فیوض الباری

فی شرح

صحیح البخاری

کتاب الجہاد

امیر اہلسنت حضرت علامہ سید محمود احمد رضوی قدس سرہ العزیز

امیر و شیخ الحدیث مرکزی دار العلوم حزب الاحناف لاہور

شعبہ تبلیغ مرکزی دار العلوم حزب الاحناف گنج بخش روڈ لاہور پاکستان

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا

احادیثِ نبویہ کا محبوب مقبول ذخیرہ قرآن کے بعد سب سے صحیح کتاب

امام الدنیا امیر المومنین فی الحدیث رأس المحدثین استاذ الحفاظ ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری

قدس سرہ الباری کی تالیف صحیح البخاری کا سلیس اردو ترجمہ اور مکمل شرح

فیوض الباری

فی شرح

صحیح البخاری

حصہ اوّل

علامہ سیّد محمود احمد رضوی

ناشر: مکتبہ رضوان، داتا دربار روڈ۔ لاہور

مختصر تعارف

مولف فیوض الباری

تحریر ـــ حکیم العلماء علامہ عبدالحکیم صاحب شرف قادری شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ لاہور

اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جس شخص کو دین کا فہم حاصل ہو جائے، رحمت الٰہیہ اس کے شامل حال ہوتی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **و من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین** اللہ تعالیٰ جس کی بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی بصیرت عطا فرما دیتا ہے

پھر اگر اس کے ساتھ تقویٰ و پرہیز گاری، حق گوئی اور بے باکی، رشد و ہدایت اور تبلیغ اسلام، تدریس و تصنیف اور اعلاء کلمہ حق ایسے اوصاف بھی جمع ہو جائیں تو سونے پر سہاگہ۔ فضیلۃ الشیخ، جلالۃ العلم و المعرفۃ، محدث عصر، حضرت علامہ مولانا سید محمد دیدار علی شاہ الوری قدس سرہ العزیز ایسی ہی جامع صفات اور نادر روزگار شخصیت تھے، ان کی دینی اور ملی خدمات اس لائق ہیں کہ ان پر علمی اور تحقیقی مقالے لکھے اور شائع کئے جانے چاہئیں۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں دو قابل صد فخر فرزند عطا فرمائے۔

۱۔ غازی کشمیر علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری

۲۔ مفتی اعظم پاکستان علامہ ابو البرکات سید احمد قادری

علامہ سید ابوالحسنات قادری نے میدان سیاست، خطابت قومی خدمات اور تصنیف میں وہ گراں قدر خدمات سرانجام دیں جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں، ان کی عظمت و جلالت کا یہ عالم تھا کہ مخالف مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے نامور علماء بھی ان کے قدموں میں بیٹھنے اور ان کے جوتے سیدھے کرنے کو سرمایہ فخر تصور کرتے تھے، علامہ سید ابوالبرکات قادری رحمہ اللہ اپنے دور کے مفتی اعظم پاکستان، یکتائے زمانہ محدث اور بے مثال مناظر تھے، اپنے اور بیگانے سب ہی ان کی جلالت علمی اور ژرف نگاہی کے معترف تھے۔

۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت کا آغاز ہوا۔ اسی دور میں پاکستان کی تاریخ کا سخت ترین مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا، کسی کو لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی، اس کے باوجود حضرت سید ابوالبرکات ہر روز نماز فجر کے بعد قرآن پاک کا درس دیتے۔ فتنہ قادیانیت کے موضوع پر تقریر

کرتے، ختم نبوت کے بارے میں قادیانیوں کے شبہات کا جواب دیتے اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی پرزور تائید فرماتے۔ اس اثناء میں کسی کو یہ جرات نہ ہوئی کہ آپ کا لاؤڈ سپیکر بند کرا دے۔

۱۳۸۵ھ / ۱۹۶۵ء میں جنگ ستمبر کے بعد علماء اہل سنت کا ایک وفد جنرل محمد ایوب خاں سے ملا، جس میں حضرت علامہ سید ابو البرکات قادری رحمتہ اللہ تعالیٰ بھی شامل تھے، ایوب خاں نے مزاج پرسی کے بعد دعا کے لیے کہا تو سید صاحب نے فرمایا:

دعا کیا کروں؟ آپ نے عائلی آرڈیننس نافذ کیا ہے جس کی بعض دفعات، صریح طور پر قرآن و سنت کے خلاف ہیں، آپ نے شاستری کی ارتھی کو کندھا دیا، ایک مشرک کی ارتھی کو کندھا دینا کب جائز ہے؟

جنرل محمد ایوب خاں نے وعدہ کیا کہ عائلی آرڈیننس میں شریعت کے مطابق ترمیم کر دی جائے گی، اور شاستری کی ارتھی کو کندھا دینے کے متعلق کہا کہ یہ ایک رسمی چیز تھی اور مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس خاندان نے اعلاء کلمتہ الحق میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیا۔ اسی عظیم خانوادے کے جلیل القدر فرزند، وسیع النظر محدث، عظیم فقیہ اور محقق، حضرت علامہ سید محمود احمد رضوی، مدظلہ العالی شارح بخاری ہیں، جو خاندانی وجاہت کے علاوہ قابل قدر خصوصیات کے حامل ہیں۔ اکثر و بیشتر جب بھی ان سے ملاقات ہوئی انہیں کسی نہ کسی دینی مسئلہ میں غور و فکر کرتے ہوئے پایا، ان کی گفتگو عام انداز سے ہٹ کر، مسائل دینیہ کے بارے میں ہی ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں گہری سوچ بچار کے بعد لکھتے ہیں۔ ان کی تحریرات، مفید عام موضوعات پر ہیں اور عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

حضرت علامہ سید محمود احمد رضوی مدظلہ العالی کی ولادت باسعادت ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔ علمی اور روحانی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اسی میں نشو و نما پائی، درس نظامی کی ابتدائی کتابیں آمد نامہ گلستان وغیرہ اپنے جدامجد، سید المحدثین مولانا سید محمد دیدار علی شاہ الوری قدس سرہ سے پڑھیں، بقیہ کتب، جید اور متبحر اساتذہ سے پڑھیں۔ شرح تہذیب، قطبی اور مختصر المعانی وغیرہ کتب منطقی بابا مولانا محمد دین بدھوی سے، ملاحسن، تفسیر بیضاوی وغیرہ کتب ملک المدرسین استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عطا محمد چشتی گولڑوی مدظلہ العالی سے پڑھیں۔

ان کے علاوہ دیگر اساتذہ سے بھی استفادہ کیا جن میں حضرت مولانا مہرالدین جماعتی رحمۃ اللہ علیہ شارح مختصر المعانی کا اسم گرامی نمایاں ہے۔ درس حدیث اپنے والد گرامی، مفتی اعظم پاکستان حضرت شیخ الحدیث علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری قدس سرہ سے لیا۔ ۱۹۴۷ء میں حزب الاحناف، لاہور کے سالانہ جلسے میں آپ کی دستار بندی کرائی گئی۔ اس اجلاس میں پاک و ہند کے اکابر علماء مثلاً حضرت صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، مفتی آگرہ مولانا مفتی عبدالحفیظ، محدث اعظم ہند، علامہ سید محمد محدث کچھوچھوی، مولانا محمد یار، گڑھی شریف، علامہ عبدالغفور ہزاروی، حضرت مولانا سید مختار اشرف کچھوچھوی قدست اسرارہم تشریف فرما تھے، حضرت صدر الافاضل نے اس موقع پر بطور تبرک اپنی ٹوپی عنایت فرمائی۔

حضرت علامہ رضوی مدظلہ نے ۷ر جون ۱۹۴۷ء کو موقر جریدہ "رضوان" جاری کیا، جو ابتدا" ہفت روزہ تھا، پھر پندرہ روزہ ہوا، بعدازاں ماہنامہ کی صورت میں شائع ہوا اور بحمدہ تعالیٰ آج تک شائع ہو رہا ہے۔ اس جریدے میں وقیع اور گرانقدر مقالات شائع ہوا کرتے تھے، اس جریدے نے دین متین کی حفاظت اور مسلک اہل سنت و جماعت کی تبلیغ و اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اس رسالے کے کئی قیمتی نمبر، راقم کی نظر سے گزرے ہیں، مثلاً نماز نمبر، ختم نبوت نمبر، چکڑالویت نمبر اور معراج النبی نمبر وغیرہ، مشہور شیعہ مناظر مولوی اسمٰعیل گوجروی سے متعدد مسائل پر مباحثہ کا سلسلہ جاری رہا۔ ان مباحثوں میں علامہ رضوی مدظلہ کا قلم علمی اور تحقیقی جواہر بکھیرتا رہا۔ علامہ کا استدلال، عالمانہ گرفت، مخالفین کے اعتراضات کے ٹھوس جوابات، یہ سب چیزیں پڑھنے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ حضرت علامہ کی تصانیف رضوی گوجروی مکالمہ، بیعت رضوان، باغ فدک، حدیث قرطاس حضور کی نماز جنازہ اسی دور کی یادگار ہیں۔

اس خاندان کا طرہ امتیاز رہا ہے کہ جب بھی ملی اور ملکی مسئلہ پیش آیا، یہ حضرات راہنمائی میں پیش پیش رہے۔ تحریک پاکستان میں دارالعلوم حزب الاحناف، لاہور کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ جامع مسجد وزیر خاں، لاہور، تحریک پاکستان کا اہم ترین سٹیج تھی۔ اس اسٹیج سے پاکستان کی حمایت میں اٹھنے والی آواز اتنی زور دار تھی کہ اس کی گونج پورے پنجاب بلکہ اس کے اردگرد تک سنی جاتی تھی۔

۲۷ر تا ۳۰ر اپریل ۱۹۴۶ء کو بنارس کے باغ فاطماں میں منعقد ہونے والی آل انڈیا سنی

کانفرنس، تحریک پاکستان کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اجلاس میں اہل سنت و جماعت کے علماء و مشائخ نے اجتماعی طور پر مطالبہ پاکستان کی زبردست حمایت کی اور اس عزم کا اظہار کیا کہ جب تک پاکستان نہیں بن جاتا ہم آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ اس اجلاس میں مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری، علماء پنجاب کے وفد کے ہمراہ شریک ہوئے، اس وفد میں علامہ سید محمود احمد رضوی بھی شامل تھے۔

۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت چلائی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ قادیانیوں کو پاکستان کے کلیدی عہدوں سے ہٹایا جائے اور انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، اس تحریک کے صدر علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری تھے۔ علامہ سید محمود احمد رضوی نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی ذاتی مشین پر پمفلٹ چھاپ کر فوج اور پولیس کے نوجوانوں میں تقسیم کئے اور انہیں تحریک کے مقاصد سے آگاہ کیا اور گرفتار ہوئے، قلعہ لاہور اور سنٹرل جیل لاہور میں مقید رہے۔

۲۲ر مارچ ۱۹۷۰ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں نام نہاد کسان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں "مولانا" بھاشانی مہمان خصوصی تھے۔ اس کانفرنس کا نعرہ تھا "ماریں گے۔۔۔ مر جائیں گے۔۔۔ سوشلزم لائیں گے"۔ اسی کانفرنس میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کا نام لینن گراڈ تجویز کیا گیا۔ اہل سنت کے علماء و مشائخ نے اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے سوشلزم کے پروپیگنڈے کا موثر جواب دینے اور کسان کانفرنس کے اثرات زائل کرنے کے لیے عین اسی جگہ ۱۳، ۱۴ر جون ۱۹۷۰ء کو عظیم الشان سنی کانفرنس منعقد کی۔ جس میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن قادری مدنی مدظلہ، مدینہ طیبہ سے تشریف لاکر بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔

اس کانفرنس کا منظر دیدنی تھا۔ تاحد نظر پھیلے ہوئے غلامان مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جم غفیر اور تین ہزار علماء و مشائخ کے مبارک اجتماع سے وہ سماں پیدا ہوا کہ باطل کی تمام تاریکیاں چھٹ گئیں۔ اس کانفرنس میں اسلامیان پاکستان کو مقام مصطفیٰ کے تحفظ اور نظام مصطفیٰ کے نفاذ کا نعرہ ملا، اور اعلان کیا گیا کہ اسی منشور کی بنیاد پر دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں حصہ لیا جائے گا۔ اس کانفرنس کے کنوینئر حضرت علامہ رضوی مدظلہ اور ان کے رفقاء تھے۔ انہوں نے ملک بھر کے دورے کر کے کانفرنس کے انعقاد کے لیے فضا ہموار کی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے مولانا مختار الحق مرحوم اور ان کے رفقاء نے بھی اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے گرانقدر

خدمات انجام دیں۔

۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں تمام مکاتب فکر کے اشتراک سے مجلس عمل تحفظ ختم نبوت معرض وجود میں آئی۔ علامہ رضوی مدظلہ اس کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ آپ نے ملک کے طول و عرض میں دورے کئے' قیدو بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ بالآخر ۷ر ستمبر ۱۹۷۴ء کو اسلامیان پاکستان کے شدید دباؤ کی بنا پر قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

علامہ رضوی مدظلہ ۱۹۷۴ء تک جمعیتہ العلماء پاکستان کے مرکزی جنرل سیکرٹری رہے۔ ایک مرحلے پر جمعیتہ داخلی انتشار کا شکار ہو گئی' کوشش بسیار کے باوجود اتفاق و اتحاد کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ ۱۹۶۹ء میں حضرت علامہ ابو البرکات سید احمد قادری قدس سرہ نے حزب الاحناف لاہور میں ملک بھر کے علماء کی ایک میٹنگ بلائی' حضرت سید صاحب کی دعا و برکت سے تمام علماء اہل سنت شیروشکر ہو گئے۔ علامہ رضوی پہلے سنی بورڈ پھر مجلس عمل جمعیتہ العلماء پاکستان کے کنوینر مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر جمعیتہ کو فعال بنانے کے لیے دن رات کام کیا اور گوناگوں مشکلات کے باوجود اپنی مہم میں کامیاب رہے۔

یا رسول اللہ! کانفرنس

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت اور تعظیم و تکریم اہل سنت و جماعت کا طرہ امتیاز اور سرمایہ ایمان ہے۔ بارگاہ رسالت کی بے ادبی اور گستاخی دیکھ اور سن کر خاموشی سے برداشت کر جانا ان کے نزدیک غیرت ایمانی کے منافی ہے۔ حضرت علامہ رضوی مدظلہ کو یہ عقیدہ ورثہ میں ملا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں برطانیہ کے نام نہاد ڈاکٹر منہاس نے ایک دل آزار کتاب لکھی جس میں اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی۔ اس کتاب کی اشاعت کے خلاف جمعیتہ علماء پاکستان نے لاہور سے جلوس نکالے اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس کتاب کو ضبط کیا جائے۔ لیکن حکومت نے مطالبہ تسلیم کرنے کی بجائے ۱۰ر جنوری ۱۹۷۱ء کو علامہ سید محمود احمد رضوی اور مولانا اکرام حسین مجددی' مولانا فیض القادری اور پیر طریقت میاں جمیل احمد شرقپوری کو گرفتار کرلیا۔ پھر ان حضرات کی رہائی کے لیے حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین سیالوی اور حضرت مولانا حامد علی خاں کی قیادت میں ایک وفد ۲۰ر جنوری کو اس وقت کے گورنر پنجاب' جنرل عتیق الرحمٰن سے ملا اور ان راہنماؤں کی رہائی کے بارے میں گفتگو کی۔

چنانچہ ۱۴ر جنوری کو تمام حضرات رہا کر دیئے گئے۔

۲۳ر مارچ ۱۹۸۴ء کو بادشاہی مسجد' لاہور میں محفل قرات منعقد ہوئی' مصر کے معروف قاری عبدالباسط نے تلاوت کی' سامعین میں ہر مکتب فکر کے افراد موجود تھے۔ اسی اثناء میں کسی نے نعرہ رسالت بلند کیا اور اس کے جواب میں کسی بدبخت نے مردہ باد کا نعرہ لگایا' نعرہ لگانے والے حافظ غلام معین الدین کو مارا گیا اور اسے مرزائی کہہ کر پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

علامہ رضوی نے اس سانحہ کا بروقت نوٹس لیا اور اپریل ۱۹۸۴ء ملک بھر کے علماء و مشائخ اہلسنّت کی میٹنگ بلا کر مجلس عمل علماء اہلسنّت قائم کی اور طے پایا کہ ۱۲ر اپریل کو حزب الاحناف لاہور میں یارسول اللہ کانفرنس منعقد کی جائے' چنانچہ اس کانفرنس میں ہزاروں علماء و مشائخ اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ سامعین نے شرکت کی۔ اہل سنت و جماعت نے مغرب اور عشاء کی نمازیں شاہی مسجد میں باجماعت ادا کیں اور رات کے ساڑھے بارہ بجے تک یارسول اللہ کانفرنس کا پروگرام جاری رہا۔ شاہی مسجد کے درو دیوار نعرہ رسالت سے گونجتے رہے۔ چاروں میناروں' برجیوں اور مسجد کے چپے چپے پر یارسول اللہ اور سبز گنبد کے عکس والے جھنڈے لہراتے رہے اور دنیا پر واضح ہو گیا کہ اس دور بے عملی میں بھی مسلمان ناموس رسول کی حفاظت کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔

مشہور صحافی جناب انور قدوائی نے نوائے وقت لاہور میں لکھا۔

"علامہ محمود احمد رضوی نے جس بات پر علم احتجاج بلند کیا تھا وہ اہم ترین اور سنگین مسئلہ تھا جس سے اختلاف بریلوی کیا؟ کوئی مسلمان بھی نہیں کر سکتا تھا"۔ اس کانفرنس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا

(۱) کہ اس واقعہ کی تحقیق کی جائے اور گستاخ رسول کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

(۲) سنی اوقاف علیحدہ کیا جائے۔

یہ جنرل ضیاء الحق کی مارشل کا دور تھا۔ مگر اس کے باوجود لاہور اور ملک بھر میں یارسول اللہ کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ مجلس عمل نے ۱۲ر مئی کو شاہی مسجد لاہور اور نومبر ۱۹۸۵ء کو عرس داتا گنج بخش کے موقع پر یارسول اللہ کانفرنسیں منعقد کیں۔ جس کی تفصیل کے لیے دفتر درکار ہے۔

نوائے وقت کے جناب محترم انور قدوائی کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں ۱۲ر مئی کو علامہ

محمود احمد رضوی نے تمام سرکاری رکاوٹوں کو روند ڈالا اور نہ صرف جلوس نکالا بلکہ بادشاہی مسجد میں جلسہ بھی کیا۔ علامہ محمود احمد رضوی کی اپیل پر جس طرح لوگ اکٹھے ہوئے اور انہوں نے ناموس رسول کے لیے جس جذبہ و جوش کا مظاہرہ کیا ہے' اس سے دو فائدہ ہوئے ہیں۔

ایک تو یہ کہ علامہ محمود احمد رضوی جو ایک عرصہ سے علیل تھے' پھر جوان ہو گئے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ملک کے اندر اور باہر وہ عناصر جو یہ سوچ کر خوش تھے کہ پاکستان میں ایمان کی طاقت کمزور ہو گئی ہے اور یہ کہ روسی ٹینکوں پر بیٹھ کر پاکستان آئیں گے۔ ان کے خواب بکھر گئے ہیں اور یہ کہ اسلام کے ماننے والوں کا ایمان ابھی تک قائم ہے اور اس ملک میں کسی کو اسلام کے خلاف بات کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

تدریس و تالیف

علامہ رضوی جہاں دقیق النظر محدث' نکتہ رس فقیہہ اور مفتی صاحب طرز ادیب اور قادر الکلام خطیب بھی ہیں۔ ان کی تقریر علم و فضل' سنجیدگی اور متانت کا بہترین مرقع ہوتی ہے۔

علامہ رضوی نے زمانے طالب علمی میں درس تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دارالعلوم حزب الاحناف میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور درس نظامی کی اکثر کتب پڑھاتے رہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے تصنیف و تالیف اور دارلعلوم حزب الاحناف کی تعمیر و انتظام کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

علامہ رضوی کی تمام تصانیف' علم و تحقیق کا منہ بولتا ثبوت اور عوام و خواص کے لیے مفید ہیں اور علمی حلقوں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کی سب سے اہم تالیف بخاری شریف کی شرح فیوض الباری ہے جس کے اب تک دس پارے پانچ ضخیم جلدوں میں شائع ہو کر مقبولیت عامہ کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں خصائص مصطفیٰ' جامع الصفات' روح ایمان' شان مصطفیٰ' مقام مصطفیٰ' معراج النبی' علم غیب رسول بصیرت' لمحات فکر' دین مصطفیٰ' شان صحابہ' چراغ ہدایت' مسائل نماز' روشنی' اسلامی تقریبات' جواہر پارے' فتاوی برکات العلوم سیدی ابوالبرکات' بھی آپ کی مشہور مقبول تصانیف ہیں۔

علامہ سید محمود احمد رضوی کو اللہ تعالیٰ نے تین صاحبزادیاں اور سات صاحبزادے عطا فرمائے ہیں۔ صاحبزادوں میں سے سید مصطفیٰ اشرف رضوی بڑے ہونہار اور باصلاحیت نوجوان ہیں جن کے بارے میں توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے قابل صد فخر آباؤ اجداد کے مسند نشین ہوں

گے۔

ستارہ امتیاز

حضرت علامہ رضوی نے غیر ممالک کے تبلیغی دورے بھی کئے ہیں۔ آپ کی دینی، علمی اور ملی خدمات کی بنا پر حکومت پاکستان نے آپ کو ستارہ امتیاز بھی دیا۔ آپ تقریباً سات سال ۱۹۸۴ء تک مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے بلامقابلہ چیئرمین بھی رہے اور ۱۹۸۱ء سے ۳۱ر اپریل ۱۹۸۴ء تک اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ آپ نے ممالک اسلامیہ کا بھی دورہ کیا اور تین حج اور ایک عمرہ کی سعادت بھی حاصل کی۔

فیوض الباری شرح صحیح بخاری

علامہ سید محمود احمد رضوی مدظلہ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ وہ قلم و قرطاس کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ تحقیق کا مادہ ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کی تمام تصانیف علم و تحقیق کا بہترین شاہکار اور افادیت عامہ کی حامل ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کی جملہ تصانیف' عوام و خواص میں مقبولیت کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی تصانیف کے نام اس سے پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔ اس وقت ان کی اہم تصنیف فیوض الباری کا مختصر تعارف پیش کرنا مقصود ہے۔

فیوض الباری کا انداز بیان یہ ہے۔

۱۔ ہر حدیث کا بامحاورہ اور سلیس اردو ترجمہ کیا گیا ہے۔

۲۔ الفاظ حدیث کی لغوی تحقیق پیش کی گئی ہے۔

۳۔ حدیث سے مستنبط ہونے والے احکام و مسائل کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

۴۔ ائمہ اربعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے فقہی اختلافات کی تفصیل پھر روشن دلائل سے مذہب حنفی کی ترجیح اور تحقیق

۵۔ مسلک اہل سنت کو مدلل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ فرق باطلہ اور منکرین حدیث کے اعتراضات اور شکوک و شبہات کے معقول اور مسکت جوابات دیئے ہیں۔

۶۔ امام بخاری اکثر و بیشتر احادیث کی پوری سند بیان کرتے ہیں۔ فیوض الباری میں اختصار کے پیش نظر سندوں کا ذکر نہیں کیا گیا۔

۷۔ امام بخاری ایک ہی حدیث کو مختلف ابواب میں بیان کر جاتے ہیں۔ فیوض الباری میں ابواب کے عنوانات تو باقی رکھے گئے ہیں' لیکن حدیث کو ایک جگہ بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے اور اسی جگہ اس سے مستنبط ہونے والے احکام و مسائل بیان کر دیئے گئے ہیں۔

۸۔ حسب ضرورت راویوں کے مختصر احوال بیان کر دیئے گئے ہیں۔

۹۔ ابتداء میں مفصل مقدمہ ہے جس میں حجیت حدیث' مقام رسول عہد نبوی' عہد صحابہ' عہد تابعین میں حدیث کی حفاظت و کتابت وغیرہ امور پر پر مغز علمی گفتگو کی گئی ہے۔ نیز امام بخاری کا تذکرہ مختصر مگر دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ علم حدیث کی چند ضروری اصطلاحات بھی بیان کی گئی ہیں۔

فیوض الباری کو جلیل القدر محدثین نے داد و تحسین سے نوازا ہے۔ قومی اخبارات نے شاندار تبصرے کئے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ غزالی زماں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ فرماتے ہیں بخاری شریف کی ایک بلند پایہ شرح جن خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے وہ تمام خوبیاں "فیوض الباری" میں پائی جاتی ہیں.... اکثر و بیشتر اردو تراجم میں جو کمزوریاں اور نقائص پائے جاتے ہیں الحمد اللہ! فیوض الباری کا دامن ان سے پاک ہے۔ اس کا مطالعہ عوام کے لیے نہیں بلکہ خواص اہل علم' طلباء اور مدرسین کے لیے بھی نہایت ہی مفید ہے۔

فاضل مولف نے یہ کتاب لکھ کر وقت کے اہم تقاضے کو پورا کیا ہے۔ اور ان کی یہ گران مایہ تالیف اہل سنت پر ایسا احسان عظیم ہے جس کو ہماری آئندہ نسلیں بھی فراموش نہیں کر سکتیں۔ حضرت علامہ سید محمود احمد رضوی' مولف فیوض الباری' اپنی اس قابل قدر تالیف پر یقیناً شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ ازہری مرحوم فرماتے ہیں اس کتاب نے از اول تا آخر دریائے علم حدیث کو کوزے میں بند کر دیا ہے اور حدیث پاک کی وہ خدمت کی ہے جس کے متعلق سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **نضر اللہ عبدا سمع مقالتی فحفظھا و وعاھا و اداھا فرب حامل فقہ لیس بفقیہہ ورب حامل فقہ الی من ھو افقہ منہ** (مشکواۃ ص ۳۵) اللہ تعالیٰ اس بندے کو حسن و رونق عطا فرمائے جس نے میری حدیث سنی اور اس کو یاد کیا اور اسے سمجھا اور ادا کیا' اس لیے کہ بہت سے علم اٹھانے والے عالم نہیں اور بہت سے علم کے حامل اسے سناتے ہیں جو اس سے زیادہ فقیہہ ہے۔

الغرض علامہ سید محمود احمد رضوی زید مجدہ نے فہم و افہام و تفہیم و اتقان و تلقین کا حق ادا کیا ہے اور حقائق و معارف حدیث کے دریا بہا دیئے ہیں اور مشککین کے شکوک و شبہات کو دفع کرکے حنفیہ و عقائد اہل سنت و جماعت کی خوب اور بہت خوب خدمت کی ہے۔ (عبدالمصطفیٰ ازہری' علامہ : تقریظ فیوض الباری ج ۵ ص ۲)

۲۷ر جولائی ۱۹۵۹ء کو روزنامہ نوائے وقت کے تبصرہ نگار نے پہلی جلد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا

آج کے دور میں اکثر تصانیف' محض پرانے مصنفین کی محنتوں کو نئے قالب میں ڈھال کر پیش کی جاتی ہیں اور ایک روش یہ ہو گئی ہے کہ نئے مصنفین' اس محنت' کاوش' وسیع مطالعہ اور عمیق فکر سے کام نہیں لیتے جو کسی تصنیف کو مکمل بنانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس ماحول میں "فیوض الباری" ایک ایسی نئی تصنیف نظر آتی ہے جس میں مصنف نے وسعت علم کے فن پر عبور کے علاوہ محنت کا ثبوت دیا ہے جس سے اس کی افادیت علماء اور عوام سب کے لیے یکساں ہوگئی ہے۔ (فیوض الباری : ج ۳ ص ۳)

روزنامہ جنگ' شمارا ۱۱ر ستمبر ۱۹۶۱ء میں تبصرہ نگار تیسری جلد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ترجمہ و تشریح علمی لحاظ سے بہت بلند اور زبان کے لحاظ سے نہایت سلجھا ہوا ہے' حضرت مولف کا انداز تحریر مدرسانہ' فقیہانہ اور ناصحانہ ہے' ان کی تحریر میں تعصب' عناد' اور کرختگی نہیں' بلکہ اکثر مقامات پر فروعی مسائل پر تشدد کرنے والوں کو خوف خدا یاد دلایا گیا ہے۔

ان آراء اور تبصروں کے بعد راقم کی رائے کیا حیثیت رکھتی ہے؟ ہاں یہ دعا ضرور ہے کہ مولائے کریم حضرت علامہ کا سایہ تادیر سلامت رکھے اور اس شرح کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے صاحبزادوں کو علم دین میں کمال حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ اپنے آباء کی مسند کو سنبھال سکیں۔

سند حدیث اور سلسلہ بیعت

حضرت [illegible] ضوی کے جد امجد شیخ [illegible] نرت [illegible] دیدار علی [illegible] ث الوری علیہ الرحمہ نے حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری علیہ الرحمہ سے [illegible] درس حدیث [illegible] اور [illegible] بعد [illegible] حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی علیہ الرح[illegible] دوبارہ [illegible] کا

درس لیا اور آپ سے بیعت ہوئے۔ حضرت گنج مراد آبادی نے آپ کو اپنی خلافت سے بھی نوازا اور سلاسل اولیاء اللہ کے معمولات و وظائف کی اجازت عطا فرمائی۔

حضرت علامہ رضوی کے والد محترم شیخ الحدیث علامہ ابو البرکات علیہ الرحمہ طریقت میں اعلیٰ حضرت شاہ سید علی حسین شاہ صاحب سجادہ نشین کچھوچھہ شریف علیہ الرحمہ سے بیعت ہیں اور ان کے خلیفہ مجاز بھی اور علامہ رضوی کو بھی اعلیٰ حضرت اشرفی میاں علیہ الرحمہ سے بیعت و خلافت حاصل ہے۔

علامہ رضوی نجیب الطرفین سید ہیں اور سیدنا امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اس لیے علامہ رضوی اپنے نام کے ساتھ رضوی لکھتے ہیں اور سلسلہ اشرفیہ میں مرید و خلیفہ ہیں۔ نیز آپ کو سلسلہ اشرفیہ کے موجودہ سجادہ نشین صدر شریعت حضرت ابوالمسعود شاہ سید محمد مختار اشرف الاشرفی الجیلانی مدظلہ العالی سجادہ نشین آستانہ عالیہ اشرفیہ کچھوچھہ شریف انڈیا نے بھی اپنی خلافت سے نوازا ہے۔

آخر میں یہ بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ علامہ سید محمود احمد رضوی کا سلسلہ حدیث ایک واسطہ سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ تک پہنچتا ہے کیونکہ آپ کے والد ماجد قدس سرہ کو امام احمد رضا بریلوی سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔ (اور امام المحدثین حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ تک صرف چار واسطے ہیں۔ ۱۔ استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت علامہ ابوالبرکات سید احمد صاحب رضوی قادری اشرفی۔ ۲۔ امام المحدثین حضرت مولانا ابو محمد سید دیدار علی شاہ صاحب رضوی قادری فضل رحمانی۔ ۳۔ قطب وقت شیخ المحدثین حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی۔ ۴۔ سراج الہند شیخ الحدیث حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

مختصر فہرست مضامین

فیوض الباری (پارہ اوّل) شرح صحیح البخاری

کتاب الایمان

مضمون	صفحہ

کتاب العلم

مضمون	صفحہ

فسبح بحمد ربك وكن من الساجدين
واعبد ربك حتى يأتيك اليقين

مُقدّمہ

مجموعہ احادیث کے تراجم اب عام ہوگئے ہیں اور مُسلمان انہیں بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے محض اُردو ترجمہ سے اس ہستی مقدس کے ارشادات کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھا جا سکتا جو معلِم کائنات ہے اور جس کا قلبِ اقدس بے شمار اسرارِ غیب اور لطائف وحکم کا خزینہ ہے اور جس کو کتاب وحکمت دے کر مبعوث کیا گیا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کتنے ہی ارشادات ایسے غامض و لطیف و دقیق ہیں کہ جب تک علمِ حدیث سے باخبر حضرات ان کے اسرار نہ کھولیں اور سیاق وسباق اور اصولِ دین کی روشنی میں ان کے معانی واضح نہ کریں۔ ایک عام قاری کے لیے محض ترجمہ سے ان کی تہہ تک پہنچنا بہت دُشوار ہے۔ احادیث کے اُردو تراجم نے جہاں عوام کی ایک گونہ دینی رہنمائی کا سامان مہیا کیا ہے۔ وہاں ان کو نہایت ہی خطرناک اُلجھنوں میں مُبتلا کر دیا ہے بلکہ عام گمراہوں نے عموماً اور مُنکرینِ حدیث نے خصوصاً غلط ترجمے چھاپ کر بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں۔ میں عرصہ سے محسوس کر رہا تھا کہ حدیث کے لفظی ترجمہ کے ساتھ اس کی ایسی ترجمانی وتفہیم بھی کر دی جائے کہ جس سے عام مسلمان اس کے صحیح مفہوم ومُدعا تک پہنچ سکیں اور جو اُلجھنیں ان کو پیش آتی ہیں وہ بھی صاف ہو جائیں۔ احباب نے مشورہ دیا کہ بخاری شریف جو احادیثِ نبویہ کا نہایت ہی مقبول ومحبوب ذخیرہ ہے "تفہیمِ حدیث" کا سلسلہ اسی سے شروع کر دیا جائے۔ احباب کے اس مشورہ کو قبول کرتے ہوئے میں اس بار کو اٹھانے کی جرأت کی ہے۔ مجھے اپنی بے بضاعتی وکم علمی کا پورا پورا احساس ہے۔ احادیثِ بخاری کی جو تفہیم وترجمانی میں نے کی ہے یہ بہرحال حرفِ آخر نہیں ہے۔ اہل علم کی خدمت میں التماس ہے کہ جہاں کہیں لغزشِ قلم پائیں مجھے مطلع فرمائیں تاکہ اس کی تلافی کر سکوں کیونکہ نقص یا خطا بخاری میں نہیں ہے بلکہ میری تفہیم وترجمانی میں ہو سکتا ہے۔ خدا ہی پر بھروسہ ہے اور اسی کے اختیار میں ہے کہ مجھ جیسے کم علم کو جتنی چاہے توفیق عطا فرمائے۔ حسبی اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ و

نعم النصیر

فیوض الباری ان اوراق میں احادیث بخاری کی تفہیم وترجمانی کی جو کوشش کی گئی ہے اس کا نام "فیوض الباری" تجویز کرتا ہوں اور اس میں امورِ ذیل کا خیال رکھا گیا ہے :-

۱- حدیث کا لفظی ترجمہ ۲- الفاظِ حدیث کی حسبِ ضرورت لغوی تحقیق ۳- حدیث کے مسائل واحکام کی تفصیل ۴- ائمہ اربعہ کا حدیث زیرِ بحث سے استدلال اور ان کے مابین اختلافِ آرار کے دلائل کی وضاحت ۵- امام نے ہر حدیث کو پوری سند سے لکھا ہے۔ میں نے بوجہ اختصار ابتدائی سند کو حذف کر دیا ہے ۶- امام ایک ہی حدیث کو متعدد عنوانات کے ماتحت متعدد بار ذکر کرتے ہیں۔ میں نے بخاری کا ہر عنوان قائم رکھا ہے البتہ حدیث مکرر کو صرف ایک ہی جگہ ذکر کیا ہے ۷- جس عنوان میں حدیثِ مکرر آئی ہے وہاں میں نے اس کی مناسبت بلکہ بعض اوقات اس کے جملے بھی لکھ دیئے ہیں اور یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ یہاں حدیثِ مکرر ہے۔ اس کو ترک کیا گیا ہے ۸- ایک جگہ اگر کوئی حدیث مختصر مذکور ہے اور دوسری جگہ مفصل ہے تو مفصل حدیث کو بھی جہاں وہ آئی ہے باقی رکھا ہے۔

ضروری نوٹ :- امام بخاری علیہ الرحمہ نے عنوانات کے تحت جو حدیثیں ذکر کی ہیں ہم نے تقریباً ہر حدیث کے متعلق یہ تصریح کر دی ہے کہ اس حدیث کو امام بخاری نے اور امام مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ محدثین کرام علیہم الرحمت والرضوان نے ، کو کن کن ابواب میں ذکر کیا ہے۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ اوّل باب معلوم ہو تو حدیث تلاش کرنے میں آسانی ہوتی ہے کیونکہ صفحات بعض اوقات بدل جاتے ہیں۔ دوم یہ کہ زیرِ بحث حدیث کے متعلق جو حضرات مزید توضیح وتشریح چاہیں تو دیگر شروح میں دیکھ سکتے ہیں۔

حجیتِ حدیث

حجیتِ حدیث کے متعلق مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ ابتدائے اسلام سے لے کر اب تک تمام مسلمان حدیث کی حجیت کے قائل رہے ہیں اور امت کا یہ عقیدہ ہے کہ حدیث اور قرآن دونوں ہی دین کا جزو اور شریعت کی اساس ہیں اور سنت کی پیروی بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح قرآنِ حکیم کی۔ مگر اس پُر آشوب دور میں جہاں اور فتنوں نے سر نکالا ہے ایک فتنہ منکرینِ حدیث کا بھی ہے جو حجیتِ حدیث کے منکر ہی نہیں بلکہ اس کو عجمی سازش قرار دیتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہوا کہ دیباچہ میں حجیتِ حدیث کے متعلق گفتگو کی جائے۔

تنزیلِ کُتب حدیث کی حجیت پر بحث کرنے سے پہلے تین باتیں قابلِ غور ہیں - اوّل - اللہ تعالےٰ نے کتاب اور رسول کے واسطہ کے بغیر خود ہی مخلوق کی ہدایت کیوں نہ فرمائی دوم - رسالت کے کام کے لیے صرف انسانوں کو کیوں منتخب کیا - فرشتوں یا غیر انسانی ہستیوں کو اس کام کے لیے کیوں نہ مامور کردیا سوم - تمام آسمانی کتابوں کو رسول کے واسطہ سے کیوں نازل کیا صرف کتاب ہی کیوں نہ نازل کردی۔

اِن سوالوں کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ غایتہ تجرد اور نہایت تقدس میں ہے یعنی وہ ایک ایسی ہستی ہے جو کمال کے انتہائی بلند مقام پر فائز ہے اور انسان نقصان کے انتہائی درجہ پر ہے اس لیے انسان میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ خدا سے بلا واسطہ ہدایت اور فیض حاصل کرے اور نہ خدا ہی بلا واسطہ اپنے بندے سے تعلق پیدا کرتا ہے اور اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ خدا قادر نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقصان انسان میں ہے - اس میں یہ صلاحیت اور قابلیت اور استعداد ہی نہیں ہے کہ وہ براہِ راست خدا سے فیض لے کیونکہ ناقص، کامل سے اسی وقت بلا واسطہ فیض حاصل کرسکتا ہے جب کہ ناقص اور کامل میں کوئی مناسبت ہو اور خدا اور بندہ میں تو کوئی مناسبت ہے ہی نہیں۔ (وہ خالق ہے اور یہ مخلوق - خالق اور مخلوق کا کیا جوڑ) اس لیے اللہ سے فیض لینے اور اس کی رضا اور احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ایک واسطہ کی ضرورت پڑی - ایسا واسطہ جس کا تعلق خدا سے بھی ہو اور مخلوق سے بھی - پس یہ واسطہ انبیار کرام ہیں - جن کے ذریعے مخلوق کا تعلق خدا سے قائم ہوتا ہے۔

اب یہ سمجھیے کہ انسان تو غایتِ نقصان میں تھا اور وہ اپنی عدمِ صلاحیت کی وجہ سے خدا سے بلا واسطہ تعلق پیدا نہیں کرسکتا تھا - پھر انبیار جو انسان ہی ہوتے ہیں وہ اللہ سے کیسے تعلق پیدا کرسکتے ہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ انبیار اگرچہ انسان ہی ہوتے ہیں مگر انسانیت کی نہایت بلند سطح پر ہوتے ہیں - ان میں اللہ تعالےٰ ایسی استعداد پیدا فرمادیتا ہے کہ وہ بلا واسطہ اس سے تعلق رکھیں - انبیار میں چند خصوصیات ایسی ہوتی ہیں کہ وہ انسانوں میں کیا فرشتوں میں بھی نہیں پائی جاتیں - جیسے خدا اپنی مخلوقات کے درمیان تقدس اور تجرد کے نہایت بلند مقام پر ہوتا ہے - اسی طرح انبیار کرام عام انسانوں میں تقدس اور تجرد کے نہایت بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں - تجرد کی جہت سے وہ خدا سے تعلق رکھتے ہیں اور تعلق کی جہت سے وہ پیغاماتِ الٰہی بندوں تک پہنچا دیتے ہیں - اس لیے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہدایت کے لیے انبیار کرام کو واسطہ قرار دیا اور خود بلا واسطہ مخلوق کی ہدایت نہیں فرمائی۔

سوال دوم کا جواب یہ ہے اللہ کی سنت یہ ہے کہ عام انسانوں کی ہدایت کے لیے رسول

بشری ہی مبعوث فرماتا ہے اور اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فرشتے یا غیر انسانی ہستیاں انسان کی ہدایت اور تزکیہ کا سبب نہیں بن سکتیں کیونکہ انسان کی ہدایت کا سبب وہی بن سکتا ہے جو انسان کے ساتھ مناسبت رکھے۔ فرشتے اپنی نورانیت اور ملکیت کی وجہ سے اور غیر انسانی ہستیاں اپنے فطری قصور اور عدم صلاحیت کی وجہ سے انسان کے لیے ہادی نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہر زمانہ کے کفار نے انبیاء و مرسلین سے یہی مطالبہ کیا ہے کہ اگر خدا کو پیغام پہنچانا ہی منظور ہے تو ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل کرتا کہ ہمیں اس پیغام کے منزل من اللہ ہونے کا یقین آجائے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے جواب میں فرمایا :۔

لَوْجَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا	اگر ہم فرشتے بھی بھیجتے تو ان کو انسانی لباس میں بھیجتے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا کہ انسان کی ہدایت اور تزکیہ و تربیت کے لیے فرشتہ کام نہیں دے سکتا۔ کیونکہ فرشتے اور انسان میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ فرشتہ انسانی جذبات سے محروم ہے۔ شہوانی قوتیں اس میں مفقود ہیں۔ انسانی ضرورتوں سے بے نیاز ہے۔ ایسے ملکی اور نوری افراد انسان کی تعلیم و تربیت کے فرائض ادا کر ہی نہیں سکتے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر ہم فرشتوں کو بھیجتے تو بھی ان کو لباسِ بشریت میں بھیجتے تاکہ انسان اور فرشتہ میں مناسبت پیدا ہو جاتی بلکہ قرآنِ کریم نے یہاں تک فرمایا کہ فرشتے اسی صورت میں بھیجے جا سکتے تھے جبکہ زمین پر فرشتے بستے ہوتے۔

لَوْكَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا	اگر زمین میں فرشتے بستے ہوتے تو ہم ان کی ہدایت کے لیے رسول ملکی کو مبعوث فرماتے (قرآنِ مجید)

اس لیے اللہ تعالیٰ نے عام انسانوں کی ہدایت و تزکیہ و تربیت کے لیے فرشتوں کی بجائے انسانوں کو ہی رسول بنا کر مبعوث فرمایا۔

سوال سوم کا جواب یہ ہے اب رہا یہ سوال کہ کتاب کو رسول کے واسطہ سے کیوں نازل کیا۔ صرف کتاب ہی کیوں نہ نازل کر دی ؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام آسمانی کتابوں کو رسول ہی کے واسطہ سے نازل کیا ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ صرف کتاب نازل کر دیتا اور کتاب کے مطبوعہ نسخے ہر انسان تک پہنچا دیے جاتے۔ اگر کتاب کی اشاعت کا یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تو بلاشبہ یہ ہدایت کا یقینی ذریعہ ہوتا کیونکہ ایسے

صریح معجزہ ہے اور بالکل ظاہر خارق عادت کو دیکھ کر ہر شخص مان لیتا کہ یہ کتاب واقعی خدا کی طرف سے ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے باوجود قادرِ مطلق ہونے کے یہ طریقہ اختیار نہیں فرمایا بلکہ ہمیشہ اپنے رسولوں ہی کے ذریعہ کتابیں نازل کیں تا آنکہ قرآن شریف کی باری آئی تو قرآن بھی بلا واسطہ نہیں دیا بلکہ اس کے نزول سے پہلے بڑے انتظامات فرمائے۔ پھر ایک مقدس ہستی کو ابتدا ہی سے قرآن کے لیے مخصوص و منتخب فرمایا۔ جب وہ ہستی دنیا میں جلوہ فرما ہو گئی تو پھر قرآن نازل ہوا اور رسول کریم کے واسطہ سے قرآن بھی دیا گیا۔ آخر کیوں؟ اس کا تسلی بخش جواب خود قرآن ہی نے دیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ اللہ نے جس قدر رسول مبعوث کیے ہیں۔ ان کی بعثت کا مقصد یہ رہا ہے کہ فرامینِ الٰہی کے مطابق حکم دیں اور لوگ انہی کے احکام کی اطاعت کریں۔ وہ کتابِ الٰہی پر خود عمل کر کے دکھائیں اور لوگ انہیں کے نمونہ کو دیکھ کر ان کا اتباع کریں۔

مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ	ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جاتے۔

دنیا میں جتنے انبیائے کرام تشریف لائے سب نے اپنی امت سے یہی مطالبہ کیا

اِتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ	اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

حضور نبی کریم کی زبانِ مبارک سے یہ بھی کہلوایا گیا۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ	اگر اللہ کے محبوب بننا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو

ان نصوصِ قرآنیہ سے ثابت ہوا کہ کتاب کے ساتھ رسولوں کو اور قرآن کے ساتھ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمانے کی حکمت یہ ہے کہ کتاب اور رسول دونوں کی اطاعت کی جائے اور اللہ کا منشا یہ ہے کہ جس طرح لوگ میری کتاب کی اطاعت کریں ٹھیک اسی طرح لوگ کتاب کے ساتھ جو رسول بھیجا گیا ہے اس کا بھی اتباع کریں۔

معلّمِ کتاب اس میں شک نہیں کہ کتاب (قرآن) دین و شریعت کی اصل ہے اور ادلۂ شرعیہ میں سب سے مقدم اور محکم قرآن ہی ہے مگر یہ بات منکرینِ حدیث کو بھی تسلیم ہے کہ قرآن صرف اصول دیتا ہے اور اپنے اصول کی تشریح و توضیح کسی اور پر چھوڑ دیتا ہے۔ آخر کیوں؟ کیا قرآن ناقص ہے؟ کیا وہ ملت کا دائمی اور آخری ضابطہ حیات نہیں ہے؟ ہے اور ضرور ہے تو پھر قرآن میں اصول کیوں ہیں؟ اجمال اور ابہام کیوں ہے؟ تو اس کی وجہ بھی خود قرآن ہی نے بتا دی۔ اس نے ہمیں

بتایا کہ اگر محض کتاب اُتار دی جاتی اور اس کے ساتھ کوئی رسول نہ آتا تو لوگ آیات کے معانی میں اختلاف کرتے۔ اصول کی جزئیات میں لڑتے جھگڑتے اور کوئی ان کو تسلّی دینے والا اور غلطی کی نشاندہی کرنے والا نہ ہوتا اور اس طرح اللہ کی کتاب جدال و نزاع کا اکھاڑہ بن جاتی۔ اس لیے اللہ تعالےٰ نے کتاب کے ساتھ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی مبعوث کیا اور قرآن کو رسولِ کریم علیہ السلام پر نازل فرمایا۔ یہ صرف اس لیے تاکہ لوگ اپنے اپنے طور پر نہیں بلکہ رسول کے بیان اور تشریح کی روشنی میں قرآن کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ قرآن کریم نے اپنے ساتھ رسول کے اس تعلق کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے:۔

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ	ہم نے یہ ذکر (قرآن) آپ پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ آپ خوب کھول کھول کر بیان کر دیں اس کو جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں کہ قرآن کے ساتھ رسول کو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ رسول قرآن کے شارح ہیں اور ان کا فرض نبوت یہ ہے کہ وہ قرآن کی خوب تشریح و توضیح فرمائیں اور امت کا فرض یہ ہے کہ وہ رسول کا اتباع کرے اور اس کے اُسوۂ حسنہ پر چلے۔

لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ	تمہارے لیے رسول کریم میں بہترین نمونہ ہے

تلاوتِ آیات پھر یہ نہیں کہ قرآن نے صرف ایک ہی جگہ رسول کے اس منصب اور فرض کو بیان کر دیا بلکہ متعدد مقام پر رسول کے فرائض اور اس کے مراتب سے دنیا کو آگاہ کیا گیا۔

چنانچہ فرمایا:۔

يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ	یہ رسول قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں۔ اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

اس آیت میں دو چیزیں الگ الگ ذکر کی گئی ہیں ۱۔ تلاوتِ آیات ۲۔ تعلیم کتاب

آیات کی تلاوت کا مطلب تو بالکل واضح ہے۔ البتہ تعلیم کتاب کی مراد پر غور کرنا ہے۔ اگر تعلیم کتاب سے بھی قرآن کی عبارت پڑھ کر سنانا اور یاد کرانا ہی مقصود ہے تو تلاوتِ آیات سے الگ کوئی چیز نہ ہوئی حالانکہ وہ اس سے الگ چیز ہے اور الگ ہی ذکر کی گئی ہے تو معلوم ہوا کہ یقیناً تعلیم کتاب سے مراد قرآن کی تشریح اس کے معانی و مطالب کی توضیح ہی ہے۔ جب قرآنِ مجید سے یہ ثابت ہو گیا کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ نبوت میں الفاظ و کلماتِ قرآن کریم کی تلاوت ہے اسی طرح اس کے

معانی ومطالب کا بیان بھی فرائضِ رسالت میں داخل ہے تو اب لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ جس طرح متنِ قرآن حجت ہے اسی طرح اس کی نبوی تشریح بھی حجت ہے ورنہ قرآن کا آپ کو معلمِ کتاب کہنا اور کتاب کی تعلیم کو آپ کا فرضِ رسالت قرار دینا بالکل بے معنی ہوگا۔ جب قرآن سے حضور علیہ السلام کا معلّم اور شارح ہونا ثابت ہوگیا تو جو شخص آپ کی رسالت پر ایمان رکھتا ہے اس کو بھی یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ جیسے حضور علیہ السلام نے متنِ قرآن کی تلاوت وتبلیغ کی۔ اسی طرح آپ نے قرآن کے مطالب ومعانی بھی بیان فرمائے۔ پھر جب قرآنِ کریم اللہ کی آخری کتاب ہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم آخری نبی تو نہ اب کوئی کتاب آسکتی ہے اور نہ کوئی دوسرا نبی اور اس آخری کتاب کا اس کے نزول کے وقت سے رہتی دنیا تک باقی رہنا ضروری ہے۔ جب اس کی بقا ضروری ہے تو قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے حضور علیہ السلام کی قولی وفعلی تشریحات وتوضیحات کا بھی ہر دور اور ہر زمانہ میں منقول ومتداول اور موجود رہنا ضروری ہے۔

الغرض ان دو نصوصِ قرآنیہ سے ثابت ہوا کہ (۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے شارح ہیں ۲۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جس طرح متنِ قرآن کی تبلیغ کی اسی طرح آپ نے قرآنِ مجید کے مطالب ومعانی بھی بیان فرمائے ۳۔ جب قرآنِ کریم کو باقی رہنا ضروری ہے تو حضور علیہ السلام کی تشریح کا باقی رہنا بھی ضروری ہے ۴۔ جب قرآنِ مجید کی دین میں حجت یقینی ہے تو قرآنِ حکیم کی شرح بھی دین میں حجت ضروری ہے اور قرآنِ حکیم کے ساتھ اس کی شرح (حدیث) کو ماننا بھی ضروری ہے۔

تعلیمِ حکمت

اب آیۂ زیرِ غور کے دوسرے ٹکڑے پر غور کیجیے۔ تعلیمِ قرآن کے ساتھ تعلیمِ حکمت بھی حضور علیہ السلام کا ایک فریضہ بتایا گیا ہے یعنی جس طرح قرآنِ کریم کے مفہوم ومطالب کو بیان کرنا حضور علیہ السلام کا فرضِ نبوّت ہے۔ اسی طرح حکمت کی تعلیم دینا بھی آپ کا فرض ہے۔ یہ حکمت کیا ہے؟ قرآن بتاتا ہے کہ حکمت ایک ایسی چیز ہے جو اللہ نے قرآن شریف کے علاوہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے:۔

۱۔ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا	اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی اور حکمت بھی نازل کی اور سکھا دیا تم کو وہ جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر تو اللہ کا بڑا فضل ہے۔
۲۔ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُنَّ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ	یاد کرو اس کو جس کی تلاوت ہوتی ہے تمہارے گھروں میں آیتیں اور حکمت

ان دونوں آیتوں سے واضح ہوا کہ جس طرح حضور علیہ السلام پر قرآن نازل ہوا اسی طرح اللہ نے آپ پر حکمت بھی نازل کی۔ اب یہ حکمت کیا ہے؟ جو ازواجِ مطہرات کے گھروں میں قرآنی آیتوں کے علاوہ پڑھی جاتی تھی؟ وہ کیا چیز تھی جو حضور علیہ السلام ان کو قرآن کے علاوہ سناتے تھے؟ یہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور سنت تھی۔ یعنی قرآن کی تشریح فرمانے کے ضمن میں حکمت و دانائی کی وہ باتیں جو الفاظِ قرآن کے علاوہ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس یا فعل و عمل سے ظاہر ہوئیں وہی حدیث اور سنّت ہے اور اسی کو قرآن نے حکمت سے موسوم کیا ہے اور چونکہ اس آیت سے حکمت کے یاد رکھنے کا وجوب بھی ثابت ہوا۔ پھر یاد رکھنے سے اصل مقصود ہی عمل ہے تو سنت و حدیث پر عمل کا واجب و مامور ہونا بھی ثابت ہوا اور جب سنت ہی کا دوسرا نام حکمت ہے اور حکمت منزّل من اللہ ہے تو اس سے سنّت کا منزّل من اللہ اور وحی الٰہی ہونا بھی ثابت ہوگیا۔ اسی لیے حضور سرور عالم نورِ مجسم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حکمت کو اللہ کی طرف سے دیئے جانے کی تصریح فرمائی۔

اَلَآ اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْاٰنَ وَ مِثْلَہٗ مَعَہٗ (ابوداؤد)	خبردار مجھے قرآن عطا کیا گیا اور اس کے ساتھ ایک اور چیز اس کی مثل دی گئی ہے

یہ قرآن کی مثل کیا چیز تھی؟ جس کے متعلق آپ نے فرمایا۔ "مجھے دی گئی"۔ گویا خود بخود آپ میں وہ چیز موجود نہ تھی بلکہ خدا کی طرف سے تھی۔ وہ چیز حکمت ہی تھی اور حکمت سنتِ رسول ہے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن کی جو تشریح و توضیح حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے وہ اللہ کی وحی اور اس کی ہدایت کے ماتحت ہوتی تھی۔ جب وہ اللہ کی ہدایت کے ماتحت ہوتی تھی تو پھر اس کا دین کا جزو اور مامور بہ ہونا بالکل ظاہر بات ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ جس طرح قرآنِ مجید کو ماننا ضروری ہے اسی طرح سنتِ رسول کو ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے اور سنت کے بغیر فہم قرآن ناممکن ہے۔

رسُول کا مرتبہ و مقام حقیقت یہ ہے کہ منکرینِ حدیث دراصل منصبِ نبوت و رسالت کے منکر ہیں۔ اسی لیے وہ یہ کہتے ہیں کہ رسول کا کام صرف اللہ کی وحی کو بندوں تک پہنچا دینا ہے اور بس۔ باقی رہے اس کے اقوال و اعمال، یہ دین نہیں ہیں۔ لیکن قرآن صاف لفظوں میں ان کے اس کافرانہ نظریہ کی تردید کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ رسول کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہی نہیں ہے بلکہ پیغامِ الٰہی کے معانی و مفہوم، تشریح و مطالب کو بیان کرنا بھی اس کا فرض ہے رسول صرف قاصد ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ مطاع، ہادی، امام، مربّی، حاکم، مبشر، نذیر، سراجِ منیر، صاحب حکمت، صاحب خلقِ عظیم، صاحبِ مقامِ محمود، مجتبیٰ، مصطفےٰ، مقبول، مبین، شارح، معلّم، حکَم،

مزکی، داعی الی اللہ، آمر و ناہی بھی ہوتا ہے۔

رسول کے ان اوصافِ جلیلہ پر قرآنِ مجید کی آیات شاہد ہیں جن کی تفصیل کے لیے دفتر درکار ہے تاہم چند آیاتِ قرآنیہ یہاں درج کی جاتی ہیں جو رسول کے مرتبہ و مقام کی وضاحت کے لیے کافی ہونگی۔

۱۔ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ	ہم نے جو بھی رسول بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

۱۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کو اللہ کا رسول مان لیا جائے اور بس ۲۔ پھر اطاعتِ رسول کا حکم جہاں جہاں آیا ہے بالکل مطلق ہے۔ اس میں کوئی قید نہیں ہے کہ فلاں امور میں تو رسول کی اطاعت کرو اور فلاں میں نہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسول ایک حاکمِ عام ہے۔ جو حکم بھی وہ دے مومنوں کو اس کا ماننا لازمی ہے۔

۲۔ قرآن نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت ایک عام انسان کی اطاعت کی طرح نہیں ہے جیسا کہ جاہل کفار کا خیال تھا۔ جو یہ کہتے تھے:

هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ	یہ تم جیسا بشر ہی تو ہے۔
لَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ	اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کی تو تم ضرور ٹوٹے میں رہوگے۔

۳۔ قرآن نے جاہل کفار کے اس خیال کی تردید کردی اور مومنوں کو یہ اطمینان دلایا کہ رسول کی اطاعت عام انسانوں کی اطاعت کی طرح نہیں بلکہ دراصل خدا کی اطاعت ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ	جس نے رسول کی اطاعت کی اسی نے اللہ کی اطاعت کی۔

۴۔ قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ رسول من جانب اللہ امام ہوتا ہے اور ہر اختلاف اور نزاع کی صورت میں رسول کو حکم بنانا اسی طرح ضروری ہے جس طرح خدا کو

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا	ہم نے انبیاء کو ہدایت کا امام بنایا ہے وہ ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے ہیں
۵۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ	اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اولی الامر کی جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو تو اس میں اللہ و رسول

| کی طرف رجوع کرو۔

فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا فقرہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ مسائل شرعی میں جب مسلمانوں کے درمیان اختلاف واقع ہو تو حکم ہے کہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کریں۔ اس میں خدا اور رسول دونوں کو حکم بنانے کا حکم ہے۔ اگر مرجع بالکل قرآنِ مجید ہوتا تو فردوہ الی اللہ کہنا کافی تھا لیکن اس کے ساتھ والرسول بھی کہا گیا۔ جس میں صاف وضاحت ہے کہ قرآن کے بعد رسول کا طریقہ ہی مرجع ہے اور دین کے اصلی دو جزو قرآن اور حدیث ہی ہیں۔

۶- قرآن نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو دل و جان سے ماننا اہلِ ایمان کے لیے فرض بلکہ شرطِ ایمان ہے۔ جو شخص رسول کے فیصلہ کو نہ مانے وہ بے ایمان ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ۱ع

اے رسول! تیرے رب کی قسم یہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تمام معاملات میں تمہیں حکم نہ مان لیں

۷- مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ

کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے

یہاں کسی زمانہ کی قید نہیں ہے۔ مومن و مومنہ سے صرف عہدِ نبوی کے مومن مرد و عورت مراد نہیں ہیں بلکہ قیامت تک کے مومن مراد ہیں اَمْرًا کا لفظ نہایت عام ہے جو ہر قسم کے معاملات پر حاوی ہے مطلب یہ ہے کہ ہر کام اور ہر بات میں خدا اور رسول کے فیصلہ کو تسلیم کرنا فرض ہے۔

۸- قرآن نے یہ بھی اعلان کیا کہ اللہ کی طرح اس کے رسول کو بھی ساری دنیا کی چیزوں سے محبوب رکھنا ضروری ہے۔ جو ایسا نہ کریں وہ فاسقین سے ہیں اور اللہ کی ہدایت سے محروم ہیں۔ جب اللہ اور رسول کسی کام کی دعوت دیں اور پکاریں تو اس پر لبیک کہنا ہر مومن کے لیے فرض ہے۔

اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

اگر یہ دنیا تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہے تو اللہ کے امر (عذاب) کا انتظار کرو۔

۹- اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ

اللہ اور اس کے رسول جب تمہیں آواز دیں تو فوراً لبیک کہو۔

۱۰- اور یہ بھی کہ مومن وہی ہیں جو اللہ اور رسول کے حکم پر لبیک کہتے ہیں اور اللہ و رسول دونوں کی

اطاعت کرتے ہیں۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا

ایمان والوں کو جب اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ اللہ اور رسول ان کے درمیان فیصلہ دیں تو ان کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ کہیں سمعنا و اطعنا

۱۱۔ قرآن نے یہ بھی بتایا کہ کسی شخص کی کامیابی اور فوز و فلاح کے لیے جس طرح اللہ کی اطاعت ضروری ہے۔ اسی طرح رسول کی اطاعت بھی فرض ہے۔ جس طرح اللہ کی نافرمانی گمراہی و بد بختی ہے اسی طرح رسول کی نافرمانی کا حال ہے۔

مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا

جس نے اطاعت کی اللہ کی اور اس کے رسول کی اس نے بڑی مراد کو پالیا۔

۱۲۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا

جس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔

۱۳۔ قرآن نے یہ ہدایت بھی دی ہے کہ مسلمانوں کو رسول کی نافرمانی کی کوئی بات بھی آپس میں نہیں کرنی چاہیے۔ ایک مومن کا اپنی جان پر جتنا حق ہے اس سے کہیں زیادہ اس کی جان پر نبی کا حق ہے اور اللہ کے ساتھ نبی کو راضی کرنا بھی ضروری ہے بلکہ شرطِ ایمان ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ

اے ایمان والو! جب تم چپکے چپکے بھی کوئی بات کرو تو گناہ، زیادتی، ظلم اور رسول کی نافرمانی کی کوئی بات نہ کرو۔

۱۴۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ

نبی زیادہ قریب ہے مومنوں کی جانوں سے

۱۵۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ

اللہ کے ساتھ اس کے رسول کو بھی راضی کرنا ضروری ہے۔

۱۶۔ قرآن نے ان منافقین کی مذمت بھی کی ہے جو اپنی خود غرضی اور منافقت کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں کوتاہی کرتے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ

جب ان سے کہا جاتا ہے آؤ اس کتاب کی طرف

اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا	جس کو اللہ نے نازل کیا اور رسول کی طرف آو۔ تو اسے رسول تو دیکھے گا۔ ان منافقوں کو کہ اعراض کرتے ہیں تیری طرف سے

اس آیت میں رسول کی اطاعت کا جس طرح حکم دیا گیا ہے وہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ رسول کی اطاعت مستقل طور پر فرض ہے۔ دیکھئے مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ تو کتاب ہے لیکن وَاِلَى الرسول یہ کتاب نہیں ہے یہ تو رسول کی مستقل طور پر اطاعت کا حکم ہے۔

۱۷۔ قرآن نے یہ بھی اعلان کیا کہ کفار دوزخ میں ڈالے جانے کے بعد جس طرح اللہ کی نافرمانی پر کف افسوس ملیں گے اسی طرح رسول کی نافرمانی پر بھی افسوس کریں گے۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِى النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا (احزاب)	جس دن ان کے منہ الٹ الٹ کر آگ میں تلے جائیں گے تو کہتے ہوں گے ہائے کسی طرح ہم نے اللہ کا حکم مانا ہوتا اور رسول کا حکم مانا ہوتا

اگر رسول کی اطاعت ایک مستقل اطاعت نہیں تھی تو پھر اللہ اور رسول کی اطاعت کو علیحدہ علیحدہ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

۱۸۔ قرآن نے یہ بھی بتایا کہ رسول کی اطاعت غیر مشروط اور غیر محدود طور پر ہے۔ اس میں کسی زمانہ کی قید نہیں ہے اور رسول مستقل طور پر خدا کی طرح مطاع ہے۔ فرق یہ ہے کہ رسول کی اطاعت خدا ہی کے حکم اور اذن سے کی جاتی ہے۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ	اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی۔

یہاں اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کو اَطِيْعُوا اللّٰهَ سے ایک مستقل جملہ کی شکل میں لایا گیا ہے جس سے اس امر کی وضاحت مقصود ہے کہ رسول کی اطاعت بھی مستقل طور پر فرض ہے اور اگر اس کا یہ مطلب ہوتا کہ بس رسول جو کتاب لائے ہیں اس کو مانا جائے تو صرف اطیعوا اللہ کہنا ہی کافی تھا۔ اطیعوا الرسول کے اضافہ کی ضرورت نہ تھی۔

۱۹۔ قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ رسول کی مستقل طور پر اطاعت اس لیے ضروری ہے کہ رسول جو کچھ کہتا ہے وہ خدا کی ہدایت اور اس کی وحی کے ماتحت کہتا ہے۔ وہ اپنے نفس کی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتا۔ اس لیے تم کو مطمئن ہو جانا چاہیئے کہ رسول کی پیروی میں کسی قسم کی گمراہی اور غلط روی کا خطرہ نہیں ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى

تمہارے صاحب (محمد) نہ گمراہ ہوئے اور نہ کج رو۔ وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے (وہ جو کچھ کہتے ہیں وحی سے کہتے ہیں جو ان پر کی جاتی ہے

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى میں ھو کی ضمیر نطقِ رسول کی طرف لوٹتی ہے جس کا ذکر مَا يَنْطِقُ میں کیا گیا ہے۔ اس آیت میں کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے کہ نطقِ رسول کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص کیا جائے۔ یہاں تو ہر بات کو وحی الٰہی قرار دیا گیا ہے جس پر نطقِ رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول کا نطق (بولنا) خالص وحی سے ہوتا ہے اور اس میں رسول کی خواہش کو قطعاً دخل نہیں ہوتا۔

قرآن نے یہ تصریح اس لیے کی ہے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ (دین سے متعلق) رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر کسی ایک بات میں بھی شبہ ہو جائے کہ رسول خواہشِ نفس سے بولتا ہے اور اس کا نطق خدا کی وحی سے نہیں ہے تو پھر تو رسالت پر سے اعتماد اُٹھ جائے گا۔ اس لیے قرآن نے وضاحت کر دی کہ رسول کا نطق وحی الٰہی سے ہے۔ اس کی زبان سے جو نکلتا ہے خاص خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہی بات حضور علیہ السلام نے خود اپنی زبانِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمائی۔

فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّا حَقًّا

(بخاری)

مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس سے جو کچھ نکلتا ہے۔ حق ہی نکلتا ہے۔

۲۰۔ قرآن نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ اللہ کا اپنے نبی سے عارضی اور وقتی تعلق نہیں ہوتا کہ جب کبھی اس کو اپنے بندوں تک کوئی پیغام پہنچانا ہو اسی وقت یہ تعلق قائم ہو اور اس کے بعد منقطع ہو جائے بلکہ اللہ کا اپنے نبی سے دائمی تعلق ہوتا ہے چنانچہ ذیل کی آیت۔ اس امر پر دال ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ

اے محبوب! اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ تم کو راہِ راست سے ہٹا دینے کا ارادہ کر ہی چکا تھا۔ مگر وہ خود اپنے آپ کو گمراہ کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے اور تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے (کیونکہ) اللہ نے تم پر کتاب

مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا ۝ | اتاری اور حکمت نازل کی اور تمہیں وہ سب کچھ سکھادیا جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

اس آیہ مبارکہ میں تصریح کر دی گئی کہ حضور علیہ السلام کا نگران اللہ تعالےٰ ہے۔ فضلِ الٰہی ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا ہے اور اللہ تعالےٰ دائمی طور پر آپ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اس لیے حضور علیہ السلام کے تمام اقوال وافعال اللہ تعالےٰ کی رضا کے مطابق ہوتے ہیں۔ اسی مضمون کو اس آیہ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ | اللہ تعالےٰ تم کو لوگوں کی دست بُرد سے بچائیگا۔

اس آیہ کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ جسمِ نبوی کو دشمنوں سے محفوظ رکھا جائیگا۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا وجودِ مبارک اللہ کی حفاظت میں ہے۔ اس لیے نبی کی آنکھیں اور اس کی زبان حق دیکھتی اور حق ہی کہتی ہے اور نبی دین سے متعلق جو کچھ فرماتا ہے۔ وہ منشاء ایزدی کی ترجمانی ہوتی ہے ان آیاتِ قرآنیہ نے بتا دیا کہ نبی صرف پیامبر ہی نہیں ہوتا بلکہ آمر وناہی بھی ہوتا ہے اور وہ اپنے قول وعمل سے نازل شدہ کتاب کے احکام کی جو تفسیر وتشریح اور توضیح فرماتا ہے وہ اللہ تعالےٰ کی منشا کی ترجمانی ہوتی ہے اور دین سے متعلق رسول کا قول وعمل قرآن کی طرح غیر مُبدّل اور واجب العمل ہوتا ہے۔

وحی متلو وغیر متلوء

مُنکرینِ حدیث یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل کی وہ قرآن میں بند ہے۔ قرآنِ مجید کے علاوہ آپ پر کوئی اور وحی نازل ہی نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا صرف قرآن واجب العمل ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال دین اور شریعت نہیں ہیں۔ لیکن ان کا ایسا کہنا عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے۔

اصطلاحِ شریعت میں وحی ان مطالب ومعارف کا نام ہے جو اللہ کی طرف سے انبیاء کرام پر نازل ہوتے ہیں۔ بنیادی حیثیت سے وحی کی تین قسمیں ہیں۔ براہ راست بلا واسطہ خطاب جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا۔ دوسرے فرشتے کے واسطہ سے کلام جیسا کہ نزولِ قرآن کے باب میں ہوا۔ تیسرے ان دونوں طریقوں سے ہٹ کر مطالب واحکام کا قلبِ رسول پر نزول۔ یہ تیسری قسم ہی وہ ہے جس کی روشنی میں حضور سیدِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے دین کے بیشمار امور کی تفصیلی ہیئت وشکل متعین کی اور قرآن کے اجمال کو اس طرح مفصل کر دیا کہ اس کی تسلیم شرطِ ایمان ٹھہری۔ مُنکرینِ حدیث اسی تیسری قسم کی وحی کو تسلیم نہیں کرتے اور دین کو قرآن تک محدود کر دینے کی غرض سے نہ صرف اس کا انکار ہی کر رہے ہیں بلکہ

اس کے خلاف منظم مہم چلا رہے ہیں - یہ لوگ اتنی سی بات نہیں سمجھ پاتے کہ جو قادر و قدیر خدا ہر شئے پر قادر ہے اور نہ صرف گنہگار انسانوں بلکہ جانوروں تک صحیح خیالات اور درست فیصلوں کا الہام کرتا رہتا ہے اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ وہ جیسے چاہے قرآن کے علاوہ بھی اپنے رسول کو خصوصی رہنمائی عطا فرمائے اور قرآن کے اجمال و ابہام کی صحیح ترین تفصیلات معین کرنے کے لیے اپنے رسول پر محفوظ و معصوم افکار وہدایات کسی طرح بھی نازل فرمائے - اسی ربانی رہنمائی کو وحی غیر متلو سے موسوم کیا جاتا ہے (یعنی وہ وحی جو قرآن کے علاوہ حضور علیہ السلام پر آئی) اور یہ وحی غیر متلو صحت میں قرآن سے کم نہیں ہے - اسی لیے قرآن نے کہا کہ رسول جس سے روکے رُک جاؤ - جس کا حکم دے اس کو مان لو - گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہر وہ بات جو آپ نے دین سے متعلق فرمائی - قرآن ہی کے حکم سے واجب القبول ہے - ظاہر ہے کہ قرآن یہ حکم اسی وقت دے سکتا ہے جب کہ رسول کریم کے امر و نہی میں قطعاً غلطی کا شائبہ بھی نہ ہو - سورہ نحل کی ذیل کی آیت پر غور کیجئے -

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۵	اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو الہام کیا کہ پہاڑوں درختوں اور ان جگہوں میں جہاں لوگ چھت بناتے ہیں گھر بنائے -

غور کیجئے کیا اللہ عزوجل نے شہد کی مکھیوں سے براہِ راست کلام کیا ہوگا یا فرشتہ کے ذریعہ کہلوایا ہوگا - ظاہر ہے یہاں ان دونوں صورتوں میں سے کوئی سی بھی صورت واقع نہیں ہوئی بلکہ یہاں وہ وحی مراد ہے جو اللہ عزوجل شعور و ادراک پر بلاواسطہ الفاظ وارد فرماتا ہے - یہ وحی مکھی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انسان وحیوان کے صدہا امور ایسے ہیں جو اس کے ذیل میں آتے ہیں - بس جس اللہ نے مکھی تک کو سے نوازا اس کے لیے آخر کیا دشوار ہے کہ اپنے آخری نبی کے قلب و ادراک پر وقتاً فوقتاً بلاواسطہ الفاظ مطالب خاصہ و معارفِ معنویہ کا نزول فرماتا رہے - چنانچہ یہ مسئلہ صرف عقلی نہیں ہے بلکہ خود قرآن کی نصوص اس کی تائید و توثیق کرتی ہیں - ملاحظہ کیجئے - سورہ توبہ میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو منافقین کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے ان لفظوں میں منع فرمایا گیا ہے -

۱- وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا	ان میں سے جو کوئی مرے آپ کبھی ان کی نمازِ جنازہ نہ پڑھیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے نماز جنازہ شروع ہو چکی تھی اور حضور علیہ السلام منافق کی نمازِ جنازہ بھی پڑھا دیتے تھے - حالانکہ قرآن میں اس سے پہلے نازل ہونے والی ایسی کوئی

آیت نہیں ہے جس میں حضور علیہ السلام کو نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہو۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ نمازِ جنازہ کا حکم اس وحی سے تھا جو قرآن کے علاوہ تھی۔

۲- اسی طرح جمعہ کے خطبہ کو لے لیجئے جو ایک دینی عمل اور شرعی حکم ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم خود خطبہ دیا کرتے تھے اور امت میں اسی طرح آج تک جاری ہے۔ سورہ جمعہ میں شکایت کے ضمن میں اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا

جب یہ تجارت یا کھیل کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور آپ کو تنہا چھوڑ جاتے ہیں

حالانکہ کوئی قرآنی آیت نہیں دکھائی دیتی جس میں اس خطبہ کا حکم ہو۔ پس لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا حکم اس وحی کے ذریعہ ملا جو قرآن کے علاوہ تھی۔

۳- علی ہذا اذان کو لیجئے نماز سے پہلے اذان دی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک دینی عمل ہے۔ سورہ جمعہ اور مائدہ میں بطور حکایت اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

۴- وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا

جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو یہ منافق اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

۵- حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پہلے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے۔ بیت المقدس کے قبلہ ہونے کے متعلق قرآنِ حکیم میں کوئی حکم موجود نہیں مگر جب اس قبلہ کو منسوخ کر کے بیت الحرام کعبہ کو قبلہ بنایا گیا تو ارشاد ہوا۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ

جس قبلہ پر آپ تھے اس کو ہم نے صرف اس لیے مقرر کیا تھا کہ رسول کا اتباع کرنے والے اور اتباع سے منہ موڑنے والوں کے درمیان امتیاز ہو جائے

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے جو بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا وہ اللہ کی وحی کی بنا پر تھا۔

۶- جنگِ اُحد کے موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مسلمانوں سے فرمایا۔ اللہ تمہاری مدد کے لیے فرشتے بھیجے گا۔ بعد میں اللہ تعالےٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا ذکر قرآن میں اس طرح فرمایا۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ

اللہ نے اس وعدے کو تمہارے لیے خوشخبری بنایا ہے

ثابت ہوا حضور علیہ السلام نے جب مسلمانوں کو فرشتوں کی امداد کی اطلاع دی تھی وہ اس وحی

(غیر متلو) سے تھی۔ جس کا ذکر قرآن نے بعد میں کیا۔

۵۔ جنگِ اُحد کے بعد حضور علیہ السلام نے غزوۂ بدر ثانیہ کے لیے لوگوں کو نکلنے کا حکم دیا۔ جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں نہیں ہے مگر اللہ نے بعد میں تصدیق کی۔ یہ بھی اسی کی جانب سے تھا۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَھُمُ الْقَرْحُ | جن افراد نے زخم کھانے کے بعد اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو مانا۔

۶۔ حضور علیہ السلام نے صدقات تقسیم کیے۔ اس پر منافقین نے اعتراضات کیے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ظالمو! رسول کے فعل پر اعتراض کرتے ہو۔ حالانکہ یہ تقسیم جو رسول نے کی اللہ کے حکم سے کی تھی اور فرمایا۔

وَلَوْ اَنَّھُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ | اگر وہ راضی ہو جاتے اس حصہ پر جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا۔

۷۔ اسی طرح صلح حدیبیہ کا واقعہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔ تمام صحابہ کرام نے صلح نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا اور صلح کی شرائط ہر ایک کو نہایت دبی ہوئی نظر آتی تھیں مگر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں شرائط کو جو کفار نے مقرر کی تھیں قبول فرمالیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ تصدیق فرمائی۔ یہ صلح اللہ کی ہدایت کے ماتحت تھی۔ جس کو صحابہ کرام نہ سمجھ سکے۔ قرآن نے اعلان کیا۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا | اے رسول ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عطا کی

۸۔ حضور سرور دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک زوجہ مطہرہ حضرت حفصہ سے ایک راز کی بات فرمائی اور اس کے اظہار سے منع فرمایا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان سے اس راز کا افشا ہو گیا۔ حضور علیہ السلام نے اپنی زوجہ مطہرہ سے راز افشا کرنے کا تذکرہ فرمایا۔ حضرت حفصہ نے عرض کی۔ حضور مَنْ اَنْۢبَاَكَ آپ کو کس نے خبر دی کہ مجھ سے آپ کا راز افشا ہو گیا۔ حضور علیہ السلام نے فوراً جواب دیا۔ اَنْۢبَاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ (قرآن) مجھے میرے علیم و خبیر رب نے بتایا ہے۔ (کہ تم سے میرا راز افشا ہو گیا ہے) یہ اور اس قسم کی اور بھی متعدد آیات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو یقیناً قرآن کے علاوہ بھی وحی ہوتی تھی اور حضور علیہ السلام دین سے متعلق جو ہدایات فرماتے تھے اور اصول قرآنی کی اپنے قول و عمل سے جو توضیح و تشریح فرماتے تھے وہ بھی وحی ہی سے ہوتی تھی۔ نماز ہی کو لیجیے۔ قرآنِ مجید صرف اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ نماز کا طریقہ اس کے آداب و فرائض بیان نہیں کرتا۔ اب یہ امور کس سے معلوم کیے جائیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ | جیسے میں نماز پڑھوں ایسے ہی تم پڑھو

ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز کا یہ طریقہ معاذ اللہ اپنے جی سے نہیں گڑھ لیا تھا۔ بلکہ اسی وحی کے ذریعے متعین فرمایا تھا جو آپ پر قرآن کے علاوہ نازل ہوتی تھی۔ نماز کی تو یہ صرف ایک مثال ہے۔ آپ عقائد، معاملات، حرام و حلال، نکاح و طلاق۔ غرضکہ دنیا کے کسی بھی معاملہ کو لے لیجئے، ان کے سمجھنے اور ان کے تفصیلی احکامات جاننے کا مرکز حضور اکرم کی ذاتِ اقدس بنتی ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے اپنے قول و عمل سے قرآن کے اصولی احکام کی توضیح اور اس کے جزئیات کی جو تعیین فرمائی وہ اسی وحی سے فرمائی جو آپ پر قرآن کے علاوہ نازل ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر دین کو سمجھنے کے لیے احادیث نبوی کو قابلِ اعتبار نہ سمجھا جائے تو خود بہت سی آیات کا مفہوم و مطلب مبہم بلکہ بڑی حد تک تشنہ رہ جاتا ہے۔ چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۔ قرآن میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا حکم ہے۔ مگر کیا صرف قرآنِ مجید سے ان عبادات کے تفصیلی احکام معلوم ہوسکتے ہیں اور آدمی ان احکاماتِ قرآنیہ پر اللہ تعالیٰ کی منشار کے مطابق عمل کرسکتا ہے؟

۲۔ قرآنِ کریم میں طیب چیزوں کے کھانے کا اصولی حکم دیا گیا ہے۔ کیا صرف قرآنِ مجید سے حلال و حرام کی تفصیل معلوم کی جاسکتی ہے؟ اگر کہا جائے کہ ہم خود اپنی عقل و فہم سے حرام و حلال کی فہرست بنالیں گے تو کیا جن چیزوں کو ہم حلال یا حرام قرار دیں گے ان کے متعلق ہمیں یقین بھی ہوجائیگا کہ اللہ کے نزدیک بھی ان اشیار کا یہی حکم ہے۔

۳۔ قرآن میں ہے فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا | پھر جب زید اس عورت سے اپنی غرض پوری کر چکے تو پھر ہم نے اس کو تمہارے نکاح میں دیدیا۔

دیکھئے یہ قرآن شریف کی آیت ہے مگر کیا صرف قرآن مجید سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ زید کون تھے اور یہ عورت کون تھی۔ لامحالہ یہ بات روایات سے ہی معلوم ہوگی یا مثلاً ارشاد ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى | تیوری چڑھائی اور منہ موڑا جب اس کے پاس ایک نابینا آیا۔

کیا صرف قرآن شریف سے یہ بتایا جا سکتا ہے کہ یہ نابینا کون تھے اور اصل واقعہ کیا تھا۔ اسی طرح سورہ توبہ کی آیت کو لیجئے۔ اس میں ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ | اگر تم رسول کی مدد نہیں کروگے تو اس کی مدد کی ہے اللہ نے جب کافروں نے ان کو نکالا

هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ | جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر

کیا صرف قرآنِ مجید سے معلوم ہوسکتا ہے کہ حضور علیہ السلام کو کافروں نے کہاں سے نکالا تھا نیز یہ رفیقِ غار کون تھے اور کس غار میں آپ رفیق کے ساتھ روپوش ہوتے تھے۔

۴- وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ (توبہ) | اللہ نے بہت سے میدانوں میں تمہاری مدد کی

کیا روایات کے انکار کرنے کے بعد ان بہت سے میدانوں کی تفصیل معلوم ہوسکتی ہے؟

۵- وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا (توبہ) | اللہ کی مہربانی ہوئی ان تینوں پر جن کے معاملہ کو ملتوی رکھا گیا۔

یہ تین شخص کون تھے۔ ان کا معاملہ کیا تھا اور کیوں ملتوی رکھا گیا۔ کیا روایات کے بغیر یہ باتیں حل ہوسکتی ہیں ۶- اسی سورہ توبہ کی اس آیت پر غور کیجیے۔ ارشاد ہے۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ ۔ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا | جس مسجد کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی۔ اوّل دن ہی سے یہ مسجد لائق ہے کہ آپ اس میں نماز پڑھیں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو طہارت کو پسند کرتے ہیں۔

یہ کس مسجد کا ذکر ہے۔ وہ کون لوگ ہیں جن کی اس آیت میں مدح ہے۔ ان کی طہارت پسندی کا خاص معیار کیا تھا۔ جس کو اس آیت میں سراہا گیا ہے۔ کیا ان امور کا جواب صرف قرآن سے مل سکتا ہے۔

۷- اسی طرح سورۃ انفال کی آیت کو لیجیے۔

وَاِذْ یَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَكُمْ | اور جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک تمہارے قبضہ میں آجائے گی۔

کیا صرف قرآن سے بتلایا جاسکتا ہے کہ یہ دو جماعتیں کون تھیں؟ اور یہ وعدہ کیا تھا۔ قرآن میں تو ہے نہیں۔ تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ کوئی دوسری قسم کی وحی بھی ہوتی تھی۔ اس قسم کی اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں جو بوجہ اختصار چھوڑی جارہی ہیں۔ ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کے احکام معلوم کرنے اور قرآن کو سمجھنے سمجھانے کے لیے روایات و احادیث کا دامن تھامنا ناگزیر ہے

صحابہ کرام کا سنّتِ نبوی سے استدلال وامتثال

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام وخلفاء راشدین نے اپنے ہر عمل وحرکت کا محور ہی

ذاتِ نبوی کو قرار دیا اور ہر مسئلہ اور ہر فیصلہ کا مدار حضور علیہ السلام کے ارشادات کو رکھا۔ اس سلسلہ میں اگر وہ تمام واقعات پیش کیے جائیں تو اس کے لیے دفتر درکار ہے۔ دو ایک واقعات بطور مثال پیش کر کے ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو جب قرآنِ مجید سے کسی قضیہ کا فیصلہ نہ ملتا تو آپ سنت ہی سے فیصلہ فرماتے تھے۔ پھر اگر اس معاملہ میں ان کو سنت یاد نہ ہوتی تو صحابہ کرام سے کہا کرتے تھے کہ تم کو معلوم ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں کوئی فیصلہ دیا ہو۔ جب صحابہ میں سے کوئی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فیصلہ بتا دیتے تو اس پر حضرت صدیق اکبر فرماتے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْنَا مَنْ یَّحْفَظُ عَنْ نَبِیِّنَا (تاریخ الخلفاء مصری ص۳۱)

خدا کا شکر ہے جس نے ہم میں ایسے لوگ بھی بنائے ہیں جو ہمارے نبی کی باتیں یاد رکھتے ہیں۔

۲۔ صحابہ کرام کو سب سے پہلی مشکل حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے جانشین کے متعلق پیش آئی کہ حضور علیہ السلام کا جانشین کس کو مقرر کیا جائے۔ اس مسئلہ کا حل بھی صحابہ نے سنتِ نبوی میں تلاش کیا۔ حضرت علی نے فرمایا کہ جب خود حضور علیہ السلام نے صدیق اکبر کو نماز کے لیے امام مقرر فرمایا تو جس کو آپ نے ہمارے دین کے لیے پسند کیا ہم نے اس کو اپنی دنیا کے لیے بھی پسند کر لیا۔ (طبقات ابن سعد)

۳۔ وصالِ نبوی کے بعد دوسرا مرحلہ حضور علیہ السلام کے دفن کا تھا۔ جب صحابہ کرام میں اختلافِ آرار ہوا تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کہا کہ میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ ہر نبی اپنی اسی خوابگاہ میں دفن ہوتا ہے جہاں اس کی وفات ہوتی ہے۔ یہ حدیث سُن کر سب اختلافات ختم ہو گئے اور صحابہ کرام نے اپنی ذاتی آرار کو حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آگے جھکا دیا۔

۴۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے قرآن کو یکجا کرنے کا مشورہ دیا تو جناب صدیق اکبر نے فرمایا۔

کَیْفَ اَفْعَلُ شَیْئًا لَّمْ یَفْعَلْہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

میں وہ کام کیسے کروں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔

یہی جواب دیگر صحابہ نے دیا۔ حتیٰ کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا شرح صدر ہوا اور آپ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے مشورہ کو مان لیا۔ اس واقعہ سے اتنا ثابت ہوا کہ صحابہ کرام ہر اقدام سے پہلے سنت رسول تلاش کرتے تھے۔

۵۔ سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا نے میراث طلب کی تو حضرت صدیق اکبر نے فرمایا۔ میں نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ اِنَّ النَّبِیَّ لَا یُوْرِثُ نبی کسی کو اپنے متروکات میں وارث

نہیں بناتے اس کے بعد فرمایا۔

فَاِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ تَرَکْتُ شَیْئًا مِنْ اَمْرِہٖ اَنْ اَزِیْغَ (مسند احمد جلد ۱ ص ۲۷۔ بیہقی جلد ۱ ص ۳۰۱)	میں ڈرتا ہوں کہ آپ کے حکم میں سے کسی کو چھوڑ دوں گا تو بھٹک جاؤں گا۔

نہ صرف یہ بلکہ یہاں تک فرمایا۔

لستُ تارکا شیئاً کان رسولَ اللہ صلی اللہُ علیہ وسلّم یعمل بہٖ الا عملتہ (مسند احمد جلد ۱ ص ۲۷ منتخب کنز العمال جلد ۳ ص ۱۲۸)	میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعمالِ شریفہ سے کوئی عمل ایسا نہ چھوڑوں گا

دیکھیے خلیفہ راشد سیدنا امیر المومنین صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے جو مرکز ملّت بھی تھے، قضیہ وراثت میں سنت نبویہ سے فیصلہ فرمایا اور قرآنِ مجید کی آیتِ میراث سے میراثِ نبی کو مستثنیٰ قرار دیا اور سنت پر عمل کر کے یہ بتا دیا کہ قرآنِ مجید میں میراث کا حکم عام مسلمانوں کے لیے ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں ہے اور یہ کہ اصولِ قرآن کی توضیح وتشریح صرف سنتِ رسول علیہ السلام ہی سے ہو سکتی ہے۔

۶۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ماتحتی میں ایک لشکر شام کی مہم پر بھیجنے کا حکم فرمایا تھا کہ آپ کا وصال ہوگیا اور حالات بدل گئے۔ قبائلِ عرب مرتد ہونے لگے جو منافق تھے وہ سازشوں میں مصروف ہوگئے۔ اجلہ صحابہ کرام کی رائے یہ ہوئی کہ ایسے نازک اور پُرفتن موقع پر مرکزِ اسلام مدینہ منورہ سے لشکر کو علیحدہ کرنا اور مرکز کو خالی کر دینا قرینِ مصلحت نہیں ہے۔ اس وقت تو مدینہ منورہ دار الخلافہ کو ہر طرح مضبوط رکھنے کی ضرورت ہے۔ جب باہر کے حالات سازگار ہو جائیں تب اس لشکر کی روانگی عمل میں لائی جائے۔ لیکن سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ حالات ناسازگار ہیں مگر ماحول کے پُرفتن دباؤ کے باوجود لشکرِ اسامہ ضرور روانہ ہوگا اور اس لیے روانہ ہوگا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہے۔ انفذوا جیش اسامہ۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پُرجوش لہجہ میں مزید فرمایا۔ "بخدا اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ اس لشکر کے روانہ کر دینے کی بنا پر مرکز کمزور ہو جائے گا اور درندے مجھے کھا جائیں گے تو بھی حکمِ نبوی علیہ السلام کی تعمیل ضرور کروں گا۔"

اِنَّمَا اَنَا مُنَفِّذٌ لِاَمْرٍ اَمَرَ بِہٖ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (منتخب کنز العمال جلد ۴ ص ۱۸۴)	کیونکہ میں اپنا حکم نہیں بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم نافذ کر رہا ہوں۔

دیکھیے ماحول کا تقاضا تھا کہ لشکرِ اسلام مرکز کی مضبوطی کے لیے مدینہ میں موجود رہے۔ اجلہ صحابہ کی

رائے بھی یہی تھی مگر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حکمِ نبوی (حدیث) میں ذرا بھی ردوبدل نہ کیا۔

غرضکہ اس نوع کے ایک نہیں سینکڑوں واقعات ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خلفاء اربعہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالٰی اجمعین نے ہر موقع اور محل پر سنتِ نبوی کو مشعلِ راہ بنایا اور ہر حادثہ اور ہر معاملہ میں سنت رسول سے ہدایت حاصل کی۔ بلکہ سُنتِ رسول کے مطابق کاروبارِ خلافت انجام دینے کی شرط پر بیعت تک کی۔ جب سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ تعالٰی عنہ سے بیعت ہوئی تو صحابہ کرام نے بایں لفظ بیعت کی۔

نُبَايِعُكَ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ وَ سُنَّتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ سُنَّةِ الْخَلِيْفَتَيْنِ

ہم آپ کے ہاتھ پر اس شرط پر بیعت کرتے ہیں کہ آپ کتاب اللہ، سنتِ رسول اور دونوں سابق خلیفوں کے طرزِ عمل پر بیعت کریں گے۔

قرآنِ کریم نے انہیں صحابہ کرام کے راستہ پر چلنے کا حکم دیا اور فرمایا۔

مَنْ يَّتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا

جو مومنین (صحابہ کرام) کے راستہ سے الگ راستہ اختیار کرے تو ہم اسی راستے پر چلنے دیں گے اور انجام کار اس کو جہنم میں داخل کریں گے جو بُرا ٹھکانہ ہے۔

اس آیت میں مومنین سے مراد یقیناً صحابہ کرام ہیں۔ انہیں کے راستہ پر چلنے کی قرآنِ کریم تاکید کر رہا ہے اور ان کے خلاف چلنے والے کو جہنمی قرار دے رہا ہے اور سبیلِ صحابہ یہی ہے کہ وہ سُنّت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دین جانتے تھے اور اخلاق وعبادات ومعاملات غرضکہ دین ودنیا کے ہر مسئلہ اور ہر حادثہ میں سنتِ نبوی کا اتباع کرتے تھے اور قرآنی اصول کی جزئیات سنتِ نبویہ سے متعین کر کے اس پر عمل کرتے تھے اور سُنتِ نبویہ میں ذرا بھی ردّو بدل گوارا نہ کرتے تھے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

جمع وتدوینِ حدیث

اس موضوع پر میں نے ابتداءً ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ مگر چونکہ اب اس موضوع پر مستقل کتابیں منظرِ عام پر آگئی ہیں۔ اس لیے بنظرِ اختصار اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

منکرینِ حدیث جمع وتدوینِ حدیث کے سلسلے میں سب سے بڑا مغالطہ یہ دیتے ہیں کہ حدیث کی موجودہ کتابیں دوسری اور تیسری صدی میں تصنیف ہوئی ہیں اور جامعینِ حدیث نے سنی سنائی باتوں کو جمع کر دیا ہے۔ اب یہ کیسے مان لیا جائے کہ اتنے طویل عرصہ کے بعد جو باتیں جمع کر کے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی

کی طرف منسوب کردی گئی ہیں ۔ وہ حضور علیہ السلام ہی کی فرمودہ ہیں ۔ خصوصًا ایسی صورت میں جب کہ خود رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی کتابت سے صحابہ کو منع فرمادیا تھا ۔ لیکن ان کا یہ دعوٰے صحیح نہیں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ کتابت حدیث کا رواج عہد نبوی ہی میں شروع ہوچکا تھا اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے قولاً و فعلاً اس میں حصہ لیا ہے اور حفظ وضبط و کتابتِ حدیث کا اہتمام عہدِ نبوی و عہد صحابہ و تابعین تمام ادوار میں جاری رہا ہے ۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے ۔

حدیث کی تبلیغ کا حکم

حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کو تاکیدی حکم تھا کہ جو لوگ میری مجلس میں حاضر ہوں وہ میری حدیثیں خوب اچھی طرح یاد کریں اور بجنسہٖ دوسروں تک پہنچائیں ۔

رَحِمَ اللّٰہُ عَبْدًا سَمِعَ کَلَامِی فَوَعٰھَا ثُمَّ اَدَّاھَا کَمَا سَمِعَھَا

اللہ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے میرا کلام سُنا اور دوسروں تک پہنچایا ۔

نَضَّرَ اللّٰہُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِیْثًا فَحَفِظَہٗ وَبَلَّغَہٗ غَیْرَہٗ

اور اس شخص کے چہرہ کو روشن رکھے جو ہم سے حدیث سُن کر یاد رکھے اور دوسروں تک پہنچا دے ۔

مَنْ حَفِظَ مِنْ اُمَّتِیْ اَرْبَعِیْنَ حَدِیْثًا مِنَ السُّنَّۃِ حَتّٰی یُؤَدِّیَھَا اِلَیْھِمْ کُنْتُ لَہٗ شَھِیْدًا وَشَفِیْعًا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ

میرا جو امتی چالیس حدیثیں یاد رکھے اور ان کو تبلیغ کرے ۔ قیامت کے دن میں اس کے ایمان کی شہادت دوں گا اور اس کی شفاعت کروں گا ۔

(جامع بیان العلم)

بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ کَانَ اٰیَۃً ۔ وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ (بخاری)

مجھ سے جو کچھ سُنو اس کو دوسروں کو پہنچا دو ۔ جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا اس کی جگہ جہنم ہے ۔ (بخاری)

حَدِّثُوْا عَنِّیْ بِمَا تَسْمَعُوْنَ وَلَا تَقُوْلُوْا اِلَّا حَقًّا ۔ وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ بُنِیَ لَہٗ بَیْتٌ فِیْ جَھَنَّمَ یُوْقَعُ فِیْہِ (طبرانی)

جو کچھ مجھ سے سنو عوام تک پہنچا دو اور سچ کہو جو مجھ پر جھوٹ باندھے گا اس کا مقام جہنم ہے ۔

تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا کِتَابُ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ

میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ۔ اللہ کی کتاب اور اپنی سنت ۔ جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہو گے اس وقت تک گمراہ نہ ہوگے ۔

فَمَنْ حَفِظَ شَيْئًا فَلْيُحَدِّثْ (مستدرک) | جو میری حدیثوں کو حفظ کرے تو ان کو روایت بھی کرے۔

اور ان ارشادات میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی احادیث کو یاد کرنے اور ان کی تبلیغ کرنے کا حکم دیا۔ حافظِ حدیث کے مرتبہ و مقام کو بیان فرما کر حفظ و اشاعتِ حدیث کی اہمیت کو ظاہر فرمایا۔ جس سے واضح ہوگیا کہ منشاءِ رسالت یہی تھا کہ حدیث کی حفاظت ہو اور یہ دین کا جزو قرار پائیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ حدیث کے بیان کرنے، اس کے یاد کرنے اور دوسروں تک پہنچانے پر سرسبز رہنے کی دعا نہ فرماتے۔ اب یہ ملاحظہ کیجئے کہ صحابہ کرام و تابعینِ عظام نے حدیث کے حفظ و ضبط کا کیسا کچھ اہتمام کیا۔ اس کا اندازہ ذیل کی چند مثالوں سے ہوسکتا ہے۔

عہدِ نبوی میں حفظِ حدیث عہدِ نبوی میں حدیثوں کے حفظ یا یاد کرنے کا یہ اہتمام تھا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضور علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے حدیثیں سنتے تھے۔ جب آپ مجلس سے اُٹھتے تو ہم آپس میں حدیثوں کا دورہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک آدمی کل حدیثیں بیان کرجاتا۔ پھر دوسرا، تیسرا، بعض اوقات ساٹھ ساٹھ آدمی مجلس میں ہوتے تھے اور ساٹھوں باری باری سے حدیثیں بیان کرتے تھے۔ اس کے بعد ہم اُٹھتے تو حدیثیں اس طرح یاد ہوتیں کہ گویا ہمارے دلوں میں بودی گئی ہیں (مجمع الزوائد جلد ۱ ص۱۶۱)

۲۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ عہدِ نبوی میں فرض نمازوں کے بعد صحابہ کرام مسجد میں بیٹھ جاتے تھے اور قرآنِ پاک اور حدیثِ نبویہ کا اندازہ کرتے تھے (مستدرک جلد ۱ ص۹۴) حضرت ابوسعید خدری کا بیان ہے کہ صحابہ کرام جب کہیں بیٹھتے تھے تو ان کی گفتگو کا موضوع فقہ یعنی حضور کی حدیثیں ہوتی تھیں یا پھر یہ کہ کوئی آدمی قرآنِ پاک کی کوئی سورت پڑھے یا کسی سے پڑھنے کو کہے (مستدرک حاکم ص۹۴) ۴۔ دور کے علاوہ انفرادی طور پر بھی حدیثوں کے یاد کرنے کا بڑا اہتمام تھا اور جن کو کوشش کے باوجود بھی حدیثیں یاد نہ ہوتیں تو وہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیثوں کو محفوظ رکھنے کی تدابیر معلوم کیا کرتے تھے۔ جیسے حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے حضور علیہ السلام سے اپنے حافظہ کے متعلق عرض کیا تھا۔ نیز حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں حدیثوں کو دل سے یاد کرتا تھا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ازبر کرنے کے ساتھ ساتھ لکھتے بھی جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما کا بیان ہے کہ ہم حدیثیں یاد کرتے تھے (مسلم جلد ۱ ص۱۰، ابن ماجہ ص۹۴)

اس قسم کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام نے عہدِ نبوی میں حفظِ حدیث کا اہتمامِ بلیغ کر رکھا تھا۔ عہدِ نبوی کے بعد عہدِ صحابہ کو لے لیجئے کہ اس دور میں بھی حدیث کو یاد رکھنے

اور اپنے شاگردوں کو یاد کرانے کی برابر تاکید کی جاتی تھی۔

عہد صحابہ میں حفظِ حدیث

۱۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ تَذَاکَرُوْا ھٰذَا الْحَدِیْثَ لَا یَنْفَلِتُ مِنْکُمْ۔ حدیثوں کا آپس میں مذاکرہ (دور) کرو ایسا نہ ہو کہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے (دارمی ص۷۸) وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حدیث کو بار بار دُہرایا اور اس کو مستحضر کرو۔ اگر اس طرح یاد نہ کرو گے تو جاتی رہیں گی (دارمی) حضرت ابن عباس کی یہ بھی تاکید تھی کہ ہر روز کچھ حدیثیں بیان کیا کرو۔

۲۔ حضرت ابو سعید خزامی بھی آپس میں حدیث کا دورہ کرتے تھے (دارمی ص۷۷ مستدرک جلد ا ص۹۴) بلکہ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ حدیثیں حفظ یاد کرو (دارمی ص۶۶) ۳۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے۔ تَذَاکَرُوا الْحَدِیْثَ فَاِنَّکُمْ لَا تَفْعَلُوْا یَنْدَرِسُ (مستدرک جلد ا ص۹۵) ۴۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی سخت تاکید تھی کہ حدیثوں کا دورہ کرتے رہو۔ یہی اس کے بقا کا سامان ہے (مستدرک جلد ا ص۹۵۔ دارمی ص۷۹) ۵۔ حضرت علی کرم اللہ تعالےٰ وجہہ فرمایا کرتے تھے۔ تَذَاکَرُوْا وَتَدَارَسوا الحدیث ولا تترکوہ (کنز العمال ج۵ ص۲۴۲ دارمی ص۷۹) ایک دوسرے سے ملتے رہو اور باہم حدیث کا مذاکرہ کرتے رہو۔ اس کو چھوڑ نہ دو غرضکہ عہدِ نبوی کے بعد عہد صحابہ میں بھی حدیث کے حفظ وضبط اور دور کا باقاعدہ نظام تھا۔ صحابہ کے شاگرد اپنے اساتذہ کے احکام کا پورا احترام کرتے تھے اور حدیث کے دَور سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے (دارمی ص۷۹) اور تذکرہ میں عطا کا بیان ہے کہ ہم جب حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیثیں سُن کر اُٹھتے تو ان کا دور کرتے تھے۔ ہمارے ہم سبقوں میں ابو زبیر کا حافظہ سب سے اچھا تھا۔ ان کو سب سے زیادہ حدیثیں یاد ہوتی تھیں (مستدرک جلد ص۹۴) امام زہری علیہ الرحمہ عشار کی نماز کے بعد حدیث کے دور کے لیے بیٹھتے تو صبح کر دیتے تھے (دارمی ص۹۸) دارمی میں بیان ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ تم لوگ آپس میں ملتے رہتے ہو اور ایک جگہ بیٹھ کر حدیث کا دور بھی کرتے ہو؟ شاگردوں نے جواب دیا۔ ہاں اور اگر ہمارا کوئی ساتھی غائب ہو جائے تو وہ کوفہ کے آخری سرے پر ملتا ہے تو وہیں جا کر اس سے ملتے ہیں (دارمی ص۷۹)

عہدِ تابعین میں حفظِ حدیث

صحابہ کے بعد تابعین کا دور آیا تو اس میں بھی حدیثوں کے حفظ کرنے اور اس کے مذاکرہ کے لیے مجالس قائم تھیں۔ چنانچہ دارمی میں ہے کہ عبد الرحمٰن ابن ابی لیلیٰ زہری اور علقمہ حدیث کے دَور کی تاکید فرماتے تھے۔ انہی تاکیدوں کا نتیجہ تھا کہ حارث، ابن زید عکلی، قعقاع ابن یزید، مغیرہ اور فضیل عشار کی نماز کے بعد جب حدیث کے لیے بیٹھتے تو صبح ہی

کردیتے تھے (دارمی ص۱۸، تہذیب جلد ۱ ص۲۷)

یونس کا بیان ہے کہ جب ہم حضرت حسن بصری کے پاس سے حدیثیں سن کر اٹھتے تو پھر آپس میں دور کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اسماعیل بن رجاء کا دستور تھا کہ جب کوئی نہ ملتا تو مکتب کے لڑکوں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے حدیثیں بیان کرتے تاکہ حدیث کی مشق میں ناغہ نہ ہو اور بھولنے نہ پائیں (دارمی ص۸۰ تہذیب ج ۱ ص۲۹۶)۔ ان مختصر مثالوں سے آپ نے معلوم کرلیا کہ حفظِ حدیث کا عہدِ نبوی، عہدِ صحابہ اور تابعین میں کیا کچھ غیر معمولی اہتمام تھا۔

عہدِ نبوی میں کتابتِ حدیث

حدیث کے حفظ وضبط کے اہتمامِ بلیغ کے ساتھ کتابتِ حدیث کا رواج عہدِ نبوی میں ہو چکا تھا۔ وہ مکاتیب جو مختلف اوقات میں حضور علیہ السلام نے لکھوائے ان میں مسائلِ شرعیہ کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور یہ مکاتیب وتحریرات حدیث کی کتابوں میں درج ہیں۔ صحابہ کرام کی متعدد جماعتیں دربارِ نبوی میں حدیث سنتی اور لکھتی تھیں۔ حضرت ابن عباس و عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں۔

۱۔ بَیْنَا نَحْنُ حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰہِ نَکْتُبُ (دارمی ص۹۸) — ہم حضور کے حلقہ درس میں آنحضرت کے ارشادات لکھ رہے تھے۔

۲۔ ۸ھ میں فتح مکہ کے موقعہ پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے انسانی حقوق اور مکہ کی حرمت کے متعلق مسائل بیان فرمائے تو ایک یمنی نے عرض کی مجھے یہ احکام لکھوا دیجئے۔ آپ نے حکم دیا۔ اُکْتُبُوْہُ لِاَبِیْ شَاہٍ یہ احکام ابوشاہ کو لکھ کر دو (بخاری ابوداؤد) ۳۔ قبیلہ جہنیہ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مُردہ جانوروں سے متعلق احکام لکھوا کر بھیجے (مشکوٰۃ شریف) ابوداؤد ۴۔ مسلم شریف جلد ۱ ص۴۹۵ میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قبیلہ والوں کو دیت (خون بہا) کے احکامات لکھوا کر بھجوائے ۵۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں وہ تمام حدیثیں جن کا تعلق مسائلِ زکوٰۃ سے تھا یکجا قلم بند کروا دیں جس کا نام کتاب الصدقہ تھا مگر اس کو عمال وحکام کے پاس روانہ کرنے سے قبل ہی آپ کا وصال ہو گیا تو خلفائے راشدین میں سے سیدنا صدیقِ اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہما نے اپنے زمانہ میں اسے نافذ کیا۔ اس کے مطابق زکوٰۃ کے وصول وتحصیل کا ہمیشہ انتظام رکھا (ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ ص۱۵۶)

۶۔ امام بخاری نے اسی کتاب الصدقہ کا مضمون نقل کیا ہے جسے صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو بحرین کا حاکم بنا کر بھیجتے وقت ان کے حوالے کیا تھا۔ اس میں اونٹوں، بکریوں، چاندی سونے کی زکوٰۃ کے نصاب کا بیان ہے ۷۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات کے آخری ایام میں حدیثوں کا ایک ضخیم مجموعہ اہلِ یمن کے پاس عمرو بن حزم صحابی کی معرفت روانہ فرمایا۔ جس کے الفاظ

ہ ہیں ۔ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَتَبَ اِلٰی اَھْلِ الْیَمَنِ کِتَابًا فِیْہِ الْفَرَائِضُ وَالسُّنَنُ وَالدِّیَاتُ وَبَعَثَ مَعَ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ (موطا امام مالک صہ۲۳) جس میں فرائض و یات کے احکام مندرج تھے (نسائی جلد ۲ صہ۲۴۷) ۸۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے حدیثیں جمع کر کے اس مجموعہ کا نام صادقہ رکھا۔ اس میں ایک ہزار حدیثیں تھیں (بخاری ۲ اصابہ ۔ طبقات ابن سعد) ۹۔ حضرت انس نے حدیثیں لکھی تھیں (بخاری تدریب الراوی) ۱۰۔ تحریری احکام اور معاہدات حدیبیہ اور وہ فرامین جو حضور علیہ السلام نے قبائل کو بھیجے تھے (ابن ماجہ، طبقات ابن سعد) ۱۱۔ جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے سلاطین و امراء کے نام ارسال فرمائے تھے (بخاری، تذکرۃ الحفاظ) ۱۲۔ کتاب الصدقہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوبکر بن حزم صحابی والیٔ بحرین کو لکھائی تھی ۔ یہ وہ صفحات تھے جن میں زکوٰۃ کے احکام تھے ہ دیگر امراء کو بھی بھیجا گیا تھا (دارقطنی، مسند احمد بن حنبل) یہ تحریر خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ابی حرم سے لے لی تھی (دارقطنی) ۱۳۔ محصلین زکوٰۃ کے پاس کتاب الصدقہ کے علاوہ اور بھی تحریریں تھیں (دارقطنی) ۱۴۔ عمرو بن حزم کو جب یمن کا حاکم مقرر کیا تو ایک تحریر لکھا دی ۔ جس میں فرائض، صدقات، دیات، طلاق، صلوٰۃ، مس مصحف وغیرہ کے احکام تھے (کنز العمال مسند امام احمد بن حنبل، مستدرک) ۱۵۔ عبداللہ بن حکیم صحابی کے پاس حضور علیہ السلام کا ایک نامہ تھا جس میں مُردہ جانوروں کے احکام تھے (معجم صغیر طبرانی) ۱۶۔ وائل بن حجر صحابی کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز، روزہ، ربوٰا، شراب وغیرہ کے احکام لکھا دیے تھے (معجم صغیر) ۱۷۔ ضحاک بن سفیان صحابی کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر کرائی ہوئی ایک ہدایت۔ جس میں شوہر کی دیت کا حکم تھا (دارقطنی) اشیم نام تھا اس مقتول کا جس کی بیوی کو شوہر کی دیت دلانے کا فرمان تحریر کرایا تھا (ابوداؤد) ۱۸۔ حضرت معاذ بن جبل کو ایک تحریر یمن بھیجی گئی جس میں سبزیوں، ترکاریوں پر زکوٰۃ نہ ہونے کا حکم تھا (دارقطنی) ۱۹۔ مدینہ بھی مثل مکہ کے حرم ہے ۔ اس کے متعلق حضور علیہ السلام کی تحریر رافع بن خدیج کے پاس تھی (مسند احمد) ۲۰۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے ایک مجموعہ لکھا تھا جو ان کے صاحبزادہ کے پاس تھا (جامع بیان العلم) ۲۱۔ حضرت سعد بن عبادہ نے ایک مجموعہ حدیث مرتب کیا، اس کا نام کتاب سعد بن عبادہ تھا جو کئی پشت تک ان کے خاندان میں رہا (مسند احمد) ۲۲۔ سعد ابن ربیع انصاری نے حدیثیں لکھی تھیں (اسد الغابہ) ۲۳۔ سمرہ بن جندب نے ایک نسخہ حدیث مرتب کیا تھا (تہذیب) ۲۴۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے پاس ایک دفتر حدیث لکھا ہوا تھا (فتح الباری) چنانچہ ہمام بن منبہ کا صحیفہ جو حضرت ابوہریرہ سے نقل کیا گیا ہے ۔ وہ چھپ چکا ہے اس مجموعہ کی اکثر احادیث مسند احمد و صحیح بخاری و مسلم میں موجود ہیں ۔ جن کے دیکھنے سے حدیث کی حفاظت

کا یقین مستحکم ہو جاتا ہے۔اس صحیفہ میں جن الفاظ کے ساتھ حدیثیں درج ہیں من وعن صحاح میں پائی جاتی ہیں۔جس سے واضح ہوتا ہے کہ پہلی صدی کے صحیفہ کی احادیث تیسری صدی کے مجموعوں میں نقل در نقل ہو کر آئیں اور ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔اسی طرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا وہ خط جو آپ نے ہرقل کو لکھا تھا۔اس کا فوٹو بھی شائع ہو چکا ہے۔اس خط کی نقل حضور علیہ السلام کے پاس نہیں تھی۔صحابہ کرام نے وہ خط سنا، حفظ کیا پھر واسطوں کے ساتھ مصنفین صحاح تک پہنچایا اور تیسری صدی میں نقل در نقل کی صورت میں لکھا گیا۔مگر اس کے مضمون میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔

عہد صحابہ میں کتابت حدیث

اس کے بعد عہد صحابہ کو لیجئے۔اس دور میں بھی کتابت حدیث کے بیشمار واقعات ملتے ہیں۔تمثیل کے طور پر چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ دارمی صہ۶۸ و مستدرک حاکم جلد ا صہ۱۰۶ میں امیرالمومنین فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا یہ فرمان منقول ہے کہ علم کو کتاب میں مقید کرلو ۲۔ دارمی و مستدرک میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ علم کو لکھ کر مقید کرلو۔نیز صحیح مسلم جلد ا صہ۴۶ میں ہے کہ حضرت انس نے محمود ابن الربیع صحابی کی زبانی حضرت عتبان کی ایک طویل حدیث سُنی تو اپنے لڑکے سے کہا اس کو لکھ لو چنانچہ انہوں نے لکھ لیا۔طحاوی جلد ۲ صہ۴۸۴ میں بھی حضرت انس کا اپنے لڑکے سے حدیث لکھوانا مذکور ہے ۳۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر یا کسی دوسرے سے لکھوا کر اپنی حدیثوں کو سفینہ میں محفوظ کر لیا تھا۔چنانچہ فتح الباری جلد ا صہ۱۴۸ میں حسن ابن عمرو کا بیان ہے کہ حضرت ابو ہریرہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور حدیث نبوی کی کئی کتابیں دکھا کر فرمایا کہ دیکھو یہ میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہیں اور بشیر ابن نہیک کا بیان طحاوی جلد ۲ صہ۳۸۵ میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ سے حدیث کی کتابیں عاریتہً لے کر نقل کرتا تھا۔نقل سے فارغ ہو کر ان کو کل سنانا جاتا تھا۔سنانے کے بعد عرض کرتا تھا کہ میں نے آپ کو جو سنایا ہے وہ سب آپ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے۔وہ فرماتے تھے ہاں ۴۔ حضرت ابن عباس کے چند صحیفے تھے جن میں حدیثیں قلمبند تھیں۔چنانچہ ترمذی جلد ۲ صہ۲۳۸ اور طحاوی جلد ۲ صہ۳۸۴ میں ہے کہ طائف کے کچھ لوگ حضرت ابن عباس کے پاس ان کے چند صحیفے لے کر حاضر ہوئے کہ آپ ہم کو سُنا دیں۔اس وقت حضرت ابن عباس کی نگاہ بہت کمزور ہو چکی تھی اس لیے وہ پڑھ نہ سکے اور فرمایا۔تم خود سنا دو، تمہارا سنانا اور میرا پڑھنا جوازِ روایت کے حق میں دونوں برابر ہیں ۵۔ دارمی صہ۶۸ میں ہے کہ ابان (تابعی) حضرت انس کے پاس بیٹھے سا گوان کی تختیوں پر حدیثیں لکھتے رہتے تھے ۶۔ جلد ۲ صہ۳۸۴ میں عبداللہ ابن محمد ابن عقیل کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت جابر کی

کی خدمت میں حاضر ہو کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو پوچھتے اور لکھ لیتے تھے۔ ۷۔ دارمی ص۶۹ میں ہے کہ حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ علم کو قید تحریر میں لاؤ۔ چنانچہ دارمی ہی میں حضرت سعید ابن جبیر کا بیان ہے کہ میں حضرت ابن عمر سے حدیثیں سُنتا اور لکھ لیتا تھا ۸۔ دارمی ص۱۲۹ اور طحاوی جلد ۲ ص۳۸۴ میں ہے کہ حضرت سعید ابن جبیر وغیرہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس حدیثیں لکھتے رہتے تھے بلکہ دارمی میں ہے کہ کاغذ بھر جاتا تھا تو کسی دوسری چیز پر لکھ لیتے تھے۔

عہدِ تابعین میں کتابتِ حدیث

اوپر جو واقعات آپ نے پڑھے ہیں۔ ان میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم کے سامنے یا صحابہ سے سُن کر حدیث لکھنے کا ذکر ہے۔ اب چند ایسے واقعات سُنئے جن میں تابعین کے سامنے یا تابعین سے سُن کر حدیث لکھنے کا تذکرہ ہے۔ ۱۔ ترمذی جلد ۲ ص۲۲۸ اور دارمی ص۶۶ میں ابراہیم نخعی کا بیان ہے کہ سالم ابن ابی الجعد حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ سالم کی وفات ۱۰۱ھ میں ہوئی ہے اور انھوں نے بعض صحابہ سے بھی حدیثیں سُنی ہیں۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص۱۰۳ میں ابوالزناد (تابعی) کا بیان ہے کہ ہم زہری کے ساتھ علماء کے پاس حدیثیں سُننے کے لیے جایا کرتے تھے۔ زہری اپنے ساتھ تختیاں اور کاغذ لیے رہتے تھے اور جتنا سُنتے تھے سب لکھتے رہتے تھے۔ زہری کی وفات ۱۲۴ھ میں ہوئی ہے ۳۔ کنزالعمال جلد ۵ ص۲۳۸ میں صالح بن کیسان کا بیان ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں میرا اور زہری کا ساتھ تھا۔ زہری نے مجھ سے کہا آؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں لکھیں ۴۔ دارمی ص۶۹ میں ہشام ابن الغار کا بیان منقول ہے کہ عطا ابن ابی رباح تابعی سے لوگ پوچھتے جاتے تھے اور انہی کے سامنے لکھتے جاتے تھے۔ عطا کی وفات ۱۱۴ھ میں ہوئی ۵۔ دارمی میں سلیمان ابن موسےٰ کا بیان ہے کہ میں نے نافع کو دیکھا ہے کہ وہ حدیثیں اپنی زبان سے بولتے جاتے ہیں۔ نافع کا انتقال ۱۱۷ھ میں ہوا ۶۔ ترمذی جلد ۲ ص۲۳۹ میں ہے کہ ایک شخص حسن بصری کے پاس آیا اور کہا کہ میرے پاس آپ کی بیان کردہ کچھ حدیثیں لکھی ہوئی ہیں۔ میں ان کی روایت آپ سے کر سکتا ہوں؟ تو انھوں نے کہا "ہاں"۔

تہذیب التہذیب میں ہے کہ حمید طویل نے حسن بصری کی کتابیں نقل کی تھیں (جلد ۳ ص۳۹) حسن بصری کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی ۷۔ ترمذی جلد ۲ ص۲۳۹ میں ابن جریج کا بیان ہے کہ ہشام بن عروہ کی وفات ۱۴۶ھ میں ہوئی ۸۔ تذکرۃ جلد ۱ ص۸۸ میں ہے کہ ابوقلابہ وفات کے وقت اپنی کتابوں کی وصیت ایوب سختیانی کے لیے کر گئے تھے چنانچہ وہ کتابیں شام سے اونٹ پر بار کر کے لائی گئیں۔ ایوب فرماتے ہیں کہ میں نے بارہ، چودہ درہم ان کا کرایہ ادا کیا۔ ابوقلابہ کی وفات ۱۰۴ھ میں ہوئی ۹۔ صحیح بخاری

جلد ۱ ص۱۴۰ اسعاف المبطا ص۵، دارمی ص۶۸ میں ہے کہ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تمام اطراف سلطنت میں یہ فرمان بھیجا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو جمع کرو، چنانچہ ابوبکر بن حزم (جو ان کی طرف سے مدینہ کے امیر و قاضی تھے) کے پاس جب یہ فرمان پہنچا تو انھوں نے حدیث کے کئی مجموعے تیار کیے۔ مگر ابھی ان کو دربار خلافت میں بھیجنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ عمر بن عبدالعزیز کی وفات ہوگئی۔ نیز عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے ابن شہاب زہری نے بھی حدیثوں کو مدون کیا تھا۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص۱۰۶ میں معمر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زہری کی حدیثوں کے دفتر کئی اونٹوں پر بار کیے گئے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز کی وفات ۱۰۱ھ میں ہوئی۔

لہٰذا تابعین کے یہ چند واقعات برسبیل تذکرہ میں نے پیش کیے ہیں اور ہر واقعہ کے ساتھ صاحب واقعہ کا سن وفات بھی لکھ دیا ہے۔ سنین وفات دیکھ کر آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ واقعات وفات نبوی سے صرف سو برس بعد کے ہیں بلکہ اکثر تو سو برس کے اندر ہی کے ہیں۔

تبع تابعین کے عہد میں حدیث کی کتابت

اب ذرا اور قریب آئیے اور تبع تابعین کا دور نظر کے سامنے رکھیے تو اور زیادہ کتابت حدیث کے واقعات آپ کی نگاہ سے گزریں گے اور حدیثوں کے دفتر کے دفتر آپ کو دکھائی دیں گے جو اس عہد میں لکھے گئے اور ان میں سے بعض آج بھی ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں۔ اس دور میں حدیثوں کے لکھنے کا یہ دستور تھا کہ استاد سے جو حدیثیں سنیں لکھ لیں چنانچہ محمد ابن بشر کا بیان ہے کہ مسعر المتوفی ۱۵۵ھ کے پاس ایک ہزار حدیثیں تھیں۔ میں نے دس کے سوا ساری لکھ لیں (تذکرہ ص۱۷۷) عبدالرزاق کا بیان ہے کہ میں نے معمر المتوفی ۱۵۳ھ سے دس ہزار حدیثیں سن کر لکھی ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص۱۷۵) حماد بن سلمہ کے پاس قیس بن سعد کی کتاب تھی (تذکرہ جلد ۱ ص۱۹۸) ثوری یمن گئے تو ان کو ایک تیز لکھنے والے کاتب کی ضرورت ہوئی۔ ہشام ابن یوسف کا بیان ہے کہ لوگوں نے مجھ کو پیش کیا چنانچہ میں ان کے لیے حدیثیں لکھا کرتا تھا (تذکرہ جلد ۱ ص۳۱۶) ابونعیم کا بیان ہے کہ میں نے آٹھ سو مشائخ سے حدیثیں لکھی ہیں۔ شعیب بن حمزہ نے بہت زیادہ حدیثیں لکھی تھیں۔ زہری بولتے اور شعیب لکھتے تھے۔ امام احمد نے شعیب کی کتابیں دیکھی تھیں۔ ان کا بیان ہے کہ شعیب کی کتابیں بہت صحیح اور درست تھیں۔ شعیب کی وفات ۱۶۳ھ میں ہوئی ہے (تذکرہ جلد ۱ ص۲۱۰)

ابوعوانہ پڑھنا جانتے تھے لکھنا نہیں جانتے تھے۔ اس لیے جب حدیث سننے کے لیے جاتے تھے تو دوسرے سے لکھواتے تھے۔ ابوعوانہ کی وفات ۱۶۳ھ میں ہوئی (تذکرہ جلد ۱ ص۲۱۹) ابن لہیعہ کے پاس بھی حدیث کی کتابیں تھیں۔ چنانچہ ابن صالح کا بیان ہے کہ میں نے عمارہ ابن غزیہ کی حدیثیں ابن لہیعہ ہی کی اصل سے نقل کی ہیں۔ ابن لہیعہ نے ۱۷۴ھ میں انتقال کیا (تذکرہ جلد ۱ ص۲۲۲) سلیمان بن ابی بلال المتوفی

۱۷۲ھ کے مسموعات کی بھی کئی کتابیں تھیں اور اپنے مرنے کے وقت وصیت کر گئے تھے کہ وہ کتابیں عبدالعزیز ابن حازم کو دے دی جائیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۴۹)

ابن المبارک نے اپنی لکھی ہوئی جن حدیثوں کی روایت کی اور لوگوں کو سنایا ان کی تعداد بیس ہزار تھی۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۵۳) غندر کے پاس بھی ان کی مسموعات کی کتابیں تھیں۔ ابن معین کا بیان ہے کہ ان کی کتابیں سب سے زیادہ صحیح تھیں۔ ابن مہدی کا بیان ہے کہ ہم شعبہ کی زندگی ہی میں غندر کی کتابوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ غندر کی وفات ۱۶۳ھ میں ہوئی (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۷۷)

بہرحال کتابتِ حدیث کے اس دستور کے علاوہ باقاعدہ تصانیف کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں ابن جریج المتوفی ۱۵۰ھ نے یمن میں معمر بن راشد المتوفی ۱۵۳ھ نے، بصرہ میں سعید ابن ابی عروبہ المتوفی ۱۵۲ھ اور ربیع ابن صبیح المتوفی ۱۴۱ھ نے حدیث کی کتابیں تصنیف کیں اور اسی عہد میں موسیٰ ابن عقبہ المتوفی ۱۴۱ھ اور ابن اسحاق المتوفی ۱۵۱ھ نے غزوات اور سیرتِ نبوی پر کتابیں لکھیں اور ان کے بعد امام اوزاعی المتوفی ۱۵۷ھ نے شام میں۔ امام ابن المبارک المتوفی ۱۸۱ھ نے خراسان میں، حماد بن سلمہ المتوفی ۱۶۷ھ نے بصرہ میں، سفیان ثوری المتوفی ۱۶۱ھ نے کوفہ میں، جریر بن عبدالحمید المتوفی ۱۸۸ھ نے رے میں اور ہثیم المتوفی ۱۸۳ھ نے واسط میں حدیث کی کتابیں لکھیں اور تقریباً اس زمانہ میں امام مالک نے اپنی شہرہ آفاق کتاب موطا تصنیف کی۔ امام مالک نے ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔ اسی زمانہ میں ابومعشر سندی نے غزواتِ نبوی پر کتاب لکھی۔ ابومعشر نے ۱۷۰ھ میں وفات پائی۔

ان حضرات کے بعد ابراہیم بن محمد اسلمی استاد شافعی نے امام مالک کی موطا کے طرز پر اپنی موطا لکھی جس کی نسبت ابن عدی کا بیان ہے کہ موطا مالک سے وہ چند گونہ بڑی تھی۔ ابراہیم کی وفات ۱۸۴ھ میں ہوئی (تذکرہ) یحییٰ بن زکریا بن زائدہ کوفی شاگرد امام اعظم بھی صاحبِ تصنیف تھے۔ یحییٰ کا انتقال ۱۸۲ھ میں ہوا۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۴۶) معافی بن عمران موصلی المتوفی ۱۸۵ھ نے کتاب السنن، کتاب الزہد، کتاب الادب، کتاب الفتن وغیرہ تصنیف کیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۶۵)

عبدالرحیم بن سلیمان کنانی نے بھی کئی کتابیں لکھیں (تہذیب جلد ۶ ص ۳۰۶) —— امام ابویوسف المتوفی ۱۸۲ھ نے کتاب الآثار، کتاب الخراج وغیرہ لکھیں —— امام محمد المتوفی ۱۸۹ھ نے موطا، کتاب الآثار، کتاب الحج وغیرہ تصنیف فرمائیں۔

ولید بن مسلم المتوفی ۱۹۵ھ نے حدیث کے مختلف ابواب و موضوعات پر ستر کتابیں لکھیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۷۳) ابن وہب المتوفی ۱۹۷ھ نے اہوال القیامہ اور جامع وغیرہ تصنیف کیں۔ نیز ایک بہت

ضخیم موطا بھی ان کی تصنیفات میں ہے۔
محمد ابن فضیل المتوفی ۱۹۵ھ نے کتاب الزہد کتاب الدعا وغیرہ اپنی یادگار چھوڑی۔ اس دور کی تصنیفات میں سے سفیان کی جامع ابن المبارک کی کتاب الزہد والرقائق۔ امام مالک کی موطا، ابو یوسف کی کتاب الآثار اور کتاب الخراج اور امام محمد کی موطا کتاب الآثار اور کتاب الحج وغیرہ آج بھی موجود ہیں۔

بطور تمثیل یہ چند واقعات ہم نے ذکر کر دیئے ہیں۔ ورنہ اس سلسلہ کے تاریخی حقائق کو یکجا جمع کیا جائے تو مستقل طور پر ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ بہرحال حفظ و کتابت حدیث کے اس اہتمام بلیغ کے ہوتے ہوئے یہ خیال قائم کر لینا کہ زبانی روایت پر دارومدار ہونے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہو گئی ہونگی انصاف کا خون اور حقائق سے چشم پوشی اور محض وہم پرستی سے زائد و قبیح نہیں ہے۔

روایت میں محدثین کی بے نظیر احتیاط

حدیث کے حفظ و کتابت کے لیے صحابہ کرام و تابعین عظام کا یہ غیر معمولی اہتمام ملاحظ فرمانے کے بعد اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اپنی حدیثوں کی اشاعت و تبلیغ کے لیے تاکیدیں فرمائیں وہاں اس کی بھی نہایت سخت تاکید فرمائی کہ کوئی غلط بات آپ کی طرف منسوب نہ ہونے پائے۔ اس لیے ابتدا ہی سے محدثین کا گروہ حدیثوں کی روایت کرنے میں بے حد محتاط رہا ہے۔
چنانچہ بعض صحابہ اس ڈر سے کہ بیان کرنے میں کچھ کمی بیشی نہ ہو جائے بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے جیسا کہ حضرت زبیر کا واقعہ صحیح بخاری جلد ۱ ص ۲۱ میں مذکور ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ حال تھا کہ جس حدیث میں ان کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ یہ حدیث خوب اچھی طرح یاد نہیں ہے تو وہ اس کو بیان نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ غلطی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں بیان کرتا (دارمی ص ۴۲)
امام ربانی محمد باقر کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمر کو سب سے زیادہ اس بات کا اہتمام تھا کہ حدیث میں ذرہ برابر بھی کوئی کمی بیشی نہ ہو (تذکرہ ص ۳۷) چنانچہ صحیح مسلم جلد ۱ ص ۳۲ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عمر نے یہ حدیث بیان کی کہ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَصِیَامُ رَمَضَانَ وَالْحَجِّ
حضرت ابن عمر کے بیان کرنے کے بعد مجلس میں کسی شخص نے اس حدیث کو دہرایا تو یوں کہہ دیا۔ وَالْحَجِّ وَصِیَامِ رَمَضَانَ۔ حضرت ابن عمر نے فوراً اس کو ٹوک دیا اور فرمایا یوں نہیں بلکہ " وَصِیَامُ رَمَضَانَ وَالْحَجِّ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح سنا ہے۔ غور فرمائیے کہ باوجودیکہ معنیٰ میں کوئی خرابی پیدا نہیں

ہوتی تھی۔ پھر بھی جس ترتیب سے حدیث کے الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنتے تھے۔ اس میں یہ معمولی سا تغیر بھی ان کو گوارا نہ تھا۔ دارمی صہ۱۵ میں عبداللہ بن عمر کا ایسا ہی دوسرا واقعہ ایک دوسری حدیث کے باب میں مذکور ہے اور حضرت عبداللہ ابن مسعود کی نسبت تذکرۃ الحفاظ میں مذکور ہے۔

كان ممن يتحرى في الاداء ويشدد في الرواية ويزجر تلامذته عن التهاون وضبط الالفاظ (جلد ا صہ۱۳)

ان کا شمار ان حضرات میں ہے جن کو ادائے حدیث میں بے حد احتیاط اور روایت کے بارے میں بڑا تشدد تھا اور وہ اپنے شاگردوں کو الفاظِ حدیث کے ضبط کرنے میں سُستی پر بہت ڈانٹتے تھے۔

امام مالک کا یہ حال تھا کہ وہ یا اور تا کا بھی خیال رکھتے تھے یعنی خطاب وغیبت کا (تذکرۃ الحفاظ جلد ا صہ۱۹۸) ۔ حضرت زید ابن ارقم کا جب بڑھاپا آیا۔ اس وقت کوئی شخص حدیث بیان کرنے کو کہتا تو فرماتے کہ اب ہم بوڑھے ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے (ابن ماجہ) اسی احتیاط کا تقاضا تھا کہ حضرت ابن عمر اپنے شاگردوں کو ہدایت کیا کرتے تھے کہ جب تم حدیث کی روایت کرنے کا ارادہ کرو تو پہلے تین دفعہ اس کو دُہرا لیا کرو (دارمی صہ۴۸)

نیز اسی شدتِ احتیاط کی وجہ سے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالےٰ عنہما کی بڑی تاکید تھی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے وہی حدیثیں روایت کی جائیں جن پر سُننے والے کو پختہ یقین ہو۔

صحابہ کرام کے یہ واقعات پڑھنے کے بعد آپ ہی انصاف سے کہئے کہ جس جماعت کو اسقدر احتیاط کا پاس ولحاظ ہو اس کی نسبت یہ خیال قائم کرنے کا تو کسی درجہ میں امکان ہی نہیں کہ انھوں نے جان بوجھ کر غلط تو درکنار کوئی مشکوک بات بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی ہوگی بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ جب احتیاط کا یہ عالم تھا کہ حدیثوں کی روایت سے بھی چارہ کار نہ تھا تو لازمی طور پر حدیثوں کو یاد رکھنے اور ان کو بعینہٖ حافظہ میں محفوظ رکھنے کا انتہائی اہتمام ہوا۔ اس حالت میں بھول چوک سے حدیثوں کا کچھ سے کچھ ہونا بعید از قیاس ہے۔ خصوصاً جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ شروع ہی سے اس کا بھی اہتمام تھا کہ ایک شخص کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو مزید اطمینان کے لیے کوئی دوسرا اس کا مؤید تلاش کیا جاتا تھا جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ جلد ا صہ۳ میں مذکور ہے کہ جب حضرت مغیرہ نے یہ بیان کیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دادی کو پوتے کی میراث کا چھٹا حصہ دلوایا ہے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے دریافت کیا کہ کوئی اور بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اس بات کو نقل کرنے میں تمہارا شریک

ہے ؟ معلوم ہوا کہ حضرت محمد ابن مسلمہ بھی اس کو جانتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اگر شہادت دی تو حضرت ابوبکر نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔ اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری نے حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے ایک حدیث بیان کی تو انھوں نے حکم دیا کہ اس پر کوئی دوسری شہادت پیش کرو۔ حضرت ابوموسیٰ انصار کے مجمع میں گئے اور اُن سے پوچھا کہ آپ لوگوں میں کسی نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے فلاں حدیث سُنی ہے۔ انھوں نے کہا ہم سب نے یہ حدیث سُنی ہے۔ حضرت ابوموسیٰ نے ان میں سے ایک انصاری کو ساتھ لیا اور حضرت عمر کے سامنے ان کی شہادت دلوائی (تذکرہ ۶)۔

خود حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ایک دفعہ ایک حدیث کو بیان کرنا شروع کیا تو فرمایا کہ ڈر تو لگتا ہے کہ کوئی کمی بیشی نہ ہو جائے لیکن عمّار نے بھی میرے ساتھ اس حدیث کو سُنا ہے اس لیے بیان کرتا ہوں۔ تم عمّار کے پاس آدمی بھیج کر ان سے تصدیق کرالو۔ چنانچہ عمار کو بُلا کر پوچھا گیا تو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان کی تصدیق کی (ابوداؤد طیالسی)

حدیث کی حفاظت کے اصل اسباب

صحابہ کرام و تابعین و تبع تابعین نے حدیث کی حفاظت و کتابت و اشاعت کا اہتمام بلیغ اسی لیے کیا کہ حدیثِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دین کا جزو اور قرآن کی طرح اسلام کی اساس اور منبع و ماخذ ہے۔ جب حدیث رسول دین کا جزو قرار پائی تو قدرتی طور پر بھی حفاظتِ حدیث کا اہتمام ہونا لازمی تھا۔ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے متعلق قرآن کا حکم تھا کہ آپ کا اتباع کیا جائے اور آپ کے طریقہ کو اختیار کیا جائے۔ چنانچہ اسی ہدایتِ قرآنی کا یہ اثر تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جب کوئی بات کہتے یا عمل کرتے تو اس پر عملدرآمد کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ شروع ہو جاتا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم دین کے متعلق جو کچھ فرماتے خود بھی اس پر عمل کرتے اور قوم کو اس پر عمل کرنے کی تلقین فرماتے۔ حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم ان اُموں میں بھی حضور علیہ السلام کے اتباع کی کوشش کرتے جو حضور علیہ السلام کے ساتھ خاص تھے یا جن کو حضور علیہ السلام نے از خود اپنے لیے مقرر کر لیا تھا جیسے صوم وصال۔ چنانچہ اس دور میں مومن مسلمان کی پہچان ہی یہ ہو گئی تھی کہ جو زندگی کے ہر معاملہ میں حضور علیہ السلام کی ہدایات کو عملی طور پر قبول کئے ہوئے ہو۔ حضور علیہ السلام پانچ وقت خود نماز پڑھاتے تھے اور ہر مکلّف مسلمان کے لیے باجماعت نماز ادا کرنا ضروری تھا۔ جو بھی نماز پڑھتا تھا وہ نماز کے مسائل و احکام حضور علیہ السلام کے قول و عمل سے اخذ کر کے نہ صرف اپنے علم میں لے آتا بلکہ ان پہ پانچ وقت عمل بھی کرتا تھا۔ حج کا موسم آتا تو حضور علیہ السلام صحابہ کے ہمراہ حج فرماتے اور اس سلسلہ میں جو اُمور پیش آتے ان کا تصفیہ فرما دیتے۔ سال گزر جانے پر زکوٰۃ کی وصولی کے لیے قاصدوں کو بھیجتے اور زکوٰۃ وصول کی

جاتی ۔ جنگ کا موقع آتا تو خود سربراہی کے فرائض سرانجام دیتے اور جنگ کے متعلق قواعد و ضوابط بیان فرماتے۔ جنگ ختم ہوتی تو مالِ غنیمت کی تقسیم، قیدیوں کا تبادلہ اور اسی نوع کے متعدد امور سے متعلق ہدایات دیتے معاہدہ یا صلح کی ضرورت پیش آتی تو اس کے احکام و مسائل سے آگاہ فرماتے ۔ غرضیکہ کوئی معاملہ ہوتا خواہ دینی یا سیاسی، معاشی، اقتصادی، داخلی و خارجی، زرعی و صنعتی، ملکی یا بیرونی، ان سب کے متعلق ہدایاتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر فوری طور پر عمل شروع ہو جاتا ۔ ظاہر ہے کہ جو چیز تقریر کے عمل سے گزر کر روزمرہ کے عمل سے رواج پاتے اور قوم کی زندگی کا لائحہ عمل اور دستورِ حیات بن جائے ۔ اس کا مٹنا اور اس میں تغیر و تبدل ہونا محال نہیں تو ناممکن ضرور ہے ۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ عہدِ نبوی میں اسلام نے ریاست کی شکل اختیار کر لی تھی اور اسلامی سٹیٹ کا قانون قرآن اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہدایات تھیں ۔ مثلاً جب زکوٰۃ کے احکام جاری کیے گئے تو ہر سال ڈھائی روپیہ سینکڑہ کے حساب سے ۵۲/۱/۲ تولے چاندی ۷/۱/۲ تولے سونے سے وصول کی جانے لگی ۔ اسی طرح گائے، بھینس، بکری، بھیڑ، اونٹ کا نصاب مقرر ہوا اور ان کی وصولی کی شرح بھی متعین کی گئی۔ زرعی پیداوار سے بھی مقررہ زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی ۔ یہی حال نکاح، طلاق، عدت، میراث، حدود و قصاص، حقوق و معاملات وغیرہ ذالک امور کا تھا ۔ ان امور کے احکامات مرتب کر کے علماء و قضاۃ، امراء و عمال کے سپرد کیا گیا ۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے ان امور کی تبلیغ کے لیے مبلغ جایا کرتے تھے اور یہ مبلغین صرف تبلیغ ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان پر عمل کر کے دکھاتے تھے اور وہاں کے باشندوں کو اس سے آگاہ کرتے اور اس طرح حدیثوں کو عملی شکل دے کر ان کی حفاظت کی طرح ڈال دیا کرتے تھے ۔ بس جو چیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کے عہد میں قانون بن گئی اس کا محفوظ رہنا لازمی و لابدی تھا ۔ پھر ایسا بھی ہوتا تھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو مبلغ احکام کی تبلیغ و نفاذ کے لیے جاتا تو وہاں کے لوگ خود خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اس امر کی تصدیق و تحقیق کر لیتے تھے کہ یہ مبلغ حضور علیہ السلام کا بھیجا ہوا ہے یا نہیں اور اس نے جو احکام ہمیں سنائے ہیں وہ آپ کے ہیں یا نہیں ۔ ایسے لوگ جب خدمتِ نبوی میں آتے تو حضور علیہ السلام اپنے مبلغ کی تصدیق فرما دیتے تھے ۔ چنانچہ صحیح بخاری و دیگر کتبِ حدیث میں ایسے متعدد واقعات مل جاتے ہیں ۔ اسی طرح یہ رواج بھی تھا کہ اگر کسی کو کسی لفظ میں شبہ گزرتا تو اس کو دوبارہ سُنا کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصحیح کر لیتا جیسا کہ بخاری کتاب العلم باب القرأۃ والعرض علی المحدث میں مذکور ہے ۔

یہ کیفیت تو عہدِ نبوی کی تھی ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے بعد خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی حدیث قانونی ماخذ تھی ۔ سیدنا صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمانِ غنی، علی مرتضٰے رضوان اللہ تعالےٰ علیہم کے ادوار میں قرآنِ مجید کے بعد سنتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا ۔ خلفاء اربعہ اور تمام صحابہ کرام

کا بالاتفاق یہی روش تھی کہ جب ان کے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو پہلے کتاب میں دیکھتے ۔ اگر اس میں حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے ۔ اگر قرآنِ مجید میں نہ پاتے تو پھر سنتِ رسول میں تلاش کرتے اور اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے ۔ حتیٰ کہ اگر ان کو حدیث یاد نہ ہوتی تو صحابہ کرام کو جمع کر کے ان سے دریافت کرتے کہ کسی کو حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث اس معاملہ میں یاد ہو تو بتائے ۔ بسا اوقات جماعت کی جماعت مطلوبہ حدیث بیان کر دیتی تو اس پر صدیق اکبر فرماتے ۔

" الحمد للہ کہ ہم میں ایسے لوگ اللہ نے پیدا کیے ہیں جو حدیث یاد رکھتے ہیں (دارمی ص ۳۲) یہی کیفیت تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں تھی ۔ وہ بھی ہر معاملہ اور ہر مقدمہ میں سنت رسول اللہ سے روشنی حاصل کر کے فیصلہ کیا کرتے تھے ۔ غور کیجیے کہ جب حدیث رسول اللہ کی تبلیغ و اشاعت کی یہ کیفیت ہو اور اس کے حفظ و تکرار کی یہ نوعیت ہو کہ ہر مرحلہ میں اس سے مسائل معلوم کیے جائیں تو ایسی صورت میں حدیثوں میں رد و بدل ہو جانے کا دعویٰ کرنا اور احادیثِ نبویہ کے ذخیرہ کو جعلی قرار دینا انصاف و دیانت کا خون کرنا نہیں تو اور کیا ہے (واللہ یھدی من یشاء)

مختصر حالات امام بخاری

نام مبارک محمد، ابو عبد اللہ کنیت ہے ۔ والد ماجد کا نام اسمٰعیل ہے جو چوتھے طبقہ کے معتبر محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ ان کی حیثیت اور مرتبہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت امام مالک اور حماد جیسے محدثین کی انھوں نے شاگردی کی اور ابن مبارک جیسے شیوخ کی صحبت میں مدتوں رہے ۔ اہلِ عراق نے اکثر حدیثیں ان سے روایت کیں ۔ خود امام بخاری نے تاریخ کبیر میں اپنے والد کے فضل و کمال کو بیان کیا ۔

نسب

امام بخاری کا سلسلہ نسب یہ ہے ۔ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بروزبہ ۔ آپ کے جد اعلیٰ بروزبہ فارس کے رہنے والے اور مذہباً مجوسی تھے ۔ امام صاحب کے جد امجد مغیرہ پہلے شخص ہیں جو اس خاندان میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور اس زمانہ کے قاعدہ کے مطابق جس شخص کے ہاتھ پر اسلام لاتے اسی کی نسبت سے نو مسلم مشہور ہو جاتے ۔ مغیرہ چونکہ امیر بخارا یمان جعفی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اس لیے جعفی مشہور ہوئے ۔ یہ لقب نسل در نسل منتقل ہوتا ہوا امام تک پہنچا ۔ اس بنا پر امام بخاری جعفی کے لقب سے بھی مشہور ہیں ۔

وطن

امام صاحب کے نام سے زیادہ اُن کی وطنیت مشہور ہے ۔ اس لیے اس قدر ہر شخص جانتا ہے کہ ان کا اصل وطن بخارا ہے ۔ دوسری صدی کے اواخر میں جب بخارا کو امام صاحب کی پیدائش کا شرف حاصل ہوا ۔ خلفاءِ عباسیہ کے زیرِ حکومت تھا اور مقامی انتظام کے لیے دربارِ خلافت سے ایک گورنر رہا کرتا تھا ۔

ولادت و یتیمی

۱۳۔ شوال ۱۹۴ھ بروز جمعہ امام صاحب پیدا ہوئے۔ ابھی کھیل کود کے دن ختم نہ ہوئے تھے کہ آپ کے والد اسمٰعیل یتیمی کا داغ دے کر ہمیشہ کے لیے آپ سے رخصت ہو گئے۔ آپ کی والدہ جن کی سرپرستی اور توجہ پہ ان کی ترقی کا دارو مدار تھا ان کو اور ان کے بڑے بھائی احمد کو لے کر بخارا سے مکہ معظمہ چلی آئیں۔ رہیں آپ نے نشوونما پائی اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ ابھی آپ کم سن ہی تھے کہ آپ کی آنکھیں جاتی رہیں۔ آپ والد آپ کے لیے رو رو کر بارگاہِ الٰہی میں دعائیں کرتی تھیں کہ ایک دن، رات کو خواب میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوئیں۔ آپ نے فرمایا۔ تیری دُعا قبول ہو گئی۔ صبح کو دیکھا تو آپ کی آنکھیں روشن تھیں (اشعۃ اللمعات) اس کے بعد آپ کی بینائی کا یہ عالم تھا کہ چاند کی چاندنی میں کتابیں لکھتے تھے۔

حُلیہ، اخلاق و عادات

امام بخاری کا حُلیہ یہ تھا۔ جسم دُبلا پتلا، قد میانہ، رنگ گندمی، طبیعت حد درجہ غیور اور خودداری تھی کہ تمام عمر امراء و سلاطین سے وظیفہ قبول نہیں کیا۔ اپنے پدر بزرگوار سے جو کچھ میراث میں ملا اسی پر آخری عمر تک قناعت کی۔ خود تو علم کی خدمت میں مصروف رہے۔ مضاربت کے طور پر تجارت میں شریک ہوتے اور اسی کی قلیل آمدنی سے ضروریات زندگی پوری کرتے۔ زندگی گو بہت ہی سادہ تھی مگر صفائی کا اس درجہ خیال فرماتے کہ فرش پر ایک تنکا پڑا رہنا گوارہ نہ ہوتا۔ غذا نہایت سادہ کھاتے۔ ایک بار بیمار ہوئے تو اطباء نے آپ کا قارورہ دیکھ کر کہا۔ یہ تو کسی راہب کا قارورہ ہے جو روٹی کے ساتھ سالن نہیں کھاتا۔ امام سے پوچھا گیا تو فرمایا۔ چالیس سال سے صرف روٹی پر قناعت ہے۔

جَودتِ ذہن

امام صاحب فطرۃً نہایت قوی الحافظہ تھے۔ فطرت کی اس فیاضی سے انھوں نے فنِ حدیث کی تحصیل میں بہت فائدہ اٹھایا۔ استاد سے جو حدیث سُن لیتے فوراً یاد کر لیتے گیارہ سال کی عمر میں آپ نے اپنے شیخ کی غلطی پکڑی۔ ۱۵ سال کی عمر میں ابن مبارک، امام وکیع اور دیگر محدثین کی کتبِ حدیث کو مع ان کے راویوں کے حالات کے حفظ کیا۔ ۱۷ برس کی عمر میں قضایائے صحابہ و تابعین تالیف کی۔ پھر روضۂ نبوی کے جوار میں بیٹھ کر تاریخ کبیر لکھی۔

امام بخاری کے حافظہ کا حال حاشد بن اسماعیل نے یوں بیان کیا ہے کہ بخاری ہمارے ساتھ حدیث سُننے کے لیے محدثین کی مجلسوں میں جایا کرتے تھے تو لکھتے نہ تھے۔ بہت دنوں تک ہم یہی دیکھتے رہے۔ ان سے اس باب میں ہم کچھ کہتے تو وہ کچھ نہ بولتے۔ ایک دن انھوں نے کہا۔ تم لوگ مجھ کو بہت کہتے رہتے۔ لاؤ مجھ کو دکھاؤ تم نے اب تک کتنی حدیثیں لکھی ہیں۔ ہم نے دکھایا تو پندرہ ہزار سے زائد حدیثیں تھیں۔ اس کے بعد ہماری بیاضیں انھوں نے ہم کو دیں اور ان حدیثوں کو اپنی یاد سے زبانی سُنانا شروع کر دیا تو کُل کی کُل سنا دیں۔ ان کی یادداشت

اتنی درست تھی کہ ہم نے ان کی یاد سے اپنی بیاضوں کی غلطیاں ٹھیک کیں۔ اس کے بعد بخاری نے کہا کہ تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں اپنا وقت برباد کرنے کے لیے روزانہ آتا ہوں (تذکرہ جلد ۲ صہ ۱۳۲ ۔ مقدمہ فتح الباری صہ ۵۱۴) خود امام بخاری فرماتے تھے کہ مجھ کو ایک لاکھ صحیح حدیثیں اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں (تذکرہ جلد ۲ صہ ۱۲۳ مقدمہ صہ ۵۷۵) بخاری کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ جب وہ بغداد گئے تو وہاں کے محدثین نے متفق ہو کر ان کے حافظ کا امتحان کرنا چاہا اور اس کی یہ صورت تجویز ہوئی کہ سو حدیثیں چھانٹ کر ان کے سند و متن کو الٹ پلٹ کر دکھایا گیا۔ اس کی سند اس کے ساتھ اور اس کی اس کے ساتھ جوڑ دی گئی۔ پھر دس محدث چنے گئے اور ان میں سے ہر ایک کو دس دس حدیثیں دی گئی کہ جب مجلس میں سب لوگ باطمینان بیٹھ جائیں تو ایک آدمی آگے بڑھ کر ایک حدیثِ تبدیل پڑھ کر امام بخاری سے پوچھے کہ آپ کو یہ حدیث معلوم ہے ؟ اسی طرح دسوں حدیثوں کو پڑھ کر پوچھتا جائے۔ جب وہ فارغ ہو جائے تو دوسرا آگے بڑھے۔ اسی طرح دسوں آدمی پوچھیں۔ یہ طے کر کے بخاری کو ایک مجلس میں دعوت دے کر بلایا گیا اور بہت بڑا مجمع کیا گیا۔ اس مجمع میں طے شدہ تجویز کے مطابق جو لوگ مقرر ہوئے تھے انھوں نے پوچھنا شروع کیا۔ بخاری نے ہر سوال کے جواب میں کہا کہ میں اس کو نہیں مانتا۔ جب وہ دسوں آدمی پوچھ چکے تو بخاری نے سب سے پہلے پوچھنے والے کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے پہلی حدیث یوں پڑھی ہے حالانکہ وہ اس طرح ہے اور دوسری حدیث کی سند یہ بیان کی ہے حالانکہ اس کی سند یوں ہے۔ اسی طرح فرداً فرداً ترتیب کے ساتھ ہر حدیث کی سند و متن کی صحیح نسبت بیان کر گئے۔ اس وقت لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کے بے مثال حافظہ کے قائل ہو گئے (اکمال فی اسماء الرجال صہ ۶۲۶) امام صاحب کی اس وسعتِ معلومات اور معرفتِ حدیث کو دیکھ کر اکثر علماء کہا کرتے تھے۔

انما ھو اٰیۃ من اٰیات اللّٰہ تمشی علیٰ وجہ الارض ماخلق الّا للحدیث

امام بخاری خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں جو زمین پر چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ خدا نے ان کو صرف حدیث کے لیے پیدا کیا۔

مرتبہ و مقام آپ حدیث کے امام اور اس فن میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ محدثین نے آپ کو امام الدنیا، امیر المومنین فی الحدیث، ناصر الاحادیث، سید المحدثین کے معزز القابات سے یاد کیا ہے اور سب نے آپ کے علم و فضل کو تسلیم کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا۔ خراسان کی زمین میں بخاری جیسا کوئی پیدا نہ ہوا۔ اسحٰق بن راہویہ نے فرمایا۔ اگر امام بخاری حسن بصری کے زمانہ میں ہوتے تو حسن بصری حدیث و فقہ میں آپ کے محتاج ہوتے۔ امام ترمذی نے فرمایا۔ میں نے عراق و خراسان میں بخاری سے زیادہ حدیث کا ماہر کسی کو نہ پایا۔ امام مسلم نے فرمایا۔ بخاری بے نظیر شخصیت ہیں۔ احمد بن حمدون کہتے ہیں کہ

ایک مرتبہ امام مسلم، امام بخاری کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے۔ بخاری مجھے اپنے قدم چومنے دو ___ تم سیّد المحدثین ہو۔ امام محمد بن اسحٰق نے فرمایا کہ اس آسمان کے نیچے میں نے بخاری جیسا حافظِ حدیث کسی کو نہ پایا۔ غرضکہ ایک عالم نے امام بخاری کے علم و فضل، ورع، تقویٰ، جودتِ ذہن وحفظ وضبط، ثقاہت و درایت کا اعتراف کیا ہے جس کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

اساتذہ و شیوخ

اگرچہ اس امر کا تفصیلی حال معلوم نہیں ہوتا کہ امام نے ابتداءً کن کن مشائخ سے فنِ حدیث حاصل کیا۔ لیکن اس قدر مسلّم ہے کہ آپ کا فضل و کمال اسحٰق بن راہویہ اور علی بن مدینی کے فیضانِ تعلیم کا زیادہ ممنون ہے۔ امام کے شوقِ تحصیلِ حدیث کا یہ عالم تھا کہ بغداد، مصر، خراسان، خوارزم، حجاز و شام میں کوئی ایسا محدّث نہ تھا جس سے امام نے کچھ نہ کچھ اخذ نہ کیا ہو۔ ان تمام شیوخ و اساتذہ کی تعداد ایک ہزار اسی تک پہنچتی ہے۔

امام بخاری کو زمانہ تحصیلِ علم ہی میں تصنیف و تالیف کا شوق ہوا اور آخری عمر تک جاری رہا۔ آپ نے اٹھارہ یا سترہ برس کی عمر میں کتاب قضایائے صحابہ و تابعین لکھی۔ تاریخ کبیر مدینہ منورہ کی چاندنی راتوں میں لکھی۔ تاریخ کبیر، تاریخ اوسط، تاریخ صغیر، خلق افعال عباد، رسالہ رفع الیدین۔ قرأت خلف الامام، الادب المفرد، برالوالدین، کتاب الضعفاء، الجامع الکبیر، التفسیر الکبیر، کتاب الاشربہ، کتاب الہبہ، کتاب المبسوط، کتاب الکنیٰ، کتاب المناقب، کتاب العلل، کتاب الفوائد بھی آپ کی تالیفات ہیں۔

امام کی شہرت وحلقۂ درس

امام کے فضل و کمال کی شہرت ان کے زمانہ تعلیم ہی میں دُور دُور تک پہنچ چکی تھی۔ بڑے بڑے محدثین جو خود امامِ فن تھے، ان کے کسی مجموعۂ حدیث کو امام صاحب تسلیم کرتے تو وہ فخر یہ کہتے۔ ہماری ان حدیثوں کو امام بخاری جیسے نقاد نے صحیح تسلیم کیا ہے۔ امام صاحب کا حلقہ درس بہت وسیع تھا۔ اسلامی دُنیا کے ہر حصہ سے طلباء کی جماعتیں جوق در جوق آکر شریک ہوتیں۔ آپ کے شاگردوں میں حافظ ابوعیسیٰ[1] محمد بن عیسیٰ ترمذی، ابوعبدالرحمٰن[2] نسائی، مسلم بن[3] حجاج جیسے محدث نظر آتے ہیں جو صحاح ستہ کے تین جلیل القدر رکن بھی ہیں۔ ابن خزیمہ، محمد بن نصر مروزی، صالح بن محمد جو آگے چل کر بہت پائے کے مصنف ہیں۔ امام بخاری کے عام شاگردوں میں شاگرد ہیں۔

---

[1] ان کی وفات ۲۷۹ھ میں ترمذان میں ہوئی جو خراسان کا ایک شہر ہے۔ آخر عمر میں آنکھوں سے معذور ہوگئے۔ جامع ترمذی آپ کی مشہور تالیف ہے جو جامع کی حیثیت سے بخاری شریف کے بعد درجہ رکھتی ہے [2] یہ حدیث کے مشہور امام ہیں۔ پیدائش ۲۲۵ھ وفات ۳۰۳ھ [3] نسائی شریف کے مؤلف پیدائش ــــھ وفات ــــھ ہے [4] آپ کی پیدائش ۲۰۴ھ اور وفات ۲۶۱ھ ہے۔ آپ کا اصل وطن نیشا پور تھا۔ مسلم شریف کے مؤلف ہیں۔ صحاح میں عام طور پر بخاری شریف کے بعد آپ کی صحیح مسلم ہی کو اصح سمجھا جاتا ہے۔

تحصیلِ علم کے لیے سفر

امام صاحب نے تحصیلِ علمِ حدیث کے لیے دُور دراز مقامات کے سفر کیے۔ مصر، شام، عراق، کوفہ اور بغداد تک پہنچے۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ میں نے سماعتِ حدیث کے لیے دو دفعہ شام و مصر کا اور چار دفعہ کوفہ و بغداد کا، چھ دفعہ حجاز کا سفر کیا اور شمار نہیں کر سکتا کہ کتنی دفعہ کوفہ و بغداد آیا ہوں اور گیا ہوں۔ امام نے حجاز میں متواتر چھ سال تک قیام کیا۔ بصرہ میں چار بار گئے اور بعض مرتبہ پانچ پانچ برس تک قیام کیا۔ ایامِ حج میں مکہ چلے جاتے اور فراغت کے بعد پھر بصرہ آجاتے۔ ان تمام سفروں میں نیشاپور کا سفر امتیازی شان کا تھا۔ آپ جس شان سے نیشاپور میں داخل ہوئے اور جس جوش سے وہاں آپ کا خیر مقدم ہوا۔ اس کی تصویر خود امام مسلم نے خود ان لفظوں میں کھینچی ہے۔

"امام بخاری جب نیشاپور تشریف لائے تو اس دھوم دھام سے ان کا استقبال ہوا کہ والیانِ ملک اور سلاطین کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا"

جلاوطنی اور بخارا کو مراجعت

لیکن نیشاپور آپ کو بعض حاسدوں کی زیادتیوں کی وجہ سے چھوڑنا پڑا اور پھر آپ بخارا واپس ہوئے۔ اہلِ بخارا کو جب معلوم ہوا کہ ان کا ہم وطن کمالِ شہرت کی خلعت سے آراستہ ہوکر پھر اپنے وطن کو آرہا ہے تو جوشِ مسرت میں استقبال کے لیے آگے بڑھے۔ شہر سے دو کوس کے فاصلہ پہ امرارِ شہر نے خیر مقدم کیا اور درہم و دینار نچھاور کرتے ہوئے نعرۂ تکبیر کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ شہر میں لائے۔ بخارا میں کچھ دن تو آرام و راحت سے زندگی بسر ہوئی لیکن آخر میں اپنی غیور طبیعت کی بدولت مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ امیرِ بخارا نے آپ کو جلاوطن[۵] کر دیا اور آپ مقامِ خرتنگ میں مقیم ہو گئے۔

خرتنگ میں قیام اور وفات

امام صاحب کے بعض رشتہ دار سمرقند کے چھوٹے سے قریہ خرتنگ میں رہتے تھے۔ امام صاحب بخارا سے نکل کر وہاں چلے آئے اور آخر عمر تک وہیں رہے جلاوطنی کا ان کو سخت صدمہ تھا۔ ایک روز نمازِ تہجد سے فارغ ہوئے تو زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

"الٰہی باوجود وسعت کے تیری زمین میرے لیے تنگ ہوگئی ہے۔ اس لیے اب مجھے اُٹھالے"

ابھی پورا مہینہ نہیں گزرا تھا کہ بعد نمازِ عشار آپ کی رحلت ہوئی۔ آپ شوال کی ۳ تاریخ کو پیدا ہوئے اور شوال ہی میں وفات پائی۔ سالِ پیدائش ۳ شوال ۱۹۴ھ ہے اور سالِ وفات ۱ شوال ۲۵۶ھ ہے۔

---

۵ امیرِ بخارا نے امام صاحب سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ دربار میں آکر مجھے بخاری و تاریخ کبیر سنائیں۔ نیز قصرِ شاہی میں آکر شہزادوں کو تعلیم بھی دیں۔ امام نے اس کی اس خواہش کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ میں علم کو ذلیل کرنا نہیں چاہتا۔ میری مجلس عام ہے جس کا جی چاہے آکر شریک ہو۔ امیرِ بخارا کو آپ کا یہ استغنار ناگوار گذرا۔ حکم دیدیا کہ ہمارے شہر سے نکل جایئے (اکمال فی اسماء الرجال ص ۶۲۷)

اس حساب سے تیرہ دن کم باسٹھ برس کی عمر ہوئی - دوسرے دن جب خبر مشہور ہوئی تو سمرقند میں تھلکہ مچ گیا۔ دھوم دھام سے جنازہ اٹھایا گیا اور بڑے بڑے علماء و امراء باچشمِ نم نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے - نمازِ ظہر کے بعد جنازہ اٹھایا گیا - جنازہ کے بعد جب آپ کے چہرہ سے کفن اٹھایا گیا تو مشک و عنبر کی خوشبو سے لوگوں کے دماغ معطّر ہو گئے - حتیٰ کہ آپ کی قبر سے عرصہ تک خوشبو آتی رہی - شیخ الاسلام امام الدنیا رئیس المحدثین ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری علیہ الرحمۃ کی وفات کے بعد ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام کے کسی کا انتظار کر رہے ہیں - عرض کی گئی حضور علیہ السلام کس کا انتظار ہے ؟ فرمایا ــــ محمد بن اسماعیل بخاری کا -

تاریخ ولادت :- آپ کی تاریخِ ولادت صدق [۱۹۴] مدت عمر حمید [۶۲] وفات نور [۲۵۶] کے الفاظ سے نکلتی ہے - طاب اللہ ثراہ

مولوی وحید الزمان جو وہابی خیال کے تھے انھوں نے بھی لکھا ۱ - کہ امام بخاری کی قبر کی مٹی سے خوشبو آتی تھی اور لوگ کئی روز تک ان کی قبر کی مٹی بطور تبرک لے جاتے رہے۔ ۲- ۲۶۴ھ میں سمرقند میں قحط پڑا تو لوگ امام بخاری کی قبر مبارک پر آئے وہاں روئے اور آپ کی قبر کے وسیلہ سے پانی مانگا - اسی وقت شدت کی بارش ہوئی جو سات روز تک جاری رہی اور خرتنگ کے لوگ بارش کی وجہ سے سات روز تک گھروں سے نہ نکل سکے ۳- صدہا مشائخ نے تجربہ کیا صحیح بخاری کا ختم ہر مطلب و مقصد کے لیے مجرّب ہے ۴- امام صاحب کے پاس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چند موئے مبارک تھے جن کو وہ اپنے لباس میں بطور تبرک رکھتے تھے (تسہیل القاری صـ۳۳ مصنفہ مولوی وحید الزمان صاحب)

تدوینِ بخاری امام خود بیان کرتے ہیں کہ صحیح بخاری کی تدوین کا محرک ایک خواب ہوا - ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما ہیں اور میں پنکھے سے ہوا کر رہا ہوں - معبرین نے اس کی تعبیر دی کہ بخاری تم حضور علیہ السلام سے جھوٹ کو جُدا کرو گے یعنی آپ کے ارشادات کو صحیح جمع کرو گے - چنانچہ اس کے بعد میرے دل میں صحیح بخاری کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا اور سولہ سال کے عرصہ میں اس کی تکمیل ہوئی - امام نے سب سے پہلے اس کا مسودہ مسجدِ حرام میں بیٹھ کر لکھا - لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ضروری عنوان لکھ لیتے تھے پھر ہر عنوان کے نیچے حدیث درج کرتے - ہر حدیث کے اندراج سے پہلے آبِ زمزم سے غسل فرماتے - مقامِ ابراہیم میں دو رکعت نفل استخارہ پڑھتے تھے - بعدہٗ حدیث قلمبند فرماتے - مسودہ مکمل کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں روضہ مبارک و منبر اقدس کے درمیان بیٹھ کر مسودہ کو دوبارہ لکھا - شیخ عبدالحق محدّث دہلوی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ بعض صلحاء نے خواب میں دیکھا کہ جس

جگہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم قدم مبارک رکھتے ہیں ٹھیک اسی جگہ امام کا قدم پڑتا ہے۔

صحیح بخاری کا پورا نام یہ ہے۔ "الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللّٰہ و سننہ وایامہ۔ (صلی اللّٰہ علیہ وسلم)" امام نے جن امور کا اس کتاب میں ذکر کیا ہے ان سب کی طرف نام ہی میں اشارہ کر دیا ہے اَلْجَامِعُ کتبِ حدیث کی مختلف قسمیں ہیں جیسے مسند، مستخرج، مستدرک وغیرہ۔ جامع بھی کتبِ احادیث کی ایک قسم ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں جامع اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں مندرجہ ذیل آٹھ باتیں پائی جاتی ہیں:۔

ا۔ ۱۔ سیر پر مشتمل روایات۔ سیر وایام فقہاء و محدثین کی اصطلاح میں ان روایات کو کہتے ہیں جو غزوات اور جہاد سے متعلق ہوں ۲۔ آداب پر مشتمل روایات ۳۔ تفسیرِ قرآن سے متعلق روایات ۴۔ عقائد یعنی وہ روایات جن میں ایمان کے اصول و فروع کا بیان ہو ۵۔ وہ روایات جن میں فتنوں اور آزمائشوں کی خبریں ہوں۔ ۶۔ احکام یعنی وہ روایات جن میں امر و نواہی کی توضیحات ہوں ۷۔ مناقب یعنی وہ روایتیں جن میں افراد کے یا قبائل کے یا قریوں اور بستیوں کے مناقب درج ہوں ۸۔ وہ روایات جن میں علاماتِ قیامت کا بیان ہو۔ یہ ہیں وہ آٹھ امور جن کا اجتماع کسی کتاب کو اصطلاحاً جامع بناتا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں یہ تمام اجزاء موجود ہیں۔

ب۔ صحیح کے متعلق بس یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ صحیح اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے تمام راوی عادل ثقہ ہوں۔ سند متصل ہو۔ مسند یعنی متصل جو منقطع اور مرسل کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ جس کا اصطلاحی مطلب یہ ہے کہ درمیان میں کوئی راوی نہ چھوٹا ہو۔ امام نے چونکہ نام ہی میں من احادیث رسول اللّٰہ کا لفظ رکھ دیا ہے اس لیے المسند کا مطلب یہ ہوا (مرفوع و متصل احادیث) یعنی وہ حدیثیں جن کے راویوں کا سلسلہ بیان کرنے والے سے لے کر حضور علیہ السلام تک بلاشبہ ملا ہوا ہو اور صحابی کا حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ملنا ثابت ہو۔ سننہ وایامہ یعنی اس مجموعہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سُنن و ایام درج ہوں۔ امام نے سنن و ایام سے حضور علیہ السلام کی فعلی احادیث اور لفظ احادیث سے حضور علیہ السلام کی قولی احادیث مراد لی ہیں۔ یہ نہیں تو پھر لفظِ حدیث کہنے کے بعد خصوصیت کے لیے سُنن و ایام کا ذکر کیا ہے۔

احادیث کی تعداد۔ امام بخاری کو چھ لاکھ حدیثیں مع ان کے راویوں کے نام و حالات کے یاد تھیں۔ سات ہزار دو سو پچھتّر مسند حدیثیں آپ نے بخاری میں درج کیں۔ مکررات کو علیحدہ کر دیا جائے تو چار ہزار حدیثیں ہیں۔ صحیح بخاری میں ایک سو ساٹھ کتاب ہیں اور تین ہزار چار سو باب ہیں۔ ان تمام شیوخ کی تعداد جن سے بخاری میں حدیثیں لی گئیں ۲۰۸۹ ہیں۔ تیرہ سو چالیس مشائخ ایسے ہیں جن سے مسلم نے روایت نہیں کی صرف امام بخاری نے روایت

کی۔صحیح بخاری میں بائیس حدیثیں ثلاثیات ہیں جن پر امام کو فخر ہے اور بجا طور پر فخر ہے۔ثلاثیات اس حدیث کو کہتے ہیں جو صرف تین راویوں کے واسطے سے حضور علیہ السلام تک پہنچے۔

صحاحِ ستّہ۔بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ۔ ان چھ کتابوں کو صحاحِ ستّہ کہتے ہیں۔جمہور محدثین کے نزدیک صحیح بخاری تمام کتبِ مصنّفہ پر مقدم ہے۔نیز یہ بھی مشہور ہے کہ جمہور صحیح بخاری کو مسلم پر ترجیح دیتے ہیں۔یہ بحث بھی کی ہے کہ ان دونوں میں اصح کون ہے۔جس کی تفصیل طول وطویل کلام کو چاہتی ہے۔صحیح کی تعریف میں امام بخاری ومسلم کے مابین جو اختلاف ہے اس کی بحث بھی کافی طویل ہے۔پھر شذوذ اعلال کا مبحث نہایت پیچیدہ اور دقیق ہے جسے عوام کا مزاج بھی ہضم نہ کر پائیگا۔

۲۔متفق علیہ وہ حدیث ہے جس کو بخاری ومسلم دونوں نے تخریج کیا ہے۔اسی کو "اخرجہ الشیخان" کہتے ہیں۔تمام احادیث متفق علیہ دو ہزار تین سو چھبیس (۲۳۲۶) ہیں۔مذہبِ جمہور یہ ہے کہ سب سے بلند درجہ حدیثِ صحیح متفق علیہ کا ہے۔پھر اس کو جسے تنہا بخاری لائے۔پھر اس کا جس کو تنہا مسلم نے ذکر کیا۔پھر اس کا جو بخاری ومسلم کی شرطوں پر ہو۔پھر اس کا جو بخاری کی شرط پر ہو۔پھر اس کا جو مسلم کی شرط پر ہو۔پھر بخاری ومسلم کے سوا ان آئمہ کی حدیثوں کا مرتبہ ہے جنھوں نے التزامِ صحت کا کر کے صحیح کی ہیں۔شرطِ بخاری ومسلم کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کے راوی ان شرطوں کے ساتھ متصف ہوں۔جس کی رعایت بخاری ومسلم نے کی ہے جیسے راوی کا ضبط، عدالت وغیرہ۔بہرحال بخاری حدیثِ نبویہ کا نہایت معتبر ذخیرہ ہے اور بہت ہی مقبول کتاب۔اس کی محبوبیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عربی زبان میں تقریباً ستر سے زیادہ بخاری کی شرحیں موجود ہیں۔واضح ہو کہ تمام صحیح حدیثیں صرف بخاری میں منحصر نہیں ہیں۔خود بخاری نے بہت سی ایسی حدیثوں کو چھوڑا ہے۔جو صحیح ہونے کے باوجود ان کی شرط پر نہیں۔ان کو امام حاکم ابو عبداللہ نیشاپوری نے مستدرک میں جمع کیا ہے اور کہا۔علی شرط بخاری۔

کتب حدیث کی تعریفات

صحاحِ ستّہ میں مذکورہ بالا اصطلاح کے مطابق ۱۔**جامع** صرف بخاری شریف اور ترمذی شریف ہے۔مسلم شریف کو بعض حضرات قلّتِ تفسیر کی وجہ سے جامع نہیں کہتے اور بعض اس قلت کو نظرانداز کر کے مسلم پر بھی جامع کا اطلاق کر دیتے ہیں ۲۔**سنن** جس میں بترتیبِ ابواب فقہ صرف احکامِ مذکور ہوں۔صحاح ستہ میں بایں معنیٰ سنن، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ ہے ۳۔**مسند** جس میں صحابہ کرام کی احادیث بترتیبِ مراتب مذکور ہوں ۴۔**معجم** جس میں شیوخ کی احادیث بترتیب مراتب ذکر کی جائیں ۵۔**جزء** جس میں صرف ایک مسئلہ کے متعلق احادیث جمع کر دی جائیں ۶۔**مفرد** جس میں صرف ایک شخص کی روایت کردہ احادیث ذکر کی جائیں ۷۔**غریبہ**

حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں صرف ایک تلمیذ کے تفردات کا ذکر ہو۔

مصطلحات حدیث

اب قارئین کے اضافہ معلومات کے لیے حدیث کے اصطلاحی ناموں اور قسموں کو حسب ضرورت بیان کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث جو واقعہ میں حدیث ہے وہ غلط یا ناقابل عمل نہیں ہو سکتی۔ حدیث کی جو قسمیں بیان کی جاتی ہیں اور جو احکام بتائے جاتے ہیں وہ صرف راویوں سے متعلق ہیں۔ یعنی یہ کہ راوی کس مرتبہ کا ہے اور یہ کس سے روایت کر رہا ہے اور روایت کا سلسلہ کہاں تک ہے۔ حضور علیہ السلام تک ہے یا صحابی تک یا تابعی تک۔ پھر اس حدیث کو بیان کرنے والے بہت ہیں یا ایک یا چند وغیرہ وغیرہ۔

علم اصول حدیث

۱۔ اصول حدیث۔ ایسے قواعد وضوابط کا جاننا جن سے حدیث کی سند اور متن کے حالات معلوم ہوں ۲۔ متن حدیث۔ حدیث کے ان الفاظ کو کہتے ہیں جو معانی مقصودہ پر دلالت کرتے ہوں ۳۔ سند۔ حدیث کے تین راویوں کو کہتے ہیں ۴۔ علم حدیث۔ وہ علم ہے جس کے ذریعہ حضور سرور کائنات علیہ السلام کے قول، فعل اور تقریر معلوم ہو۔ ۵۔ علم حدیث کا موضوع حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس ہے۔ اس لحاظ سے کہ آپ اللہ تعالے کے آخری اور سچے رسول ہیں ۶۔ علم حدیث کی غرض یہ ہے کہ احکام خداوندی پر صحیح طور پر اللہ کی منشاء کے مطابق عمل کر کے دارین کی سعادت حاصل کی جائے۔

حدیث کی تعریف

۱۔ حضور علیہ السلام کے قول فعل اور تقریر کو حدیث کہتے ہیں ۲۔ افعال سے حضور علیہ السلام کے وہ امور مراد ہیں جو آپ کی ذات اقدس سے ظاہر ہوکے اور ان کے اتباع کا حکم بھی دیا گیا۔ اس قید سے آپ کے طبعی اور خصوصی امور خارج ہوگئے ۳۔ بعض جمہور نے صحابہ و تابعین کے قول و فعل اور تقریر کو بھی حدیث سے موسوم کیا ہے ۴۔ تقریر کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے سامنے کسی نے کوئی کام کیا یا حضور علیہ السلام نے کسی کے کام پر اطلاع پائی اور آپ نے انکار نہ فرما کر اس کی توثیق فرمادی اور اس پر سکوت فرمایا۔

حدیث کی قسمیں مرفوع موقوف

۱۔ مرفوع وہ حدیث ہے جس کی سند حضور اکرم علیہ السلام تک پہنچ جائے۔ مثلاً کہا جائے حضور علیہ السلام نے فرمایا ۲۔ موقوف وہ حدیث ہے جو کسی صحابی تک پہنچے مثلاً کہا جائے ابن عباس نے فرمایا ۳۔ مقطوع وہ حدیث ہے جس کی سند تابعی تک پہنچے۔

فائدہ ۱۔ اثر، موقوف اور مقطوع حدیث کو کہتے ہیں۔ بعض حدیث مرفوع کو بھی اثر کہہ دیتے ہیں جیسے

ادعیہ ماثورہ و دعاء ماثورہ ۲۔ خبر اور حدیث دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ مگر بعض محدثین نے حدیث کو حضور علیہ السلام صحابہ اور تابعین کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور (لفظ) خبر کا اطلاق بادشاہوں کے قصے اور تاریخی واقعات پر کیا ہے۔

متواتر مشہور باعتبار اس بات کے کہ راوی تک اصل حدیث کس طرح پہنچی۔ چار قسم پر ہے ۱۔ متواتر وہ حدیث ہے جس کے راویوں کی کثرت اس درجہ کو پہنچ گئی ہو کہ عادت ان کے جھوٹ پر متفق ہونے کو محال جانے ۲۔ مشہور وہ حدیث ہے جس کو دو سے زیادہ راوی روایت کریں اسی کو مستفیض بھی کہتے ہیں ۳۔ عزیز وہ حدیث ہے جس کو دو راوی روایت کریں اور تمام اسناد میں کہیں دو سے کم نہ ہوں ۴۔ غریب وہ حدیث ہے جس کے سلسلۂ اسناد میں کہیں نہ کہیں تفرد یعنی ایک ہونا پایا جائے۔

فائدہ: اور مشہور کے علاوہ ، عزیز ، غریب کو اخبار احاد کہتے ہیں۔ یعنی خبر واحد وہ ہے جو جامع شروط تواتر نہ ہو۔ اور شہرت کو نہ پہنچتی ہو۔

فائدہ: حدیث مرفوع تین قسم پر ہے۔ قولی، فعلی، تقریری۔ ان سب کے معنیٰ بالکل ظاہر ہیں۔

خبر واحد مقبول کی قسمیں خبر واحد دو قسم پر ہے۔ مقبول۔ جس کے راوی صدق و عدالت کی جانب راجع ہوں اور اس کا سچا ہونا ثابت ہو گیا ہو تو یہ مقبول ہے ورنہ مردود۔ حدیث مقبول عند الجمہور واجب العمل ہے۔ خبر واحد مقبول کی چار قسمیں ہیں ۱۔ صحیح لذاتہ ۔ وہ ہے جو آخر تک عادل تام الضبط کی نقل سے متصل السند ثابت ہو اور اس میں کوئی قصور اور نقصان نہ ہو ۲۔ صحیح لغیرہ ۔ جس کی صفات مذکورہ میں کسی قسم کا نقصان ہو اور کثرت طرق سے اس کے نقصان کی تلافی ہو گئی ہو ۳۔ حسن لذاتہ ۔ جس کے نقصان کی تلافی نہ ہوئی ہو اور نقصان صرف ضبط میں ہو اور باقی صفتیں اپنے حال پر ہوں ۴۔ حسن لغیرہ وہ ضعیف حدیث ہے جس میں تعدد طرق سے اس کے ضعف کی تلافی ہو گئی ہو۔ مگر اسکی تمام صفات میں نقصان راہ پاتا ہو۔

فائدہ ۔ حدیث ضعیف وہ ہے جس میں وہ شرطیں نہ پائی جاتی ہوں جو صحیح اور حسن میں معتبر ہوں۔

حدیث کی دیگر قسمیں ۱۔ **حدیث متصل** ۔ اگر حدیث کے راویوں سے کوئی راوی درمیان سے نہ چھوٹے تو اس کو حدیث متصل کہتے ہیں ۲۔ **منقطع** وہ حدیث ہے جس کے ایک یا زیادہ راوی چھوٹ جائیں۔ ایک جگہ سے پیہم چھوٹے ہوں یا دو تین جگہ سے ۳۔ **معلق** وہ ہے کہ ابتدائے سند میں ایک یا زیادہ راوی چھوٹ گئے ہوں جیسے کہہ دیتے ہیں۔ قال رسول اللہ (حضور علیہ السلام نے فرمایا) اس میں ابتداء سند سے تمام راوی چھوڑ دیئے گئے اور کہہ دیا گیا قال رسول اللہ

۴- مرسل وہ ہے جس میں آخر سند سے بعد تابعین کے راوی ساقط کر دیئے گئے ہوں مثلاً تابعی کہے قال رسول اللہ ۵- معضل وہ ہے جس میں اثنائے اسناد میں دو راوی پیہم ساقط ہو گئے ہوں ۶- مُدلَّس اس فعل کو تدلیس، فاعل کو مدلس کہتے ہیں۔ تدلیس یہ ہے کہ راوی اپنے شیخ کا نام نہ لے اور اس سے اوپر کے شیخ سے روایت کرے اور لفظ ایسا لائے جس میں سماع کا وہم ہو۔ تدلیس بعض اوقات مذموم ہوتی ہے اور بعض موقع پر نہیں ہوتی ۷- مضطرب وہ حدیث ہے جس کی اسناد یا اصل متن میں راوی سے اختلاف واقع ہو جائے ۸- مدرج وہ ہے جس میں راوی کسی غرض یا مصلحت کی وجہ سے اپنا ذاتی کلام حدیث کے درمیان لے آئے ۹- روایۃ بالمعنیٰ کا مطلب یہ ہے کہ راوی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصل کلمات ذکر نہ کرے بلکہ حضور علیہ السلام کے منشار کو اپنے ذاتی لفظوں میں ادا کرے۔

فائدہ: یہ اس وقت جائز ہے جب کہ راوی عربی جانے اور اسالیب کلام، خواص عبارات اور مفہومات خطابات سے واقف ہو تاکہ روایت بالمعنیٰ میں خطا کمی یا زیادتی ہونے کا امکان نہ رہے۔

۱۰- مُسند وہ حدیث مرفوع ہے جس کی سند متصل ہو ۱۱- شاذ وہ حدیث ہے جو ثقہ اور معتبر راویوں کی روایت کے مخالف ہو ۱۲- مُنکر۔ وہ حدیث ہے جس کا راوی فسق، غفلت کی زیادتی اور غلط گوئی کے ساتھ مطعون ہو ۱۳- مُعَلَّلْ۔ اس اسناد کو کہتے ہیں جس میں ایسے اسباب اور علّتیں ہوں جو اس کی صحت کے لیے قادح ہوں ۱۴- عنعنہ یعنی عن فلاں عن فلاں کہہ کر روایت کرنا۔ ۱۵- معنعن جو بطریق عنعنہ روایت کی جائے وہ حدیث معنعن ہے ۱۶- متابع۔ جس کو راوی دوسری حدیث کے موافق روایت کرے اس سے حدیث میں قوت پیدا ہوتی ہے ۱۷- شاھد۔ جس کو راوی دوسری حدیث کے موافق روایت کرے اور وہ دونوں دو صحابیوں سے مروی ہوں۔

صحابی ۱- وہ شخص ہے جس نے عالمِ بیداری میں ایمان کی حالت میں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور ایمان پر ہی اس کا خاتمہ ہوا۔ ۲- تابعی بشرائط مذکورہ صحابی کو دیکھنے والے کو کہتے ہیں۔

صفاتِ قبولیت یہ ہیں۔ عدالت، تقویٰ، ضبط، اتصالِ سند ۱- عدالت اس کیفیتِ راسخہ در نفس کا نام ہے جو ملازمت تقویٰ اور استعمال مروۃ پر ہر وقت انسان کو آمادۂ کار رکھے۔ مروت سے مراد یہ ہے کہ خسیس افعال سے بھی پرہیز کرے جیسے بازار میں کھانا اور شارع عام پر پیشاب کرنا وغیرہ ۲- تقویٰ۔ شرک جلی و خفی اور گناہِ کبیرہ، فسق و بدعت وغیرہ اعمالِ بد سے کنارہ کش رہنے کا نام ہے۔ صغیرہ گناہ سے بچنا اگرچہ شرط نہیں ہے مگر صغیرہ پر اصرار اور دوام بھی کبیرہ گناہ ہو جاتا ہے،

۳۔ ضبط صدر یہ ہے کہ سنی ہوئی بات کو اس طرح یاد رکھنا کہ بوقت ضرورت بلاکسی دقّت کے من وعن یاد آجائے اور اس کو راوی زبان سے ادا کردے۔ ضبط کتاب کا مطلب یہ ہوا کہ جس کتاب میں حدیث نبوی کو لکھا ہے اس کتاب کو ادا کے وقت تک اپنے پاس رکھے اور اس میں تغیر و تبدل نہ ہونے دے ۴۔ اتصال سند۔ سلسلہ روایت میں کوئی بھی راوی چھوٹا ہوا نہ ہو۔ فائدہ۔ تعلّل حدیث میں ایسے نقص یا علّت کا پایا جانا جو اس حدیث کے رد و قدح کا موجب ہو۔ شذوذ کسی ثقہ راوی کا اپنے سے زیادہ ثقہ اور معتبر راوی کی روایت میں کسی قسم کی مخالفت کرنے کا نام ہے۔ احکام میں خبر صحیح لذاتہ سے حجت پکڑنے پر اجماع ہے۔ اسی طرح حسن لذاتہ ہے اکثر کے نزدیک اور یہ حجت پکڑنے میں صحیح کے ساتھ ملحق ہے اگرچہ رتبہ میں کم ہے اور چونکہ تعدد طرق سے ضعیف حدیث بھی حسن کے مرتبہ کو پہنچ جاتی ہے اس لیے اس سے بھی حجت پکڑی جائے گی اور بعض نے کہا ہے کہ اگر باوجود صدق و دیانت کے بعض رواۃ کے سوء حفظ یا اختلاط یا تدلیس کی وجہ سے حدیث میں ضعف ہو تو تعدد طرق سے اس کا جبر ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر ضعف حدیث، اتہام کذب راوی یا شذوذ یا خطا فحش کی بنا پر ہو تو تعدد طرق سے جبر نہیں ہو سکتا۔ حدیث ضعیف فضائل اعمال میں مقبول ہوتی ہے۔

۱۔ وجوہ طعن وجوہ طعن دس ہیں۔ اول جو عدالت راوی کے متعلق ہیں وہ پانچ ہیں۔ کذب راوی، اتہام راوی بکذب، فسق، جہالت، بدعت ۱۔ کذب راوی یہ ہے کہ اس کا حدیث نبوی میں جھوٹ بولنا ثابت ہو جائے۔ اگر کسی سے عمر میں ایک بار بھی حدیث نبوی میں قصداً کذب ثابت ہو جائے تو توبہ کے باوجود اس کی روایت کردہ حدیث کبھی مقبول نہ ہوگی۔

فائدہ۔ موضوع حدیث وہ ہے جس کا راوی کذب کے ساتھ مطعون ہو۔

۲۔ اتہام راوی بکذب یہ ہے کہ راوی باتیں کرنے میں جھوٹا ثابت ہو گیا ہو۔ اگرچہ اس کا جھوٹ حدیث نبوی میں ثابت نہ ہو۔ ایسا شخص اگر توبہ کرلے اور توبہ کا ثبوت عملی طور پر دے تو اس کی حدیث مانی جا سکتی ہے۔ ہاں اگر بطریق اتفاق، راوی کا حدیث کے سوا کسی اور بات میں کذب ثابت ہو تو ایسے راوی کی حدیث کو موضوع یا متروک نہیں کہہ سکتے۔ حدیث متروک وہ ہے جس کا راوی متہم بکذب ہو یا اس کی روایت شریعت کے قواعد معلوم ضروریہ کے خلاف ہو ۳۔ فسق سے مراد وہ قولی یا فعلی فسق ہے جو مرتبہ کفر کو نہ پہنچے اور فسق اعتقادی مانند اعتزال اور رفض وغیرہ بدعت میں داخل ہے ۴۔ جہالت۔ راوی کا نام معلوم نہ ہو تو جب نام ہی معلوم نہ ہوگا تو یہ بھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ راوی ثقہ ہے یا کیا ہے؟ اس کی مثال یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے کہ فلاں نے یہ بات کہی۔ فائدہ۔ حدیث مبہم وہ ہے جس کا راوی مجہول ہو۔ ایسی حدیث مقبول نہیں ہوتی۔

مگر جب کہ وہ صحابی ہو تو پھر مقبول ہیں کیونکہ صحابہ تمام کے تمام عادل ہیں ۔

۵۔ بدعت یہ ہے کہ کسی امر کی نسبت ایسا اعتقاد کر لینا جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ سے ثابت شدہ اعتقاد کے خلاف ہو۔ یعنی دین میں کسی غیر ثابت شدہ امر کو فرض یا واجب قرار دینا۔ مبتدع کی کی حدیث مردود ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جو ضروریاتِ دین میں سے کسی امر متواتر کا منکر ہے مردود ہے۔

۲۔ وجوہِ طعن | جو ضبط سے متعلق ہیں وہ بھی پانچ ہیں۔ فرطِ غفلت ، کثرتِ غلط ، مخالفتِ ثقات ، وہم ، سوءِ حفظ (۱ ، ۲) فرطِ غفلت و کثرتِ غلط کا مطلب یہ ہے کہ راوی حدیث کے سُننے یا سنانے میں غلطی کرے ۳۔ مخالفتِ ثقات ۔ اسناد یا متنِ حدیث میں ثقہ اور معتبر راویوں کے خلاف ہو۔

۴۔ وہم ، راوی وہم یا نسیان کی وجہ سے خطا کرے اور اپنے توہم پر روایت کرے۔

فائدہ ۔ معلّل وہ ہے جس حدیث کے متعلق راوی کے توہم پر قرائن دالہ معتبرہ سے اطلاع ہو جائے اور یہ حدیث میں بہت سخت اور دشوار ہے ۵۔ سوءِ حفظ یہ ہے کہ راوی حدیث حافظ کی کمزوری میں مبتلا ہو اور خطاء و نسیان اس کو غالب ہو۔ اگر سوءِ حفظ کسی کو تمام عمر لازم رہے تو اس کی حدیث معتبر نہیں ہوگی۔

فائدہ ۔ مختلط وہ حدیث ہے جس کے راوی کو بڑھاپے کی وجہ سے سوءِ حفظ عارض ہو یا وہ نابینا ہو جائے یا جس میں اس نے حدیثیں لکھ رکھی ہیں وہ کتاب گم ہو جائے۔

واضح ہو کہ ہم نے عوام کی سمجھ کا لحاظ رکھتے ہوئے صرف مقدمۃ الکتاب کی مناسبت سے یہ ضروری باتیں لکھ دی ہیں ورنہ یہاں بڑی علمی بحثیں ہیں اور طویل مباحث ہیں جن کو مجبوراً ترک کرنا پڑ رہا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحم والا ہے

افتتاحِ کتاب | مصنّفِ کتاب و مؤلّفِ رسالہ کے لیے یہ مستحب ہے کہ وہ اپنی کتاب کو اللہ عزّ و جل کے ذکر اور اس کی حمد و ثنا سے شروع کرے۔ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں اس کی تاکید فرمائی ہے۔

۱۔ كُلُّ امْرٍ ذِي بَالٍ لَمْ يُبْدَأْ فِيْهِ بِذِكْرِ اللّٰهِ وَبِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فَهُوَ اَقْطَعُ

کسی بھی عزت والے کام کو اللہ تعالیٰ کے ذکر یا بسم اللہ سے نہ شروع کیا جائے تو وہ اقطع ہے۔

۲۔ كُلُّ كَلَامٍ لَا يُبْدَأُ فِيْهِ بِحَمْدِ اللّٰهِ فَهُوَ اَجْزَمُ (نسائی)

کسی کلام کو حمدِ الٰہی سے افتتاح نہ کیا جائے تو وہ اجزم ہے۔

۳۔ کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَأْ فِیْہِ بِالْحَمْدِ فَھُوَ اَقْطَعُ | کسی عزت والے کام کو حمدِ الٰہی سے شروع نہ کیا جائے تو وہ اقطع ہے۔

اقطع اور اجزم کے حاصلِ معنی یہ ہیں کہ وہ کام قلیل البرکت ہوگا یا اس میں برکت نہ ہوگی۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ امرِ ذی شان کو خدا کی حمد و ثنا سے شروع کرنا چاہیئے تاکہ اس میں برکت ہو لیکن امام بخاری نے اپنی تالیف کو صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا ہے۔

شارحین نے اس سوال کے متعدد جوابات دیئے ہیں جو یہ ہیں۔ ۱۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے حمد اس لیے نہیں لکھی تاکہ اللہ اور رسول کے کلام پر تقدیم لازم نہ آئے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ | اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے آگے نہ بڑھو (نہ قول میں اور نہ فعل میں)

اس آیت کی رعایت ملحوظ رکھ کر امام بخاری نے حمد تحریر نہیں کی اور صرف بسم اللہ پر اکتفا کیا جو کلامِ الٰہی ہے مگر یہ جواب متعدد وجوہ سے ضعیف ہے۔ اوّلاً اس لیے کہ قرآنی الفاظ سے بھی حمد ممکن تھی مثلاً یوں کہتے الحمد للہ رب العالمین اور اس طرح اللہ اور رسول کے کلام پر تقدیم لازم نہ آتی۔ ثانیاً آیت میں اس تقدیم کی ممانعت ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اجازت کے بغیر ہو اور جو اجازت سے ہو وہ ممنوع نہیں ہے اور حمد اسی قبیل سے ہے۔ کیونکہ اطاعتِ رسول کا حکم اللہ نے دیا اور اللہ کے رسول نے ہر شاندار کام سے پہلے حمد بجالانے کا حکم دیا تو تقدیمِ حمد اجازت پر مبنی ہوئی۔ لہٰذا یہاں تقدیم ممنوع نہیں ہو سکتی۔ ثالثاً مذکورہ بالا جواب اس لیے بھی ضعیف ہے کہ اگر اپنے کلام کی تقدیم مطلقاً ممنوع تسلیم کرلی جائے تو پھر تو امام بخاری پر آیت کے خلاف عمل کرنے کا الزام قائم ہو جائے گا کیونکہ انھوں نے خود آیت پر ترجمۃ الباب اور حدیث کی سند کو مقدم کیا ہے۔

۲۔ تحمید کے ساتھ ابتدا کا حکم خطبات کے ساتھ خاص ہے۔ ایامِ جاہلیت میں لوگ خطبہ کو حمد کی بجائے شعر و اشعار سے شروع کرتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی نے جب بغیر حمد کے اپنا خطبہ شروع کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا کہ جو کلام حمد سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہے۔ لیکن یہ جواب بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ حدیثِ تحمید میں خطبہ کی تخصیص نہیں ہے بلکہ ہر شاندار کام کے متعلق یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اس سے قبل حمدِ الٰہی بجالائی جائے خواہ وہ خطبہ ہو یا کچھ اور۔ پس عموم لفظ کا اعتبار کیا جائے گا۔ خصوص مورد کا نہیں۔ لہٰذا تحمید کو خطبہ کے ساتھ خاص کرنا درست نہیں ہے۔

۳۔ حدیث تحمید منسوخ ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے عام الحدیبیہ میں قریش سے جو صلح نامہ لکھوایا تب

کی عبارت یہ تھی۔

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ هٰذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ الخ ۔ اگر حدیثِ تحمید منسوخ نہ ہوتی تو حضور علیہ السلام ترک نہ فرماتے لیکن یہ جواب بہت ہی بودا ہے کیونکہ اس کی کیا دلیل ہے کہ حضور علیہ السلام کا حمد کو ترک کرنا نسخ کی بنا پر تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے بیانِ جواز کے لیے حمد ترک کی ہو۔

۴۔ بعض علماء نے کہا حدیث تحمید ضعیف ہے لہٰذا امام پر کوئی الزام نہیں۔ مگر یہ توجیہہ صحیح نہیں کیونکہ اول تو روایت کا ضعف تمام علماء کے نزدیک مسلّم نہیں۔ علامہ تاج الدین سبکی اس کی سند کو جیّد بتاتے ہیں علامہ عینی نے لکھا۔ حدیثِ ہٰذ کو ضعیف کہنا صحیح نہیں۔ اس کے علاوہ فضائل میں تو ضعیف بھی مقبول ہوتی ہے۔

۵۔ علامہ ابن حجر علیہ الرحمہ نے فرمایا مامور بہ مطلق حمد ہے خواہ زبان سے ہو یا کتابت سے کیونکہ حدیث میں لم یبدأ کا لفظ آیا ہے جس کا معنیٰ یہ ہے کہ آغاز حمد کے ساتھ ہو۔ امام بخاری علیہ الرحمہ نے زبان سے حمد کہہ لی ہوگی۔ یہ جواب اگرچہ اچھا ہے مگر یہ ہی جواب بسم اللہ کے ترک کرنے والے کے لیے بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اب مصنفین کی مخالفت تو بہر صورت باقی رہتی ہے۔

۶۔ علامہ نووی نے فرمایا۔ یہ حدیث مختلف الفاظ سے مروی ہے کہیں لم یبدأ بحمد الله آیا ہے کہیں لا یبدأ فیہ بسم الله آیا اور کہیں لا یبدأ فیہ بذکر الله تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ ترغیب خاص طور پر حمد ہی کی نہیں ہے بلکہ ترغیب اس امر کی ہے کہ آغاز میں اللہ کا ذکر آنا چاہیئے چاہے بسم اللہ سے ہو، الحمد للہ سے یا سبحان اللہ وغیرہ سے۔ حافظ ابن حجر نے اس جواب کو قوی قرار دیا ہے (فتح الباری)

۷۔ امام زرقانی فرماتے ہیں کہ کل امر ذی بال میں واقعی بسم اللہ اور حمد کی ترغیب دی گئی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے خطوط میں صرف بسم اللہ ملتی ہے۔ خود قرآنِ مجید میں ملکہ بلقیس کے نام حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ہے اس میں بھی صرف بسم اللہ ہے۔ اس کے برخلاف حضور علیہ السلام کے خطبات میں بسم اللہ نہیں ملتی۔ صرف الحمد للہ کے لفظ ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ تحریر میں خود حضور علیہ السلام اور سابق انبیاء کرام نے بسم اللہ ہی کو آغاز کے لیے کافی جانا۔ اس لیے امام بخاری نے تحریر میں بسم اللہ پر اکتفا کر کے سُنّتِ نبوی کا اتباع کیا ہے۔

۸۔ ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ حمد کے تین معنیٰ ہیں۔

لغوی ۔ یعنی زبان سے کسی کی خوبی تعظیماً بیان کرنا۔

عرفی ۔ یعنی انعام کے باعث منعم کی تعظیم کرنا خواہ دل سے خواہ زبان سے خواہ اعضا سے۔

اصطلاحی ۔ یعنی اللہ تعالےٰ نے بندے کو جس قدر نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ سب کو ان کے مقصد

تخلیق کے مطابق طاقتِ بشری صرف کرنا۔

تو جب حمد کے یہ تین معنیٰ ہیں تو جو معنیٰ بھی مراد لیے جائیں۔ کسی صورت میں بھی امام بخاری پر ترک حمد کا الزام قائم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ امام نے صرف زبان سے یا صرف دل سے یا دل و زبان دونوں سے حمد ادا کی ہو یا جملہ نعمتوں کو مقصدِ تخلیق میں صرف کر کے بخاری کو شروع کیا ہو۔ البتہ اگر حدیث میں حمد لکھنے کا حکم ہوتا تو عدم تعمیل حکم کا الزام قائم ہو سکتا تھا؟

۹۔ نیز جب امام بخاری علیہ الرحمۃ نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تحریر فرمائی تو اس میں اللہ عزّ وجل کی صفتِ رحمت کا بیان ہے لہٰذا بسم اللہ کے تحریر کرنے سے حمد بھی ہو گئی۔ اگر بسم اللہ تحریر کرتے وقت زبان سے بھی پڑھی تھی تو حمد لغوی بھی ادا ہو گئی ورنہ حمد عرفی فافہم

درود و سلام

سلف صالحین کی یہ بھی عادت ہے کہ حمد و ثنا کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے ذکر کے ساتھ حضور علیہ السلام کا ذکر بھی ملا ہوا ہے۔ اسی لیے مفسّرین نے ورفعنا لك ذكرك کے معنیٰ یہ کیے ہیں کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

ذكرت حيثما ذكرت | محبوب جہاں میرا ذکر کیا جائے وہاں تمہارا بھی ذکر کیا جائے گا۔

حضرت امام شافعی علیہ الرحمۃ نے اپنے رسالہ میں امام مجاہد کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے اس آیۂ مبارکہ کی تفسیر میں فرمایا جو شخص لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھے گا وہ محمّد رسول اللّٰه (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی پڑھتا ہے۔ یہی معنیٰ رفع ذكر کے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دربارِ نبوی میں بیان کیے جسے امام نووی نے شرح مسلم میں ذکر کیا ہے۔ (عینی جلد ۱ صفحہ ۱۵) لیکن امام بخاری نے بسم اللہ پر ہی اکتفا کیا ہے اور صلوٰۃ و سلام کی کتابت نہیں کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی حدیث میں یہ حکم نہیں ہے کہ کسی کام کے کرنے سے پہلے درود شریف لکھ لیا کرو۔ لہٰذا یہ اعتراض ہی باطل ہے۔ ثانیاً حدیث میں درود کے متعلق جو ہدایت آئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

رغم انف رجل ذكرت عنده فلم يصل عَلَيَّ والبخيلُ الذى ذكرت عنده فلم يُصل علي (نسائی) | اس شخص کی ناک غبار آلود ہو جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درُود نہ پڑھے۔ بخیل وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ وہ شخص بہت بدنصیب ہے جس کے سامنے حضور علیہ السلام کا ذکر ہو اور وہ آپ پر درُود نہ پڑھے تو حدیث میں درُود پڑھنے کی ہدایت ہے لکھنے کی نہیں۔ اب اگر حضرت

امام بخاری نے درود نہیں لکھا تو معترض کو یہ کیسے معلوم ہوگیا تھا کہ آپ نے زبان سے بھی دُرود نہیں پڑھا تھا۔ امام بخاری کا ورع۔ تقویٰ اور عشقِ رسول یہ سب باتیں تو اس امر پر دلیل ہیں کہ آپ نے افتتاحِ بخاری سے پہلے ہی نہیں بلکہ ہر حدیث کی کتابت سے پہلے درُود پڑھا ہے اور پھر ہر حدیث کے لکھنے سے پہلے آپ دو رکعت بھی تو پڑھتے تھے جو خدا کی حمد و ثنا بھی تھی اور حضور علیہ السلام پر درُود و سلام بھی۔

مقدمۃ العلم مؤلفینِ کتاب کی یہ بھی عادت ہے کہ وہ شروع فی العلم سے پہلے وجہ تالیف، فن کی اہمیت اور عظمت، ابواب کی تفصیل اور کیفیت، علم کی تعریف، موضوع اور غرض و غایت کو تفصیل سے بیان کیا کرتے ہیں۔ مگر حضرت بخاری نے ابتدار کتاب میں ان امُور کے متعلق کچھ نہیں لکھا اور بسم اللہ کے بعد حضور علیہ السلام کی حدیث بیان کرنی شروع کر دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام بخاری علیہ الرحمۃ عاشقِ رسول تھے اور فنافی الرسول کے مرتبہ پر فائز تھے۔ انھیں مقدمۃ العلم اور مقدمۃ الکتاب کی لفظی بحثوں سے کچھ مطلب نہ تھا۔ ان کا مقدمہ بھی حضور علیہ السلام تھے اور تعریف بھی۔ موضوع بھی حضور علیہ السلام تھے اور غایت بھی۔ ان کی نظر تو محض محبوب رب العالمین کی صورت و سیرت اور آپ کے کردار اور اقوال پر تھی۔ اس لیے انھوں نے ان لفظی بحثوں سے اپنے دامن کو نہیں اُلجھایا اور قال رسول اللہ سے اپنی تالیف کی ابتدار فرمادی۔

ثانیًا۔ امام بخاری نے فن حدیث کے مبادیات کا ذکر نہ کر کے عملی طور پر اس امر کا اظہار فرمایا ہے کہ علمِ حدیث ایسا فن نہیں ہے جس کی تعریف اور غرض و غایت اور وجہ تالیف کو بیان کرنے کی ضرورت ہو۔ یہ بخاری میری تصنیف نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کے آخری رسول کے اقوال و اعمال، صورت و کردار کا مجموعہ ہے جو منزّل من اللہ ہے وحی خفی ہے۔ انسانیت کی فطرت اور آدمیت کی جان ہے۔ اگر یہ میری تصنیف ہوتی یا میں انسان کے ساختہ فنون پر کوئی تصنیف کرتا تو ضرور فن کے مبادیات کو بیان کر دیتا مگر بخاری تو اللہ کے محبوب کی گفتگو اور سیرت و کردار پر مشتمل ہے جس کی غرض و غایت مجھے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کی غرض و غایت تعریف اور عظمت و رفعت کو خود خالق کائنات نے اپنی وحی جلی قرآن مجید میں تفصیل سے بیان فرمادیا ہے۔ اس لیے علمِ حدیث کے مبادیات مجھ سے نہیں بلکہ قرآن سے پوچھو۔

بَابٌ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

یہ باب اس امر کے بیان میں ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا کیسے ہوئی؟

یہ بخاری کا پہلا عنوان ہے جس کو اصطلاح میں ترجمۃ الباب کہتے ہیں۔ اس عنوان میں آغازِ وحی اور اس کے متعلقات کا بیان کرنا مقصود ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ محدثین کرام بالعموم کتاب الایمان، کتاب الاعتصام بالسنۃ اور کتاب الطہارۃ سے اپنی تالیفات کی ابتدا کرتے ہیں۔ تو امام بخاری نے اپنی تالیف کی ابتدا آغازِ وحی سے کیوں کی؟ جواب یہ ہے کہ جن محدثین کرام نے مذکورہ بالا عنوانات سے ان کی عظمت و اہمیت کے پیشِ نظر کتاب کا آغاز کیا ہے۔ ان سب کے نقطۂ نظر کی پاکیزگی و صالحیت بھی تسلیم ہے لیکن امام بخاری علیہ الرحمۃ نے جس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سب سے اہم ہے۔ امام نے اپنی تالیف کو وحی سے شروع کر کے یہ بتایا ہے کہ ایمان ہو یا عمل۔ عقائد ہوں یا احکام ان سب کی بنیاد و اساس صرف وحی ہے اور جب تک یہ چیزیں اصلاً وحی کی طرف منسوب نہ ہوں دین و شریعت نہیں بن سکتیں۔ چنانچہ کشف و الہام اور بڑے سے بڑے مفسر، امام و مجتہد کی ذاتی رائے اور وہ قیاس و اجتہاد جو وحی سے ماخوذ نہ ہو۔ دین کے کسی بھی عقیدہ کے ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ نفسِ ایمان بھی وہی معتبر و مفید ہے جس کو وحی کی توثیق و تائید حاصل ہو۔ خوارج و معتزلہ اور دیگر گمراہ فرقے اور ملحدین کو چھوڑ کر ہر مذہب و ملت کے ماننے والوں میں کسی نہ کسی نوعیت کا ایمان پایا ہی جاتا ہے مگر یہ اس لیے ناقابلِ اعتبار اور لاحاصل ہے کہ وحی الٰہی سے اس کی مطابقت نہیں ہے۔ غرضیکہ امام نے ذکرِ وحی سے کتاب کا آغاز کر کے اس اہم نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اصل الاصول صرف وحی ہے اور جب تک کسی چیز کو وحی کی تائید و توثیق حاصل نہ ہو دینِ اسلام میں وہ نامعتبر ہے۔

۲۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عنوان یہ ہے کہ وحی کا آغاز کیونکر ہوا تو زیرِ عنوان وہ روایات آنی چاہئیں جن میں وحی اور آغازِ وحی کا ذکر ہو مگر آپ دیکھیں گے کہ اس عنوان میں چھ روایتیں ہیں۔ ان میں سے صرف ایک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں وحی و آغازِ وحی کا ذکر ہے۔ پانچ روایتوں کی سے صرف تین میں وحی کا ذکر آیا ہے آغازِ وحی کا نہیں اور دو روایتیں تو وحی اور آغازِ وحی کے ذکر ہی سے خالی ہیں حالانکہ عنوان کا اقتضا یہ تھا کہ تمام روایتوں میں وحی اور آغازِ وحی کا ذکر ہو۔ جواب یہ ہے کہ امام کی عادتِ کریمہ یہ ہے کہ وہ کسی چیز کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی ضروری تفصیلات اور اس کے مناسبات کو بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ امام کے اس طرزِ فکر کی متعدد مثالیں خود بخاری میں موجود ہیں۔

مثلاً باب ہے بدء الخلق ۔ پیدائش کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ مگر امام نے اس میں جو روایتیں ذکر کیں۔ ان میں صرف آغازِ پیدائش ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ وسط و آخر تک کے حالات، ملائکہ اور آسمانوں وغیرہ کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اسی طرح امام نے باب باندھا ہے بدء الاذان کا تو اس میں صرف

آغازِ اذان ہی کا بیان نہیں ہے۔ بلکہ اس عنوان میں امام نے وہ روایتیں بھی ذکر کردی ہیں جن میں اذان کی ابتدائی کیفیت، وسط اور آخر کے حال کا ذکر ہے۔ غرضکہ امام کا انداز فکر یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کے آغاز کا عنوان قائم کرتے ہیں تو صرف اس شے کے آغاز کے بیان پر ہی اکتفا نہیں فرماتے بلکہ اس کے اسباب وعلل اور دیگر تفصیلات کا ذکر بھی کردیتے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ جب امام نے آغازِ وحی کا عنوان قائم کیا تو اس کی عظمت و اہمیت کے اظہار کے لیے یہی اسلوب بہتر تھا کہ وحی و آغازِ وحی کے ساتھ ساتھ وحی بھیجنے والے اور اس کے لانے والے اور جس ہستی مقدس پر وحی نازل ہوئی۔ اس کا تعارف بھی کرائیں اور یہ بھی بتائیں کہ جس کو وحی نبوّت کے لیے خاص کیا جاتا ہے اس کی فطرت سلیم ہوتی ہے۔ اس کے اخلاق عمدہ ہوتے ہیں۔ اس کا فہم و ذکار، صدق و امانت، عادات و اطوار ایسے ہوتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ امام کے نزدیک وحی صرف قرآنِ کریم ہی نہیں ہے بلکہ سنتِ رسول بھی وحی ہے۔ ایسی صورت میں تو صاحبِ وحی کے اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ و تعارف اور اہم ہوجاتا ہے۔ اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ عنوان اور زیرِعنوان روایات میں کیا تعلق ہے۔ جس میں وحی یا آغازِ وحی کا ذکر ہی نہیں ہے۔ یہ تو ہے محض عنوان پر گفتگو۔ اب عنوان کے الفاظ پر بحث کی جاتی ہے۔

تشریح الفاظ ترجمہ

۱۔ باب اصل میں "بَوَبٌ" تھا۔ واؤ کو الف سے بدل دیا باب ہوگیا باب کے متعدد معنی آتے ہیں۔ یہاں نوع کے معنیٰ میں ہے۔ جیسے کہتے ہیں۔ من فتح الباب من العلم۔ جس نے علم کا دروازہ کھول دیا۔ یعنی علم کی ایک قسم ظاہر کردی باب اور کتاب میں فرق ہے۔ کتاب کے ضمن میں متعدد فصلیں ہوتی ہیں اور باب کے ضمن میں ایک ہی فصل ہوتی ہے۔ اس لیے امام بخاری نے باب کہا۔ کیف کا استعمال متعدد معنوں میں ہوتا ہے ۱۔ کیف استفہام حقیقی کے لیے جیسے کیف زیدٌ زید کیسے ہے؟ ۲۔ کبھی تعجب کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے کیف تکفرون باللہ۔ تم اللہ سے کیونکر کفر کرتے ہو ۳۔ کبھی خبر واقع ہوتا ہے جیسے کیف انت ہم کبھی حال واقع ہوتا ہے جیسے کیف جاء زیدٌ زید کس حال میں آیا۔ کَانَ افعالِ ناقصہ سے ہے جو زمانِ ماضی پر دلالت کرتا ہے۔ بَدْءٌ۔ فَعْلٌ کے وزن پر۔ ب کی زبر دال ساکن۔ ہمزہ کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنیٰ ابتدا کے ہوں گے اور اگر بغیر ہمزہ کے دال کا پیش۔ واوَ پر تشدید بُدُوٌّ بروزن فُعُولٌ و قُعُودٌ۔ تو اب اس کے معنیٰ ظہور کے ہوں گے۔ یہاں دونوں معنیٰ مراد لیے جاسکتے ہیں۔ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی کی ابتدا کیسے ہوئی؟ یا وحی کا ظہور کس طرح ہوا؟ وَحْیٌ کے لغوی معنیٰ تیزی کے ساتھ اشارہ کرنے کے ہیں۔ الاعلام فی خفاء یعنی انتہائی پوشیدگی کے ساتھ اپنے دلی منشا کو ظاہر کردینا اور

اصطلاحِ شریعت میں اللہ کا وہ کلام ہے جو وہ اپنے نبی پر نازل فرماتا ہے۔

نبی و رسول کی تعریف

نبی وہ بشر ہے جسے اللہ تعالےٰ نے ہدایت کے لیے وحی بھیجی ہو۔ وحی خواہ فرشتہ کی معرفت ہو یا بلا واسطہ مگر نبی ہونے کے لیے وحی ہونا ضروری ہے۔ رسول وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے تبلیغ احکام کے واسطے مبعوث فرمایا اور اس پر کتاب نازل ہوئی ہو یا جدید شریعت رکھتا ہو۔ پس رسول اور نبی میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہوئی رسولِ خاص ہے اور نبی عام یعنی ہر رسول نبی ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ٢۔ لیکن یہ واضح رہے کہ نبی و رسول میں جو فرق تعریفوں سے پیدا ہوتا ہے وہ محض اعتباری ہے۔ حقیقت میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی دونوں ہی اللہ عزّ وجل کی طرف سے مخلوقِ خدا کی ہدایت اور تبلیغ احکام کے لیے مبعوث ہوتے ہیں۔ دونوں ہی ہادی، مطاع، آمر، ناہی اور امت کے لیے روشنی کا مینار ہوتے ہیں۔

رسولِ ملکی و رسولِ بشری

اسی طرح رسول ہونا بشر ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ملائکہ میں بھی رسول ہیں۔ علامہ عبدالعزیز فرہادی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

١۔ ان من الملٰئکۃ رسلاً قال اللہ تعالیٰ - اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ وھم المقربون الذین یبلغون الامر والنھی الیٰ عوام الملٰئکۃ والی انبیاء البشر

ملائکہ میں بھی رسول ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ اللہ چن لیتا ہے ملائکہ سے رسول اور انسانوں سے اور رسول ملکی اللہ کے وہ مقرب ہیں جو اللہ کے امر و نہی کو عوام ملائکہ، انبیاء بشر تک پہنچاتے ہیں۔ (نبراس صـ٤٢٥)

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی آیت

٢۔ مگر کسیکہ پسند می کند و آں کس رسول می باشد خواہ از جنس ملک مثل حضرت جبرئیل وخواہ از جنس بشر مثل حضرت محمد و موسیٰ و عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام (تفسیر عزیزی تبارک صـ٢٠٥)

تفسیر جلالین و مدارک و بیضاوی و مظہری وغیرہ تفاسیر میں ہے۔

٣۔ رسلا کجبرئیل ومیکائیل و ابراھیم ومحمد وغیرھم (جلالین)

رسول جیسے حضرت جبرئیل ومیکائیل و ابراہیم و محمد صلے اللہ علیہم وسلم

٤۔ اعم من البشر والملٰئکۃ - مظہری (الملک صـ٩٥)

رسول ہونا عام ہے خواہ بشری ہو یا ملکی

۵ - رسل اللّٰه علی ضرب بین ملك و بشر (مدارک صـ۲۸)

رسول دو ضرب پر ہے - ملکی اور بشری

علامہ قاضی عیاض فرماتے ہیں -

اِتَّفَقَ اَئِمَّۃُ المسلمین ان حکم المرسلین منھم ای من المَلٰئِکۃ حکم النبیین سواء فی العصمۃ و تعظیم الحرمۃ مما ذکرنا عصمتھم منہ وانھم فی حقوق الانبیاء والتبلیغ الیھم کالانبیاءِ (شرح شفا ج ۲ صـ۱۵۴)

ائمہ مسلمین کا اس پر اتفاق ہے - ملائکہ مرسلین کا حکم وہی ہے جو انبیاء کا ہے اور وہ عصمت اور تعظیم حرمت میں برابر ہیں جیسے انبیاء بشری اپنی امتوں کو احکام خداوندی پہنچاتے ہیں - اسی طرح مرسلین ملائکہ انبیاء بشری کو اللہ کے احکام پہنچاتے ہیں اور مرسلین ملائکہ کو حقوق انبیاء حاصل ہیں -

غرضکہ جس طرح اللہ عزوجل نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انسانوں میں سے رسول بنائے ہیں اور وہ اپنی امتوں کو احکامِ الٰہی کی تبلیغ کرتے ہیں - اسی طرح اللہ تعالےٰ نے فرشتوں میں سے بھی رسول مبعوث کیے ہیں جو انبیاء بشری کو احکامِ الٰہی کی تبلیغ کرتے ہیں اور مرسلین ملائکہ کی تعظیم و توقیر اور ان کی رسالت پر ایمان لانا اسی طرح ضروری ہے جیسے انبیاء و مرسلین بشری کی تعظیم و توقیر اور ان کی نبوت و رسالت پر ایمان لانا -

امام بخاری علیہ الرحمہ کی عادت یہ ہے کہ وہ عنوان ہی میں حسب موقع و محل کوئی آیت درج کر دیتے ہیں جس کو ترجمۃ الباب سے مناسبت ہوتی ہے - چنانچہ عنوان مذکورہ بالا کے ماتحت یہ آیت لکھی گئی ہے -

اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ كَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی جیسی وحی نوح اور ان کے بعد پیغمبروں پر وحی بھیجی -

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس آیت کو انھوں نے کیوں منتخب کیا تو جواب یہ ہے کہ اس رکوع میں مضمونِ وحی کی جس قدر تفصیل ہے - قرآن مجید کے کسی اور جز میں نہیں ہے نیز اس رکوع میں اہلِ کتاب نے وحی سے متعلق جو سوال کیا تھا اس کا جواب بھی ہے - انھوں نے ازراہِ عناد و طنز یہ کہا تھا کہ اگر آپ سچے رسول ہیں تو ہمارے پاس ایک لکھی لکھائی کتاب لائیے - انہیں جواب دیا گیا کہ وحی کا معاملہ کچھ نیا اور اچھوتا نہیں کہ تم نامعقولیت پر اُتر آؤ - سلسلۂ وحی تمام انبیاء کے زمانوں میں قائم رہا ہے نیز وہ جس پر چاہتا ہے کتاب

بھی اُتار دیتا ہے جیسے حضرت عیسٰے علیہ السلام پر انجیل، موسیٰ علیہ السلام پر توریت، داؤد علیہ السلام پر زبور نازل فرمائی اور آخر کار سب سے معظم و مکمل کتاب (قرآن) اپنے آخری رسول حضرت محمد مصطفٰے علیہ التحیۃ والثنار پر نازل فرما کر یہ سلسلہ قیامت تک کے لیے بند کر دیا ۲۔ غرضکہ اس مقام پر مذکورہ آیت کے نقل کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ترجمۃ الباب میں وحی سے وہ وحی مراد ہے جو آیت میں مذکور ہے۔

۲۔ قَوْل ۔ مَا ینطقُ بِہٖ اللسان کو کہتے ہیں یعنی جو زبان سے ہی بولا جائے۔ قول کا اطلاق کلمہ، کلام اور کلم پر آتا ہے خواہ وہ تام ہو یا ناقص اور مجازاً رائے اور اعتقاد کو بھی قول کہتے ہیں۔ جیسے بولتے ہیں۔ یقول فلان یقول ابو حنیفۃ یذھب الی قول مالک ۔ یہاں قول کا لفظ اعتقاد یا رائے کے معنی میں مستعمل ہوا۔ کبھی قول کا اطلاق غیر نطق پر بھی آتا ہے۔

۱۔ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنَاہُ اَنْ نَقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ

جو چیز ہم چاہیں اس سے ہمارا فرمانا یہی ہوتا ہے کہ فرمائیں ہوجا وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

۲۔ فَقَالَ لَھَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا قَالَتَا اَتَیْنَا طَائِعِیْنَ

تو اس سے اور زمین سے فرمایا دونو حاضر ہو خوشی سے چاہے ناخوشی سے دونوں نے کہا ہم رغبت کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں قول کا اطلاق غیر نطق پر آیا ہے۔ کیونکہ خدا زبان سے پاک ہے اور زمین کی زبان نہیں ہے۔ خدا کا حکم فرمانا بے کیف ہے اور زمین نے اطاعت کا جو اقرار کیا وہ بھی بے نطق ہے۔

تفسیر آیت اِنَّا اَوْحَیْنَا

اِنَّا اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ میں کلمہ اِنَّ تحقیق و تاکید کے لیے آیا ہے یعنی اِنَّ کسی بات میں جب قوت پیدا کرنا مقصود ہو اس وقت بولا جاتا ہے۔ کَمَا اَوْحَیْنَا میں ک تشبیہ کے لیے ہے۔ مشبہ وہ "وحی" ہے جو حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی اور مشبہ بہ وہ وحی ہے جو حضرت نوح اور دیگر انبیا علیہم السلام کو ہوئی وجہ تشبیہ وحی رسالت ہے۔

مفہوم آیت یہ ہے کہ اللہ تعالٰے نے اسی طرح حضور اکرم علیہ السلام پر وحی رسالت کی جس طرح حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء پر کی ہے یہ آیت سورۃ نساء کی ہے۔ اس کی شان نزول یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ نے حضور علیہ السلام سے یہ سوال کیا تھا کہ ان کے لیے آسمان سے یکبارگی کتاب نازل ہو تو وہ آپ کی نبوت پر ایمان لائیں گے۔ اس پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی اور ان پر حجت تمام کی گئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا بکثرت انبیاء ہیں (جن میں سے گیارہ کے نام یہاں آیت میں بیان فرمائے گئے)

اہلِ کتاب ان سب کی نبوت کو مانتے ہیں۔ حالانکہ ان سب حضرات میں سے کسی پر بھی یکبارگی کتاب نازل نہ ہوئی توجب اس وجہ سے ان انبیاء کی نبوت تسلیم کرنے میں اہلِ کتاب کو کوئی عذر نہیں ہوا تو سید عالم علیہ السلام کی نبوت تسلیم کرنے میں کیا عذر ہے۔ انبیاء کی بعثت کا مقصد توحید کی معرفت کا درس دینا اور ایمان کی تکمیل اور طریقِ عبادت کی تعلیم ہے۔ کتاب کے متفرق طور پر نازل ہونے میں یہ مقصد بدرجہ اتم حاصل ہوتا ہے کہ تھوڑا تھوڑا بہ آسانی دلنشین ہوتا چلا جائے۔ اس حکمت کو نہ سمجھنا اور اعتراض کرنا کمالِ حماقت ہے۔

واضح ہو کہ قرآنِ مجید ایک ہی مرتبہ نازل نہیں ہوا بلکہ حسبِ ضرورت و مصلحت وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔ اس کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت یکبارگی نازل ہوئی۔ یہود نے یہی سوال کیا تھا کہ آپ پر یکبارگی قرآن کیوں نازل نہیں ہوا تو اس پر آیۂ مذکورہ میں ان کی جہالت و حماقت پر تنبیہ کی گئی کہ کتاب کا یکبارگی نازل ہونا' یا نجماً نجماً اس کا اترنا یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے نبی کی نبوت میں کوئی نقص پیدا ہوسکے۔ وحی نازل کرنا یہ اللہ کی سُنّت ہے اور جیسے اللہ تعالےٰ نے حضرت نوح پر وحی نازل کی تھی اسی طرح حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی کی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام آدم ثانی ہیں اور نسلِ انسانی حضرت نوح سے جاری ہوئی ہے

آیت میں حضرت نوح کا نام خصوصیت سے اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ آدمِ ثانی ہیں اور دوبارہ نسلِ انسانی انہیں سے چلی ہے کیونکہ جب طوفانِ نوح آیا تھا تو اس وقت روئے زمین کے رہنے والے ہلاک ہوگئے تھے۔ صرف کشتی میں سوار افراد باقی بچے تھے (عینی)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ کشتی میں صرف آٹھ افراد تھے۔ حضرت نوح، ان کی بیوی، ان کے تین فرزند سام، حام اور یافث اور ان کی تین عورتیں۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ان کی عورتوں کے علاوہ ۱۰ افراد تھے مقاتل کہتے ہیں کہ ۷۲ نفوس تھے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کل اسّی آدمی تھے۔ بہرحال جب یہ لوگ کشتی سے باہر آئے تو سوائے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے تین فرزند اور ان کی عورتوں کے سب ہی ہلاک ہوگئے۔ اس کے بعد حضرت نوح کا بھی وصال ہوگیا۔ صرف آپ کے تین فرزندوں سے نسلِ انسانی دوبارہ جاری ہوئی۔ قرآنِ مجید نے کہا۔ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمُ الْبَاقِيْنَ۔ پس حضرت نوح علیہ السلام طوفان کے بعد سب سے پہلے رسول قرار پائے۔ اس لیے ان کا نام خصوصیت سے لیا گیا۔ اس کا ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ چونکہ حضرت نوح علیہ السلام ایسے پہلے رسول ہیں جن کو ان کی امت نے ستایا اور سخت تکلیفیں پہنچائیں اور آپ کی قوم پر اس لیے عذاب آیا کہ اس نے آپ کی دعوت قبول نہیں کی۔ آپ سے پیشتر

ایسے رسول نہیں گذرے کہ دعوت قبول نہ کرنے کی بنا پر ان کی قوم پر عذاب نازل ہوا ہو۔ اس لیے اس آیت میں ان کا نام خصوصیت سے لیا گیا (فتح الباری و عینی)

ترجمۃ الباب اس عنوان کے ماتحت امام بخاری نے سب سے پہلے حدیث انما الاعمال لکھی ہے۔ جس میں نیّت و ہجرۃ کا بیان ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ترجمۃ الباب سے اسے کیا نسبت ہے۔ ذکر تو ظہورِ وحی کا ہے نیت اور ہجرۃ کا قصہ بیچ میں کیوں آ گیا؟ یعنی عنوان کا اقتضا یہ ہے کہ اس میں صرف وہ روایات درج ہوں جن کا تعلق وحی اور اس کے اسباب و علل سے ہو۔ مگر امام نے اس عنوان کے ماتحت جو چھ حدیثیں لکھی ہیں۔ اول میں نیت و ہجرتِ خالصہ کا بیان ہے اور باقی پانچ میں نزولِ وحی کی کیفیت، ابتدائے وحی، جبریل علیہ السلام سے قرآنِ کریم کا دَور کرنا اور حضور علیہ السلام کی صفات کا بیان ہے۔ ان پانچوں کی عنوان سے مناسبت تو ظاہر ہے مگر حدیثِ اول جس میں ہجرت اور نیت کا ذکر ہے وہ عنوان سے بالکل مناسبت نہیں رکھتی۔ کیونکہ وحی اور نیت و ہجرت میں کوئی جوڑ نہیں ہے۔ شارحین نے اس سوال کے متعدد جواب دیئے ہیں۔

۱۔ علامہ خطابی نے فرمایا۔ محض برکت کے لیے ذکر کی ہے ۲۔ بعض نے کہا چونکہ یہ حدیث متواتر المعنی ہے اس لیے ذکر کر دی ۳۔ علامہ محمد اسماعیل تیمی نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو خطبہ میں بیان کیا۔ امام نے بطور خطبہ کتاب حدیث ہذا کو ذکر کر دیا ۴۔ بعض نے یہ توجیہ کی چونکہ اسلام میں اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اس لیے امام نے یہ حدیث بطور دیباچہ کتاب ذکر کر کے یہ بتایا کہ نیت اصل ہے اور اعمال اس کی فرع ہیں اور یہ کتاب حدیث کی کتاب ہے۔ اس کا پڑھنا پڑھانا عبادت ہے اور عبادت میں نیت درست رکھنا ضروری ہے۔ خلاصہ یہ کہ امام نے بخاری پڑھنے اور پڑھانے والوں کو نیت درست رکھنے کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس حدیث کا ذکر کیا ۵۔ بعض نے یہ توجیہ کی کہ جیسے سورۂ فاتحہ قرآنِ کریم کا خلاصہ ہے۔ اسی طرح یہ حدیث بھی احادیثِ نبویہ کا خلاصہ ہے اس لیے امام نے سب سے پہلے اس کو لکھ دیا ۶۔ بخاری کی تالیف کا مقصود وحی سنت کو جمع کرنا ہے۔ اس لیے وحی کا باب منفرد کیا اور وحی سے چونکہ شرعی اعمال بیان ہوتے ہیں۔ اس لیے اس باب میں سب سے پہلے حدیث اعمال ذکر کی ہے ۷۔ سب سے پہلے عمدہ توجیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ امام کے لیے اس حدیث کو یہاں لانے کا محرک وہی اندازِ فکر ہے جو اس عنوان کے ماتحت بیان کی ہوئی دیگر روایات میں ہو رہا ہے۔ یعنی وحی کے تعارف کے لیے اس ہستیٔ مقدس کا تعارف جس پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نبوت کے لیے ہر کہ و مہ

کا انتخاب نہیں فرماتا۔ بلکہ اس کو منتخب فرماتا ہے۔ جس میں نبوت کی سزاواری کے لیے فطری طور پر صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جو افراد نبی بنائے گئے وہ قبل نبوت بھی کبائر و صغائر سے پاک و صاف اور اخلاق حسنہ سے متصف رہے۔ اب ظاہر ہے کہ تمام اعمال کا مدار نیت پر ہے تو نیک نیتی بجائے خود ایک اعلیٰ درجہ کی صفت حسنہ ہوئی۔ امام نے اس حدیث کو ذکر کر کے نبی کی اس صفتِ حسنہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نبی کے تمام افعال و اعمال اخلاق و کردار خلوصِ نیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ دنیاوی منفعت یا مادی جاہ و اقتدار کی غرض پورا کرنے کے لیے حسنِ اخلاق اور نیک کرداری کا مظاہرہ کرے۔ پس مبادیاتِ وحی میں نیت کی درستگی سب سے مقدم ہے ۸۔ نیز اس حدیث میں ہجرتِ الی اللہ کا ذکر بھی ہے اور عنوان کا مقصود بھی اوّل شانِ رسالت کو بیان کرنا ہے (یعنی وحی کا آغاز کیسے ہوا)، تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی ابتدار ہجرت الی اللہ سے ہوگی۔ نزولِ وحی سے قبل آپ سب کو چھوڑ کر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور مناجات میں مشغول رہتے تو غارِ حرا میں خلوت فرمانا اور اللہ عز وجل کی طرف متوجہ ہونا (ہجرت کرنا) حضور پُر نور صلے اللہ علیہ وسلم کے حق میں مقدمہ نبوت بنا تا آنکہ وحی کا آغاز ہو گیا۔ پس حدیثِ اعمال کو ترجمۃ الباب سے مناسبت یہ ہے کہ اس میں ترجمۃ الباب کا مقدمہ مذکور ہے۔

عمل کا ثواب نیت پر موقوف ہے

۱۔عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَ إِنَّمَا لِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ إِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ إِلٰى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پُر نور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اعمال صرف نیتوں سے ہیں اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی تو جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہو کہ اس کو پہنچے یا کسی عورت کی طرف ہو کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔ (بخاری)

تعلق ۱۔ اس حدیث کا آیت سے تعلق یہ ہے کہ وحی بھیجنا اللہ تعالےٰ کی سنت ہے اور اللہ تعالےٰ نے تمام انبیار علیہم السلام اور حضور اکرم علیہ السلام پر یہ وحی نازل کی کہ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے جیسی نیت ہوگی ویسا ہی عمل کا نتیجہ برآمد ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ نے تمام انبیار پر صحتِ نیت کی وحی بھیجی ہے ۲۔ اس حدیث کو امام نے چھ جگہ ذکر کیا ہے۔ مسلم نے کتاب الجہاد میں۔

ابو داؤد نے کتاب الطہارت میں، ترمذی نے کتاب الحدود میں، نسائی نے طہارت، طلاق اور عتاق میں ذکر فرمایا ہے۔ امام احمد و بیہقی و دارقطنی و ابن حبان نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ	اور ان لوگوں کو تو یہی حکم ہوا کہ اللہ کی بندگی کریں نرے اسی پر عقیدہ لاتے۔

یعنی اخلاص کے ساتھ نماز قائم رکھیں۔ زکوٰۃ دیں۔ شرک و نفاق سے دُور رہیں اور تمام دینوں کو چھوڑ کر خالص اسلام کے متبع ہو جائیں۔

۲۔ محدثین کرام اپنی تالیفات میں عموماً اس حدیث کو پہلے لکھتے ہیں۔ اس سے ان کی مراد اخلاص، قصد اور تصحیح نیت اور اللہ کی رضا جوئی ہوتی ہے۔ امام بخاری نے بھی اس کو پہلے لکھ کر اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میری تصنیف خلوصِ نیت پر مبنی ہے اور یہ بات ان کو حاصل بھی ہوئی اور بخاری کو اہلِ شرق و غرب نے قبول کیا ۳۔ حافظ ابن مہدی فرماتے ہیں کہ جو شخص کتاب لکھے تو اس کو چاہیئے کہ اس حدیث سے اپنی کتاب کا افتتاح کرے ۴۔ ابو داؤد کا قول ہے کہ وہ چار ہزار حدیثیں جن میں مسائلِ دینیہ کا ذکر ہے انسان کو اپنے دین کے لیے ان میں سے صرف چار حدیثیں کافی ہیں۔

۱۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ	عمل کا دارو مدار نیت پر ہے۔
۲۔ اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ	حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے۔
۳۔ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ	آدمی کے حسنِ اسلام سے یہ بات ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جو اس کو نفع نہ دے۔
۴۔ وَلَا يَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ مُؤْمِنًا حَتّٰى يَرْضٰى لِاَخِيْهِ مَا يَرْضٰى لِنَفْسِهٖ	مومن اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ بھائی (مومن) کے لیے اس چیز کو پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

ظاہر ہے جو شخص ان چار حدیثوں پر عمل کرتا ہے وہ یقیناً پورے اسلام کو عملی طور پر قبول کرنے والوں میں شمار ہو گا۔ غرضکہ یہ حدیث ایک ہزار حدیثوں کے برابر ہے اور انتہائی جامع حدیث ہے۔ امام قاضی عیاض کہتے ہیں کہ ائمہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث ثلث اسلام (دین کا تہائی حصہ) ہے۔ ابن مہدی کہتے ہیں علم کے تیس بابوں میں اس حدیث کو دخل ہے۔ امام شافعی نے فرمایا۔ ستّر باب میں۔

۵۔ یہ حدیث حضور علیہ السلام نے خطبہ میں ارشاد فرمائی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے بھی اس کو منبر پر بیان فرمایا۔ حضرت عمر کے سوا اصحابہ میں "عمر بن الخطاب" کسی کا نام نہیں ہے اور عمر نامی صحابہ

میں ۲۳ عدد افراد ہوتے ہیں - اسی لیے عمر کے آخر میں واؤ زیادہ لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو جاتے کہ اس عمر سے عمر بن الخطاب مراد نہیں ہے۔

تشریح الفاظِ حدیث اعمال عمل کی جمع ہے نیات نیت کی جمع ہے۔ اس کے معنیٰ قصد، ارادہ اور عزم کے ہیں - امام نووی نے فرمایا۔ نیت دل کے ارادہ کو کہتے ہیں۔ البتہ اہلِ تحقیق نے نیت و عزم میں فرق کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں عزم وہ ارادہ ہے جو فعل سے مقدم ہو مثلاً یہ ارادہ کہ کل ہم سفر کریں گے اور قصد وہ ارادہ ہے جو فعل سے متصل اور مقترن ہو مثلاً سفر کا وہ ارادہ جو عین حالتِ سفر میں پایا جاتا ہے اور نیت وہ ارادہ ہے جو فعل سے مقترن و متصل بھی ہو اور یہ علم بھی اس کے ساتھ پایا جائے کہ فلاں چیز کا ارادہ کس لیے کیا جا رہا ہے۔

ھِجرۃ - فعلۃ کے وزن پر وصل کی ضد ہے۔ پھر اس کے عام معنیٰ ترکِ وطن یا ایک زمین کو چھوڑ کر دوسری زمین میں چلے جانے کے ہوگئے۔ اصطلاحِ شریعت میں ہجرت کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی اپنے دین و ایمان کو بچانے اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے دار الکفر سے دار الاسلام میں چلا جاتے گا اور اللہ و رسول کے پسندیدہ افعال و اعمال کو اختیار کرلے۔ صحابہ کرام کو اس لیے مہاجر کہتے ہیں کہ انھوں نے صرف دین کی خاطر اپنے محبوب وطن مکہ کو چھوڑ دیا تھا اور مدینہ منورہ آگئے تھے۔ صحابہ کرام اس معنےٰ میں بھی حقیقی مہاجر ہیں کہ انھوں نے باطل کو ترک کیا اور حق کو قبول کیا اور حضور علیہ السلام کا ساتھ دیا اور اسلام کو اپنے خون سے سینچا اور راہِ الٰہی میں ہر قسم کی مصیبتوں اور آفتوں کو اٹھایا اور اسلام پر آنچ نہ آنے دی۔

دُنیا - فُعلیٰ کے وزن پر ہے۔ امامِ لغت جوہری نے کہا۔ دنیا کو اس لیے دنیا کہتے ہیں کہ یہ زوال کے قریب ہوتی ہے۔ دنیا کی حقیقت کیا ہے۔ اس میں متکلمین کے دو قول ہیں ۱۔ جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے دنیا ہے ۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تمام مخلوقات جواہر ہوں یا اعراض، دنیا ہیں۔ قرآن حکیم نے فرمایا وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ دنیا کا جینا تو نہیں مگر دھوکے کا مال۔ مگر یہ اس کے لیے ہے جو اس کا ہو جائے اور آخرت کو بھول جائے۔ لیکن وہ شخص جو اسباب دنیوی سے صرف آخرت کے لیے تعلق رکھے اور خدا کے اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرے تو اس کے لیے دنیا کی کامیابی آخرت کا ذریعہ ہے حضرت ذوالنون فرمایا کرتے تھے۔ اے گروہِ مریدین! دنیا طلب نہ کرو اور اگر طلب کرو تو اس سے محبت نہ رکھو۔ توشہ یہاں سے لو۔ آرام گاہ اور ہے۔

حدیث انما الاعمال حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں۔ ہم میں ایک شخص تھا جس نے ام قیس نامی ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا۔ ام قیس نے کہا جب تک تو

مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت نہ کرے میں تیرے ساتھ نکاح نہیں کروں گی۔ آخر اس شخص نے ہجرت کی اور نکاح کیا۔ ہم اس شخص کو اسی لیے مہاجر اُم قیس کہا کرتے تھے (طبرانی) جس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اعمال صرف نیتوں سے ہیں اور جو شخص جس نیت سے ہجرت کرتا ہے وہی اس کے لیے ہے۔

ہجرت کے اقسام

اگرچہ اس حدیث کا مورد خاص ہے مگر عموم لفظ کی وجہ سے تمام اقسام کی ہجرتوں کو شامل ہے۔ صحابہ کرام نے جو ہجرت کی وہ پانچ قسم کی تھی۔ پہلی ہجرت حبشہ کی طرف، دوسری مکہ سے مدینہ کی طرف۔ تیسری قبائل کی ہجرت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔ چوتھی اہلِ مکہ سے جو مسلمان ہوا۔ اس نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ پانچویں اللہ تعالےٰ نے جن باتوں سے منع فرمایا ہے ان سے ہجرت کی۔ بعض نے تین ہجرتوں کا اور ذکر کیا ہے جو یہ ہیں۔

اوّل۔ حبشہ کی طرف ہجرت ثانیہ کیونکہ صحابہ کرام نے حبشہ کی طرف دوبارہ ہجرت کی تھی۔

دوم۔ ان افراد کی ہجرت جو دارالکفر میں مقیم تھے اور اپنے ایمان کے اظہار پر قادر نہ تھے۔ ان پر واجب تھا کہ وہ دارالاسلام کی طرف ہجرت کریں۔

سوم۔ وہ ہجرت جو آخری زمانہ میں ظہور فتن کے وقت شام کی طرف ہوگی جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس ہجرت کے بعد ایک اور ہجرت ہے جب کہ اہلِ ایمان سمٹ سمٹا کر مہاجر ابراہیم علیہ السلام (شام) میں جمع ہو جائیں گے اور زمین پر شریر افراد رہ جائیں گے۔ (ابوداؤد)

صاحبِ نہایہ نے کہا۔ مہاجر ابراہیم علیہ السلام سے ملک شام مراد ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام عراق سے ہجرت کرکے شام چلے آئے تھے۔

حدیث فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں' اسکے معنیٰ

اس موقع پر ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت کے باب میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں بظاہر معارض ہیں مثلاً بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما سے روایت کی۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا ہِجْرَۃَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰکِنْ جِہَادٌ وَّنِیَّۃٌ فَاِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا (بخاری)

فتح (مکہ) کے بعد ہجرت نہیں ہے۔ لیکن جہاد اور نیت ہے اور جب امام تم کو کوچ کے لیے (جہاد کے لیے) بُلائے تو اس کے ساتھ کوچ کرو۔

بعض روایات کے الفاظ یہ ہیں۔

لَا ہِجْرَۃَ بَعْدَ الْفَتْحِ الْیَوْمَ لَا ہِجْرَۃَ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ (بخاری)

فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہجرت نہیں ہے

نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالٰے عنہا سے عبید بن عمر نے ہجرت کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا آج کے دن ہجرت نہیں اور مومن اپنے دین کو ساتھ لے کر اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرتے تھے تو خوف فتنہ کی وجہ سے کرتے تھے لیکن آج کے دن تو اللہ تعالٰے نے اسلام کو بلند فرما دیا ہے اور ایک مومن مسلمان اپنے رب کی عبادت کرتا ہے جہاں چاہتا ہے - اس لیے اب تو جہاد اور نیت ہی ہے - ہجرت نہیں ہے - بخاری
نیز بخاری اور مسلم نے اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ مجاشع بن مسعود کہتے ہیں کہ میں ابی معبد کو ساتھ لے کر ہجرت پر بیعت کرنے کے لیے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا۔

اَنْقَضَتِ الْهِجْرَةُ لِاَهْلِهَا (بخاری و مسلم) | ہجرت، ہجرت کرنیوالوں کے ساتھ ختم ہو گئی۔

پھر آپ نے اسلام اور جہاد پر بیعت کی - انقطاعِ ہجرت کے مضمون کی احادیث امام احمد نے ابی سعید خدری، رافع بن خدیج اور زید بن ثابت سے بھی روایت کی ہیں - یہ تمام حدیثیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ اب ہجرت منقطع ہے، اور فتحِ مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے لیکن ابوداؤد اور نسائی میں حضرت معاویہ سے روایت ہے - وہ فرماتے ہیں: میں نے حضور پُرنور صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ ہجرت منقطع نہ ہوگی جبتک توبہ کا دروازہ بند نہ ہو، اور توبہ منقطع نہ ہوگی - جبتک کہ آفتاب مغرب سے نہ نکلے - اسی طرح امام احمد نے ابن سعدی سے اور جنادہ بن ابی امیہ سے مرفوعاً روایت کی جس کا مضمون یہ ہے کہ ہجرت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کافر مسلمانوں سے جنگ کرتے رہیں یا جہاد ہوتا رہے یہ اور اس مضمون کی احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ ہجرت فتحِ مکہ کے بعد بھی جاری ہے - شارحین نے اس تعارض کو اُٹھانے کے لیے متعدد جواب دیئے ہیں

۱- ابن الخطابی نے فرمایا کہ وہ ہجرت جو اوّل اسلام میں تھی وہ فرض تھی - لہٰذا جن احادیث میں انقطاعِ ہجرت کا ذکر ہے - اس سے مراد یہی ہجرت ہے یعنی فرض ہجرت جو اوّل میں تھی وہ اب نہیں ہے اور فتح مکہ کے بعد جو ہجرت ہے وہ مستحب تھی لہٰذا جن احادیث میں ہجرت کے جاری رہنے کا ذکر ہے - اس سے مستحب ہجرت مراد ہے اور وہ جاری ہے۔

۲- ابن اثیر نے فرمایا - ہجرت دو قسم کی تھی ایک تو وہ کہ لوگ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور آتے تھے اور مال و اولاد سے قطع تعلق کر لیتے تھے (یعنی دین کے ہی ہو رہتے تھے) اور اس پر اللہ تعالٰے نے جنّت کا وعدہ بھی فرمایا تھا - ایسی ہجرت جس کے بدلہ میں جنت کا ملنا یقینی ہے، فتح مکہ کے بعد منقطع ہو گئی - دوسری ہجرت وہ ہے جو اعراب کی تھی جو مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد کرتے تھے اور اپنے وطن کو چھوڑتے تھے اور جیسے عمل اصحاب ہجرت (صحابہ کرام) نے کیے وہ نہیں کر سکے - اس کے متعلق حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے - یہ ہجرت توبہ کے منقطع ہونے تک جاری ہے - علامہ عینی فرماتے ہیں ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہجرت باقیہ سے مراد

ہجرالسیئات ہو یعنی گناہوں کو ترک کرنا اور یہ ہجرت بلاشبہ قیامت تک جاری ہے - چنانچہ متعدد احادیث اس مضمون کی ملتی ہیں۔ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ ہجرت دو قسم کی ہے - ایک تو گناہوں کو ترک کر دینا - دوسری اللہ و رسول کی طرف ہجرت کرنا اور ہجرت منقطع نہ ہو گی جبتک توبہ کا دروازہ کھلا رہے گا اور توبہ اس وقت تک قبول کی جائے گی جب تک سورج مغرب سے نہ نکلے (احمد)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں - ایک اعرابی حضور علیہ السلام کی خدمت میں آیا - اس نے عرض کی حضور! ہجرت کہاں پر ہے کس زمین پر ہے ؟ کس قوم کے ساتھ خاص ہے - کیا آپ کے وصال کے بعد بھی ہجرت ہے ؟ حضور علیہ السلام نے کچھ دیر سکوت فرمایا - پھر فرمایا - جب تو نماز قائم کرے - زکوٰۃ ادا کرے تو مہاجر ہے اگرچہ تو یمامہ کی زمین پر انتقال کرے (احمد) دوسری روایت کے لفظ یہ ہیں :-

اَلْهِجْرَةُ اَنْ تَهْجُرَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ ثُمَّ اَنْتَ مُهَاجِرٌ

ہجرت یہ ہے کہ تو ظاہری اور باطنی برائیوں سے قطع تعلق کرے - نماز قائم کرے - زکوٰۃ ادا کرے پھر تو مہاجر ہے۔

(احمد)

شارحین کے جوابات سے اس باب کی تمام حدیثوں میں تطبیق ہو گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان احادیث میں بظاہر بھی تضاد نہیں ہے اور ہر حدیث اپنے موقع و محل پر بالکل صحیح اترتی ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ احادیث پر غور کرنے سے پہلے ہجرت کے پس منظر کو دیکھنا چاہیئے۔

ہجرت کا پس منظر یہ ہجرت جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف فرمائی - اللہ تعالیٰ کا حکم تھی - حضرت صدیق اکبر سے بھی حضور علیہ السلام نے یہی فرمایا تھا کہ اب ہجرت کا حکم آگیا ہے -۱- اس ہجرت کا ذکر کتب سماویہ میں بھی تھا - چنانچہ وحی کی ابتدائی کیفیت جب حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ورقہ بن نوفل کو سنائی تھی تو انھوں نے کہا تھا کہ یہ وہی ناموس اکبر ہے جو موسیٰ کے پاس آیا تھا اور اے کاش! میں اس وقت تک زندہ رہ سکوں جب کہ آپ کی قوم آپ کو مکہ سے ہجرت پر مجبور کرے گی ۲- نیز سُنّت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ آخری معجزہ عذاب اس وقت نازل فرماتا ہے جب کہ پیغمبر کو مومنین کی جماعت کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم دیتا ہے - ایسی ہجرت ہر نبی نے کی ہے - حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے ملک سے ہجرت کرتے ہیں - اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ - حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے ہجرت کرتے ہیں - پھر جب یہ ہجرت ہو لیتی ہے تو معجزہ عذاب آتا ہے - چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام جب تک کشتی پر سوار نہ ہوئے عذاب نہیں آیا - حضرت ابراہیم عراق سے نکل کر شام

اور مصر نہ چلے گئے عذاب نہ آیا۔ اسی طرح حضرت لوط، ہود، صالح، شعیب علیہم السلام جب تک اپنی اپنی قوموں کو لے کر الگ نہ ہو گئے عذاب نہ آیا۔ جب ان حضرات نے ہجرت کر لی تو اب عذاب نازل ہو گیا۔ بعینہٖ اسی سنتِ الٰہی کے مطابق حضور علیہ السلام کو بھی ہجرت کرنی پڑی۔ کفار نے انتہائی تنگ کیا مصائب و آلام کے پہاڑ توڑ دیئے۔ طرح طرح کے معجزات طلب کیے۔ تو اب وہ وقت آ گیا کہ کفار پر عذاب نازل ہو چنانچہ حضور پر نور صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انا للہ پڑھا تھا اور فرمایا تھا کہ اب قریش کی ہلاکت نزدیک آ گئی (مسند احمد بن حنبل جلد ا صـ۲۱۶)

چنانچہ آیۂ قتال بھی ہجرت کے بعد نازل ہوئی اور بدر کی لڑائی بھی جو در اصل معجزۂ عذاب تھا جس میں مسلمانوں کو فتح اور کافروں کو شکست ہوئی تھی اور جس کی تفصیل سورۃ انفال میں ہے۔ وہ بھی ہجرت کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔ بہر حال حضور علیہ السلام نے مکہ سے جو ہجرت فرمائی یہ سنتِ الٰہی کے مطابق تھی اور ہر نبی کو ایسی ہجرت کرنی ہوتی ہے۔

۴۔ پھر اس ہجرت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہجرت کرنے والے انتہائی مخلص تھے اور ان کو ہجرت پر برانگیختہ کرنے والی چیز رضائے الٰہی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اس امر کا اندازہ یوں بھی کیجئے کہ مکہ میں اسلام غریب تھا کفار نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ وطن اور مال و اولاد سے کس کو محبت نہیں ہوتی۔ پھر بظاہر ایسے حالات بھی نہ تھے۔ جن سے یہ امید باندھی جائے کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کو غلبہ ہو گا۔ مگر صحابہ کرام کا خلوص وللّٰہیت دیکھئے کہ انہوں نے بلا کسی لالچ وطمع کے رسول کریم علیہ السلام کا ساتھ دیا۔ وطن چھوڑا، مال و دولت، اہل وعیال، رشتہ دار سب کو رسول پر قربان کر دیا۔ ایسی خصوصیت والی ہجرت، ایسے پاکیزہ نفوس کی ہجرت اور اس خلوص وللّٰہیت کے ساتھ ہجرت واقع میں بے مثال ہجرت تھی۔ یہ ہجرت مقبول ہجرت تھی۔ اس کے متعلق ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ نے ان مہاجرین کی ہجرت کو قبول فرما لیا اور اللہ تعالیٰ ان حضرات سے یقیناً راضی ہو گیا

پس ایسی ہجرت جس کے ثواب میں جنت اور رضائے الٰہی کا حصول یقینی ہے بلا شبہ فتح مکہ کے بعد ختم ہو چکی اور اب قیامت تک ایسی ہجرت نہیں ہو گی۔ ایسی ہجرت کے متعلق حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔

لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ | فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔

یعنی یہ مخصوص ہجرت اب منقطع ہو چکی ہے البتہ ایسا ہوتا رہے گا کہ مسلمانوں کو ہجرت کرنی پڑے اور یہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ اسلام کے مقابلہ میں کفر موجود ہے مگر اس ہجرت کا حال یہ ہے کہ اگر خلوصِ نیت کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے ہے تو ثواب ملے گا مگر اس دنیا میں اس کے متعلق قطعی حکم نہیں دیا جا سکتا کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے قبول بھی فرما لیا۔ اس کے برعکس مکہ سے مدینہ والی

ہجرت ہے۔ جواب نہیں ہے اور جن احادیث میں ہجرت کا ذکر ہے اگر ان پر غور کیا جائے تو تضاد و اختلاف کے لفظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

دُوسری توجیہہ لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ سے یہ مراد لینا کہ فتح مکہ کے بعد ہمیشہ کے لیے ہجرت شرعی ختم ہو گئی صحیح نہیں۔ حدیث ہذا پر غور کرنے سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضور اکرم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح فتح مکہ سے قبل مدینہ چلے آنے والے مسلمان مہاجر سمجھے جاتے تھے اور ان کو ہجرت کا ثواب ملتا تھا۔ اس طرح اب فتح مکہ کے بعد مکہ سے مدینہ آنے والے مسلمان مہاجر نہیں سمجھے جا سکتے کیونکہ اب مکہ و مدینہ دونوں دارالاسلام ہو گئے ہیں اور ہجرتِ شرعی کے اسباب وعلل میں سے کوئی بھی سبب اب موجود نہیں رہا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام ایسا نہ فرماتے تو ہو سکتا تھا کہ بعض لوگ فتح مکہ کے بعد بھی ثوابِ ہجرت حاصل کرنے کے لیے مدینہ ہجرت کرنے لگتے تو ان کی تنبیہہ و تفہیم کے لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اب فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔ یعنی اب مکہ سے مدینہ آ رہنے والے افراد مہاجر نہیں ہو سکتے کیونکہ ہجرت کی تعبدی نوعیت اور حقیقت کا تعلق مکہ اور مدینہ کے شہروں سے خاص نہیں ہے بلکہ ان خاص حالات سے ہے جن میں ہجرت ہوتی ہے اور یہ حالات کسی بھی ملک میں ہوں حکمِ ہجرت نافذ ہو جائیگا اور جب یہ حالات ختم ہو جائیں گے تو مکہ اور مدینہ سے حکمِ ہجرت اُٹھ جائیگا۔

ہجرت کے شرعی معنیٰ باعتبار لغت ہجرت کے معنی ترک کے ہیں۔ حدیث میں بھی یہ لفظ ترک کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے مثلاً حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ	مہاجر وہ ہے جو اس چیز سے رُک جائے جس سے اللہ تعالےٰ نے منع فرمایا ہے۔

اور اصطلاحِ شرع میں ہجرت یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالےٰ کی رضا کی خاطر اپنے شہر یا اقامت گاہ کو چھوڑ کر کسی اور شہر یا ملک میں چلا جائے اور وہاں مقیم ہو جائے۔ اکثر علماء نے یہ قید بھی لگائی ہے کہ یہ سفر دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہو مگر یہ قید ضروری نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ اس قید سے صحابہ کی "پہلی ہجرت" جو حبشہ کی طرف ہوئی۔ "حبشہ" اس وقت دارالاسلام نہ تھا۔ بہرحال علماء کی تفصیلی آراء کے مطالعہ کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ شرعی ہجرت میں یہ قید ضروری نہیں ہے کہ ہجرت دارالکفر سے دارالاسلام ہی کی طرف ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک اسلامی ملک میں اہلِ اقتدار نظریات وعقائد کے لحاظ سے ایسے بگڑ جائیں کہ صحیح العقیدہ مسلمان کی زندگی وہاں دوبھر ہو جائے۔ وہ ملک اگرچہ اسلامی ملک ہی کہلاتا ہو۔ مگر باوجود اس کے وہاں منکرات وفواحش کا زور ہو اور اہلِ اقتدار کی طرف سے حق کہنے اور حق پر چلنے والے مستحقِ تعزیر ہوں۔ ایسی حالت میں اگر کوئی صحیح العقیدہ مسلمان حمیت وغیرت میں صرف اپنے دین وایمان کے سلامت لے جانے کی نیت سے اس ملک کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے تو شرعاً یہ بھی ہجرت ہوگی اور انشاء اللہ العزیز اس پر بھی ثواب ملے گا ۲۔ اسی طرح فرض کیجئے کہ کسی دارالکفر سے مسلمان تنگ آکر ہجرت کرتا ہے اور جغرافیائی مصالح اور حالات کی مجبوری کی وجہ سے کسی

قریب دارالکفر میں پہنچ سکتا ہے اور یہ دارالکفر باوجود دارالکفر ہونے کے اسلام کے حق میں اتنا ظالم و جابر نہ ہو کہ کسی مسلمان کے لیے رہنا ہی مشکل ہو جائے۔ تو پہلے دارالکفر سے اس دارالکفر کی طرف حفاظتِ دین و ایمان کے لیے آنا جانا، ہجرتِ شرعی ہی ہوگا۔

اعمال و عقائد کی مقبولیت کا مدار خلوصِ نیّت پر ہے

واضح ہو کہ اسلام میں نیّت یعنی ارادہ قلبی ہر عمل کی بنیاد ہے۔ کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا بُرا نہیں ہوتا جتنا نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید نے نیت کا معاملہ بڑے نمایاں طور پر بیان کیا ہے اور جگہ جگہ اخلاص اور حُسنِ نیت کی ہدایت فرمائی ہے۔

۱۔ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (اعراف) — اللہ کی عبادت خلوص کے ساتھ کرو

۲۔ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (زمر) — خدا کی عبادت خلوص کے ساتھ کرو

۳۔ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا (آلِ عمران) — اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم دنیا ہی میں بدلہ دیں گے اور جو آخرت میں طالبِ ثواب ہو اُس کو آخرت میں اجر عطا کریں گے۔

۴۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (نساء) — جو شخص دنیاوی اجر کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ کے پاس دُنیا و آخرت دونوں کے بدلے ہیں اور اللہ تعالےٰ سُننے اور دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں سمیع و بصیر کے الفاظ اس جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ قادر و قدیر خدا تمہارے دلوں کی آواز سُننے والا اور پوشیدہ ارادوں کو جاننے والا ہے۔ لہٰذا اگر عمل دنیاوی منفعت کی نیت سے کیا گیا ہے تو بس دنیا ہی میں اس کا بدلہ دے دیا جائیگا اور آخرت کا انعام تو صرف انہیں کے لیے ہے جو آخرت کے ارادہ سے نیک کام کریں اسی لیے علماء نے فرمایا کہ مومن کا ہمیشہ کے لیے جنت میں داخلہ اس کے اعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ حُسنِ نیت کی وجہ سے ہوگا کیونکہ عمل کا تقاضہ تو صرف یہ ہے کہ اسی مقدار میں ثواب دیا جائے جتنا اس کا عمل ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے نیک اعمال کا وزن اور مدت ایسی نہیں ہے کہ اس کے بدلہ میں خلود فی الجنۃ کا انعام مل سکے۔ یہ خلود فی الجنۃ تو دراصل نتیجہ ہے مومن کے اس قصد و ارادہ کا کہ اگر اللہ نے مجھے ہمیشہ زندہ رکھا تو ہمیشہ اس کی خوشنودی کے لیے اس کی اطاعت کروں گا۔ چونکہ عزم و ارادہ میں ہمیشگی پائی گئی ہے اس لیے اس کے بدلہ میں خلود فی الجنۃ کا انعام دیا جائے گا۔

حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے نیت درست رکھنے اور ریا و سمعہ سے بچنے کی ترغیب کے لیے متعدد اسباب اختیار فرمائے۔ کہیں فرمایا۔ مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ کہیں فرمایا۔ جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا یا نماز پڑھی یا دکھاوے کو صدقہ دیا۔ شرک کیا۔ کہیں فرمایا۔ سب سے زیادہ خطرناک چیز جس سے مجھے تمہارے بارے میں خوف ہے شرکِ اصغر ہے۔ پوچھا کہ حضور! شرکِ اصغر کیا ہے؟ فرمایا قیامت کے دن جب اللہ تعالےٰ اپنے بندوں

کے اعمال کی جزا و سزا دے گا۔ تو دکھاوے کی نیت رکھنے والوں سے فرمائے گا۔ انہیں کے پاس جاؤ جنہیں دکھانے کے لیے تم نے فلاں فلاں عمل کیا تھا۔ دیکھیں ! ان کے پاس تمہیں دینے کے لیے کیا ہے ؟ کہیں فرمایا جس نے نیک عمل کا ارادہ کیا اور پھر نہ کر سکا تو محض نیت پر ثواب ملے گا۔ ایک حدیث میں فرمایا۔ میرا ایک صحابی ایک مد یا نصف مد اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے اور تم (غیر صحابی) سونے کا ایک پورا پہاڑ راہِ خدا میں دے دو تب بھی صحابی کے ایک مد کی برابری نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ سونے کے ایک پورے پہاڑ کے مقابلے میں ایک مد کی حیثیت ہی کیا ہے۔ مگر چونکہ اعمال میں بنیادی اہمیت نیت کی ہے اور اخلاص و نیت میں کوئی بھی صحابی کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس لیے صحابی کا تھوڑا عمل بھی ہمارے بڑے بڑے نیک عملوں کے مقابل عنداللہ کہیں ارفع و اعلیٰ ہو گیا۔

پھر خلوصِ نیت کا تعلق صرف اعمال ہی سے نہیں ہے بلکہ خیالات و جذبات، افکار و معتقدات کے مفید و مقبول ہونے کے لیے خلوصِ نیت کی ضرورت ہے۔ اگر ہم کسی سے بدگمان ہیں یا اس کے مخالف ہیں تو یہ دیکھا جائیگا کہ یہ مخالفت آیا اس لیے ہے کہ یہ اللہ کا نافرمان ہے اور اس جیسے لوگوں سے اللہ نے بدگمانی کا حکم دیا ہے۔ یا یہ بدگمانی اور مخالفت اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے قطع نظر کر کے ہمیں کسی گروہ کا ساتھ دینا ہے یا کسی شخص کی خوشنودی سے اپنے نفس کی تسکین مقصود ہے۔ اگر پہلی صورت ہو تو بیشک ہماری بدگمانی اور مخالفت نہ صرف حق ہے بلکہ اس پر ثواب کی امید بھی ہے اور اگر دوسری صورت ہے تو یقیناً ہماری یہ مخالفت و بدگمانی گناہ ہے۔ اس لیے ہر عمل، ہر عقیدہ اور ہر جذبہ کو جانچ کر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس کی تہ میں کس حد تک رضائے مولا کی طلب ہے اور کس حد تک کوئی اور جذبہ۔

فسادِ نیت کا انجام یہی وجہ ہے کہ فسادِ نیت کے باعث بہتر سے بہتر اور افضل سے افضل عمل کرنے والے قیامت کے دن منہ کے بل گھسیٹے جائیں گے اور ان کے اعمالِ خیر ان کے لیے وبالِ جان ہو جائیں گے۔ مسلم شریف میں ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ النَّاسِ یُقْضٰی عَلَیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ رَجُلٌ اُسْتُشْھِدَ فَاُتِیَ فَعَرَّفَہٗ نِعْمَتَہٗ فَعَرَفَھَا فَقَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِیْھَا قَالَ قَاتَلْتُ فِیْکَ حَتّٰی اسْتُشْھِدْتُ قَالَ کَذَبْتَ وَلٰکِنَّکَ قَاتَلْتَ لِاَنْ یُّقَالَ جَرِیْءٌ فَقَدْ قِیْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِہٖ فَسُحِبَ عَلٰی وَجْھِہٖ حَتّٰی اُلْقِیَ فِی النَّارِ وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَقَرَءَ الْقُرْاٰنَ فَاُتِیَ بِہٖ فَعَرَّفَہٗ نِعْمَہٗ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جن لوگوں کا فیصلہ اللہ تعالےٰ قیامت کے دن سب سے پہلے کرے گا ان میں ایک شخص تو وہ ہوگا جسے اللہ کی راہ میں شہید کیا گیا۔ یہ لایا جائیگا اور اللہ تعالےٰ فرمائیگا۔ یہ یہ نعمتیں ہم نے تمہیں دیں۔ وہ جواب دے گا بیشک دی تھیں۔ اللہ کہے گا پھر تو نے ان کی سپاس گزاری میں کیا کیا ؟ وہ کہے گا میں تیری خاطر لڑا۔ یہاں تک کہ شہید کر دیا گیا۔ اللہ تعالےٰ فرمائیگا کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ میری خاطر تو کہاں لڑا بلکہ تو اس لیے لڑا تھا کہ لوگ تجھے بہادر کہیں۔ پس لوگوں نے بہادر

فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهٗ وَقَرَأْتُ فِيْكَ الْقُرْاٰنَ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ هُوَ قَارِئٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى اُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَعْطَاهُ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهٖ فَاُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِيْلٍ تُحِبُّ اَنْ يُّنْفَقَ فِيْهَا اِلَّا اَنْفَقْتُ فِيْهَا لَكَ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ هُوَ جَوَادٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ثُمَّ اُلْقِيَ فِي النَّارِ۔

(مشکوٰۃ، کتاب العلم)

کہا (اور تجھے تیرا انعام مل گیا) پھر اللہ تعالےٰ اس کے بارے میں حکم صادر فرمائے گا اور اسے منہ کے بل کھینچ کر آگ میں ڈال دیا جائیگا ۔۔ اور ایک شخص وہ ہوگا جس نے علم سیکھا اور سکھلایا اور قرآن پڑھا ۔ یہ لایا جائیگا اور اللہ تعالیٰ کہے گا ۔ یہ یہ نعمتیں ہم نے تجھے دی تھیں وہ کہے گا بیشک دی تھیں اور اللہ فرمائیگا ۔ پھر تو نے ان کی سپاس گزاری میں کیا کیا ؟ وہ کہے گا میں نے علم حاصل کیا اور دوسروں تک پہنچایا اور تیرے لیے قرآن پڑھا اور اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے علم تو نے اس لیے سیکھا کہ لوگ تجھے عالم کہیں اور تلاوتِ قرآن اس لیے کی تھی کہ لوگ تجھے قاری کہیں ۔ پس انھوں نے کہا اور تیرا اجر تجھے مل گیا ۔ پھر اللہ تعالےٰ اس کے بارے میں حکم صادر فرمائے گا اور اسے منہ کے بل کھینچ کر آگ میں جھونک دیا جائیگا اور ایک شخص وہ ہوگا جس پر اللہ نے روزی کو کشادہ کیا اور ہر قسم کا مال و متاع اسے عطا کیا ۔ یہ لایا جائیگا اور اللہ تعالےٰ فرمائیگا ۔ یہ نعمتیں ہم نے تجھے دی تھیں ۔ وہ کہے گا بیشک دی تھیں ۔ اللہ کہے گا پھر تو نے ان کی سپاس گزاری میں کیا کیا ؟ وہ کہے گا ۔ میں نے ہر اس راہ میں مال خرچ کیا جس میں خرچ کرنا آپ پسند کرتے ہیں ۔ اللہ تعالےٰ فرمائے گا تو دروغ گو ہے میری پسند کے خیال سے کہاں ۔ تو نے تو اس لیے مال خرچ کیا کہ لوگ تجھے سخی کہیں ۔ پس انھوں نے کہا اور تیرا اجر تجھے مل گیا ۔ پھر اللہ تعالےٰ اس کے بارے میں حکم صادر کرے گا اور اسے منہ کے بل کھینچ کر آگ کے حوالے کر دیا جائیگا ۔

غور تو کیجئے ! جہاد جیسا عملِ خیر، شہادت جیسی جلیل القدر نعمت، تعلیم و تعلّم جیسا پاکیزہ مشغلہ، صدقہ و خیرات جیسا نفیس کام اللہ کی خوشنودی کی بجائے دنیا کی ناموری اور شہرت کے جذبہ نے مٹی کر دیا ۔ صرف اتنی سی بات پر کہ دل کے اندر بہادر کہلانے کا شوق تھا ۔ عالم مشہور ہونے، قاری اور سخی پکارے جانے کی تمنا تھی ۔ سب کچھ اکارت گیا اور آگ میں جلنا پڑا ۔

اس لیے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ اعمال کا مدار نیت پر ہے اور تمام عقائد و اعمال، جذبات و خیالات کا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ ان کی تہ میں حد درجہ کا خلوص اور رضاءِ الٰہی کے حصول کی خالص نیت کارفرما ہو ۔ نیت کی مثال بیج کی طرح ہے اور اعمال و افعال گویا زمین میں جوتنے اور پانی دینے کے درجے میں ہیں ۔ ہم عمل تو کریں دنیا کو دکھانے کے لیے اور امید رکھیں انعامِ آخرت سے نوازے جانے کی تو یہ بالکل ایسے ہی ہے

جیسے بوئیں تو تھوہڑ اور نیم کے بیج مگر امید لگائیں کھجور اور آم کے پیدا ہونے کی۔
تو امام بخاری علیہ الرحمۃ نے آغاز ہی میں حدیث انما الاعمال ذکر فرما کر اسلام کے اس بنیادی مسئلہ کو بیان فرمایا ہے کہ تمام اعمال وعقائد کے مفید ہونے کا مدار خلوصِ نیت پر ہے۔ نیت میں خلوص اور للٰہیت ہے تو عمل عند اللہ مقبول اور باعثِ اجر وثواب ہے ورنہ ریا وسمعہ کی آمیزش اچھے سے اچھے عمل کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔

حدیث انما الاعمال کے مسائل اور ائمہ کا اختلاف

ائمہ ثلاثہ: امام شافعی، امام مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالےٰ علیہم نے اسی حدیث سے وضو اور غسل میں نیت کو فرض قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ الاعمال میں الف لام استغراقی ہے تمام اعمال، روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ، وضو کو شامل ہے۔ لہٰذا ان سب میں نیت فرض ہونی چاہیئے۔ ان کے نزدیک تقدیرِ حدیث یہ ہے کہ "صحۃ الاعمال بالنیات" اعمال کی صحت نیتوں سے ہے۔ جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ اگر کسی شخص نے بغیر نیت کے وضو کر لیا تو ان ائمہ کے نزدیک صحیح نہ ہوگا اور نماز اس سے جائز نہ ہوگی۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اسی حدیث سے وضو میں نیت کو سنّت قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تقدیرِ حدیث یہ ہے: ثواب الاعمال لایکون الّا بالنّیۃ۔ عملوں کا ثواب بغیر نیت کے نہیں ملے گا۔ لہٰذا مسئلہ یہ ہوا کہ اگر کسی شخص نے بغیر نیت کے غسل یا وضو کر لیا تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک اس کا غسل و وضو صحیح ہو گیا اور اس غسل و وضو سے نماز بھی صحیح ہوگی البتہ غسل اور وضو کا ثواب اس وقت ملے گا۔ جب کہ نیتِ عبادت کر لے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جن کاموں سے ثواب متعلق ہوتا ہے وہ دو قسم پر ہیں۔
عباداتِ مقصودہ جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔ عباداتِ مقصودہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ عبادت جو کسی دوسری عبادت کے لیے ذریعہ اور وسیلہ نہ ہو۔ اس کا مقصود ہی ثواب ہو۔ اگر ثواب کو اس سے علیحدہ کر لیا جائے تو اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ مثال کے طور پر نماز کو لیجئے۔ یہ عبادتِ مقصودہ ہے۔ اس کا مقصد ہی ثواب ہے اور یہ کسی دوسری عبادت کے لیے ذریعہ اور وسیلہ نہ ہو۔ اس کا مقصود ہی ثواب ہو۔ اگر ثواب کو اس سے علیحدہ کر لیا جائے تو اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ مثال کے طور پر نماز کو لیجئے۔ یہ عبادتِ مقصودہ ہے اس کا مقصد ہی ثواب ہے اور یہ کسی دوسری عبادت کے لیے ذریعہ یا آلہ نہیں ہے۔ جب بھی نماز کے افعال ادا کیے جائیں گے۔ ثواب اس کے ساتھ ضرور متعلق ہو جائے گا تو چونکہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی حقیقت ہی ثواب ہے۔ اس لیے ان میں نیت فرض ہے۔ نیت کے بغیر چاہے آپ لاکھ نمازیں پڑھیں بیکار ہیں۔
اس کے برعکس عبادات کی دوسری قسم عباداتِ غیر مقصودہ ہیں جن کی حقیقت ثواب نہیں ہوتی بلکہ وہ عباداتِ مقصودہ کے لیے ذریعہ اور آلہ ہوتی ہیں۔ اگر ثواب کو ان سے علیحدہ بھی کر لیا جائے تو بھی وہ عباداتِ مقصودہ کے لیے آلہ رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر وضو وغسل کو لیجئے۔ فی نفسہٖ ان کی حقیقت محض ثواب نہیں ہے بلکہ وضو ذریعہ بنتا ہے نماز کا یعنی اصل چیز نماز ہے اور وضو نماز کے لیے آلہ اور ذریعہ ہے تو اگر بغیر نیت کے وضو کر لیا جائے تو وضو صحیح ہو

ہوجائے اور نماز کے لیے آلہ بن جائیگا گو ثواب نہیں ہوگا۔

ممکن ہے قارئین کو یہ شبہ پیدا ہو کہ نیت اور عدم نیت کا یہ اختلاف فضول معلوم ہوتا ہے کیونکہ جو شخص وضو و غسل کرتا ہے ارادہ ہوتا ہے جبھی تو کرتا ہے اور یہ ارادہ ہی نیت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نیت سے ہماری مراد یہ ہے کہ کسی کام کو ثواب کی نیت سے کرنا اور یہ اسی وقت مل سکتا ہے جب کہ ثواب کی نیت کی جائے

فرض کیجئے زید بے وضو ہے۔ اتفاقاً بارش ہوگئی اور اس کے تمام اعضائے وضو بارش کے پانی سے دُھل گئے تو ایسی صورت میں زید کا قصد نہیں ہے مگر وضو ہوگیا اور امام اعظم کے نزدیک اس وضو سے نماز جائز ہوگی لیکن امام شافعی کے نزدیک چونکہ نیت نہیں پائی گئی۔ اس لیے وضو درست نہ ہوا۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ تیمم بھی عبادت غیر مقصودہ ہے حالانکہ امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک تیمم بغیر نیت کے درست نہیں ہوتا تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ تیمم میں جو نیت فرض ہے وہ حصولِ ثواب کے لیے نہیں ہے بلکہ تیمم کو وضو کے قائم مقام کرنے کے لیے ہے اس لیے تیمم میں نیت فرض ہے۔

امام شافعی علیہ الرحمہ اسی حدیث سے طلاق، عتاق اور تمام اعمال میں نیت کو شرط قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ صحتِ اعمال شرع میں نیت پر موقوف ہیں۔ لہٰذا تمام اعمالِ دینیہ خواہ وہ اقوال ہوں یا افعال۔ فرض ہوں یا نفل۔ سب کے سب درست اور شرعاً معتبر ہونے کے لیے نیت ضروری ہے۔ پس اگر کسی شخص نے بغیر نیت کے اپنی بیوی کو طلاق دیدی تو ان کے نزدیک یہ طلاق واقع نہ ہوگی۔ لیکن حضرت امام اعظم فرماتے ہیں کہ حدیث انما الاعمال بالنیات کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ اعمال کا وجود نیت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا حالانکہ یہ معنیٰ بالاجماع متروک ہیں اور یہ بات بدیہی ہے کہ اعمال کا وجود بغیر نیت کے پایا جاتا ہے نہ صرف یہ بلکہ بہت سے اعمال ایسے ہیں جن کو شریعت نے بغیر نیت کے بھی صحیح قرار دیا ہے۔ مثلاً قرض ادا کرنا، ودیعت واپس کرنا، اذان، تلاوتِ قرآن مجید، ورد و وظائف، ہدایۃ الطریق اور راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا وغیرہ۔ ذالک افعال سب کے سب عبادات ہیں اور بغیر نیت کے صحیح ہوجاتے ہیں تو اسی طرح طلاق عتاق بغیر نیت کے صحیح ہونے چاہئیں۔

دوسرے طلاق صریح لفظ ہے اور صریح میں نیت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

تحقیقِ مقام یہ ہے کہ حدیث انما الاعمال کے ظاہری معنیٰ تو بالاجماع مراد نہیں بلکہ مجازی معنیٰ مراد ہیں اور یہ کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اعمال کا حکم نیت پر موقوف ہے۔ اب حکم دو قسم کا ہوتا ہے ایک وہ جس کا تعلق آخرت سے ہے اور وہ ثواب ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو دُنیا سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ عمل جائز ہوا یا مکروہ، فاسد ہوا یا حرام۔ حکم کی یہ دونوں قسمیں آپس میں متضاد ہیں۔ کیونکہ اول کی بنیاد صدقِ ارادہ اور خلوصِ نیت پر ہے۔ اگر نیت پائی گئی تو ثواب پایا جائیگا ورنہ نہیں اور دوسری کا مبنیٰ یہ ہے کہ اس عمل کے ارکان و شرائط پائے گئے یا نہیں تاکہ اس کی صحت یا عدمِ صحت کا حکم کیا جائے خواہ اس میں نیت ہو یا نہ ہو تو جب لفظ حکم دو قسم پر مشتمل ہوا تو یہ بحسبِ وضع کے مشترک ہوگیا اور حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ مشترک میں عموم نہیں ہوتا۔

یعنی لفظِ مشترک کے دونوں معنیٰ یک دم لینا جائز نہیں ہے۔
امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی مجاز میں عموم کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں دونوں میں سے ایک معنیٰ لینا لازم ہے۔ لہٰذا امام شافعی نے نوعِ ثانی کو اختیار کر لیا۔ اس بنیاد پر کہ حضور علیہ السلام کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ آپ اعمال کی صحت و فساد، حلال و حرام کے متعلق حکم صادر فرمائیں۔ اس لیے انھوں نے حدیث انما الاعمال کے معنیٰ یہ کیے کہ صحتِ اعمال نیت پر موقوف ہے۔

لیکن امام ابوحنیفہ نے نوعِ اول کو اختیار فرمایا اور تقدیرِ حدیث یہ قرار دی کہ اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے۔ نوعِ اوّل کو اختیار کرنے کی ان کے پاس دو دلیلیں ہیں جو نہایت معقول ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ بات تو بالاتفاق تسلیم ہے کہ نیت کے بغیر ثواب نہیں ملتا۔ ایسی صورت میں اگر صحت کو بھی مراد لے لیا جائے تو مشترک میں عموم لازم آئے گا جو باطل ہے۔ دوم یہ کہ ثواب کو مقدر ماننے میں یہ فائدہ ہے کہ یہ ثواب اپنے عموم پر باقی رہتا ہے اور کسی بھی نوع میں اس کی تخصیص کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ یہ بالاجماع ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ثوابِ اعمال نیت ہی پر موقوف ہیں۔ اس کے برعکس اگر صحت کو لیا جائے تو اس میں لامحالہ تخصیص کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اس میں بعض اعمال مثلاً نکاح، بیع و شراء وغیرہ کی صحت بلانیت بھی بالاتفاق تسلیم کی جاتی ہے۔
غرضیکہ شوافع تصحح مقدر مانتے ہیں جس سے اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے کہ بلانیت کے وضو سے نماز درست نہ ہو اور احناف ثواب مقدر مانتے ہیں تو اس سے اس رائے کو مدد ملتی ہے کہ بلانیت کے وضو پر ثواب تو نہ ملے گا لیکن اس وضو سے نماز درست ہو جائے گی۔ چنانچہ یہ بدیہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص بدن کو پاک کرے یا سفرِ لباس پہنے اور مقصود صرف فرحت حاصل کرنا اور صاف پوشی ہو۔ بدن کو نجاست سے پاک کرتے وقت اور تبدیلِ لباس کے وقت یہ تصور بھی نہ ہو کہ دونوں کام نماز پڑھنے کی نیت سے کیے جا رہے ہیں۔ پھر نماز کا وقت آجائے اور وہ شخص وضو کر کے نماز پڑھ لے تو بتائیے نماز ہو گی یا نہیں تو ظاہر ہے کہ شوافع بھی یہ کہیں گے کہ نماز ہو جائے گی تو ہم کہیں گے کہ جیسے بدن اور لباس کی پاکی نماز کے لیے شرط ضروری ہے اور وہ نیت کے بغیر ہو سکتی ہے تو اسی طرح وضو بھی ایک شرط ہے۔ جسے نیت کے بغیر معتبر ہونا چاہیے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ پانی طاہر و مطہر (پاک اور پاک کرنے والا ہے) قرآن کریم نے ماءً طہوراً فرمایا ہے تو پانی سے بدن یا کپڑا جو کچھ بھی دُھلے گا خود بخود پاک ہو جائے گا۔ نیت ہو یا نہ ہو۔ یہی حال وضو کا ہے کہ پانی چونکہ اصلاً طاہر و مطہر ہے اس لیے بلانیت کے وضو سے بھی وہ پاکی حاصل ہو جائے گی جو نماز کے لیے شرط ہے۔ ان دلائل کی روشنی میں سیدنا امام اعظم علیہ الرحمۃ کا مسلک بہت قوی معلوم ہوتا ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد پر امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ اور ائمہ ثلاثہ کے مابین متعدد مسائل میں اختلاف ہو جاتا ہے جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔
۳۔ زیرِ تفہیم حدیث سے متعلق یہ امر بھی قابلِ وضاحت ہے کہ جب حدیث میں "الیٰ دنیا" آگیا تو

تو اس میں عورت بھی آ گئی - پھر "الی امراۃ" فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟ علامہ قسطلانی و دیگر شارحین نے جواب دیا چونکہ عورت ہی دنیا میں سب سے زیادہ فتنہ و فساد کا سبب بنتی ہے - لہٰذا تخصیص بعد التعمیم کے طور پر اسے خصوصیت سے ذکر کر دیا جیسا کہ قرآن کریم میں لفظِ ملائکہ کے بعد جبریل کا ذکر آیا ہے اور حدیث میں حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً اَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ (عینی جلد ا صفحہ ۳۴)	میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے بڑھ کر فتنہ انگیز چیز کوئی نہیں چھوڑی۔

تو اگرچہ لفظِ دنیا میں عورت آ گئی تھی مگر خصوصی تنبیہ کے طور پر عورت کا پھر ذکر فرمادیا - ظاہر ہے کہ یہ توجیہ یک طرفہ ہے اور سوال تو پھر بھی باقی رہتا ہے کیونکہ دنیا میں جو چیز فتنہ و معصیت کا سبب بنتی ہے وہ صرف عورت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ مال و دولت اور اولاد بھی ہے جس کا ذکر خود قرآن حکیم نے کیا ہے پھر عورت مطلقاً ایسی چیز نہیں ہے جو فتنہ و فساد کی جڑ بنے - حدیث میں یہ بھی تو ہے کہ عورت صالح ہو تو دنیا کی بہترین متاع ہے اور یہ بھی کہ اَلدُّنْيَا كُلُّهَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِهَا الْمَرْءَةُ الصَّالِحَةُ دنیا پوری کی پوری سرمایہ ہے اور اس سرمایہ کا سب سے بہترین حصہ صالح عورت ہے۔

بعض شارحین نے یہ جواب دیا کہ یہ حدیث مہاجر ام القیس کے متعلق آئی - مدینہ میں قیلہ نامی ایک عورت تھی جن سے ایک صاحب نے نکاح کرنا چاہا تو قیلہ نے کہا مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے آؤ تو نکاح منظور ہے چنانچہ انھوں نے ہجرت کر کے نکاح کر لیا - لوگ انھیں مہاجر ام القیس کہنے لگے لہٰذا حضور پُر نور صلے اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ کے طور پر خصوصاً عورتوں کا ذکر بھی فرمادیا۔

۴ - اب رہی یہ بات کہ عملِ مخلوط یعنی ایسے عمل کا کیا حکم ہے جس میں دین و دنیا دونوں کی غرضیں مل جل گئی ہوں - مثلاً ایک شخص حج کے لیے جاتا ہے اور تجارتی منفعت کا بھی کوئی پہلو اس کے پیش نظر ہے تو ثواب ملے یا نہیں - واضح ہو کہ اصطلاح شرع میں خلوص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنے کو نیت کہتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ بعض وہ اعمال و افعال جو عبادت نہیں ہیں اگر ان کے کرنے والا قربۃ کی نیت کرلے تو ان پر بھی ثواب ملتا ہے چنانچہ عمل کی چند صورتیں ہیں :-

۱ - عمل کا باعث اور اصل محرک صرف دنیا ہے تو ثواب نہیں ملے گا۔

۲ - عمل کا باعث تو صرف اُخروی ہے مگر ضمناً کوئی دنیوی منفعت بھی ملحوظ ہے تو یہ عمل عبادت ہی سمجھا جائیگا - البتہ یہ ضرور ہے کہ جس نسبت سے دنیاوی نیت شامل ہے اسی نسبت سے ثواب میں کمی ہو جائیگی۔

۳ - پھر اس میں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ دوسرا مقصد جو عبادت کے ساتھ ملایا گیا وہ حلال ہے یا حرام - اگر حرام ہے تو عمل ضائع ہو جائے گا اور اگر حلال ہے تو بقدر نیت دنیاوی ثواب کم ہو کر رہ جائیگا۔

۴ - اور اگر عمل کا اصل محرک صرف رضائے الٰہی ہے اور ضمناً بھی کوئی دنیاوی منفعت ملحوظ نہیں ہے تو ہر عمل

اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے اور ثوابِ کامل اس پر دیا جائیگا۔ اب اُنکی مثالیں لیجیے۔

ایک شخص حج کے لیے روانہ ہوا۔ عزم و ارادہ تو فریضہ حج کی ادائیگی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی ہے کہ موقع ملا تو تجارت بھی کرلوں گا اور عزیز و اقارب سے بھی مل لوں گا تو اس کا یہ فعل عبادت ہی قرار پائے گا قرآن حکیم میں اس کے متعلق فرمایا:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ

تم پر کچھ گناہ نہیں کہ اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے خیال کیا کہ راہِ حج میں جس نے تجارت کی اس کا حج ہی کیا ہوا۔ اس پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی اور بتایا گیا کہ راہِ حج میں تجارت کرنا مباح ہے جس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ عملِ مخلوط میں یہ دیکھنا پڑے گا کہ دوسرا مقصد حرام ہے یا حلال۔ اگر حرام ہے تو عمل بھی ضائع ہوجائے گا جیسے حج کرنے والا یہ نیت بھی کرلے کہ حج کر کے حاجی کہلاؤں گا اور دوسروں کی نگاہوں میں عزت و جاہ حاصل کروں گا تو چونکہ ریا و سمعہ حرام ہے اس لیے یہ حج بھی ضائع ہوجائے گا اور اگر دوسرا قصد حلال ہے تو بقدر حصہ ثواب مل جائیگا مثلاً حج ہی کو لے لیجئے کہ نیت تو حج کی ہے مگر اس کے ساتھ تجارت کا بھی خیال ہے تو تجارت چونکہ حلال ہے اس لیے ثوابِ حج تو ملے گا مگر چونکہ اس میں تجارت کی نیت بھی ہے تو جس نسبت سے دنیاوی نیت شامل ہے اسی نسبت سے ثواب کم ہوکر ملے گا۔ بہرحال یہ نیت کا معاملہ ایسا ہے کہ عمل میں جس قدر زیادہ خلوص ہوگا۔ اسی قدر ثواب میں زیادتی ہوگی اور خلوص میں جس قدر کمی ہوگی ثواب میں بھی کمی ہوجائے گی اور سب سے برتر و بالا عمل وہی ہے جس میں شروع سے لے کر اخیر تک حسنِ نیت یکساں قائم رہے اور ضمناً بھی کسی دُنیاوی منفعت کا خیال تک نہ ہو۔

نزولِ وحی کی کیفیت۔ وحی کی حقیقت اور اس کے اقسام

حدیث نمبر۲۔ عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا اَنَّ الْحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ يَاْتِيْكَ الْوَحْيُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْيَانًا يَاْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ اَشَدُّهٗ عَلَيَّ فَيُفْصَمُ عَنِّيْ وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَاَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے ہے کہ حارث بن ہشام نے پوچھا۔ یا رسول اللہ۔ آپ پر وحی کیونکر آتی ہے۔ فرمایا کبھی گھڑیال کی آواز کی طرح میرے پاس آتی ہے اور یہ مجھ پر زیادہ سخت ہوتی ہے اور پھر یہ حالت دُور ہوجاتی ہے درآنحالیکہ میں اس سے مفہوم اخذ کرلیتا ہوں اور کبھی وہ فرشتہ (جبریل) میرے لیے انسان کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور مجھ سے باتیں کرتا کرتا ہے اور جو وہ کہتا ہے میں اسے محفوظ کرلیتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ وحی اُترنے کی

فَيُرْتِمُنِيْ فَاَعِيْ مَا يَقُوْلُ قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيْدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَاِنَّ جَبِيْنَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا

کی حالت میں میں نے آپ کو دیکھا کہ جب یہ کیفیت ختم ہوجاتی تھی تو سخت سردی کے دنوں میں بھی جبینِ مبارک سے پسینہ بہتا تھا۔

(بخاری)

فوائد و مسائل ۱- اس حدیث کو امام نے باب بدء الخلق میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے فضائل میں ۲- حضرت حارث بن ہشام حضرت خالد بن ولید کے چچازاد بھائی تھے۔ بحالتِ کفر جنگِ بدر اور اُحد میں شریک ہوئے۔ پھر فتح مکہ کے دن مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت ام ہانی نے حضرت حارث کو امان دی تھی حضرت علی انھیں قتل کرنا چاہتے تھے۔

حضرت ام ہانی نے بحضور نبوی عرض کی۔ سرکار حضرت علی ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہیں جس کو میں امان دے چکی ہوں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس کو تم نے امان دی اس کو ہم نے امان دی۔ یہ سُن کر حضرت علی بھی دستکش ہوگئے۔

حضرت حارث کے بتیس صاحبزادے تھے۔ جن میں سے ابوبکر مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت حارث نہایت مہمان نواز، شریف اور سخی تھے۔ عہد فاروقی میں مکہ معظمہ سے شام کی طرف اس عزم سے روانہ ہوئے کہ باقی عمر جہاد میں صرف کردوں گا۔ ماہ رجب ۱۵ھ جنگِ یرموک میں شہید ہوئے (استیعاب)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات پر لفظِ ام المومنین کا اطلاق، قرآنِ مجید کے ارشاد اَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ سے ماخوذ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی دوسری مقدس بی بی ہیں۔ آپ کا نام عائشہ اور کنیت ام عبداللہ ہے۔ آپ کی کنیت ام عبداللہ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہی رکھی تھی۔ جب کہ آپ کے بھانجے عبداللہ بن زبیر کو بغرض تحنیک بحضور نبوی پیش کیا گیا تو حضور نے فرمایا۔ یہ عبداللہ ہے اور تم ام عبداللہ (فتح الباری)

والد کا نام امیر المومنین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ ہے اور والدہ کا نام ام رومان زینب بنت عامر ہے جن کا انتقال ۶ھ میں ہوا۔

حضرت عائشہ بعثت کے چار برس بعد پیدا ہوئیں۔ نبوت کے دسویں سال حضور علیہ السلام کے عقد نکاح میں آئیں۔ آپ کی عمر شریف اس وقت ۶ سال کی تھی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد خولہ بنت حکم کی وساطت سے نکاح ہوا۔ چار سو درہم مہر مقرر ہوا۔ نکاح کے بعد حضور علیہ السلام تین سال مکہ میں مقیم رہے۔ ۱ ہجری میں جب آپ نے ہجرت فرمائی تو حضرت ابوبکر ساتھ تھے۔ اہل و عیال کو مکہ چھوڑ آئے تھے۔

جب مدینہ میں اطمینان ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عیال کو مدینہ بلا لیا۔ حضور علیہ السلام نے بھی حضرت فاطمہ، ام کلثوم اور حضرت سودہ وغیرہ کے لانے کے لیے حضرت عبداللہ بن اریقط کو بھیج دیا۔ ماہ شوال میں ۹ سال کی عمر میں رخصتی ہوئی۔

وفات: حضرت عائشہ صدیقہ نے ۹ سال تک حضور علیہ السلام کے ساتھ زندگی بسر کی۔ جب حضور علیہ السلام کا وصال ہوا تو آپ کی عمر شریف ۱۸ سال تھی۔ حضور علیہ السلام کے بعد حضرت عائشہ ۴۸ سال زندہ زندہ رہیں اور ۵۷ھ میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۶ سال تھی۔ وصیت کے مطابق جنت البقیع میں رات کے وقت دفن ہوئیں۔ حضرت ابوہریرہ اس وقت مروان بن حکم کی طرف سے حاکم مدینہ تھے۔ انہوں نے نماز جنازہ پڑھائی۔

فضائل | ازواجِ مطہرات میں حضرت ام المومنین سیدہ عفیفہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالٰے عنہا کے فضائل و مناقب، آپ کا ورع تقویٰ، علم و فقہ اور اجتہادی بصیرت اتنی اعلیٰ ہے کہ جس کے بیان کے لیے دفتر درکار ہے۔ مختصر یہ کہ آپ ام المومنین ہیں۔ آپ سے حضور علیہ السلام کی بہت محبت تھی۔ اسی محبت کی وجہ سے آپ نے اپنے مرضِ وفات میں تمام ازواجِ مطہرات سے اجازت لے کر اپنی مقدس زندگی کے آخری ایام سیدہ عائشہ کے نوری حجرہ میں بسر فرمائے۔ اس محبت کا اظہار جن طریقوں سے ہوتا تھا۔ ان کے متعلق احادیث و سیر میں کثیر واقعات ہیں جو بوجہ اختصار چھوڑے جا رہے ہیں ——— حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا خود ہی تحدیثِ نعمت کے طور پر فرماتی ہیں۔ مجھے اللہ تعالٰے نے نو خوبیاں ایسی عطا فرمائی ہیں جو کسی عورت کو نہ ملیں۔

۱۔ عقد سے پیشتر میری تصویر حضرت جبریل امین نے بحضور نبوی پیش کی (یہ تصویر قدرتی تھی کسی انسان کی بنائی ہوئی نہ تھی) ۲۔ حضور علیہ السلام نے بجز میرے کسی اور کنواری عورت سے نکاح نہیں فرمایا ۳۔ میں آپ کے خلیفہ اور صدیق کی صاحبزادی ہوں ۴۔ مجھ کو پاکیزہ کے گھر پاکیزہ پیدا فرمایا ۵۔ بوقتِ وصال حضور علیہ السلام کا سرِ اقدس میری گود میں تھا ۶۔ حضور میرے گھر میں دفن ہوئے ۷۔ حضور میرے گھر میں ہوتے تو بھی وحی نازل ہو جاتی تھی ۸۔ مجھ سے اللہ تعالٰے نے مغفرت اور رزقِ کریم کا وعدہ فرمایا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۹۔ میری برأت آسمان سے نازل ہوئی ——— بعض اہلِ تحقیق نے فرمایا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام پر تہمت رکھی گئی تو اللہ تعالٰی نے ایک شیر خوار بچے کی زبان سے آپ کی برأت ظاہر فرمائی۔ حضرت مریم کو مطعون کیا گیا تو ان کے صاحبزادے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زبان سے بحالت شیر خوارگی آپ کی برأت کا اظہار فرمایا گیا لیکن جب منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالٰے عنہا کو متہم کیا تو اللہ تعالٰے نے آپ کی برأت کسی بچے یا کسی نبی کی زبان سے نہیں کرائی بلکہ اپنے محبوب کی زوجہ محترمہ کی خود برأت فرمائی اور سورۂ نور نازل فرما کر جناب عائشہ صدیقہ کی پاکدامنی پر مہر تصدیق ثبت فرما دی۔

علمی زندگی | ازواجِ مطہرات میں حضرت عائشہ صدیقہ علم و فضل کے لحاظ سے سب سے ممتاز ہیں۔

حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ علیہم کے زمانہ میں فتویٰ دیتی تھیں۔ اکابر صحابہ آپ کے علم و فضل کے معترف تھے اور مسائل میں آپ سے استفسار کرتے تھے۔ آپ سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے ۱۷۴ احادیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے۔ بخاری نے ان سے منفرداً ۵۴ حدیثیں روایت کی ہیں ۶۸ حدیثیں امام مسلم نے منفرد طور پر روایت کی ہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ احکامِ شرعیہ کا ایک چوتھائی حصہ حضرت عائشہ صدیقہ سے منقول ہے۔ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ صحابہ کو جب کوئی مشکل سوال پیش آتا تو اس کو حضرت عائشہ صدیقہ ہی حل کرتی تھیں۔ تفسیرِ حدیث، اسرارِ شریعت، خطابت، ادب اور انساب میں آپ کو کمال حاصل تھا۔

مختصر یہ کہ ایک مسلمان کے لیے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت عائشہ، حضور علیہ السلام کی محبوب بی بی ہیں۔ ام المومنین ہیں۔ صدیق اکبر کی صاحب زادی ہیں اور حضور علیہ السلام سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے داماد ہیں یعنی صدیق وہ ہیں جن کے دامادِ مکرم رسول، نہ صرف رسول بلکہ رسولوں کے رسول اور اللہ کے محبوب اور خاتم النبیین ہیں۔ سبحان اللہ!

حضور اکرم کی ازواج ام المومنین ہیں

بخاری و کتبِ حدیث میں ازواجِ مطہرات کے ساتھ ام المومنین کا لفظ بھی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ازواج کو مومنوں کی مائیں قرار دیا ہے اور حضور علیہ السلام کی ازواج کی فضیلت در اصل خود حضور علیہ السلام کی فضیلت کا ایک شعبہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ　|　اے نبی کی بیبیو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو

النساء میں الف لام جنسی ہے۔ لفظ احد بھی موجود ہے جیسے لم یکن کفوا احد میں ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ازواجِ رسول کا درجہ و مقام ہر عورت سے بالاتر ہے ——— البتہ یہ ظاہر ہے کہ ازواجِ رسول جملہ احکام میں مسلمانوں کی مائیں نہیں ہیں ورنہ امتیوں سے پردہ کیوں ہوتا؟ ماں چونکہ بے حد معظم و محترم ہستی ہوتی ہے اور کسی طرح غلط خیالات و جذبات ان کے بارے میں انسان کے اندر پیدا نہیں ہوتے اس لیے بطور تعظیم و تکریم ازواجِ رسول کو امہات المومنین فرمایا گیا۔

۱۔ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ (قرآن کریم)　|　اے محبوب! ہم نے تمہاری ازواج کو تمہارے لیے حلال کر دیا

اس آیت سے یہ فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ حضور علیہ السلام کی بیویوں کا ازواج النبی ہونا منظوری رب العالمین ہے اور ظاہر ہے کہ یہ منظوری فی الواقع ان کے لیے فضیلتِ عظیم ہے۔

۲۔ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا　|　اے ایمان والو! تمہیں یہ حق نہیں ہے کہ تم رسول کو ایذا دو اور یہ بھی جائز نہیں کہ رسول کے بعد ان کی ازواجِ مطہرات سے نکاح کرو۔

اس آیت میں ان کی حرمتِ دوام کا اعلان ہے۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ پہلے اس آیت میں حضور علیہ السلام کو

ایذا دینے سے روکا گیا۔ اس کے بعد حقوقِ ازواج بیان کیے۔ جس سے ثابت ہوا کہ ایذائے رسول کے جس قدر اقسام ہو سکتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ سخت صورت وہ ہوگی جس میں حضور علیہ السلام کی ازواج کی شان کے خلاف کوئی رویہ اختیار کیا گیا ہو اور یہ اس لیے کہ اس آیت میں ایذارِ رسول کے تحت بہ خصوصیت سے اسی جزئی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

۴۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ | مومنین سے نبی ان کی جانوں سے بڑھ کر نزدیک ہے اور نبی کی ازواج مومنوں کی مائیں ہیں۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ازواجھم وانفسھم کی ضمیر مومنین کی طرف ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ ازواج النبی کا لقب امہات المومنین ہے نہ کہ امہات الامت، لفظِ مومنین کے استعمال کا راز یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے

اوّل۔ مومن وہ ہے جو نبی علیہ السلام کو اپنی جانِ شیریں سے زیادہ محبوب رکھتا ہے۔

دوم۔ مومن وہ ہے جو ازواج النبی کو اپنی ماں جانتا ہے وہ ماں نہیں جس سے جسم عنصری کا ظہور ہوا بلکہ وہ ماں جس کی فرزندی کا شرف اس کو ملتا ہے جس کو (ولاء) محبت نبی اور ایمان میں کمال حاصل ہوتا ہے۔

تشریح الفاظِ حدیث

مسئال: اگر بوقتِ وحی حضرت عائشہ موجود تھیں تو حدیث ہذا مسند قرار پائے گی۔ اسی بنار پر بعض علمائے نے حدیثِ ہذا کو حضرت عائشہ کے مسند میں تخریج کیا۔ اگر موجود نہ تھیں بلکہ حضرت حارث نے انہیں جواب وسوال کی خبر دی تو حدیثِ ہذا مرسل صحابی ہے جو جمہور کے نزدیک مسند کے حکم میں ہے چنانچہ مسند امام احمد و معجم بغوی وغیرہ سے احتمالِ ثانی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ ان میں عن عائشہ عن الحارث بن ہشام قالت سالت کے الفاظ ہیں مگر احتمالِ اوّل مشہور ہے۔

کیف یاتیك الوحی۔ حضور علیہ السلام سے سوال ہوا آپ پر وحی کیسے آتی ہے؟ فرمایا دو طرح۔ ایک تو مانندِ آوازِ جرس کا آنا دوم فرشتہ کا انسانی شکل میں آکر کلام کرنا۔

سوال۔ حضور علیہ السلام کے اس جواب میں وحی کی کیفیت کا بیان ہے۔ ابتدارِ وحی کی کیفیت کا بیان نہیں ہے اور ترجمۃ الباب ابتدارِ وحی کی کیفیت ہے لہٰذا یہ حدیث ترجمۃ الباب کے مطابق نہیں۔

جواب۔ ترجمۃ الباب سے مناسبت یہ ہے کہ حدیث میں اتیانِ وحی کی دو صورتوں کا بیان ہے اور ظاہر ہے کہ ابتدارِ وحی کی کیفیت انہیں دو صورتوں میں سے ایک ہوگی لہٰذا حدیثِ ہذا ترجمہ کے مطابق ہے۔

سوال۔ سائل نے وحی کی کیفیت دریافت کی تھی۔ حامل وحی کی صفت دریافت نہیں کی تھی اور جواب میں حامل وحی کی صفت کا بھی بیان ہے کہ کبھی فرشتہ بشکل انسانی حاضر ہو کر کلام کرتا تھا۔ لہٰذا جواب سوال کے مطابق نہیں

جواب۔ اگر کسی سوال کے جواب میں سوال سے زائد امور کو بھی بیان کر دیا جائے تو ایسے جواب کو سوال کے غیر مطابق نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ یہ جواب مع الزیادۃ کہلاتا ہے۔ جواب میں اضافہ نکتے پر مبنی ہوتا ہے دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال ہوا۔ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے عرض کی ھی عصای یہ میرا عصا ہے جواب

تو اسی جملہ پر ختم ہوگیا مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا کے مزید فوائد بھی عرض کر دیے۔

اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِىْ وَلِىَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى (قرآن مجید) | میں اس پر تکیہ لگاتا ہوں۔اپنی بکریوں کے لیے درخت سے پتے جھاڑتا ہوں اور میرے اس میں دوسرے کام بھی ہیں۔

دیکھیے جواب موسوی میں یہ اضافے اس نکتہ پر مبنی ہیں کہ آپ نے عصا کے فوائد کا اضافہ بطور شکر کیا کیونکہ نعمتوں کا شمار بھی شکر ہے ـــــ اسی طرح حضور علیہ السلام نے بھی جواب میں اضافہ اظہارِ شکر کے لیے کیا کہ بشکلِ انسانی فرشتہ کا وحی لے کر آنا بھی نعمتِ عظیمہ ہے یا آپ نے بھی جواب میں اضافہ اس لیے فرمایا کہ صفتِ وحی کے بیان کے بعد سائل کے ذہن میں حاملِ وحی کے متعلق بھی سوال پیدا ہوتا تو حضور علیہ السلام نے پہلے ہی سے حاملِ وحی کی صفت بھی بیان فرما دی تاکہ سائل کو سوال کی زحمت ہی نہ ہو۔

صلصلة مسلسل اور متصل آواز کو کہتے ہیں اور جرس گھڑیال کو جو اسکولوں اور دفاتر وغیرہ میں چھٹی کے وقت بجایا جاتا ہے اس پر جب ضرب پڑتی ہے تو آواز میں گونج ہوتی ہے۔ اسی طرح بلا تمثیل حضور علیہ السلام کو ہاتف غیب سے آواز آتی تھی نہ کوئی صورت نظر آتی اور نہ یہ کلام صریح ہوتا۔ سمجھانے کے لیے اس غیبی آواز کو بانگِ جرس سے تشبیہ دی گئی۔ چنانچہ اسی مقصد کے وحی کی دوسری قسم یہ بیان فرمائی کہ بولنے والا فرشتہ مجسم ہو کر سامنے آجاتا تھا اور باتیں کرتا تھا۔

وھواشدہ علیّ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ صلصلة الجرس والی وحی بہت شدید و ثقیل ہوتی تھی اور دوسری قسم کی وحی میں اتنی شدت نہیں ہوتی۔ اس کی اصل وجہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ پھر فکرِ انسانی میں یہ طاقت ہی کہاں ہے کہ وہ ناقابلِ تشریح امور کی حقیقت و ماہیت کو پا سکے۔ البتہ یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ صلصلة الجرس والی وحی آواز جرس کی طرح ایک کلام تھا۔ اس لیے اس کا دشوار و سخت ہونا قدرتی بات ہے۔ اس لیے اس نوع کی وحی میں آپ دشواری محسوس فرماتے ہوں گے اور دوسری صورت میں تو فرشتہ متشکل ہو کر کلام صریح پیش کرتا تھا۔ اس لیے اس میں وہ دشواری نہ ہوتی ہوگی۔

فیفصم عنی۔ فصم کے معنیٰ قطع ہونے، جدا ہونے کے ہیں وقد وعیت عنہ کے معنیٰ جمع کرنے، حفظ کرنے اور سمجھنے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ جب جرس کی طرح مسلسل آواز آتی تو پھر وہ منقطع ہو جاتی تھی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس سے مطلب اخذ فرما چکے ہوتے تھے۔

یتمثل لی الملك یہ وحی کی دوسری کیفیت کا بیان ہے کہ کبھی فرشتہ بشکل انسانی حاضر ہو کر کلام کرتا۔ ملک سے مراد جبریل امین ہیں۔ رجلا سے معلوم ہوا کہ جبریل امین مردانہ شکل میں حاضر ہوتے تھے ـــــ اس حدیث سے فرشتہ کا وجود ثابت ہوا۔ یہ نورانی مخلوق ہے اور کسی بھی شکل و صورت میں آسکتی ہے۔ حضرت جبریل امین عموماً حضرت دحیہ صحابی کی شکل میں حاضر ہوتے تھے اور کبھی کسی اعرابی کی صورت میں۔

فائدہ علامہ قسطلانی نے بحوالہ تفسیر ابن عادل لکھا کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام کو
حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں بارہ مرتبہ
حضرت ادریس علیہ السلام کی خدمت میں چار مرتبہ
حضرت نوح علیہ السلام کی خدمت میں پچاس مرتبہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں بیالیس مرتبہ
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں چار سو مرتبہ
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں دس مرتبہ اور
حضور سید عالم نور مجسم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں چوبیس ہزار مرتبہ باریابی کا شرف حاصل ہوا۔

۲۔ اس حدیث میں وحی کی دو صورتوں کا بیان ہے مگر مقصود حصر نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام کو ان صورتوں کے علاوہ بھی وحی ہوتی تھی چونکہ ان دو طریقوں سے اکثر و بیشتر وحی سے نوازا جاتا تھا۔ اس لیے ان دو صورتوں کو خصوصیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا۔

۳۔ وحی کی دو صورتیں اس حدیث میں بیان ہوئیں۔ اوّل۔ صلصلة الجرس۔ گھڑیال کی طرح آواز آنا۔ دوم: فرشتہ کا آدمی کی صورت میں آنا اور پیغامِ الٰہی پہنچانا۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صلصلة الجرس والی وحی قرآن میں نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کلام صریح ہوتا ہے اور یہ صرف ایک آواز تھی جس سے حضور علیہ السلام مفہوم اخذ فرماتے تھے۔

۴۔ عجیب وغریب امور کی تحقیق و تفتیش کا شوق انسان کی جبلّت میں ودیعت رکھا گیا ہے۔ حضرت حارث نے وحی کے متعلق جو سوال کیا وہ بھی اسی فطری داعیہ کے ماتحت تھا۔ یہ نہیں کہ آپ کو وحی کے بارے میں کوئی شک وشبہ تھا (۲) اسی سے علمائے نے یہ مسئلہ نکالا کہ سوال کرنے کا جواز صرف مسائلِ شریعت ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ پوشیدہ حقائق و اسرار کے بارے میں سوال کرنا بھی جائز ہے۔

بندے جن امور کی معرفت کے مکلّف نہیں انہیں زیر بحث نہ لائیں

چنانچہ فقہاء کرام نے اس سلسلہ میں یہ ہدایت دی ہے کہ وہ باتیں جن کی تحقیق و تفتیش کے ہم مکلّف نہیں اور جن کی معرفت ضروری نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں زیر بحث نہ لایا جائے۔

رد المحتار میں ہے۔ مثلاً یہ سوال کہ جبریل امین کس طرح اُترے کس شکل میں حضور نے ان کو دیکھا کہ جب حضور نے ان کو بشری شکل میں دیکھا تو وہ فرشتے رہے یا نہیں اور جنت و دوزخ کہاں ہے۔ قیامت کب ہوگی۔ عیسے علیہ السلام کس تاریخ کو نازل ہوں گے۔ حضرت اسماعیل افضل ہیں یا حضرت اسحاق۔ ان دونوں میں ذبیح کون ہے؟ حضرت فاطمہ افضل ہیں یا حضرت عائشہ۔ حضور علیہ السلام کے والدین کس دین پر تھے اور ابو طالب

کا کیا دین تھا؟ مہدی کون ہیں۔

ینبغی ان لا یسئل الانسان عما لا حاجۃ الیہ مما لا تجب معرفتہ ولم یرد التکلیف بہ (رد المحتار ج ۵ ص ۵۲۴)

اس قسم کی اور باتیں جن کی معرفت ضروری نہیں یا بندہ ان کے ساتھ مکلف ہے۔ انہیں زیر بحث لانا چاہیے۔

بلکہ میرے نزدیک تو فی زمانہ اس نوع کے مسائل کو زیر بحث نہ لانا ضروری ہے کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس نوع کے مسائل میں بحث و تجسس سے فتنوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ پارٹیاں اور فرقے بن جاتے ہیں اور سخت انتشار و افتراق پیدا ہو جاتا ہے۔

فَاَعِیْ مَا یَقُوْلُ:۔ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب فرشتہ مردانہ شکل میں ظاہر ہو کر کلام کرتا تو میں اس کو محفوظ کر لیتا۔ صحیح ابن عوانہ میں یہ لفظ بھی ہیں وَھُوَ اَھْوَنُہٗ عَلَیَّ اور وحی کا اس کیفیت سے آنا مجھ پر آسان ہوتا تھا۔ یعنی اس کو محفوظ کرنے میں مجھے آسانی ہوتی تھی۔

لیتفصّدُ:۔ تفصد کے معنی بہنے کے ہیں۔ فصد کو اسی لیے فصد کہتے ہیں کہ خون بہانے کے لیے نس کو کاٹتے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کہتی ہیں کہ بوقتِ وحی حضور علیہ السلام کو جبینِ اقدس سے پسینہ بہتا تھا۔

یہ پسینہ کا بہنا دراصل وحی الٰہی کی ہیبت و عظمت کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ متعدد احادیث کا مضمون ہے کہ

وحی کی شدّت و ثقالت

جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو اس کی شدت و ثقالت کا یہ عالم ہوتا کہ جبینِ اقدس پسینہ سے تر ہو جاتی۔ چہرہ مبارک سُرخ ہو جاتا۔ آپ اونٹنی پر جا رہے ہوتے اور وحی نازل ہوتی تو اونٹنی بوجھ سے بیٹھنے لگتی۔ حضرت زید بن ثابت کا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام کا سر مبارک میری ران پر تھا کہ اس حالت میں آیت کا یہ ٹکڑا نازل ہوا غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ تو میری ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ میرا خیال ہو گیا کہ ران کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ حضور علیہ السلام غارِ حرا سے تشریف لاتے تو قلبِ اقدس دھڑکتا ہوتا۔ سردی محسوس فرماتے تو چادر اوڑھا دینے کا حکم دیتے۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ وحی کس قدر شدید و ثقیل ہے اور اس کے تحمل و برداشت کے لیے کیسے مطمئن قلب کی ضرورت ہے قرآن پاک نے وحی کو قَوْلًا ثَقِیْلًا کہا۔ جس کو خود رب العالمین قولِ ثقیل فرمائے۔ اس کے ثقل و شدت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ ایک دوسرے مقام پر قرآنِ حکیم نے وحی کی شدت و قوت کو یوں بیان فرمایا ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اُتارتے تو ضرور تُو اسے دیکھتا جھکا ہوا، پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے۔

اللہ اکبر! جس وحی سے پہاڑ پارہ پارہ ہو جائیں، جس کی شدت و ثقالت کو پہاڑ جیسی سخت چیز برداشت نہ کر سکے۔ اسے انبیاء کرام برداشت کرتے ہیں۔ جس کا معمولی سا مظاہرہ دیکھئے کہ اونٹنی یا حضرت زید بن ثابت کا

کا زانو جس کو وحی سے براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ صرف مہبطِ وحی کے جسدِ مبارک سے اس کا اتصال تھا مگر پھر بھی وحی کی شدت کو محسوس کر رہا تھا۔ اس سے قلوبِ انبیاء کی زبردست قوتِ برداشت کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اقدس پر جو کچھ نازل ہوا۔ ہمارے دل اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

وکیف یکون لمورد الوحی ومنزل القرآن نسبۃ مع رجل من امتہ ھیہات ذالک

(حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم ص ۵۶۳)

اور وہ ذاتِ اقدس جس پر وحی نازل ہوئی اور قرآن اترا اس کی اپنی امت کے ایک شخص سے کیا نسبت ہو سکتی ہے ان دونوں کی حالت میں بڑا فرق ہے۔

حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمسری و برابری کا دعویٰ کرنے والے اگر صرف نفسِ وحی کی شدت اور قوت ہی کو ذہن میں رکھ کر غور کریں تو یہ بات کھل جائے گی کہ انبیائے کرام علیہم السلام باوجود انسان ہونے کے عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتے۔ ان کی بشریت و انسانیت نہایت ارفع و اعلیٰ ہے۔ ان کے قوائے بشریت پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دینے والی چیز کو برداشت کر لیتے ہیں۔

بشر ضرور ہیں پر داخلِ انام نہیں شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

وحی کے لغوی معنیٰ

وحی کے لغوی معنیٰ اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، خفیہ بات کرنا کے ہیں (لسان العرب) امام کسائی عرب کا محاورہ بتاتے ہیں۔

وحیت الیہ بالکلام واوحیت الیہ وھو ان تکلمہ بکلام تخفیہ من غیرہ

کسی سے اس طرح بات کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ۔

ابو اسحاق امام لغت کہتے ہیں۔

وَاَصْلُ الْوَحْیِ فِی اللُّغَۃِ کُلِّھَا اِعْلَامٌ فِی خَفَاءٍ

وحی کا اصل مفہوم اس کے تمام معنوں میں چھپا کر اطلاع دینے کے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں وحی کا لفظ متعدد مقام پر آیا ہے۔ مثلاً

۱۔ وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ — تیرے رب نے شہد کی مکھیوں کو وحی کی

۲۔ بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَھَا — تیرے رب نے زمین کو وحی کی۔

ان دونوں آیتوں میں وحی "فطری" حکم کے معنیٰ میں آیا ہے۔

۳۔ وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ — اور ہم نے حواریوں کو وحی کی کہ ہم پر اور ہمارے پیغمبروں پر ایمان لاؤ

۴۔ وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ اَرْضِعِیْہِ — ہم نے موسیٰ کی ماں پر وحی کی کہ اس بچہ کو دودھ پلا

ان دونوں آیتوں میں وحی کا لفظ الہام کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے (یعنی دل میں بات ڈالنا)

۵- يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ — ایک دوسرے کو چکنی چپڑی باتوں سے وحی کرتے ہیں۔

۶- وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ — شیاطین اپنے دوستوں کو وحی کرتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں لفظِ وحی "پوشیدہ طور پر بات کرنے" میں استعمال ہوا ہے۔ جب ان تمام مقامات کو جہاں قرآن میں لفظِ وحی آیا ہے ایک جگہ جمع کیا جائے تو یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ وہ کلام جو منہ اور کان کے بغیر کسی تک پہنچا ہو وحی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو فرزند کی بشارت دی تو انہیں یہ علامت بتائی کہ تم تین رات دن کلام نہیں کرسکو گے۔ حضرت زکریا علیہ السلام جب حجرہ سے باہر آئے تو بات نہ کرسکے۔ اس لیے انھوں نے اشارہ سے لوگوں کو سمجھا دیا کہ صبح و شام اللہ تعالےٰ کی تسبیح کرتے رہو۔ فَاَوْحٰىٓ اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا۔

اس آیت میں منہ اور کان کی مدد کے بغیر ایک بات کے سمجھا دینے کو وحی کہا گیا (عینی جلد ا صـ۱۸) امام راغب نے فرمایا۔ الاشارۃ السریعۃ فی خفیہ۔ گویا تین چیزیں ہوئیں۔ اشارہ، سرعت، خفاء کسی مبسوط اور مفصل مضمون کو کم از کم عنوان سے ادا کر دینے کا نام اشارہ ہے۔ یہ کئی طرح کا ہوتا ہے۔ کبھی زبان سے ہوتا ہے کہ ایک دو لفظ کہہ دیئے۔ کبھی ہاتھ یا انگلی وغیرہ سے کبھی آنکھ یا گردن سے کبھی کسی اور ذریعہ سے جیسے آج کل بجلی اور انجن وغیرہ سے اشارات کا کام لیا جاتا ہے ۲۔ سریعۃ کے معنیٰ بہت تیز ۳- فی خفیہ یعنی اشارہ مخصوص و پوشیدہ طور پر ہوتا ہے جیسے آپ شارٹ ہینڈ کو دیکھتے ہیں کہ مخصوص و مخفی قواعد کے تحت چند الفاظ و خطوط میں لمبی عبارتوں کو سمو لیا جاتا ہے یا جیسے جہازوں کے سگنل میں خاص قواعد کے تحت اشارے ہوتے ہیں یا جیسے ٹیلیفون آپریٹر کے دفاتر میں ٹک ٹک کی آواز سے مفہوم اخذ کیا جاتا ہے خلاصہ یہ کہ وحی نام ہے ایک ایسے تیز رفتار اشارے کا جو اپنے مخصوص و مخفی قاعدوں کے تحت مفصل باتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

وحی کے شرعی معنیٰ اور اصطلاحِ شرع میں وحی ان مطالب و معارف کا نام ہے جو خدا کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتے ہیں۔ بنیادی حیثیت سے وحی کی تین قسمیں ہیں۔ اللہ تعالےٰ کا بندے سے بلا واسطہ براہِ راست خطاب جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآنِ حکیم میں مذکور ہے۔ دوسرے فرشتہ کے واسطے سے کلام۔ تیسرے ان دونوں طریقوں سے ہٹ کر کسی اور طرح کلام یا مطالب و احکام کا قلبِ نبی پر نزول۔ یہ تیسری قسم ہی وہ ہے جس کی روشنی میں حضور علیہ السلام نے دین کے بارے میں بے شمار امور کی تفصیلی ہیئت و شکل متعین فرمائی اور قرآنِ حکیم کے اجمال و ابہام کی تبیین و تشریح کی۔ واضح ہو وحی جلی جیسے قرآنِ کریم، توریت، زبور و انجیل۔ یہ کلام صریح ہے اسی

علماء نے وحی جلی کی تعریف یہ کی :-

هُوَ كَلَامُ اللّٰهِ الْمُنَزَّلِ عَلٰی نَبِيٍّ مِنْ اَنْبِيَائِهٖ (عینی)

(وحی جلی) اللہ کے اس کلام صریح کو کہتے ہیں جو وہ اپنے انبیاء میں سے کسی نبی پر نازل فرماتا ہے۔

وحی اللہ کی سُنّت ہے اور انبیاء کرام کا خاصہ ہے۔ بلکہ قرآنِ کریم نے جس اہمیت سے وحی کو بیان کیا ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وحی نبوّت کے مترادف ہے اور نبی کے سوا کسی کو وحی ہوتی ہی نہیں ہے۔

وحی اور الہام میں فرق

لغت کے لحاظ سے وحی اور الہام میں کچھ فرق نہیں ہے کیونکہ وحی کا اطلاق کتابت، اشارات، الہام، خفیہ کلام، اشارہ سریعہ (تیزی سے اشارہ کرنا) دل میں کسی بات کا ڈال دینا۔ سبھی پر آتا ہے لیکن شرع میں وحی نبوت کے مترادف ہے اور الہام یا اشارہ یا القاء جو نبی کو ہوتا ہے اسی کو وحی کہتے ہیں اور جو الہام یا اشارہ غیر نبی کو ہوتا ہے اس کو الہام کہتے ہیں۔

وحی و الہام کے متعلق قارئین کرام کو خصوصیت کے ساتھ مندرجہ ذیل امور کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔

اوّل۔ وحی کے لیے فرشتے کی وساطت نہ شرعاً ضروری ہے اور نہ لغۃً۔ مطلقاً القاءِ ربانی کو وحی کہتے ہیں۔

دوم۔ اصطلاحِ شرع میں وحی کا جو مفہوم ہے وہ اب منقطع ہو چکا ہے اور قیامت تک ایسی وحی کوئی نہیں پا سکتا کیونکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے آخری نبی ہیں۔ نبوت و رسالت آپ پر ختم ہو چکی ہے اس لیے اب وحی کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے۔

سوم۔ الہام، یہ اب بھی جاری ہے۔ اولیائے کرام اور صلحائے اُمّت کو ہوتا ہے۔ جس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ کبھی غیب سے آواز آتی ہے کبھی ملکوتی اسرار اس پر منکشف ہوتے ہیں اور غیب کے امور ان کو صفائی باطن کی وجہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں مگر حجت نہیں ہوتے اور وحی رسول سے جو حکم بھی ثابت ہو وہ لازم القبول ہوتا ہے اس کے برعکس الہامِ اولیاء ہرگز ہرگز کسی حکم اور امر و نہی کے صادر کرنے یا نافذ کرنے کی مجاز نہیں اور نہ ہمارے لیے حجت اور سند ہے۔ حضرت شیخ اکبر قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں :-

"وحی انبیاء میں احکام اور امر و نہی ہوتے ہیں اور وحی (الہام) اولیاء میں یہ کبھی نہیں ہو سکتے۔ جو ولی اس کا دعوائے کرے اس کی گردن مار دینی چاہیئے کیونکہ در پردہ وہ نبوت کا دعوائے کرتا ہے۔"

پھر الہامِ اولیاء میں عصمت بھی ضروری نہیں۔ ممکن ہے اس میں شیطان کا دخل ہو۔ اسی لیے الہام کی دو قسمیں ہو گئیں۔ رحمانی و شیطانی۔ جو الہام کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو وہ رحمانی ہے اور جو اس کے خلاف ہو وہ شیطانی ہے۔ پھر اگر الہام واقع میں رحمانی بھی ہو تو بھی دین میں حجت نہیں بن سکتا اور نہ اس کو ماننا ضروری ہوتا ہے اور نہ الہام کی بنیاد پر کسی عقیدے یا کسی امر و نہی کا نفاذ ثابت ہو سکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب غیر نبی کے الہام شریعت میں حجت و سند نہیں تو پھر اس کا فائدہ ہی کیا ہوا۔ اس کا

جواب یہ ہے جو علم غور و فکر، نظر و استدلال کے بغیر طرق مذکورہ سے حاصل ہو اس کو الہام کہتے ہیں۔ اب اگر کسی کا دل الہامِ ربانی کا مخزن بنتا ہے اور اسرارِ ملکوتیہ اس پر منکشف ہوتے ہیں تو یہ بات اس کے دل کی صفائی اور مقربِ بارگاہِ الٰہی ہونے کی دلیل بنتی ہے اور اس الہام سے ملہم اپنی منزلوں کو طے کرتا ہے اور معرفتِ الٰہی میں زیادتی پاتا ہے گویا اس الہام سے ملہم کی ذات کو یقیناً فائدہ پہنچتا ہے اور بعض اوقات دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ چنانچہ حضرت امام غزالی نے الہام کو اللہ کی رحمت قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس باب میں جو کچھ فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"وحی و الہام الطافِ ربانی کے جھونکے ہیں جو قلب کی آنکھوں سے حجاب کو دُور کرتے ہیں اور پھر حقائقِ علوم آئینہ لوحِ محفوظ سے آئینہ قلبِ عارف پر عکس انداز ہوتے ہیں اور ملکوتی اسرار کے ادراک کرنے کی راہِ سعادت کھلتی ہے۔" (احیاء العلوم ص۱)

حضور علیہ السلام کے ساتھ وحی کا آغاز

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وحی کا آغاز رویائے صادقہ (سچے خوابوں) سے ہوا۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ جو خواب بھی دیکھتے تھے۔

فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ (بخاری)	وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہوتا تھا۔

گویا ابتدائے وحی یہ تھی کہ خواب میں آپ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے۔ جو کچھ ملاحظہ فرماتے تھے بعینہ وہی پیش آتا تھا۔

غارِ حرا کا مجاہدہ

مکہ معظمہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک غار تھا۔ جس کو حرا کہتے ہیں۔ آپ مہینوں وہاں جا کر قیام فرماتے۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے وہ ختم ہو جاتا تو پھر گھر واپس تشریف لاتے اور پھر واپس جا کر مصروفِ مراقبہ ہو جاتے۔ بخاری کی حدیث میں ہے کہ غارِ حرا میں حضور علیہ السلام تحنث (عبادت) فرمایا کرتے تھے۔ یہ عبادت کیا تھی۔ علامہ عینی لکھتے ہیں کہ سوال کیا گیا کہ آپ کی عبادت کیا تھی؟

اجیب بان ذالک کان بالتفکر والاعتبار	جواب یہ ہے کہ غور و فکر اور عبرت پذیری تھی۔

ایک دن جب آپ حسبِ معمول غارِ حرا میں مصروفِ مراقبہ تھے کہ فرشتہ غیب نظر آیا۔ فرشتہ کی زبانی سب سے پہلی وحی غارِ حرا میں ہوئی۔

حضور علیہ السّلام پر سب سے پہلی وحی

جب کہ آپ کی عمر مبارک چالیس سال تھی۔ غارِ حرا میں پہلی بار سورہ اقراء کی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک یہ سلسلہ رُکا رہا ــــــ محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ سلسلہ وحی کے رُک جانے کے بعد سب سے پہلے سورہ

مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں۔ آپ حرا سے واپس آرہے تھے کہ ایک آواز سنائی دی۔ آپ نے ادھر ادھر دیکھا کچھ نظر نہ آیا۔ اوپر دیکھا تو وہی فرشتہ جبرئیل نظر آیا۔ حضور علیہ السلام حضرت خدیجہ کے پاس آئے۔ فرمایا مجھے چادر دو اور مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈال دو۔ اسی حالت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں :۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ	اے بالاپوش (محبوب) اُٹھو! اور لوگوں کو خدا سے ڈراؤ اور اپنے رب کی کبریائی بیان فرماؤ۔

نزولِ وحی کی مدت

تمام قرآن حکیم یکدم نازل نہیں ہوا بلکہ حسبِ ضرورت اور وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اوّل نزول شب قدر میں ہوا۔ شب قدر رمضان المبارک کی آخری راتوں میں سے ایک طاق تاریخ کی رات ہے۔ غارِ حرا میں سب سے پہلے وحی سورۂ اقرا کی پانچ آیتیں ہیں۔ اس کے بعد قرآن مجید نجماً نجماً وصالِ اقدس سے کچھ دن پہلے تک نازل ہوتا رہا۔ باعتبار نزول کے قرآن مجید کی آخری آیت واتقوا یومًا ترجعون فیہ الی اللہ ہے۔ اس حساب سے چالیس برس کے سن سے لے کر تریسٹھ سال کے سن تک کل ۲۳ برس نزولِ وحی کے ہیں یعنی تکمیلِ قرآن کی کل مدت ۲۳ سال ہے۔

وحی کے اقسام

قرآن حکیم نے وحی کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

۱۔ وحی، اشاروں سے بات کرنا۔ یعنی دل میں کسی معنیٰ کا بغیر آواز اور الفاظ کے آجانا۔ یہ اگر حالتِ بیداری میں ہے تو کشف ہے اگر خواب میں ہے تو رویا ہے ۲۔ خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی متکلم نظر نہیں آتا مگر غیب سے آواز آتی ہے الفاظ سنائی دیتے ہیں اس کو الہام کہیے ۳۔ فرشتہ کے ذریعہ بات کرنا یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے منہ سے الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ جن کو سن کر نبی محفوظ کر لیتا ہے۔ قرآن پاک کا نزول اسی طریقہ سے ہوا ہے۔ وحی کے یہ تین اقسام خود قرآن پاک نے بیان فرمائے ہیں۔ اگرچہ قرآن مجید نے ان تینوں قسم کی وحی کا علیحدہ علیحدہ نام نہیں رکھا ہے۔ ان اقسام کا ذکر سورۃ شوریٰ کی اس آیت میں ہے :۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (سورہ شوریٰ)	کسی بشر میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ تعالےٰ اس سے بات کرے لیکن وحی کے ذریعہ یا پردہ کی آڑ سے یا وہ کسی فرشتہ کو بھیجے جو اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے بشر کو پہنچادے۔

انبیاء کرام کی وحی کی تین قسمیں ہیں۔

اوّل۔ کلام قدیم کا سننا جیسے بنص قرآن موسیٰ علیہ السلام نے سنا اور ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے صحیح آثار کے ساتھ۔ دوم۔ وحی رسالت یعنی فرشتہ کی وساطت سے کلام کرنا سوم۔ تلقیٔ قلب جس کو حضور علیہ السلام نے یوں بیان فرمایا :۔

اِن روح القدس نفث فی روعی | روح القدس نے میرے دل میں ڈالا

وحی کی سات صورتیں امام سہیلی نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی کی سات صورتیں بیان کی ہیں جو سب کے سب احادیث سے مستخرج ہیں :۔

اوّل :۔ رویائے صادقہ ، سچے خواب دیکھنا دوم :۔ صلصلۃ الجرس ، گھڑیال کی طرح آواز آنا سوم :۔ النفث فی القلب ، دل میں پھونکنا یا دل میں ڈالنا چہارم :۔ تمثیل ، فرشتہ کا کسی شکل میں متشکل ہوکر آنا جیساکہ حدیث میں آیا ہے کہ جبریل حضرت وحیہ کلبی صحابی کی شکل میں حاضر ہوتے تھے۔ پنجم :۔ فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں نمودار ہونا ششم :۔ وہ طریق مکالمہ جو حضور علیہ السلام کو شبِ معراج میں پیش آیا اور اس شب اللہ نے آپ پر وحی فرمائی اور بلا واسطہ مکالمہ جیساکہ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا :۔

اَتَانِی رَبِّی فِی احسن صورۃ فقال فیم یختصم الملاء الاعلیٰ (بخاری) | میرے رب نے بہترین صورت میں تجلی فرمائی اور کہا ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے کس بات میں جھگڑا کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ حضور اکرم پندرہ سال مکہ میں مقیم رہے اور آپ کو سات برس متواتر غیب سے آوازیں آتی رہیں اور آپ روشنی دیکھتے رہے لیکن کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اور آٹھ سال آپ پر وحی نازل ہوئی (مسلم)

ہفتم :۔ وحی اسرافیل ، مسندِ احمد میں صحیح حدیث ہے۔ حضرت شعبی کہتے ہیں کہ جب حضور اکرم علیہ السلام کی عمر مبارک ۴۰ سال کی ہوئی۔ اس وقت وحی نازل ہونا شروع ہوئی (ابتدا میں تین سال تک حضرت اسرافیل (قرآن کے علاوہ) وحی لاتے رہے) ۱۰ سال مکہ میں اور ۱۰ سال مدینہ میں اور حضور علیہ السلام کا وصال ۶۳ برس کی عمر میں ہوا (عینی جلد ۱ ص ۷۴) اس روایت کی رو سے نزولِ قرآن کی کل مدت ۲۰ سال ہوتی ہے۔

وحی متلو وغیر متلو احادیث میں طریقہ وحی کی متعدد صورتیں بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

اَنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِی رُوعِی | روح القدس نے میرے دل میں پھونکا

کہیں یہ صیغہ مجہول بھی آیا ہے۔ نُفِثَ میرے دل میں پھونکا گیا۔ بہت سی حدیثوں میں یہ تصریح ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے حکم دیا۔ یا اللہ تعالےٰ نے مجھ سے کہا۔ ان میں ایسی وحی بھی ہے جو قرآن مجید کے اجزا نہیں ہے اس لیے فقہاء نے وحی کی دو قسمیں کردیں ۔ وحی متلو ، یعنی جس کی تلاوت کی جلیے قرآنِ کریم ۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک حرف تواتر روایت سے منقول ہے اور قرآن کے لفظ اور معنی دونوں خدا کا کلام ہیں۔ وحی غیر متلو :۔ جو تلاوت نہیں کی جاتی اور قرآن کریم کے علاوہ ہوتی ہے جیسے وہ احکام شرعیہ و نصائح دربلیہ جو بروایتِ صحیح احادیث میں مذکور ہیں۔ یہ تواتر سے بہت کم مروی ہیں ۔ وحی غیر متلو یعنی حدیث ۔ یہ الفاظ کے لحاظ سے خدا کا کلام نہیں مگر معنی مفہوم کے لحاظ سے یقیناً اللہ کا ارشاد ہے کیونکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نفسانیت سے بری

کے ترجمان ہیں اور آپ کی زبانِ اقدس سے وہی کچھ خارج ہوتا ہے جو وحی الٰہی ہوتی ہے۔

بوقتِ وحی حضور علیہ السلام کی کیفیت

بوقتِ وحی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی کیا کیفیت ہوتی تھی؟ خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ صلصلۃ الجرس والی وحی مجھ پر بہت زیادہ سخت ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو اس کی شدت سے جاڑوں میں آپ کی پیشانی اقدس سے موتیوں کی طرح پسینہ کے قطرے ڈھلکنے لگتے۔ (بخاری واقعہ افک)

صحابہ کرام کا بیان ہے کہ اس حالت میں جسمِ مبارک بہت بھاری ہو جاتا۔ اگر آپ کسی سواری پر ہوتے تو وہ بیٹھ بیٹھ جاتی (مسند احمد حنبل) حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ پر وحی آئی اور میرا پاؤں زانوئے مبارک کے نیچے دبا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا پاؤں بوجھ سے پس جائیگا۔ (بخاری)

یعلی بن اُمیہ کہتے ہیں کہ وحی کی حالت میں آپ کا چہرہ مبارک سُرخ ہو جاتا تھا۔ (بخاری)

عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہو جاتی تو آپ مضطرب ہوتے۔ چہرہ کا رنگ بدل جاتا۔ آپ سرِ اقدس جھکا لیتے صحابہ بھی اپنے سر نیچے کر لیتے۔ وحی کے بعد آپ سر اُٹھا لیتے (صحیح مسلم باب عرق النبی)

وحی کی ابتدا رویائے صالحہ سے ہوئی

حدیث نمبر۳ عَنْ عَائِشَۃَ اُمِّ الْمُؤْمِنِیْنَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا اَنَّھَا قَالَتْ اَوَّلُ مَا بُدِیَٔ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْیِ الرُّؤْیَا الصَّالِحَۃُ فِی النَّوْمِ فَکَانَ لَا یَرٰی رُؤْیَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ حُبِّبَ اِلَیْہِ الْخَلَاءُ وَکَانَ یَخْلُوْا بِغَارِ حِرَاءٍ فَیَتَحَنَّثُ فِیْہِ وَھُوَ التَّعَبُّدُ اللَّیَالِیَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ اَنْ یَّنْزِعَ اِلٰی اَھْلِہٖ وَیَتَزَوَّدُ لِذٰلِکَ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلٰی خَدِیْجَۃَ فَیَتَزَوَّدُ لِمِثْلِھَا حَتّٰی جَاءَہُ الْحَقُّ وَھُوَ فِیْ غَارِ حِرَاءٍ (بخاری)

حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ تعالےٰ عنہا کہتی ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وحی کا آغاز سچے خوابوں سے ہوا۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ سپیدۂ سحر کی طرح (سچا ہو کر) نمودار ہوتا۔ پھر آپ کو تنہائی پسندیدہ کیا گیا اور آپ غارِ حرا میں خلوت گزینی فرمانے لگے اور وہاں متعدد راتیں عبادت فرماتے۔ بغیر اس کے کہ اپنے اہل و عیال کی طرف جائیں اور آپ اپنے ہمراہ توشہ لے جاتے جب وہ ختم ہوتا تو آپ حضرت خدیجہ کے پاس آتے اور مزید توشہ لے جاتے یہاں تک کہ حق آپ کے سامنے آگیا اور آپ غارِ حرا میں تھے۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے تفسیر میں، مُسلم نے ایمان میں اور ترمذی و نسائی نے کتاب التفسیر میں ذکر کیا ۲۔ یہ سوال نہ کیا جائے کہ حضرت عائشہ تو حضور علیہ السلام کے مجاہدہ حرا کے موقع پر موجود ہی نہ تھیں پھر نزولِ وحی کے واقعہ کو کیسے بیان فرما رہی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے حضور علیہ السلام

سے سُن کر ہی اس واقعہ کو بیان فرمایا ہے جس پر حدیث کے الفاظ قَالَ فَاَخَذَنِیْ فَغَطَّنِیْ دال ہیں۔ البتہ اوّل مَا بُدِیَ بِہٖ ..... الخ یہ عائشہ صدیقہ کے اپنے الفاظ ہیں جن سے نبوی کلام کی حکایت فرمائی ہے لہٰذا حدیث ہذا مرسل نہیں بلکہ مسند ہے۔

۲۔ من الوحی بتقدیر مضاف یعنی من اقسام الوحی۔ کیونکہ من برائے تبعیض ہے اور اس کے مدخول کے لیے ذی ابعاض ہونا ضروری ہے۔ نبوی خواب چونکہ وحی ہوتے ہیں اس لیے ان کو اقسامِ وحی میں شمار کرنا درست ہے

رویائے صالحہ وصادقہ کا فرق

۳۔ رُؤیا صادقہ اس خواب کو کہتے ہیں جو انتشار اور شیطانی عمل دخل سے پاک ہو۔ جو اپنی تعبیر خود ہو۔ علامہ قسطلانی نے فرمایا کہ صالحہ اور صادقہ انبیاء کرام کے حق میں بنظرِ آخرت متساوی ہیں مگر دنیوی لحاظ سے ان میں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ انبیاء کرام کے رویا دنیوی اعتبار سے صادقہ تو سبھی ہوتے ہیں لیکن سب کے سب کا صالحہ ہونا ضروری نہیں جیسے یومِ احد کا رویا کہ دنیوی حیثیت سے صالحہ نہ تھا اگرچہ صادقہ ضرور تھا لہٰذا ان میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہوئی۔ صالحہ خاص اور صادقہ عام ہے۔

۴۔ فی المنام: رؤیا نیند کے ساتھ خاص ہے۔ رویت آنکھ کے ساتھ اور رأی دل کے ساتھ۔ لہٰذا یہاں فی المنام کے الفاظ بغرض مزید توضیح کے لیے ہیں یا دفع وہم تجوّز کے لیے اس لیے کہ کبھی رویت عینی پر بھی رویا کا اطلاق مجازاً ہوتا ہے جیسے قرآنِ مجید کی اس آیت میں مَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِیْ ..... الخ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے آنکھ کا دیکھنا مراد ہے جو حضور علیہ السلام کو شبِ اسراء دکھایا گیا (عامۂ تفاسیر)

رویا کے اقسام اور کونسا رویا نبوّت کا جزء ہے؟

واضح ہو کہ رویا کی دو قسم ہیں۔ باطلہ۔ حقہ۔ پھر رویائے باطلہ سات قسم پر ہے۔

۱۔ حدیث نفس: وہ باتیں جو آدمی اپنے نفس سے کہتا رہتا ہے خواہ وہ کسی چیز کے منصوبے ہوں یا کسی چیز کی آرزوئیں اسی کو عربی میں اضغاث اور فارسی میں پریشان خواب کہتے ہیں۔

۲۔ تحذیر شیطان: جس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ اگر بیدار ہو کر آدمی بائیں جانب تین مرتبہ تھوک دے تو مضرت رساں نہیں ہوتے۔

۳۔ حلم: یعنی خواب میں جماع کرتے ہوئے اپنے آپ کو دیکھنا جو موجب غسل ہوتا ہے اور اس کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

۴۔ ساحری، جو کسی جن یا انسان کی وجہ سے نظر آتا ہے۔

۵۔ شیطانی۔ وہ خواب جو شیطان دکھائے۔

۶۔ خلطی: جو اخلاطِ اربعہ میں سے کسی ایک کے غالب ہونے سے نظر آتا ہے مثلاً سوداء کے غلبہ سے

قبریں، سیاہی، صفرا کے غلبہ سے آگ، چراغ، خون وغیرہ۔ بلغم کے غلبہ سے سپیدی، پانی، مرجین وغیرہ، دم کے غلبہ سے مشروبات، پھول، آلات، مزامیر وغیرہ دکھائی دیتے ہیں۔

۷۔ رجعی:۔ جو ایسے زمانہ میں نظر آئے جس میں دیکھنے والا موجود تھا اور اس کو بیس ہزار سال کا عرصہ گزر گیا ہو۔
رؤیائے حقہ پانچ قسم پر ہے۔

۱۔ شاهدی:۔ وہ خواب جس کی صحت پر شاہد ہو جو شر کے خیر اور خیر کے شر ہونے پر دلالت کرے جیسے کوئی دیکھے کہ مسجد میں طنبورہ بجا رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ بے حیائی کی باتوں سے اور بُرے افعال سے توبہ کرے گا یا کسی نے دیکھا کہ حمام میں قرآن پڑھ رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ کسی بُرے کام میں مشہور ہو گیا اور اس پر شاہد یہ ہے کہ حمام ستر کھلنے کی جگہ ہے اور یہاں فرشتے داخل نہیں ہوتے اور مسجد میں شیطان داخل نہیں ہوتا۔

۲۔ مرموزہ:۔ وہ خواب جس میں تعبیر کی طرف اشارہ ہو جیسے کسی نے فرشتہ کو دیکھا کہ وہ کہتا ہے کہ تیری بیوی تیرے فلاں دوست کے ذریعہ تجھ کو زہر پلانا چاہتی ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ یہ دوست اس کی بیوی سے زنا میں مبتلا ہوگا۔ اس خواب میں تعبیر کی طرف اشارہ یوں ہے کہ جیسے زہر پوشیدہ طور پر کھلایا جاتا ہے۔ اسی طرح زنا بھی مخفی طور پر کیا جاتا ہے۔

۳۔ ملکی:۔ وہ خواب جو ملک رؤیا کے توسّط سے ہو۔ جن کا نام صدیقوں ہے۔ جس طرح آفتاب کی روشنی میں اشیاء نظر آتی ہیں۔ اسی طرح صدیقوں نور الٰہی کی روشنی میں اشیاء کی معرفت کراتے ہیں۔ دنیوی و اخروی خیر و شر کی تلقین کرتے ہیں۔ گزشتہ یا آیندہ عمل خیر کی بشارت دیتے ہیں۔ گزشتہ معصیت یا آیندہ معصیت پر ڈراتے ہیں اگر ڈراؤنا خواب دکھائیں تو اسی وقت ہو جاتا ہے تاکہ دیکھنے والا مغموم نہ رہے اور اگر مسرور کن خواب دکھائیں تو چند دنوں کے بعد ظاہر ہوتا ہے تاکہ اس وقت تک دل مسرور رہے۔

۴۔ صالحہ:۔ جو اللہ عزوجل کی طرف سے بشارت ہوتا ہے۔

۵۔ صادق ظاهرہ:۔ وہ خواب جس کی تعبیر نہیں ہوتی بلکہ وہ خود اپنی تعبیر ہوتا ہے جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا رؤیا جس کو قرآن نے بیان کیا۔ یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ یا حضور علیہ السلام کا وہ رؤیا جو سورۃ فتح میں مذکور ہے جس کو یوں بیان فرمایا گیا لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ الخ یہی رؤیا یعنی صادق ظاہرہ نبوت کے ۴۶ اجزاء میں سے ایک جزء ہے اور یہ رویا صرف انبیاء کرام کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے بلکہ عام انسانوں کو بھی نظر آجاتا ہے۔

رؤیائے صالحہ نبوّت کا ایک جزء ہے۔ غیر نبی کے خواب کا حکم اور اسکی شرعی حیثیت

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پاکیزہ خواب بھی نبوّت کا جزو ہیں اور اس اتفاق کی بنیاد قرآنِ حکیم کے فیصلے پر ہے۔ سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض خواب کی ہدایت پر ہی ذبح فرزند کا اہتمام فرمایا تھا اور اللہ عزّوجل نے ان کے اس اقدام کو غلط نہیں ٹھہرایا بلکہ اس

کی مدح فرمائی۔ اس سے واضح ہوا کہ خواب جزوِ نبوت نہ ہوتا تو نہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ذبح فرزند کا قصد فرما سکتے تھے اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تحسین ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ انی ارٰی فی المنام میں نے خواب دیکھا ہے کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں۔ اس پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے جواب دیا افعل ما تؤمر جو آپ کو حکم ملا ہے اس کو کر ڈالیے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا جواب بھی اس امر کی تصریح کر رہا ہے کہ وہ خود بھی خواب کو حکمِ ربانی سمجھتے تھے۔ ورنہ اگر خالی اپنے والد کی اطاعت مقصود ہوتی تو ان کا جواب یہ ہونا چاہیے تھا اِفعَلْ مَاتَریٰ۔ کیجیے جو آپ مناسب سمجھیں لیکن انھوں نے یہ جواب نہیں دیا جس سے واضح ہوا کہ نبی کا خواب بھی ایسا ہی ہوتا ہے جیسے جاگتے میں کوئی حکم ملا ہو ——— خوب یاد رکھئے کہ رؤیائے صالحہ اگرچہ نبوت کا جُز ہیں لیکن غیر نبی کے رؤیائے صالحہ دین میں حجّت نہیں ہوتے اور نہ اس سے کوئی شرعی حکم نافذ کیا جا سکتا ہے نبوت کے بہت سے اجزاء ہیں جو صالح امتیوں میں پائے جاتے ہیں مگر ان اجزاء کا پایا جانا آدمی کو نبی نہیں بناتا۔ نبوت ایک وہبی چیز ہے جو اللہ عزّوجل کی خاص عطا کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ نبی میں حُسنِ اخلاق اور متعدد ملکات کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ حسنِ اخلاق اور ملکات جس میں پائے جائیں وہ لازماً نبی ہو جائے۔

علاوہ ازیں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل تو کسی نبی کے مبعوث ہونے کا امکان تھا مگر حضور علیہ السلام کی ذات پر تو اللہ عزّوجل نے نبوّت کو ختم کر دیا۔ آپ کے بعد تو کسی نبی کے پیدا ہونے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ پھر جب حضور علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا تو غیر نبی کے رویائے صالحہ دین یا شریعت بھی نہیں بن سکتے۔

الرویاء الصالحہ یعنی وحی کا آغاز سچے خوابوں سے ہوا۔ ویسے رویاء صالحہ سے قبل بھی کچھ امور حضور علیہ السلام کو پیش آئے تھے مثلاً روشنی کا نظر آنا، حجر و شجر کا بزبانِ فصیح سلام عرض کرنا، درختوں کا سایہ ریز ہونا۔ یہ سب مبادیات وحی تھے۔ یعنی یہ سب چیزیں وحی بواسطہ ملک کے لیے تمہید تھیں۔ اس کے بعد رویاءِ صالحہ سے وحی کی ابتداء ہوئی۔ یہ شاید اس لیے کہ رویا صالحہ وحی کی بہت ہی نیک اور ملکی قسم تھی۔

فَلَقَ الصُّبْحِ ۔ فلق کے معنیٰ صبح کی روشنی کے ہیں اور فلق کی اضافت صبح کی طرف بیانیہ ہے۔ اس تشبیہ سے واضح ہوتا ہے کہ جو خواب حضور علیہ السلام کو دکھائے جاتے تھے ان کا نتیجہ عملی زندگی میں وہی ظاہر ہوتا تھا جو آپؐ کو خواب میں صاف وصریح طور پر دکھایا جاتا تھا۔

ثُمَّ حُبِّبَ اِلَیْہِ الْخَلَاءُ : خوابوں کے نظر آنے سے حضور علیہ السلام کی طبیعت میں روحانیت کا اور زیادہ غلبہ ہوا اور آپ کا میلان خلوت و یکسوئی کی طرف ہو گیا اور آپ اکثر و بیشتر غارِ حراء کی خلوت میں رہنے لگے۔

۲۔ یہ خلوت زیرِ بحث چونکہ وحی کی شروعات ہو جانے کے بعد وقوع پذیر ہوئی جس پر لفظ ثم دلالت کرتا ہے جس سے واضح ہوا کہ ان کا اختیار فرمانا بھی بحکمِ الٰہی ہی تھا۔

بغارِ حراء : حراء مکہ سے منیٰ جاتے ہوئے تین میل کے فاصلے پر بائیں ہاتھ ایک پہاڑ ہے تین چٹانیں

کچھ اس طرح مل گئی ہیں کہ قدرتاً حجرہ بن گیا ہے۔ مختصر اتنا کہ دو آدمی اس میں تنگی سے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ داخلہ کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ بھی سیدھا نہیں ہے بلکہ سکڑ سمٹ کر جانا پڑتا ہے۔ خلوت نشینی و یکسوئی کے لیے یہ ایک بہترین جگہ تھی۔ جس میں خلوت نشینی کی محبت آپ کے قلب مبارک میں ڈالی گئی۔ فیتحنث: حنث باب تفعل سے ہو تو اس میں سلب و نفی کے معنیٰ پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے تاثم گناہ سے دور ہونا تو تحنث کے معنی ہوئے خلاف شان کام سے اجتناب و دوری اور شایانِ شان کام میں انہماک و مستعدی۔ ابن شہاب زہری نے تحنث کی تفسیر تعبد سے کی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ حضور علیہ السلام غارِ حرا میں کیا عبادت فرماتے تھے؟ اس کے متعلق قطعی و یقینی فیصلے کی تو کوئی صورت نہیں کیونکہ واقعات کا تعین خالی قیاسات سے نہیں ہو سکتا تاہم شارحین نے متعدد احتمالات نکالے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

اس معرفت کا طریقہ حضور علیہ السلام کو اپنے نورِ معرفت سے ہوا۔ بذریعہ الہام اس کا طریقہ بتایا گیا یا رویائے صالحہ میں طریقۂ عبادت بتایا گیا (عینی جلد ۱ ص۲۷) یتزود۔ تزود کے معنیٰ توشہ لینے کے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ اپنے ساتھ توشہ یعنی سامانِ ضرورت رکھنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔ حتّٰی جاءہ الحق یعنی غارِ حرا میں خلوت نشینی کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا کہ آپ پر وحی آگئی۔

فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فَقَالَ اِقْرَأْ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ قَالَ فَاَخَذَنِیْ فَغَطَّنِیْ حَتّٰی بَلَغَ مِنِّی الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِیْ فَقَالَ اِقْرَأْ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ قَالَ فَاَخَذَنِیْ فَغَطَّنِی الثَّالِثَةَ ثُمَّ اَرْسَلَنِیْ فَقَالَ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ

(بخاری)

پس فرشتہ آپ کے پاس آیا اس نے کہا پڑھو میں نے کہا۔ میں نہیں پڑھتا۔ حتّٰی کہ فرشتے نے مجھے پکڑا اور اتنا دبایا کہ وہ تھک گیا۔ پھر چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے پھر کہا۔ میں نہیں پڑھتا۔ فرشتے نے پھر دوسری بار مجھے پکڑا اور اتنا دبایا کہ وہ تھک گیا پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو میں نے پھر وہی جواب دیا۔ میں نہیں پڑھتا۔ فرشتے نے تیسری بار مجھے پھر دبایا اور کہا پڑھیے اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا ہے جس نے انسان کو بستہ لہو سے پیدا کیا۔ پڑھیے تمہارا رب بڑا ہی کریم ہے ...... الخ

غارِ حرا میں جبریل کی آمد

۱۔ یہ تھی غارِ حرا میں حضور السلام پر سب سے پہلی وحی اور ایک پیامبر کی حیثیت سے جبریل کی پہلی حاضری۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس فرشتہ سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہی ہیں اور قرآن کریم جبریل ہی لے کر نازل ہوئے۔ قرآن مجید میں بھی اس کی تصریح کی گئی۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ ۲۔ رویائے صالحہ اور حرا میں خلوت گزینی کے بعد تیسری کیفیت یہ پیدا ہوئی کہ حضرت جبریل امین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سامنے آگئے اور انھوں نے سورۃ اقراء کی پانچ آیتیں سنائیں۔ یہ ۷ رمضان پیر کا دن تھا۔ اس وقت حضور علیہ السلام کی عمر مبارک چالیس سال تھی۔

غارِ حرا میں جبریل بشکلِ بشر حاضر ہوتے تھے

اس حدیث سے پیشتر جو حدیث تھی۔ اس میں وحی کی دو صورتوں کا بیان تھا ۱۔ مانندِ آوازِ جرس ۲۔ فرشتہ کا بشکلِ بشر حاضر ہو کر کلام کرنا اور حدیثِ زیرِ بحث میں چونکہ آمدِ وحی کی ابتدائی کیفیت کا ذکر ہے تو لامحالہ یہ آمد انہیں دو صورتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہوگی اور یہ تو ظاہر ہے کہ یہ وحی مانندِ جرس نہ تھی۔ تو جب پہلی صورت کا انتفاء ثابت ہوا تو دوسری صورت متعین ہوگئی کہ حضرت جبریل بشکلِ بشر حاضر ہوتے تھے۔ چنانچہ تین بار اقرار کہنا اور فغطنی کے الفاظ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

فَقَالَ اِقْرَءْ۔ حضرت جبریلِ امین نے عرض کی اقرا۔ پڑھیے۔ حضرت جبریلِ امین نے تین مرتبہ اقرار کہا اور حضور نے تینوں بار مَا اَنَا بِقَارِئٍ "میں تو نہیں پڑھتا" فرمایا[۱] تین بار اقرار کہنے میں اس طرف اشارہ تھا کہ جس وحی کا آغاز ہو رہا ہے وہ تین چیزوں پر مشتمل ہوگی۔ توحید، احکام، قصص۔ مَا انا بقارئ۔ حضور علیہ السلام نے جواباً فرمایا۔ میں نہیں پڑھتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے پڑھنے سے انکار کیوں فرمایا؟ تو حق یہ ہے کہ حضرت جبریلِ امین کا تین بار اقرار کہنا اور حضور کا ما انا بقارئ کے الفاظ سے جواب دینا اللہ ہی جانے اس میں کیا حکمتیں ہیں۔ اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہنے کی گنجائش تو نہیں ہے۔ البتہ بظاہر انکار کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضور علیہ السلام غارِ حرا میں ذکرِ الٰہی سے لذت اندوز تھے کہ قلبِ اقدس پر کیف کا عالم طاری تھا کہ اچانک حضرت جبریلِ امین نے حاضر ہو کر استدعا کی، پڑھیے تو ظاہر ہے کہ جب آپ کا قلبِ مبارک محبوبِ حقیقی کی یاد میں سرشار تھا اور ایک استغراق کی کیفیت طاری تھی تو ایسی صورت میں آپ نے دوسری جانب توجہ مبذول نہ فرمائی۔ حضرت جبریلِ امین نے تین بار اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے معانقہ بھی فرمایا مگر حضور علیہ السلام کا قلبی اقتضا یہی رہا کہ ذکرِ حبیب سے لطف اندوز ہوتا رہوں تا آنکہ سیدنا جبریل امین نے اسی محبوب کے نام کی برکت سے پڑھنے کی استدعا کی جس کے مشاہدۂ جمال میں حضور مستغرق تھے ——— غرضکہ اب حضور علیہ السلام ادھر متوجہ

---

[۱] چنانچہ شارحین نے لکھا کہ مَا انا بقارئ میں مَا نافیہ ہے انا اس کا اسم ہے اور بقارئ خبر ہے ب زائد ہے نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ البتہ علامہ عینی کی رائے یہ ہے کہ یہاں مَا استفہامیہ ہے جیسے مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَا مُوْسٰى میں ہے اور اس کی تائید روایت ابی الاسود (فی مغازیہ) بھی کرتی ہے جس میں ما انا بقارئ کی جگہ کیف اقرء یا ماذا اقرء آیا ہے (عینی جلد ۱ صہ ۶۷)

چنانچہ ابن اسحٰق نے بروایتِ عبید بن عمیر مَا ذَا اَقْرَءُ اور ابوالاسود نے اپنے مغازی میں کَيْفَ اَقْرَءُ روایت کیا اس صورت میں ترجمہ ہوگا کیا پڑھوں؟ کیسے پڑھوں، ہوگا (عینی ج ۱ صہ ۶۷) میرے والد محترم حضرت علامہ ابوالبرکات، قدس سرالعزیز نے حلقہ درسِ بخاری شریف سن ۱۹۴۶ء میں مَا انا بقارئ کی ایک توجیہہ یہ بیان فرمائی کہ لفظِ مَا برائے نفی مشبہ بلیس ہے اور با زائدہ تاکید نفی کے لیے ہے اور یہ کہ مَا انا بقارئ میں نفی جنسِ قراءت میں ہے ہے تو اب ترجمہ یہ ہوگا میں تو نہیں پڑھتا۔ حضرت صدرالافاضل مولانا سید نعیم الدین صاحب مرادآبادی علیہ الرحمہ نے خزائن العرفان میں مَا انا بقارئ کا ترجمہ "ہم پڑھے نہیں ہیں" کیا ہے۔

اقرأ باسم ربك الذی خلق ۔ اس رب کے نام کی برکت اور مدد سے پڑھیے جس نے پیدا کیا۔ امام راغب مفردات میں رب کے معنی بیان کرتے ہیں کہ رب وہ ہے جو کسی چیز کو تدریجاً اس کے حد کمال تک پہنچا دے وہ حد کمال جس کی وہ شے لائق ہے اور جس کی اس میں استعداد ہے ۲۔ خلق کہا گیا مگر یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ کس چیز کو پیدا کیا ؛ تو کارِ تخلیق کو نکرہ چھوڑ دینے سے یہ واضح ہوا کہ کائنات و موجودات کی ہر شے کا خالق صرف ایک رب ہے۔ گویا رب اور خلق کے لفظ سے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ گو بظاہر اقرأ (پڑھیے) جبریل کی زبان سے ادا ہو رہا ہے مگر یہ تو وسیلہ اور واسطہ میں ہمارے حکم کی تعمیل میں اقرأ کہہ رہے ہیں ورنہ حقیقت میں اقرأ کہنے والا اور وحی کے پڑھنے کی آپ میں استعداد و ہمت پیدا فرمانے والا بھی آپ کا رب ہی ہے۔ لہٰذا اسی کا نام لے کر پڑھیے خلق الانسان من علق ۔ ہاں وہ رب جس نے انسان کو جمے ہوئے لہو سے پیدا کیا تو اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ وہ انسانِ کامل محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کو اپنے تلمذ میں لے کر ان کے سینہ کو علم و عرفان سے بھر دے۔

اقرأ وربك الاکرم بالفعل پڑھیے اور آپ کیوں نہ پڑھیں گے جب کہ آپ کا رب کریم ہی نہیں بلکہ اکرم ہے وہ فیض کے لامتناہی خزانوں کی بلا شرکتِ غیرے مالک ہستی فیض پہنچا رہی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں فیض قبول کرنے کی پوری استعداد بھی موجود ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ فیض پہنچنے میں کوئی کسر رہ جائے۔

الذی علم بالقلم ۔ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا ——— ظاہر ہے کہ اگر اللہ عزوجل انسان کو قلم سے کام لینے کا سلیقہ و شعور نہ عطا فرماتا تو آج علم و عرفان کے یہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر قلبِ انسانی کی گھاٹیوں میں ہی کھوئے رہتے لیکن اللہ عزوجل نے قلم سے کام لینے کا سلیقہ عطا فرمایا اور اس کے ذریعہ انسان نے علوم و معارف کے دریا بہا دیئے۔

یہیں سے اس امر کی وضاحت بھی ہو گئی کہ گو وحی کا نزول بذریعہ جبریل ہوا اور زبانِ جبریل نے حضور نبوی علیہ السلام اقرأ کہا۔ مگر جبریل حضور علیہ السلام کے اُستاد پھر بھی نہیں ہوئے اور ان نادانوں کے خیال کی تردید اسی چھوٹے سے جملے نے کر دی جو حضور علیہ السلام کو جبریل کا شاگرد قرار دیتے ہیں (معاذ اللہ)

غور کیجیے ! کہ قلم علم کے سیکھنے کا واسطہ بنتا ہے لیکن کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ قلم خود عالم سب قلم سے افضل ہو گیا یا جس شخص نے قلم کے ذریعے علم حاصل کیا وہ شاگرد اور قلم اس کا اُستاد ہو گیا ؟ نہیں بلکہ ہر عقل و فہم کا مالک یہ کہتا جانتا مانتا ہے کہ استاد قلم نہیں ہے بلکہ وہ شخص ہے جو قلم کے ذریعے کسی دوسرے کو علم سکھا رہا ہے پس جبریل کہاں اور کیسے اُستاد تو وہ رب کریم ہے جو جبریل کے واسطہ سے حضور علیہ السلام کو علم دے رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قلم ایک بے جان آلہ ہے جس کی بجائے خود کوئی حیثیت نہیں ہے اور حضرت جبریل امین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اللہ کے مقدس رسول ہیں۔ ملکِ مقرب ہیں۔ واجب التعظیم ہیں۔ مرسل ملائکہ میں بھی ممتاز درجہ رکھتے ہیں لیکن بایں ہمہ حضور علیہ السلام کے مقابل ان کی حیثیت معلم اور حاکم کی ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے وحی پہنچانے کے سلسلہ میں انہیں حضور علیہ السلام کا استاد قرار دینا یا کسی نہ کسی درجہ میں انہیں حضور علیہ السلام

پر فضیلت دینا باطلِ محض ہے۔

یہاں یہ شبہ وارد نہیں ہوسکتا کہ قرآنِ حکیم میں علم سکھانے کی نسبت جبریل کی طرف کی گئی ہے اور بہت سے مفسرین نے بھی وہاں جبریل امین کو ہی مراد لیا ہے۔ جیسے اس آیت میں علمہ شدید القوی۔ تو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جہاں قرآن میں علم سکھانے کی نسبت جبریل امین کی طرف کی گئی ہے وہ مجاز ہے حقیقت نہیں ہے حقیقۃً استاد و معلم اللہ عزوجل ہی ہے۔ جبریل امین کی طرف علم سکھانے کی نسبت مجازاً کردی گئی ہے چنانچہ اُردو کا محاورہ ہے "اس کا قلم موتی بکھیرتا ہے"۔ "اس کے قلم نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہادیئے" ——— ظاہر ہے کہ اس قول میں حقیقتاً تعریف اس قلم کی نہیں جس سے آدمی مضمون لکھتا ہے بلکہ تعریف خود اس شخص کے ملکۂ تحریر اور حُسنِ بیان کی، کی جارہی ہے جس کے ہاتھ میں قلم ہے۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی تلوار نے کتنے ہی ممالک زیرِ نگین کرلیے۔ تو حقیقت میں یہ تعریف لوہے کے اس تیز دھار والے ٹکڑے کی نہیں ہے جسے تلوار کہتے ہیں بلکہ صاحبِ تلوار کی جنگجویانہ قابلیت اور اس کی شجاعت و بسالت کی تعریف ہوتی ہے ایسی سینکڑوں مثالیں ہیں جن میں معنیٰ مجازی مراد ہوتے ہیں تو اسی طرح جہاں کہیں بھی کتاب و سُنّت میں حضور علیہ السلام کو تعلیم دینے کی نسبت حضرت جبریل کی طرف کی گئی ہے وہ نسبت بھی مجازی ہے حقیقی نہیں ہے۔ علم الانسان مالم یعلم آدمی کو وہ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔ یہ فقرہ بھی بے شمار لطائف و حکم پر مشتمل ہے۔ مگر سب سے ممتاز حقیقت جس کی طرف اس فقرہ میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے۔

کہ یہ مت سمجھنا کہ وہ ربِ کائنات صرف وسائل و ذرائع ہی سے علم سکھاتا ہے اور اس کی قدرت (معاذ اللہ) اسی حد تک محدود ہے۔ نہیں بلکہ وہ تو یہاں تک قادر ہے کہ بلا کسی واسطہ اور وسیلہ کے انسان کو وہ کچھ سکھا دے جو وہ نہیں جانتا ——— پھر اس میں اس اہم حقیقت کی طرف راہنمائی کی گئی ہے کہ اللہ عزّوجل نے نزولِ وحی کے لیے جبریل امین کو وسیلہ و واسطہ بنایا ہے تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اللہ عزّوجل نے اپنے رسول پر صرف بذریعہ جبریل ہی وحی نازل کی ہے اور بلا واسطہ جبریل کچھ نازل نہیں کیا ہے یا حضور علیہ السلام تک جو ہدایات خداوندی پہنچی ہیں وہ صرف بذریعہ جبریل ہی پہنچی ہیں اور جبریل کے واسطہ کے بغیر اللہ عزّوجل نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی ہدایت دی ہی نہیں ہے۔ ایسا کہنا اور سمجھنا بالکل لغو و باطل ہے۔ اس لیے کہ وہ قادر و قدیر خدا جبریل کے وسیلہ کا محتاج نہیں ہے اور نہ اس کا پابند ہے، کہ وہ وسائل و ذرائع ہی سے اپنے رسولوں پر اپنے احکام نازل فرمائے بلکہ اس کی شان تو یہ ہے کہ علم الانسان مالم یعلم کہ وہ بلا واسطہ و وسیلہ بھی انسان کو وہ کچھ سکھاتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔ چنانچہ علم بالقلم کے بعد علم الانسان مالم یعلم فرمایا (یعنی پہلے قلم کے ذریعہ علم سکھانے کا مستقل ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ سکھایا آدمی کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا۔ اسی اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجُفُ فُؤَادُهُ، فَدَخَلَ عَلَى خَدِيجَةَ	پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نازل شدہ آیات لے کر واپس گھر تشریف لائے۔ قلب مبارک مضطرب تھا۔ فرمایا۔

بِنْتِ خُوَيْلِدٍ فَقَالَ زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ فَزَمَّلُوْهُ حَتّٰى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ فَقَالَ لِخَدِيْجَةَ وَاَخْبَرَهَا الْخَبَرَ لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ (بخاری)

مجھے کمبل اُڑھاؤ مجھے کمبل اُڑھاؤ۔ آپ کو کمبل اڑھایا۔ یہاں تک کہ وہ کیفیتِ اضطراب جاتی رہی پھر حضور علیہ السلام نے (حضرت خدیجہ) کو (غارِ حرا) کا تمام ماجرا بیان کر کے فرمایا مجھے تو اپنی حالت کا خطرہ ہو گیا تھا۔

یَرْجُفُ فُؤَادُہٗ، رجف، باب نصر ینصر سے لازم و متعدی دونوں آتا ہے اس کے اصل معنے ہلنے ہلانے کے ہیں۔ یہاں اس جملہ سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی قلبی کیفیت کو اضافہ حرکت سے ظاہر کیا گیا کہ جب آپ غارِ حرا سے تشریف لائے تو قلبِ مبارک مضطرب تھا اور جب آپ کو چادر اڑھا دی گئی تو وہ اضطرابی کیفیت جاتی رہی جس پر حَتّٰى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ کا جملہ نصِ صریح ہے اور جب یہ اضطرابی کیفیت رفع ہو گئی تو اس کے بعد حضور اکرم نے غارِ حرا کی پیش آمدہ سرگزشت بیان کر کے فرمایا کہ مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہوا۔ لقد خشیت علی نفسی کا ترجمہ بعض لوگوں نے "حال" کا کیا ہے۔ "یعنی مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے"۔ لیکن جب خشیت ماضی کا صیغہ ہے۔ قد بھی یہاں موجود ہے اور سیاقِ حدیث فاخبرھا الخبر بھی اس پر دال ہے کہ واقعہ ماضی کا ہے تو ترجمہ "ہے" کی بجائے "ہوا" کرنا چاہیئے۔ معروف محاورہ ہے کہ جب آدمی کسی انتہائی تکلیف دہ چیز سے دوچار ہوتا ہے تو اس موقع پر وہ کہتا ہے کہ مجھے تو جان کا خطرہ ہو گیا تھا۔ اس جملہ سے مقصود صرف واقعہ کی اہمیت از تکلیف کی شدت کو بیان کرنا ہوتا ہے۔ بلا تمثیل ایسے ہی غارِ حرا میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوئی اور انوار و برکاتِ صمدیت منزجہ نمائش ہوئے اور اللہ عزوجل نے اپنی سب سے زیادہ ثقیل و شدید چیز کا بار دوشِ نبوی پر رکھا تو اس کی سرگزشت سنانے کے بعد حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جناب خدیجہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے فرمایا کہ وحی کی ثقالت اور کلامِ الٰہی کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب جان چلی۔ چنانچہ وحی کو خود قرآن نے قولِ ثقیل کہا ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ اگر وحی کسی پہاڑ پر اُتار دی جاتی تو وہ جلالِ الٰہی سے پاش پاش ہو جاتا مگر یہ تو ذاتِ نبوی ہی تھی جس نے بتوفیقِ الٰہی پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دینے والی چیز کی شدت کو برداشت کر لیا۔

الغرض لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ کے جملہ سے حضور علیہ السلام نے وحی کی اس تکلیف اور شدت کو بیان فرمایا ہے جو غارِ حرا میں آپ کو پہنچی اور جس کے اثرات گھر تشریف لانے اور چادر اوڑھا دینے تک رہے اور جب چادر اوڑھا دی گئی تو وہ اضطرابی کیفیت ختم ہو گئی۔ اور اس کے بعد حضور علیہ السلام نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کو غارِ حرا کا واقعہ سنایا چنانچہ ذھب عنہ الروع کا جملہ اس امر کی تصریح کر رہا ہے کہ خوف دُور ہو جانے کے بعد آپ نے قصہ سنایا۔ یہ نہیں کہ قصہ سنانے کے وقت بھی آپ اپنی جان کے خوف میں مبتلا تھے۔

۲۔ اور اگر لقد خشیت علی نفسی کا ترجمہ حال کا کیا جائے یعنی مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ تب بھی اس کا مطلب و معنی بالکل واضح ہے۔ یعنی اس جملہ سے حضور علیہ السلام کا مقصود بارِ نبوّت اور رسالت کی عظیم ذمہ داریوں کو

بیان کرنا ہے اور بالکل ابتدائی مرحلہ میں نبوت کی عظیم ذمہ داریوں کو نبھانے کے متعلق حضور کو عارضی فکر ہو جانا قدرتی تھا اس وقت کے حالات کو ذہن میں لائیے۔ آپ کو نبی بنایا گیا آپ تن تنہا ہیں اور پوری انسانی کائنات آپ کی مخاطب ہے اور سارے عالم میں جہالت ومعصیت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ رُشد وہدایت کی تمام مشعلیں گُل ہو چکی ہیں اور ایک جہان گیر تاریکی عالم پر مسلّط ہے۔ ساری دنیا نشۂ جہالت میں سرشار ہے غرضیکہ ایک پوری دنیا اور اس کی مسلح جہالتیں ہیں اور ایک طرف صرف ذاتِ نبوی ہے جس کے ذمہ اس تحریکِ الٰہی کی ذمہ داری عائد کی جا رہی ہے جس کا ضعیف سے ضعیف ذوق بھی مخاطبین میں نہیں ہے۔ ان کے جذبات، ان کی عقیدتیں اور ان کے صدیوں سے جمے ہوئے اعتقاد اس تحریک کے یکسر خلاف ہیں۔ پھر یہ تحریک بھی کسی ایک شہر ایک صوبے یا ملک کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام عالم کو دعوت دینی ہے۔

نبوت کی یہی عظیم ذمہ داریاں تھیں جن سے آپ فکر مند ہوئے اور اسی کا اظہار آپ نے لقد خشیت علی نفسی کے جملہ سے فرمایا کہ اب تک تو میں الصادق الامین کے لقب سے مشہور رہوں۔ پوری قوم میری دیانت وامانت خلوص وللّٰہیت، ورع، تقویٰ اور حسنِ سیرت وصورت کی معترف ہے اور مجھ سے بے پناہ محبت رکھتی ہے لیکن نزولِ وحی کے بعد اب مجھے فرائضِ نبوت ادا کرنے ہیں۔ دین کی تبلیغ واشاعت کرنی ہے اور باطل کی جہانگیر قوتوں سے ٹکرانا ہے اور پوری دنیا کی مسلح جہالتوں اور معصیتوں سے تن تنہا مقابلہ کرنا ہے۔ یہی وہ خطرات وحوادث ہیں جن کے پیشِ نظر حضور نے لقد خشیت علی نفسی فرمایا۔

یہ بالکل ایک سیدھی سی بات ہے جس میں کسی قسم کا اُلجھاؤ نہیں ہے۔ نبی کو نبوت کے بالکل ابتدائی مرحلہ میں فرائضِ نبوت کو نبھانے کا عارضی فکر ہو جانا شانِ نبوت کے خلاف نہیں ہے منکرینِ سنّت کا اس معصوم جملہ کو غلط رنگ دے کر یہ کہنا کہ بخاری سے تو یہ بھی ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام کو اپنی نبوت ہی میں شک تھا نہایت بے ایمانی کے ساتھ حدیث کے مذکورہ بالا جملہ کی تحریفِ معنوی کرنا ہے کیونکہ پوری حدیث میں کوئی لفظ تو درکنار اشارۃً تک نہیں ہے کہ معاذ اللہ آپ نبوت کے معاملہ میں ذرا بھی ریب وشک میں مبتلا تھے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو جب نبوت ملی تو حکم ہوا کہ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اِنَّہٗ طَغٰی بیشک اس نے سر اُٹھایا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی:

دونوں نے عرض کیا اے ہمارے رب! بیشک ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا شرارت سے پیش آئے۔	قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی (طٰہٰ)

دیکھئے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بھی خوف ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے خوف کی علّت یہ نہیں تھی کہ جناب کلیم علیہ السلام کو اپنی نبوت میں شک تھا بلکہ یہ خوف فرضِ نبوت کی ادائیگی کے سلسلہ میں تھا کہ مجھے فرعون جیسی عظیم طاقت کے مقابلہ کے لیے بھیجا جا رہا ہے تو میں تنہا فرائضِ نبوت سے کیونکر عہدہ برآ ہوں گا۔ یہی فکر تھا جس نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو

خوف میں مبتلا کر دیا اور انہیں عرض کرنا پڑا کہ الٰہی میں ڈرتا ہوں کہ کہیں فرعون زیادتی نہ کرے۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی کا نبوت کے بالکل ابتدائی مرحلہ میں فرائض نبوت کی ادائیگی اور رسالت کی ذمہ داریوں کے متعلق عارضی طور پر ذرا دیر کے لیے باقتضاء بشریت خوف و اضطراب میں مبتلا ہو جانا منافیٔ شانِ نبوت نہیں ہے۔

۳۔ اسی طرح لقد خشیت علی نفسی کا یہ مطلب لینا بھی باطل ہے کہ حضور علیہ السلام کو یہ خوف پیدا ہوا کہ فرشتے کو دیکھنے سے بوجہ رعب کے عاجز رہوں گا۔ اوّلاً اس لیے کہ اگر اس موقع پر جبریل امین ملکی شکل میں حاضر ہوتے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ ملکی شکل کے دیکھنے سے رعب طاری ہو گیا اور اس رعب کی وجہ سے یہ خوف ہوا کہ آئندہ ان کو دیکھنے سے عاجز رہیں گے لیکن حضرت جبریل کا اس موقع پر ملکی شکل میں حاضر ہونا ثابت نہیں اور حدیث زیر بحث میں تو خود اشارات موجود ہیں کہ وہ انسانی شکل میں حاضر ہوتے تھے۔ لہٰذا رویتِ ملک سے عاجز رہنے کے خوف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ثانیاً۔ اگر طاری شدہ رعب کا سبب حضرت جبریل امین کی ذات ہوتی تو یہ رعب شروع ملاقات ہی میں پیدا ہو جاتا مگر اس وقت پیدا نہیں ہوا بلکہ اس وقت تو حضور علیہ السلام کو اس قدر سکون تھا کہ حضرت جبریل امین کے بار بار اقرار عرض کرنے اور معانقہ کرنے کے باوجود آپ نہایت ہی سکون و وقار کے ساتھ ما انا بقاری فرماتے رہے اس سے واضح ہوا کہ رعب و اضطراب کا سبب حضرت جبریل کی رویت نہ تھی بلکہ کلام الٰہی کا نزول اور وحی کی شدت و ثقالت ہی تھی۔

فَقَالَتْ خَدِيجَةُ كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيكَ اللّٰهُ أَبَدًا إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتُكْسِبُ الْمَعْدُومَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِينُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ۔

حضرت خدیجہ کہنے لگیں۔ ہرگز نہیں بخدا اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی پریشان و شرمندہ نہیں کرے گا۔ آپ قرابتداروں کا خوب حق ادا کرتے ہیں۔ بے سہاروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ ضرورتمندوں کی ضرورت پوری کرتے ہیں مسافروں کی میزبانی کرتے ہیں اور لوگوں کو راہ حق میں پیش آنے والے حوادث پر مدد دیتے ہیں۔

حضور نے خشیت علی نفسی سے وحی کی شدت و ثقالت یا نبوت کی عظیم ذمہ داریوں کا اظہار فرمایا تھا مگر جناب خدیجہ جن کو حضور علیہ السلام سے والہانہ محبت تھی وہ اپنی جان میں حضور علیہ السلام کو تسلی دینے لگیں اور آپ کی اخلاقی خوبیوں کو گنانے لگیں کہ ایسی خوبیوں کے مالک ہستی کو جان کا کیا خطرہ ہو سکتا ہے اور آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔

حَتّٰى أَتَتْ بِهِ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ أَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعُزّٰى ابْنَ عَمِّ خَدِيجَةَ وَ

پھر حضرت خدیجہ آپ کو ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزیٰ اپنے چچا زاد بھائی کے پاس لے گئیں۔ ورقہ

كَانَ امْرَأً تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعِبْرَانِيَّ فَيَكْتُبُ مِنَ الْإِنْجِيلِ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَكْتُبَ وَكَانَ شَيْخًا كَبِيرًا قَدْ عَمِيَ فَقَالَتْ لَهُ خَدِيجَةُ يَا ابْنَ عَمِّ اسْمَعْ مِنِ ابْنِ أَخِيكَ فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ يَا ابْنَ أَخِي مَاذَا تَرَى فَأَخْبَرَهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَبَرَ مَا رَأَى فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ هٰذَا النَّامُوسُ الَّذِي نَزَّلَ اللهُ عَلَى مُوسَى يَا لَيْتَنِي فِيهَا جَذَعًا يَا لَيْتَنِي أَكُونُ حَيًّا إِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوَمُخْرِجِيَّ هُمْ قَالَ نَعَمْ لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهٖ إِلَّا عُودِيَ وَإِنْ يُدْرِكْنِي يَوْمُكَ أَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ أَنْ تُوُفِّيَ وَفَتَرَ الْوَحْيُ

بن نوفل زمانۂ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے اور وہ عبرانی زبان لکھنا جانتے تھے اور انجیل کو عبرانی میں لکھتے تھے جو اللہ چاہتا اور بہت بوڑھے تھے اور آنکھوں کی روشنی بھی جاتی رہی تھی۔ حضرت خدیجہ نے ورقہ سے فرمایا۔ اے ابن عم، اپنے بھتیجے کا ماجرا سنیئے! ورقہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اے میرے بھتیجے! ہاں بتاؤ تم کیا دیکھتے ہو؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا بیان فرما دیا۔ ورقہ نے کہا۔ یہی وہ ناموس (محرم اسرار) ہے جسے خدا نے موسیٰ پر اُتارا تھا۔ اے کاش میں آپ کے زمانۂ دعوت میں جوان ہوتا۔ کاش میں اس وقت تک زندہ ہی رہتا۔ جب کہ آپ کی قوم آپ کو مکہ سے ہجرت پر مجبور کر دے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟ ورقہ نے جواب دیا ہاں! جو کچھ آپ لے کر آئے ہیں اس کو لے کر کوئی آدمی نہیں آیا۔ جس سے لوگوں نے دشمنی نہ کی ہو۔ اگر اس زمانہ میں میں زندہ رہا تو آپ کی ہر طرح مدد کروں گا۔ اس واقعہ کے تھوڑے دنوں بعد ہی ورقہ نے وفات پائی اور اس کے بعد وحی رُکی رہی۔

سورہ اقرأ کی پانچ آیتوں کے نزول کے بعد جبریل کی آمد رُکی رہی۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ سلسلہ وحی کے رُک جانے کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں۔ حضور علیہ السلام غارِ حرا سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ فرشتہ نظر آیا جس کا قصہ آیندہ حدیث میں آ رہا ہے۔ اس کے بعد جبریل امین کی پے در پے آمد شروع ہو گئی اور حیاتِ مبارک کے آخری لمحات تک جاری رہی بلکہ آخر عمر شریف میں وحی کی کثرت ہو گئی تھی (بخاری)

اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہا

اس حدیث میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کا نام خصوصیت رکھتا ہے کیونکہ آپ حضور علیہ السلام کی اوّل محرم راز ہیں اور ابتدائے وحی کے موقع پر آپ ہی حضور علیہ السلام کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئی تھیں۔ آپ کا نام خدیجہ اور لقب طاہرہ ہے۔ آپ حضور علیہ السلام کی پہلی مقدس بی بی ہیں۔ آپ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت زائدہ ہے والد کا نام عامر بن لوی ہے۔ حضرت خدیجہ کی پہلی شادی ابوہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی اور دو لڑکے ہند اور حارث پیدا

ہوئے۔ ابو ہالہ کے انتقال کے بعد آپ عتیق بن عائذ مخزومی کے عقد میں آئیں۔ ان سے ایک لڑکی بنام ہند پیدا ہوئی اسی لیے آپ ام ہند کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ عتیق کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہ سید المرسلین علیہ السلام کے عقد میں آئیں۔ اس وقت حضور علیہ السلام کی عمر شریف ۲۵ برس اور حضرت خدیجہ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ حضرت خدیجہ نکاح کے بعد ۲۵ برس تک زندہ رہیں۔ ان کی زندگی میں حضور علیہ السلام نے دوسری شادی نہیں فرمائی۔ حضور علیہ السلام سے چھ اولادیں ہوئیں۔ دو صاحبزادے جو کہ بچپن ہی میں انتقال کر گئے اور چار صاحبزادیاں حضرت فاطمہ، زینب، رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ تعالٰی۔

حضرت ام المومنین خدیجہ رضی اللہ تعالٰی عنہا سے حضور علیہ السلام کو بے انتہا محبت تھی۔ ان کی وفات کے بعد آپ کا معمول تھا۔ جب کبھی گھر میں کوئی جانور ذبح ہوتا تو آپ حضرت خدیجہ کی ملنے والی عورتوں کے پاس گوشت ضرور بھجواتے۔ خود حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ مجھے حضرت خدیجہ پر بہت رشک آتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور علیہ السلام ہمیشہ ان کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اس پر آپ کو کچھ کہا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ خدا نے مجھے خدیجہ کی محبت دی ہے (مسلم شریف، فضل خدیجہ) ایک مرتبہ حضرت عائشہ نے فرمایا۔ آپ ایک بڑھیا کی یاد کرتے ہیں جو مر چکی ہیں۔ استیعاب میں ہے۔ کہ اس کے جواب میں حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ ہرگز نہیں۔ لیکن جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو خدیجہ نے میری تصدیق کی۔ جب لوگ کافر تھے وہ اسلام لائیں۔ جب میرا کوئی معین نہ تھا انھوں نے میری مدد کی۔

ورقہ بن نوفل یہ حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی تھے جو زمانۂ جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے اور کتب سماویہ کے عالم اور نیک آدمی تھے۔ اگرچہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اظہارِ نبوت سے قبل ہی وفات پا گئے۔ مگر نزولِ وحی کا واقعہ سن کر انھوں نے حضور علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کی تھی۔ چنانچہ مستدرک کی حدیث کے یہ الفاظ ہیں کہ ورقہ بن نوفل نے نزولِ وحی کا واقعہ سن کر عرض کی۔

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنَّکَ نَبِیٌّ (مستدرک)	مجھے اس کی قسم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے آپ تو نبی ہیں۔

نیز ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضرت خدیجہ نے پوچھا کہ حضور ورقہ نے آپ کی تصدیق تو کر لی تھی۔ مگر آپ کے اظہارِ نبوت سے قبل ہی وہ وفات پا گئے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ میں نے خواب میں ان کو سفید لباس میں دیکھا ہے۔ اگر وہ دوزخی ہوتے تو ان کا لباس سفید نہ ہوتا۔ ان احادیث کی روشنی میں شراح حدیث نے ورقہ بن نوفل کو مسلمان قرار دیا ہے۔ بہر حال اتنا تو ظاہر ہے کہ ورقہ عیسائی تھے۔ کتبِ سماویہ کے عالم تھے، نیک تھے اور حضور علیہ السلام کی نبوت کی انھوں نے تصدیق کی تھی۔ حضور علیہ السلام کی کیفیت سن کر عرض کی تھی کہ یہ تو وہی ناموسِ اکبر ہے جو موسیٰ کے پاس آیا تھا۔

عبرانی زبان کی اصل اس حدیث میں آیا ہے کہ ورقہ عبرانی زبان جانتے تھے اور انجیل کو عبرانی زبان میں لکھتے تھے۔

بعض روایات میں یہ ہے کہ عربی میں لکھتے تھے۔ عبرانی عبر کی طرف منسوب ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سریانی تھی۔ جب نمرود سے جدا ہو کر آپ نے نہر فرات کو عبور کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبان عبرانی کردی کیونکہ نمرود نے اپنی پولیس سے کہدیا تھا کہ جو شخص تمہیں سریانی بولتا ہوا ملے اس کو گرفتار کرو تو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہر فرات کو عبور کیا تو اس کے بعد اس زبان کا نام عبرانی ہوگیا۔ تیمی نے کہا ہے کہ تمام صحف سماویہ انجیل و توریت عبرانی زبان میں تھیں۔

علامہ عینی کہتے ہیں۔ انجیل اور توریت عبرانی زبان میں تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی وہ اولاد جو نبی ہوئی ان سب کی زبان سریانی تھی۔ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام نہر فرات کو عبور کرنے کے بعد عبرانی بولتے تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام عربی بولتے تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام تمام لغات کے عالم تھے۔ حضرت صالح و شعیب علیہما السلام کی زبان بھی عربی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اصلی زبان عربی تھی۔ پھر سریانی ہوگئی مگر قبولِ توبہ کے بعد پھر عربی بولنے لگے۔

سفیان کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی وحی نازل فرمائی وہ عربی میں تھی اور انبیاء کرام اپنی قوموں کی زبان میں اس وحی کی ترجمانی کرتے تھے۔ سریانی زبان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ سِرّ سے مشتق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے پوشیدہ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ زبان سکھائی تھی۔ اس لیے اسے سریانی کہنے لگے۔

لفظِ ناموس کی تحقیق | لفظِ ناموس، جاسوس کے وزن پر ہے۔ دونوں کے معنیٰ رازدار کے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں۔ نامسته ای ساررته اس نے راز کو چھپایا۔

ناموس اور جاسوس میں فرق یہ ہے کہ ناموس خیر و برکت کا رازدار ہوتا ہے اور جاسوس برائی کا جبرئیل امین کو ناموسِ اکبر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ انبیاء کرام کے رازدار ہوتے تھے۔

لفظِ مَلَک کی تحقیق | حدیث ہذا میں لفظ مَلَک ہے۔ لفظ ملائکہ کا واحد ملاک ہے جو بقاعدہ صرف مَلَک ہوگیا۔ یہ الوکنۃ سے مشتق ہے۔ جس کے معنیٰ پیغام کے ہیں۔ ملائکہ الہیٰ خالق و مخلوق کے درمیان قاصد ہوتے ہیں۔ قرآنِ پاک نے ان کو رسل اور رسل اللہ قاصدانِ الہی فرمایا ہے۔

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا | اللہ فرشتوں میں سے اپنے پیغامبر منتخب فرماتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کارخانہ الٰہیہ کو چلاتے ہیں۔ اسی لیے ان کو مدبراتِ امر کہا گیا ہے۔ سورہ والنازعات میں ملائکہ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سراپا مطیع ہیں اور اس کے حکم کے تابع و فرمان ہیں اور حکم الٰہی سے کبھی روگردانی نہیں کرتے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرتیں، ان کی آمد سے معمور ہیں اور کتبِ سماویہ کے نام کے ساتھ ان کا نام ضرور آتا ہے۔ ملائکہ کے سرخیل اور شہنشاہ حضرت جبرئیل ہیں۔ جو وحی رسالت کے لانے پر مامور ہیں اور دیگر امور کو سرانجام دینا ان کے فرائض ہیں۔

لفظِ جبرئیل | عبرانی لفظ ہے جس کے معنیٰ مردِ خدا کے ہیں لیکن اصطلاحِ شرع میں جبرئیل اس مَلَکِ مقرب کا نام ہے

جو خدا اور خاصانِ خدا کے درمیان پیامبری کی خدمت انجام دیتا ہے اور جو رسل ملائکہ سے ہے۔ کتبِ عقائد میں لکھا ہے

رسل الملائكة هم المبلغون لاحكام الوحى الى الانبياء من البشر وافضلهم جبرئيل عليه السلام كما اخرجه الطبرانى مرفوعاً

اور مرسل ملائکہ وہ ہیں جو احکام وحی انبیاء بشری کو پہنچاتے ہیں اور ان میں جبریل امین سب سے افضل ہیں جیسا کہ طبرانی کی مرفوع حدیث میں آیا۔

(نبراس)

علامہ قاضی عیاض علیہ الرحمۃ نے لکھا:۔

اتفق ائمة المسلمين ان حكم المرسلين منهم اى من الملئكة حكم النبيين سواء فى العصمة وتعظيم الحرمة مما ذكرنا عصمتهم منه وانهم فى حقوق الانبياء والتبليغ اليهم كالانبياء مع الامم

تمام ائمہ مسلمین کا اتفاق ہے کہ جو انبیاء کرام کا حکم ہے وہی مرسلین ملائکہ کا حکم ہے اور وہ عصمت و تعظیم حرمت میں برابر ہیں اور بے شک مرسلین ملائکہ کو حقوقِ انبیاءؑ حاصل ہیں اور جیسے انبیاء کرام امتوں کو احکام پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح مرسلین ملائکہ حضرات انبیاء کو احکامِ الٰہیہ پہنچاتے ہیں۔

(شفاء مع نسیم الریاض و شرح علی قاری ج ۲ ص ۱۵۴)

قرآنِ حکیم میں جبریل علیہ السلام کو الروح الامین (امانت دار روح) بھی کہا گیا ہے اور روح القدس بھی اور قرآنِ پاک میں جبریل کا نام تین مقام پر آیا ہے۔ آغازِ وحی کی اس حدیث میں جو ملک کا لفظ آیا ہے اور جس کو ورقہ نے ناموس کے لفظ سے موسوم کیا ہے وہ یہی جبریل ہیں۔

۱- فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ
۲- نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ

۱- جبریل نے آپ کے دل پر قرآن نازل کیا۔
۲- تم فرماؤ اس کو روح القدس نے تیرے رب کی طرف سے سچائی کے ساتھ اتارا ہے۔

علامہ عینی نے لکھا ہے کہ جبریل وہ فرشتہ ہیں جن کے سپرد وحی لانے کی خدمت ہے۔ حضرت جبریل ہی عذاب زلزلے، ہدم و غرق وغیرہ امور انجام دیتے ہیں۔ جبر سریانی زبان میں عبد کو کہتے ہیں اور ایل اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ حضرت جبریل کا نام عبداللہ ہے اور میکائیل کا نام عبیداللہ ہے۔

حضرت جبرئیل کا اصلی نام

۱- بعض علماء نے فرمایا کہ حضرت جبریل علیہ السلام کا اصلی نام عبدالجلیل ہے اور ان کی کنیت ابوالفتوح ہے۔
۲- میکائیل کا نام عبدالرزاق اور کنیت ابوالغنائم ہے۔
۳- اسرافیل کا نام عبدالخالق اور کنیت ابوالمنافع ہے۔
۴- عزرائیل کا نام عبدالجبار اور کنیت ابویحییٰ ہے علیہم السلام (عینی جلد ۱ ص ۵۸)

لفظِ جبریل نو لغتوں کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ جن میں سے بعض یہ ہیں:۔ جبراعیل، جبرائیل، جبرین، جبرال، جبرئیل وغیرہ وغیرہ۔

بارگاہِ نبوی میں جبریل امین کی حاضری کے لیے وقت مقرر نہ تھا، صبح و شام، روز و شب، صلح و جنگ، جبریل کی حاضری ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جبریل کو ان کی اصلی شکل میں دو دفعہ ملاحظہ فرمایا۔ جبریل امین انسانی شکل میں حاضری دیتے تھے اور حضرت دحیہ کلبی جو ایک حسین صحابی تھے ان کی شکل میں اکثر آیا کرتے تھے

فترۃ الوحی

قَالَ ابْنُ شِهَابٍ وَّ اَخْبَرَنِیْ اَبُوْ سَلَمَةَ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ الْاَنْصَارِیَّ قَالَ وَهُوَ یُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَةِ الْوَحْیِ فَقَالَ فِیْ حَدِیْثِهٖ بَیْنَا اَنَا اَمْشِیْ اِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِّنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِیْ فَاِذَا الْمَلَكُ الَّذِیْ جَاءَنِیْ بِحِرَاءٍ جَالِسٌ عَلٰی كُرْسِیٍّ بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ فَرُعِبْتُ مِنْهُ فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ فَحَمِیَ الْوَحْیُ

ابن شہاب نے کہا کہ مجھے خبر دی ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن نے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری فترۃ وحی کے متعلق حدیث بیان کرتے تھے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں (غارِ حرا) سے آ رہا تھا کہ آسمان سے ایک آواز میں نے سنی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں آیا تھا آسمان اور زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ تو مجھے اس سے خوف آیا۔ میں گھر واپس ہوا اور میں نے کہا مجھے چادر اڑھاو مجھے چادر اڑھا دو پھر اللہ تعالےٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ یاایہا المدثر قم فانذر الخ

فوائد و مسائل

۱۔ سورۂ اقراء کی پانچ آیتوں کے نزول کے بعد وحی آنا بند ہو گئی تھی جس کی مدت تین سال بتائی جاتی ہے۔ اس کے بعد جبرائیل امین حاضر ہوئے تو سب سے پہلے سورۂ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں جن کا ذکر حدیث زیرِ بحث میں ہے۔ اس کے بعد وحی آنا شروع ہو گئی اور ۲۳ سال تک قرآنِ حکیم کا نزول ہوتا رہا۔

۲۔ فترہ کے معنی سستی، کمزوری اور رک رک کے آنے کے ہیں۔ باری کے بخار میں وہ دن جن میں بخار نہیں آتا اسی طرح وہ زمانہ جو دو وحیوں کے درمیان ہوتا ہے اس کو بھی فترہ کہتے ہیں۔ حضور سیّدِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم پر جب عارضی طور پر وحی آنا بند ہو گئی تو آپ بہت ملول رہتے تھے تا آنکہ رحمتِ الٰہی پھر متوجہ ہو گئی اور وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ فترۂ وحی کیوں ہوا اس کی اصل حکمت تو اللہ ہی جانتا ہے۔ البتہ بعض شارحین نے یہ حکمت بیان کی ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے وحی آنا اس لیے بند ہوئی کہ پہلی بار جو آپ پر وحی کی شدت اور ثقالت کے اثرات مرتب ہوئے تھے وہ دور ہو جائیں اور آپ کا شوق اور بڑھ جائے۔

۳۔ حدیث زیرِ بحث میں وحی کے رُکنے کے بعد پھر وحی کی ابتداء کا ذکر ہے یعنی اس امر کا بیان ہے کہ وحی کے رُک

جانے کے بعد سب سے پہلے سورہ یا ایہا المدثر کی مذکورہ بالا آیات کے نزول سے وحی کی ابتدار اس کیفیت کے ساتھ ہوئی کہ موحی الیہ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھے ہوئے تھے اور یہی ترجمۃ الباب تھا کہ وحی کی ابتدار کی کیفیت کیا تھی؛ یعنی ترجمۃ الباب میں جو ابتدار کا لفظ ہے وہ ابتداءً قبل اختباس اور ابتدائً بعد اختباس دونوں کو شامل ہے۔ اور حدیث زیر بحث میں ابتدار وحی بعد اختباس کی کیفیت کا ذکر ہے۔ لہٰذا حدیث زیر بحث اور ترجمۃ الباب میں مناسبت ظاہر ہے۔

تفسیر آیات سورہ مدثر

یا ایہا المدثر۔ متدثر بمعنیٰ دثار۔ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو گرمی حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے جیسے چادر، رضائی، کمبل وغیرہ اور شعار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو بدن سے ملا ہوا ہو جیسے تہبند، بنیان، پاجامہ وغیرہ۔ نزولِ وحی کے وقت چونکہ حضور علیہ السلام چادر اوڑھے ہوئے تھے اس لیے اسی لباس کے ساتھ حضور کو مخاطب کیا گیا جس سے واضح ہوا کہ اللہ عز وجل کو اپنے محبوب رسول کی ہر ادا محبوب ہے۔ حتیٰ کہ استعمالِ لباس کی ہیئت کذائی بھی اس درجہ پسند ہے کہ اس کے ساتھ ندا فرمائی گئی۔ اس میں امت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ انبیار کرام کو ان کا نام لے کر ندا نہ کی جائے بلکہ ادب و احترام تعظیم و توقیر کے ساتھ معزز و پُر عظمت اوصاف و القابات سے یاد کیا جائے۔ پھر اس خصوص میں حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی تو یہ خصوصیت ہے کہ دیگر انبیار کرام کو تو رب العزت جل مجدہ نے نام بنام خطاب کیا ہے۔ یا آدم، یا ابراھیم، یا موسیٰ، یا داؤد، یا عیسیٰ کی ندائیں قرآن میں موجود ہیں لیکن جب اپنے حبیبِ مکرم کو ندا فرمائی تو ان کی کمالِ عظمت و رفعت کے اظہار کے لیے ان کے نامِ پاک کے ساتھ ندا نہیں کی گئی بلکہ ان کے معزز اوصاف و القابات کے ساتھ یا ایہا النبی، یا ایہا الرسول، طٰہٰ، یٰسین کے الفاظ سے خطاب فرمایا گیا ہے ؎

یا آدم است با پدر انبیار خطاب — یا ایہا النبی خطاب محمد است

قرآن نے آدابِ بارگاہ نبوت کے سلسلہ میں فرمایا:

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا — رسول کو اس طرح مت پکارو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو

حضور کا نام لے کر ندا کرنا ممنوع ہے

علامہ صادی علیہ الرحمۃ نے تحتِ آیت فرمایا کہ آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ حضور کو ان کا نام لے کر یا محمد یا ابوالقاسم کہہ کر ندا نہ کرنا چاہیے بلکہ تعظیم و توقیر کے ساتھ یا رسول اللہ، یا نبی اللہ، یا امام المسلمین، یا رسول رب العالمین، یا خاتم النبیین الفاظ کے ساتھ ندا کیا کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کو ایسے الفاظ

واستفید من الایۃ انہ لا یجوز نداء النبی بغیر ما یفید التعظیم لا فی حیاتہ ولا بعد وفاتہ — کے ساتھ ندا جائز نہیں۔ جس سے تعظیم مفہوم نہ ہوتی ہو۔ نہ دنیوی حیات میں اور نہ وصال کے بعد

لہٰذا تحریر و تقریر میں جب بھی نامِ اقدس لیا جائے تو تعظیم و توقیر کے ساتھ لیا جائے اور درود و سلام لکھا جائے اور محض نامِ اقدس اور وہ بھی ایک عام انداز میں اور بغیر درود و سلام کے لکھنا اور بولنا انتہائی درجہ کی شقاوت و بدنصیبی ہے۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو آدابِ نبوی کے پاس و لحاظ کی توفیق عطا فرمائے۔

۲۔ بعض علماء نے یہ معنیٰ کیے۔

المتدثر بلباس النبوۃ والمعارف الانسیه (تفسیر ابوالسعود)	اے ہماری معرفت اور نبوت کی پوشاک زیبِ تن فرمانے والے۔

۳۔ تدثیر کے معنیٰ "طائر کا اپنے گھونسلے کو درست کر لینا" کے بھی آتے ہیں تو اب یاایھا المدثر کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اے کاشانۂ عالم کو درست و محکم بنانے والے رسول، کاشانۂ عالم حضور کے علوِ مراتب کے مقابلہ میں ایک آشیانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضور کا اس آشیانہ کو درست و محکم بنا دینا، اہلِ عالم کی ضروریات مادی و اخلاقی و روحانی کو مکمل فرما دینا ہے۔ یہ تکمیل انذار اور تکبیر و تہلیلِ ربانی اور تطہیرِ خلائق از علائق مادی و قلبی کی تدابیر سے فرمائی گئی۔ رجز و رجس کو دُور فرما کر طہارتِ ظاہری و باطنی سے اہلِ عالم کو حضور ہی نے مطہر بنایا ہے۔

۴۔ تدثر کے معنیٰ "کود کر گھوڑے پر سوار ہونے" کے بھی آتے ہیں جیسے بولتے ہیں تدثر فرسہ ای وثب علیہ فرکبہ تو اب یا ایھا المدثر کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ نہایت ہی جوانمردی، تیزی اور احتیاط کے ساتھ منصبِ نبوت کو ادا کرنے والے رسول۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ حضور علیہ السلام نے نہایت ہی حزم و احتیاط کے ساتھ اور انتہائی جوانمردی، صداقت و امانت کے ساتھ فرائضِ نبوت کو ادا فرمایا اور قرآن نے حضور علیہ السلام کی اس کوشش کے نتیجہ کا یوں اعلان فرمایا۔ رایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ فقہاء نے اس آیت کو تکبیرِ تحریمہ کی فرضیت کے ثبوت میں پیش کیا ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ لفظ تکبیر کبھی بمعنی تعظیم آتا ہے اور آیت مذکورہ میں فکبّر کا صیغہ تکبیر بمعنی تعظیم سے ماخوذ ہے اور مامور بہ مطلقاً تعظیم نہیں بلکہ وہ تعظیم ہے جو تکبیر تحریمہ کے ضمن میں حاصل ہوتی ہے اس سے تکبیرِ تحریمہ مراد ہونے پر اہلِ تفسیر متفق ہیں۔ اور اس مراد پر اجماع[1] بھی منعقد ہو چکا ہے اور تکبیر تحریمہ صرف اللہ اکبر کو نہیں کہتے بلکہ اس سے مراد ذکرِ الٰہی ہے۔ جس کے بعد بلافصل[2] نماز شروع ہو جاتی ہے تو اللہ اکبر اس کا ایک فرد ہوا تو آیت سے بطریقِ مذکور تکبیر تحریمہ بمعنی ذکر مذکور کی فرضیت ثابت ہوئی نہ لفظ اکبر۔ البتہ تکبیر تحریمہ کا اس فرد مخصوص (اللہ اکبر) کے ساتھ ادا کرنا واجب ہے۔ سیدنا امام اعظم علیہ الرحمہ کا یہی مذہب ہے اور یہ وجوب حدیث سے مستفاد ہے لہٰذا اگر تکبیر تحریمہ میں اللہ اکبر نہ کہا اور اس کی جگہ اللہ الکبیر وغیرہ الفاظ کہے جو تعظیمِ خداوندی پر دلالت کرتے ہیں تو فرضیت ادا ہو گئی، کیونکہ مامور بہ تکبیر بمعنی تعظیم

---

[1] مراقی الفلاح اور اس کے حاشیہ طحاوی ص۱۱ پر ہے اجمع المسلمون علی ان المراد بہ تکبیرۃ الافتتاح وعلیہ انعقد الاجماع [2] والذکر الذی تتعقبہ الصلوٰۃ بلافصل ھو تکبیرۃ الافتتاح بدائع ج ۱ ص ۱۳۰

ہی تھی جو ان الفاظ سے حاصل ہو جاتی ہے البتہ وجوب سے بری الذمہ نہ ہوگا۔

تکبیر تحریمہ نماز میں فرض ہے اور کبھی لفظِ تکبیر، اللہ اکبر کے معنیٰ میں بھی آتا ہے تو اللہ اکبر کہنا مامور بہ ہوا اور امر وجوب کے لیے ہے لہٰذا اللہ اکبر کہنا واجب قرار پایا اور چونکہ یہ امر فکبر کتاب کا جزء ہونے کی وجہ سے قطعی ہے اور امر قطعی کے مامور بہ کو اصطلاح میں فرض کہتے ہیں اس لیے اللہ اکبر کہنا فرض ہوا اور اللہ اکبر کہنے کی فرضیت اجماعاً بجز تحریمہ اور کہیں نہیں ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ حکم تحریمہ کے لیے ہے ورنہ نص معطل ہو جائے گی۔ بس بوقتِ تحریمہ خاص لفظ اللہ اکبر کہنا فرض ثابت ہوا ____ لیکن اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ امر "فکبر" کے مامور بہ سے مراد تکبیرِ تحریمہ ہے تو اللہ اکبر کہنے کی طلب سے مراد تکبیرِ تحریمہ بجا لانا ہوا جو اللہ اکبر کہنے سے عام ہے لہٰذا اس تقریر سے بھی تکبیرِ تحریمہ کی فرضیت ثابت ہوئی۔

فائدہ یہ نہ کہا جائے کہ اس آیت کے نزول کے وقت نماز فرض ہی نہ تھی۔ پھر تکبیرِ تحریمہ کی فرضیت کیسی؟ کیونکہ ممکن ہے کہ اس وقت حضور نفل ادا فرماتے ہوں تو اس میں تکبیرِ تحریمہ کا حکم آ گیا (تفسیر کبیر) ____ نیز یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ بعض آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول متاخر ہے اور ان کے حکم کا نفاذ مقدم تھا جیسے آیتِ وضو کہ یہ بالاجماع مدنی ہے اور اس کا حکم پہلے ہی[1] مکہ میں نماز کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اسی طرح آیتِ جمعہ کہ مدنی ہے حالانکہ نمازِ جمعہ کے حکم کا نفاذ ہجرت سے قبل ہو چکا تھا اور بعض آیات ایسی ہیں جن کا نزول مقدم اور حکم کا نفاذ مؤخر[2] ہے جیسے سورۂ مزمل میں وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ کہ یہ آیت مکی ہے اور اس کے حکم پر عملدرآمد مدینہ منورہ میں ہوا (اتقان) اس لیے ممکن ہے کہ آیت وربک فکبر کا نزول مقدم ہو اور حکم پر عملدرآمد مؤخر ہو۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ "ثیاب" ثوب کی جمع ہے اور "طھّر" تطہیر سے مشتق ہے۔ ان دونوں لفظوں میں چار احتمال ہیں۔ اوّل: یہ کہ ثوب اور تطہیر کے حقیقی معنیٰ مراد ہوں تو آب معنیٰ یہ ہوں گے کہ کپڑوں کو نجاست سے پاک رکھیے۔ اندرونِ نماز یا بیرونِ نماز؟ آیت میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن آیت وربک فکبر میں جب اجماعاً تکبیرِ تحریمہ مراد ہے اور یہ پہلی آیت کے بعد بلافصل واقع ہے تو بقرینہ سباق آیت ثیابک فطھر کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ بحالتِ نماز کپڑے پاک رکھے جائیں۔ چنانچہ کپڑوں کا پاک رکھنا اندرونِ نماز فرض ہے۔ بیرونِ نماز مستحب ہے فرض نہیں ____ اور بر تقدیر بیرونِ نماز مراد یہ

---

[1] واضح رہے کہ مکہ میں نماز کے ساتھ وضو کا حکم اس وقت قرآن میں کسی آیت میں نازل نہیں ہوا بلکہ بعد میں مدینہ شریف میں وضو کا حکم آیا۔ اس سے واضح ہوا کہ مکہ میں ہجرت سے قبل وضو کا حکم اس وحی کے ذریعے نازل ہوا تھا جو حضور پر قرآن کے علاوہ نازل ہوتی تھی۔ [2] اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ قرآنی احکام کے نفاذ کے متعلق بھی اللہ تعالٰے قرآن کے علاوہ حضور پر وحی فرماتا تھا۔ اور حضور اسی وحی کے مطابق جو قرآن کے علاوہ ہوتی تھی قرآنی احکام کو نافذ و جاری فرماتے تھے اور یہ بات حضور کی ذاتِ مقدس کے ساتھ خاص تھی۔ حضور کے وصال کے بعد قرآن کا کوئی مؤخر و مقدم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حضور کے بعد کسی پر وحی کا آنا اور کسی کو نبوت کا ملنا ممکن ہی نہیں ہے۔ فافہم

ہوگی کہ مشرکین اپنے کپڑوں کو نجاست سے پاک نہیں رکھتے۔ آپ ان کی عادت اختیار نہ کریں۔ تو یہ حکم بیرونِ نماز کے لیے ہوا کیونکہ اس وقت تک نماز فرض نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا یہ امر استحباب کے لیے ہوا۔ یعنی بیرونِ نماز کپڑوں کو نجاست سے پاک رکھنا مستحب ہے۔

دوم۔ یہ کہ ثوب کے حقیقی معنیٰ اور تطہیر کے مجازی معنیٰ مراد ہوں تو اس صورت میں اگر تطہیر بمعنیٰ تقصیر[1] لی جائے تو اب معنیٰ یہ ہوں گے کہ کپڑوں میں تقصیر کی جائے یعنی اہلِ عرب کی طرح اتنے لمبے نہ ہوں کہ زمین سے لگیں کیونکہ یہ متکبرین کا طریقہ ہے ——— اور اگر تطہیر بمعنیٰ ازالہ[2] نجاستِ معنوی ہو تو اب معنیٰ یہ ہوں گے کہ کپڑوں کو نجاستِ معنوی سے پاک رکھیے یعنی حلال طریقہ پر حاصل کیے گئے ہوں مغصوب نہ ہوں۔

سوم۔ یہ کہ ثوب کے معنیٰ مجازی اور تطہیر کے حقیقی معنیٰ مراد ہوں۔ اس احتمال پر ثیاب بمعنیٰ جسد[3] ہوگا تو اب معنیٰ یہ ہوں گے۔ مشرکین بوقتِ استنجا نظافت کا خیال نہیں کرتے ان کی اس عادت سے اجتناب چاہیئے۔

چہارم۔ یہ کہ ثوب اور تطہیر دونوں میں مجازی معنیٰ مراد ہوں۔ اس احتمال پر اگر لفظِ ثیاب بمعنیٰ نفس ہوگا تو معنیٰ یہ ہوں گے کہ اپنے نفس کو اخلاقِ ذمیمہ سے پاک رکھیے ۲۔ ثوب بمعنیٰ دین بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے خواب میں لوگوں کو کپڑے پہنے ہوئے دیکھا (بخاری) پھر آپ نے اس کی تعبیر دین سے فرمائی ۳۔ ثوب بمعنیٰ عمل و اخلاق اور بمعنیٰ عورت (بیوی) اور بمعنیٰ خلق و نیت بھی استعمال ہوتا ہے تو اب معنیٰ یہ ہوں گے۔

"اپنے اخلاق اچھے رکھیے۔ اپنے عمل کو درست رکھیے۔ اپنے دین کو پاک رکھیے۔ اپنی بیویوں کو بذریعہ وعظ و نصیحت و تادیب پاک رکھیے۔ اپنے قلب اور اپنی نیت کو پاک رکھیے۔"

۴۔ امام بیضاوی نے فرمایا کہ معنیٰ یہ ہیں۔ فطھر دثار النبوۃ یعنی پوشاکِ نبوت کو ایسی چیزوں سے پاک رکھیے جو اس کے مناسب نہیں۔ جیسے کینہ، بغض و حسد وغیرہ۔

واضح ہو ان سب احتمالوں میں اول بہرحال راجح ترین ہے۔ کیونکہ اس صورت میں لفظ ثیاب اور لفظ تطہیر اور امر تینوں اپنے حقیقی معنیٰ پر رہتے ہیں۔ اس کے برعکس باقی احتمالوں میں بلاضرورت حقیقت سے عدول لازم آتا ہے۔ اسی لیے فقہائے احناف نے آیت مذکورہ میں حقیقی معنیٰ اختیار کیے ہیں اور

---

[1] واضح ہو کہ تطہیر کا بمعنیٰ تقصیر مجاز ہونا ظاہر ہے [2] اور تطہیر بمعنیٰ ازالہ نجاستِ معنوی میں دو قول ہیں اول یہ کہ نجاستِ حسی (جیسے پاخانہ پیشاب وغیرہ) اور نجاستِ معنوی جیسے زنا، چوری، شراب خوری، گناہ وغیرہ میں تطہیر حقیقت ہے۔ دوم یہ کہ تطہیر نجاستِ حسی کے ازالہ میں حقیقت اور نجاستِ معنوی کے ازالہ میں مجاز ہے۔ احتمالِ دوم کی دوسری صورت اسی قول پر مبنی ہے (فافہم)

[3] اہلِ عرب لفظ ثیاب کو بمعنیٰ جسد استعمال کرتے ہیں۔ عرب کا مشہور شاعر عنترہ کہتا ہے۔ فشککت بالرمح الاصم ثیابہ ای طعنت جسدہ بالرمح الاصم اہلِ عرب ایسے شخص کو جو برے اخلاق سے متصف ہو طاھر الثیاب کہتے ہیں نیز

باقی اگلے صفحہ پر

بحالتِ نماز طہارتِ ثوب کی فرضیت کا اثبات اسی آیت سے فرمایا ہے۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ رجز کے چند معنیٰ ہیں۔ اصنام، عبادتِ اصنام، معصیت، شرک، پلیدی، عذاب، شیطان ——— یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء کرام اخلاقِ عالیہ وصفاتِ حسنہ سے خلقتاً موصوف ہوتے ہیں اور اخلاقِ رذیلہ وذمیمہ، عہد شکنی، تکبر و ریا وغیرہ سے پاک صاف ہوتے ہیں۔ اسی طرح رجز کے پانچوں معنیٰ سے بھی انبیاء کرام کا پاک وصاف ہونا بدیہی امر ہے۔ اور مذکورہ بالا احتمالوں کی بناء پر و ثیابك فطھر کا ترجمہ ہوگا کہ اپنے اخلاق اچھے رکھئے۔ عمل کو درست رکھیئے۔ دین کو پاک رکھیئے؟ تو کیا اس حکم کے نزول سے قبل آپ کے اخلاق اچھے نہ تھے؟ یا عمل درست نہ تھا؟ اسی طرح رجز کے معنیٰ اگر عبادتِ اصنام کے لیے جائیں تو ترجمہ ہوگا "بتوں کی عبادت ترک کردیجیے"۔ معصیت کے لیے جائیں تو ترجمہ ہوگا۔ "معصیت ترک کردیجیے"۔ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ معاذ اللہ جس وقت حضور علیہ السلام کو ترک کا حکم دیا گیا ہے۔ اس وقت آپ عبادتِ اصنام کرتے تھے یا معصیت کے ساتھ متصف تھے۔ غرضکہ رجز کے جو بھی معنیٰ لیے جائیں اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ بروقت حکم آپ اس معنیٰ کے ساتھ متصف ہوں؟ حالانکہ یہ محال ہے۔ جواب یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں تمام معانی مراد ہو سکتے ہیں اور کوئی محذور لازم نہیں آتا۔ اس لیے دونوں جگہ فطھر و فاھجر کا امر مداومت کے لیے ہے۔ لہٰذا و ثیابك فطھر کے معنیٰ یہ قرار پائیں گے کہ اخلاقِ حسنہ کے ساتھ تو آپ پہلے ہی سے متصف ہیں لیکن اخلاقِ حسنہ کے اختیار کرنے پر مداومت فرمائیے۔ اسی طرح والرجز فاھجر کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اصنام کی عبادت اور معصیت کا ارتکاب تو آپ سے ممکن ہی نہیں ہے لیکن عبادتِ اصنام وغیرہ کے ترک پر ہمیشگی (مداومت) کیجیے۔ یعنی جیسے اب تک آپ ان سے علیحدہ رہے ہیں آئندہ بھی علیحدہ رہیں اور اس کی مثالیں قرآن میں اور بھی ہیں مثلاً یاایھا النبی اتق اللہ اے اللہ کے نبی اللہ سے ڈریئے۔ ولا تطع الکافرین کافروں کی اطاعت نہ کیجیے یا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمانا۔ لا تتبع سبیل المفسدین مفسدوں کا راستہ اختیار نہ کیجیے تو ان سب آیتوں میں امر مداومت کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سے تو آپ ڈرتے ہیں۔ آئندہ بھی ڈرتے

خبیث العمل آدمی کو خبیث الثیاب کہا جاتا ہے [۱] چنانچہ ابراہیم حلبی نے غنیہ میں فرمایا۔ علی ان المراد به حقیقة التطهیر وبیرادا ایضاً حال ارادة الصلوٰة لیکون الامر علی حقیقة ایضاً وما قیل ان المراد فقصر خفیه عدول عن الحقیقة من غیر ضرورة۔ وقال الامام الطحطاوی فی حاشیة درمختار ص۱۹۰ فان الاظهر ان المراد ثیابك الملبوسة فی الصلوٰة وتطهیرها من النجاسة وَهُوَ قول الفقهاء وارجح التفاسیر (منہ) [۱] ایک جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ اس نوع کی جملہ آیات میں گو خطاب حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مراد امت ہے۔

رہیئے ۔ مفسدوں کے راستہ کو اختیار کرنا آپ کے لیے ممکن ہی نہیں ہے آئندہ بھی اس راستہ کو اختیار نہ کیجئے ۔

حضور علیہ السلام کے سینہ میں الفاظ اور معانی قرآن کے جمع کرنے کا اللہ ذمہ دار ہے

حدیث ۴ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَالِجُ مِنَ التَّنْزِيلِ شِدَّةً وَّ كَانَ مِمَّا يُحَرِّكُ شَفَتَيْهِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَأَنَا أُحَرِّكُ هُمَالَكَ كَمَا كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَرِّكُهُمَا وَقَالَ سَعِيدٌ أَنَا أُحَرِّكُهُمَا كَمَا رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمَا يُحَرِّكُهُمَا فَحَرَّكَ شَفَتَيْهِ فَأَنْزَلَ اللهُ تَعَالَى لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ قَالَ جَمْعُهُ لَكَ صَدْرُكَ وَ تَقْرَاهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ قَالَ فَاسْتَمِعْ لَهُ وَ أَنْصِتْ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا أَنْ تَقْرَأَهُ فَكَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ذَالِكَ إِذَا أَتَاهُ جِبْرَئِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اسْتَمَعَ فَإِذَا انْطَلَقَ جِبْرَئِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَرَأَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا قَرَأَهُ (بخاری)

سعید ابن جبیر نے حضرت ابن عباس سے آیت لا تحرک بہ لسانک کی تفسیر میں یہ بیان کیا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم قرآن کے نازل ہونے سے شدت محسوس فرماتے تھے ۔ بسا اوقات اپنے لبوں اور زبان کو حرکت دیتے تھے ۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں میں بھی اپنے لبوں کو اسی طرح حرکت دیتا ہوں جس طرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم حرکت دیتے تھے ۔ سعید نے کہا میں بھی اسی طرح حرکت دیتا ہوں جس طرح حضرت ابن عباس اپنے لبوں کو حرکت دیتے تھے ۔ پھر سعید نے اپنے لبوں کو حرکت دی تو اس پر اللہ تعالے نے یہ آیتیں نازل فرمائیں ۔ اے محبوب تم وحی اپنی زبان پر ادا کرنے کی جلدی میں قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دو ۔ بیشک اس کا محفوظ کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے ۔ اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباس نے فرمایا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا تمہارے سینہ میں جمع کرنا اور پڑھا دینا ہمارے (یعنی اللہ تعالے کے) ذمہ ہے تو جب ہم اسے پڑھ چکیں تو اس وقت اس پڑھے ہوئے کی اتباع کرو ۔ اتباع کی تفسیر میں حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اس کو سنیں اور خاموش رہیں پھر یقیناً وحی کے مطلب کا سمجھا دینا ہمارے ذمہ ہے ۔ بیان کی تفسیر میں ابن عباس نے فرمایا ۔ پھر بے شک ہمارے ذمہ ہے کہ آپ اس کو پڑھتے رہیں گے اور اس کے بعد جب حضور کی خدمت میں جبرئیل حاضر ہوتے تو حضور لبوں کو حرکت دینے کے بجائے سنتے رہتے پھر جب وہ چلے جاتے تو پھر حضور اس کو ویسا ہی پڑھ لیتے جیسا

انھوں نے پڑھا تھا۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے کتاب التفسیر و باب فضائل القرآن میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے کتاب الصلوٰۃ میں۔ امام ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے ۲۔ بوقتِ وحی تکلیف محسوس فرمانے کی وجہ اس کی ثقالت اور کلامِ الٰہی کی ہیبت تھی۔ اسی لیے قرآن نے وحی کو قول ثقیل کہا۔ ہونٹوں کو حضور علیہ السلام اس لیے ہلاتے تھے تاکہ وحی یاد ہو جائے۔ اللہ عزوجل نے فرمایا۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰی ہم آپ کو پڑھائیں گے اور آپ بھولیں گے نہیں۔ یعنی متنِ قرآن کا آپ کے سینہ میں ضبط کرنا اور آپ کے حافظہ میں محفوظ کرنا ہمارا کام ہے ۴۔ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام جب وحی سناتے تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ یاد کرنے کے لیے اپنی زبانِ مبارک کو ہلاتے اس پر فرمایا کہ آپ ایسا نہ کیجیے۔

۱- اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ	قرآن کا آپ کے سینہ میں جمع کرنا ہمارے ذمہ ہے۔
۲- فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ	جب ہم پڑھیں تو تم اس پڑھنے کی پیروی کرو
۳- ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (قرآن)	پھر وحی کے مطالب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

ان آیات سے یہ واضح ہو گیا کہ قرآنِ مجید کا کوئی حکم حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے مجمل و مبہم نہیں ہے۔ اللہ عزّوجل نے جس طرح سینہ نبوی میں قرآنِ مجید کو محفوظ کر دینے کی ذمہ داری لی ہے۔ اسی طرح اس کے مطالب و معانی اور اس کے اصولوں کے جزئیات کے تعیّن و تبیین کی ذمہ داری بھی لی ہے۔ اسی لیے فرمایا:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (قرآن)	ہم نے تم پر کتاب اُتاری جس میں ہر شے کا روشن بیان ہے۔

یہ ہر شے کا روشن بیان ہر ایک کے لیے نہیں ہے بلکہ صرف حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کے لیے ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم کے اصولوں کی حضور علیہ السلام نے جو تبیین و توضیح فرمائی ہے اور جو مطالب و معانی اپنے قول و عمل سے اُمت کو تعلیم دیتے ہیں وہ سب وحی الٰہی سے ہے اور وہ (سُنّت) بھی قرآنِ مجید کی طرح دین ہے اور قرآنِ حکیم کی طرح ہی واجب العمل ہے۔

فائدہ حدیثِ زیر بحث میں راوی سے نقلِ تفسیر میں سہو واقع ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے ان نقرأہ کو بیانہ کی تفسیر میں نقل کیا ہے حالانکہ وہ بیانہ کی تفسیر ہے اور قرآنہ کی تفسیر یہ نہیں بلکہ اس کی تفسیر ان یثبتہ علی لسانک ہے جیسا کہ بخاری کتاب التفسیر میں مذکور ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما آپ عہدِ صحابہ کے سب سے کمسن مفسّر قرآن ہیں۔ حضور علیہ السلام کے چچا زاد بھائی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے آپ کو دُعا دی تھی کہ الٰہی ان کو حکمت اور تاویلِ قرآن سکھا۔ یہ اسی دُعا کا اثر تھا کہ جلیل القدر صحابہ کرام نے آپ

کے علم و فضل کا اعتراف کیا۔ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ سے مشکل مسائل میں مشورہ لیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔

ابن عباس فتی الکھول له لسان سئول و قلب عقول (استیعاب)

ابن عباس جوانوں کا بڑے بوڑھوں میں ان کو خدا نے سوال کرنے والی زبان اور سمجھنے والا دل دیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود اس دور کے ایک جلیل القدر مفسر تھے۔ ان کا جو مرتبہ ہے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وہ خود اپنی نسبت یہ فرماتے ہیں کہ "میں قرآن کریم کی ہر آیت کی بابت جانتا ہوں کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔ اگر مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ چلتا جو مجھ سے زیادہ قرآن کا علم رکھنے والا ہے اور سواریوں کے ذریعے اس تک پہنچنا ممکن ہوتا تو اس کے پاس ضرور پہنچتا"۔ لیکن اس جلالت مرتبہ کے باوجود حضرت ابن عباس کے بارے میں ان کا ارشاد یہ ہے:۔

نعم ترجمان القرآن ابن عباس لوادرك اسفلنا ما عاشره منا رجل

عبداللہ ابن عباس کیا خوب مفسر ہیں اگر وہ ہمارے ہم عمر ہوتے تو ہم میں سے کوئی بھی ان کی ہمسری کی جرأت نہ کر سکتا۔

حضرت عکرمہ کا قول ہے کہ سیدنا ابن عباس جس راستے سے گزر جاتے۔ وہ خوشبو سے معطّر ہو جاتا۔ حضرت ابن عباس عبادلہ اربعہ میں سے ایک ہیں۔ عبادلہ اربعہ کے نام یہ ہیں۔ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبداللہ بن زبیر، امام احمد نے فرمایا کہ ذیل کے چھ صحابہ کثیر الروایت ہیں

اور ان میں سب سے زیادہ کثیر الروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر، حضرت انس حضرت ابن عمر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

حضرت ابن عباس سے ایک ہزار چھ سو ساٹھ حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے ۹۵ حدیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے اور ۱۲۰ پر صرف بخاری نے اور ۴۹ حدیثوں پر صرف مسلم نے اتفاق کیا ہے۔ بوقت وصالِ نبوی آپ کی عمر ۱۳ یا ۱۴ سال تھی (عینی جلد ۱ صـ۸۳) ستر سال کی عمر میں بمقام طائف انتقال فرمایا۔ حضرت محمد بن حنفیہ نے نماز جنازہ پڑھانے کے بعد کہا آج امّت کا مفسر اٹھ گیا۔

حدیث نمبر ۵۔ رمضان میں جبرئیل کے ساتھ قرآن کا دور

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدَ النَّاسِ وَكَانَ اَجْوَدَ مَا يَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ حِيْنَ يَلْقَاهُ

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور تمام اوقات سے زیادہ آپ رمضان میں زیادہ سخی ہو

جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَكَانَ يَلْقَاهُ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ الْقُرْاٰنَ فَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدُ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ (بخاری)

جانتے تھے جب کہ جبریل علیہ السلام سے مُلاقات کرتے تھے۔ حضرت جبریل امین رمضان کی ہر رات میں آتے تھے اور آپ کے ساتھ قرآن حکیم کا دَور کرتے تھے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم ان دنوں میں تیز ہوا سے بھی زیادہ سخی ہو جاتے تھے۔

تشریح الفاظِ حدیث

اجود النّاس۔ اجود اسم تفضیل کا صیغہ ہے جود سے مشتق ہے۔ اس کے معنیٰ (اعطاء ماینبغی لمن ینبغی) یعنی مناسب چیز مناسب شخص کو دینے کے ہیں۔ یہی معنیٰ سخاوت کے ہیں تو اجود الناس کے معنیٰ ہوتے تمام لوگوں سے زیادہ سخی۔ ایک حدیث میں فرمایا "اللہ تعالےٰ سب سے زیادہ جود فرمانے والا ہے۔ پھر تمام انسانوں سے سخی تر میں ہوں۔ میرے بعد وہ شخص جو علمِ دین کو پھیلائے۔"

حضور علیہ السلام اجود الخلق ہیں

یہاں النّاس کی قید اس لیے ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے ظاہر ہے کہ جب بہ نسبت اشرف المخلوقات حضور اجود ہیں تو بلحاظ غیر اشرف تو بدرجہ اولیٰ اجود قرار پائیں گے جس سے واضح ہوا کہ حضور علیہ السلام نہ صرف اجود النّاس ہیں بلکہ اجود الخلق ہیں اور وہ بھی ایسے کہ دنیا و آخرت آپ کے خوانِ جود کا ایک ٹکڑا ہے۔ امام بوصیری قدس سرہ القوی نے اسی لیے عرض کیا ؎

فَاِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا
وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

حضور! دنیا و آخرت آپ کے خوانِ جود کا ایک ٹکڑا ہے اور لوح و قلم کا علم آپ کے علوم کا ایک حصہ ہے۔

رَمَضَانَ سے رمضان کا مہینہ مراد ہے۔ یہ رمض سے مشتق ہے۔ رمض کے معنیٰ جل جانے کے ہیں چونکہ اس وقت جب اس مہینہ کا نام رکھا گیا تھا گرمی تھی۔ اس لیے اس کا نام رمضان ہو گیا۔ یدارسہ باب مفاعلہ ہے۔ درس کے معنیٰ سرعت کے ساتھ پڑھنے کے ہیں۔ یعنی رمضان المبارک میں حضور اکرم اور جبریل امین قرآنِ پاک کا دَور فرماتے تھے۔

الرِّیح المرسلۃ۔ وہ ہوا جو لوگوں کے نفع کے لیے بھیجی جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم مطلقاً فیاض اور سخی تھے لیکن رمضان المبارک میں حضور علیہ السلام کی سخاوت اور دنوں سے زیادہ ہو جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو جبریل سے ملاقات ہوتی تھی جو اللہ کے پیامبر تھے دوسرے رمضان مبارک وہ عظیم الشان مہینہ ہے کہ اس میں لیلۃ القدر ہے اور رمضان کے مہینہ میں نیک کاموں کا ثواب دُگنا ملتا ہے۔

۲۔ امام زہری نے فرمایا کہ رمضان میں ایک مرتبہ اللہ کی تسبیح کرنا ستر مرتبہ تسبیح کرنے کے مترادف ہے۔

پھر جبریل کی حاضری اور قرآن پاک کا دور یہ وہ باتیں ہیں جن سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو روحانی کیف حاصل ہوتا تھا اور اس کے شکریہ میں حضور علیہ السلام بہ نسبت دیگر ایام اور زیادہ سخاوت فرماتے تھے ۔ حضرت جبریل کے ساتھ قرآن کے دَور میں متعدد حکمتیں تھیں ۔ اللہ تعالٰی نے وعدہ فرمایا تھا کہ ہم پڑھائیں گے اور پھر آپ بھولیں گے نہیں ۔ اس لیے جبریل امین رمضان کی ہر رات میں حاضر ہو کر دَور فرماتے اور رمضان کے مہینہ کو درس کے لیے اس لیے بھی مقرر فرمایا کہ اسی ماہ میں قرآنِ کریم لوحِ محفوظ سے سماءِ دنیا پر نازل ہوا اور پھر یہاں سے حسبِ مصلحت ۲۳ سال تک نازل ہوتا رہا ۔

مسائلِ حدیث ۱۔ سخاوت بہر صورت بہتر ہے اور مومن فیاض ہے ۔ ۲۔ رمضانِ مبارک کے مہینہ میں زیادہ سخاوت کرنی چاہیئے کیونکہ ثواب زیادہ ملتا ہے ۳۔ صلحاء اور اہلِ خیر کی زیارت بار بار کرنا باعثِ برکت ہے ۔ جیسے جبریل امین علیہ السلام بار بار حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوتے تھے ۴۔ رمضان المبارک میں قرآنِ حکیم خصوصیت کے ساتھ زیادہ پڑھنا بھی مستحب ہے ۔ ۵۔ قرآنِ حکیم کی تلاوت تمام اذکار و وظائف سے افضل ہے کیونکہ تمام وظائف کی اصل قرآن مجید ہی ہے ۶۔ قرآنِ مجید کے دَور کرنے اور بار بار پڑھنے سے قرآن یاد رہتا ہے اور حفاظ کے لیے قرآنِ مجید کا دَور ناگزیر ہے ۔ دَور کے بغیر قرآنِ مجید بھول جاتا ہے ۷۔ وكان يلقاه من كل ليلة من رمضان میں ابتدائی نزول کی کیفیت کی جانب اشارہ ہے تو ترجمۃ الباب سے مناسبت یہ ہوئی کہ وحی کی ابتداء رمضان المبارک کے مہینہ سے ہوئی ۔

نزولِ قرآن کی ابتداء اور کتبِ سماویہ کے نزول کی تاریخیں

۱۔ واضح ہو کہ قرآنی وحی کے نزول کی ابتداء رمضان المبارک یوم دوشنبہ میں ہوئی ۔ جیسا کہ حدیث زیرِ بحث کے مذکورہ جملہ میں بہ صراحت مذکور ہے کہ جبریل امین رمضان کی ہر شب میں حاضر ہو کر ایک مرتبہ قرآن کا دَور کیا کرتے تھے تو قرآنی دَور کے لیے بارہ مہینوں میں رمضان کا انتخاب اسی مناسبت سے ہوا کہ زمین پر نزول کی ابتداء رمضان سے ہوئی تھی ۔ علاوہ ازیں خود قرآنِ مجید میں بھی اس کی تصریح ہے ۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ ۲۔ اسی طرح لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر قرآن کا یکبارگی نزول بھی رمضان میں ہوا یعنی جبریل امین لوحِ محفوظ سے پورا قرآن اخذ کر کے آسمانِ دنیا پر آتے اور وہاں فرشتوں کو املا کرایا ۔ فرشتوں نے موجودہ ترتیب کے مطابق اپنے صحیفوں میں لکھ کر بیت العزۃ میں رکھ دیا جو آسمانِ دنیا پر ایک مقام ہے ۔ پھر جبریل امین یہاں سے وقتاً فوقتاً حسبِ اقتضائے حکمت جتنا جتنا منظورِ الٰہی ہوا ۔ بحضورِ نبوی پیش کرتے رہے حتٰی کہ بذریعہ جبریل امین نزولِ قرآن تیئیس (۲۳) سال کی مدت میں پورا ہوا ۳۔ علماء فرماتے ہیں کہ صحفِ ابراہیم رمضان کی یکم کو ـــــ توریت ۲۰ رمضان کو ـــــ انجیل ۱۲ رمضان کو اور قرآنِ حکیم ۱۷ رمضان کو نازل ہوا ۔ پھر جتنا قرآنِ مجید نازل ہوتا ایک رمضان سے دوسرے

... جس سال حضور علیہ السلام کا وصال ہوا اس سال دربار دور ہوا۔

ہرقل کے دربار میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفات کے متعلق ابوسفیان کا بیان

حدیث نمبر ٦ مسعود إِنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ أَبَا سُفْيَانَ بْنَ حَرْبٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ هِرَقْلَ أَرْسَلَ إِلَيْهِ فِي رَكْبٍ مِنْ قُرَيْشٍ وَكَانُوا تُجَّارًا بِالشَّامِ فِي الْمُدَّةِ الَّتِي كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَادَّ فِيهَا أَبَا سُفْيَانَ وَكُفَّارَ قُرَيْشٍ فَأَتَوْهُ وَهُمْ بِإِيلِيَاءَ فَدَعَاهُمْ فِي مَجْلِسِهِ وَحَوْلَهُ عُظَمَاءُ الرُّومِ ثُمَّ دَعَاهُمْ وَدَعَا تَرْجُمَانَهُ فَقَالَ أَيُّكُمْ أَقْرَبُ نَسَبًا بِهَذَا الرَّجُلِ الَّذِي يَزْعُمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ قَالَ أَبُو سُفْيَانَ فَقُلْتُ أَنَا أَقْرَبُهُمْ نَسَبًا فَقَالَ أَدْنُوهُ مِنِّي وَقَرِّبُوا أَصْحَابَهُ فَاجْعَلُوهُمْ عِنْدَ ظَهْرِهِ ثُمَّ قَالَ لِتَرْجُمَانِهِ قُلْ لَهُمْ إِنِّي سَائِلٌ هَذَا عَنْ هَذَا الرَّجُلِ فَإِنْ كَذَبَنِي فَكَذِّبُوهُ فَوَاللهِ لَوْلَا الْحَيَاءُ مِنْ أَنْ يَأْثِرُوا عَلَيَّ كَذِبًا لَكَذَبْتُ عَنْهُ ثُمَّ كَانَ أَوَّلَ مَا سَأَلَنِي عَنْهُ أَنْ قَالَ كَيْفَ نَسَبُهُ فِيكُمْ قُلْتُ هُوَ فِينَا ذُو نَسَبٍ قَالَ فَهَلْ قَالَ هَذَا الْقَوْلَ مِنْكُمْ أَحَدٌ قَطُّ قَبْلَهُ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ لَا قَالَ فَأَشْرَافُ النَّاسِ يَتَّبِعُونَهُ أَمْ ضُعَفَاؤُهُمْ فَقُلْتُ بَلْ ضُعَفَاؤُهُمْ

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ابوسفیان بن حرب نے ان سے بیان کیا کہ ہرقل (شاہِ روم) نے ان کے پاس ایک آدمی بھیجا۔ جب کہ وہ قریش کے چند سواروں میں (بیٹھے) تھے اور یہ لوگ شام میں تاجر بن کر گئے تھے اور یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب کہ حضور اکرم نے ابوسفیان اور کفارِ قریش سے ایک محدود عہد کیا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ ہرقل کے پاس آئے جب کہ یہ لوگ ایلیا میں تھے تو ہرقل نے ان لوگوں کو اپنے دربار میں بلایا ہرقل کے گرد روم کے رئیس بھی جمع تھے۔ ہرقل نے ان کو اپنے پاس بلایا اور ترجمان کو بھی بلایا۔ پھر ابوسفیان اور ان کے ساتھیوں سے کہا کہ تم میں اس شخص کا قریب النسب کون ہے۔ جو یہ گمان کرتا ہے کہ وہ اللہ کا نبی ہے (یعنی حضور اکرم)؟ ابوسفیان نے کہا۔ میں حضور اکرم کا قریبی رشتہ دار ہوں۔ ہرقل نے کہا۔ ابوسفیان کو میرے سامنے کھڑا کردو اور اس کے ساتھیوں کو اس کے پیچھے کھڑا کرو۔ پھر ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ان سے کہو میں ابوسفیان سے اس شخص کا حال معلوم کرتا ہوں (جس نے نبوت کا دعوےٰ کیا ہے) اگر یہ (ابوسفیان) جھوٹ بولیں تو تم ان کی تکذیب کر دینا۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ اگر مجھے اس بات کی شرم نہ ہوتی کہ میرے ساتھی میرے جھوٹ کو ظاہر کر دیں گے تو میں حضور اکرم کے متعلق غلط بیانی سے کام لیتا۔ پھر سب سے پہلا سوال ہرقل نے مجھ سے یہ کیا: قیصر، مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟ ابوسفیان: وہ (حضور اکرم) ہم

قَالَ اَيَزِيْدُوْنَ اَمْ يَنْقُصُوْنَ قُلْتُ بَلْ يَزِيْدُوْنَ قَالَ هَلْ يَرْتَدُّ اَحَدٌ مِنْهُمْ سُخْطَةً لِدِيْنِهٖ بَعْدَ اَنْ يَدْخُلَ فِيْهِ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُوْنَهٗ بِالْكِذْبِ قَبْلَ اَنْ يَقُوْلَ مَا قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ يَغْدِرُ قُلْتُ لَا وَنَحْنُ مِنْهُ فِيْ مُدَّةٍ لَا نَدْرِيْ مَا هُوَ فَاعِلٌ فِيْهَا قَالَ وَلَمْ تُمْكِنِّيْ كَلِمَةٌ اُدْخِلُ فِيْهَا شَيْئًا غَيْرُ هٰذِهِ الْكَلِمَةِ تَاتَلْتُمُوْهُ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَكَيْفَ كَانَ قِتَالُكُمْ اِيَّاهُ۔ قُلْتُ الْحَرْبُ بَيْنَنَا وَبَيْنَهٗ سِجَالٌ يَنَالُ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْهُ قَالَ مَا يَاْمُرُكُمْ قُلْتُ يَقُوْلُ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّاتْرُكُوْا مَا يَقُوْلُ اٰبَآؤُكُمْ وَيَاْمُرُنَا بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ وَالصِّلَةِ فَقَالَ لِلتَّرْجُمَانِ قُلْ لَهٗ سَاَلْتُكَ عَنْ نَسَبِهٖ فَذَكَرْتَ اَنَّهٗ فِيْكُمْ ذُوْ نَسَبٍ فَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ تُبْعَثُ فِيْ نَسَبِ قَوْمِهَا وَسَاَلْتُكَ هَلْ قَالَ اَحَدٌ مِنْكُمْ هٰذَا الْقَوْلَ فَذَكَرْتَ اَنْ لَّا قُلْتُ لَوْ كَانَ اَحَدٌ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ قَبْلَهٗ لَقُلْتُ رَجُلٌ يَاْتَسِيْ بِقَوْلٍ قِيْلَ قَبْلَهٗ وَسَاَلْتُكَ هَلْ كَانَ مِنْ اٰبَآئِهٖ من مَلِكٍ فَذَكَرْتَ اَنْ لَّا فَقُلْتُ فَلَوْ كَانَ مِنْ اٰبَآئِهٖ

ہیں شریف خاندان سے ہیں۔ قیصر، اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعوٰے کیا؟ ابوسفیان نہیں قیصر، جن لوگوں نے اس کا (یعنی حضور کا) اتباع کیا ہے وہ کمزور (غریب) لوگ ہیں یا اشراف (صاحب اثر)؟ ابوسفیان، کمزور لوگ۔ قیصر، اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جا رہے ہیں؟ ابوسفیان، بڑھتے جاتے ہیں۔ قیصر، اس کے پیروؤں میں سے کوئی اس کے دین کو بُرا جان کر مُرتد بھی ہو جاتا ہے یا نہیں؟ ابوسفیان، نہیں! قیصر، کیا تم نے اس کو نبوّت کے دعوے سے قبل جھوٹ کے ساتھ متہم بھی کیا ہے؟ ابوسفیان، نہیں۔ قیصر، وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے یا نہیں؟ ابوسفیان، ابھی تک تو اس نے بدعہدی نہیں کی اور اب ہمارا اس کا معاہدہ ہوا ہے نہیں معلوم وہ اس میں کیا کرے گا؟ (ابوسفیان کہتے ہیں کہ سوائے اس کلمے کے میں حضور کے خلاف اور کوئی بات نہ کہہ سکا) قیصر، تم لوگوں نے کبھی اس سے جنگ بھی کی ہے؟ ابوسفیان، ہاں۔ قیصر، جنگ کا نتیجہ کیا رہا؟ (یعنی فتح کس کو ہوئی ہے) ابوسفیان، ہماری اس کی لڑائی ڈولوں کی طرح ہے۔ کبھی ڈول ہماری طرف آتا ہے اور کبھی ہم سے اس کی طرف (یعنی کبھی ہمیں فتح ہوئی کبھی اس کی۔ قیصر، وہ تمہیں کن باتوں کا حکم دیتا ہے۔ ابوسفیان، اس کی تعلیم یہ ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ کسی کو خدا کا شریک مت بناؤ اور وہ باتیں ترک کر دو جو تمہارے ماں باپ کہتے ہیں (یعنی بُت پرستی) وہ ہمیں نماز پڑھنے، سچ بولنے، پاکدامنی اختیار کرنے اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔ اس کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ سے کہا کہ۔ میں نے تم سے اس کے نسب کے

مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ رَجُلٌ يَطْلُبُ مُلْكَ أَبِيهِ وَسَأَلْتُكَ هَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ قَالَ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا فَقَدْ أَعْرِفُ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ لِيَذَرَ الْكَذِبَ عَلَى النَّاسِ وَيَكْذِبَ عَلَى اللّٰهِ وَسَأَلْتُكَ أَشْرَافُ النَّاسِ اتَّبَعُوهُ أَمْ ضُعَفَاؤُهُمْ فَذَكَرْتَ أَنَّ ضُعَفَاءَهُمُ اتَّبَعُوهُ وَهُمْ أَتْبَاعُ الرُّسُلِ وَسَأَلْتُكَ أَيَزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ فَذَكَرْتَ أَنَّهُمْ يَزِيدُونَ وَكَذٰلِكَ أَمْرُ الْإِيمَانِ حَتّٰى يَتِمَّ وَسَأَلْتُكَ أَيَرْتَدُّ أَحَدٌ سَخْطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا وَكَذٰلِكَ الْإِيمَانُ حِينَ تُخَالِطُ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوبَ وَسَأَلْتُكَ هَلْ يَغْدِرُ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا وَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ لَا تَغْدِرُ وَسَأَلْتُكَ بِمَا يَأْمُرُكُمْ فَذَكَرْتَ أَنَّهُ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَيَنْهَاكُمْ عَنْ عِبَادَةِ الْأَوْثَانِ وَيَأْمُرُكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ فَإِنْ كَانَ مَا تَقُولُ حَقًّا فَسَيَمْلِكُ مَوْضِعَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ وَقَدْ كُنْتُ أَعْلَمُ أَنَّهُ خَارِجٌ وَلَمْ أَكُنْ أَظُنُّ أَنَّهُ مِنْكُمْ فَلَوْ أَنِّي أَعْلَمُ أَنِّي أَخْلُصُ إِلَيْهِ لَتَجَشَّمْتُ لِقَاءَهُ وَلَوْ كُنْتُ عِنْدَهُ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ

متعلق پوچھا تم نے اس کو شریف النسب بتایا اور پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندان سے ہوتے ہیں۔ میں نے تم سے یہ بھی پوچھا کہ اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعوٰے کیا ہے تم نے کہا نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ میں نے تم سے پوچھا کہ کیا اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے تم نے کہا۔ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو اپنے باپ کی حکومت مطلوب ہے (یعنی حکومت کی ہوس ہے) میں نے تم سے سوال کیا تم نے کبھی اس کو نبوت کے دعوٰی سے قبل جھوٹ سے متہم کیا ہے تم نے کہا نہیں۔ پس جو شخص کسی آدمی سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ ضعیف لوگ اس کا اتباع کرتے ہیں یا اشراف اور مالدار تم نے جواب دیا غریب لوگ تو پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ تم سے میں نے پوچھا کہ اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟ تم نے کہا کہ بڑھ رہے ہیں تو ایمان کا یہی حال ہے یہاں تک کہ پورا ہو جائے (یعنی سچا مذہب بڑھتا ہی جاتا ہے) میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد دین کو برا سمجھ کر کوئی پھرتا ہے؟ تم نے کہا نہیں! تو ایمان کی یہی حالت ہوتی ہے۔ جب کہ اس کے دل میں سما جاتی ہے کہ جب وہ پختہ ہو جائے (یعنی جب ایمان کامل ہو جائے تو پھر کفر سے نفرت ہو جاتی ہے) میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس نے کبھی بدعہدی بھی کی ہے؟ تم نے کہا نہیں تو انبیاء کا یہی حال ہوتا ہے وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ میں نے تم سے اس کی تعلیم کے متعلق پوچھا تھا تم نے کہا وہ ہم کو ایک خدا کو پوجنے اور اس کا کسی کو شریک نہ بنانے کا حکم دیتا ہے اور بتوں کی پرستش سے منع کرتا ہے۔ نماز سچائی اور پاکدامنی کا

حکم دیتا ہے۔ پس اگر جو کچھ تم نے جواب میں کہا ہے، صحیح ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا اور میں جانتا تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ تم میں ہوگا (یعنی قریش میں پیدا ہوگا) اور اگر مجھے یہ امید ہوتی کہ اس تک پہنچ جاؤں گا تو ضرور اس سے ملنے کی کوشش کرتا۔ اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا۔"

ثُمَّ دَعَا بِكِتَابِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِي بَعَثَ بِهِ مَعَ دِحْيَةَ الْكَلْبِيِّ إِلَى عَظِيمِ بُصْرَى فَدَفَعَهُ عَظِيمُ بُصْرَى إِلَى هِرَقْلَ فَقَرَأَهُ فَإِذَا فِيهِ

پھر قیصر نے حضور علیہ السلام کا خط طلب کیا جو حضور علیہ السلام نے حضرت دحیہ کلبی کے ہاتھ بصرے کے رئیس کو ارسال فرمایا تھا اور رئیس بصریٰ نے ہرقل کے پاس بھیج دیا تھا (یہ خط ۶ ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد بھیجا گیا تھا) ہرقل نے اس نامہ مبارک کو پڑھا۔ فرمان رسالت کے یہ الفاظ تھے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ إِلَى هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ سَلَامٌ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْأَرِيسِيِّينَ وَيَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَنْ لَا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے۔ یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم (بادشاہ) ہے۔ اس کو سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے۔ اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام لا۔ سلامت رہے گا۔ خدا تجھ کو دوگنا اجر دے گا اور اگر تو نے نہ مانا تو اہل ملک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا۔ اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو (خدا کو چھوڑ کر) خدا نہ بنائے۔ اگر تم نہیں مانتے تو گواہ رہو ہم تو ایک خدا کے تابعدار ہیں۔

قَالَ أَبُو سُفْيَانَ فَلَمَّا قَالَ مَا قَالَ وَفَرَغَ مِنْ قِرَاءَةِ الْكِتَابِ كَثُرَ عِنْدَهُ الصَّخَبُ فَارْتَفَعَتِ الْأَصْوَاتُ وَأُخْرِجْنَا فَقُلْتُ لِأَصْحَابِي حِينَ أُخْرِجْنَا لَقَدْ أَمِرَ أَمْرُ ابْنِ أَبِي كَبْشَةَ إِنَّهُ يَخَافُهُ مَلِكُ بَنِي الْأَصْفَرِ فَمَا زِلْتُ مُوقِنًا أَنَّهُ سَيَظْهَرُ حَتَّى أَدْخَلَ اللّٰهُ عَلَيَّ الْإِسْلَامَ وَ

ابوسفیان کہتے ہیں کہ جب ہرقل نے یہ باتیں کیں اور نامہ اقدس پڑھنے سے فارغ ہوا تو دربار میں بڑا شور ہوا اور آوازیں بلند ہوئیں اور ہم دربار سے باہر نکال دیئے گئے۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ جب ہم دربار سے نکال دیئے گئے تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابوکبشہ کے بیٹے کا درجہ بڑھ گیا ہے۔ بنی اصفر کا بادشاہ ان سے ڈرتا ہے (ابوکبشہ حضور کے رضاعی والد ہیں) (بنی اصفر

كَانَ ابْنُ النَّاطُوْرِ صَاحِبُ اِيْلِيَاءَ وَهِرَقْلَ سُقُفًّا عَلٰى نَصَارَى الشَّامِ يُحَدِّثُ اَنَّ هِرَقْلَ حِيْنَ قَدِمَ اِيْلِيَاءَ اَصْبَحَ يَوْمًا خَبِيْثَ النَّفْسِ فَقَالَ بَعْضُ بَطَارِقَتِهٖ قَدِ اسْتَنْكَرْنَا هَيْئَتَكَ قَالَ ابْنُ النَّاطُوْرِ وَكَانَ هِرَقْلُ حَزَّاءً يَنْظُرُ فِي النُّجُوْمِ فَقَالَ لَهُمْ حِيْنَ سَاَلُوْهُ اِنِّيْ رَاَيْتُ اللَّيْلَةَ حِيْنَ نَظَرْتُ فِي النُّجُوْمِ مَلِكَ الْخِتَانِ قَدْ ظَهَرَ فَمَنْ يَخْتَتِنُ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ قَالُوْا لَيْسَ يَخْتَتِنُ اِلَّا الْيَهُوْدُ فَلَا يُهِمَّنَّكَ شَاْنُهُمْ وَاكْتُبْ اِلٰى مَدَايِنِ مُلْكِكَ فَلْيَقْتُلُوْا مَنْ فِيْهِمْ مِنَ الْيَهُوْدِ فَبَيْنَا هُمْ عَلٰى اَمْرِهِمْ اُتِيَ هِرَقْلُ بِرَجُلٍ اَرْسَلَ بِهٖ مَلِكُ غَسَّانَ يُخْبِرُ عَنْ خَبَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا اسْتَخْبَرَهُ هِرَقْلُ قَالَ اذْهَبُوْا فَانْظُرُوْا اَمُخْتَتِنٌ هُوَ اَمْ لَا فَنَظَرُوْا اِلَيْهِ فَحَدَّثُوْهُ اَنَّهٗ مُخْتَتِنٌ وَسَاَلَهٗ عَنِ الْعَرَبِ فَقَالَ هُمْ يَخْتَتِنُوْنَ فَقَالَ هِرَقْلُ هٰذَا مَلِكُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ قَدْ ظَهَرَ ثُمَّ كَتَبَ هِرَقْلُ اِلٰى صَاحِبٍ لَهٗ بِرُوْمِيَةَ وَكَانَ نَظِيْرَهٗ فِي الْعِلْمِ وَسَارَ هِرَقْلُ اِلٰى حِمْصَ فَلَمْ يَرِمْ حِمْصَ حَتّٰى اَتَاهُ كِتَابٌ مِنْ

سے روم کے لوگ ڈرتے ہیں۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ پھر مجھے یقین ہو گیا کہ حضور غالب ہوں گے۔ حتیٰ کہ اللہ نے مجھے اسلام نصیب کر دیا اور ابن ناطور جو ایلیا کا امیر تھا اور ہرقل کا مصاحب تھا اور شام کے نصاریٰ کا سردار (پادری) بھی تھا وہ کہتا ہے کہ جب ہرقل ایلیا میں آیا تو ایک صبح کو پریشان حال اُٹھا تو ہرقل کے بطارقہ (مصاحبوں) نے کہا کیا بات ہے آج ہمیں تمہاری طبیعت خراب دکھائی دیتی ہے۔ ابن ناطور کہتا ہے کہ ہرقل کاہن بھی تھا اور ستاروں کو دیکھا کرتا تھا تو ہرقل نے مصاحبوں کے سوال پر جواب دیا۔ میں نے رات ستاروں کو دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ ختنہ کرنے والوں کا بادشاہ ظاہر ہو گیا ہے تو بتاؤ اس اُمت میں کونسی قوم ختنہ کرائی ہے تو مصاحبوں نے جواب دیا۔ یہودی ختنہ کراتے ہیں لیکن آپ کو ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنے علاقہ کے شہروں کے حاکموں کو حکم دے دیجئے کہ ان شہروں میں جو بھی یہودی ہیں ان کو قتل کر دیں۔ ابھی ہرقل اور اس کے مصاحب اسی گفتگو میں مصروف تھے کہ ہرقل کے حضور ایک شخص لایا گیا جس کو غسان کے بادشاہ نے بھیجا تھا جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات کی اطلاع دیتا تھا۔ جب ہرقل نے اس شخص سے حضور علیہ السلام کے حالات معلوم کیے تو اپنے مصاحبوں سے کہا۔ جاؤ دیکھو وہ ختنہ شدہ ہے یا نہیں تو انھوں نے حضور علیہ السلام کا حال دیکھ کر واپس آ کر بتایا کہ آپ مختون ہیں پھر ہرقل نے عرب کے متعلق پوچھا تو جواب دیا گیا کہ وہ بھی ختنہ کراتے ہیں۔ ہرقل نے کہا۔ بس یہی شخص (حضور اکرم علیہ السلام) اس امت کے بادشاہ ہیں جو ظاہر ہو چکا ہے۔ پھر نجوم اور علامات کے ذریعہ ہرقل نے جو رائے قائم کی تھی اس کی مزید تائید کے لیے ہرقل نے اپنے ایک

صَاحِبِهٖ يُوَافِقُ رَأْيَ هِرَقْلَ عَلٰى خُرُوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَّهٗ نَبِيٌّ فَاَذِنَ هِرَقْلُ لِعُظَمَاءِ الرُّوْمِ فِيْ دَسْكَرَةٍ لَّهٗ بِحِمْصَ ثُمَّ اَمَرَ بِاَبْوَابِهَا فَغُلِّقَتْ ثُمَّ اطَّلَعَ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ الرُّوْمِ هَلْ لَّكُمْ فِي الْفَلَاحِ وَالرُّشْدِ وَاَنْ يَّثْبُتَ مُلْكُكُمْ فَتُبَايِعُوْا هٰذَا النَّبِيَّ فَحَاصُوْا حَيْصَةَ حُمُرِ الْوَحْشِ اِلَى الْاَبْوَابِ فَوَجَدُوْهَا قَدْ غُلِّقَتْ فَلَمَّا رَاٰى هِرَقْلُ نَفْرَتَهُمْ وَاَيِسَ مِنَ الْاِيْمَانِ قَالَ رُدُّوْهُمْ عَلَيَّ وَقَالَ اِنِّيْ قُلْتُ مَقَالَتِيْ اٰنِفًا اَخْتَبِرُ بِهَا شِدَّتَكُمْ عَلٰى دِيْنِكُمْ فَقَدْ رَاَيْتُ فَسَجَدُوْا لَهٗ وَرَضُوْا عَنْهُ فَكَانَ ذٰلِكَ اٰخِرَ شَاْنِ هِرَقْلَ قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ رَوَاهُ صَالِحُ بْنُ كَيْسَانَ وَيُوْنُسُ وَمَعْمَرٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ

نجومی دوست کو جو رومیہ میں تھا (یہ تمام حال لکھا) یہ شخص ہرقل کا علم میں مثل تھا۔ پھر ہرقل حمص چلا گیا۔ ابھی وہاں پہنچا ہی تھا کہ دوست کا جواب آ گیا جس میں ہرقل کی رائے (اور حساب نجوم) کی تائید کی گئی تھی کہ حضور علیہ السلام عرب میں پیدا ہو چکے ہیں۔ آخر ہرقل نے حمص میں اپنے محل میں روم کے رئیسوں کو جمع کیا اور محل کے دروازے بند کروا دیئے۔ پھر ان پر ظاہر ہوا اور ارکانِ دولت و رؤسائے مملکت کو خطاب کر کے کہا۔ اے رومیو! کیا تم اپنا فائدہ اور بھلائی چاہتے ہو اور یہ بھی چاہتے ہو کہ تمہارا ملک سلامت رہے؟ تو اس نبی کی بیعت کر لو جو عرب میں ظاہر ہوئے ہیں یہ کلمات سنتے ہی تمام سردارانِ روم وحشی گورخر کی طرح دروازہ کی طرف لپکے تو دروازہ کو بند پایا۔ ہرقل نے جب ان کی یہ نفرت دیکھی اور ان کے ایمان لانے سے مایوس ہو گیا تو کہا کہ میں نے ابھی ابھی تم سے جو بات کہی تھی وہ تو صرف اس لیے کہی تھی تاکہ مجھے یہ معلوم ہو سکے کہ تم اپنے دین پر کس قدر ثابت قدم ہو اور وہ مجھے ظاہر ہو گیا۔ یہ بات سن کر تمام سردار سجدہ میں گر گئے اور ہرقل سے راضی ہو گئے۔ بس یہ آخیر حال ہے ہرقل کا۔

فوائد و مسائلِ حدیث

۱۔ حدیثِ ہذا کو امام نے ابوابِ ذیل میں چودہ جگہ ذکر کیا ہے۔ تفسیر، جہاد، شہادت جزیہ، مغازی، استیذان، ادب، علم، احکام، خبر واحد وغیرہ ابواب میں اور امام مسلم نے مغازی میں۔ ابوداؤد نے ادب میں۔ ترمذی نے استیذان میں اور نسائی نے تفسیر میں ذکر کیا۔ ابنِ ماجہ نے اس حدیث کو روایت نہیں کیا ۲۔ ہرقلِ روم کا لقب قیصر ہے یہ بہت بہادر، جنگجو اور جبار بادشاہ تھا۔ یہ لفظ ان کی لغت میں قطع سے مشتق ہے۔ اس کی والدہ مر گئی تھی اور پیٹ کا آپریشن کر کے اس کو نکالا گیا تھا۔ قیصر فخر یہ کہا کرتا تھا کہ میں شرمگاہ کے راستہ پیدا نہیں ہوا ۳۔ ایک حدیث میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے (قیصرِ روم کی ہلاکت کے بعد دوسرا قیصر نہ ہوگا اور کسریٰ کے مرنے کے بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا۔ علامہ عینی فرماتے ہیں۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ملکِ شام میں دوسرا قیصر نہ ہوگا۔ اور عراق میں کوئی کسریٰ نہ ہوگا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی اس پیشگوئی کے مطابق شام میں قیصر اور عراق میں کسریٰ آج تک کوئی نہیں ہوا اور نہ ہوگا یہ حدیث

سفیان رضی اللہ تعالےٰ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ آپ کا نام صخر کنیت ابوحنظلہ ہے۔ واقعہ عام فیل سے دس سال قبل پیدا ہوئے اور فتح مکہ کے دن ایمان لائے۔ طائف، حنین اور جنگِ یرموک میں شریک ہوئے۔ غنائم حنین سے حضور علیہ السلام نے ان کو ایک سو اونٹ اور چالیس اوقیہ سونا عطا فرمایا تھا۔ ان کی ایک آنکھ یوم طائف میں اور دوسری جنگ یرموک میں خراب ہو گئی تھی۔ آخری ایام مدینہ میں گذرے اور وہیں ۳۲ھ میں وفات پائی۔ ۸۸ برس کی عمر ہوئی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ سے حضرت معاویہ اور ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما نے حدیثیں روایت کی ہیں۔ سفیان نامی متعدد صحابہ ہوتے ہیں مگر سفیان بن حرب صرف یہی ہیں۔

۵۔ مختلف ملکوں کے بادشاہوں کے لقب یہ ہیں۔ حبشہ نجاشی۔ ترک خاقان۔ قبط فرعون۔ مصر عزیز۔ یمن تبع۔ فارس کسریٰ۔ ایران خسرو۔ یونان بطلیموس۔ یہود قیطون۔ بربر جالوت۔ روم قیصر ۶۔ قیصر نے ۳۱ سال حکومت کی اور اسی کے عہدِ حکومت میں حضور علیہ السلام نے وصال فرمایا۔ ہرقل کے نام حضور علیہ السلام نے صلح حدیبیہ کے بعد ۶ھ میں بذریعہ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ دعوتِ اسلام کا خط بھیجا تھا۔ علامہ قسطلانی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ ہرقل نے ازراہِ تعظیم اس خط کو سونے کے ڈبے میں رکھا اور یہ خط برابر ایک بادشاہ سے دوسرے بادشاہ تک منتقل ہوتا رہا اور یہ سب نامہ اقدس کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ بادشاہِ فرنگ نے ملک منصور قلاؤن صالحی کے زمانہ میں سیف الدین فلیج کو ایک سونے کا صندوق دکھایا اور اس میں سے ایک خط نکالا جس کے اکثر حروف مدھم ہو گئے تھے۔ اس نے کہا یہ تمہارے پیغمبر کا خط ہے جو انھوں نے ہمارے دادا قیصر کے نام بھیجا تھا۔ ہمارے باپ دادا کی یہ وصیت تھی کہ اس کو احتیاط سے رکھنا۔ جب تک یہ خط تمہارے پاس رہے گا تمہارے خاندان میں سلطنت باقی رہے گی۔

۸۔ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ ایک نہایت حسین صحابی ہیں۔ ان کا نام زید ہے۔ حضرت جبریل امین علیہ السلام بحضور نبوی علیہ السلام اکثر انہیں کی صورت اختیار کر کے حاضری دیا کرتے تھے۔ آپ قدیم الاسلام ہیں۔ بدر کے علاوہ تمام معرکوں میں شریک ہوئے۔ آپ نے امیر معاویہ کی خلافت کا زمانہ دیکھا۔ صحابہ میں دحیہ نامی صرف یہی ہیں۔

سلاطین کو اسلام کی دعوت

۹۔ ۶ھ حدیبیہ کی صلح کے بعد وہ وقت آیا کہ اسلام کا پیغام تمام دنیا کے کانوں تک پہنچا دیا جائے۔ اس بنا پر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دن تمام صحابہ کو جمع کیا اور خطبہ دیا۔ اے لوگو! خدا نے مجھے تمام دنیا کے لیے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ جاؤ میری طرف سے پیغام حق ادا کرو۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام نے قیصرِ روم، شہنشاہ عجم، عزیز مصر اور رؤسائے عرب کے نام دعوت اسلام کے خطوط ارسال فرمائے۔ جو لوگ خطوط لے کر گئے اور جن کے نام لے کر گئے ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ حضرت دحیہ کلبی، قیصرِ روم
۲۔ عبداللہ بن حذافہ سہمی، خسرو پرویز کجکلاہِ ایران
۳۔ حاطب بن بلتعہ، عزیز مصر
۴۔ عمرو بن اُمیہ، نجاشی بادشاہِ حبش
۵۔ سلیط بن عمرو بن عبد شمس، رؤسائے یمامہ (تاریخ ابن ہشام و طبری)

۶- شجاع بن وہب بن الاسدی، رئیس حدودِ شام حارث غسانی

ہرقل کے نام جو حضور علیہ السلام نے تحریر فرمایا تھا۔ وہ حضرت دحیہ کلبی کے ذریعہ ارسال فرمایا تھا۔ ایرانیوں نے چند برس پہلے بلادِ شام پر حملہ کر کے رومیوں کو شکست دی تھی۔ جس کا ذکر کتابِ مجید کی اس آیت غُلِبَتِ الرُّوم میں ہے۔ ہرقل نے اس کے انتقام کے لیے بڑے سروسامان سے فوجیں تیار کیں اور ایرانیوں پر حملہ کر کے ان کو شکست دی۔ اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہرقل حمص سے بیت المقدس آیا تھا اور اس شان سے آیا تھا کہ جہاں چلتا تھا زمین پر فرش اور پھول بچھائے جاتے تھے (فتح الباری)

شام میں عرب کا جو خاندان قیصر کے زیرِ حکومت رہا تھا وہ غسانی خاندان تھا اور اس کا پایہ تخت بصریٰ تھا جو دمشق کے علاقہ میں ہے اور آج کل حوران کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں اس علاقہ کا تخت نشین حارث غسانی تھا۔ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کا نامہ مبارک یہیں سے بصریٰ میں حارث غسانی کو لا کر دیا۔ اس نے قیصر کے پاس بیت المقدس بھیج دیا۔ قیصر کو جب حضور علیہ السلام کا نامہ مبارک ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے تو لاؤ۔ اتفاق یہ کہ ابوسفیان (جو اس وقت ایمان نہیں لائے تھے) تجارِ عرب کے ساتھ غزہ میں مقیم تھے قیصر کے آدمی ابوسفیان کو غزہ سے جا کر لائے۔ پھر قیصر نے بڑے سامان سے دربار منعقد کیا۔ خود تاجِ شاہی پہن کر تخت پر بیٹھا۔ تخت کے چاروں طرف بطارقہ و قسیس اور رہبان کی صفیں قائم کیں۔ پھر اہلِ عرب کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ تم میں سے اس مدعی نبوت کا رشتہ دار کون ہے؟ حضرت ابوسفیان نے کہا۔ میں ہوں۔ پھر قیصر نے ابوسفیان سے سوالات کیے جن کا ذکر حدیثِ بالا میں ہے اس کے بعد قیصر کو یقین ہو گیا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سچے نبی ہیں۔ اور آپ وہی ہیں جن کی آمد کا ذکر کتبِ سماویہ میں ہے۔ اس لیے اس نے رومیوں سے کہا کہ دین و دنیا کی بھلائی چاہتے ہو تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر لو۔ پھر اس نے حضور علیہ السلام کا نامۂ اقدس دربار میں پڑھ کر سنایا۔ قیصر کی زبان سے یہ کلمات سن کر رؤسائے روم برہم ہو گئے۔ قیصر نے جب یہ صورت دیکھی تو نزاکتِ وقت کو محسوس کر کے کہنے لگا۔ رومیو! میں تمہارا امتحان لینا چاہتا ہوں کہ تم اپنے مذہب پر کس قدر ثابت قدم ہو۔ یہ سن کر رومی سجدہ میں گر گئے اور قیصر سے راضی ہو گئے۔ قیصر کے دل میں گو اسلام کا نور آ چکا تھا اور اس پر اسلام کی حقانیت آفتاب کی طرح روشن ہو گئی تھی مگر تخت و تاج کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ گئی اور قیصر نے اسلام قبول نہیں کیا۔

۱۰- حدیثِ ہذا کا باب سے تعلق یہی ہے کہ اس میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ جمیلہ و خصائلِ حمیدہ کا بیان ہے۔ امام نے وحی کے باب میں اس حدیث کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ جس ہستی مقدس پر وحی آتی ہے اس کے یہ اوصاف ہوتے ہیں۔ وہ شریف النسب ہوتا ہے اور اس کا اخلاق بلند اور سیرت بے داغ ہوتی ہے وہ کذب و دروغ و عہد شکنی وغیرہ ذالک عیوب سے پاک و منزہ ہوتا ہے اور دوست و دشمن اس کی پاکدامنی، راستبازی و صفاتِ حسنہ کے معترف ہوتے ہیں۔ نبی کے تمام ظاہری افعال و اعمال اور کردار کے پیچھے نیت بھی نہایت پاک اور خالص ہوتی ہے۔ وہ کسی دنیاوی منفعت اور مادی جاہ و اقتدار کے لیے حسنِ اخلاق و نیک کرداری کا مظاہرہ نہیں کرتا۔

مسائلِ حدیث

حدیثِ ہذا مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ ایک کافر کو اگر دعوتِ اسلام دی جائے تو اس کے دنیاوی اعزاز کا لحاظ رکھ کر خطاب کیا جائے اور دعوتی خط میں نرم الفاظ لکھے جائیں جیسا کہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہرقل رومِ کو عظیم الرُّوم کے الفاظ سے خطاب کیا۔ یعنی اے وہ کہ رومی جس کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؛ حضور علیہ السلام کا یہ مکتوب اور اس کی ساری عبارت " اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ " کے مطابق ہے ۲۔ خط کی ابتدا بسم اللہ سے کی جائے اگرچہ مکتوب الیہ کافر ہی ہو۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط کی ابتدا جو انھوں نے بلقیس کے نام بھیجا یوں کی تھی۔ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے خط میں پہلے اپنا نام اس لیے لکھا تاکہ اگر بلقیس گالی دے تو اسمِ الٰہی اس کی زد سے بچا رہے (عینی جلد ۱ ص ۱۱۶) ۳۔ خبرِ واحد پر عمل کا وجوب ثابت ہوا ورنہ حضور علیہ السلام صرف حضرت دحیہ کلبی کو نہ بھیجتے ۴۔ خطبہ میں اور خطوط میں اَمَّا بَعْدُ لکھنا مستحب ہے ۵۔ اہلِ کتاب میں سے جو شخص حضور علیہ السلام پر بھی ایمان لے آئے تو وہ دو اجر کا مستحق ہے ۶۔ علامہ خطابی نے کہا کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ حضور علیہ السلام نے جو منع فرمایا ہے کہ دشمن کے ملک میں قرآن کو ساتھ لے کر سفر نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پورا (قرآنِ پاک یا اکثر آیات کا مجموعہ جیسے پنجسورہ وغیرہ کے ساتھ سفر نہ کیا جائے۔ البتہ ایک دو آیتیں لکھی ہوئی ہوں تو سفر کر سکتے ہیں لیکن یہ اس صورت میں منع ہے کہ کافر حکومت سے یہ خطرہ ہو کہ وہ قرآنِ پاک کی توہین کرے گی یا اس کو چھین لے گی ۷۔ جنگ سے پہلے کفار کو اسلام کی دعوت دینا واجب ہے۔ دعوت سے قبل جنگ کرنا حرام ہے اور اگر ان کو دعوتِ اسلام پہنچ چکی ہے تو پھر جنگ سے قبل دوبارہ اسلام کی دعوت دینا مستحب ہے ۸۔ بعض علماء نے اسی حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ کافر اور بے وضو شخص کو ایسی کتاب یا خط کا چھونا جائز ہے جس میں ایک دو آیاتِ قرآنیہ لکھی ہوں۔ جیسے حضور علیہ السلام کے مکتوب بنام ہرقل میں قرآنِ پاک کی آیت لکھی ہوئی تھی۔ صاحبِ ہدایہ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ حائضہ عورت اور جنبی قرآنِ پاک کا ایک لفظ بھی نہ پڑھے (شَيْئًا مِنَ الْقُرْآنِ) حدیث کے یہ مطلق الفاظ ہیں۔ جو اس امر پر دال ہیں کہ حائضہ و جنبی کو ایک پوری آیت تو درکنار آیت سے کم کا پڑھنا بھی جائز نہیں ہے۔ البتہ کتبِ شرعیہ و فقہیہ جس میں آیاتِ قرآنیہ بھی لکھی ہوتی ہیں۔ محدث اس کو آستین کے دامن سے پکڑ سکتا ہے۔ اسی طرح بچوں کو پڑھنے کے لیے قرآن دے سکتے ہیں اگرچہ وہ بے وضو ہوں کیونکہ بار بار وضو کی تکلیف دینے میں حرج ہوتا ہے ۹۔ خطبہ یا تقریر یا خط میں فصیح و بلیغ الفاظ کا استعمال کرنا جائز ہے جیسے حضور علیہ السلام کا یہ خط فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے ۱۰۔ جھوٹ ہر امت میں عیب سمجھا گیا ہے یعنی اس کی قباحت بین الاقوامی چیز ہے ۱۱۔ انبیاء کرام افضل ترین افرادِ انسانیہ سے ہوتے ہیں ۱۲۔ یہ کہ اہلِ کتاب کو اس امر کا علمِ قطعی حاصل تھا کہ حضور علیہ السلام نبی صادق ہیں اور علاماتِ نبوت بھی ان کے علم میں تھیں۔ کتبِ سماویہ میں حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے خصائل فضائل کا بالتصریح ذکر تھا مگر بغض و عناد اور ذاتی مفاد نے ان لوگوں کو قبولِ حق سے باز رکھا۔

کتاب الایمان

۱- چونکہ وحی خواہ وہ جلی ہو یا خفی دین کی اصل ہے اس لیے باب بدء الوحی کو امام بخاری نے بطور مقدمۃ الکتاب ذکر کیا اور اب اس کے بعد سب سے پہلے ایمان کی بحث شروع کر دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے لیے سب سے پہلا واجب ایمان ہے۔ ہر خیر کا مبدا اور ہر کمال کا منشا ایمان ہے۔ ایمان کو تمام امور پر فضیلت مطلقہ حاصل ہے اور دارین کی نجات ایمان پر موقوف ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ایمان کو بیان کرنا ضروری ہے۔

۲- کتاب الایمان کے بعد بخاری میں کتاب الصلوٰۃ ہے۔ کیونکہ نماز کا مرتبہ ایمان کے بعد ہے اور قرآن و حدیث میں بھی نماز کو ایمان کے بعد رکھا گیا ہے۔ نماز دین کی بنیاد ہے اور دن میں پانچ وقت ہر مسلمان کو اس سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لیے ایمان کے بعد صلوٰۃ کا بیان ضروری ہے۔

۳- صلوٰۃ کے بعد بخاری میں کتاب الزکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ ایمان کے تیسرے اور نماز کے بعد دوسرے درجہ پر ہے اور شارع نے زکوٰۃ کا ذکر صوم سے زیادہ کیا ہے اس لیے کتاب الصلوٰۃ کے بعد کتاب الزکوٰۃ لائے۔

۴- زکوٰۃ کے بعد حج کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت تو محض مالی ہوگی یا بدنی یا مالی اور بدنی دونوں سے مرکب ہوگی۔ نماز محض بدنی عبادت ہے۔ زکوٰۃ محض مالی عبادت ہے اور حج مالی اور بدنی دونوں سے مرکب ہے اور مفرد مرکب سے پہلے ہوتا ہے اس لیے نماز اور زکوٰۃ کے بعد حج کا ذکر کیا۔

۵- بخاری میں حج کے بعد صوم کا ذکر ہے۔ حالانکہ فقہاء زکوٰۃ کے بعد صوم کا ذکر کرتے ہیں۔ فقہاء نے صلوٰۃ کے بعد صوم کو اس لیے ذکر کیا کہ یہ عبادت ہر سال ادا کرنی پڑتی ہے۔ برخلاف حج کے کہ وہ عمر میں ایک بار ہی فرض ہے اور امام بخاری نے حج کو صوم سے پہلے ذکر کیا کیونکہ احادیث مشہورہ میں ان دونوں کا اسی ترتیب سے ذکر ہے۔

اسلام کی ہمہ گیری

دنیا کے مذاہب میں وہ کاملیت نہیں ہے جو اسلام میں ہے۔ دنیا کے مذاہب دین و دنیا کے کسی ایک شعبہ پر زور دیتے ہیں اور دوسرے شعبہ کو تشنۂ تکمیل چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے مذاہب کو اپنے دینی و دنیوی مسائل کی تکمیل کے لیے مذہب سے باہر کسی تعلیم کو اپنانے اور اس سے ہدایت لینے کی ضرورت پڑتی ہے مگر دین اسلام ایک کامل قانون اور مکمل شریعت ہے اور اس کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ یہ حیات انسانی کے ہر شعبے پر حاوی ہے کیونکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اصلاح انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا کہ جس کی تکمیل اپنے ارشاد و عمل سے نہ کر دی ہو۔ اسلام میں حضور علیہ السلام کے سوا اور کچھ نہیں۔ عبادات ہوں یا اخلاق انسان کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ۔ ان سب کا ماخذ و مرکز ذات نبوی ہے۔

لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے چار ابواب پر

منقسم ہے۔

۱۔ خالق و مخلوق کے درمیان جو رابطہ ہے اس کا تعلق صرف دل سے ہے تو اس کا نام عقیدہ اور ایمان ہے۔
۲۔ اور اگر قلبی حالات کے ساتھ جسم و جان اور مال و جائداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے ۳۔ باہم انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو تعلق ہے اور اس حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہوتے ہیں اگر ان کی حیثیت قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے ۴۔ اور اگر قانون کی حیثیت نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔

غرضیکہ دین اسلام عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق انہیں چاروں کا مجموعہ ہے اور ان میں ایمان اور عقیدہ تمام اعمال و افعال کی اصل ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے ایمان کے متعلق گفتگو کی جائے کیونکہ یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے۔

عقیدہ کی اہمیت اور ضرورت

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ عقیدہ و خیال کے بغیر حیاتِ انسانی کی بقا ناممکن ہے۔ عقیدہ کے عام معنی غیر متزلزل اور پختہ اصول خیالات کے ہیں۔ یہی اصولی خیالات انسان کے ارادہ اور عمل کے محرک ہوتے ہیں۔ خیال کے بغیر ارادہ اور عمل کا ظہور ناممکن ہے ایک معمار مکان بناتا ہے تو پہلے اس کے ذہن میں خیال ہوتا ہے۔ وہ خیال اس کو ارادہ پر مجبور کرتا ہے اور ارادہ عمل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ عمل اور ارادہ کا دار و مدار خیال اور عقیدہ پر ہے۔ جسم انسانی میں دل ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام اقلیم بدن پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہی گوشت کا وہ ٹکڑا ہے جس کو عقیدہ، خیال یا ضمیر سے موسوم کرتے ہیں۔ معلم کائنات نے بھی دل ہی کو تمام اعضاءِ انسانی میں نیکی و بدی کا مرکز قرار دیا ہے۔

اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا۔ ہاں وہ ٹکڑا دل ہے۔

قرآنِ حکیم نے دل کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں ۱۔ قلبِ سلیم، جو ہر گناہ سے پاک رہ کر نجات کے راستہ پر چلتا ہے ۲۔ قلبِ آثیم، یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے (فَاِنَّہٗ اٰثِمٌ قَلْبُہٗ) ۳۔ قلبِ منیب، رجوع ہونے والا دل جو اگر کبھی بھٹکتا ہے تو فوراً نیکی کی طرف پلٹ آتا ہے۔ غرضیکہ انسانی مشین کا ہر پرزہ اسی دل کے ارادہ و نیت کی طاقت سے چلتا ہے۔ اسی لیے حضور اکرم علیہ السلام نے فرمایا۔ "تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے"۔

علمِ نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کے عمل و ارادہ پر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔ انسان کی عملی اصلاح کے لیے اس کی قلبی و دماغی اصلاح مقدم ہے لہٰذا صحیح اور صالح عمل کے لیے ضروری ہے کہ چند اصول اس طرح مان لیے جائیں کہ وہ دل کا غیر متزلزل اور غیر مشکوک عقیدہ بن جائیں اور اسی

عقیدہ کے تحت ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔

عقیدہ اعمال کی اساس ہے

قرآنِ پاک نے ایمان کا ذکر عمل کے ذکر سے لازمی طور پر پہلے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں قرار دیا کیونکہ ایمان و عقیدہ کے عدم سے اس مخلصانہ ارادہ کا عدم ہو جاتا ہے۔ جس پر حُسنِ عمل کا مدار ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالے عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عبداللہ بن جدعان کے متعلق پوچھا۔ جس نے جاہلیت کے زمانہ میں نیکی کے کام کیے تھے۔ کیا اس کو ثواب ملے گا؛ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ نہیں کیونکہ اس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ الہی میرے گناہوں کو قیامت کے دن بخش دے۔ یعنی اس نے عمل تو نیک کیے مگر عمل کا جس عقیدہ پر مدار تھا وہ اس میں نہ پایا گیا۔ معلوم ہوا کہ عقیدہ عمل کی اساس ہے اور عقیدہ کے بغیر عمل بے بنیاد ہے۔

ایمان کے بغیر عمل بے کار ہے

قرآنِ حکیم نے تمام اعمال کی اساس ایمان کو قرار دیا ہے اور ایمان سے محروم افراد کے کاموں کی مثال راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا چنانچہ ارشاد ہے:۔

۱۔ مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ کَرَمَادِنِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ (ابراہیم)

جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا۔ ان کے اعمال کی مثل اس راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی۔

۲۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ کَسَرَابٍ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْئًا (نور)

جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں جو میدان میں ہو جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔

یہ اور اسی مضمون کی متعدد آیات ہیں جن میں اس امر کی تصریح ہے کہ ایمان کے بغیر عمل بیکار ہے اور ایمان سے محروم افراد خواہ کتنے ہی نیک عمل کریں وہ سراب اور راکھ کی طرح ہیں جیسے سُراب سے پیاسا پانی نہیں پاتا۔ راکھ کے ڈھیر سے کچھ نہیں مل سکتا۔ اسی طرح بے ایمان کے اعمال کا حال ہے۔

ایمان اور کفر کی تعریف

خدا کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے اور خدا کی اطاعت اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ جب کہ ہمیں اس کی پسند و ناپسند کا علم ہو ہم اپنے کسی عزیز یا دوست کی پسند و ناپسند کو اس وقت تک نہیں جان سکتے جب تک کہ وہ خود اپنے کلام سے یا طرزِ عمل سے اس کا اظہار نہ کر دے تو جب عقلِ انسانی اپنے ہم جنس کی پسند و ناپسند کے ادراک سے قاصر ہے تو اس ہستی مقدس کی پسند و ناپسند کو صرف عقل کیسے جان سکتی ہے جس کا ادراک ہی سرحد عقل سے باہر ہے۔ دنیا میں انبیاء کرام کے بھیجنے کی حکمت ہی یہ ہے کہ انسان ان کے ذریعے اللہ کی پسند و ناپسند سے واقف ہو جائے۔

پس اس دنیا میں خدا کے ماننے کا صرف یہی ایک حل ہے کہ اس کے رسول کی لائی ہوئی ہدایات کو دل و زبان سے تسلیم کیا جائے کیونکہ رسول خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ انھیں کے ذریعہ مخلوق کی ہدایت فرماتا ہے اور انھیں کے ذریعے اللہ تعالےٰ کی پسند و ناپسند کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے قبول کرنے کا نام اسلام ہے اور ان کی ہدایات کو قبول نہ کرنے کا نام کفر ہے۔

مذہب کا بنیادی مسئلہ کفر و ایمان ہے۔ اسی لیے قرآن کی سب سے پہلی سورہ (بقرہ) میں اس کو بیان کیا گیا اور پورے عالم کو تین گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ مومن، کافر، منافق۔ سورہ بقرہ کی ابتدائی پانچ آیتوں میں مومنین کی شان کا بیان ہے اور بعد کی دو آیتیں کفار کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد تیرہ آیتیں منافقین کے حال میں ہیں۔ اگرچہ کافر و منافق اصل میں ایک ہی گروہ ہے۔ لیکن چونکہ منافق کی ظاہری صورت عام کفار سے مختلف ہوتی ہے اور منافقین کا گروہ بہ نسبت کھلے ہوئے کافروں کے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے ان کے حالات کا بیان تیرہ آیتوں میں زیادہ تفصیل سے کیا گیا۔

۱۔ الٓمّٓ ۔۔۔ مُفْلِحُوْنَ تک پانچ آیتوں میں مومن اور ایمان کا اجمالی ذکر ہے۔ الذین یؤمنون بالغیب یعنی وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ غیب سے اس جگہ وہ تمام اعتقادات مراد ہیں جو انسان کی نظر اور مشاہدہ سے پوشیدہ ہیں۔ جیسے قیامت، جنت، دوزخ، پلصراط، میزانِ عدل وغیرہ (خازن و ابن کثیر)۔ اس ایمانِ اجمالی کی تفصیل بعد کی تیسری آیت میں کر دی۔

وَالذین یؤمنون بما اُنزل الیك وما انزل من قبلك وبالاخرة هم یوقنون	جو حضور پر نازل شدہ کتاب اور شریعت پر ایمان لائے اور گذشتہ انبیاء پر نازل شدہ وحی اور شریعت پر بھی اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔

یہاں ایمان کے سب سے پہلے جزو ایمان باللہ کا صراحۃً ذکر اس لیے نہیں فرمایا کہ جب اللہ ہی پر ایمان نہ ہوگا تو اس کے اصولوں اور وحی پر ایمان کیونکر ہو سکے گا۔ اسی سورۃ کے ختم پر جب کہ ایمان کے مفہوم کی تشریح فرمائی گئی تو وہاں "ایمان باللہ" کو صریح لفظوں میں ذکر کیا گیا۔ "کل اٰمن باللهِ و ملٰئکته وکتبه ..... الخ" چنانچہ ایمان مجمل و مفصل جو مشہور ہیں اس کا مبنیٰ یہ ہے کہ ایمان مجمل سورہ بقر کی پہلی آیات سے اور ایمان مفصل اس کی آخری آیات سے اخذ کیا گیا۔

پس آیت مذکورہ سے ایمان کے تین بنیادی اصول معلوم ہوئے۔ اللہ پر ایمان لانا، رسول اللہ اور انبیاء سابقین اور ان سب کی وحیوں پر ایمان لانا، آخرت پر ایمان لانا۔ یہی تین چیزیں دراصل ایمان کے اصول ہیں باقی سب فروع ہیں امام غزالی نے فیصل التفرقہ فی الاسلام والزندقہ میں لکھا۔

اُصُوْلُ الْاِیْمَانِ ثَلٰثَۃٌ اَلْاِیْمَانُ بِاللّٰہِ وَبِرَسُوْلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا	ایمان کے اصول تین ہیں۔ اللہ تعالےٰ پر ایمان لانا، اس کے رسول پر ایمان لانا اور قیامت پر ایمان اس

عداد فروع | کے سوا سب فروع ہے۔

اور ان اصولوں کو بھی مختصر کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ "ایمان بالرسول" میں سب اصول آجاتے ہیں کیونکہ جب تک اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ ہو رسول پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا اور رسول پر ایمان ہو جائے تو یوم قیامت پر ایمان خود اس کے اندر داخل ہے کیونکہ "ایمان بالرسول" کا مطلب یہ ہے کہ رسول کی تمام ہدایتوں پر ایمان لایا جائے اسی لیے ائمہ اسلام نے ایمان کی تعریف یوں فرمائی۔

هُوَ التَّصْدِيْقُ بِمَا جَآءَ بِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ تَعَالٰى اَىْ تَصْدِيْقَ النَّبِىِّ بِالْقَلْبِ فِىْ جَمِيْعِ مَا عُلِمَ بِالضَّرُوْرَةِ مَجِيْئُهٗ بِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِجْمَاعاً

ایمان ان اُمور کی تصدیق کا نام ہے جو اللہ کی طرف سے آئے یعنی اجمالی طور پر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی دل سے تصدیق کرنا ہر اس چیز میں جو آپ اللہ کی طرف سے لائے جس کا ثبوت آپ سے قطعی طور پر ہو۔

ثبوتِ قطعی ضروری و بالضرورۃ وضروریاتِ دین کی تعریف

۱۔ ثبوتِ قطعی :۔ یعنی وہ امور جو حضور علیہ السلام سے ہم تک بطریق تواتر پہنچے، کا ثبوت قطعی ہے جیسے تعداد رکعات، زکوٰۃ کی مقدار، قرآن حکیم وغیرہ۔ تواتر کے معنی یہ ہیں کہ حضور علیہ السلام سے لے کر ہم تک ہر قرن اور ہر زمانہ میں دنیا کے مختلف خطوں میں اس بات کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والے اتنی تعداد میں رہے ہوں کہ ان سب کا غلطی یا کذب پر متفق ہو جانا عقلاً محال ہے۔

۲۔ ضروری و بالضرورۃ :۔ عرف فقہاء و متکلمین میں ضروری و بالضرورۃ کا مطلب یہ ہے کہ تواتر کے ساتھ ساتھ اس بات کی شہرت تمام خاص و عام مسلمانوں میں اس درجہ کی ہو جائے کہ عوام تک اس سے واقف ہوں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا فرض ہونا، نبوت کا حضور علیہ السلام پر ختم ہونا وغیرہ۔

۳۔ ضروریات :۔ جو امور حضور علیہ السلام سے بذریعہ تواتر اس درجہ شہرت و بداہت کے ساتھ ثابت ہوں کہ ہر خاص و عام اس سے باخبر ہو۔ ان کو فقہاء و متکلمین کی اصطلاح میں ضروریات دین سے موسوم کیا جاتا ہے۔

هُوَ مَا يَعْرِفُ الْخَوَاصُّ وَالْعَوَامُّ اَنَّهٗ مِنَ الدِّيْنِ لِوُجُوْبِ الْاِعْتِقَادِ التَّوْحِيْدِ وَالرِّسَالَةِ وَالصَّلٰوةِ الْخَمْسِ وَاَخَوَاتِهَا يَكْفُرُ مُنْكِرُهٗ (رد المحتار صـ۲۶۶، جلد ۱)

ضروریاتِ دین وہ اُمور ہیں جن کو ان کی شہرت کی وجہ سے خواص و عوام سب ہی دین کی ضروری باتیں سمجھتے ہیں جیسے توحید، رسالت، پانچ نمازیں اور اسی کے مثل اور باتیں جن کا منکر کافر ہوتا ہے۔

۴۔ علامہ شہاب الدین ابن حجر اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں :۔

۱۔ ثم المعلوم بالضرورة من الشرع قسمان احدهما مما يعرفه الخاصة والثانى ما قد يخفى على بعض العوام

پھر ضروریات دین کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جسے خاص و عام جانتا ہو اور عام جو شرائط کا خواص ہو اور دوسری وہ ہے جو کبھی بعض عوام پر مخفی رہتی ہے

ولا ینافی فی ھذا قولنا انہ معلوم بالضرورة لان المراد من مارس الشریعة علم منھا ما یحصل بہ العلم الضروری بذلك وھذا یحصل بعض الناس دون بعض بحسب الممارسة و کثرتھا او قلتھا او عدمھا فالقسم الاول من انکرہ من العوام والخواص فقد کفر لانہ کالمکذب للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فی خبرہ

۲- والقسم الثانی من انکرہ من العوام الذین لم یحصل عندھم من ممارسة الشرع ما یحصل بہ العلم الضروری لم یکفروا ان کانت کثرة الممارسة توجب للعلماء العلم الضروری

(فتاوی حدیثیہ صہ۱۴۲)

۳- الا اذا ذکر لہ اھل العلم انہ من الدین وانہ قطعی فتمادی فیما ھو علیہ عناداً فیکفر بظھور التکذیب منہ حینئذ

(فتاوی حدیثیہ صہ۱۴۲)

اس کے باوجود اسے معلوم بالضرورۃ کہا جائیگا کیونکہ معلوم بالضرورۃ سے وہ مسائل مراد ہیں جن کا ماہرینِ شریعت کو علم ضروری ہے اور یہ قلت و کثرت مہارت کی وجہ سے بعض کو معلوم ہوتا ہے اور بعض اس سے بے خبر رہتے ہیں۔ قسم اوّل کا انکار عوام و خواص میں سے جو شخص بھی کرے وہ کافر قرار پائے گا اس لیے کہ وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی خبر میں حضور کی تکذیب کرتا ہے۔

اور قسم ثانی کا انکار اگر عوام میں سے وہ لوگ کریں جنہیں شریعت میں ممارست تامہ حاصل نہیں جس کی وجہ سے انہیں علمِ ضروری حاصل ہو جاتے تو وہ کافر نہیں ہوں گے۔ اگرچہ کثرتِ مہارت علمار کے لیے اس کے علمِ ضروری کو واجب کرتی ہے۔

لیکن جب اہلِ علم قسم ثانی کے منکر کو یہ بتا دیں کہ یہ مسئلہ دین سے ہے اور قطعی ہے۔ اس کے باوجود وہ منکر اپنی بات پر عناداً اڑا رہے تو اب اس کی بھی تکفیر کی جائے گی کیونکہ (معلوم ہو جانے کے بعد انکار) سے حضور علیہ السلام کی تکذیب کا ظہور ہو گیا۔

ان عبارات سے واضح ہوا کہ ضروریاتِ دین کی دو قسمیں ہیں۔ قسم اوّل تو یہ ہے جس کا دینی ضروری ہونا خواص کو معلوم ہوتا ہے اور ان عوام کو بھی معلوم ہوتا ہے جو علماء سے ربط و ضبط رکھتے ہیں تو قسم اوّل کا انکار خواہ عوام کریں یا خواص بہرحال یہ کفر قطعی ہے اور دوسری قسم وہ ہے جس کا ضروری دینی ہونا بعض عوام پر مخفی ہوتا ہے تو اگر عوام میں سے کوئی انکار کر دے تو اسے کافر قرار نہیں دیں گے لیکن جب کہ علماء اس کو بتا دیں کہ یہ مسئلہ بھی ضروری و قطعی ہے اور اس پر بھی وہ ازراہِ عناد انکار پر اڑا رہے تو اب اس کی تکفیر کی جائے گی۔

الغرض ضروریاتِ دین اصطلاحِ شریعت میں انہیں امور کو کہا جاتا ہے جو حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم سے بطریقِ تواتر ثابت ہوں اور عام طور پر مسلمان ان امور کو جانتے ہوں۔ اسلام و ایمان کے لیے ان امور کا تسلیم کرنا لازم و ضروری ہے اور ان کا انکار کفر ہے۔

فائدہ | ضروریاتِ دین پر ایمان کے لیے ان کی پوری تفصیل کا معلوم ہونا ضروری نہیں۔ نفسِ ایمان کے لیے

اجمالی تصدیق بھی کافی ہے۔ ایمانِ اجمالی کے الفاظ یہ ہیں :۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَ قَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ	یعنی اللہ پر جیسا کہ وہ اپنی ذات و صفات میں ہے ایمان لایا اور میں نے اس کے تمام احکام قبول کئے۔

اس کلمہ میں کہ خدا پر جیسا کہ وہ اپنی ذات و صفات میں ہے۔ ایمان لانے کا مجمل طور پر اقرار ہے مطلب یہ ہوا کہ جیسا کہ خدا کی ذات و صفات کے متعلق دین سے جو بھی تفصیل معلوم ہوگی اس پر ایمان لانے کا اعتراف بھی ہے اسی طرح یہ جملہ کہ اس کے تمام احکام قبول کرتا ہوں۔ یہ بھی مجمل ہے مگر بایں طور پر کہ ہر وہ حکم جس کا حکم الٰہی ہونا ثابت ہوگا۔ اس پر ایمان لانے کا بھی اقرار ہے اس سے واضح ہوگیا کہ ایمانِ مجمل میں ایمان مفصل بہرحال داخل ہوتا ہے

اور ایمان مفصل کے الفاظ یہ ہیں :۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ	اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، آخرت پر، نیکی و بدی پر اللہ کی طرف سے اور مرنے کے بعد جی اُٹھنے پر ایمان لاتا ہوں۔

الغرض نجات کے لیے مجمل طور پر ایمانیات کو قبول کرلینا کافی ہے۔

واضح ہو کہ امورِ ایمانیہ کی جو تشریح و تفصیل کتاب و سنت نے کردی ہے۔ اس کو بعینہٖ تسلیم کرنا ضروری ہے اور ان کا اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم و معنیٰ متعین کرنا یا کسی قسم کی ترمیم کرنا گمراہی و بے دینی ہے ۲۔ ایمان بہت سی مجموعی چیزوں کی تصدیق کا نام ہے۔ تو کفر میں تمام ایمانیات کا انکار و تکذیب ضروری نہیں۔ بلکہ ان میں سے کسی ایک چیز کی تکذیب و انکار بھی کفر ہے۔ خواہ باقی تمام امورِ ایمانیہ کو صدقِ دل سے قبول کیا جائے۔

اس تفصیلی گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ

ایمان ۔حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی دل سے تصدیق کرنے اور زبان سے اقرار کرنے کو کہتے ہیں۔ ہر اس چیز میں جس کا ثبوت آپ سے قطعی و بدیہی طور پر ہوچکا ہے۔

مومن ۔ وہ شخص ہے جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی دل سے تصدیق کرے۔ ہر اس امر میں جس کا ثبوت آپ سے قطعی طور پر ہوا ہے۔

اسلام ۔ اللہ و رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار بشرطیکہ اس کے ساتھ ایمان تصدیق قلبی موجود ہو۔

مسلمان ۔ وہ شخص جو اللہ و رسول کی اطاعت کا اقرار کرے بشرطیکہ اس کے ساتھ تصدیق قلبی بھی ہو۔

کفر ۔ جن امور کی تصدیق ایمان میں ضروری ہے۔ ان میں سے کسی ایک امر کی تکذیب و انکار کفر ہے۔

کافر ۔ وہ شخص ہے جو ایمانیات میں سے کسی ایک چیز کا دل سے انکار یا زبان سے تکذیب کردے۔

اسلام، ایمان، مسلم و مومن میں فرق لغتہً ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور اسلام اطاعت و فرمانبرداری

کا۔ ایمان کا محل قلب ہے اور اسلام کا محل قلب اور سب اعضا و جوارح ہیں۔ لیکن شرعاً ایمان بغیر اسلام کے اور اسلام بغیر ایمان کے معتبر نہیں۔ یعنی اللہ و رسول کی محض دل سے تصدیق کرلینا شرعاً اس وقت تک معتبر نہیں۔ جب تک زبان سے اس تصدیق کا اظہار اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار نہ کرے اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار اس وقت تک معتبر نہیں جب تک اس کے ساتھ دل میں اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ ہو۔ غرضیکہ از روئے لغت ایمان و اسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں اور قرآن و حدیث میں اسی لغوی مفہوم کی بنا پر ایمان و اسلام کے اختلاف کا ذکر ہے لیکن خود قرآن و حدیث ہی کی تصریحات کے مطابق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شرعاً کوئی ایمان بدون اسلام کے یا اسلام بدون ایمان کے معتبر نہیں ہے۔ اسی مضمون کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ایمان و اسلام کی مسافت تو ایک ہے لیکن ابتداء و انتہاء کا ہے۔ ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر پر منتہی ہوتا ہے اور اسلام ظاہر سے شروع ہو کر قلب پر منتہی ہوتا ہے۔ اگر قلبی تصدیق ظاہری اقرار تک نہ پہنچے تو وہ تصدیق ایمان معتبر نہیں۔ اسی طرح ظاہری اقرار و اطاعت اگر تصدیق قلبی تک نہ پہنچے تو وہ اسلام معتبر نہیں۔ چنانچہ قرآن نے کہا۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ اس سے واضح ہوگیا کہ اللہ کا دین اسلام ہے اور ہر وہ چیز جو اسلام نہ ہو وہ غیر مقبول ہے اور ظاہر ہے کہ ایمان بھی دین ہی ہے تو اگر ایمان، اسلام کا غیر ہوتا تو وہ مقبول نہ ہوتا لہٰذا اسلام اور ایمان کا ایک ہونا ثابت ہوا۔ شرح عقائد نسفی میں ہے۔

اَلْاِسْلَامُ وَالْاِیْمَانُ وَاحِدٌ	اسلام و ایمان شے واحد ہیں

علامہ شیخ کمال الدین ہمام شارح ہدایہ نے شرح مسامرہ میں فرمایا :۔

وَقَدِ اتَّفَقَ اَھْلُ الْحَقِّ وَھُوَ فَرِیْقَا الْاَشَاعِرَۃِ وَالْحَنَفِیَّۃِ عَلٰی تَلَازُمِ الْاِیْمَانِ وَالْاِسْلَامِ بِمَعْنٰی اَنَّہٗ لَا اِیْمَانَ یُعْتَبَرُ بِلَا اِسْلَامٍ وَعَکْسُہٗ	اہل حق نے اتفاق کیا اور وہ دونوں گروہ اشاعرہ و حنفیہ ہیں کہ ایمان و اسلام باہم متلازم ہیں بایں معنیٰ کہ اسلام بغیر ایمان کے اور ایمان بغیر اسلام کے معتبر نہیں۔

یعنی یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اگر اس موقع پر یہ شبہ پیدا کیا جائے کہ قرآن پاک میں ہے۔ قالت الاعراب اٰمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام بغیر ایمان کے بھی پایا جاتا ہے۔ جبھی تو قرآن حکیم نے اسلام کا اثبات اور ایمان کی نفی کردی۔ جواب یہ ہے کہ آیت میں جس اسلام کا ذکر ہے۔ وہ ہے جس میں تصدیق قلبی نہ ہو۔ جیسے جو شخص زبان سے کلمہ پڑھے اور دل میں تصدیق نہ ہو تو اس کا ایمان معتبر نہیں۔ تو آیت میں اعراب کے نفاق کا بیان ہے کہ تم لوگ ظاہری طور پر اطاعت کر رہے ہو مگر تمہارے دلوں میں تصدیق نہیں ہے اور شرعاً وہ اسلام معتبر ہے جس میں تصدیق قلبی بھی ہو۔ لہٰذا آیت کا مفہوم یہ نہیں کہ اسلام بغیر ایمان کے پایا جاتا ہے بلکہ اعراب کی منافقت کا بیان ہے۔ اگر کہا جائے کہ حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ

اسلام صرف اعمال ظاہرہ [illegible] جیسے حضور [illegible] نے فرمایا [illegible]
نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے اور حج کرے۔ جواب یہ ہے کہ حدیث [illegible] میں اسلام کے
ثمرات و علامات کا بیان ہے۔ یعنی ایمان و اسلام کی علامت یہ ہے کہ اسلام فرائض اسلامیہ پر عمل کرے۔ جبکہ
دوسری حدیث میں فرمایا۔ تم جانتے ہو۔ ایمان کیا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ ایمان یہ ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی شہادت دے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو ادا کرے۔ یہاں ایمان کی تعریف میں عمل
کو صرف اس لیے داخل کیا تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ اعمال صالحہ ایمان و اسلام کی علامتیں اور اس کے ثمرات
ہیں تو اسی طرح مذکورہ بالا حدیث میں اسلام کے ثمرات و علامات کا بیان ہے۔

کفر کی تعریف اور اس کے اقسام

کفر شریعت میں ایمان کی ضد ہے یعنی ایسے احکامِ شرعیہ جو ہم کو قطعی اور یقینی طور پر حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پہنچے ہیں انہیں نہ ماننا کفر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ کفر تکذیبِ رسول کا نام ہے پھر تکذیب کی چند صورتیں ہیں:-

۱۔ صراحتہً حضور علیہ السلام کو اللہ کا رسول ہی تسلیم نہ کرنا جیسے ہندو، سکھ و عیسائی تسلیم نہیں کرتے۔

۲۔ رسول تسلیم کرنے کے باوجود آپ کے کسی قول کو صراحتہً غلط یا جھوٹ قرار دینا۔ یعنی آپ کی بعض ہدایات کو ماننا اور بعض کی تکذیب کرنا۔

۳۔ یہ کہ کسی قطعی الثبوت قول یا فعلِ رسول کو یہ کہہ کر رد کر دینا کہ یہ حضور علیہ السلام کا قول یا فعل نہیں ہے۔

۴۔ یہ کہ قول و فعلِ رسول کو تسلیم کرتے ہوئے قرآن و حدیث میں ایسی تاویلاتِ باطلہ کرنا جو ان کے اجماعی مفہوم کو بدل دیں اور امت کے اجماعی عقائد کے خلاف کوئی نیا مفہوم ان سے پیدا ہو جائے۔ ایسی تاویل بھی تکذیبِ رسول علیہ السلام کے حکم میں ہے۔

کفر و ارتداد کا معیار کیا ہے؟

واضح ہو کہ کفر و ارتداد اس صورت میں عائد ہوتا ہے جب کہ حکم قطعی سے انکار کر دے۔ مثلاً یہ کہے کہ نماز فرض نہیں ہے۔ جنت کا کوئی وجود نہیں ہے یا کوئی شخص پانچ وقت کی نماز تو نہیں ہے پابند ہے مگر فرض و واجب نہیں مانتا تو یہ بھی کفر ہے اور دوسرا شخص جو عبادت کی [illegible] نماز نہیں پڑھتا مگر نماز کی فرضیت کا اعتقاد رکھتا ہے تو وہ مسلمان ہے اگرچہ فاسق و فاجر اور سخت گنہگار ہے۔

دوسرے یہ کہ ثبوت کے اعتبار سے احکامِ اسلامیہ کی مختلف قسمیں ہیں۔ تمام اقسام کا حکم ایک نہیں ہے تو کفر و ارتداد صرف ان احکام کے انکار سے عائد ہوتا ہے جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت بھی ہوں۔

قطعی الثبوت کے معنیٰ

یہ ہیں کہ ان کا ثبوت قرآن مجید یا ایسی احادیث سے ہو جن کے روایت کرنے والے حضور علیہ السلام سے لے کر آج تک ہر زمانہ، ہر قرن میں مختلف طبقات اور مختلف شہروں کے لوگ اس کثرت سے رہے ہیں کہ ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال سمجھا جائے۔

اسی کو اصطلاحِ حدیث میں تواتر اور ایسی حدیث کو احادیثِ متواترہ کہتے ہیں۔

قطعی الدلالت کے معنی

ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جو عبارت قرآن مجید میں اس امر کے متعلق وارد ہوئی ہے یا حدیثِ متواتر سے ثابت ہوئی ہے وہ اپنے مفہوم مراد کو صاف صاف بیان کرتی ہے کہ اس میں کسی قسم کا اُلجھاؤ اور ابہام بھی نہیں۔

پھر اس قسم کے احکام قطعیہ اگر عوامؒ و خواص میں مشہور و معروف ہوں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا فرض ہونا، جوا، شراب اور زنا کا گناہ ہونا۔ حضور علیہ السلام کا خاتم الانبیاء ہونا وغیرہ تو ایسے احکام قطعیہ کو ضروریاتِ دین سے موسوم کرتے ہیں جو اس درجہ مشہور نہ ہوں وہ صرف قطعیات کہلاتے ہیں۔

ضروریاتِ دین اور قطعیات کے حکم میں کیا فرق ہے؟

ضروریاتِ دین اور قطعیات کے حکم میں فرق یہ ہے کہ ضروریاتِ دین کا انکار بالجماعِ امت مطلقاً کفر ہے۔ ناواقفیت وجہالت کو اس میں عذر نہ قرار دیا جائے گا اور نہ کسی قسم کی تاویل سُنی جائے گی۔ اور قطعیاتِ محضہ جو شہرت میں اس درجہ کو نہیں پہنچے تو حنفیہ کے نزدیک اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کوئی آدمی بوجہ ناواقفیت و جہالت کے انکار کر بیٹھے تو ابھی اس کے کفر وارتداد کا حکم نہ کیا جائیگا۔ بلکہ پہلے اس کو تبلیغ کی جائیگی کہ یہ حکم اسلام کے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت احکام سے ہے۔ اس کا انکار کفر ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ اپنے انکار پر قائم رہے تب حکم کفر دیا جائیگا۔ علامہ ابن الہمام نے لکھا۔

واما ما ثبت قطعاً ولم يبلغ حد الضرورة كاستحقاق بنت الابن السدس مع البنت الصلبية باجماع المسلمين فظاهر كلام الحنفية الاكفار بجحده بانهم لم يشترطوا فى الاكفار سوى القطع فى الثبوت (الى قوله) ويجب حمله على ما اذا علم المنكر ثبوته قطعاً

(مسامرہ صفحہ ۳۰۹، شامی جلد ۳ صفحہ ۳۰۹)

اور جو حکم قطعی الثبوت تو ہو مگر ضرورت کی حد کو نہ پہنچا ہو جیسے میراث (میں اگر پوتی اور حقیقی بیٹی جمع ہو تو پوتی کو چھٹا حصہ ملنے کا حکم اجماعِ امت سے ثابت ہے تو اس پر کلام حنفیہ کا یہ ہے کہ اس کے انکار کی وجہ سے کفر کا حکم کیا جائے کیونکہ انھوں نے قطعی الثبوت ہونے کے سوا اور کوئی شرط نہیں لگائی (الی قولہ) مگر واجب ہے کہ حنفیہ کے اس کلام کو اس صورت پر محمول کیا جائے کہ جب منکر کو اس کا علم ہو کہ یہ حکم قطعی الثبوت ہے۔

ؔ عوام سے مراد علماء کی صحبت میں رہنے والے عوام مراد ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ حدیثیہ میں ہے۔

وهوان يكون قطعياً مشهوراً بحيث لا يخفى على العامة المخالطين للعلماء بان يعرفوا بداهة من غير افتقار الى نظر واستدلال ص ۱۴۱

وہ قطعی ایسا مشہور ہو کہ علماء سے اختلاط رکھنے والے عوام پر مخفی نہ ہو بایں طور پر کہ نظر و استدلال کی طرف احتیاج کے بغیر وہ اسے بداہۃً جانتے ہوں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کفر و ارتداد کی ایک قسم تو تبدیلِ مذہب ہے۔ اسی طرح دوسری قسم یہ ہے کہ ضروریاتِ دین اور تعلیماتِ اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کر دیا جائے یا ضروریاتِ دین میں کوئی ایسی تاویل کی جائے جس سے ان کے معروف فی الشرع معانی کے خلاف معنیٰ پیدا ہو جائیں اور غرضِ معروف بدل جائے۔ بنا بریں اگر کوئی شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا انکار کرے یا کوئی ایسی تاویل و تحریف کرے جو اس کے اجماعی معانی کے خلاف ہوں تو اس شخص کے کفر میں کوئی تامل نہیں کیا جائیگا۔

ضروریاتِ دین میں تاویل مسموع نہیں ہے

واضح ہو کہ تاویل وہاں معتبر ہے جہاں کوئی اشتباہ ہو اور قواعدِ عربیت اور قواعدِ شریعت میں اس کی واقعی گنجائش ہو یعنی وہ تاویل کتاب و سنت اور اجماعِ اُمّت کے خلاف نہ ہو اور جو حکمِ شرعی ایسی دلیل سے ثابت ہو جو کہ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہو اس پر تاویل معتبر نہیں ہے بلکہ ایسے امور میں تاویل کفر ہے ——— مثلاً کوئی عین نصف النہار کے وقت جب کہ ابر و غبار بھی ہو اور دھوپ نکل رہی ہو یہ کہے اس وقت دن نہیں ہے بلکہ رات ہے کیونکہ ممکن ہے کہ آسمان پر کوئی بجلی کوندرہی ہو اور یہ روشنی اسی کی ہو جسے لوگ دھوپ سمجھ رہے ہوں تو کیا کوئی عاقل اس تاویل کو تاویل کہے گا؟ بلکہ یہی کہا جائیگا کہ یہ محسوس اور مشاہدہ کا انکار کر رہا ہے لہذا ضروریاتِ دین میں ایسی تاویل معتبر نہیں ہوگی کیونکہ اس طرح کی تاویلیں معتبر مان لی جائیں تو پھر تو دنیا میں کوئی کافر نہ رہے گا۔ منکرینِ توحید و رسالت اور دہریہ تک کافر نہ ہوں گے۔ آخر وہ بھی تو کسی دلیل اور تاویل ہی کی وجہ سے توحید و رسالت کے منکر ہیں۔ چنانچہ علامہ عبدالحکیم حاشیہ خیالی میں لکھتے ہیں۔

وَالتَّاوِيْلُ فِى ضُرُوْرِيَاتِ الدِّيْنِ لَا يَدْفَعُ الْكُفْرَ (حاشیہ صہ۷)

ضروریاتِ دین میں تاویل کرنا کفر سے نہیں بچا سکتا۔

شیخ نے فتوحات میں فرمایا:۔

اَلتَّاوِيْلُ الْفَاسِدُ كَالْكُفْرِ (ج ۲ صہ۸۵)

تاویلِ فاسد مثلِ کفر کے ہے۔

حضرت امام غزالی نے "التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ" میں اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے اور آئمہ دین، فقہاء و متکلمین نے اپنی تصانیف میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"قرآن و حدیث میں ایسی تاویلاتِ باطلہ کرنا جو ان کے اجماعی مفہوم کو بدل دیں اور امت کے اجماعی عقائد کے خلاف کوئی نیا مفہوم ان سے پیدا ہو جائے تو ایسی تاویل بھی تکذیبِ رسول ہی کے حکم میں ہے اور اس کا کفر ہونا ظاہر ہے تفصیل کے لیے اہلِ علم درج ذیل کتب کا مطالعہ فرمائیں:۔

التفرقۃ، مسوّیٰ ج ۲ صہ۱۴۰، جوہر التوحید، ردالمختار ج ۳ صہ۲۹۶، شفاء صہ۱۲۱، ایثار الحق علی الخلق صہ۴۲۱

کفر کے لیے تمام امورِ ایمانیہ کا انکار ضروری نہیں ہے

واضح ہو کہ ایمان بہت سی مجموعی چیزوں کی تصدیق و تسلیم کا نام ہے لیکن کفر میں ان سب

چیزوں کی تکذیب یا انکار ضروری نہیں ہے بلکہ ایمانیات میں سے کسی ایک چیز کا انکار بھی کفر ہے مثلاً تمام اُمور ایمانیہ کو تسلیم کرے مگر صرف نماز کی فرضیت کا انکار کرے تو کافر ہی قرار پائیگا۔ اس صورت میں باقی اُمور اسلامی کا ایمان اس کو کفر سے نہیں بچا سکتا۔ ۲۔ اسی طرح دائرہ اسلام سے نکلنے یا کافر ہونے کے لیے اس کا قصد وارادہ ضروری نہیں ہے شیطان نے کافر ہونے کا ارادہ نہیں کیا تھا مگر اس کی حرکت نے اس کو کافر بنا دیا اور قرآن میں فرمایا گیا۔ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ اور وہ کافر تھا ــــــ البتہ یہ ضرور ہے کہ مسلمان سے بے خبری میں کوئی کلمہ کفر نکل جائے تو اس کی فوراً تکفیر نہ کی جائے بلکہ اس کو بتایا جائے کہ یہ کلمہ کفر کا ہے توبہ کرلو۔ اس پر بھی اگر وہ توبہ نہ کرے اور اپنی بات پر اڑ جائے تو اب تکفیر کی جائے گی کیونکہ لزومِ کفر کفر نہیں، التزام کفر کفر ہے۔ فافہم

ارتداد، زندقہ اور الحاد کی تعریف

ارتداد کے معنی لغت میں ہٹ جانے اور پھر جانے کے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں ایمان و اسلام میں داخل ہونے کے بعد کفر کی طرف لوٹ جانے کے ہیں۔ امام راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں۔

هُوَ الرُّجُوْعُ مِنَ الْاِسْلَامِ | اسلام سے کفر کی طرف پھر جانے کا نام ارتداد ہے۔

ارتداد کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اعلانیہ طور پر مذہب تبدیل کرلے۔ مثلاً اسلام کو ترک کردے اور یہودی عیسائی یا سکھ ہو جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نہ تو مذہب تبدیل کرے اور نہ توحید و رسالت کا انکار کرے لیکن ضروریاتِ دین میں سے کسی امر کا انکار کردے مثلاً یہ کہے کہ نماز فرض نہیں۔ روزہ و حج ضروری نہیں تو ایسا شخص کافر و مرتد دائرہ اسلام سے خارج ہے اگرچہ وہ صدق دل کے ساتھ اللہ کی تمام صفات پر اور حضور علیہ السلام کی رسالت پر ایمان رکھتا ہو۔ اس لیے کہ ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر و ارتداد ہے۔ اسی طرح ضروریاتِ دین میں ایسی تاویل کرنا اور ان کے ایسے معنی بیان کرنا جو اجماعی عقیدہ کے خلاف ہوں۔ قرآن حکیم میں اس کا نام الحاد ہے۔

ان الذین یلحدون فی ایاتنا لا یخفون علینا | جو ہماری آیات میں الحاد کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے۔

اور حدیث میں اس کا نام زندقہ رکھا گیا ہے۔ صاحب مجمع البحار نے جناب علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت کے پاس چند زنادقہ لائے گئے۔

هِيَ جَمْعُ زِنْدِيْقٍ (الی قوله) ثم استعمل فی کل ملحد فی الدین والمراد منه قوم ارتدوا عن الاسلام (مجمع البحار صفحہ ۹۵) | زنادقہ زندیق کی جمع ہے اور لفظ زندیق ہر اس شخص کے لیے ہے جو دین میں الحاد (بے جا تاویلات) کرے اور اس جگہ مراد ایک مرتد جماعت ہے۔

غرضیکہ اصطلاحِ شریعت میں ملحد اور زندیق اس شخص کو کہتے ہیں جو الفاظ تو اسلام کے کہے مگر معنی ایسے بیان کرے جن سے اس کی حقیقت ہی بدل جائے جیسے صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں یہ تاویل کرے کہ قرآن میں صلوٰۃ سے فقط دُعا و ذکر مراد ہے اور اس خاص ہیئت سے نماز پڑھنا ضروری نہیں اور زکوٰۃ سے تزکیہ نفس مراد ہے۔ ایک معین نصاب سے مال

کی خاص مقدار دینا مراد نہیں - ضروریاتِ دین اور قطعیاتِ اسلام میں اس نوع کی تاویلات کرنا زندقہ والحاد ہے اور زندقہ والحاد منافقت سے بھی زیادہ اشد ہے - جس طرح منافق طمع کاری سے کام لیتا ہے - اسی طرح زندیق اپنے عقائدِ کفریہ پر تاویلِ فاسد کے ذریعہ اسلامی لیبل لگا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے - تاکہ لوگ اسلام کے دھوکہ میں اس کے باطنی کفر کو قبول کرلیں - علامہ شامی نے لکھا ہے -

فان الزندیق یموہ کفرہ ویروج عقیدۃ الفاسدۃ ویخرجھا فی الصورۃ الصحیحۃ (شامی ج ۳ ص ۳۳۴)

تحقیق ملحد وزندیق اپنے کفر پر اسلام کا ملمع کرتا ہے تاکہ اپنے عقیدہ فاسدہ کو اس طمع کاری کے ذریعہ لوگوں میں رائج کرسکے - اور اپنے اس عقیدہ کو عمدہ طریقہ پر پیش کرسکے -

اس لیے کہ الحاد وزندقہ درحقیقت نفاق کی اعلیٰ ترین قسم ہے - امام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ العزیز نے لکھا -

وان اعترف بہ ظاھراً ولکن یفسر بعض ماثبت من الدین ضرورۃ بخلاف ما فسرہ الصحابۃ والتابعون واجمعت علیہ الامۃ فھو الزندیق کما اعترف بان القرآن حق وما فیہ من ذکر الجنۃ والنار حق لکن المراد بالجنۃ الابتہاج الذی یحصل بسبب الملکات المحمودۃ والمراد بالنار الندامۃ التی تحصل بسبب الملکات المذمومۃ ولیس فی الخارج جنۃ ولا نار فھو زندیق

اور اگر (ضروریاتِ دین کا اقرار) تو کرے مگر بعض ان چیزوں کو جو دین میں ثابت ہیں ایسی تفسیر بیان کرے جو صحابہ و تابعین اور اجماعِ امت کے خلاف ہو تو وہ زندیق ہے مثلاً یہ تو اقرار کرے کہ قرآن حق ہے اور اس میں جو جنّت و دوزخ کا ذکر ہے وہ بھی حق ہے - لیکن جنت سے مراد وہ خوشی اور فرحت ہے جو اخلاقِ حمیدہ سے پیدا ہوتی ہے اور دوزخ سے مراد وہ ندامت ہے جو اخلاقِ مذمومہ کے سبب حاصل ہوتی ہے - ویسے نہ کوئی جنت ہے اور نہ دوزخ - (تو ایسی تاویل کرنے والا) زندیق ہے -

(مسوّیٰ شرح موطا ج ۲ ص ۱۳۰)

واضح ہو کہ کفر وارتداد کی یہ صورت چونکہ دعویٰ اسلام کے ساتھ اور شعائرِ اسلامی کی ادائیگی کے ساتھ ہوتی ہے - اس لئے اس میں اکثر لوگوں کو مغالطہ ہوتا ہے اور وہ بہک جاتے ہیں - اس لیے یاد رکھیئے کہ اسلام کے قطعی اور یقینی احکام میں قرآن وسُنّت اور اجماعِ امت سے ثابت شدہ مفہوم کے خلاف کوئی مفہوم قرار دینا الحاد وزندقہ ہے اور ایسے ملحدین سے بچنا فی زمانہ تمام فرائض سے اہم ہے -

فتویٰ تکفیر میں احتیاط نہایت ضروری ہے

خوب یاد رکھیئے کہ تکفیر میں کبھی عجلت نہیں کرنی چاہیئے اور اس سلسلہ میں کامل غور وفکر سے کام لینا چاہیئے اور جب تک کسی کا کفر واقعی طور پر ثابت نہ ہو جائے تکفیر نہ کرنی چاہیئے - کیونکہ یہ معاملہ بڑا سخت ہے اور فتویٰ تکفیر سے پوری ملّتِ اسلامی متاثر ہوتی ہے - اسی طرح جب کسی امر کا کفر ہونا واقعی ثابت ہو جائے تو ایسی صورت میں تکفیر نہ کرنا یا تاویلاتِ فاسدہ سے کام لینا یہ بھی جائز نہیں ہے کیونکہ کسی کافر کو مسلمان کہہ دینا یا کسی کلمہ کفر کو اسلام قرار دے دینا محض ایک لفظی سخاوت نہیں

بلکہ ملتِ اسلامیہ پر ظلم عظیم ہے کیونکہ اس کے نتائج و عواقب ملت کے لیے بڑے عظیم خطرات کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں اور کفر و اسلام ایک بے معنیٰ سی حقیقت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اگر کسی کے کلام میں ۹۹ وجوہ کفر کے ہوں؟

چنانچہ حضرات فقہاء کرام نے اس معاملہ میں اس درجہ احتیاط کا حکم دیا ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی مشتبہ کلام سرزد ہو جائے جس میں سو احتمال ہیں سے ننانوے احتمالات مضمون کفر ہونے کے ہوں اور ایک احتمال عبارت میں اس کا بھی ہو کہ اس کے کوئی صحیح و جائز معنیٰ بن سکیں تو مفتی پر لازم ہے کہ ننانوے احتمال کو چھوڑ کر اسی ایک احتمال کی طرف مائل ہو اور تکفیر نہ کرے لیکن یاد رہے کہ یہ احتیاط اسی صورت میں ہے جب کہ واقعی اس عبارت کے ایک صحیح و جائز معنیٰ بن سکیں اور قائل بھی خود اپنے کسی قول و فعل سے اس کی تصریح نہ کر دے کہ اس کی مراد وہی معنیٰ ہیں جن سے کفر عائد ہوتا ہے ورنہ اگر صحیح و جائز معنیٰ نہ بن سکیں تو وہ کلمہ کفر قرار پائے گا اور اگر قائل خود ہی یہ تصریح کر دے۔ میری مراد یہی معنیٰ کفری ہیں تو پھر اس کی تکفیر کی جائے گی۔ علامہ شامی نے لکھا:

اذا کان فی المسئلۃ وجوہ توجب الکفر و وجہ واحد یمنع فعلی المفتی ان یمیل الی ذالک الوجہ الا اذا صرح بارادۃ ما یوجب الکفر فلا ینفعہ التاویل حینئذ

جب کسی مسئلہ میں متعدد وجوہ کفر کے ہوں اور ایک وجہ مانع کفر تو مفتی پر لازم ہے کہ اس ایک وجہ کی طرف مائل ہو مگر جب کہ قائل اس وجہ کی تصریح کر دے جو موجبِ کفر ہے تو پھر تاویل سے اس وقت کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ (شامی)

واضح رہے کہ فقہاء کے اس کلام کے بعض جہلاء نے یہ معنیٰ لیے ہیں کہ اگر کسی شخص کے عقائد میں ایک عقیدہ یا قول بھی ایمان کا ہو تو اسے مومن سمجھو خواہ وہ کتنے ہی واضح کفری عقائد کیوں نہ رکھتا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ فقہاء کے کلام کا یہ مطلب لینا قطعاً وحتماً مردود ہے۔ اگر یہ مطلب لیا جائے تو پھر تو شیطان بھی کافر نہیں رہتا۔ کیونکہ ہر کافر کا کوئی نہ کوئی عقیدہ اور قول تو ضرور ہی ایمان کے موافق ہوتا ہے۔ شیطان بھی تو، توحید و رسالت، حشر و نشر سب کا قائل تھا اسی طرح یہود و نصاریٰ محض ایک اسلامی عقیدہ رکھنے کی بناء پر مسلمان قرار پائیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ فقہاء کی مذکورہ بالا عبارت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر کسی کی زبان سے کوئی کلمہ جو لغت و عرف کے اعتبار سے مختلف معانی پر محمول ہو سکتا ہے۔ جن میں ایک معنیٰ کے اعتبار سے یہ کلمہ عقیدہ کفریہ سے نکل جاتا ہو اور دوسرے تمام معانی اس کو عقیدہ کفریہ ٹھہراتے ہوں تو ایسی صورت میں مفتی احتیاط کرے اور اس کلام کو صحیح معنیٰ پر محمول کر کے تکفیر سے باز رہے۔ بشرطیکہ وہ خود ایسی تصریح نہ کر دے کہ اس کی مراد معنیٰ کفری ہیں اور کلام میں واقعی یہ گنجائش بھی ہو کہ وہ صحیح معنیٰ پر محمول ہو سکے۔

مسئلہ تکفیر اہلِ قبلہ

یہ بات بہت مشہور ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے اور کتب عقائد و فقہ میں اس کی تصریح ہے۔ اسی تصریح کے پیش نظر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر کلمہ گو اہلِ قبلہ ہے لہٰذا اس کی تکفیر ممنوع ہے لیکن سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اہلِ قبلہ کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

اصطلاحِ شریعت میں اہلِ قبلہ وہی لوگ ہیں جو تمام قطعیاتِ اسلام اور ضروریاتِ دین پر ایمان رکھتے ہوں لیکن وہ لوگ جو ضروریاتِ دین کے منکر ہوں مثلاً شراب و زنا و دیگر محرماتِ قطعیہ کو حلال جانیں یا ضروریاتِ دین میں تاویل کریں اور اسلام کے قطعی و یقینی احکام کے ثابت شدہ مفہوم و معنیٰ میں ایجاد سے کام لیں تو ایسے لوگ ہرگز ہرگز اہلِ قبلہ نہیں ہیں۔

۲۔ اور فقہاء نے جو یہ فرمایا ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ قبلہ کی گناہِ کبیرہ کے ارتکاب پر تکفیر نہ کی جائے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اہلِ قبلہ اگر ضروریاتِ دین میں سے کسی امر کا انکار کر دیں تو بھی ان کو کافر نہ کہا جائے چنانچہ ان امور کی تصریح و توضیح خود ائمہ دین و فقہاء کرام نے فرمائی ہے۔ چند اقوالِ ائمہ پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں :۔

اعلموا ان المراد باهل القبلة الذين اتفقوا على ما هو من ضروريات الدين

جاننا چاہئے کہ اہلِ قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو تمام ضروریاتِ دین پر متفق ہیں۔

۲۔ فمن واظب طول عمره على الطاعات والعبادات مع اعتقاد قدم العالم و نفي الحشر او نفي علمه سبحانه وتعالىٰ بالجزئيات لا يكون من اهل القبلة

پس جو شخص تمام عمر طاعات و عبادات کا پابند ہونے کے باوجود قدمِ عالم اور نفیِ حشر یا نفیِ علم اللہ بالجزئیات کا معتقد ہو۔ وہ اہلِ قبلہ نہیں ہے۔ (شرح فقہ اکبر صہ ۱۸۹)

اہلِ قبلہ کی تعریف

محقق ابن امیر الحاج شرح تحریر الاصول میں فرماتے ہیں۔

۳۔ هُوَ الْمُوَافِقُ عَلىٰ مَا هُوَ مِنْ ضُرُوْرِيَاتِ الْاِسْلَامِ

اہلِ قبلہ وہ ہیں جو تمام ضروریاتِ اسلام میں موافق ہوں (شرح تحریر الاصول)

۴۔ شرح عقائد نسفی کی شرح نبراس میں ہے۔

اهل القبلة فى اصطلاح المتكلمين من يصدق بضروريات الدين (نبراس صہ ۵۷۲)

اہلِ قبلہ متکلمین کی اصطلاح میں وہ شخص ہے جو تمام ضروریاتِ دین کی تصدیق کرے۔

۵۔ شرح مقاصد مبحث سابع میں ہے :۔

فلا نزاع فى كفر اهل القبلة المواظب طول العمر على الطاعات باعتقاد قدم العالم ونفي الحشر الخ

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اہلِ قبلہ میں سے اس شخص کو کافر کہا جائیگا جو اگرچہ تمام عمر طاعات و عبادات میں گزارے مگر عالم کے قدیم ہونے یا قیامت و حشر کا انکار کرے۔

۶۔ لا يكفر اهل القبلة الا فيما فيه انكار ما علم مجيئه به بالضرورة او اجمع عليه كاستحلال المحرمات (مواقف)

اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے گی مگر اس صورت میں کہ اس میں ضروریاتِ دین کا انکار یا ایسی چیز کا انکار لازم ہے جس پر امت کا اجماع ہو چکا ہے جیسے حرام اشیاء کو حلال سمجھنا۔

۷۔ لا خلاف فى كفر المخالف فى ضروريات

جو شخص ضروریاتِ اسلام کا مخالف ہو اس کے کفر میں

الاسلام وان کان من اھل القبلہ (شامی ج۱ ص۲۷۷)

کوئی اختلاف نہیں اگرچہ وہ اہلِ قبلہ میں سے ہو۔

۸۔ ومعنی عدم تکفیر اھل القبلۃ ان لا یکفر بارتکاب المعاصی ولا بانکار الامور المخفیہ غیر المشھورۃ (نبراس ص۵۷۲)

(اور فقہائے نے جو یہ کہا ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاصی کے ارتکاب کی وجہ سے اور اسلام کے ایسے امور کے انکار کی وجہ سے جو کہ مشہور نہ ہوں تکفیر نہ کی جائے۔

۹۔ فتح المغیث شرح الفیہ الحدیث میں ہے:۔

اذ لا نکفر احدا من اھل القبلۃ الا بانکار قطعی من الشریعۃ (شرح الفیہ ص۱۴۲ وعقائد عضدیہ)

ہم اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے مگر بسبب انکار کسی حکم قطعی کے۔

۱۰۔ امام ربانی مجدد الف ثانی مکتوبات میں فرماتے ہیں:۔

وچوں ایں فرقہ مبتدعہ اہل قبلہ اند در تکفیر آنہا جرأت نباید نمود تا زمانے کہ انکار ضروریات دینیہ نماید و متواترات احکام شرعیہ نکنند وقبول ما علم مجیئہ من الدین بالضرورۃ نکنند۔ (مکتوبات ۴۸ ج ۲ ص۹۸)

اور چونکہ یہ فرقہ مبتدعہ اہلِ قبلہ ہیں اس لیے ان کی تکفیر میں جرأت نہیں کرنی چاہیے جب تک کہ ضروریاتِ دین کا انکار اور متواترات احکام شرعیہ کا انکار نہ کریں اور ضروریاتِ دین کو قبول نہ کریں۔

فقہائے کرام اور آئمہ متکلمین کی ان تصریحات سے واضح ہوا۔

۱۔ اہلِ قبلہ وہ نہیں جو صرف کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لیں بلکہ اہلِ قبلہ وہ ہیں جو تمام ضروریاتِ دین اور اسلام کے قطعی ویقینی اُمور پر ایمان رکھتے ہوں اور انہیں تسلیم کرتے ہوں اور دین کی کسی بھی ضروری بات کے مُنکر نہ ہوں۔

۲۔ فقہاء نے جو فرمایا ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے تو اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ اگر وہ کفر و شرک کے علاوہ کسی گناہ میں ملوّث ہو جائیں مثلاً شراب پئیں زنا کریں تو گناہِ کبیرہ کے ارتکاب کی وجہ سے ان کی تکفیر جائز نہ ہوگی جیسے خوارج ومعتزلہ مرتکبِ کبیرہ کی تکفیر کرتے ہیں۔

۳۔ لیکن اگر اہلِ قبلہ جو نماز بھی پڑھیں اور تمام عمر عبادات وطاعات میں گزاریں اور اس کے باوجود ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک بات کا بھی انکار کر دیں تو اب ان کی تکفیر کی جائیگی۔

کفر و شرک وارتداد کے دُنیوی واُخروی احکام

کتاب وسُنّت کے حسب ذیل دنیوی واُخروی بڑی وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں اور ان احکام پر تمام اہلِ اسلام کا اتفاق بھی ہے۔ ۱۔ کفر کا اُخروی حکم یہ ہے کہ اس کی سزا دوزخ کا دائمی عذاب ہے اور کافر و مشرک کی بخشش نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ

اللہ تعالےٰ مشرک کی بخشش نہیں فرمائیگا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ یَکُنْ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ | جو لوگ کافر ہوئے اور ظلم کیا۔ انہیں اللہ تعالیٰ ہرگز نہیں بخشے گا۔

۲۔ کفار و مرتدین، ملحدین و زنادقہ سے میل جول سلام کلام موالات وغیرہ حرام و ممنوع ہے ۳۔ کفار سے مناکحت حرام ہے ۴۔ کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا ۵۔ کافر کی نمازِ جنازہ میں شریک ہونا یا اس کی قبر پر جانا یا اس کے لیے مغفرت کی دُعا کرنا جائز نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا:۔

لاتصل علی احد منھم ابداً ولا تقم علی قبرہ انھم کفروا باللہ ورسولہ وماتوا وھم فاسقون | ان کی نمازِ جنازہ نہ پڑھئے ان کی قبر پر کھڑے نہ ہوجیئے اس لیے کہ وہ اللہ و رسول کے منکر ہوئے اور نافرمان مرے۔

ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا ولو کانوا اولی قربیٰ | نبی کو اور مسلمانوں کو نہ چاہیئے کہ وہ مشرکوں کی مغفرت کی دُعا کریں۔ اگرچہ وہ ان کے قرابتدار ہوں۔

۷۔ کافر کا ذبیحہ اور شکار مسلمان کے لیے حلال نہیں ۸۔ کافر کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں ۹۔ جو کافر دارالاسلام میں مسلمانوں کی رعایا ہوں ان کو فوج میں بھرتی کر کے جہاد میں لے جانا جائز نہیں کیونکہ بہت ممکن ہے کہ وہ سازش کر کے دارالحرب سے کفار سے جا ملیں ۱۰۔ جو کافر اسلامی حکومت میں رہتے ہوں ان سے جزیہ لیا جائیگا۔ قرآنِ مجید میں فرمایا:۔

حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن ید وّھم صاغرون | یہاں تک کہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہو کر

۱۱۔ کسی کافر و مرتد کو کوئی وزارتی یا فوجی یا افسری کسی قسم کا کلیدی عہدہ دینا اور اس کو مسلمانوں کا سردار بنا دینا اور کفار سے سیاسی و مملکتی امور میں مشورہ لینا جائز نہیں۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابو موسیٰ کو ہدایت کی تھی۔

ولاتکرمھم وقد اھانھم اللہ۔ ولا تامنھم وقد خونھم اللہ ولا تستعملوا اھل الکتاب الخ (قرطبی ج ۴ ص ۱۷۹) | کافروں کا اعزاز و اکرام نہ کرو، اللہ نے ان کی اہانت کا حکم دیا ہے۔ ان کو امین اور امانت دار نہ سمجھو اللہ نے ان کو خائن بتلایا ہے۔ یہود و نصاریٰ کو کوئی عہدہ نہ دو۔

حضرت فاروقِ اعظم کا یہ حکم قرآنِ مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ان الکافرین کانوا لکم عدواً مُّبینًا | بے شک کافر تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔

ظاہر ہے کہ دشمن کو کلیدی آسامیوں پر فائز کر دینے کا نتیجہ بہرحال اسلام و مسلمین کی ذلّت و رسوائی ہوگا اور تاریخ گواہ ہے۔ جب بھی کسی مسلمان حکمران نے کافر و مشرک یا مرتد کو کسی عہدہ پر فائز کیا ہے تو بُرے وقت میں اس نے غداری ہی کی ہے۔ مجھے یہاں مرتدوں و منافقین کی نشاندہی کی ضرورت نہیں۔ تاریخ کا مطالعہ ہی آپ کو بتا دے گا کہ ممالکِ اسلامی کی تباہی و بربادی میں اصل ہاتھ ان کفار و مرتدین کا ہی رہا ہے بلکہ کھُلے ہوئے کافر ہندو سکھ عیسائی وغیرہ اتنا نقصان اسلام کو نہیں پہنچا سکے جتنا کہ مرتدوں یا منافقوں نے پہنچایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب و سُنّت کی نصوصِ واضحہ میں مُرتد

کی سزا موت ہے اور قتلِ مرتد پر علمائے امت کا اجماع ہے۔

۱۔ حافظ عسقلانی فتح الباری صفحہ ۷۷ جلد ۱۲ میں فرماتے ہیں۔

قال ابن دقیق العید الردۃ سبب لاباحۃ دم المسلم بالاجماع فی الرجل واما المرأۃ ففیھا خلاف

(فتح الباری صفحہ ۷۷ جلد ۱۲ کتاب الدیات)

علامہ ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مرتد ہونا یعنی دینِ اسلام سے پھر جانا بالاتفاق مرد کے حق میں موجبِ قتل ہے البتہ اگر عورت دینِ اسلام سے پھر جائے تو اس کے قتل میں اختلاف ہے۔

۲۔ حافظ بدرالدین عینی شرح بخاری میں لکھتے ہیں۔

وقال شیخنا فی شرح الترمذی وقد اجمع العلماء علی قتل المرتد اذا لم یرجع الی الاسلام واصر علی الکفر و اختلفوا فی قتل المرتدۃ فجعلھا اکثر العلماء کالرجل المرتد وقال ابو حنیفۃ لا تقتل المرتدۃ لعموم قولہ نھی عن قتل النساء والصبیان

(عمدۃ القاری صفحہ ۴۱ جلد ۲۴ کتاب الدیات باب قولہ تعالیٰ النفس بالنفس والعین بالعین)

ہمارے شیخ نے شرح ترمذی میں فرمایا ہے۔ علمائے قتلِ مرتد پر اجماع فرمایا ہے جب کہ وہ ارتداد پر قائم رہے اور اسلام کی طرف نہ لوٹے اور کفر پر مداومت اختیار کرے اور مُرتد عورت کے قتل میں اختلاف ہے۔ اکثر علمائے مُرتد عورت کو بھی مثل مرد کے واجب القتل قرار دیا ہے اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ مُرتد عورت کو قتل نہ کیا جائے بوجہ عموم قولِ پیغمبر علیہ السلام کے کہ آپ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ (کذا فی عمدۃ القاری)

۳۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ تعالےٰ میزانِ کبریٰ میں فرماتے ہیں:

قد اتفق الائمۃ علی ان من ارتد عن الاسلام وجب قتلہ

ائمہ نے اتفاق فرمایا ہے کہ جو شخص اسلام لاکر اس سے پھر جائے تو اس کا قتل واجب ہے۔

ایمان کی تعریف میں ائمہ کا اختلاف

حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

ان الایمان اقرار باللسان ومعرفۃ القلب

ایمان دل سے تصدیق کرنے اور زبان سے اقرار کرنے کو کہتے ہیں۔

معرفۃ قلب کے معنی پختہ اور غیر متزلزل اعتقاد کے ہیں یعنی ایمان فقط دل کے اعتقاد جازم کا نام ہے اور زبان سے اقرار کرنا شرط ہے۔ چنانچہ شرح عقائد میں ہے:

وَذَهَبَ جُمْهُورُ الْمُحَقِّقِيْنَ اِلٰى اَنَّہٗ هُوَ التَّصْدِيْقُ بِالْقَلْبِ وَالْاِقْرَارُ شَرْطٌ لِاِجْرَآءِ الْاَحْكَامِ فِي الدُّنْيَا لِمَا اَنَّ تَصْدِيْقَ الْقَلْبِ اَمْرٌ بَاطِنٌ لَا بُدَّ مِنْ عَلَامَةٍ

جمہور متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے اور اقرار لسانی صرف دنیوی احکام جاری ہونے کی ایک شرط ہے کیونکہ تصدیقِ قلبی ایک امر پوشیدہ ہے اس لیے لازمی طور پر اس کے لیے کوئی علامت ظاہر ہونی

فَمَنْ صَدَّقَ بِقَلْبِہٖ وَلَمْ یُقِرَّ بِلِسَانِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ عِنْدَ اللّٰہِ تَعَالٰی
(شرح عقائد)

چاہیئے - لہٰذا جو شخص دل سے (تمام ضروریاتِ دین) کی تصدیق کرے اور زبان سے (کسی کے سامنے) اس کا اقرار و اظہار نہ کرے وہ اللہ کے نزدیک مومن ہے۔

معلوم ہوا کہ زبان سے اقرار کرنا صرف اس لیے ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص مومن ہے کیونکہ جب تک کوئی شخص اپنے مافی الضمیر کا اظہار نہیں کرے گا۔ اس کے دل کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ہو سکتی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایمان محض تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور "اقرار لسانی" صرف شرط ہے۔

ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اس کے عقلی و نقلی دلائل

ایمان دل کے اعتقاد کو کہتے ہیں اس کے مندرجہ ذیل دلائل ہیں۔
۱- عربی زبان میں امنوا باللہ کا اولین مفہوم تصدیق ہی سمجھا جاتا ہے اور اس معنیٰ سے عدول کی کوئی مثال نہیں پائی جاتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے۔ ۲- ایمان کا محل دل ہی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں دل کو ایمان کا محل قرار دیا گیا ہے۔

۱- اُولٰٓئِكَ كَتَبَ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ — یہ وہ ہیں جن کے دل میں ہم نے ایمان کو پختہ کر دیا۔
۲- مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ — ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو زبان سے ایمان کا اقرار کرتے ہیں مگر دل سے ایمان نہیں لاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان دل کی تصدیق کا نام ہے۔

۳- حضرت اسامہ نے ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا تھا جس نے زبان سے کلمہ پڑھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شخص دل سے کلمہ نہیں پڑھ رہا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا۔ اسامہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ ایمان کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ لہٰذا دل کی تصدیق کا نام ایمان ہوا۔
۴- اہلِ کتاب اور فرعون حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی جانتے تھے حالانکہ وہ مومن نہ تھے۔ اس کی وجہ یہی تو تھی کہ وہ دل سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتے تھے۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے۔

۵- کفر ایمان کی ضد ہے اسی لیے قرآنِ مجید میں کفر کے مقابل ایمان کا ذکر کیا گیا ہے جیسے اس آیت میں مَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ اور یہ ظاہر ہے کہ کفر کے معنیٰ جھٹلانے اور انکار کرنے کے ہیں اور یہ دل ہی کا فعل ہے۔ لہٰذا جب کفر دل کا فعل ہے تو کفر کی ضد ایمان بھی دل کا فعل ہی ہونا چاہیئے اور دل کا فعل عبارت ہے تصدیق سے اور تکذیب کی ضد تصدیق ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ایمان دل کی تصدیق کو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل

نوٹ ۱- اس مسئلہ کی مکمل بحث... اس پر تفصیلی گفتگو انشاء اللہ العزیز فیوض الباری کے آخری حصص میں اپنی جگہ پر پیش کی جائے گی

آیات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور اعمالِ صالحہ حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں ہیں۔

۶- وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ اس آیت میں منافقین سے ایمان کی نفی کی گئی ہے حالانکہ منافق زبان سے اقرار کرتے تھے۔ مگر چونکہ دل سے تصدیق نہیں کرتے تھے اس لیے ایمان کی نفی کر دی گئی۔

۷- اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ۔ اس آیت میں مُکرَہ کے لیے یہ جائز کیا گیا کہ وہ جان بچانے کے لیے زبان سے انکار کر دے مگر اس زبانی انکار کے باوجود اس کو مومن قرار دیا گیا۔ اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اس میں تصدیقِ قلبی پائی جا رہی ہے۔

۸- (۱) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۲) اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ ۳- اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ ..... الخ ان آیات میں ایمان کا عطف اعمالِ صالحہ پر کیا گیا اور معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے یعنی معطوف معطوف علیہ میں داخل نہیں ہوتا۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اعمالِ صالحہ حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں۔

۹- وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ۔ اس آیت میں اعمال کی صحت ایمان پر موقوف قرار دی گئی ہے اور مشروط شرط میں داخل نہیں ہوتا ورنہ اِشْتِرَاطُ الشَّيْءِ فِيْ نَفْسِهٖ لازم آئیگا جو باطل ہے

۱۰- قرآن میں مرتکبِ حرام کو مومن کہا گیا جیسے اس آیت میں وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا حالانکہ یہ امر قطعی ہے کہ شئی رکن کے بغیر مستحق نہیں ہوتی تو اگر اعمالِ صالحہ حقیقتِ ایمان میں داخل ہوتے تو مرتکبِ حرام کو مومن نہ کہا جاتا۔

۱۱- قرآن میں جہاں روزہ، نماز اور وضوء کا حکم دیا ہے وہاں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے خطاب کیا ہے۔ اس کے بعد ان کو عمل کی تکلیف دی ہے۔ یہ بات بھی ایمان میں عمل کے خروج پر دلالت کرتی ہے۔ ورنہ تکلیف تحصیل الحاصل لازم آئے گی جو باطل ہے۔

۱۲- قرآنِ پاک میں اللہ تعالےٰ نے مومنوں کو توبہ کا حکم دیا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً ..... الخ یہ بات بھی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ معصیت ایمان کے منافی نہیں۔ معصیت کے ساتھ ایمان بھی ہوتا ہے کیونکہ توبہ گنہگار کے لیے ہوتی ہے۔ نیز گنہگار کو اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں مومن قرار دیا ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اعمال حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں۔

امام شافعی کے نزدیک ایمان کی تعریف

حضرت امام مالک، امام شافعی، امام احمد رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے نزدیک ایمان کی تعریف یہ ہے ____

اَلْاِيْمَانُ فِعْلُ الْقَلْبِ وَاللِّسَانِ مَعَ سَائِرِ الْجَوَارِحِ (عینی) (ترجمہ) ایمان دل سے تصدیق کرنے زبان سے اقرار کرنے اور جوارح مامور بہ کو ادا کرنے کو کہتے ہیں۔

ایمان کی تعریف کے متعلق امام ابوحنیفہ وامام شافعی علیہما الرحمۃ کے اختلاف کی حقیقت

واضح رہے کہ امام ابوحنیفہ و امام شافعی علیہما الرحمۃ کے نزدیک ایمان کی تعریف میں جو اختلاف نظر آرہا ہے۔ حقیقت میں یہ اختلاف لفظی ہی ہے۔ جس کی تقریر یہ ہے کہ ایمان دو طرح کا ہوتا ہے اوّل وہ ایمان جو انسان کو خلود فی النار سے نجات دے۔ (خلود فی النار سے نجات کا مطلب یہ ہے کہ اپنے گناہوں کی پاداش میں کچھ عرصہ کے لیے بطور سزا جہنم میں داخل کیا جائے۔ اس کے بعد پھر جنت ہی میں داخل ہو) دوم وہ ایمان جو انسان کو دخولِ نار سے نجات دے یعنی ذرا دیر کے لیے بھی وہ جہنم میں نہ جائے تو ظاہر ہے کہ خلود فی النار سے نجات دینے والے ایمان کی تعریف یہ ہوگی کہ انسان دل سے تمام ضروریاتِ دین کے اقرار و تصدیق کرے اور زبان سے اقرار کرے اور دخولِ نار سے نجات دینے والے ایمان کی تعریف یہ ہوگی کہ ضروریاتِ دین کے اقرار و تصدیق کے ساتھ ساتھ احکام شرعیہ کی پابندی کرے۔ جب آپ نے اس تقریر کو اچھی طرح سمجھ لیا تو اب غور کیجئے کہ حضرت امام ابوحنیفہ و امام شافعی میں ایمان کی تعریف میں جو اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ صرف نزاعِ لفظی رہ جاتا ہے کیونکہ امام شافعی اعمال کو ایمان کا رکن قرار دیتے ہیں تو اس سے وہ قسمِ دوم کے ایمان کی تعریف کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اعمال کو دین کا رکن نہیں قرار دیتے تو اس سے وہ قسمِ اوّل والے ایمان کی تعریف فرما رہے ہیں۔ چنانچہ وہ ایمان جو خلود فی النار سے نجات دے۔ امام شافعی اور تمام ائمہ کے نزدیک اس کی تعریف صرف یہ ہے کہ دل سے ضروریاتِ دین کی تصدیق کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص دل سے ضروریاتِ دین کی تصدیق کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے گناہ بھی ہو جائے یا وہ تصدیق تو کرے مگر عمل نہ کرے تو ایسا شخص تمام ائمہ کے نزدیک کافر نہیں ہوتا۔

گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں

جب آپ نے یہ سمجھ لیا کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور اعمال حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں ہیں تو اب ثمرہ یہ نکلے گا کہ مرتکبِ کبیرہ کافر نہیں ہے۔ اس موقعہ پر چند باتیں ذہن میں رکھیئے۔

اوّل۔ گناہِ کبیرہ سے مراد کفر و شرک کے علاوہ گناہ ہے دوم۔ جب ایک مسلمان بشری کمزوری کی بنا گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ گناہ کو گناہ ہی سمجھتا ہے اور حرام کو حرام ہی قرار دیتا ہے مگر پھر بھی گناہ میں ملوث ہو جاتا ہے تو ایسا شخص اہل سنت و جماعت کے نزدیک مسلمان ہے دوسرے یہ کہ گناہ کرتا ہے اور حرام کو حلال جان کر اختیار کرتا ہے تو ایسا شخص بلا اختلاف بے ایمان ہے۔ کیونکہ اب اس میں تصدیق قلبی جو ایمان کی حقیقت تھی وہ نہیں پائی گئی۔

گناہِ کبیرہ نو ہیں

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ گناہِ کبیرہ نو ہیں ۱۔ شرک باللہ ۲۔ ناحق قتل کرنا ۳۔ آزاد مکلف مسلمان پاکدامن عورت پر تہمت لگانا ۴۔ زنا کرنا ۵۔ یتیم کا مال ناحق کھانا ۶۔ مسلمان والدین کی نافرمانی کرنا ۷۔ جادو کرنا ۸۔ جہاد سے بلا وجہ شرعی بھاگ آنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالٰی عنہ کی روایت میں سود لینا اور حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی روایت میں چوری کرنا

اور شراب پینا بھی گناہِ کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے۔ ابو طالب مکّی سے روایت ہے کہ گناہ کبیرہ سترہ ہیں۔ چار وہ جن کا تعلق دل سے ہوتا ہے ۱۔ شرک ۲۔ گناہوں پر اصرار ۳۔ اللہ کی رحمت سے نااُمید ہو جانا ۴۔ اَلْاَمْنُ مِنْ مَکْرِہٖ ——— چار وہ ہیں جن کا تعلق زبان سے ہے ۱۔ جھوٹی گواہی دینا ۲۔ عفیفہ کو تہمت لگانا ۳۔ جادو کرنا ۴۔ حرم میں گناہ کرنا ——— تین وہ ہیں جن کا تعلق پیٹ سے ہے ۱۔ شراب پینا ۲۔ یتیم کا مال ناحق کھانا ۳۔ سُود لینا، دو وہ ہیں جن کا تعلق شرم گاہ سے ہے ۱۔ زنا ۲۔ لواطت ——— ایک وہ ہے جس کا تعلق پاؤں سے ہے ۱۔ بلاوجہ شرعی جہاد سے بھاگ جانا ——— ایک وہ ہے جس کا تعلق تمام بدن سے ہے ۱۔ والدین کی نافرمانی کرنا ——— دو وہ ہیں جن کا تعلق ہاتھ سے ہے ۱۔ ناحق قتل کرنا ۲۔ چوری کرنا (شرح عقائد ص۸۲)

واضح ہو کہ روایات میں جن اُمور کو گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ بطور حصر نہیں ہے بلکہ بطور مثال ہے یعنی مذکورہ بالا گناہوں کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جو گناہِ کبیرہ ہیں مثلاً بلا عذر شرعی نماز ترک کرنا، روزہ نہ رکھنا، زکوٰۃ نہ دینا، مالدار ہو کر حج نہ کرنا، ظلم کرنا، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، دھوکہ دینا، گالی دینا، ڈاکہ ڈالنا، دو مسلمانوں میں لڑائی کرانا، عورتوں کا بے پردہ پھرنا، فحاشی و عریانی کو اختیار کرنا، ناچ رنگ کی مجالس قائم کرنا، نامحرم عورت پر بلا ضرورتِ شرعی نظر ڈالنا، سودا کم تولنا، حالتِ حیض میں اپنی بیوی سے جماع کرنا، غیر اللہ کو سجدۂ تعظیمی کرنا بھی گناہِ کبیرہ ہیں۔

ایمان سے متعلق معتزلہ و خوارج کا مسلک

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ امام شافعی گو اعمال کو ایمان میں داخل مانتے ہیں مگر اس کے باوجود مرتکب کبیرہ کو کافر نہیں کہتے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ خوارج و معتزلہ کے نزدیک اعمال حقیقتِ ایمان میں داخل ہیں اور ان کا مسلک یہ ہے کہ مرتکبِ کبیرہ نہ کافر ہے اور نہ مومن اور خوارج یہ کہتے ہیں کہ مرتکبِ کبیرہ کافر ہے۔ معتزلہ و خوارج کا مذہب باطل ہے اور حق یہی ہے کہ مرتکبِ کبیرہ گنہگار ضرور ہے مگر کافر نہیں ہے یا امام شافعی کے مسلک کے مطابق مرتکبِ کبیرہ کامل الایمان نہیں ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں عاصی پر مومن کا اطلاق آیا ہے جیسے ان آیات میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى ۲۔ وَاِنْ طَآىٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا ۳۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ اگر مرتکبِ کبیرہ کافر ہوتا تو اس پر قرآنِ حکیم میں مومن ہونے کا اطلاق نہ کیا جاتا اسی طرح حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر آج تک ہر اہلِ قبلہ کی (خواہ اس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ مرتکب کبیرہ تھا اور بغیر توبہ کے مرا ہے) نمازِ جنازہ پڑھی گئی ہے۔ اس کے لیے بخشش کی دُعا کی جاتی رہی ہے حالانکہ یہ متفقہ بات ہے کہ کافر کے لیے دُعا و استغفار اور نمازِ جنازہ پڑھنا حرام ہے۔ اگر گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر ہوتا تو حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام ایسے شخص کی نمازِ جنازہ نہ پڑھتے۔ نیز حدیث ابوذر میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھ لیا ہو اور اسی اعتقاد پر مرگیا تو وہ جنتی ہے۔ حضرت ابوذر نے عرض کی کہ اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ ہاں اگرچہ اس نے زنا اور چوری کی ہو۔ دوسری حدیث میں فرمایا۔

یُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ فِیْ قَلْبِهٖ	وہ شخص بالآخر دوزخ سے نکالا جائیگا جس کے دل میں

مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنَ الْإِيْمَانِ | ایک ذرہ بھی ایمان کا ہوگا۔

یہ اور اس مضمون کی متعدد احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرتکبِ کبیرہ کافر نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی تعریف میں کہیں اعمال کو ایمان میں داخل فرمایا ہے اور کہیں نہیں مثلاً آپ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، ملائکہ پر، اس کے رسُولوں پر ایمان لا اور وفد عبد القیس کی حدیث میں فرمایا۔ کیا تم جانتے ہو کہ ایمان کیا ہے۔ پھر فرمایا۔ ایمان یہ ہے کہ تُو توحید و رسالت کی شہادت دے اور نماز پڑھے اور روزہ رکھے وغیرہ وغیرہ تو پہلی حدیث میں اعمال کو ایمان میں شامل نہیں فرمایا کیونکہ یہاں حضور علیہ السلام نے صرف اہلِ اسلام کی تعریف فرمائی ہے یعنی وہ ایمان جو انسان کو خلود فی النار سے نجات دے اور وفد عبد القیس کی حدیث میں اعمال کو ایمان میں شامل فرمایا ہے تو اس سے مراد ایمانِ کامل ہے جو انسان کو جنت کا مستحق بنا دیتا ہے اور دخولِ نار سے بچاتا ہے چنانچہ اس حدیث میں ہ۔

لَا يَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ | زانی زنا نہیں کرتا مگر وہ مومن ہو

اس میں زانی سے ایمان کی نفی فرمائی گئی ہے تو اس سے ایمانِ کامل ہی کی نفی مراد ہے۔ اصل ایمان کی نفی مراد نہیں ہے۔ اسی طرح احادیث میں آیا ہے کہ جس نے قصداً نماز ترک کر دی اس نے کفر کیا۔ قرآن میں ہے۔ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ۔ اس سے شُبہ پیدا ہوتا ہے کہ مرتکبِ کبیرہ کافر ہے تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اس سلسلہ کی مخالف و موافق تمام احادیث و آیات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ صرف تصویر کے ایک رُخ کو دیکھ کر حکم لگانا صحیح نہیں ہے۔ یہ آیات و احادیث اپنے ظاہری معنوں پر محمول نہیں ہیں بلکہ ان کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو حکمِ الٰہی کو حکمِ الٰہی اعتقاد نہ کرے یا نماز کی فرضیت کا مُنکر ہو جائے تو وہ کافر ہے۔ چنانچہ اس مضمون کی آیات و احادیث کا جو مطلب ہم نے بیان کیا ہے اس پر اجماع ہے۔

ایمان کم یا زیادہ نہیں ہوتا

ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور اس کے ۱۲ دلائل بھی لکھ چکے ہیں جن کو آپ دوبارہ ذہن میں لے آئیے کیونکہ جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے تو اس سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ ایمان کم یا زیادہ نہیں ہوتا جس کی تقریر یہ ہے۔

ایمان کی زیادتی و نقصان کے اختلاف کا مبنی اس امر پر ہے کہ اعمالِ صالحہ جزوِ ایمان ہیں یا نہیں؟

جن لوگوں نے اعمالِ صالحہ کو حقیقتِ ایمان میں داخل مان کر ان کو جزوِ ایمان قرار دیدیا۔ ان کے نزدیک اعمالِ صالحہ کی کمی بیشی کی وجہ سے اصلِ ایمان میں کمی بیشی کا واقع ہونا بدیہی امر ہے کیونکہ جب اعمالِ صالحہ جزوِ ایمان قرار پائیں گے تو اعمال کی کمی بیشی کی وجہ سے اصلِ ایمان میں بھی لامحالہ کمی بیشی ہو جائے گی۔

لیکن ــــ محققین و متکلمین اور سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک تصدیقِ یقینی کا نام ایمان ہے جو کمی بیشی کو قبول نہیں کرتی۔ اقرارِ لسانی اور دیگر اعمالِ صالحہ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک جزوِ ایمان نہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کا غیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ایمان کو اعمالِ صالحہ کا غیر قرار دیتے

ہوئے اعمال کا عطف ایمان پر فرمایا۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ | بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اعمالِ صالحہ کیے

عطف میں حقیقت یہ ہے کہ معطوف علیہ معطوف کا مغائر ہو جہاں مغائرت نہ ہو وہاں مجاز ہوگا اور ظاہر ہے کہ تعذّرِ حقیقت کے بغیر مجاز صحیح نہیں۔ جن آیات میں ایمان پر اعمالِ صالحہ کا عطف وارد ہے۔ وہاں تعذرِ حقیقت پر کوئی دلیل قائم نہیں اس لیے بلا وجہ مجاز مراد لینا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا ——— تو جب امام اعظم علیہ الرحمہ کے نزدیک ایمان محض تصدیقِ قلبی کا نام ہے تو ایمان کا کمی و زیادتی کو قبول نہ کرنا بالکل واضح ہے۔ کیونکہ ظنّ و یقین میں یہ فرق ضرور ہوتا ہے مگر یقین اور یقین میں اُس تفاوت کا وجود کسی طرح متصور نہیں۔

پس ایمان کی تفسیر جب تصدیقِ یقینی کے ساتھ کی جائے تو اس میں کمی بیشی اور قوت و ضعف کا پایا جانا ممکن نہیں کیونکہ یقین میں احتمال نقیض نہیں ہوتا۔ اگر یقین میں ادنیٰ ترین کمی بیشی بھی پائی جائے تو وہ متحملِ نقیض ہو کر یقین نہ رہے گا۔ جب وہ یقین ہی نہ رہا تو اس کو ایمان کیسے کہا جائیگا۔ معلوم ہوا کہ اصل ایمان زیادتی و نقصان اور قوت و ضعف کو قبول نہیں کرتا۔

فائدہ | بعض لوگ کمالاتِ ایمان اور اماراتِ تصدیق کی کمی بیشی کو نفسِ ایمان کی کمی بیشی سمجھ لیتے ہیں۔ ان کا یہ سمجھنا صحیح نہیں کیونکہ ایمان و تصدیق ایک علیحدہ چیز ہے اور اس کے کمالات و امارت دوسری چیز ہے ایک کی کمی بیشی کو دوسرے کی کمی بیشی سمجھ لینا صحیح نہیں۔

جن آیات میں ایمان کی زیادتی مذکور ہے وہاں نفسِ ایمان یعنی تصدیقِ یقینی مراد نہیں بلکہ لفظ ایمان سے وہ ایمان کامل مراد ہے جو اپنے کمالات و امارات اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ ہو۔ اس لیے ان آیات سے نفسِ ایمان کی زیادتی ثابت نہ ہوئی بلکہ اعمالِ صالحہ اور کمالات و اماراتِ ایمان کی زیادتی ثابت ہوئی جو امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب کی بہترین تائید و تصدیق ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آیاتِ زیادتی ایمان میں ثمراتِ ایمان کی زیادتی مراد ہو مثلاً رقتِ قلب اور تزکیہ نفس و قرب الی الحق سبحانہٗ و تعالیٰ وغیرہ ذالک۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آیاتِ مبارکہ میں مطلقاً ایمان کی زیادتی مراد نہیں بلکہ اشیاءِ مصدقہ مؤمن بہا کی زیادتی کے لحاظ سے ایمان کی زیادتی بیان فرمائی گئی ہے۔

بنا بریں جن آیات و احادیث میں ایمان کی زیادتی و نقصان یا قوت و ضعف وارد ہے۔ ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اصل ایمان کم و بیش یا قوی و ضعیف ہوتا ہے بلکہ ان سے علامات و کمالاتِ ایمان (جو اصلِ ایمان پر زائد امور ہیں) ثمراتِ ایمان کی کمی بیشی اور تفاوت مراد ہے یا ایمانِ تفصیلی مراد ہے جو اپنے متعلقات کی کثرت کے اعتبار سے ایمانِ اجمالی کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

۲۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ اجمالی اور تفصیلی ——— ایمانِ اجمالی یہ ہے کہ جو کچھ شارع علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے مجمل طور پر ان کی تصدیق کرنا اور ایمان تفصیلی یہ ہے کہ جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ تصدیق کرنا اور ہر چیز پر تفصیلاً ایمان لانا۔ صحابہ کرام اولاً

اجمال و تفصیل کا فرق اب بھی ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ ایک شخص جو اوّلاً ایمان لایا اسے تمام احکام شرعیہ پر

اجمالی ایمان لاتے تھے۔ پھر وقتاً فوقتاً جو آیات و احکام نازل ہوتے تھے ان کی تصدیق علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایمانِ اجمالی امر واحد[۲] (ما جاء به الرسول صلی الله علیه وسلم) سے متعلق ہے اور ایمان تفصیلی امور متعددہ (احکامِ مفصلہ) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اگر ایمان مفصل کو باعتبار اس کے متعلق کے زیادہ کہہ دیا جائے تو یہ بالکل صحیح ہے۔ بنا بریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جن آیات میں زیادتی ایمان وارد ہے۔ وہاں ایمان تفصیلی کے متعلقات کے اعتبار سے زیادتی مراد ہے۔ اعتبار مذکور سے قطع نظر کرکے نفسِ ایمان کی زیادتی مقصود نہیں۔

الغرض ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور حقیقت تصدیقِ شی واحد ہے جو زیادتی و نقصان کو قبول ہی نہیں کرتی لہذا جن آیات و حدیث میں ایمان کی کمی یا زیادتی کا بیان ہے وہاں نفسِ ایمان بمعنیٰ محض تصدیقِ قلبی مراد نہیں ہے بلکہ لفظِ ایمان سے وہ ایمان مراد ہے جو اپنے کمالات و امارات اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ ہو لہذا اس سے نفسِ ایمان میں کمی زیادتی ثابت نہ ہوئی بلکہ اعمال صالحہ اور ایمان کے کمالات اور اس کی علامتوں میں زیادتی ثابت ہوئی۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں اگر امام اعظم کے مسلک پر یہ شبہ وارد کیا جائے کہ جب امام صاحب کے نزدیک اصل ایمان زیادتی و نقصان اور قوت و ضعف کے تفاوت کو قبول نہیں کرتا تو پھر تو تمام مومن ادنیٰ، اعلےٰ، نبی غیر نبی اصل ایمان میں مساوی ہو گئے اور اعلیٰ و ادنیٰ، نبی، غیر نبی میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ اس صورت میں اولیاء اللہ اور حضرات انبیاء علیہم السلام حتیٰ کہ حضور سید عالم نورِ مجسم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قدح پیدا ہوتی ہے اور ان کے فضائل و کمالات بھی باقی نہیں رہتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں کمی بیشی متصور نہیں وہاں مساوات کیونکر متصور ہو سکتی ہے اور اگر ہو بھی تو یہ مساوات کسی برگزیدہ ہستی کے حق میں موجب قدح یا اس کی فضیلت کے کب منافی ہے ——— دیکھئے ماہیتِ نبوت میں تشکیک نہیں یعنی نفس نبوت کمی بیشی کو قبول نہیں کرتی مگر اس کے باوجود قرآنِ مجید میں فرمایا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ | یہ رسول ہیں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔

اسی طرح مخلوقیت اور حدوث وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جن میں کمی بیشی کا تصور نہیں ہو سکتا۔ لیکن بایں ہمہ اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہر مخلوق و حادث اپنے کمالاتِ مخلوقیت کے اعتبار سے بھی مساوی ہے اور ایک دوسرے پر کسی اعتبار سے بھی امتیاز و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ ایسا ہو تو پھر تو نبی و غیر نبی تو علیحدہ رہے مومن و کافر میں بھی کوئی

---

[۲] بعثہٗ واحدۃً اطلاع نہیں ہوئی۔ اس لیے اس کا وہ ایمان اجمالی ہے۔ اس کے بعد جب اسے احکام شرعیہ کی تفصیلات کا علم تدریجاً ہوا اور اس نے الگ الگ ان کی تصدیق کی تو یہ ایمان اس کے لیے ایمان تفصیلی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ما جاء بہ الرسول صلے اللہ علیہ وسلم اور احکام مفصلہ ایک ہی چیز ہیں لیکن وہ اجمال کے اعتبار سے امورِ کثیرہ اور اعتبارات کا لحاظ ضروری ہے۔ لولا الاعتبارات لبطلت الحکمۃ۔

امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ پس اسی طرح یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ جس طرح اصل مخلوقیت میں مساوی ہونے سے کمالات مخلوقیت میں مساوی ہونا لازم نہیں اسی طرح نفسِ ایمان و تصدیق میں مساوات کمالات ایمانیہ کی مساوات کو مستلزم نہیں ہے۔

سیدنا امام اعظم علیہ الرحمۃ کے نزدیک ایمان تفصیلی بہ اعتبار اپنے تعلق کے ایمانِ اجمالی سے زیادہ ہے کیونکہ ایمان اجمالی امرِ واحد سے متعلق ہے اور ایمانِ تفصیلی کا تعلق امورِ کثیرہ سے ہے۔

عارفِ کامل پر جب شیونِ الٰہیہ (اللہ تعالےٰ کی شانوں) کا انکشاف ہوتا ہے تو اس پر جو شانِ ایزدی منکشف ہوتی ہے وہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ پھر جب دوسری شان کا انکشاف ہوتا ہے تو وہ اس پر ایمان لاتا ہے۔ شیونِ الٰہی غیر متناہی ہیں۔ اس لیے ان کی معرفت کی بھی کوئی حد نہیں۔ اس صورت میں عارف کا ایمان معرفت کے ہر درجہ پر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے تمام انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کرام کا یہی حال ہے۔ جس کا عرفان زیادہ ہوگا۔ اس کا ایمان تفصیلی بھی زیادہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم سب عارفوں کے سردار ہیں۔ اس لیے سرکار ابد قرار صلے اللہ علیہ وسلم کا ایمان سب سے زیادہ اور تمام عالم سے اکمل و اقویٰ اور برتر و بالا ہوگا۔ اس لیے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى	پیارے حبیب صلے اللہ علیہ وسلم! آپ کی آئندہ گھڑی گذشتہ گھڑی سے بہتر ہوتی رہے گی۔

عارفین اور حضرات انبیاء کرام کے کمالاتِ ایمانی کو ان کا غیر کسی طرح نہیں پا سکتا۔ چہ جائیکہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمانِ مبارک کے کمال کو کوئی پہنچ سکے ؎

مُنَزَّهٌ عَنْ شَرِيْكٍ فِيْ مَحَاسِنِهٖ　|　فَجَوْهَرُ الْحُسْنِ فِيْهِ غَيْرُ مُنْقَسِمٖ

ترجمہ:۔ ہمارے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خوبیوں میں شریک سے منزّہ ہیں۔ آپ نے حُسن کا جوہر ہے وہ قابل تقسیم نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ نفسِ ایمان میں مساوات ایمانِ تفصیلی میں مساوات کو مستلزم نہیں ہے۔ نفسِ ایمان میں گو کمی بیشی متصور نہیں ہے لیکن ایمانِ تفصیلی میں بہرحال کمی و بیشی لازمی ہے اور یہی سیدنا امام اعظم علیہ الرحمۃ کا مسلک ہے اور اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ سیدنا امام اعظم کے نزدیک عام مومنین کا ایمان عارفین کے ایمان کے من کل الوجوہ مساوی نہیں ہے۔ کیونکہ امام کے نزدیک ایمان تفصیلی بہ اعتبار اپنے متعلق کے ایمانِ اجمالی سے زیادہ ہے اس لیے کہ ایمان اجمالی امرِ واحد ہے اور ایمانِ تفصیلی کا تعلق امورِ کثیرہ سے ہے اور ظاہر ہے کہ نفسِ ایمان میں مساوات کمالاتِ ایمانیہ میں مساوات کو مستلزم نہیں ہے شرح فقہ اکبر میں ہے:۔

وروی عن ابی حنیفۃ رحمۃ اللہ انہ قال ایمانی کایمان جبرئیل ولا اقول مثل ایمان جبرئیل لان المثلیۃ تقتضی	اور جناب ابو حنیفہ سے مروی ہے کہ فرمایا میرا ایمان جبرئیل کے ایمان کی طرح ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ جبرئیل کے ایمان کی مثل ہے کیونکہ مثلیت تمام صفات میں ہوتی ہے اور

المساوات فی کل الصفات والتشبیہ لا تقتضیہ بل یکفی لاطلاقہ المساوات فی بعضہ فلا احد یساوی بین ایمان احاد الناس وایمان الملائکۃ والانبیاء علیہم السلام من کل وجہ (شرح فقہ اکبر لعلی قاری ص۱۱۳)

تشبیہ تمام میں نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے اطلاق کے لیے بعض وجوہ سے مساوات کافی ہے۔ پس عام لوگوں کا ایمان ملائکہ کرام اور انبیاء کرام کے ایمانوں کے من کل الوجوہ مساوی نہیں ہے۔ (شرح فقہ اکبر)

بَابُ قَوْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

باب حضور اکرم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے اس ارشاد

بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ وَھُوَ قَوْلٌ وَفِعْلٌ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ

کے بیان میں کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے ایمان قول وفعل کو کہتے ہیں اور یہ کم اور زیادہ ہوتا ہے

تشریح ایمان کی تعریف اور ایمان سے متعلق پوری بحث اوپر گزر چکی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ امام بخاری علیہ الرحمۃ کے نزدیک ایمان کی تعریف وہی ہے جو امام شافعی کے نزدیک ہے اور چونکہ ان کے نزدیک اعمال حقیقتِ ایمان میں داخل ہیں اس لیے امام بخاری ایمان کی کمی بیشی کے قائل ہیں۔

۱۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی لِیَزْدَادُوْا اِیْمَانًا مَعَ اِیْمَانِھِمْ — اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ اور ایمان بڑھائیں۔

۲۔ وَزِدْنٰھُمْ ھُدًی — ہم نے ان کی ہدایت بڑھا دی۔

۳۔ وَیَزِیْدُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اھْتَدَوْا ھُدًی — جنہوں نے ہدایت پائی اللہ ان کے ایمان کو بڑھاتا ہے

۴۔ وَالَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ ھُدًی وَّاٰتٰھُمْ تَقْوٰھُمْ — جنہوں نے ہدایت پائی اللہ نے ان کے ایمان و تقوٰی میں زیادتی فرمائی۔

۵۔ وَیَزْدَادُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِیْمَانًا — تاکہ ایمان والوں کا ایمان زیادہ ہو جائے۔

۶۔ اَیُّکُمْ زَادَتْہُ ھٰذِہٖ اِیْمَانًا فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْھُمْ اِیْمَانًا — تم میں کس کا ایمان بڑھایا اس صورت نے انہیں کا جو ایمان لائے۔

۷۔ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا — ان کو ڈرایا تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا

۸۔ مَا زَادَھُمْ اِلَّا اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا (بخاری) — نہیں بڑھا ان کا مگر ایمان اور تابعداری

تشریح ۱۔ ان آیات میں پہلی آیت سورۂ فتح کی ہے اور دوسری سورۂ کہف کی۔ تیسری سورہ مریم کی، چوتھی سورہ قتال کی۔ پانچویں سورۂ مدثر کی، چھٹی سورہ توبہ کی، ساتویں سورۂ آلِ عمران کی اور آٹھویں آیت سورۂ احزاب کی ہے۔ یہ آٹھ آیتیں امام بخاری اس امر کے ثبوت میں لائے ہیں کہ ایمان کم اور زیادہ ہوتا۔ جس کا جواب ہم اوپر تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں نفسِ ایمان کی کمی یا زیادتی کا بیان نہیں ہے بلکہ

ایمان کے ثمرات و علامات کی زیادتی کا بیان ہے۔

۲۔ ان آیات کے بعد امام بخاری علیہ الرحمہ اپنے دعوے کے ثبوت میں آثارِ صحابہ و اقوالِ علماء ذکر فرماتے ہیں جو یہ ہیں:۔

وَالْحُبُّ فِي اللهِ وَالْبُغْضُ فِي اللهِ مِنَ الْإِيْمَانِ (بخاری)

اور اللہ کیلئے دوستی اور اللہ ہی کے لیے دشمنی رکھنا علاماتِ ایمان ہے۔

تشریح: اسی مضمون کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے:۔

اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَلْحُبُّ فِي اللهِ والبغض فِي اللهِ (بخاری)

بہترین اعمال میں یہ ہے کہ اللہ ہی کے لیے محبت کی جائے اور اسی کے لیے دشمنی

اس حدیث میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ مومن کے عمل کی غرض و غایت رضاءِ الٰہی ہونی چاہیئے اور حُبّ و بُغض کو خصوصیت کے ساتھ اس لیے بیان فرمایا کہ حُبّ و بغض پر ہی تمام معاملاتِ دینی و دُنیوی کا مدار ہے۔ جب یہ دونوں ہی خدا کے لیے ہوں گے تو پھر انسان سعادتِ دارین حاصل کرلے گا۔ امام بخاری غالباً اس حدیث کو بھی ایمان کی کمی و زیادتی پر بطور دلیل لائے ہیں۔ وجہ استدلال ان کا یہ ہے کہ حُبٌّ فِي اللهِ اور بغض فی اللہ بھی ایمان میں داخل ہے اور دوستی و دشمنی کم یا زیادہ ہوا کرتی ہے تو کمی و زیادتی ایمان میں نہ ہوئی بلکہ ایمان کی علامتوں اور اس کے ثمرات میں ہوئی۔

وَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ اِلٰى عَدِيِّ ابْنِ عَدِيٍّ اَنَّ لِلْاِيْمَانِ فَرَائِضَ وَشَرَائِعَ وَحُدُوْدًا وَّسُنَنًا فَمَنِ اسْتَكْمَلَهَا اِسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَكْمِلْهَا لَمْ يَسْتَكْمِلِ الْاِيْمَانَ فَاِنْ اَعِشْ فَسَاُبَيِّنُهَا لَكُمْ حَتّٰى تَعْمَلُوْا بِهَا وَاِنْ اَمُتْ فَمَا اَنَا عَلٰى صُحْبَتِكُمْ بِحَرِيْصٍ

حضرت عمر بن عبد العزیز نے عدی بن عدی کو لکھا کہ ایمان کے لیے فرائض و عقائد حدود اور سُنن ہیں تو جس نے ان کو پورا کیا اس نے ایمان کو پورا کیا اور جس نے ان کی پروا نہ کی اس نے ایمان کو پُورا نہ کیا۔ اگر میں زندہ رہا تو تم سے ان سب امور کو بیان کروں گا کہ تم اس پر عمل کرو اور اگر میں زندہ نہ رہا تو مجھے تمہاری ہم نشینی کی آرزو نہیں ہے

تشریح یہاں چند امور قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۔ فرائض سے مراد وہ اعمال جو فرض کئے گئے جیسے نماز، زکوٰۃ وغیرہ شرائع سے مراد عقائد دینیہ، حدود یعنی محرمات اور ممنوعات۔ سُنن یعنی مندوبات و مستحبات ۲۔ امام بخاری نے عمر بن عبد العزیز کے اس قول کو ایمان کے کم و زیادہ ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز حضرت عمر بن عبد العزیز تابعی ہیں۔ آپ نے حضرت انس اور عبد اللہ بن جعفر وغیرہ سے مُلاقات کی ہے۔ حضرت انس نے عمر بن عبد العزیز کے پیچھے اس وقت نماز پڑھی جب کہ آپ خلیفہ نہ ہوئے تھے تو اس وقت حضرت انس نے فرمایا تھا عمر بن عبد العزیز کی نماز حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی نماز کے مشابہ ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز ۹۹ھ میں خلیفہ ہوئے اور دو سال کچھ دن آپ کی خلافت رہی آپ نہایت نیک' پرہیزگار عادل خلیفہ تھے۔ دیر سمعان جو حمص میں ہے۔ رجب کے مہینہ میں ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کو مجدد دین امت میں شمار کیا گیا ہے۔ آپ نے بوقت وفات یہ وصیت کی تھی کہ حضور اکرم علیہ السلام کے موئے مبارک و ناخن مبارک قبر میں ان کے ساتھ رکھے جائیں۔

فائدہ ۱۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت تک تمام صحابہ وفات پا چکے تھے ۲۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مذکورہ بالا احکام عدی بن عدی کو لکھے جو آپ کی طرف سے موصل میں گورنر تھے ۳۔ عدی بن عدی بھی تابعی ہیں۔ انہوں نے اپنے والد اور اپنے چچا عمر بن وہب بن عمیرہ سے روایت کی ہے جو دونوں اصحابی تھے۔ خود عدی سے ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ روایت کرتے ہیں۔ لیکن بخاری و مسلم و ترمذی نے ان سے کوئی روایت نہیں کی۔

آیہ لیطمئن قلبی کی تفسیر

(قَالَ اِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ) وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ

(حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی) یقین کیوں نہیں۔ مگر یہ چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آئے۔ (بخاری)

۱۔ اس آیت کو امام بخاری ایمان کے کم و بیش ہونے کے ثبوت میں لائے ہیں ۲۔ اس آیت کی مختصر تفسیر یہ ہے سمندر کے کنارے ایک آدمی مرا پڑا تھا۔ جوار بھاٹے میں پانی چڑھتا اترتا ہے۔ جب پانی چڑھتا تو مچھلیاں اس لاش کو کھاتیں۔ جب اُتر جاتا تو جنگل کے درندے کھاتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ ملاحظہ فرمایا تو آپ کو شوق ہوا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ مُردے کس طرح زندہ کیے جائیں گے۔ آپ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ اے رب مجھے یقین ہے کہ تو مُردوں کو زندہ فرمائیگا اور ان کے اجزا دریائی جانوروں اور درندوں کے پیٹ اور پرندوں کے پوٹوں سے جمع فرمائے گا لیکن میں یہ عجیب و غریب منظر دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ مفسّرین کا یہ قول بھی ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تو ملک الموت حضرت رب العزت سے اذن لے کر آپ کو یہ بشارت سنانے آئے۔ آپ نے بشارت سن کر اللہ کی حمد کی اور ملک الموت سے فرمایا کہ اس خلعت کی علامت کیا ہے۔ انہوں نے عرض کی یہ کہ اللہ آپ کی دُعا قبول فرمائے گا اور آپ کے سوال پر مُردے زندہ فرمائے گا تب ابراہیم علیہ السلام نے یہ دُعا کی (خازن) —— جب آپ نے یہ دُعا کی کہ اے رب تو مُردے کیسے زندہ کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کیا تجھے یقین نہیں؟ مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ عالم غیب و شہادت ہے۔ اس کو حضرت ابراہیم کے کمال ایمان و یقین کا علم ہے باوجود اس کے کہ یہ سوال فرمانا کیا تجھے یقین نہیں' اس لیے ہے کہ سامعین کو سوال کا مقصد معلوم ہو جائے اور جان لیں کہ یہ سوال کسی شک و شبہ کی بنا پر نہ تھا (بیضاوی جمل)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی بَلٰی' کیوں نہیں۔ مگر چاہتا ہوں کہ میرے دل کو طمانیت حاصل ہو جائے۔ حضرت شیخ ابن الہمام مسامرہ میں لکھتے ہیں کہ طمانیت کے معنیٰ سکون' قرار اور ٹھہراؤ کے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا سوال ہی ایسا تھا جیسے کوئی مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے حالات بیان کرنے لگے اور تمہیں مکہ یا مدینہ خود جا کر ان کے حالات کو دیکھنے کا اشتیاق

پیدا ہو جائے تو جس طرح اشتیاق کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں بیان کرنے والے کے بیان میں شک ہے بلکہ اس کا
یہ ہے کہ تم نے پوری طرح یقین کر لیا ہے۔ اس لیے تو بچشم خود ان حالات کو دیکھنے کا شوق و اضطراب پیدا ہو گیا۔
یہ ہی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے سوال کے اندر کام کرنے والے شوق و اضطراب کا حال ہے کہ انہیں شک و شبہ قطعا
تھا۔ بلکہ یقین کامل تھا کہ اللہ تعالےٰ مُردوں کو زندہ فرمائے گا اور اسی یقین کے تحت شوقِ نظارہ سوال بن کر اُبھرا
حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس علامت سے میرے دل کو تسکین
جائے کہ تو نے مجھے اپنا خلیل بنایا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ چار پرندے لے کر اپنے ساتھ ہلا لیجئے۔ آپ
مور، مُرغ، کبوتر، کوا یہ چار پرندے لیے۔ انہیں بحکم الٰہی ذبح کیا۔ ان کے پَر اُکھاڑے اور قیمہ کر کے ان کے ا
باہم خلط کر دیے اور اس مجموعہ کے کئی حصّے کیے۔ ایک ایک حصہ ایک ایک پہاڑ پر رکھا اور ان کے سر اپنے پاس محفو
رکھے۔ پھر فرمایا چلے آؤ حکمِ الٰہی سے۔ یہ فرماتے ہی وہ اجزاء اُڑے اور ہر ہر جانور کے اجزاء علیحدہ علیحدہ ہو کر
ترتیب سے جمع ہوئے اور پرندوں کی شکلیں بن کر اپنے پاؤں سے دوڑتے ہوتے اپنے اپنے سروں سے مل کر
پہلے کی طرح مکمل پرند بن کر اُڑ گئے اور اس طرح سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کو قرار آیا اور ان کے نو
ایمان میں زیادتی ہو گئی۔

وَقَالَ مُعَاذٌ اِجْلِسْ بِنَا نُؤْمِنْ سَاعَةً (بخاری)

اور معاذ نے کہا ہمارے ساتھ بیٹھو تاکہ ایک گھڑی دین کی باتیں کریں۔

تشریح ۱۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے یہ جملے حضرت اسود بن بلال سے کہے تھے ۲۔ امام بخاری
حضرت معاذ کے اس قول کو اس امر کے ثبوت میں لائے ہیں کہ ایمان کم و بیش ہوتا ہے۔ تقدیر اس
یہ ہے کہ حضرت معاذ مومن ہی تھے۔ پھر ان کا یہ فرمانا کہ مومن ہوں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ ذکرِ خیر کریں اور اپنا ا
بڑھائیں یعنی احکامِ دین بیان کریں اور ذکرِ خیر میں مشغول ہوں۔ یہی نُؤْمِنْ سَاعَةً کا مفہوم ہے۔

معاذ بن جبل رضی اللہ تعالےٰ عنہ معاذ بن جبل انصاری خزرجی جلیل القدر عظیم المرتبت امام العا
رئیس الفقہاء عابد و زاہد قاری اور فقیہہ مشہور اصحابی ہیں۔ ابو عبد
کنیت ہے۔ نہایت خوبصورت، جوانمرد اور سخی تھے۔ آپ انصار کے ان ستر اشخاص میں سے ہیں جو بیعت عقبہ ثا
میں حاضر ہوئے تھے۔ ۱۸ سال کی عمر میں ایمان لائے۔ غزوۂ بدر اور دوسرے تمام غزوات میں شریک رہے۔ حضر
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بارہا آپ کی تعریف فرمائی ہے۔ کبھی آپ نے فرمایا کہ قرآنِ حکیم چار آدمیوں سے پڑھو
ابن مسعود، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، ابی بن کعب اور معاذ بن جبل سے —— کبھی فرمایا کہ حلال و حرام کے سب سے
زیادہ جاننے والے معاذ بن جبل ہیں —— یہ بھی ارشاد فرمایا کہ معاذ قیامت کے دن علماء کے آگے بہ مقدار ایک
بڑے ٹیلے کے آئیں گے —— اور کبار صحابہ بھی معاذ بن جبل کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ حضرت عمر فاروق
رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے تھے کہ عورتیں عاجز ہو گئی ہیں کہ اب معاذ رضی اللہ تعالےٰ عنہ جیسا بچہ جنیں۔ اگر معاذ نہ ہوتے

ہلاک ہوجاتا ـــــ اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالےٰ عنہ حضرت عمر فاروق اللہ تعالےٰ عنہ کے کس قدر گہرے مشیر تھے۔

الغرض حضرت معاذ کے مناقب وفضائل بہت ہیں۔ جب حضور علیہ السلام نے ان کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا تو دعاؤں سے سرفراز فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ معاذ بن جبل امام الفقہاء تھے اور قیاس پر عمل کرنے کی انھوں نے نبی اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سب سے پہلے اجازت حاصل کی تھی۔ عہد رسالت کے بعد حضرت ابوبکر وحضرت عمر ان سے تدبیر مملکت اور امور جہاد میں مشورہ اور مدد لیتے رہے اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی وفات کے بعد شام کی افواج اسلامیہ کے سپہ سالار اعظم مقرر ہوئے۔ طاعون عمواس میں حضرت ابو عبیدہ کی وفات کے چند بعد آپ ۱۷ھ یا ۱۸ھ میں آپ نے جوانی ہی میں ۳۳ سال یا کسی قدر زائد عمر میں وفات پائی۔ آپ سے ۱۵۰ مروی ہیں۔ ۲۰ حدیثیں ایسی ہیں جن پر بخاری ومسلم نے اتفاق کیا اور تین ایسی ہیں جن کو صرف بخاری نے ذکر ایک ایسی ہے جو صرف مسلم نے ذکر کی۔

قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ اَلْيَقِيْنُ الْاِيْمَانُ كُلُّهٗ (بخاری)

حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ یقین پورا ایمان ہے۔

اس اثر کا دوسرا ٹکڑہ ہے۔ وَالصَّبْرُ نِصْفُ الْاِيْمَانِ۔ صبر نصف ایمان ہے۔ اس سے بھی ہوا کہ ایمان کم اور زیادہ ہوتا ہے۔ یقین اس علم کو کہتے ہیں جس میں شک نہ ہو ۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعود قدر اصحابی ہیں۔

حضرت ابن مسعود مکہ میں قدم سے ایمان لائے۔ دونوں ہجرتوں میں شریک ہوئے۔ بدر اور دیگر تمام لڑائیوں میں حضور علیہ السلام کے ہمراہ رہے۔ یہ بڑے خوش قسمت صحابی ہیں۔ حضور علیہ السلام کی نعلین برداری کا شرف انہیں کو حاصل ہوا۔ جب حضور علیہ السلام تشریف فرما ہوتے تو یہ نعلین مبارک آستین میں رکھ لیتے۔ آپ کا مدینہ شریف میں ۳۲ھ میں انتقال ہوا۔ حضرت عثمان یا حضرت زبیر یا حضرت عمار بن یاسر نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کی عمر شریف کچھ اوپر ساٹھ برس کی ہوئی۔ آپ سے ۸۴۸ حدیثیں مروی ہیں۔ ان میں سے ۶۴ حدیثوں پر بخاری ومسلم نے اتفاق کیا اور ۲۱ حدیثیں ایسی ہیں جن کو صرف بخاری نے اور ۳۵ ایسی ہیں جن کو صرف مسلم نے ذکر کیا۔ رضی اللہ تعالےٰ عنہ

وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيْقَةَ التَّقْوٰى حَتّٰى يَدَعَ مَا حَاكَ فِي الصَّدْرِ (بخاری)

اور حضرت ابن عمر نے فرمایا۔ انسان تقویٰ کی حقیقت کو نہیں پاسکتا جب تک اس بات سے کنارہ کشی نہ کرے جو دل میں کھٹکے

تشریح تقویٰ۔ خشیت الٰہی کا نام ہے یعنی اللہ سے ڈر کر معاصی کو ترک کرنا۔ حَاكَ يَحِيْكُ اس کے معنے تاثیر کے ہیں جیسے کہتے ہیں ضَرَبَهٗ فَمَا حَاكَ فِيْهِ السَّيْفُ۔ اس نے تلوار چلائی مگر تلوار نے

تاثیر نہ کی۔ امام بخاری اس اثر کو بھی اس امر کی دلیل لائے ہیں کہ ایمان کم اور زیادہ ہوتا ہے کیونکہ حضرت عمر نے فرمایا بندہ حقیقتِ تقویٰ (ایمان) کو اس وقت تک نہیں پا سکتا جب تک ان امور کو ترک نہ کر دے جو دل میں کھٹکیں یعنی جس کام کے متعلق یہ شبہ ہو جائے کہ شاید خلافِ شرع ہو۔ اس کو بھی چھوڑ دے جس سے واضح ہوا کہ بعض لوگ حقیقت ایمان کو پا لیتے ہیں اور بعض نہیں جو نہیں پاتے ان کا ایمان ناقص ہوتا ہے۔ لہٰذا ایمان میں کمی بیشی ہونا ثابت ہوا۔

حضرت ابن عمرؓ حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب قرشی عدوی مکی۔ آپ مکہ میں اپنے والد مکرم جناب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ ایمان لائے۔ جب کہ آپ صغیر السن تھے۔ آپ خندق اور اس کے بعد کی لڑائیوں میں شریک ہوئے۔ آپ مسلمانوں کے امام اور مشہور مفتیوں میں سے ہیں اور عبادلہ اربعہ میں اوّل ہیں۔ آپ سے دو ہزار چھ سو تین حدیثیں مروی ہیں۔ صحاح ستہ میں آپ سے کل ۱۶۳۰ حدیثیں روایت کی گئی ہیں جن میں سے ۱۷۰ پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے اور ۸۱ حدیثیں ایسی ہیں جن کو صرف بخاری نے اور ۳۱ ایسی ہیں جن کو صرف مسلم نے ذکر کیا۔ آپ نے موضع فخ میں ۷۳ھ یا ۷۴ھ میں حضرت ابن زبیر کی شہادت کے تین ماہ بعد یا ۸۶ھ میں وصال فرمایا اور حجاج نے نماز جنازہ پڑھائی۔

وَقَالَ مُجَاهِدٌ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا اَوْصَيْنَاكَ يَا مُحَمَّدُ وَاِيَّاهُ دِيْنًا وَاحِدًا

(بخاری)

اور امام مجاہد نے کہا "تمہارے لیے وہی دین ہے جس کی وصیت کی تھی۔ حضرت نوح کو" کی تفسیر میں فرمایا یعنی حکم دیا ہم نے تم کو اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور نوح کو ایک ہی دین کا۔

اس آیت اور اس کی تفسیر سے اتنی بات معلوم ہوئی کہ جس دین کا حکم اللہ عزّ وجل نے حضرت نوح اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو دیا۔ اسی دین کا حکم حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔

امام مجاہد یہ فقہ، تفسیر اور حدیث میں امام مانے گئے ہیں۔ ان کے والد کا نام جبر تھا۔ یہ عبداللہ بن سائب مخزومی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ امام مجاہد حضرت ابن عباس و ابن عمر و ابوہریرہ و جابر و عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہم جلیل القدر صحابہ کرام سے روایت کرتے ہیں۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ میں نے تین مرتبہ حضرت ابن عباس پر قرآن پیش کیا ہے۔ آپ کی عمر ۸۳ سال کی ہوئی۔ آپ نے مکہ میں بحالت سجدہ ۱۰۰ھ یا ۱۰۲ھ یا ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ میں وفات پائی۔

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا سَبِيْلًا وَّسُنَّةً

(بخاری)

اور حضرت ابن عباس نے آیہ مبارکہ شرعۃ ومنہاجا کی تفسیر سبیل اور سنّت سے کی۔

۱۔ یعنی آیہ مبارکہ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کا راستہ اور طریقہ بنایا۔ حضرت ابن عباس نے شرعۃ کی تفسیر لفظ سبیل سے کی۔ جس کے معنی راستہ کے ہیں اور منہاج کی تفسیر لفظ سنت سے کی جس کے معنی طریقہ کے ہیں ۲۔ یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلی آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے

کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہے اور دوسری آیت یعنی لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا سے یہ ثابت ہے کہ ہر نبی کا دین علیحدہ ہے۔ جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں اس امر کا بیان ہے کہ اصولِ دین میں تمام انبیاء متحد ہیں اور دوسری آیت میں فروعِ دین میں اختلاف کا بیان ہے۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں تناقض نہیں۔

۳۔ ان دونوں آیتوں کا باب سے کیا تعلق ہے۔ شارحین نے اُس کی مناسبت کے بیان سے سکوت کیا ہے۔

وَدُعَاؤُكُمْ اِيْمَانُكُمْ (بخاری) | "دُعاءکم" کے معنیٰ "ایمانکم" کے ہیں۔

یعنی حضرت ابن عباس نے دُعاء کے معنیٰ ایمان کے کیے ہیں۔ امام بخاری اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دُعا میں کمی و زیادتی ہوتی ہے لہٰذا ایمان میں ہوگی۔ پوری آیت یہ ہے :۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَاؤُكُمْ | تم فرماؤ تم کچھ قدر نہیں میرے رب کے ہاں اگر تم اسے نہ پُوجو (ترجمہ رضویہ)

یہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اہلِ مکہ کو کہلوایا گیا تھا کہ جب تک اللہ عزوجل کی پرستش نہ کرو اس وقت تک اس کی جناب میں تمہاری کوئی قدر نہیں۔

واضح ہو کہ لفظِ دعا کے متعدد معنیٰ ہیں اور یہ لفظ قرآن پاک میں بھی متعدد معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً پکارنا، دُعا کرنا، دُعا مانگنا، بُلانا، پوجنا، تمنّا یا آرزو کرنا وغیرہ۔ لہٰذا ہر جگہ کی مناسبت کے لحاظ سے اس لفظ کے معنیٰ کیے جائیں گے۔ حضرت ابن عباس نے اس آیت میں دُعا کے معنیٰ ایمان کے کیے ہیں تو اب آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب تک تم ایمان نہ لے آؤ اس وقت تک خُدا کے ہاں تمہاری کوئی قدر نہیں ہے۔

اسلام کی بُنیاد پانچ چیزوں پر ہے

حدیث ۷ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ

حضرت ابن عمر سے ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے۔ گواہی دینا اس بات کی کہ خدا کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسُول ہیں اور نماز پڑھنا۔ زکوٰۃ دینا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

تشریح الفاظ حدیث

بُنِيَ ۔ بنی یبنی سے ہے اس کے معنیٰ بُنیاد کے ہیں۔ لفظ صلاۃ سولہ لفظوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اصل لغت میں اس کے معنیٰ سرین ہلانے کے ہیں اور شریعت میں ارکانِ مخصوصہ کے یعنی نماز پڑھنا زکوٰۃ کے معنے پاکیزگی و طہارت کے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى اس کے معنیٰ نشو و نما کے بھی آتے ہیں جیسے کہتے ہیں۔ زَكَى الزَّرْعُ یعنی کھیتی سرسبز شاداب ہوگئی اور شریعت میں زکوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ سال گزر جانے پر صرف خدا کے لیے شارع کی مقرر کردہ مدوں

اور مقدار میں اپنے مال کا ایک حصہ دینا۔ حج لغت میں قصد کرنے کو کہتے ہیں اور شریعت میں حج کا مفہوم یہ ہے کہ مخصوص مکان کی طرف مخصوص ایام میں شارع کے مقرر کردہ نظام کے مطابق قصد کرنا۔ صوم کے معنیٰ لغت میں رُکنے کے ہیں خواہ کسی بھی چیز سے رُک جائے اور شریعت میں صوم کے معنیٰ یہ ہیں کہ مسلمان کا بہ نیت عبادت صبح صادق سے غروب آفتاب تک اپنے آپ کو قصداً کھانے پینے اور جماع سے باز رکھنا۔ روزہ اور زکوٰۃ ۲ھ میں فرض ہوئے۔

مسائل حدیث

۱۔ اللہ عزوجل کی طرف سے اسلام کا جو آخری اور مکمل دستور ہمارے پاس آیا۔ اس میں توحید خداوندی اور رسالتِ محمدی کی شہادت کے بعد نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج بیت اللہ کو ارکانِ اسلام قرار دیا گیا ہے۔ نماز فرض ہے اور اس کی فرضیت کا منکر کافر ہے۔ جو قصداً چھوڑے اگرچہ ایک ہی وقت کی ہو وہ فاسق ہے اور جو نماز نہ پڑھتا ہو اسے قید کیا جائے۔ یہاں تک کہ توبہ کرے اور نماز پڑھنے لگے۔ ائمہ ثلاثہ مالک و شافعی و احمد رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے نزدیک سلطانِ اسلام کو اس کے قتل کا حکم ہے۔ واضح ہو کہ ائمہ ثلاثہ تارکِ صلوٰۃ کے لیے قتل کا جو حکم دیتے ہیں تو یہ بطورِ تعزیر ہے۔ اس لیے نہیں ہے کہ ان کے نزدیک تارکِ صلوٰۃ کافر ہے۔ بچہ کی جب سات برس کی عمر ہو۔ تو اس کو نماز پڑھنا سکھایا جائے اور جب دس برس کا ہو جائے تو مار کر پڑھوانا چاہئے (ترمذی) زکوٰۃ بھی فرض ہے اس کا منکر کافر ہے اور نہ دینے والا فاسق اور قتل کا مستحق ہے اور ادا میں تاخیر کرنے والا گنہگار مردود الشہادۃ ہے۔ روزہ بھی فرضِ عین ہے۔ اس کا منکر کافر ہے۔ بلا عذرِ شرعی روزہ نہ رکھنے والا سخت گنہگار ہے اور عام طور پر کھلے بندوں روزے کا احترام نہ کرنے والا مستحقِ تعزیر ہے۔ حج ۹ھ میں فرض ہوا اس کی فرضیت بھی قطعی ہے اس کا منکر بھی کافر ہے۔ عمر بھر میں حج صرف ایک بار فرض ہے۔

۲۔ ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ میں سے کسی کا بھی تارک مسلم نہیں ہے۔ لیکن اجماع اس پر منعقد ہو چکا ہے کہ ان میں سے کسی چیز کا محض تارک کافر نہیں ہوتا جب تک ان کی فرضیت کا انکار نہ کر دے۔ چنانچہ وہ حدیث جس کا مضمون یہ ہے کہ جس نے قصداً نماز ترک کی وہ کافر ہے۔ یہ وعید زجر و توبیخ پر محمول ہے یا اس سے مراد کفرانِ نعمت ہے یا یہ حدیث مُؤَوَّل ہے یعنی معنیٰ حدیث یہ ہے کہ جو شخص ان کے ترک کو حلال جانے وہ کافر ہے۔ (عینی جلد ۱ صـ۱۴۲) ۳۔ ارکانِ اسلام کے پانچ امور میں بند ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عبادت یا قولی ہوگی تو یہ شہادت ہے۔ یعنی توحید و رسالت پر ایمان لانا یا غیر قولی ہوگی۔ اس کی دو صورتیں ہیں ترکی ہوگی تو یہ روزہ ہے۔ فعلی ہوگی تو پھر اس کی دو صورتیں ہیں۔ بدنی ہوگی تو یہ نماز ہے یا مالی ہوگی تو زکوٰۃ ہے یا مالی اور بدنی دونوں سے مرکب ہوگی تو یہ حج ہے ۴۔ ان ارکانِ اسلام میں رکنِ اصلی صرف ایمان ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا دار و مدار بھی ایمان پر ہے اور یہاں نماز روزہ کو رکنِ اصلی کے ساتھ صرف اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ یہ اعظم شعائرِ اسلام ہیں ۵۔ اس حدیث میں ایمان بالانبیاء، کتبِ سماویہ و ملائکہ کا ذکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہادۃ کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو کچھ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے لائے اس کی تصدیق کرنا تو اس میں تمام عقائد اسلامیہ آ گئے۔ گویا اس حدیث میں عقائدِ اسلامیہ کی تفصیل نہیں ہے اور دوسری حدیثوں میں عقائد اسلامیہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

نوٹ:۔ اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب التفسیر میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم نے کتاب الایمان میں اور یہ حدیث رباعیاتِ بخاری سے ہے۔

بَابُ اُمُوْرِ الْاِیْمَانِ

یہ باب امور ایمان کے بیان میں

وَقَوْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللهِ اِلٰى قَوْلِهٖ الْمُتَّقُوْنَ وَقَوْلُهٗ تَعَالٰى قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (بخاری)

ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لو۔ نیکی تو یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ (اخیر آیت متقون تک پڑھیے) اور اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ مومن فلاح یافتہ ہیں (اخیر آیت تک پڑھیے) (ترجمہ بلفظہٖ ہے)

۱۔ واضح ہو کہ مرجیہ اس امر کے قائل ہیں کہ ایمان تو صرف قول کا نام ہے۔ عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ایمان لانے کے بعد چاہے انسان کتنے ہی گناہ کر لے اس سے کسی قسم کا مواخذہ نہ ہوگا۔ چونکہ مرجیہ کا یہ نظریہ کتاب وسنّت کے خلاف ہے اور کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ اس لیے امام بخاری نے ان ابواب کو قائم کرکے ان کی تردید فرمائی ہے اور کتاب وسنت کی نصوص سے یہ واضح کیا ہے کہ نجات کے لیے ایمان کے ساتھ عمل کی بھی ضرورت ہے اور یہ کہ کتاب وسنت سے بھی ایمان کے کاموں کی تفصیل معلوم ہوتی ہے ۲۔ امام بخاری نے اس باب میں دو آیتیں ذکر کی ہیں۔ پہلی آیت کا مکمل ترجمہ یہ ہے۔ "کچھ اصلی نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو۔ ہاں اصل نیکی یہ ہے کہ ایمان لائے اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور پیغمبروں پر اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے۔ رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیروں اور سائلوں کو اور غلام آزاد کرانے میں اور نماز قائم رکھے اور زکوٰۃ دے اور اپنا قول پورا کرنے والے جب عہد کریں اور صبر کرنے والے مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت۔ یہی ہیں جنہوں نے اپنی بات سچی کی اور یہی پرہیزگار ہیں۔" (بقرہ پ۲) یہ آیت یہود ونصاریٰ کے حق میں نازل ہوئی۔ کیونکہ نصاریٰ نے بیت المقدس کے مشرق کو اور یہود نے اس کے مغرب کو قبلہ بنا رکھا تھا اور ہر فریق کا گمان تھا کہ صرف اس کی طرف منہ کرنا ہی کافی ہے۔ اس آیت میں اس کا رد فرما دیا گیا کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ ہو گیا (مدارک) مفسرین کا ایک قول یہ بھی ہے کہ خطاب اہلِ کتاب اور مومنین سب کو عام ہے اور معنی آیت یہ ہیں کہ "صرف قبلہ کی طرف منہ کر لینا اصل نیکی نہیں۔ جب تک عقائد درست نہ ہوں اور دل اخلاص کے ساتھ ربّ قبلہ کی طرف متوجہ نہ ہو۔

دوسری آیت کا مکمل ترجمہ یہ ہے۔ "بے شک ایمان والے مراد کو پہنچے جو اپنی نماز میں گڑگڑاتے ہیں اور وہ جو کسی بیہودہ بات کی طرف التفات نہیں کرتے اور وہ جو زکوٰۃ دینے کا کام کرتے ہیں اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں (المؤمنون پ۱۸ رکوع ۱)

ان آیتوں میں اہلِ ایمان کے ضروری اوصاف معلوم ہوئے۔ نماز میں خشوع وخضوع بے کار باتوں سے احتراز

زکوٰۃ وخیرات دینا، عفت، پاک دامنی، امانت، ایفائے عہد، نمازوں کی پابندی۔ یہ گویا ایمان کے ثمرات ونتائج ہیں واضح ہو کہ قرآن پاک سے بھی ایمان کے اثرات ونتائج کی تفصیل ملتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط | ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں

معلوم ہوا کہ محبت الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے۔ اسی طرح سورۃ نور رکوع ۷ میں فرمایا۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ..... الخ (سورۃ نور رکوع ۷) | ایمان والوں کا حال یہ ہے کہ جب ان کو فیصلہ کرنے کے لیے اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے تو کہیں۔ ہم نے سُنا اور ہم نے مانا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلے کے سامنے سر جھکانا ہے۔ ایک اور آیت میں فرمایا:-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (سورہ حجرات ع) | ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں۔

اس سے نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں باہمی محبت وشفقت کا ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (سورۃ آل عمران رکوع ۱۷) | خدا تعالےٰ پر چاہیئے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل ایمان والوں کی نشانی ہے۔ اس قسم کی بہت سی آیات مل جاتی ہیں۔ جن میں ایمان کے نتائج وثمرات کا ذکر ہے۔ تو جیسے قرآن پاک نے ایمان کے نتائج وثمرات اور ایمانداروں کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ اسی طرح قرآن حکیم کے شارع حضور سید عالم نورِ مجسم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ایمان کے نتائج وعلامات کو بیان فرمایا ہے۔ جن کی تفصیل ابھی آپ کے سامنے آرہی ہے۔

حدیث ۵ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْاِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ شُعْبَةً وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ | حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایمان کے کچھ اوپر ساٹھ شعبے ہیں اور حیاء بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔ (بخاری)

اس حدیث کو مسلم ونسائی نے کتاب الایمان میں اور ابوداؤد وابن ماجہ نے سنت میں ذکر کیا ہے۔

فوائد ومسائل بِضع کے لفظ کا استعمال تین سے لے کر نو تک ہوتا ہے۔ شُعْبَۃٌ ش کے زیر، زبر اور پیش تینوں طرح پڑھا جائز ہے۔ اس کے معنیٰ ٹکڑے کے ہیں۔ شعب درخت کی ٹہنیوں اور ہڈی کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں اس کے معنیٰ خصلت کے ہیں۔ یعنی ایمان کی متعدد علامتیں اور خصلتیں ہیں ۲۔ یہ ظاہر ہے کہ ایمان اصل ہے اور اعمال اس کی فرع ہیں اور اس حدیث میں فرع پر ایمان کا اطلاق بطور مجاز کیا گیا ہے کیونکہ اعمالِ صالحہ ایمان کی علامتیں ہیں۔ بعض احادیث میں بضع وسبعون کا لفظ بھی آیا ہے۔ یعنی ایمان کی کچھ اوپر

ستر شاخیں ہیں۔ لیکن اس تعداد سے مراد حصر نہیں ہے کہ ایمان کی صرف اتنی ہی شاخیں ہیں بلکہ مراد تکثیر ہے یعنی ایمان کی کثرت سے شاخیں اور خصلتیں ہیں ۳۔ حیاء انسان کی ایک فطری صفت ہے اور اس سے وہ حیاء مراد ہے جو انسان کو بُرائیوں سے روکے۔ چنانچہ ترمذی کی حدیث میں فرمایا کہ اللہ تعالےٰ سے پوری حیاء کرنے کا مطلب یہ ہے :۔

اَنْ تَحْفَظَ الرَّاسَ وَمَا حَوٰی وَالْبَطْنَ وَمَا دَعٰی وَتَذْکَرَ الْمَوْتَ وَالْبَلٰی | سر و خواہشات و پیٹ اور اس کے اندر جو ہے اس کی حفاظت کر اور بلاء و مصیبت کو یاد رکھ

ایمان کے اثرات و ثمرات

علماء کی ایک جماعت نے ایمان کے کچھ اوپر ستر ثمرات و اثرات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً شیخ عبدالجلیل نے اپنی تصنیف "شعب الایمان" میں۔ اسحاق بن قرطبی نے "کتاب النصائح" میں۔ امام ابو حاتم نے اپنی کتاب "وصف الایمان" میں، امام ابو عبداللہ حلیمی نے اپنی کتاب "فوائد المنہاج" میں اور امام حافظ بیہقی نے مختصر شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کے ان ستر اثرات کو ایک ایک کرکے گنایا ہے۔ علامہ عینی نے اختصار کے ساتھ اثراتِ ایمان کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے ایمان تصدیقِ قلبی و اقرار لسانی کا نام ہے مگر نجاتِ کامل کے لیے تصدیق، اقرار اور عملِ صالح کی ضرورت ہے۔ یہ تین قسمیں ہوئیں۔

اوّل:۔ اعتقادات۔ اس کے تین شعبے ہیں ۱۔ ایمان باللہ۔ اس میں توحید اور خدا کی ذات و صفات بھی شامل ہیں ۲۔ یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ کے سوا جو کچھ ہے حادث ہے ۳۔ فرشتوں پر ایمان ۴۔ رسولوں پر ایمان ۵۔ کتبِ سماویہ پر ایمان ۶۔ ملائکہ پر ایمان ۷۔ تقدیر پر ایمان ۸۔ یومِ آخرت پر ایمان۔ اس میں سوالِ قبر۔ عذابِ قبر۔ بعث و نشور، حساب۔ میزان و پل صراط پر ایمان لانا بھی داخل ہے ۹۔ جن کے لیے اللہ تعالےٰ نے جنت یا نار کا وعدہ فرمایا ہے اس پر ایمان لانا اور وعید نار پر ایمان لانا ۱۰۔ اللہ سے محبت کرنا ۱۱۔ اللہ تعالےٰ کے لیے کسی سے محبت کرنا اور عداوت رکھنا۔ اس میں صحابہ کرام، مہاجرین و انصار اور آلِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی داخل ہے ۱۲۔ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا، اس میں نماز اور اتباعِ سنتِ نبوی داخل ہے ۱۳۔ اخلاص، اس میں ریاء اور نفاق کا ترک بھی شامل ہے ۱۴۔ توبہ ۱۵۔ خوفِ الٰہی ۱۶۔ خدا سے اُمید ۱۷۔ خدا سے کسی حال میں نااُمید نہ ہونا ۱۸۔ شکر ۱۹۔ وفا ۲۰۔ صبر ۲۱۔ تواضع ۲۲۔ بڑوں کا ادب کرنا ۲۳۔ تقدیر پر راضی ہونا ۲۴۔ توکل ۲۵۔ رحمت و شفقت، اس میں چھوٹوں پر رحم کرنا بھی شامل ہے ۲۶۔ غضب کا ترک کرنا ۲۷۔ بدگمانی سے بچنا ۲۸۔ عجب و تفاخر سے پرہیز کرنا ۲۹۔ ترک الحقد ۳۰۔ حُبِّ دنیا کا ترک۔ اس میں حُبِّ مال اور جاہ شامل ہے۔

دوم۔ وہ جن کا تعلق زبان سے ہے اس کے چھ شعبے ہیں ۱۔ زبان سے توحید کا اقرار کرنا ۲۔ قرآن پاک کی تلاوت ۳۔ علم دین کی تعلیم دینا ۴۔ دُعا ۵۔ ذکرِ الٰہی میں استغفار بھی شامل ہے ۶۔ لغو سے پرہیز کرنا

سوم۔ بدن کے اعمال۔ اس کے چالیس شعبے ہیں اور پھر ان کی تین قسمیں ہیں اوّل۔ وہ جن کا اعیان سے تعلق ہے اس کے ۱۶ شعبے ہیں ۱۔ پاکی، اس میں بدن، کپڑا، مکان کی طہارت، وضو، غسلِ جنابت و حیض و نفاس بھی

شامل ہے ۲۔ اقامۃ الصلوٰۃ۔ اس میں فرض، نفل اور قضا داخل ہے ۳۔ صدقہ، اس میں ادائے زکوٰۃ، صدقۂ فطر، جود و کرم، کھانا کھلانا اور مکان کی تکریم بھی شامل ہے ۴۔ صوم، اس میں فرضی، نفلی روزے داخل ہیں ۵۔ حج، اس میں عمرہ بھی داخل ہے ۶۔ اعتکاف، اس میں لیلۃ القدر کا قیام بھی داخل ہے ۷۔ دینی وجہ سے ہجرت کرنا ۸۔ نذر کو پوری کرنا ۹۔ غلاموں کو آزادی دلانا ۱۰۔ کفارہ کو ادا کرنا ۱۱۔ نماز اور خارج نماز میں ستر عورت ۱۲۔ قربانی کرنا ۱۳۔ القیام بامر الجنائز ۱۴۔ قرض ادا کرنا ۱۵۔ معاملات میں سچائی کو اختیار کرنا اور سود سے بچنا ۱۶۔ حق کی شہادت دینا اور اس کو نہ چھپانا۔

دوم۔ وَمَا يَخْتَصُّ بِالْاِتِّبَاعِ۔ اس کے چھ شعبے ہیں ۱۔ نکاح کے بعد زنا سے بچنا ۲۔ اہل و عیال کے حقوق ادا کرنا۔ اس میں خادموں کے ساتھ نرمی بھی شامل ہے ۳۔ والدین سے نیک سلوک کرنا ۴۔ اولاد کی تربیت کا خیال کرنا ۵۔ صلہ رحمی کو اختیار کرنا ۶۔ اپنے آقا کی اطاعت کرنا۔

سوم۔ وہ جن کا تعلق عام لوگوں سے ہے۔ اس کے اٹھارہ شعبے ہیں ۱۔ حاکم ہونے کی صورت میں عدل و انصاف کرنا ۲۔ سوادِ اعظم کے ساتھ رہنا ۳۔ نیک و صالح حاکموں کی اطاعت کرنا ۴۔ اصلاح بین الناس۔ اس میں قتالِ خوارج و بغاوت داخل ہے ۵۔ نیکی پر تعاون ۶۔ اچھی باتوں کا حکم کرنا برائی سے روکنا ۷۔ حدود کو قائم رکھنا ۸۔ راہِ خدا میں جہاد کرنا ۹۔ امانت کو ادا کرنا ۱۰۔ قرض وعدہ پر ادا کرنا ۱۱۔ ہمسایہ کی عزت کرنا ۱۲۔ معاملہ کی صفائی ۱۳۔ اسراف و تبذیر سے بچنا ۱۴۔ سلام کا جواب دینا ۱۵۔ چھینک کا جواب دینا ۱۶۔ رفاہِ عامہ کے کاموں میں حصہ لینا ۱۷۔ لہو و لعب سے پرہیز کرنا ۱۸۔ راستہ سے ایذا دینے والی چیز کو ہٹانا۔ یہ ۷۷ شعبے ہیں جو ایمان کے اثرات و نتائج ہیں (عینی جلد ۱ صـ ۱۵۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اس حدیث کے راویوں میں حضرت ابوہریرہ بہت اہم ہیں۔ آپ ازدی، دوسی، یمنی اور پھر مدنی ہیں۔ آپ کا اصل نام عبد اللہ یا عبد الرحمٰن بن صخر الدوسی ہے۔ بعض نے کہا۔ ایامِ جاہلیت میں ان کا نام عبدِ شمس تھا۔ اسلام لانے کے بعد عبد الرحمٰن رکھا گیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان کے اور ان کے والد کے نام میں اختلاف ہے اور اس میں تیس قول ہیں۔ آپ کی والدہ کا نام میمونہ یا امیمہ ہے۔ آپ کی والدہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی دعا سے مشرف بہ اسلام ہوئیں آپ کو بلیوں سے بہت محبت تھی۔ ایک دن حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی آستین میں بلی کو دیکھا تو فرمایا۔ ابا ہریرہ (بلیوں کے باپ) حضور علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد آپ ابوہریرہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ممکن ہے کہ یہ حضور علیہ السلام کے ارشاد ہی کا اثر ہو کہ لوگ ان کا اصل نام ہی بھول گئے۔ حتیٰ کہ ان کے والد کے نام میں بھی اختلاف ہو گیا۔ حضرت ابوہریرہ سے بہت زیادہ روایتیں آئی ہیں۔ آپ نے حضور علیہ السلام سے عرض کی تھی کہ مجھے حدیثیں بھول جاتی ہیں جس پر حضور علیہ السلام نے ان کی جھولی میں کچھ ڈال دیا اور فرمایا سمیٹ لو۔ بس اس وقت سے آپ جو حدیث سنتے یاد رہتی تھی۔ آپ قبیلہ ازد سے تعلق رکھتے تھے۔ ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے بعد رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہجرت کرکے آئے اور تا وفات حضور علیہ السلام کی صحبت میں رہے اور آپ سے بکثرت حدیثیں روایت کیں۔ صحاح ستہ میں ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے۔ تین سو چھیس کی تخریج بر بخاری و مسلم متفق ہیں۔ تین سو نوے کی تخریج امام بخاری اور ایک سو نوے کی تخریج پر امام مسلم منفرد ہیں اور ان سے آٹھ سو تابعین نے روایات حدیث لیں اور بیان کیں۔ سب سے زیادہ سعید ابن المسیب ان کے داماد اور ان کے مولیٰ اعراج نے اور مدینہ کے کبار تابعین نے ان سے بکثرت حدیثیں لیں۔

آپ بڑے جلیل القدر، عبادت گزار اور متواضع و خاکسار تھے اور صحابہ میں سب سے زیادہ حافظ الحدیث تھے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ اے ابوہریرہ تم ہم سب سے زیادہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور تم ہم سب سے زیادہ آپ کی حدیثوں کا علم رکھتے ہو۔

ابن سعید کا بیان ہے کہ روزانہ بارہ ہزار نفل پڑھتے تھے واقدی کے قول کے مطابق ۵۹ھ ۷۸ سال کی عمر میں انتقال کیا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے (عینی جلد ۱ صـ۱۲۶)

حدیث نمبر ۹- بَابُ الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ

باب مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کی زبان

مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ

اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہیں اور مہاجر وہ ہے جو ان باتوں کو چھوڑ دیں جس کی اللہ تعالیٰ نے ممانعت فرمائی۔

فوائد و مسائل ۱- اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب الرقاق میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے ۲- ہجر کے لغوی معنیٰ چھوڑنے کے ہیں۔ اسی لیے جو شخص اپنے اہل و عیال و وطن سے جدا ہو جائے اس کو مہاجر کہنے لگے۔ **ھجرت شرعی** کے متعلق تفصیلی گفتگو گزشتہ اوراق میں ہو چکی ہے۔ حدیث زیر بحث میں مسلمان کی دو علامتوں کا بیان ہے۔ اوّل اس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو ایذا نہ پہنچے اگرچہ ایذا ہاتھ کے بغیر بھی پہنچائی جا سکتی ہے۔ مگر چونکہ افعال کا صدور زیادہ تر ہاتھ ہی سے ہوتا ہے۔ اس لیے ہاتھ کا خصوصیت سے ذکر فرمایا اور زبان کو ہاتھ سے پہلے اس لیے ذکر کیا کہ زبان کے ذریعے ایذا پہنچانا عامۃ الوقوع ہے اور زیادہ آسان ہے۔ اس کے علاوہ زبان سے جو ایذا پہنچائی جاتی ہے۔ وہ زیادہ اشد اور تکلیف دہ ہوتی ہے اور یہ بھی کہ زبان سے حاضر و غائب، قریب و بعید سب کو ایذا پہنچائی جا سکتی ہے۔ برخلاف ہاتھ کے کہ وہ موجودین کے ساتھ خاص ہے۔ حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد پوری ملّت کے لیے امن و چین کا ضامن ہے۔ اس پر اگر عمل کیا جائے تو پھر کسی پولیس و عدالت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ افسوس اگر ہم اپنے موجودہ حالات اور اپنے

گردوپیش پر نظر ڈالیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کی زبان یا ہاتھ سے محفوظ نہیں ہے (الاماشاء اللہ) خودغرضی، لالچ، دھوکا فریب، خیانت، ظلم وحسد ہمارے معاشرہ کی بڑی بڑی خرابیاں ہیں۔ جو حدیث زیر بحث پر عمل کرنے سے دور ہوسکتی ہیں۔ جب ایک مسلمان اپنا یہ دستور بنالے گا کہ بحیثیت مسلمان میرا فرض یہ ہے کہ دوسرے مسلمان کو میری کسی حرکت سے نقصان نہ پہنچے تو پھر معاشرہ امن و عافیت کا گہوارہ بن جائیگا ——— حدیث زیر بحث کا دوسرا ٹکڑا ہمیں مہاجر کی صحیح تعریف بتاتا ہے کہ صحیح معنوں میں مہاجر وہ ہے جو ان تمام باتوں سے باز آجائے۔ جن کی اللہ ورسول صلے اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے۔ خواہ ان میں کتنی ہی کشش کیوں نہ ہو۔ غرضیکہ پوری حدیث پر عمل کرنے سے ایک تو انسان کی اپنی روح کی صفائی ہوتی ہے۔ دوسرے معاشرہ میں امن وسکون قائم ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ ہمیں توفیق عمل عطا فرمائے۔

۳۔ علماء نے اس حدیث کو جوامع الکلم میں شمار کیا ہے اور واقعی حضور اکرم صلے اللہ کے یہ کلمات طیبہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع ومانع ہیں ——— فرمایا مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہے۔ اس جملہ میں تمام حقوق العبد آگئے خواہ ان کا تعلق دوست واحباب سے ہو یا عزیز و اقارب سے سب ہی کے حقوق پورا کرنے کی ہدایت۔ اس مختصر جملہ سے ملتی ہے جس کو اگر پھیلایا جائے تو سینکڑوں صفحات بھر جائیں۔ اسی طرح یہ ارشاد کہ مہاجر وہ ہے جو اللہ تعالےٰ کی ناپسندیدہ باتوں کو چھوڑ دے" حقوق اللہ" کی تمام صورتوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

حدیث نمبر ۱۰

بَابُ اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ

باب کون سا مسلمان افضل ہے۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ۔

حضرت ابی موسیٰ اشعری سے روایت ہے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کونسا مسلمان افضل ہے۔ فرمایا۔ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہے۔

فوائد ومسائل حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالےٰ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے آپ کو زبید، عدن اور ساحل یمن کا حاکم مقرر فرمایا تھا۔ جناب فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے بھی آپ کو کوفہ وبصرہ کا حاکم مقرر کیا۔ آپ علماء صحابہ سے ہیں۔ مفتی بھی ہیں۔ ابوموسیٰ نامی چار صحابہ ہوئے ہیں۔ ابوموسیٰ انصاری، ابوموسیٰ غافقی، ابوموسیٰ حکمی اور چوتھے یہ ہی ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالےٰ عنہم۔ آپ سے کل ۳۶۰ حدیثیں مروی ہیں۔ جن سے بخاری ومسلم نے ۵۰ پر اتفاق کیا اور ۴ حدیثوں کو بخاری نے اور ۱۵ حدیثوں کو مسلم نے منفرداً روایت کیا۔ آپ سے حضرت انس بن مالک وطارق بن شہاب تابعین کی کثیر تعداد اور آپ کے بیٹوں ابوبردہ، ابوبکر، ابراہیم وموسیٰ نے حدیثیں روایت کیں۔ مکہ یا کوفہ میں آپ کا انتقال ہوا ۲۔ اس حدیث کو مسلم ونسائی نے کتاب الایمان میں اور ترمذی نے کتاب الزہد میں درج کیا ہے۔ مسلم شریف میں اسی مضمون کی جس دوسری روایت میں ای الاسلام کی بجائے ای المسلمین افضل آیا ہے۔ مطلب حدیث یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک مسلمانوں میں وہ مسلمان افضل ہے

جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان سلامت رہے ۲- اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس کی زبان یا ہاتھ سے مسلمان کو ایذا پہنچے وہ مسلمان ہی نہیں ہے بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ کامل مسلمان یا افضل مسلمان وہی ہے کہ جس میں یہ صفت پائی جائے۔

حدیث نمبر ۱۱

بَابٌ اِطْعَامُ الطَّعَامِ مِنَ الْاِسْلَامِ

باب کھانا کھلانا اسلام کی خصلت ہے

عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَىُّ الْاِسْلَامِ خَيْرٌ قَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَءُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ

حضرت عبد اللہ بن عمر سے ہے کہ ایک آدمی نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ اسلام کی کونسی خصلت بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کھانا کھلانا اور سلام کرنا اس کو جس کو تو پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو۔

فوائد و مسائل ۱- امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الایمان اور باب اسلام للمعرفۃ میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و نسائی نے کتاب الایمان میں اور ابو داؤد نے کتاب الادب میں اور ابن ماجہ نے کتاب الاطعمہ میں ذکر کیا۔ ۲- اسلام کی کونسی خصلت بہتر ہے۔ یہ سوال غالباً حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ حضور علیہ السلام نے اس کے جواب میں دو باتوں کو اسلام کی بہترین خصلت قرار دیا۔ کھانا کھلانا اور سلام کرنا مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف دو ہی بہترین خصلتیں ہیں بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ اسلام کی بہترین خصلتوں میں سے یہ دو بھی ہیں۔ کھانا کھلانے کی اہمیت و افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ خصوصاً غریب و نادار کو کھانا کھلانا ایک ایسا عمل ہے جو اللہ عزوجل کو بہت ہی محبوب ہے۔ کتاب مجید میں یتیموں، مسکینوں، غریبوں کے لیے خوراک مہیا کرنے کی مختلف و موثر انداز میں ترغیب دی گئی ہے۔ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے دوستی اور پُرخلوص تعلقات کے فروغ کے جن کثیر آداب و مراسم کی ترغیب دی ہے۔ ان میں ایک "سلام" بھی ہے۔ کتاب مجید میں فرمایا:۔

اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا الخ

جب تمہیں کوئی سلام کرے تو اس سے بہتر انداز میں جواب دو۔

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا الخ

جب گھروں میں داخل ہو تو ان کے اہل کو سلام کرو

سلام کی اہمیت اگرچہ دیگر اقوام میں بھی یہ طریقہ رائج ہے کہ جب دو اشخاص ملتے ہیں یا ایک دوسرے کے گھر جاتے ہیں تو کسی اور گفتگو سے قبل کوئی لفظ یا فقرہ ایسا کہتے ہیں جو دوستی اور تعارف کو پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً انگریزوں میں وقت کے تعلق سے "گڈ مارننگ" اور "گڈ نائٹ" وغیرہ رائج ہیں اور متوجہ کرنے کے لیے "ہلو" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور اہل ہنود میں رام رام یا اسی طرح کے اور الفاظ رائج ہیں۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ ان میں وہ وسعت اور عمومیت نہیں ہے جو اسلام کے "سلام" میں پائی جاتی ہے۔ "گڈ مارننگ" کا مطلب روز بخیر ہے۔ گویا یہ جملہ کہنے والا دعا دے رہا ہے کہ آپ کا دن خیریت سے گزرے"۔ اسی طرح دوسرے الفاظ بھی وقت کے ساتھ مقید

ہیں لیکن لفظ "سلام" کے مفہوم میں ہر طرح کی خیر و برکت، مسرت و راحت داخل ہے ۔ اس میں ندرفت کی قید ہے اور نہ زمانے کی "السلام علیکم" کہہ کر گویا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے حق میں بطور دُعا بہترین جذبات و خواہشات کا اظہار کرتا ہے ۔ اور "سلامتی ہو تم پر" کے ذیل میں دین و دنیا کی تمام راحتیں اور برکتیں آجاتی ہیں ۔ غرضیکہ اسلام کے "سلام" میں جو وسعت و عمومیت ہے ۔ وہ دنیا کے کسی ضابطہ، تہذیب و نظام، تمدن کے مقرر کردہ الفاظ میں نہیں ہے ۔

"سلام" کا وسیع پس منظر

۱۔ پھر جہاں سلام باہمی ربط و ضبط بڑھانے کا مفید ذریعہ ہے ۔ وہاں ایک وسیع ذہنی پس منظر اور بنیادی فکر کا اعلامیہ اور آئینہ بھی ہے ۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو تعلیم دیتا ہے کہ ایک دوسرے کو سلام کرو ۔ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔

اِذَا لَقِيَ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ فَلْيُسَلِّمْ عَلَيْهِ (ابوداؤد)	تم میں سے کوئی جب اپنے مسلمان بھائی سے ملے تو چاہیے کہ سلام کرے ۔

ہادی کامل صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت دراصل اس امر کی طرف توجہ دلا رہی ہے کہ اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں مسلمان بھی خواہی تعاون اور محبت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بھائی ہوں ۔ جس طرح ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے غم سے غم اور خوشی سے خوشی ہونا خون کے رشتہ کی وجہ سے فطری امر ہے ۔ اسی طرح ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی تکلیف سے تکلیف، راحت سے راحت محسوس ہونا اسلام کے تعلق سے لازمی امر ہے ۔ دو مسلمانوں میں خواہ ظاہری و مادی طور پر کوئی تعلق نہ ہو صرف اسلام کا مقدس رشتہ ہی انہیں ایک دوسرے کا دوست، مونس و غمگسار، ہمدرد و مشیر بنانے کے لیے کافی ہو ۔ لہٰذا اس شان کے معاشرے والے ایک دوسرے کے قریب سے بالکل خاموش گزر جائیں تو یہ نہایت ہی غیر مناسب روش ہوگی ۔ اس لیے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے سلام کرنے کی ہدایت فرمائی ۔ گویا "سلام" اس رشتہ کا آئینہ دار ہے کہ ایک مسلم کو دوسرے مسلم سے حاصل ہوتا ہے ۔ پھر اسلام میں اس کی وسعت و عمومیت کا یہ عالم ہے کہ حدیث زیر بحث میں فرمایا ۔

۲۔ وَتَقْرَءُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ	جس سے تم واقف ہو اسے بھی سلام کرو اور جس سے تمہاری شناسائی نہیں ہے اسے بھی ۔

یعنی سلام کرنے کے لیے پہلے سے شناسائی اور مادی و رسمی تعارف شرط نہیں ہے ۔ صرف اسلامی رشتہ کافی ہے کیونکہ "سلام" اسلام کے تعلق سے بڑھ کر کسی اور تعلق کو نہیں مانتا ۔ نسلی، جغرافیائی، طبقاتی اور لسانی وغیرہ رشتے اس کی نگاہ میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور اسلام کا رشتہ سب پر مقدم اور سب سے برتر و اعلیٰ ہے ۔ جہاں بھی ہوگا ان میں حقیقۃً کوئی اجنبیت نہ ہوگی ۔ لہٰذا ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان سے شناسائی ہو یا نہ ہو ۔ وہ بہرصورت اس کو سلام کرے اور ہر موقع و محل پر اس حقیقت ثابتہ کی یاد دلاتا رہے کہ اسلام و ایمان کا تعلق ختم ہونے والا نہیں ہے ۔ یہ تعلق تمام تعلقات سے ارفع و اعلےٰ ہے ۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر السلام علیکم کے جملہ پر غور کیجیے ۔ یہ اپنے اندر کتنا وسیع مفہوم رکھتا ہے ۔ جہاں اس کا

یہ مطلب ہے کہ سلام کرنے والا مخاطب کو یقین دلا رہا ہے کہ ہم تم اجنبی نہیں ہیں بلکہ ہمارے درمیان ایک مضبوط تعلق ہے۔ وہیں یہ بھی ہے کہ زندگی کے میدان میں اپنے کو تنہا مت سمجھو۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔ رنج و راحت میں شریک ہوں تمہیں کوئی مشکل پیش آئے تو میرا تعاون لو۔

اور مخاطب کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ جواب میں واؤ کے اضافہ کے ساتھ یہی الفاظ دہرائے یعنی وعلیکم السلام کہے۔ گویا جواب دینے والا یہ کہہ رہا ہے کہ تم جو میری سلامتی کے خواہشمند ہو۔ تو میں بھی تمہاری سلامتی کا خواہشمند ہوں۔ غور کیجئے کتنی راحت و محبت مضمر ہے اس سوال و جواب میں اور کتنا پُر امن اور راحت بیز ہوسکتا ہے وہ معاشرہ جہاں واقعۃً ہر مسلمان دوسرے مسلمان کی سلامتی اور خیر و فلاح کا دل سے خواہشمند ہو۔ اسی لیے قرآنِ پاک نے بھی مومنوں کو ایک دوسرے کا بھائی بطور تشبیہ نہیں بلکہ بطور امرِ واقعہ کہا ہے۔

۳۔ افسوس بعض جدید تعلیم یافتہ حضرات نے السلام علیکم کے الفاظ کو رجعت پسندانہ قرار دے کر ترک کر دیا ہے اور اس کی جگہ جدید الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلامی تصورات سے بُعد اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن سے قرب و شیفتگی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ عقلاً بھی السلام علیکم سے بہتر اور جامع الفاظ کسی اور نظامِ تمدن میں رائج نہیں ہیں۔ خود حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح فرمائی۔ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضرت جابر ایک مرتبہ خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور کہا۔ عَلَيْكَ السَّلَامُ يَا رَسُوْلَ اللهِ حضور نے فرمایا لَا تَقُلْ عَلَيْكَ السَّلَامُ ظاہر ہے کہ علیک السلام میں لفظی تبدیلی کوئی نہیں صرف ترتیبِ الفاظ بدل دی گئی ہے مگر حضور علیہ السلام نے یہ بھی گوارا نہ فرمایا۔ لہٰذا لَا تَقُلْ کی واضح نہی سے معلوم ہوا کہ الفاظ تو کیا ترتیب بدلنا بھی جائز نہیں ہے۔

۴۔ ابوداؤد کی حدیث میں ہے کہ عمران بن حصین کہتے ہیں۔ ہم اسلام سے پہلے بوقتِ ملاقات یہ الفاظ کہا کرتے تھے

اَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْنًا وَّ اَنْعِمْ صَبَاحًا (ابوداؤد)	تیری آنکھوں کو اللہ ٹھنڈا رکھے اور تیری صبح نعمتوں کے ہجوم میں طلوع ہو۔

ظاہر ہے باعتبار مفہوم و معنیٰ آداب تسلیمات گڈ مارننگ وغیرہ سے یہ جملے زیادہ مبارک اور خوشگوار ہیں لیکن حضور علیہ السلام نے ان کی جگہ السلام علیکم مقرر فرما کر یہ بتا دیا کہ السلام علیکم نہایت جامع ہے اور یہ کہ مسلمان کو اغیار کے طریقوں کو چھوڑ کر اپنے اسلامی طریقہ کو اپنانا چاہیئے۔

۵۔ سلام کی مقدس رسم کو شارع علیہ السلام نے کبر و نخوت، علو پسندی، طبقاتی تفاوت اور اس طرح کے فاسد رجحانات کی آبیاری میں استعمال ہونے سے کس شان سے روکا ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کی ہدایت سے ہوسکتا ہے۔ بخاری شریف کی حدیث میں فرمایا:

لِيُسَلِّمِ الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِيْ	سوار پیادے کو سلام کرے

جب آدمی گھوڑے یا کسی سواری پر سوار ہوتا ہے تو نفسیاتی طور پر پیدل چلنے والوں کے مقابلہ میں اس کے اندر برتری اور شان کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر پیادے کو حکم دیا جاتا کہ وہ سوار کو سلام کرے تو لازما

سواروں کے غلط احساسِ برتری و نخوت و تکبر کو غذا ملتی۔ اس لیے ہادیٔ کامل صلے اللہ علیہ وسلم نے سوار کے غلط احساسِ برتری کا علاج یوں فرمایا کہ وہ پیدل چلنے والوں کو سلام کرے اور پیدل چلنے والوں پر نفسیاتی طور پر یہ اثر ڈالا کہ وہ خود کو صرف پیدل ہونے کی وجہ سے کمتر نہ سمجھیں کیونکہ اسلام میں بزرگی و بڑائی صرف تقویٰ وطہارت پر ہے نہ کہ دولت و ثروت اور دنیاوی وجاہت وعزت پر

وَالْمَاشِيْ عَلَى الْقَاعِدِ وَالْقَلِيْلُ عَلَى الْكَثِيْرِ | چلنے والا بیٹھنے والے کو اور تھوڑے لوگ زیادہ لوگوں کو سلام کریں۔

گویا اس کا لحاظ نہیں کیا جائیگا کہ چلنے والا کوئی ذی وجاہت اور با شوکت آدمی ہے لہٰذا جب وہ گزرے تو ہر وہ شخص اس کو سلام کرے جو عرف عام میں اس سے کم حیثیت رکھتا ہے بلکہ اس گزرنے والے پر لازم ہے کہ وہ سلام میں پہل کرے۔ اسی طرح قلیل کثیر کو سلام کریں۔ اس میں بھی سلام کی پہل کو طبقاتی تفاوت اور فرقِ مراتب سے مشروط نہیں کیا بلکہ ایسا طریقہ مقرر فرمایا کہ "سلام" کی پاکیزہ رسم سے کسی حال میں بھی کمتری و برتری کی آبیاری نہ ہو۔ اسی لیے فرمایا:۔

يُسَلِّمُ الصَّغِيْرُ عَلَى الْكَبِيْرِ | چھوٹا بڑے کو سلام کرے

یعنی کم عمر سلام میں پہل کرے مگر یہ نہ دیکھے کہ زیادہ عمر والا رتبہ وحیثیت میں بڑھا ہوا ہے یا گھٹا ہوا۔ چنانچہ مسلم کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام لڑکوں کے پاس سے گزرے تو آپ نے انہیں سلام کیا۔ بظاہر حضور علیہ السلام کا یہ طرز عمل سابقہ حدیث کے متعارض ہے مگر حقیقت میں کوئی تعارض نہیں۔ اولاً اس لیے کہ حضور علیہ السلام اسقدر شفیق تھے کہ ہر چھوٹے بڑے کے لیے دعا میں سبقت کرنا گویا آپ کے قلبِ اقدس کا تقاضا تھا۔ چنانچہ بارہا آپ نے ان صحابہ کو سلام کیا جو بلا شبہ آپ سے کم عمر تھے۔ دوسرے آپ کا فرضِ نبوت یہ تھا کہ صرف قول ہی سے نہیں بلکہ عمل سے بھی اسلامی آداب وضوابط اُمت کو سکھائیں۔ چنانچہ لڑکوں کو سلام کی پاکیزہ رسم پر خصوصی توجہ دینے کے لیے آپ نے انہیں سلام کیا جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص جس پر آدابِ اسلامی کی رُو سے سلام میں سبقت ضروری ہو سبقت کو فراموش کردے تو ہمیں اس کے انتقام میں سلام سے گریز نہ کرنا چاہیئے بلکہ سلام ہے کہ خود سلام کرکے اسے بھولا ہوا سبق یاد دلادیں۔ اسی لیے فرمایا:۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاللّٰهِ مَنْ بَدَءَ بِالسَّلَامِ (ابو داؤد) | لوگوں میں اللہ سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو سلام میں پہل کرے۔

یعنی سلام میں پہل کرنا کسی کم تری و بے حیثیتی کی علامت نہیں ہے بلکہ تقرب الی اللہ اور نیکی کا مظہر ہے۔

۶۔ سلام کی مقدس رسم اسلام کو کس درجہ پسند ہے اس کا اندازہ حدیثِ ذیل سے کیجئے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی کو ملے تو سلام کرے۔

فَاِنْ حَالَتْ بَيْنَهُمَا شَجَرَةٌ اَوْ جِدَارٌ اَوْ حَجَرٌ ثُمَّ لَقِيَهُ | پھر اگر اس باہمی سلام کے بعد درمیان میں کوئی درخت، دیوار یا پتھر آجائے اور اس کے بعد پھر ملاقات ہو تو پھر

فَلْيُسَلِّمْ عَلَيْهِ (ابوداؤد) | سلام کرنا چاہیئے۔

گویا ہر ملاقات کے آغاز میں تجدیدِ سلام ہونا چاہیئے۔ خواہ وہ ملاقات چند لمحوں کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ ایک مسلمان کو ہر صورت میں دوسرے مسلمان کے ساتھ ہمدردی، بہی خواہی و عافیت طلبی کی نیک خواہش کا اظہار ضرور کر دینا چاہیئے اور سلام جیسی پاکیزہ دُعا سے نہ چُوکنا چاہیئے۔

افسوس ہمارے معاشرہ میں یہ عمل تقریباً متروک ہے۔ صرف اس وقت تو سلام کر لیتے ہیں جب سفر سے واپسی ہو یا پہلی بار ملاقات ہو۔ ورنہ ایک لمحہ کے بعد دوسرے لمحہ کی ملاقات میں اسے نظر انداز ہی کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت تو یہ ہے۔

يَا بُنَيَّ إِذَا دَخَلْتَ عَلٰى اَهْلِكَ فَسَلِّمْ يَكُوْنُ بَرَكَةً عَلَيْكَ وَ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِكَ (ترمذی) | اے بیٹے! جب تو اپنے گھر والوں کے پاس پہنچے تو سلام کر یہ سلام تیرے اور تیرے گھر والوں کے لیے برکت کا باعث ہوگا۔

بیہقی کی حدیث میں فرمایا۔

إِذَا دَخَلْتُمْ بَيْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰى اَهْلِهٖ وَاِذَا خَرَجْتُمْ فَاَوْدِعُوْا اَهْلَهٗ بِسَلَامٍ (بیہقی) | جب گھر میں داخل ہو تو اپنے گھر والوں کو سلام کرو اور جب گھر سے چلنے لگو اور انہیں سلام ہی سے رخصت کرو۔

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے فرمایا۔ مسلم پر مسلم کے چھ حقوق ہیں۔ جب اس سے ملے تو سلام کرے۔ جب وہ بیمار ہو عیادت کرے۔ جب چھینکے جواب دے۔ جب بُلائے اس کے پاس جائے۔ جب وہ مر جائے اس کے جنازہ کے ساتھ جائے اور جو چیز اپنے لیے پسند کرے وہی اسکے لیے پسند کرے (ترمذی) ۲۔ جو شخص پہلے سلام کرے وہ رحمتِ الٰہی کا زیادہ مستحق ہے (ترمذی) ۳۔ جو پہلے سلام کرتا ہے وہ تکبّر سے بری ہے (بیہقی) ۴۔ ایک ملاقات کے بعد دوسری ملاقات کے موقع پر بھی سلام کرو (ابوداؤد) ۵۔ آدم علیہ السلام نے جب فرشتوں کو سلام کیا تو فرشتوں نے جواب میں السلام علیکم کہا تھا (بخاری و مسلم) ۶۔ سلام بات چیت کرنے سے پہلے کیا جائے (ترمذی) ۷۔ مجلس میں پہنچنے کے بعد اور مجلس سے واپسی پر دونوں مواقع پر سلام کرے (ابوداؤد) ۸۔ بچوں کو سلام کرو (مسلم) ۹۔ چھوٹا بڑے کو، سوار پیدل کو، گزرنے والا بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑے زیادہ آدمیوں کو سلام کریں (مسلم) ۱۰۔ اہلِ کتاب سلام کریں تو ان کے جواب میں صرف وعلیکم کہہ دیں (مسلم) ۱۱۔ راستہ کا حق یہ ہے کہ نظر نیچی رکھنا، تکلیف دہ چیز کو دُور کرنا، سلام کا جواب دینا، اچھی بات کا حکم اور بُری باتوں سے روکنا (مسلم) ۱۲۔ السلام علیکم کہنے والے کے لیے دس نیکیاں السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے والے کے لیے بیس، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ومغفرتہ کے کہنے والے کے حق میں چالیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں (ابوداؤد) ۱۳۔ یہود و نصاریٰ سے تشبہ نہ کرو۔ یہود کا سلام انگلیوں کے اشارہ سے ہے اور نصاریٰ کا سلام ہتھیلیوں کے اشارہ سے (ترمذی) ۱۴۔ علیک السلام مت کہو یہ مُردوں کی تحیت ہے بلکہ السلام علیک کہا کرو (ابوداؤد)

سلام کے ضروری مسائل

یہ اور اس مضمون کی احادیث سے فقہا نے بہت سے مسائل اخذ کیے ہیں۔ جن میں سے بعض یہ ہیں ۱۔ سلام کرنے میں مسلم کی عزت و آبرو اور مال و جان کی حفاظت کی نیت کرے ۲۔ ایک شخص کو سلام کرے تو اس کے لیے بھی جمع کا لفظ استعمال کرے یعنی السلام علیکم کہے۔ جواب دینے والا بھی وعلیکم السلام کہے۔ رحمۃ اللہ وبرکاتہ کے الفاظ کا اضافہ بہتر ہے۔ صرف علیکم یا علیک نہ کہا جائے ۳۔ سلام کا جواب فوراً دینا واجب ہے۔ بلا عذر تاخیر کی تو گنہ گار ہوگا اور یہ گناہ جواب دینے سے دفع نہ ہوگا بلکہ توبہ کرنی ہوگی ۴۔ مجلس میں سے کسی ایک شخص کا جواب دے دینا اہلِ مجلس کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے ۵۔ قاضی جب کہ عدالت میں اجلاس کر رہا ہو اس کو کسی نے سلام کیا تو اس پر جواب دینا واجب نہیں ۶۔ جو شخص تلاوت میں یا درس و تدریس یا علمی گفتگو یا سبق کی تکرار کر رہا ہو یا عالمِ دین وعظ کر رہا ہے یا تعلیم میں مشغول ہے یا کوئی شخص ذکر میں مشغول ہے یا تقریر ہو رہی ہے اور لوگ سُن رہے ہیں، ان صورتوں میں سلام نہ کیا جائے ۷۔ جو شخص پیشاب، پاخانہ، کبوتر اُڑانے یا گانے یا حمام یا غسل خانہ میں ننگا نہا رہا ہے اس کو بھی سلام نہ کیا جائے۔ اگر کیا تو اس پر جواب واجب نہیں۔ پیشاب کے بعد ڈھیلا لے کر استنجا سکھاتے ہیں۔ اس موقع پر بھی سلام نہ کیا جائے۔ فاسق کو بھی سلام نہ کرے۔ گمراہ و بے دین کو سلام کرنا گناہ ہے ۸۔ کسی کو سلام پہنچانے کا وعدہ کر لیا ہے تو سلام پہنچانا واجب ہے ۹۔ ہتھیلی یا انگلی کے اشارے سے سلام کرنا ممنوع ہے ۱۰۔ یونہی اشارہ سے جواب دینا بھی ناکافی ہے منہ سے وعلیکم السلام کہنا واجب ہے ۱۱۔ رکوع کی حد تک جھک کر سلام کرنا حرام ہے اور اس سے کم جھکنا مکروہ ہے ۱۲۔ بندگی عرض ہے ان لفظوں سے سلام کرنا ناجائز ہے ۱۳۔ آداب عرض ہے۔ گو اس میں اتنی بُرائی نہیں مگر سنت کے خلاف ہے تسلیمات اور تسلیم اور سلام۔ یہ سلام ہی کے معنی میں ہے مگر السلام علیکم کہنا بہر حال افضل ہے ۱۴۔ بچے جب سلام کرتے ہیں تو عام طور پر جواب میں جیتے رہو کہا جاتا ہے یہ ناکافی ہے۔ یہ جواب ایامِ جاہلیت میں کفار دیا کرتے تھے۔ اسی لیے اسلام نے سلام کے جواب میں وعلیکم السلام کا لفظ مقرر کیا ہے ۱۵۔ جب کوئی کسی کو سلام پہنچائے تو جواب میں اسی طرح کہا جائے علیک وعلیہ السلام ۱۶۔ نبی و فرشتہ کے نام کے علاوہ کسی اور کے نام کے ساتھ علیہ السلام نہیں کہنا چاہیے۔ ۱۷۔ خط میں سلام لکھا ہوتا ہے اس کا جواب دینا بھی واجب ہے اور جواب کی دو صورتیں ہیں۔ یہ کہ زبان سے جواب دے یا دوسری صورت یہ ہے کہ سلام کا جواب لکھ کر بھیج دے۔ مگر چونکہ جواب سلام فوراً دینا واجب ہے اور تحریری جواب میں بہر صورت تاخیر ہوتی ہے اس لیے فوراً جواب دے تاکہ تاخیر سے گناہ نہ ہو۔ کافر کو سلام نہ کیا جائے۔ اگر وہ سلام کریں تو جواب میں صرف وعلیکم یا علیك کہا جائے اور بقصدِ تعظیم کافر کو ہر گز ہر گز سلام نہ کیا جائے کیونکہ کافر کی تعظیم کفر ہے۔ (درمختار) ۱۸۔ اگر ایسی جگہ گزر ہو جہاں مسلم و کافر دونوں ہوں تو السلام علیکم کہے اور مسلمانوں کو سلام کا ارادہ کرے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ السلام علیٰ من اتبع الہدیٰ کہے ــــ غیر مسلموں کو ابتداءً سلام نہ کیا جائے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

لَا تَبْدَءُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی بِالسَّلَامِ | یہود و نصاریٰ کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو۔

ظاہر ہے کہ یہود و نصاریٰ اہلِ کتاب ہیں۔ جب انہیں سلام کرنے کی ممانعت ہے تو غیر اہلِ کتاب کفار تو بدرجہ

اولیٰ اس حکم میں شامل ہوں گے۔ اسی طرح بدمذہب و بے دین خصوصاً جن کے عقائد حدِ کفر تک پہنچ چکے ہیں، ان کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ البتہ جب غیر مسلم ہمیں سلام کریں تو صرف وَعَلَیکَ کہنے کی ہدایت دی گئی ہے اور یہ حکم کوئی تنگ نظری، تنگ دلی اور بداخلاقی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ انصاف و دیانت اور خلوص و للہیت کا آئینہ دار ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ السلام علیکم میں جس سلامتی کا ذکر ہے وہ اس محدود پیمانے کی سلامتی نہیں ہے جو صرف دنیاوی عیش و آرام، امن و عافیت تک محدود ہو بلکہ اس میں آخرت کی فلاح و نجات، عافیت و خیریت بھی شامل ہے یعنی السلام علیکم یا علیکم السلام کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ عزوجل تمہیں دنیا و آخرت دونوں میں امن و عافیت عطا فرمائے۔ ظاہر ہے کہ جب اہلِ کفر کے لیے قرآنی تصریحات کے مطابق آخرت کی فلاح و نجات ہے ہی نہیں تو انہیں سلامتی کی دعا دینا کیسے درست ہوسکتا ہے کیونکہ جس سلامتی کے ہم اہلِ کفر کے لیے قائل ہی نہیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ قائل ہوجائیں تو مسلمان ہی نہیں رہ سکتے۔ اسی سلامتی کی دعا اگر ہم اہلِ کفر کو دے دیں تو یہ منافقانہ رواداری ہوگی اور مسلمان منافقانہ رواداری کا قائل نہیں ہے اور اس کو شرافت و نجابت اور اخلاق کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ غیر مسلموں کو سلام کہنے میں پہل نہ کریں۔ یعنی ان کو السلام علیکم نہ کہیں اور اگر وہ سلام کریں تو ہم صرف وعلیک جواب میں کہہ دیں اور اس وعلیک کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم پر سلامتی ہو بلکہ "سلام" کو حذف کر دینے کے بعد وعلیکَ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم پر بھی وہی کچھ ہو جس کے تم مستحق ہو۔ البتہ جہاں غیر مسلموں کے ساتھ مل جل کر رہنا پڑتا ہے یا ان کی حکومت ہوتی ہے یا ان سے ربط و ضبط ناگزیر ہوتا ہے۔ وہاں "آداب عرض" ہے ایسے جملے استعمال کر سکتے ہیں۔ جن میں کوئی شرعی خرابی کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ لیکن السلام علیکم کے الفاظ بہرصورت نہیں کہیں گے۔ اسی طرح وہ الفاظ بھی نہیں استعمال کر سکتے جو غیر اسلامی ثقافت کا جزو بن گئے ہیں۔ جیسے نمستے رام رام یا جے بھارت وغیرہ۔

حدیث نمبر ۱۲ بَابٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ اَنْ يُّحِبَّ

باب مومن کی شان یہ ہے کہ جو اپنے لیے

لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ

(بخاری)

پسند کرے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لیے پسند کرے حضرت قتادہ، حضرت انس سے راوی ہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ جو اپنے لیے پسند کرے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لیے چاہے۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام مسلم و ترمذی و نسائی نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے ۲۔ یحب کے لغوی معنی کسی چیز کی طرف دل کے مائل ہونے کے ہیں۔ میلانِ قلب کی متعدد وجوہات ہوتی ہیں۔ حسن، علم و فضل، احسان ظاہر ہے۔ یہ میلان طبعی و فطری ہوتا ہے۔ یعنی جب کسی میں حُسن پایا جائے یا کمال موجود ہو یا کوئی شخص احسان کرے تو انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ یہ محبت کم اور زیادہ ہوتی رہتی

ہے ۔ جب احسان بڑھے گا محبت بڑھ جائے گی ۔ جب احسان کم ہوگا محبت کم ہو جائے گی ۔ علماء نے فرمایا کہ اس حدیث میں محبت اختیاری مراد ہے ـــــ اور فطری نہیں ۳ - لا مومن میں لا نفی کے لیے ہے لیکن علماء یہاں کا و تاماً جیسے الفاظ مقدر مانتے ہیں اور معنی یہ کرتے ہیں کہ مومن کامل وہ ہے جس میں یہ صفت پائی جائے کیونکہ اگر کسی میں مذکورہ بالا صفت نہ پائی جائے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا ۔

کسی ایک کام کو اسلامی قرار دینے کا مطلب

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اکثر احادیث میں کسی ایک کام کو اسلام یا اسلام کی علامت قرار دیا گیا ہے مثلاً یہی حدیث کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہے یا مومن کی شان یہ ہے کہ جو بات وہ اپنے لیے پسند کرے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لیے پسند کرے یا اسی مضمون کی متعدد حدیثیں آگے آرہی ہیں - جن کا مضمون یہ کھانا کھلانا اسلام ہے - سلام کرنا وغیرہ وغیرہ - تو ان احادیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس مسلمان میں صرف سلام کرنے کی صفت پائی گئی وہ مومن کامل ہے اگرچہ بقیہ اعمال و ارکان اسلامی کی وہ پابندی نہ کرتا ہو - اسی طرح ان احادیث کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ بس یہ ایک کام ہی اسلامی ہے اور باقی اعمال و ارکان اسلامیہ غیر ضروری ہیں بلکہ کسی ایک کام کو خصوصیت کے ساتھ بیان کر دینے سے شارع علیہ السلام کا مقصد اس عمل کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے - چنانچہ اس کی واضح مثال یہ حدیث ہے - لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِطَهُوْرٍ طہارت کے بغیر نماز نہیں ہوتی - تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صحت نماز کے لیے صرف طہارت کافی ہے بلکہ مقصد صرف طہارت کی اہمیت کو ظاہر کرنا ہے تو جیسے طہارت کو محض اس کی اہمیت کے لیے خصوصیت کے ساتھ ذکر فرما دیا - اسی طرح اعمال اسلامیہ میں سے کسی ایک عمل کی اہمیت و عظمت کے اظہار کے لیے ذکر کر دیا جاتا ہے - تاکہ لوگوں میں اس عمل کو اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہو - لہٰذا مومنِ کامل وہی مسلمان قرار پائیگا جو تمام افعال و اعمالِ اسلامیہ کو بجا لاتے ۔

اسی طرح حدیث کے پڑھنے والوں کو یہ اصولی بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ وہ حدیثیں جن میں خاص خاص بداعمالیوں اور بداخلاقیوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ان کے مرتکب ہوں ان میں ایمان نہیں یا وہ مومن نہیں نیز وہ حدیثیں جن میں بعض اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ جو شخص ان کا تارک ہو وہ ایمان سے خالی ہے یا وہ مومن نہیں ہے - ان کا منشاء و مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ شخص دائرہ اسلام سے بالکل خارج ہو گیا اور اب آخرت میں اس سے کافروں والا معاملہ ہوگا بلکہ مطلب صرف یہ بتانا ہوتا ہے کہ ایسا مسلمان اس درجہ اور مقام سے محروم ہے جو ایک مومن کی اصلی شان ہوتی ہے - چنانچہ ہر زبان کا یہ عام محاورہ ہے کہ جس کسی میں کوئی صفت بہت ناقص اور کمزور ہوتی ہے تو اس کو کالعدم قرار دے کر اس کی بالکل نفی کر دی جاتی ہے - خصوصاً دعوت و خطابت اور ترغیب و ترہیب میں بھی طرزِ بیان زیادہ موزوں اور زیادہ مفید مطلب ہوتا ہے ـــــ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ جب آپ کو کسی فعل یا عمل کی انتہائی قباحت یا بے حد افادیت کا اظہار منظور ہوتا ہے تو آپ اپنا خاص طرز کا کلام اختیار فرمائے جس میں حقائق کا بیان اس انداز سے ہوتا کہ سننے والا نافرمانی سے خوف کھائے اور اطاعت پر مائل ہو جیسے علماء

کی اصطلاح میں ترغیب وتحریص وتنذیر وترہیب کہتے ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا۔
۱۔ جس نے ظالم کو ظالم جانتے ہوئے بھی اس کی مدد کی وہ اسلام سے خارج ہوگیا ۲۔ آپ نے فرمایا۔ خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ ہو ۳۔ یا آپ خطبہ میں فرمایا کرتے تھے۔ جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس میں عہد کی پابندی نہیں اس کا دین میں حصہ نہیں ۴۔ یا زیر تفہیم حدیث ہی لے لیجئے جس میں فرمایا کہ تم میں کوئی مومن نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ جو بات اپنی ذات کے لیے پسند کرے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لیے پسند کرے ۵۔ یا اسی نوع کی اور متعدد حدیثیں آگے آرہی ہیں۔ جن میں کسی ایک عمل یا فعل کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ ایمان دار نہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس نوع کے تمام ارشادات کا مقصد ومنشا یہ نہیں ہے کہ جو مسلمان پڑوسی کو ایذا دے یا بددیانتی کرے یا ظالم کو مدد پہنچائے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے بلکہ اس طرز کلام سے مقصود صرف اس فعل کی انتہائی قباحت یا اس عمل کی بے حد افادیت بیان کرنی ہوتی ہے۔ چنانچہ علماء حق اس پر متفق ہیں کہ وہ روایتیں جو ترہیب و تعدیر و تنذیر کے سلسلہ میں آئی ہیں وہ ظاہری معنیٰ پر محمول نہیں ہیں اور نہ ان سے کوئی شرعی عقیدہ یا حکم اخذ کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اسی حدیث کو لیجئے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں جس کا ہمسایہ اس کے شر سے محفوظ نہ ہو۔ یا فرمایا کہ جس وقت زناکار زنا کرتا ہے، شرابی شراب پیتا ہے، چور چوری کرتا ہے۔ اس وقت میں وہ مومن نہیں ہوتا (بخاری) ظاہر ہے کہ اس طرز کلام سے حضور علیہ السلام کا منشا فتویٰ دینا اور قانون شرعی بیان کرنا نہیں ہے بلکہ پڑوسیوں کو تکلیف پہنچانے، زنا کرنے و شراب پینے کی بدترین قباحت پر متنبہ کرنا ہے تاکہ لوگ برائیوں کو ترک کر دیں اور اعمالِ حسنہ کی طرف راغب ہوں ——— لہٰذا اس نوع کی حدیثوں کو "کفر کے فتوے" اور قانونی فیصلے سمجھنا اور اس بناء پر ان گناہوں کے مرتکبین کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینا (جیسا کہ معتزلہ وخوارج نے گمان کیا ہے)، دراصل ان حدیثوں کے اصل مفہوم اور حضور علیہ السلام کے طرز کلام کی خصوصیات سے ناواقفی و ناآشنائی کا نتیجہ ہے۔ علماء کا یہ فرض ہے کہ جب وہ اس نوع کی روایات کو بیان کریں تو ان کی حقیقی پوزیشن کو اجمال یا تفصیل کے ساتھ ضرور بیان کردیا کریں تاکہ خالی الذہن عوام کسی بھی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

حضرت قتادہ وانس رضی اللہ تعالیٰ عنہما

اس حدیث کے راویوں میں حضرت قتادہ وحضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہما قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت قتادہ سدوسی، بصری تابعی تھے۔ انھوں نے حضرت انس وعبداللہ بن سرجس اور ابوطفیل عامر سے حدیث سُنی ہے۔ بڑے جلیل القدر عالم فاضل مفسّر تھے۔ علم وفضل وشرف والے تھے کہ آپ نے ۔ اسال کامل حضور علیہ السلام کی خدمت کی اور خادم رسول اللہ مشہور ہوئے۔ آپ کی والدہ نے دربارِ نبوت میں دعا کے لیے درخواست کی۔ حضور علیہ السلام نے دُعا فرمائی۔ الٰہی! انس کی عمر، مال اور اولاد میں برکت عطا فرما۔ حضور علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہوئی۔ آپ کافی مالدار ہوئے۔ آپ کے باغ میں ایک پودا تھا جس کے پھولوں سے مشک وعنبر کی خوشبو آتی تھی۔ آپ نے کنواں کھودا تو

پانی کھارا نکلا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کی۔ حضور علیہ السلام نے اپنا لعاب دہن مبارک ڈال دیا۔ کنویں کا پانی مدینہ کے تمام کنوؤں سے زیادہ میٹھا ہوگیا (خصائص کبریٰ سیوطی) اولاد کی کثرت کا یہ حال ہوا کہ خود ہی فرماتے ہیں کہ اپنے بیٹے پوتے وغیرہ جن کو میں نے اپنے ہاتھ سے دفن کیا ان کی تعداد دوکم سو تک پہنچتی ہے۔ آپ کی عمر شریف ایک سو سال کی ہوئی۔ صحابہ کرام میں سب سے آخر میں آپ کا ہی وصال ہوا۔ آپ نے بصرہ میں وفات پائی۔ حضرت محمد بن سیرین نے آپ کو غسل دیا۔ ۹۳ھ میں حجاج کے زمانہ حکومت میں بمقام بصرہ آپ کا وصال ہوا اور حجاج کے محل کے قریب آپ کو دفن کیا گیا۔ رضی اللہ تعالے عنہم۔ حضرت انس رضی اللہ تعالے عنہ سے بکثرت حدیثیں مروی ہیں۔ صحاح ستہ میں آپ سے ۲۲۸۶ حدیثیں مروی ہیں ——— بخاری ومسلم نے ۱۶۸ حدیثوں پر اتفاق کیا ۸۳ حدیثوں کو صرف بخاری نے اور ۹۱ حدیثوں پر صرف مسلم نے اتفاق کیا ہے۔

بَابٌ حُبُّ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْاِيْمَانِ

باب محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم شرطِ ایمان ہے

۱۳ - عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَ وَلَدِهٖ

(بخاری)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے اس ذاتِ مقدس کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ مجھے اپنے والد اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ جانے۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام مسلم و نسائی نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے۔ نسائی کی روایت میں مِنْ مَالِهٖ وَاَهْلِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ کے الفاظ آئے ہیں ۲ - الرسول میں الف لام عہدی ہے اور اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام سے محبت رکھنا، ان کی تعظیم توقیر کرنا اور ان کی نبوتوں پر ایمان لانا واجب ہے۔ بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا انبیاء کرام علیہم السلام سے محبت کو مستلزم ہے بلکہ حضور علیہ السلام سے محبت تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین سے محبت کو بھی مستلزم ہے وَالَّذِیْ میں واؤ قسم کے لیے ہے۔ حَتّٰی غایت کے بیان کے لیے ہے۔ اَحَبُّ اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور قسم کلام میں تاکید اور قوت پیدا کرنے کے لیے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ کسی اہم امر کو بیان کرنے کے لیے قسم کا استعمال جائز ہے بِيَدِهٖ اللہ تعالے ہاتھ وغیرہ سے پاک ہے اور یہ لفظ متشابہات سے ہے۔ قرآن کریم میں بھی اللہ عزوجل نے اپنی طرف ید وغیرہ کی نسبت کی ہے۔ متشابہات سے متعلق علما کی دو رائیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اس لفظ پر ہمارا ایمان ہے اور اس کے اصل مفہوم کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ دوسرا طبقہ مؤلین کا ہے جو اس قسم کے الفاظ کا ایسا معنیٰ کرتے ہیں جو خدا تعالے کے شایانِ شان ہو۔ مثلاً جہاں ید کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے تو اس سے مراد وہ طاقت و حکومت اور اختیار لیتے ہیں تو اب حدیث کا ترجمہ یہ ہوگا کہ مجھے اس ذات کی قسم جس کے اختیار میں

میری جان ہے۔

حضور اکرم علیہ السلام کی محبت عین ایمان ہے

لَا یُؤْمِنُ۔ تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مجھ کو ساری کائنات سے زیادہ محبوب نہ رکھے۔ اس کا مطلب قطعاً یہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے بغیر ایمان کا پایا جانا ناممکن ہے۔ ہر شخص جس کو اللہ تعالے نے فہم و عقل کی دولت دی ہے وہ یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ جس کے ساتھ عقیدت و نیازمندی ایمان میں داخل ہو اور بغیر اسکے مانے ہوئے آدمی مومن نہ ہو سکے۔ اس کی محبت ساری کائنات سے زیادہ ضروری ہوگی۔ ماں باپ اولاد عزیز و اقارب کے انسان پر حقوق ہیں اور ان کا ادا کرنا لازم ہے لیکن اگر کوئی شخص ان سب کو بھول جائے اور اس کے دل میں ان کے لیے بالکل محبت و اُلفت باقی نہ رہے اور ان سب سے بے تعلق ہو جائے تو اس کے ایمان میں خلل نہ آئیگا کیونکہ ایمان لانے میں ماں باپ عزیز و اقارب کا ماننا ضروری نہیں ہے لیکن رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ماننا مومن ہونے کے لیے ضروری ہے۔ جب تک لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کا معتقد نہ ہو ہرگز مومن نہیں ہو سکتا۔ تو اگر اس کا رشتۂ محبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوٹا تو یقیناً ایمان سے خارج ہو گیا۔ کیونکہ تصدیقِ رسالت محبت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے اسلام میں حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کو سارے عالم سے زیادہ ضروری اور اسلام و ایمان کی شرطِ اوّل قرار دیا گیا ۲۔ محبت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ محبت اجلال و احترام جیسے والدین سے محبت، رحمت و شفقت جیسے اولاد سے محبت (رحمت و شفقت جیسے اولاد سے محبت) محبتِ احسان کہ کسی نے آپ پر احسان کیا تو آپ کا دل اس کی طرف مائل ہو گیا تو اس حدیث میں یہ بتایا گیا کہ تمام قسم کی محبتوں پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب ہونی چاہیئے کیونکہ مخلوقات میں آپ سے زیادہ شفیق مہربان، فیاض، محسن اور محترم ہستی اور کون ہے۔

۱۴- عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ

حضرت انس سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں کوئی مومن نہیں ہوتا جب تک میں اس سے اس کے والد، اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ پیارا اور محبوب نہ ہوں۔

فوائد و مسائل

مسلم اور نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ پہلی حدیث اور اس حدیث کا مضمون ایک ہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلی حدیث میں وَالنَّاسِ اجمعین کا لفظ نہ تھا۔ لہٰذا اصل مفہوم دونوں حدیثوں کا یہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تک سارے جہان سے پیارے و محبوب نہ ہوں اس وقت تک کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا۔ احادیث میں والد اور ولد کا ذکر محض اس لیے لایا گیا ہے کہ یہ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کو ان سے لامحالہ محبت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان احادیث کی توثیق و تائید قرآن پاک کی متعدد آیات سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اگر تمہارے باپ، بیٹے، عورتیں، کنبہ، کمائی کا مال، تجارت جس کے نقصان کا تمہیں ڈر ہے اور تمہاری پسند کے مکان، یہ چیزیں تمہیں (اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام اور اس

کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہوں تو انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لائے۔ یہ اور اس مضمون کی متعدد آیات میں یہ بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، آباؤ اجداد، اولاد، عزیز و اقارب، دوست، احباب، مال و دولت، شوکت و حکومت، مسکن وطن سب چیزوں کی محبت سے اور خود اپنی جان کی محبت سے زیادہ ضروری و لازم ہے۔ اگر ماں، باپ یا اولاد یا رشتہ دار اللہ و رسول کے ساتھ رابطہ عقیدت و محبت نہ رکھتے ہوں تو ان سے دوستی و محبت جائز نہیں۔

بَابُ حَلَاوَةِ الْإِيمَانِ

باب حلاوتِ ایمان کے بیان میں

۱۵- عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ اَنْ يَكُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَاَنْ يُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَاَنْ يَكْرَهَ اَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُّقْذَفَ فِي النَّارِ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین چیزیں جس میں ہوں وہ ایمان کی لذت اور شیرینی کو پالیتا ہے ۱- جس کو اللہ و رسول سارے عالم سے پیارے ہوں ۲- اور جو کسی بندے کو خاص اللہ کے لیے محبوب رکھتا ہو ۳- جو اسلام قبول کرنے کے بعد اس سے پھرنے کو ایسا بُرا جانے جیسے کہ آگ میں ڈالے جانے کو بُرا جانتا ہے۔

اللہ و رسول سارے عالم سے پیارے ہونے چاہئیں

اس حدیث کو امام مسلم و ترمذی و نسائی نے بھی روایت کیا ہے ۲- حلاوۃ مصدر ہے اس کے معنیٰ مٹھاس کے ہیں۔ یہ (مُر) کڑوے کی ضد ہے۔ حلاوۃ الایمان کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان کو ایمان کی ایسی لذت حاصل ہو جائے اور خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس درجہ غالب ہو کہ خدا و رسول کی اطاعت میں لذت محسوس کرے۔ یکرہ جیسے کہتے ہیں کرھت الشئی۔ میں نے فلاں چیز کو بُرا جانا یعنی اس سے میں راضی نہیں۔ یُقْذَفُ قذف سے مشتق ہے اس کے معنیٰ پھینکنے کے ہیں۔ خاذف اور قاذف دونوں کے معنیٰ پھینکنے والے کے ہیں۔ لیکن اگر پتھر پھینکا جائے تو قذف بولیں گے اور اگر کنکریاں پھینکی جائیں تو خذف بولیں گے۔

۵- علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔ یہ حدیث اصولِ اسلام سے ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا بیان ہے۔ جو اصل ایمان بلکہ عین ایمان ہے اور اللہ و رسول سے محبت اور کفر سے کراہت اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ انشراحِ صدر ہو جائے اور ایمان خون اور گوشت میں رس بس جائے تو وہ شخص ایمان کی حلاوت کو پالیتا ہے اور کسی سے اللہ تعالیٰ کے لیے محبت رکھنا (اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ) یہ اللہ سے محبت کرنے کا ثمرہ اور نتیجہ ہوتا ہے۔

۶- شارحین کرام نے محبت اللہ کے معنیٰ یہ کیے ہیں کہ اسکے احکام کی اطاعت اور اسکے منہیات سے پرہیز کیا جائے۔ بعض نے اس کو یوں ادا کیا کہ محبت اللہ کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کو پسند ہے دل ان کو پسند کرے جو اللہ کو پسند نہیں اس سے

پرہیز کیا جائے۔ بعض نے اسی کو یوں ادا کیا۔ محبۃ اللہ کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کو پسند ہے دل ان کو پسند کرے۔ جو اللہ کو ناپسند ہیں دل ان کو ناپسند کرے۔ علامہ قاضی عیاض علیہ الرحمۃ نے فرمایا محبۃ اللہ کا مطلب یہ ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں استقامت اور اس کے اوامر و نواہی کا التزام ہو۔ محبت میلانِ قلب کا نام ہے۔ حسن، اخلاق، احسان یہ محبت کرنے کا سبب بنتے ہیں اور یہ تمام امور حضور علیہ السلام میں پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ حضور علیہ السلام محسنِ عالم ہیں۔ ظاہری و باطنی حسن کے مجسمہ ہیں۔ اخلاقِ عالیہ اور محاسن غیر متناہیہ کے پیکر ہیں۔

۷۔ ان یحب المرء میں الحب فی اللہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو بھائی بھائی قرار دیا ہے۔ فاصبحتم بنعمتہٖ اخوانا۔ لہٰذا حلاوتِ ایمان کا درجہ اسی مسلمان کو حاصل ہوگا جو دوسرے مسلمان سے محض اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرے اور اس میں کسی دنیاوی غرض کو دخل نہ ہو۔ وان یکرہ یعنی جس کے دل میں ایمان گھر کر جائے اور اسلام کے محاسن اور کفر کے خباثت سے اچھی طرح واقف ہو جائے تو پھر اس کو کفر دوبارہ اختیار کرنا ایسے ہی مکروہ و ناپسندیدہ ہوگا جیسے آگ میں ڈالا جانا۔

۸۔ اس حدیث میں ایمان کو شہد سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مشبہ ایمان ہے مشبہ بہ عسل ہے۔ وجہ شبہ دونوں میں لذت ہے۔ یہ استعارہ بالکنایہ ہوا۔ پھر مشبہ بہ کو ذکر کیا اور خواص و لوازم مشبہ بہ کی طرف اس کی اضافت کر دی۔ یہ استعارہ تخیلیہ ہوا۔ گویا جیسے شہد کے ذائقے سے جو واقف ہو جاتا ہے تو شہد جیسی مٹھاس اور ذائقہ اور فائدہ کسی دوسری چیز میں نہیں پاتا۔ اسی طرح جو مسلمان ایمان کی حلاوت پالیتا ہے تو اس پر چند اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جن میں سے تین اس حدیث میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سارے عالم سے زیادہ پیارے ہو جاتے ہیں۔ الحب فی اللہ اس شخص کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور اسلام سے بغاوت اس کے لیے ایسے ہی دشوار ہوتی ہے جیسے آگ میں اپنے جسم کو ڈالنا۔

۹۔ امام مسلم نے حدیث کے اس ٹکڑے ان یقذف فی النار سے اس مومن کی فضیلت کا استدلال کیا ہے۔ جسے کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے اور وہ تقیہ نہ کرے بلکہ جان دیدے۔ نوٹ۔ حدیث نمبر ۲۰ کا بھی یہی مضمون ہے۔

باب علامة الایمان حب الانصار

باب　ایمان کی علامت انصار سے محبت ہے

۱۶۔ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اٰيَةُ الْاِيْمَانِ حُبُّ الْاَنْصَارِ وَ اٰيَةُ النِّفَاقِ بُغْضُ الْاَنْصَارِ۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انصار سے محبت ایمان کی علامت ہے اور انصار سے بغض رکھنا نفاق کی علامت ہے۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے فضائل الانصار میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ۲۔ آیت کے معنی علامت کے ہیں۔ ۳۔ انصار ناصر کی جمع ہے۔ انصار کو انصار اس لیے کہتے ہیں کہ انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی تھی اور آپ کا ساتھ دیا تھا اور اسلام کی سرسبزی و شادابی کے لیے نہایت ایثار سے کام لیا تھا۔ قرآنِ پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان افراد کو ناصر اور مومن فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ نفاق کے معنیٰ یہ ہیں کہ زبان سے اسلام کا اظہار کرنا اور دل میں کفر چھپانا ۳۔ اس حدیث میں انصار کے ساتھ محبت رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یوں تو ہر مومن سے محبت رکھنا ضروری ہے۔ مگر انصار کی اسلامی خدمات اور دوسری خصوصیات کی وجہ سے ان سے محبت رکھنے کو خاص طور پر بیان کیا گیا خصوصیت کے ساتھ انصار سے محبت رکھنے کی تاکید فرمانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہوں گے جو مہاجرو انصار و صحابہ کرام کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں گے۔ اسی لیے دوسری حدیث میں حضور علیہ السلام نے فرمایا میرے اصحاب کے حق میں اللہ سے ڈرو جس نے ان کو محبوب رکھا تو میری محبت کی وجہ سے محبوب رکھا اور جس نے ان سے بغض رکھا جس نے ان کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے بیشک خدا کو ایذا دی اور جس نے خدا کو ایذا دی تو خدا اس سے باز پرس فرمائیگا (ترمذی) ۴۔ اس مضمون کی بکثرت احادیث ہیں۔ جن سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ صحابہ کرام انصار و مہاجرین سے محبت رکھنا اور ان کی تعظیم و توقیر کرنا ہر مسلمان کے لیے لازمی ہے۔ یہ وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جنہوں نے بلاواسطہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض حاصل کیا اور آپ پر جان و مال قربان کیا اور دینِ اسلام کو اپنے خون سے سینچا اور اسلام کے لیے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ یہ افراد ساری قومِ مسلم کے محسن اور مخدوم ہیں اور ان سے محبت رکھنا یقیناً اسلام ہے اور ان سے بغض و عداوت منافقت ہے ۵۔ حدیثِ ہذا میں ایۃ الایمان مبتدا ہے اور حب الانصار اس کی خبر ہے اور جب مبتدا اور خبر دونوں معرفہ ہوں تو حصر کا فائدہ دیتے ہیں تو اگر حصر حقیقی مراد لیا جائے جیسا کہ حدیث کا اقتضا بھی ہے تو اس کا صاف و صریح مطلب یہی ہوگا کہ انصار و مہاجرین و صحابہ کرام سے محبت رکھنا اس لحاظ سے کہ وہ صحابی رسول اللہ ہیں یا انصار رسول اللہ ہیں ایمان ہے اور ان حضرات سے اس لحاظ سے بغض و عداوت رکھنا کہ یہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یقیناً نفاق ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کے ساتھ بغض صحابہ کرام کا جمع ہونا ناممکن ہے۔

بَابٌ اِنَّ عِبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ وَكَانَ شَهِدَا

باب حضرت عبادہ بن صامت جو بدر کی لڑائی میں شریک ہوئے تھے

بَدْرًا وَّاَحَدَ النُّقَبَاءِ لَيْلَةَ الْعُقْبَةِ

۱۷۔ اَخْبَرَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَحَوْلَهٗ عِصَابَةٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ بَايِعُوْنِیْ عَلٰٓى اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ وَلَا تَاْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوْا فِیْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَّفٰى مِنْكُمْ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ فِی الدُّنْيَا فَهُوَ

اور لیلۃ العقبہ میں نقیب بنائے گئے تھے سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور آپ کے اردگرد صحابہ کی ایک جماعت تھی۔ مجھ سے بیعت کرو (ان امور پر) کہ ۱۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ گے ۲۔ چوری نہیں کرو گے ۳۔ زنا نہیں کرو گے ۴۔ اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے ۵۔ کسی پر بہتان نہیں باندھو گے جس کو تم ہاتھ اور پاؤں کے درمیان سے افترا کرتے ہو ۶۔ معروف میں نافرمانی نہ کرو گے۔ پس جس نے اس عہدو پیمان کو پورا کیا اس کا اجر اللہ پر ہے اور جو کوئی ان

كَفَّارَةٌ لَهُ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللهُ فَهُوَ اِلَى اللهِ اِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَاِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ

(بخاری)

گناہوں میں سے کچھ کر بیٹھے اور اس کو دنیا میں اس کی سزا مل جائے تو یہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جس نے ان گناہوں میں سے کسی کا ارتکاب کیا اور اللہ نے اس کے گناہوں کو چھپائے رکھا تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے چاہے تو اس کو معاف فرما دے یا محاسبہ فرمائے۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام نے پانچ جگہ بخاری میں ذکر کیا ہے۔ مغازی، وفود الانصار۔ حدود اور احکام میں نیز مسلم نسائی و ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

شهد ۔ حضر کے معنیٰ میں ہے۔ جیسے قرآنِ حکیم میں حضور اکرم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شاہد قرار دیا گیا ہے جس کے معنیٰ حاضر کے ہیں۔ اصل الشہود الحضور (عینی جلد ۱ صفحہ ۱۸۱) یہ باب علم یعلم سے ہے جیسے بولتے ہیں قوم شهود ای حضور شہود مصدر ہے اور شہادت کے معنیٰ یقینی خبر کے ہیں جیسے بولتے ہیں شهد الرجل علی كذا یہاں شَهِدَ بَدرًا کے معنیٰ یہ ہیں کہ حضرت عبادہ بن صامت بدر کی لڑائی میں حاضر تھے ۳۔ بدر ایک گاؤں کا نام ہے جہاں سال کے سال میلہ لگتا تھا۔ یہ مدینہ منورہ سے ۸۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ بدر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ بدر ایک شخص کا نام تھا جس نے کنواں کھدوایا۔ اسی کے نام سے اس کا نام بدر ہو گیا۔ ۴۔ احد النقباء یعنی حضرت عبادہ بن صامت بارہ نقیبوں میں سے ایک ہیں۔ نقیب قوم کے سردار اور معلم یا قوم کے ذمہ دار کو کہتے ہیں۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ حج کے موسم میں رؤسائے قبائل کے پاس جا کر تبلیغ اسلام فرمایا کرتے تھے۔ رجب ۱۱ھ میں آپ نے عقبہ کے پاس جہاں اب مسجد عقبہ ہے۔ خزرج کے چند اشخاص کو دعوتِ اسلام دی اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ انہوں نے یہود سے سن رکھا تھا کہ ایک نبی پیدا ہونے والے ہیں۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا یہ وہی نبی ہیں اور یہ بھی کہا کہ دیکھو یہود ہم سے اسلام لانے میں سبقت نہ لے جائیں۔ یہ کہہ کر ان سب نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ چھ اشخاص تھے۔ جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ابوالہیثم بن تیہان ۲۔ اسعد بن زرارہ جنہوں نے ۱ھ میں وفات پائی ۳۔ عوف بن حارث ۴۔ رافع بن مالک بن حارث یہ جنگِ احد میں شہید ہوئے ۵۔ قطبہ بن عامر یہ یمامہ میں شہید ہوئے ۶۔ جابر بن عبداللہ۔ اسلام لانے کے بعد یہ لوگ اپنے گھروں میں چلے گئے اور انہوں نے اسلام کی تبلیغ کی۔ دوسرے سال موسمِ حج میں بارہ اشخاص مدینہ منورہ سے آئے اور بیعت کی[1]۔ اور اس کے ساتھ یہ خواہش کی کہ احکامِ اسلام سکھانے کے لیے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ پھر اگلے سال ۷۰ یا ۷۲ شخص حج کے زمانہ میں آئے اور انہوں نے بمقامِ منیٰ، عقبہ حضور علیہ السلام کے دستِ اقدس پر بیعت کی اور آپ نے اس گروہ میں سے ۱۲ شخص نقیب منتخب فرمائے۔ ان میں نو خزرج کے اور تین اوس کے تھے۔ انہیں میں ایک نقیب حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے اور یہ بیعت عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت بیعتِ رضوان میں بھی شریک تھے جو ہجرت کے بعد ہوئی۔ جب کہ حضور علیہ السلام عمرہ کے لیے مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ حضور علیہ السلام نے جن باتوں پر انصار سے بیعت لی تھی ان کا ذکر اس حدیث میں ہے۔

---

[1] یہ بیعت عقبہ اولیٰ ۱۱ھ

۷۔عصابہ کے معنیٰ جماعت کے ہیں (ع کے زیر کے ساتھ) اس کا اطلاق دس افراد سے لے کر چالیس افراد تک ہوتا ہے۔عصابہ اس پٹی کو بھی کہتے ہیں جو ماتھے پر باندھی جاتی ہے۔اس کے معنیٰ احاطہ کرنے کے بھی ہیں ۸۔ مابیعونی مبایعت کے معنیٰ خرید وفروخت کے ہیں۔مبایعۃ علی الاسلام کا مطلب عہد وپیمان ہے۔اس عہد وپیمان کو جو حضور علیہ السلام نے صحابہ کرام سے لیا۔بیع سے تشبیہ دی گئی۔کیونکہ ہر ایک نے جو اس کے پاس تھا اس کو بیچا۔صحابہ کرام نے عہد کیا کہ ہم احکام اسلام کی اطاعت کریں گے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے عوض ان سے ثواب کا وعدہ فرمایا۔۹۔بہتان۔اس جھوٹ کو کہتے ہیں جس کو سن کر انسان حیران ہوجائے۔کسائی نے کہا۔بہتان کے معنیٰ جھوٹ کے ہیں۔بہتان کے اصل معنیٰ حیرانی کے ہیں بہتان کے معنیٰ یہ ہیں کہ کسی شخص کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو اس میں نہیں ہے۔خطابی نے کہا کہ یہاں بہتان کے معنیٰ پاکدامن عورتوں کو زنا کی تہمت لگانے کے ہیں ۱۰۔عصیان یہ ضد ہے اطاعت کی ۱۱۔ معروف۔ہر نیک کام کو کہتے ہیں علامہ بیضاوی نے فرمایا۔معروف اس کام کو کہتے ہیں جس کو شارع علیہ السلام نے نیک قرار دیا ہو۔معروف اللہ تعالےٰ کے احکام کو بھی کہتے ہیں۔معروف کے عمومی معنیٰ اللہ تعالےٰ کی اطاعت کے ہیں۔

مسائلِ حدیث اس سے پہلی حدیث میں انصار سے محبت رکھنے کا بیان تھا اور یہ کہ انصار کو یہ فضیلت اسلیے حاصل ہوئی کہ انھوں نے اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا اور آپ کی جان و مال سے مدد کی۔جب کہ ساری دنیا آپ کے خلاف تھی۔اس میں انصار کی وجہ تسمیہ کا بیان ہے کہ پہلے اس قوم کو نبی قیلہ کہتے تھے لیکن جب ان کے سرداروں نے اسلام قبول کیا اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی تو ان کا لقب انصار ہوگیا یعنی دین کے مددگار۔

انصار نے جن امور پر بیعت کی وہ یہ ہیں۔

۱۔شرک نہیں کریں گے ۲۔زنا کے قریب نہ جائیں گے ۳۔چوری نہیں کریں گے ۴۔اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے یوں تو مسلمان کو ناحق قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے مگر قتل اولاد کی قید اس لیے ہے کہ اس زمانہ میں لوگ اپنی اولاد کو مفلس ہوجانے کے خوف سے قتل کردیا کرتے تھے یا یہ کہ اولاد کو قتل کر دینا بہ نسبت دوسروں کے اشد کبیرہ ہے کیونکہ اس میں قطعیۃ رحم بھی ہے۔
۵۔بہتان نہیں باندھیں گے۔عرب میں یہ دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی۔وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کردیا کرتی تھی یا مجہول بچہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی طرف منسوب کردیا کرتی تھی۔عام مردوں کی یہ حالت تھی کہ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگایا کرتے تھے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان لوگوں کو بیعت فرمایا تو ان لوگوں سے عہد لیا کہ آئندہ کسی پر افترا، و بہتان نہیں باندھیں گے۔حدیث ہذا میں بہتان کی نسبت ہاتھ اور پاؤں کی طرف کی گئی ہے۔حدیث کے لفظ یہ ہیں ——— "بہتان نہ باندھیں گے۔جن کو ہاتھ اور پاؤں کے درمیان سے افترا کرتے ہیں"۔شراح احادیث نے اس کے متعدد معنیٰ کیے ہیں۔بعض نے کہا۔"ہاتھ اور پاؤں" کنایہ ہے نفس سے اور عبارت یہ ہوگی۔ لا تاتوا ببھتان من قبل انفسھم یعنی اپنی ذات سے اور دل سے کسی پر بہتان نہ باندھیں گے کیونکہ دل ہاتھ پاؤں کے درمیان ہوتا ہے۔محمد بن جمرہ نے فرمایا کہ بین ایدیکم کے معنیٰ یہ ہیں کہ فی الحال کسی پر بہتان نہ باندھیں گے اور ارجلکم

کے معنیٰ یہ ہیں کہ زمانۂ آئندہ میں کسی پر بہتان نہ باندھیں گے۔

۶- ولا تعصوا فی معروف اور اچھی بات میں نافرمانی نہیں کریں گے۔ اچھی بات کی قید صرف ان کے نفوس کی تطییب کے لیے ہے ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معروف ہی کا حکم فرماتے ہیں۔

عاصی کو سزا دینا اور مطیع کو ثواب عطا فرمانا اللہ پر واجب نہیں ہے

واضح ہو کہ اللہ رب العزت جل مجدہٗ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے مطیع کو بخشنا اور عاصی کو سزا دینا یہ بھی اللہ پر واجب نہیں ہے وہ فعال لما یرید ہے۔ چنانچہ حدیث ہٰذا کے اس ٹکڑے سے کہ جس نے گناہ کیا تو اگر خدا چاہے تو اس کو بخش دے اور چاہے تو سزا دیدے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ رب العزت جل مجدہٗ پر عاصی کو سزا دینا واجب نہیں ہے۔ جب عاصی کو سزا دینا اس پر واجب نہیں ہے تو مطیع کو ثواب عطا فرمانا بھی اس پر واجب نہیں ہے۔ لہٰذا مسلمان کا عقیدہ یہ ہونا چاہیئے کہ اللہ رب العزت جل مجدہٗ مطیع کو جو ثواب عطا فرمائے گا وہ محض اس کا فضل و کرم ہوگا یعنی ؎

اگر بخشے زہے قسمت نہ بخشے تو شکایت کیا　　　سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

۲- فھو الی اللہ یعنی مومن کو ثواب عطا فرمانا اور عاصی کو عذاب دینا خدا کے قبضہ میں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اہل کبائر سے جو شخص بغیر توبہ کیے مرگیا تو اللہ تعالیٰ چاہے تو اول مرتبہ ہی اس کو جنت میں داخل فرمادے اور اگر چاہے تو سزا دینے کے بعد جنت میں داخل فرمائے۔ یہ ہی عقیدہ اہل سنت وجماعت کا ہے کہ اجر وعذاب مفوض الی اللہ ہے۔ اسی حدیث سے معتزلہ اور خوارج کے خیال کی تردید کی گئی ہے۔ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ اگر بغیر توبہ کیے مر گیا تو اللہ تعالیٰ پر اس کو عذاب دینا واجب ہے اور اگر توبہ کرکے مرا ہے تو اللہ تعالیٰ پر اس کو معاف کر دینا واجب ہے۔ اسی طرح اس حدیث سے خوارج کے اس خیال کی بھی تردید ہوگئی جو یہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ کافر ہے۔ کیونکہ اگر مرتکب کبیرہ کافر ہوجاتا تو اس کی بخشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳- نیز فھو الی اللہ یعنی گنہ گار کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے چاہے بخشے اور چاہے تو سزا دے۔ اس میں توبہ کرکے مرنے والے اور بغیر توبہ کیے مرنے والے دونوں شامل ہیں۔ نیز اسی جملہ حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی کے جہنمی یا جنتی ہونے کا قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بخشنا یا سزا دینا یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ البتہ جن جن افراد کے جہنمی یا جنتی ہونے پر نص وارد ہوچکی ہے ان کے جہنمی یا جنتی ہونے کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔

اس موقع پر یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ حدیث ہٰذا میں عموم ہے۔ لفظِ حدیث یہ ہیں۔ من اصاب من ذالک شیئًا۔ جس میں شرک، زنا، قتل، بہتان وغیرہ تمام گناہ داخل ہیں۔ تو اب عموم حدیث کا منشا یہ ہوگا کہ اگر کوئی شرک کرکے مرتد ہوگیا اور اس کو حداً قتل کر دیا گیا تو یہ قتل اس کے لیے کفارہ ہوجائے گا۔ حالانکہ یہ بات قرآنِ مجید کی اس آیت کے خلاف ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرک کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔ لہٰذا حدیث ہٰذا کا عموم آیت ان اللہ لایغفران یشرك بہ سے مخصوص ہے اور معنیٰ حدیث یہ ہے کہ جس نے شرک کے علاوہ کوئی گناہ کیا اور اس پر حدقائم

ہوگئی تو یہ کفارہ ہوگا۔

۳۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ذالک کا لفظ اشارہ ہے۔ غیر شرک کی طرف اور لفظ ستر اس پر قرینہ ہے۔ کیونکہ ستر اس چیز کا ہوتا ہے جس کا اظہار اور اخفا ہو سکے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ کفر و شرک امور باطنہ سے ہیں کیونکہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے لہٰذا اس تقدیر پر حدیث میں خصوص کی بھی حاجت نہیں رہتی۔

۴۔ علامہ طیبی نے فرمایا کہ شرک سے مراد ہی یہاں شرکِ خفی، ریا، سمعہ وغیرہ ہے۔ مگر ان کا ایسا فرمانا کئی وجہ سے غلط ہے۔ اول اس لیے کہ جب مطلقاً شرک کا لفظ بولا جائے تو اس سے توحید کا مقابل ہی مراد ہوتا ہے یعنی شرکِ جلی۔ دوم، اس لیے کہ جس زمانہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی تھی۔ یہ اوائلِ بعثت کا زمانہ تھا اور اس دور میں کثرت سے بتوں کی پوجا ہوتی تھی۔ ان دو قرینوں کے ہوتے ہوئے شرکِ خفی مراد لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ سوم، یہ کہ فعوقب لفظ بھی اس کی تردید کرتا ہے کیونکہ ریا سمعہ جو شرکِ خفی ہے اس پر کوئی حد نہیں ہے۔ فافہم

کیا حُدودِ شرعیہ گناہ کا کفارہ ہیں

حدود و کفارات گناہ کا کفارہ ہوتے ہیں یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ اکثر اہلِ علم کا مسلک یہ ہے کہ حدودِ شرعیہ گناہ کا کفارہ ہیں یعنی جس پر حد قائم ہوگئی اس کا گناہ معاف ہوگیا۔ یہ حضرات اپنے مسلک پر حدیثِ ہٰذا کے اس جملے سے دلیل پکڑتے ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰالِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ	جس سے کوئی گناہ ہوا پھر دنیا میں اس کو سزا دی گئی اس پر حد قائم کردی گئی تو یہ حد آخرت کے گناہ کا کفارہ ہوجائیگی

چنانچہ اس مسلک کی تائید میں وہ اور بھی حدیثیں پیش کرتے ہیں جو متعدد صحابہ کرام سے مروی ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ تعالےٰ وجہہ الکریم سے ترمذی وحاکم نے، ابو تمیم یمنی سے طبرانی نے (باسنادِ حسن) اور حضرت خزیمہ بن ثابت نے امام احمد سے (باسنادِ حسن) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہم سے طبرانی نے مرفوعاً اس مضمون کی حدیث روایت کی:

مَنْ اَصَابَ ذَنْبًا فَعُوْقِبَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا فَاللّٰهُ اَكْرَمُ مِنْ اَنْ يُّثَنِّيَ بِالْعُقُوْبَةِ عَلٰى عَبْدِهٖ فِي الْاٰخِرَةِ (عینی جلد ۱ ص ۱۸۷)	جس نے کوئی گناہ کیا پھر دنیا میں اس کی پاداش میں حد لگائی گئی تو اللہ تعالےٰ سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے بندہ کو آخرت میں دوبارہ سزا دے۔

لیکن احناف کا مسلک یہ ہے کہ حدود و کفارات امنِ عالم کے قیام کے لیے ہیں۔ حد سے اُخروی سزا کی معافی نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ مجرم اسی دنیا میں توبہ نہ کرے۔ احناف اپنے مسلک پر حدیث ابوہریرہ سے استدلال کرتے ہیں جس میں حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

لَا اَدْرِيْ الْحُدُوْدُ كَفَّارَةٌ لِاَهْلِهَا اَمْ لَا	میں اٹکل سے نہیں کہتا کہ حدود اس کے اہل کے لیے کفارہ ہوتے ہیں یا نہیں۔

حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ بلاشبہ صحیح ہے اور شرطِ شیخین پر ہے اس کو حاکم و بزار

نے بروایت معمر ابن ابی ذئب عن سعید المقبری عن ابی ہریرۃ روایت کیا ہے، اور امام احمد نے عبد الرزاق سے انہوں نے معمر سے روایت کیا ہے۔ لہٰذا احناف حدیث ابی ہریرہ سے حجت پکڑتے ہوئے اس معاملہ میں توقف فرماتے ہیں۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جو اہلِ علم حدیث عبادہ بن صامت سے استدلال کرتے ہوتے اس امر کے قائل ہیں کہ حدود و کفارہ ہیں وہ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو بھی صحیح مانتے ہیں اور دونوں حدیثوں میں تطبیق یہ دیتے ہیں کہ حدیث ابوہریرہ سابق ہے یعنی یہ بات کہ حد کے قائم ہو جانے سے گناہ معاف ہو جاتا ہے یا نہیں؛ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا تھا جب کہ اس کے متعلق اللہ عزوجل کی طرف سے کوئی ہدایت نہ آئی تھی لیکن جب اللہ تعالےٰ نے آپ کو مطلع فرما دیا تو اس وقت آپ نے فرمایا کہ حد کے قائم ہو جانے سے آخرت کا گناہ معاف ہو جاتا ہے جس کا بیان حدیث عبادہ میں ہے۔ ان کی اس تقریر پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث ابوہریرہ سابق نہیں ہو سکتی کیونکہ حدیثِ عبادہ اس وقت کی ہے جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو مکہ معظمہ میں بیعت فرمایا تھا۔ یہ بیعت اولیٰ کہلاتی ہے اور حضرت ابوہریرہ اس بیعت کے سات سال بعد عام خیبر میں ایمان لائے تھے لہٰذا حدیثِ ابوہریرہ سابق کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ حضرت ابوہریرہ عام خیبر میں بیعت کے سات سال بعد ایمان لائے مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے خود حضور علیہ السلام سے حدیث نہ سُنی ہو بلکہ کسی اور صحابی سے سُن کر بیان کی ہو۔ جس نے قدیم سے حضور علیہ السلام سے یہ حدیث سُن رکھی ہوگی۔ حافظ ابن حجر نے جواب دیا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ حدیثِ عبادہ میں وہ بیعت مراد نہ ہو جو لیلۃ العقبہ میں ہوئی تھی۔ بلکہ اس کے بعد بھی کئی بیعتیں ہوئیں جن میں حضرت عبادہ شریک ہوئے تھے ان میں سے کوئی بیعت مراد ہو۔ لیکن میری گزارش یہ ہے کہ اس تمام گفتگو کی بنیاد محض امکان پر ہے یعنی یہ حضرات یہی تو کہتے ہیں کہ ممکن ہے اس بیعت سے بیعت لیلۃ العقبہ مراد نہ ہو ممکن ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے خود حضور علیہ السلام سے حدیث نہ سُنی ہو اور اس امکان پر ان کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔ لہٰذا صحیح یہ ہے کہ حدیثِ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سابق ہی ہے اور حدیث عبادہ بن صامت سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ حدود سے آخرت کا گناہ معاف ہو جاتا ہے کیونکہ بیعتِ لیلۃ العقبہ کے زمانہ میں حدود و قصاص کے احکام نہیں نازل ہوئے تھے اس لیے عقوبت سے حد مراد ہی نہیں ہے۔

اس کے برعکس حدیث ابوہریرہ میں حدود کا لفظ موجود ہے۔ لہٰذا حدیثِ ہٰذا میں فَعُوقِبَ کے لفظ سے عقوباتِ قدریہ یعنی مصائب و آلام مراد ہیں جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ مومن کو جو رنج و غم پہنچتا ہے حتیٰ کہ جو کانٹا اس کو چبھتا ہے اللہ تعالےٰ اس کو بھی اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ لہٰذا جب عقوبت سے مصائب و آلام مراد ہوتے تو اب مسلک امام اعظم علیہ الرحمہ ہی ثابت رہا ۲۔ نیز طحاوی میں حدیث موجود ہے کہ دربارِ نبوی میں ایک چور پکڑ کر لایا گیا۔ آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد وہ پھر حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا اپنے گناہوں سے توبہ کر لی۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اگر حد کے جاری ہونے سے اصلی گناہ معاف ہو جاتا ہے تو پھر حضور علیہ السلام حد جاری فرمانے کے بعد توبہ کراتے ۳۔ اب رہی وہ حدیث جس میں یہ ہے کہ جس سے کوئی گناہ ہوا اور اس پر حد قائم ہو گئی تو اللہ بہت عادل ہے کہ اس کو دوبارہ آخرت میں سزا دے۔ یہ حدیث ترمذی کی

ہے اور اس کے اصل لفظ یہ ہیں۔ فاللّٰہُ اعدل من ان یثنیٰ علی عبدہ العقوبۃ فی الاخرۃ۔ حدیث کے ان الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا قطعی حکم لگانا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالےٰ جو عادلِ حقیقی ہے جو رحمن و رحیم ہے اس کی بارگاہ سے اس امید کا اظہار فرمانا ہے کہ وہ اپنے فضل سے اس شخص سے آخرت میں دوبارہ مواخذہ نہ فرمائے جس پر دنیا میں حدِ شرعی قائم ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس حدیث سے بھی یہ قطعی طور پر ثابت نہیں ہوا کہ جس پر حد شرعی لگ گئی اس کا گناہ بھی معاف ہو گیا۔

ضروری نوٹ: - اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ صدرِ اوّل کے مسلمانوں میں تقویٰ و خوف و خشیت کا یہ عالم تھا کہ جب ان سے باقتضاءِ بشریت کوئی گناہ سرزد ہو جاتا تو فوراً نادم ہوتے۔ حتیٰ کہ بحضورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آ کر عرض کرتے کہ ہم سے گناہ ہو گیا ہے پاک کر دیجئے (حد لگا دیجئے) ظاہر ہے کہ جن کی خشیت کا یہ حال ہو کہ وہ اپنی ذات کو خود سزا کے لیے پیش کر دیں اور اپنے کیے پر منفعل ہوں تو ان کا نادم ہونا اور خود حاضر ہو کر جرم کا اقرار کرنا ہی توبہ ہے۔ چنانچہ حضرت ماعز اسلمی نے خود حاضر ہو کر اقرارِ جرم کیا اور ان پر حد لگی۔ اسی طرح ایک خاتون نے اعترافِ جرم کیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تو حاملہ ہے۔ وضع حمل کے بعد آنا۔ وہ وضع حمل کے بعد پھر آئیں تو فرمایا ابھی بچہ کے دودھ پینے کا زمانہ ہے جب وہ ختم ہو جائے تو پھر آنا۔ چنانچہ وہ خاتون مدتِ رضاعت پورا کرنے کے بعد پھر آئیں اور بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ جس سے انھوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ اب بچہ میرے دودھ کا محتاج نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام نے حد لگانے کا حکم دیا اور اس خاتون رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق فرمایا:-

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَۃً لَوْ تَابَھَا صَاحِبُ مَکْسٍ لَغُفِرَ لَہٗ

مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ ناجائز طور پر ٹیکس لینے والا بھی اگر توبہ کرے تو بخشا جائے۔

اور حضرت ماعز رضی اللہ تعالےٰ کے متعلق فرمایا۔

اِسْتَغْفِرُوْا لِمَاعِزِ بْنِ مَالِکٍ لَقَدْ تَابَ تَوْبَۃً لَوْ قُسِمَتْ بَیْنَ اُمَّۃٍ لَوَسِعَتْھُمْ

(مشکوٰۃ شریف کتاب الحدود)

ماعز بن مالک کے لیے مغفرت چاہو۔ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر پوری اُمّت میں تقسیم کی جائے تو کفایت کرے

تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حدِ شرعی ان کے گناہ کا کفارہ ہو گئی بلکہ گناہ کی معافی تو ان کے منفعل ہونے سے ہوئی ہے۔ فافہم

۳- حضرت ملا علی قاری نے فعوقب کی ایک اور تفسیر کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس شخص نے کوئی جرم کیا اور اللہ تعالےٰ نے دنیا میں اس کو سزا دیدی تو اس جرم کی سزا آخرت میں اس کو نہیں دی جائیگی۔ البتہ توبہ نہ کرنے کی سزا اس کو ضرور ملے گی کیونکہ ترکِ توبہ ایک علیحدہ جرم ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (مرقات ج ۱ ص ۸۰) (واللہ اعلم)

عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس حدیث کے راویوں میں حضرت عبادہ قابلِ ذکر ہیں۔آپ حسین و جمیل، قدآور، نہایت مضبوط بدن کے صحابی تھے۔عقبہ اولیٰ و ثانیہ، بدر و احد، بیعت الرضوان اور تمام مشاہد میں شریک ہوئے۔سب سے پہلے فلسطین کے حاکم یہی بنائے گئے۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو شام کا قاضی بھی بنایا تھا۔یہ حمص میں مقیم ہوگئے پھر فلسطین میں آگئے اور وہیں ۳۴ھ میں انتقال فرمایا اور بیت المقدس میں دفن ہوئے۔عبادہ بن صامت نامی صرف ایک ہی صحابی ہیں لیکن صرف عبادہ نامی بارہ صحابی ہوئے ہیں۔حضرت عبادہ بن صامت سے ۱۸۱ احادیث مروی ہیں جن میں سے صرف ۶ حدیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے اور دو کو صرف مسلم نے اور دو ہی کو بخاری نے منفرداً ذکر کیا۔

بَابٌ مِّنَ الدِّيْنِ الْفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ

باب فتنوں سے بچنا بھی دینداری ہے

۱۸۔عَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيِّ اَنَّهٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ اَنْ يَّكُوْنَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يَّتْبَعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْمَطَرِ يَفِرُّ بِدِيْنِهٖ مِنَ الْفِتَنِ (بخاری شریف)

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئیگا کہ مسلمان کا بہترین مال بکریاں قرار پائیں گی۔جن کو ساتھ لے کر اپنے دین کو فتنے سے بچانے کے لیے وہ پہاڑ کی چوٹیوں اور بارش کے مقامات پر چلا جائیگا۔

فوائد و مسائل ۱۔اس حدیث کو امام نے ان ابواب میں ذکر کیا ہے۔فتن، رقاق، علاماتِ نبوت اور ابو داؤد، نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے ۲۔یوشک کے معنیٰ قریب کے ہیں۔وشک کے معنیٰ سُرعت کے بھی آتے ہیں۔جیسے کہتے ہیں۔اوشك فلان ای اسرع۔غنم۔اسم مونث ہے۔جنس کے لیے موضوع ہے۔نر و مادہ دونوں کے لیے غنم کا لفظ بولا جاتا ہے۔یتبع باب افتعال سے یا فتح یفتح سے ہے۔اس کے معنیٰ پیچھے چلنے کے ہیں شعف۔شعاف پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔فتن فتنہ کی جمع ہے۔عام طور پر فتنہ کا لفظ مکروہ چیزوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔فتنہ کا لفظ مندرجہ ذیل امُور کے لیے استعمال ہوتا ہے۔کفر کے لیے جیسے اس آیت میں والفتنة اکبر من القتل۔گناہ کے معنیٰ میں جیسے اس آیت میں الا فی الفتنة سقطوا جلانے کے معنیٰ میں ان الذین فتنوا المؤمنین اس آیت میں فتنہ کا لفظ جلانے کے معنیٰ میں آیا۔پھیرنے کے معنیٰ میں جیسے اس آیت میں وان کادو لیفتنونك۔مطلب حدیث یہ ہے کہ جب ایسا زمانہ آجائے کہ دین و ایمان خطرہ میں پڑ جائے تو پھر گوشہ نشین ہو کر اپنے ایمان کو بچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔بکری کو خیر مال اس لیے قرار دیا کہ یہ ایسا مال ہے جو بابرکت ہے اور حلال روزی ہے جس میں حرام کو دخل نہیں ہے۔گوشہ نشینی کے لیے پہاڑ کی چوٹی کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ایسے مقامات فتنہ و فساد سے خالی ہوتے ہیں اور وہاں رہ کر آدمی فتنوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

مسائل حدیث اس حدیث سے مندرجہ ذیل امُور پر روشنی پڑتی ہے۔جب فتنہ و فساد کا دور دورہ ہو۔حق کا

کہنا اور حق پر چلنا مشکل ہو جائے تو ایسے وقت میں صرف اپنے دین و ایمان کی سلامتی کے لیے گوشہ نشین ہو جانا بہتر ہے لیکن جو شخص فتنہ کے مٹانے پر قادر ہو اس کو گوشہ نشینی جائز نہیں ہے۔ اس پر تو واجب ہے کہ حق پر رہے اور لوگوں کو چلائے۔ اس میں اختلاف ہے کہ جب فتنہ نہ ہو تو ایسی صورت میں گوشہ نشین ہونا جائز ہے یا نہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں۔ ایسی صورت میں گوشہ نشین نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ گوشہ نشینی کی صورت میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری نہ رہے گا اور اس کے وجود سے حق کی جو اشاعت ہوتی تھی اور خود اس کو جمعہ و جماعات میں شرکت نصیب ہوتی تھی وہ بند ہو جائے گی۔ حضرت امام غزالی نے عزلت اور صحبت دونوں کے فوائد و نقصان پر تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے اور اہل علم کی اس باب میں مختلف رائیں ہیں۔ بہرحال حدیث ہذا سے اتنی بات ہی ثابت ہوتی ہے کہ فتنہ و فساد عام ہو جائے اور دین پر قائم رہنا مشکل ہو جائے تو ایسے نازک وقت میں گوشہ نشین ہو جانا بہتر ہے تاکہ انسان اپنے دین کو سلامت رکھ سکے۔ اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیب کی خبر دی ہے۔ جو آپ کا معجزہ ہے یعنی ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ مومن کو دین کی حفاظت کے لیے پہاڑوں کی چوٹی پر پناہ گزین ہونا پڑے گا۔

ابو سعید خدری رضی اللہ تعالےٰ عنہ آپ جلیل القدر صحابی ہیں۔ بارہ غزوات میں حضور علیہ السلام کے ہمراہ رہے۔ ایک جماعت صحابہ سے یہ روایت کرتے ہیں۔ جن میں خلفائے اربعہ اور آپ کے والد مالک بھی شامل ہیں۔ صحابہ کرام حضرت عمر و ابن عباس اور کثیر تابعین کرام نے ان سے روایت کی ہے۔ آپ نے مدینہ میں ۶۴ھ یا ۷۴ھ میں وفات پائی۔ آپ نے ۱۱۷۰ حدیثیں روایت کی ہیں جن میں سے ۴۶ حدیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا اور ۱۶ حدیثیں صرف بخاری نے اور ۵۲ حدیثیں صرف مسلم نے ذکر کیں۔

بَابُ قَوْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا اَعْلَمُکُمْ بِاللّٰہِ

باب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جانتا ہوں

وَاَنَّ الْمَعْرِفَۃَ فِعْلُ الْقَلْبِ لِقَوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ

(بخاری)

اور معرفت دل کا فعل ہے۔ ارشادِ ربانی ہے کہ، لیکن اللہ اسی پر مواخذہ فرمائے گا جو تمہارے دلوں نے کمایا (یعنی جس چیز کا تمہارے دل نے اعتقاد کیا۔

۱۔ فرقہ کرامیہ کا خیال ہے کہ ایمان مجرد اقرار کو کہتے ہیں۔ لہٰذا منافق ظاہر میں مومن ہے اور باطن میں کافر اور یہ کہ دنیا میں منافق پر مسلمانوں کے احکام جاری کیے جائیں گے۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے ان المعرفۃ فعل القلب کا عنوان قائم کر کے کرامیہ کے اس خیال کی تردید کی ہے اور آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ کسبت کے معنیٰ عزم و ارادہ کے ہیں اور اللہ تعالیٰ اسی پر مواخذہ فرماتا ہے جس کو آدمی دل سے قبول کرلے۔ لہٰذا مومن ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ضروریاتِ دین کو دل سے قبول کیا جائے۔ محض زبان سے اقرار کافی نہیں۔

وسوسے منافی ایمان نہیں ۲۔ اس آیت سے واضح ہوا کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے اور اسی آیت سے وسوسہ کے منافی ایمان نہ ہونے کی دلیل بھی ملتی ہے۔ آدمی کا دل افکار و خیالات کا گنجینہ ہوتا

ہے۔ ماحول کے اثرات سے متاثر ہوکر دل میں طرح طرح کے خیالات آیا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی ایسے خیالات وخطرات بھی آدمی کے دل ودماغ کو پریشان کرتے ہیں جو شرعی نقطۂ نظر سے کافرانہ وملحدانہ ہوتے ہیں۔ ایسے خیالات وخطرات کے متعلق حکم یہ ہے کہ جب تک یہ خیالات وسوسہ کی حد تک رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر مواخذہ ومحاسبہ نہیں ہوتا لیکن جب یہی خیالات وخطرات وسوسہ کی حد سے بڑھ کر اس شخص کا قول وعمل اور عقیدہ بن جائیں تو پھر ان پر مواخذہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں بخاری، ابوداؤد ومسلم کی مندرجہ ذیل احادیث کو پیشِ نظر رکھیئے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

۱- اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِيْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ بِهٖ اَوْ تَتَكَلَّمْ (رواہ البخاری ومسلم)

اللہ تعالیٰ نے میری اُمت سے دل کے بُرے خیالات اور وسوسوں کو معاف کر دیا ہے۔ ان پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا جب تک ان پر عمل نہ ہو اور زبان سے نہ کہا جائے۔

۲- عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلُوْهُ اِنَّا نَجِدُ فِيْ اَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ يَتَكَلَّمَ بِهٖ؟ قَالَ اَوَقَدْ وَجَدْتُمُوْهُ قَالُوْا نَعَمْ! قَالَ ذٰلِكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے دریافت کیا کہ ہمارا حال یہ ہے کہ بعض اوقات ہم اپنے دلوں میں ایسے بُرے خیالات اور وسوسے پاتے ہیں کہ ان کو زبان سے کہنا بھی بہت بُرا اور بہت بھاری معلوم ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا واقعی تمہاری یہ حالت ہے؟ انھوں نے عرض کیا۔ ہاں یہی حال ہے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ تو خالص ایمان ہے۔

یعنی اگر کسی شخص کی یہ کیفیت ہو کہ وہ دین اور شریعت کے خلاف وساوس سے اتنا گھبرائے اور ایسا پریشان ہو کہ زبان سے ادا کرنا بھی اس کو گراں ہو تو یہ خالص ایمانی کیفیت ہے۔

۳- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ اِنِّيْ اُحَدِّثُ نَفْسِيْ بِالشَّيْءِ لِاَنْ اَكُوْنَ حُمَمَةً اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ رَدَّ اَمْرَهٗ اِلَى الْوَسْوَسَةِ (رواہ ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی کہ کبھی کبھی میرے دل میں ایسے بُرے خیالات آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں ان کو زبان سے نکالوں؟ اس پر آپ نے فرمایا اللہ کے لیے حمد ہے جس نے اس کے معاملہ کو وسوسہ کی طرف لوٹا دیا۔

مطلب یہ ہے کہ جب تمہارا یہ حال ہے کہ تم کو خلافِ اسلام خیالات وخطرات اسقدر تکلیف پہنچاتے ہیں تو اس پر فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اپنے رب کریم کا شکر ادا کرو کہ اس کے فضل وکرم اور اس کی دستگیری نے تمہارے دل کو ان بُرے خیالات کے قبول کرنے سے بچا لیا اور بات وسوسہ کی حد سے آگے نہ بڑھنے دی۔

۴- عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِي الشَّيْطَانُ أَحَدَكُمْ فَيَقُولُ مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ حَتّٰى يَقُولَ مَنْ خَلَقَ رَبَّكَ فَإِذَا بَلَغَهُ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَلْيَنْتَهِ (رواہ البخاری ومسلم)

علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ (یہاں تک کہ یہی سوال وہ اللہ کے متعلق بھی دل میں ڈالتا ہے کہ جب ہر چیز کا کوئی پیدا کرنے والا ہے تو پھر اللہ کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ پس سوال کا سلسلہ جب یہاں تک پہنچے تو چاہیے کہ بندہ اللہ سے پناہ مانگے اور رُک جائے۔

مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے وسوسے اور سوالات شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں اور جب شیطان اس قسم کے جاہلانہ سوالات دل میں ڈالے تو اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ شیطان کے شر سے پناہ مانگے اور اس مسئلہ کو قابلِ توجہ و لائقِ غور ہی نہ سمجھے ایک اور حدیث جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ ہی سے مروی ہے اس میں فرمایا:۔

لَا يَزَالُ النَّاسُ يَتَسَاءَلُونَ حَتّٰى يُقَالَ هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ؟ فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ (رواہ البخاری ومسلم)

لوگوں میں ہمیشہ فضول سوالات اور چون وچرا کا سلسلہ جاری رہیگا۔ یہاں تک کہ یہ احمقانہ سوال بھی کیا جائے گا کہ اللہ تعالےٰ نے سب مخلوق کو پیدا کیا ہے تو پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جس کو اس سے سابقہ پڑے وہ یہ کہہ کر بات ختم کردے کہ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر میرا ایمان ہے۔

مطلب یہ کہ بعض اوقات یہی سوالات ملحدانہ نظریات رکھنے والے افراد کی طرف سے ہوتے ہیں اور مومن کو چاہیے کہ جب اسے ایسے لوگوں اور ایسے سوالوں سے سابقہ پڑے تو بات یہ کہہ کر ٹال کردے کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر میرا ایمان ہے اس لیے تمہارے لایعنی اور مہمل سوالات بالکل قابل غور نہیں۔ جس طرح کسی آنکھ والے کے لیے یہ سوال قابلِ غور نہیں ہے کہ سورج میں روشنی ہے یا نہیں؟ ——— ۳۔ امام بخاری نے یہ جو فرمایا ہے کہ معرفت دل کا فعل ہے اس سے معرفتِ اختیاری مراد ہے کیونکہ معرفتِ اضطراری کو اہلِ لُغت فعل سے موسوم نہیں کرتے۔ نیز مومن ہونے کے لیے معرفتِ اختیاری کا ہونا ضروری ہے۔ قرآن نے کہا۔ یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم۔ یہ کافر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے ماں باپ کو پہچانتے ہیں حضور علیہ السلام کی معرفت کے باوجود ان کو کافر کہا گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان میں معرفتِ اضطراری پائی گئی ہے اختیاری نہیں اور شریعت میں جس معرفت کا نام ایمان ہے وہ معرفتِ اختیاری ہے

۱۹ - عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَمَرَهُمْ أَمَرَهُمْ مِنَ الْأَعْمَالِ بِمَا يُطِيقُونَ قَالُوا إِنَّا لَسْنَا كَهَيْئَتِكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ

حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو جب کوئی حکم دیتے تو انہیں کاموں کا حکم دیتے جن کو وہ کر سکتے۔ صحابہ کرام عرض کرتے یارسول اللہ ہم آپ کی طرح نہیں ہیں آپکے صدقے تو اللہ نے آپکے اگلے اور پچھلے گناہ بھی بخش دیئے ہیں تو حضور ناراضگی کا اظہار فرماتے جس کا

مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ فَيَغْضَبُ حَتّٰى يُعْرَفَ الْغَضَبُ فِيْ وَجْهِهٖ ثُمَّ يَقُوْلُ اِنَّ اَتْقَاكُمْ وَاَعْلَمَكُمْ بِاللّٰهِ اَنَا (بخاری)

اثر آپ کے چہرۂ مبارک پر ظاہر ہوتا پھر فرماتے ہیں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور اس کی معرفت رکھتا ہوں۔

فوائد و مسائل

۱- یہ حدیث افراد بخاری میں سے ہے اور مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

۲- اذا امرھم کا معنی یہ ہے کہ حضور علیہ السلام صحابہ کو انہیں کاموں کا حکم فرماتے تھے جو وہ علی الدوام کر سکیں۔ انا لسنا۔ اس پر صحابہ کرام عرض کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام آپ تو مغفور ہیں۔ آپ کو عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے باوجود آپ اعمال خیر پر مواظبت فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم معصوم نہیں ہیں اس لیے ہمیں کثرت عبادت اور زیادہ سے زیادہ اعمال خیر میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا رد فرمادیا اور فرمایا میں عمل کا زیادہ سزاوار ہوں کیونکہ اعلم و اتقی ہوں اور تمہارے لیے یہی کافی ہے کہ میں جس بات کا حکم دوں اس کی تعمیل کرو۔

مسئلہ عصمت انبیاء

اتقی واعلم اسم تفضیل کے صیغے ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی قوت علمیہ و عملیہ سب سے برتر و افضل ہے۔ حضور علیہ السلام تمام اقسام تقوی کے جامع ہیں۔ عبادت اللہ کی رضا کے مطابق عمل کرنے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوگا۔ اس کی عبادت بھی سب سے افضل واکمل ہوگی۔ لہٰذا امتی کا کثیر سے کثیر عمل بھی انبیاء کرام علیہم السلام کے قلیل سے قلیل عمل کی برابری نہیں کر سکتا۔ نبی کا ایک سجدہ امتی کے کروڑوں سجدوں سے افضل و برتر ہے۔ واضح ہو کہ جمہور مفسرین ومحدثین وائمہ دین اس امر پر متفق ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں۔ تفسیرات احمدیہ میں آیت، لاینال عھدی الظالمین کے تحت لکھا ہے کہ:۔

لاخلاف لاحد فی ان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم لم یرتکب صغیرۃ ولا کبیرۃ طرفۃ عین قبل الوحی و بعدہ کما ذکرہ ابو حنیفۃ فی الفقہ الاکبر

اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لمحہ کے لیے بھی قبل نبوت و بعد نبوت کسی صغیرہ و کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔ جیسا کہ فقہ اکبر میں سیدنا امام اعظم علیہ الرحمہ نے تصریح فرمائی ہے۔

نیز علامہ قاضی عیاض، ابو اسحاق و علامہ تقی الدین سبکی و دیگر علماء و ائمہ دین نے تصریح کی ہے کہ حضور علیہ السلام سے کوئی گناہ خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ سہواً ہو یا عمداً صادر نہیں ہوا۔ چنانچہ آیت، لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر کے علماء نے متعدد معنی کیے ہیں۔

۱- علامہ سبکی و شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے اس معنی کی تحسین و تعریف کی کہ آیت کسی لغزش یا گناہ کے وقوع کی اطلاع نہیں دیتی بلکہ ازراہ تکریم و تشریف یہ فرمایا گیا کہ اگر کسی گناہ کا امکان بھی فرض کر لیا جائے تو وہ بھی بخش دیا گیا سکتے ہیں۔ مقصود کلام اثبات ذنب اور اس کا غفران نہیں بلکہ اس جگہ مطلقاً نفی ذنب مراد ہے۔

۲۔ صاحب روح البیان نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام ازلی و ابدی طور پر گناہوں سے پاک و منزہ ہیں۔

۳۔ بعض مفسرین نے کہا کہ اس آیت میں حضور علیہ السلام کے صدقہ میں امت کے گناہوں کی بخشش کا اعلان ہے (عینی جلد ۱ ص ۱۹۵)

۴۔ بعض نے کہا کہ ذنب سے مراد ترک اولیٰ ہے یعنی افضل کی بجائے فاضل کو اختیار کرنا اور یہ بات انبیاء کی جلالت شان کی وجہ سے ان کے حق میں گویا ذنب ہے آیت میں اسی کی بخشش کا اعلان ہے۔ حسنات الابرار سیئات المقربین (عینی جلد ۱ ص ۱۹۵)

۵۔ علامہ قاضی عیاض نے لفظ مغفرت کو تبریہ از عیوب کے معنیٰ میں لیا۔ انا فتحنالك فتحا مبینا ۰ لیغفرلك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر ویتم نعمته علیك ویهدیك صراطا مستقیما وینصرك الله نصرا عزیزا ۱۔ یہ آیت سورۂ فتح کی ہے جس میں فتح مبین کی خبر دی گئی ہے اور اس فتح مبین کے نتائج بیان کیے گئے ہیں یعنی ۲۔ مقدم و موخر ذنب کا غفران ۳۔ اتمام نعمت ۴۔ صراط مستقیم کی ہدایت ۵۔ نصرت ایزدی کی یاوری و معیت۔

احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس فتح سے مراد صلح حدیبیہ و بیعت الرضوان ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انا فتحنالك کا نزول صلح حدیبیہ کے انجام پر ہوا۔ حضرت براء ابن ابی عازب سے روایت ہے کہ گروہ صحابہ معاہدۂ حدیبیہ و بیعت الرضوان کے دن کو یوم الفتح قرار دیا کرتے تھے (بخاری)

سب کو معلوم ہے کہ صلح حدیبیہ جن شرائط پر ہوئی وہ انتہائی دبی ہوئی شرطیں تھیں۔ خود صحابہ کرام کو بھی اس کا احساس تھا مگر اس کے باوجود قرآن حکیم نے اسی صلح حدیبیہ کو فتح مبین سے تعبیر کیا۔ کیونکہ اس معاہدہ سے جانبین کی آمد و رفت کی راہ کھلی۔ مسلمانوں کو کفار میں تبلیغ کا موقع ملا۔ دس سال تک قریش نے جنگ نہ کرنے کا عہد کیا۔ اسلام کے لیے یہی فتح مبین تھی کہ اشاعت اسلام کی دشواریاں دور ہوئیں اور جھوٹے شکوک زائل ہوئے۔

یہ تو ہے فتح مبین کا پس منظر۔ اب آیت کے لفظ ذنب پر غور کیجیے۔

معصیۃ۔ اس نافرمانی کو کہتے ہیں جس میں قصد و ارادہ ہو۔ المعصیة عدول عن الحکم انحراف من الطاعة مخالفة الامر۔ خطا صواب کی ضد ہے۔ اس کے معنیٰ نادرست کے ہیں اور ذَنب جس کے معنیٰ دُم ہیں تو اشتقاق اوسط کے اصول پر ذَنْب بفتح و سکون ثانی کے معنیٰ بھی متبادلہ ہو جاتے ہیں یعنی ہر وہ الزام جو کسی پر لگا دیا جائے۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ الفاظ آئے ہیں۔

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ	انہوں نے مجھ پر ایک الزام لگایا ہوا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

یہاں ذنب بمعنی الزام ہے اور غفر کے معنیٰ مٹانے اور چھپانے کے آتے ہیں۔ لہٰذا جب آیت مذکورہ بالا میں لفظ

معصیۃ نہیں ہے تو ایسی صورت میں کیا ضروری ہے کہ یہاں ذنب کے معنیٰ گناہ کے لیے جائیں۔ پس اس تشریح کی روشنی میں ذنب کے معنیٰ الزام قوم کے ہیں۔ غفر کے معنیٰ مٹانے کے۔ ما تقدم سے مراد وہ الزامات ہیں جو کفار نے حضور علیہ السلام پر قبل ہجرت لگائے یعنی یہ کاہن ہیں۔ شاعر و ساحر ہیں وغیرہ وغیرہ اور ما تاخر سے مراد وہ اتہامات ہیں جو انہوں نے بعد از بعثت لگائے کہ یہ فسادی ہیں۔ گھر کو اجاڑنے والے اور بھائی بھائی میں جدائی ڈالنے والے ہیں وغیرہ وغیرہ (معاذ اللہ) تو اب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ حدیبیہ کی فتح مبین کا پہلا ثمرہ یہ ہوگا کہ وہ اگلے پچھلے تمام الزامات مٹ جائیں گے جو آپ پر کفار نے لگا رکھے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ نتائج اس صلح سے بہت جلد مرتب ہو گئے۔

صلح حدیبیہ کے انعقاد کے بعد جو تبلیغ قریش اور خلفاء قریش میں رکی ہوئی تھی۔ وہ موانعات دور ہو گئے۔ لوگ اسلام کو سمجھنے لگے۔ بصارت کھلی، بصیرت بیدار ہوئی اور ان تمام الزامات و اتہامات کی لغویت کا خود ان لوگوں کو بہ ندامتِ انفعال اقرار کرنا پڑا۔

آیت کی یہ توجیہ بہت ہی نفیس ہے اور اس توجیہ پر فتح مبین اور مغفرتِ ذنب کے درمیان نہایت نفیس مناسبت پیدا ہو جاتی ہے کہ مختصر یہ کہ آیت کا مفہوم یہ ہے:۔

"ہم نے آپ کو فتح مبین عطا فرمائی۔ اس کے ذریعے اللہ نے آپ کے لیے پہلے اور پچھلے الزامات و اتہامات کو مٹا دیا۔

بَابُ تَفَاضُلِ اَهْلِ الْاِيْمَانِ فِى الْاَعْمَالِ

باب　اہل　ایمان　کے اعمال میں　تفاضل　کے　بیان　میں

۲۰۔ حدیث نمبر ۲۰ کا وہی مضمون ہے جو کہ حدیث نمبر ۱۵ کا ہے جو مع تفہیم و ترجمانی اوپر گزر چکی ہے اس لیے یہاں نہیں لکھی یعنی اس باب میں اعمالِ صالحہ کی وجہ سے جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر فضیلت ہوتی ہے اس کا بیان ہے۔ اسلام میں دولت و حکومت مدارِ فضیلت نہیں ہے۔ مدارِ فضیلت صرف تقویٰ ہے۔ قرآنِ حکیم نے اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اکرم و افضل وہ ہے جو تقویٰ کو اختیار کیے ہوئے ہے

عَنْ اَبِىْ سَعِيْدِ الْخُدْرِىِّ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَدْخُلُ اَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ وَاَهْلُ النَّارِ النَّارَ ثُمَّ يَقُوْلُ اللّٰهُ اَخْرِجُوْا مَنْ كَانَ فِىْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ اِيْمَانٍ فَيُخْرَجُوْنَ مِنْهَا قَدِ اسْوَدُّوْا فَيُلْقَوْنَ فِىْ نَهْرِ الْحَيَاءِ اَوِ الْحَيٰوةِ شَكَّ مَالِكٌ فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّةُ فِىْ جَانِبِ السَّيْلِ اَلَمْ تَرَ اَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ

حضرت ابی سعید خدری سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت جنت میں اور اہل نار دوزخ میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر اللہ عزوجل فرمائیگا کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہے اس کو دوزخ سے نکال لو۔ پس وہ نکالے جائیں گے (اور وہ جل کر کوئلے کی طرح) کالے ہو گئے ہوں گے۔ پھر ان کو نہر حیا۔ یا نہر حیوۃ میں ڈالا جائیگا (مالک کو جو اس حدیث کے راوی ہیں اس میں شک ہے کہ حضور نے حیا فرمایا یا حیوۃ فرمایا) پھر اُگے گا ان کے جسم پر گوشت) جیسے سیلِ آب کے کنارے جنگلی دانہ

مُلْتَوِيَةً قَالَ وَهَيْبٌ حَدَّثَنَا عَمْرٌو الْحَيَاةِ وَقَالَ خَرْدَلٍ مِنْ خَيْرٍ
(بخاری)

اُگ آتا ہے کیا تو نہیں جانتا کہ دانا پہلے نکلتا ہے زرد پیٹا ہرا۔ وہیب نے کہا روایت عمر میں لفظ حیات آتا ہے اور خردل من ایمان کی جگہ خردل من خیر وارد ہوا ہے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے باب صفۃ الجنۃ والنار میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و ترمذی نے کتاب الایمان میں درج کیا ہے ۲۔ اسی مضمون کو ایک حدیث باب زیادۃ الایمان و نقصانہ میں بھی آئی ہے۔ قارئین اس کی تفہیم و ترجمانی کو بھی بغور پڑھیں۔

الفاظِ حدیث کی لغوی تفہیم مثقال۔ ثقل سے ہے۔ اس کے معنیٰ مقدار اور وزن کے ہیں جیسے قرآن پاک میں آیا۔ مثقال ذرۃ۔ ای زنۃ ذرۃ۔ مثقال فقہی حسب تصریح فقہاء ایک سو عدد جو یعنی چار ماشہ چار رتی کا ہوتا ہے۔ حیاء بالمد کے معنیٰ ندامت و شرمندگی کے ہیں اور حیا بالقصر کے معنیٰ بارش ہیں جس سے کھیتی سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ روایت کریمہ میں یہ لفظ بالقصر مروی ہے اور یہی مناسب بھی ہے۔ نہر الحیاۃ وہ نہر ہے جس میں غوطہ کھانے والے کو زندگی مل جائے۔ حِبَّۃ کی جمع حبب ہے۔ اس کے معنیٰ بیج ہیں۔ حبّہ کا لفظ گندم کے دانے اور ہر قسم کی تاریوں وغیرہ کے بیج پر بولتے ہیں۔ امام کسائی نے پھولوں کے بیج مراد لیے ہیں۔

تفہیمِ حدیث - ظاہر ہے کہ ایمان کیفیتِ نفسانیہ کا نام ہے۔ یہ جسم نہیں کہ ناپا تولا جائے لیکن معقولات کو محسوسات سے تشبیہ دے کر سمجھایا کرتے ہیں۔ مطلبِ حدیث یہ ہے کہ جس شخص میں اصل ایمان موجود ہوگا وہ خواہ کیسا ہی گنہگار کیوں نہ ہو بالآخر جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائیگا۔ حبہ سے تشبیہ محض اس امر میں دی گئی ہے کہ جیسے جڑی بوٹیوں کے بیج نہر کے کنارے ذرا سے وقت میں اُگ آتے ہیں اور یہ جڑی بوٹیاں پھول وغیرہ نہایت صاف و شفاف ہوتے ہیں۔ ایسے ہی نافرمان مسلمانوں کو ان کے اعمالِ بد کی سزا دینے کے بعد جب جہنم سے نکال کر نہرِ حیات میں غوطہ دیا جائیگا تو ان کے جلے بھنے جسم اور جھلسے ہوئے بدن انتہائی سرعت کے ساتھ اپنی اصلی حالت پر آجائیں گے اور نہایت تر و تازہ ہوجائیں گے۔ اس حدیث سے اہل سنت و جماعت کے اجماعی عقائد نہایت وضاحت سے ثابت ہوتے ہیں۔

اوّل - ایسے لوگ بھی ہوں گے جو باوجود مومن ہونے اور کلمہ پڑھنے کے اپنی بد اعمالیوں کے سبب جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ **دوم**:- جس کے دل میں اصل ایمان ہوگا وہ بالآخر دوزخ سے ضرور نکالا جائیگا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی ادنی درجہ کا مومن خواہ وہ کیسا ہی فاسق فاجر گنہگار کیوں نہ ہو۔ کافروں اور مشرکوں کی طرح ہمیشہ دوزخ میں رہے۔

سوم:- مرجیہ کے اس خیال کی تردید ہوگئی کہ مومن خواہ کتنا ہی گنہگار ہو دوزخ میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں جائیگا۔

چہارم:- اس حدیث نے معتزلہ کے اس خیال کی بھی تردید کردی کہ گنہگار ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

پنجم:- اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مومنین اعمال کے لحاظ سے ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں۔

حضرت عمر کی فضیلت ۲۲- عَنْ اَبِيْ

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو

أُمَامَةَ ابْنِ سَهْلِ ابْنِ حُنَيْفٍ اَنَّهٗ سَمِعَ اَبَا سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيَّ يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا اَنَا نَائِمٌ رَأَيْتُ النَّاسَ يُعْرَضُوْنَ عَلَيَّ وَعَلَيْهِمْ قُمُصٌ مِنْهَا مَا يَبْلُغُ الثُّدِيَّ وَمِنْهَا مَا دُوْنَ ذٰلِكَ وَعُرِضَ عَلَيَّ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ وَعَلَيْهِ قَمِيْصٌ يَجُرُّهٗ قَالُوْا فَمَا اَوَّلْتَ ذٰلِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الدِّيْنُ

یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بحالتِ خواب لوگ میرے سامنے لائے گئے۔ وہ قمیص پہنے ہوئے تھے۔ کسی کا قمیص سینہ تک اور کسی کا اس سے نیچے تھا۔ عمر بن الخطاب (رضی اللہ تعالےٰ) جب لائے گئے تو وہ ایسا کُرتہ پہنے ہوئے تھے جس کو وہ سمیٹ رہے تھے (یعنی بہت نیچا) صحابہ نے عرض کی آپ نے اس سے کیا تعبیر کی۔ فرمایا۔ دین (بخاری)

تشریح و توضیح

امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب التفسیر اور باب فضلِ عمر میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم ونسائی و ترمذی نے فضائل میں۔

۲۔ یُعْرَضُوْنَ کے معنی ظاہر ہونے کے ہیں۔ قُمُص۔ قمیص کی جمع ہے۔ ثُدِیّ دال کے زیر اور ی کی تشدید کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ اَوَّلْت تاویل سے مشتق ہے۔ یہاں اس کے معنی تعبیر کے ہیں ۳۔ حدیث ہذا سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی تمام صحابہ کرام پر ماسوا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق کا اس میں ذکر نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا کرتہ حضرت فاروقِ اعظم سے بھی زیادہ نیچا ہو۔ دوسرے حضرت ابوبکر کا تمام صحابہ سے افضل ہونا اجماعی مسئلہ ہے اور آپ کی فضیلت میں وارد شدہ احادیث متواتر ہیں اور یہ حدیث خبرِ واحد ہے اور خبرِ واحد متواتر کے معارض نہیں ہوسکتی ۴۔ اس حدیث میں تفاضل فی الایمان سے نفسِ حقیقتِ ایمان میں تفاضل مراد نہیں ہے بلکہ اعمال میں تفاضل مراد ہے جس سے نورِ ایمان زیادہ ہوتا ہے ۵۔ حدیث ہذا میں فرمایا گیا۔ بہت افراد میرے سامنے پیش ہوئے قمیص پہنے ہوئے تھے۔ مگر فاروقِ اعظم کا قمیص سب سے نیچا تھا۔ اور اس کی تعبیر حضور علیہ السلام نے دین فرمائی یعنی حضرت فاروقِ اعظم سب سے زیادہ کامل الایمان اور صاحبِ خیرِ کثیر ہیں ۶۔ اس حدیث میں دین کو قمیص سے تشبیہ دی گئی ہے۔ وجہ تشبیہ ستر ہے۔ جیسے قمیص بدنِ انسان کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ اسی طرح دین و ایمان یہ آتشِ دوزخ سے بچانے کا سبب ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا۔ خواب میں قمیص پہنے ہوئے دیکھنا اس سے دین مراد ہوتا ہے اور قمیص کا نیچا ہونا کہ پہننے والا اس کو سمیٹ کر چلے اس کی تاویل یہ ہے کہ صاحبِ قمیص کے آثارِ جمیلہ اور سُننِ حسنہ اس کی وفات کے بعد باقی رہیں گے تاکہ مسلمان اس کی اقتدار کریں ۷۔ اس حدیث سے خواب کی تعبیر لینے کا جواز ثابت ہوا ۸۔ امام نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے قمیص کے چھوٹے بڑے ہونے کو دین سے تعبیر کیا یعنی جس کا قمیص چھوٹا تھا اس میں ایمان کم تھا جس کا لمبا تھا اس میں ایمان زیادہ تھا۔

علامہ عینی نے جواب دیا۔ حدیث ہذا میں نفسِ ایمان میں تفاضل کا بیان نہیں ہے بلکہ اعمالِ حسنہ میں تفاضل کا بیان مقصود ہے جس سے نورِ ایمان زیادہ ہوتا ہے۔

۹۔ اس حدیث سے واضح ہوا کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر بسبب اعمال فضیلت ہے۔

بَابُ الْحَيَاءِ مِنَ الْإِيمَانِ

باب اس امر کے بیان میں کہ حیار بھی ایمان کی نشانی ہے

۲۳۔ عَنْ سَالِمِ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰى رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ وَهُوَ يَعِظُ اَخَاهُ فِي الْحَيَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْهُ فَاِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْاِيْمَانِ

سالم بن عبداللہ وہ اپنے والد سے راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری کے قریب سے گزرے۔ وہ اپنے بھائی کو حیار کے متعلق نصیحت کر رہے تھے (یعنی حیار سے منع کر رہے تھے) اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جانے دو (یعنی حیا کرنے سے منع نہ کرو) کیونکہ حیار بھی ایمان کی نشانی ہے۔ (بخاری)

فوائد و مسائل امام نے اس حدیث کو کتاب البر والصلہ میں بھی ذکر کیا ہے اور ابو داؤد، نسائی و ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے ۲۔ وعظ کے معنے نصیحت کرنے یا دلانے۔ کسی چیز سے ڈرانے سے آتے ہیں وہ انصاری اپنے بھائی کو حیار نہ کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ ایسا مت کرو۔ کیونکہ حیار ایمان کی نشانی ہے یعنی جیسے ایمان معاصی سے روکتا ہے۔ اسی طرح حیا بھی روکتی ہے۔ حیا دراصل اس کیفیت کا نام ہے جو انسان میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ اسے اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ کوئی اسے عیب لگائیگا یا اس کی مذمت کریگا اور ترکِ فعل حیار کے لوازم سے ہے۔ غالباً اسی لیے بعض علمار نے ترکِ فعل کا نام حیاء رکھا ہے۔ سلیم طبیعتیں اس کام کے کرنے میں حیار کرتی ہیں۔ جو قبیح ہوتے ہیں۔ لیکن جاہل لوگ نیک کاموں کے کرنے میں بھی حیا کرتے ہیں اور اب تو زمانہ کا یہ عالم ہے کہ لوگ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے میں حیار کرنے لگ گئے ہیں۔ بہر حال جس حیار کو علامت ایمان قرار دیا گیا ہے وہ وہی حیار ہے جو آدمی کو برائیوں کے اختیار کرنے سے روکے۔ مومن حق کہنے اور حق پر چلنے میں حیا نہیں کرتا۔ (من الایمان) میں لفظ من تبعیضیہ ہے اور اس پر دلیل وہ حدیث ہے جو پہلے گزر چکی ہے جس کے لفظ یہ ہیں۔ الحیاء شعبۃ من الایمان۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب حیار ایمان کا جزء ہے تو جس میں حیار نہ ہوگا اس میں بعض ایمان بھی نہ ہوگا اور جب بعض ایمان نہ رہے گا تو حقیقتِ ایمان کی نفی ہو جائے گی اور ایمان کی نفی کفر ہے تو ان مقدمات سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس میں حیار نہ ہو وہ کافر ہے۔ جواب یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ حیار حقیقت ایمان سے ہے بلکہ حیار تو مکملاتِ ایمان سے ہے اور نفی کمال کی مستلزم نفی حقیقت نہیں ہوتی۔ فافہم

بَابٌ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ

باب کہ اگر یہ کافر توبہ کریں اور نماز قائم کریں

وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ

اور زکوٰۃ دیں تو ان سے تعرض نہ کرو۔

۲۴۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْہَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذَالِکَ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَآءَ ہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُہُمْ عَلَی اللّٰہِ

(رواہ مسلم و بخاری)

نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا کہ لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ یہ کہ وہ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں تو جب وہ ایسا کریں تو مجھ سے اپنی جان و مال کو محفوظ پائیں گے۔ مگر اسلام کے حق سے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ (یعنی ان کی فرضیت کے قائل ہو جائیں۔

توضیح مرجیہ فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ امام بخاری نے اس باب میں ایک آیت اور حدیث کو ذکر فرما کر مرجیہ کے اس خیال کی تردید کی ہے۔ آیت میں تین باتوں کا ذکر ہے۔ کفر سے توحید کی طرف رجوع، نماز قائم رکھنا اور زکوٰۃ دینا۔ حدیث میں بھی انہی تین امور کا بیان ہے۔ پھر جس طرح آیت میں اس امر کا بیان ہے کہ جو شخص ان مذکورہ بالا امور کو بجا لائے گا۔ اس کا جان و مال محفوظ ہو جائیگا۔ اسی طرح حدیث میں اسی کا بیان ہے۔ یہ حدیث گو آیۂ مبارکہ کی تفسیر بھی ہے۔ مگر امام بخاری نے حدیث کو آیت کی تفسیر کرنے کی غرض سے ذکر نہیں کیا۔ ان کا مقصد مرجیہ کے خیال کی تردید ہے اور یہ بتانا ہے کہ اعمال بھی ایمان کا شعبہ ہے۔ کیونکہ حضرت انس سے مروی ہے کہ باعتبار نزول کے یہ سب سے آخری آیت قرآن ہے اور حضور علیہ السلام نے قتال کا جو حکم دیا تھا وہ ابتدار بعثت میں دیا تھا اور متقدم متاخر کے لیے تفسیر نہیں ہوتا ۲۔ اُمِرْتُ بصیغہ مجہول امر کا صیغہ ہے۔ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی آمر اور حاکم نہیں ہے۔ اس لیے جب حضور علیہ السلام یہ فرمائیں کہ مجھے حکم دیا گیا ہے تو اس سے مراد اللہ رب العزت جل مجدہ کی ذاتِ اقدس ہو گی۔ کیونکہ حضور علیہ السلام دین کے شارح اور امت کے حاکم آمر اور ناہی ہیں اور آپ کے سوا کوئی اور شارح نہیں ہے اور جب صحابی یہ کہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے تو اس سے مراد حضور علیہ السلام کا حکم ہو گا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ صحابہ کرام کا مطیع رسول ہونا بدیہی بات ہے۔ لہٰذا جب صحابی یہ کہے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے تو اس سے حضور علیہ السلام ہی مراد ہونے چاہئیں ۲۔ امرت ان اقاتل الناس میں الف لام جنسی ہے۔ مشرک اور اہلِ کتاب بھی اس میں داخل ہیں۔ جو لوگ جزیہ قبول کریں وہ اس میں شامل نہیں رہیں گے۔ نسائی کی روایت میں اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ الْمُشْرِکِیْنَ کا لفظ آیا ہے۔ اسی بنا پر اکثر شراح حدیث نے الناس سے صرف مشرک مراد لیے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب جزیہ قبول کر لینے کی وجہ سے اس حکم سے خاص ہو گئے۔ مطلب حدیث یہ ہے کہ جو لوگ توحید و رسالت پر ایمان لے آئیں وہ بھی اور جو کفر پر قائم رہتے ہوئے جزیہ قبول کریں وہ بھی اپنے جان و مال کو محفوظ کر لیں گے اور اگر دونوں باتوں میں سے کسی کو قبول نہ کریں تو پھر ان سے جہاد کیا جائے گا۔ اقامۃ الصلوٰۃ کا مطلب نماز پر مداومت اور اس کو اس کے پورے ارکان و واجبات کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں۔ یہ تو الزکوٰۃ یعنی ال کا مخصوص حصہ شریعت کی مقرر کردہ ہدایت کے مطابق مستحقین کو دینا۔ یقیموا الصلوٰۃ و یوتوا الزکوٰۃ کا دیگر دلائل شرعیہ پر

پر نظر رکھتے ہوئے معنیٰ یہ ہوں گے کہ وہ توحید و رسالت پر ایمان لانے کے بعد نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کو بھی تسلیم کر لیں۔
عصموا۔ عصم کے معنیٰ اصل لغت میں روک کے ہیں۔ اسی لیے عصام اس رسی کو کہتے ہیں جو مشک کے منہ پر باندھی جاتی ہے تاکہ پانی باہر نہ نکل سکے۔ یہاں اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ جب وہ ان امور پر ایمان لے آئیں گے تو اب ان کا جان و مال محفوظ ہو جائیگا۔ الا بحق الاسلام کا مطلب یہ ہے کہ باوجود مسلمان ہونے کے اگر کوئی کسی کو ناحق قتل کر دے یا کسی اور جرم کا مرتکب ہوگا تو اس کو سزا دی جائے گی۔ یہ نہیں کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اس کو کھلی چھٹی دیدی جائے کہ جو چاہے کرے۔ حتیٰ یشھدو سے واضح ہوا کہ کسی کو مسلمان اسی صورت میں قرار دیا جائیگا۔ جب کہ وہ زبان سے کلمہ پڑھے اور تمام ضروریاتِ دین کو تسلیم کرے۔ حسابھم علی اللہ کا معنیٰ یہ ہے کہ ظاہر پر حکم لگائیں گے اور دلوں کی کیفیت کا معاملہ اللہ کے سپرد رہے گا۔ ایک معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ عصمت احکام دنیوی سے متعلق ہوگی۔ رہا اعمال کا ثواب دینا یا بداعمالیوں کی سزا دینا یہ اللہ تعالےٰ کا کام ہے۔

فائدہ اس حدیث میں توحید و رسالت کے ساتھ نماز و زکوٰۃ پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ باقی ارکانِ اسلامیہ کا ذکر نہیں ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نماز و زکوٰۃ کی اہمیت کی وجہ سے ان دونوں کا ذکر کر دیا ہے ورنہ مومن ہونے کے لیے ان تمام باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کی طرف سے لائے ہیں چنانچہ اسی مضمون کی بخاری میں جو حدیث ہے اس کے لفظ یہ ہیں۔ حَتّٰی یَشْھَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ یُؤْمِنُوْا بِیْ وَ بِمَا جِئْتُ بِہٖ کہ لوگوں کے جان و مال اس وقت محفوظ ہوں گے۔ جب کہ وہ توحید کے اقرار کے بعد مجھ پر ایمان لائیں اور جو چیزیں میں لایا ہوں اس پر بھی ایمان لائیں۔ بما جئت بہ میں تمام امورِ اسلامیہ آگئے۔

تارکِ صلوٰۃ عمداً کا حکم یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ کے الفاظ سے امام شافعی یہ استدلال کرتے ہیں کہ جو شخص نماز کی فرضیت کے قائل ہونے کے باوجود قصداً عمداً نماز ترک کرے۔ کو تلوار سے حداً قتل کر دیا جائیگا۔ اب یہ کہ فی الفور قتل کر دیا جائے یا اس کو تین دن کی مہلت دی جائے۔ اس میں اصحاب شافعی کا اختلاف ہے (کما قالہ النووی) لیکن جو شخص زکوٰۃ نہ دے اس کے متعلق وہ قتل کا حکم نہیں دیتے بلکہ جبراً اس سے زکوٰۃ وصول کرنے کو کہتے ہیں۔ لیکن ان کے اس استدلال پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حدیثِ مذکورہ میں صلوٰۃ و زکوٰۃ دونوں کا ذکر ہے۔ لہٰذا دونوں کا ایک ہی حکم ہونا چاہیئے۔ لیکن آپ (شافعی) تارکِ صلوٰۃ کو حداً قتل کر دینے کا حکم فرماتے ہیں مگر تارکِ زکوٰۃ کے لیے یہ حکم نہیں دیتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں۔ حدیثِ ہذا میں اُقَاتِلُ کا لفظ آیا ہے جو بابِ مفاعلہ ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں فعل جانبین سے ہوتا ہے اور حدیث میں قتال کا لفظ آیا ہے۔ قتل کا نہیں۔ لہٰذا اباحۃ قتال سے اباحۃ قتل کیسے ثابت ہوگا۔

پس تارکِ صلوٰۃ عمداً کی تعزیر یہ ہونی چاہیئے کہ اس کو قید کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ توبہ کرلے اور نماز کا پابند ہو جائے۔

بَابُ مَنْ قَالَ الْاِیْمَانُ هُوَ الْعَمَلُ

باب اس امر کے بیان میں جنہوں نے یہ کہا کہ ایمان عمل کا نام ہے

لِقَوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَ تِلْکَ الْجَنَّۃُ الَّتِیْۤ اُوْرِثْتُمُوْھَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ وَ قَالَ عِدَّۃٌ مِّنْ اَھْلِ الْعِلْمِ فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی فَوَرَبِّکَ لَنَسْئَلَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ عَنْ قَوْلِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

کیونکہ اللہ تعالٰی نے فرمایا یہ جنت جس کے تم وارث ہوئے ہو اپنے اعمال کی وجہ سے اور بعض اہلِ علم نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ تیرے رب کی قسم ضرور سوال کرے گا۔ اللہ تعالٰی جو وہ عمل کرتے ہیں۔ عمل کی تفسیر انہوں نے لا الٰہ الا اللہ سے کی ہے۔

امام بخاری نے یہ باب بھی فرقِ مرجیہ کے اس خیال کی تردید کے لیے باندھا ہے کہ "ایمان کے لیے عمل کی ضرورت نہیں ہے" اور آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ایمان عمل کو کہتے ہیں جس کی تقریر یہ ہے کہ ایمان دخولِ جنت کا سبب بنتا ہے اور اس آیت میں اللہ تعالٰی نے خبر دی کہ تم جنت کے مستحق عمل کی وجہ سے ہوئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایمان عمل کو کہتے ہیں۔ اسی طرح دوسری آیت میں یعملون کے لفظ کی تفسیر بعض مفسرین نے لا الٰہ الا اللہ سے کی۔ گویا قول پر عمل کا اطلاق آیا اور یعملون کے معنی ہوئے تو منون تو اس سے واضح ہوا کہ ایمان عمل تا ہی دوسرا نام ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ مرجیہ کا یہ کہنا کہ ایمان کے ساتھ عمل کی ضرورت نہیں ہے باطل محض ہے۔ دلائلِ شرعیہ سے صریح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ نجاتِ کامل کے لیے ایمان کے ساتھ عمل کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن امام بخاری علیہ الرحمۃ کا ان آیات سے یہ استدلال فرمانا کہ اعمال حقیقتِ ایمان میں داخل ہے قابلِ نظر ہے کیونکہ آیت عما کانوا یعملون کے عموم میں عقائد و اعمال دونوں داخل ہیں۔ معنیٔ آیت یہ ہے کہ قیامت کے دن عقیدہ و عمل دونوں کے متعلق سوال ہوگا۔ ایسی صورت میں یعملون کی تفسیر صرف عقیدہ سے کرنا تخصیص بلا دلیل ہے۔ ثانیاً عمل کا اطلاق ایمان پر اس حیثیت سے تو صحیح ہے کہ ایمان عملِ قلب ہے یعنی تصدیق۔ لیکن جب عمل کا اطلاق ایمان پر اس حیثیت سے کیا جائے کہ اس سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ عمل حقیقتِ ایمان میں داخل ہے یا اس کا جزو ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حدیث ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ تعالٰی عنہ سے مروی ہے کہ عما کانوا یعملون سے مراد لا الٰہ الا اللہ ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی اسناد میں لیث بن ابی سلیم ضعیف ہے لہٰذا اس کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

وَقَالَ لِمِثْلِ ھٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ

اور اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ ایسے عمل کریں عمل کرنے والے

اس آیت سے بھی امام یہی استدلال کرتے ہیں کہ یہاں عمل سے مراد ایمان ہے لیکن یہ دعوٰی تخصیص بھی بلا دلیل ہے۔

۲۵ ۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سُئِلَ اَیُّ الْعَمَلِ اَفْضَلُ فَقَالَ اِیْمَانٌ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ قِیْلَ ثُمَّ مَاذَا قَالَ الْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قِیْلَ ثُمَّ مَا

حضرت ابوہریرہ سے ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسا عمل افضل ہے۔ فرمایا اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پھر پوچھا گیا۔ اس کے بعد فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔ پوچھا گیا۔ اس کے بعد فرمایا۔

ذَا قَالَ حَجٌّ مَبْرُوْرٌ | حج مبرور

فوائد و مسائل اس حدیث کو مسلم، ترمذی و نسائی نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے۔
۲- اَفْضَلُ - اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہوں گے کہ سب سے زیادہ ثواب والا فعل کونسا ہے؟ ای یہاں استفہامیہ ہے۔ ثُمَّ مَاذَا میں ثُمَّ عطف ترتیب کے لیے ہے اور مَا استفہامیہ ہے اور ذَا اسم اشارہ ہے۔ عبارت یوں بنے گی۔ اَیُّ شَیْءٍ اَفْضَلُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ جِهَادٌ جَهْدٌ سے ہے۔ ج کے زبر کے ساتھ۔ اس کے معنی لغت میں مشقت کے ہیں اصطلاح شرع میں کافروں سے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے لڑنے کا نام جہاد ہے۔ حج کے معنی لغت میں قصد ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں مکانِ مخصوص کی زمانِ مخصوص میں فعلِ مخصوص کے ساتھ زیارت کرنے کو حج کہتے ہیں۔ مَبْرُوْرٌ۔ بر۔ ب کے زیر کے ساتھ اس کے معنی قبول و طاعت کے ہیں جیسے بولتے ہیں۔ برّ اللہ حجك۔ اللہ تعالیٰ تیرا حج قبول کرے۔ اصل لغت میں بِر کے معنی خیر کے جمع ہونے کے ہیں۔ اسی لحاظ سے مبرور مختلف معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ وہ کام جس میں گناہ نہ ہو۔ برت یمینه یعنی اس نے اپنی قسم کو پورا کر دیا جس میں ریا نہ ہو۔ ہر عملِ صالح کو بھی بر کہتے ہیں۔ لبید شاعر نے بر کو تقویٰ کے معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔

وما البر الا مضمرات من التقیٰ ‏ ‏ ‏ وما المال الا معمرات ودایع

بر بھی تقویٰ کے مضمرات سے ہے اور مال مدتِ عمر میں تو ودیعت ہوتا ہے اور مرنے کے بعد وارثوں کو مل جاتا ہے۔ بر کے معنیٰ نیکی کے بھی آتے ہیں جیسے اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ میں اور لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ میں بر جنت کے معنیٰ میں بھی بعض نے لیا ہے۔ بر احسان وصلہ کے معنیٰ میں بھی آتا ہے جیسے بولتے ہیں۔ بَرَرْتُ وَالِدِیْ۔ مَبْرُوْرٌ کے معنیٰ وہ کام جو گناہ سے پاک ہو جو مقبول عند اللہ ہو، جو شبہات سے پاک ہو۔ جس میں ریا نہ ہو۔ بعض نے کہا کہ حجِ مبرور کی علامت یہ ہے کہ آدمی پہلے سے زیادہ پابندِ شریعت ہو جائے۔

توضیح حدیثِ ہذا میں عمل پر ایمان کا اطلاق بایں معنیٰ ہوا ہے کہ ایمان فعلِ قلب ہے یعنی دل کا کام ہے اس لیے ایمان کو بھی عمل کہہ دیا گیا ورنہ حقیقتِ ایمان مجرد تصدیق ہے اور افضل الاعمال ایمان کو قرار دینا بایں معنیٰ ہے کہ ایمان اصل ہے اور عمل اس کی فرع ۲- اس حدیث میں ترتیب یہ ہے سب سے افضل ایمان باللہ و رسولہ۔ اس کے بعد جہاد، اس کے بعد حجِ مبرور۔ لیکن حدیث ابن مسعود میں افضل عمل نماز پھر والدین سے نیکی کرنا۔ اس کے بعد حجِ مبرور کا ذکر ہے۔ حدیث ابن عمر میں افضل اسلام کھانا کھلانا اور سلام کرنے کو قرار دیا گیا ہے اور حدیث ابی موسیٰ میں افضل اسلام اس بات کو بتایا گیا ہے کہ جس کی زبان سے اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہیں۔ اسی طرح حدیث ابوذر میں افضل عمل ایمان باللہ اور جہاد کو بتایا گیا ہے۔ اس کے بعد غلام آزاد کرنے کو۔ اس میں حج کا ذکر نہیں ہے تو شبہ پیدا ہوتا ہے کہ احادیث متعارض ہیں۔ کہیں کسی عمل کو افضل الاعمال قرار دیا گیا ہے اور کہیں کسی کو۔ جواب یہ ہے کہ اس مضمون کی احادیث کو پڑھتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ حضور سید عالم نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے

حکیم بنا کر مبعوث فرمایا ہے ۔ آپ صاحبِ حکمت ہیں اور حکمت کے معنی ہیں کہ اشیاء کو ٹھیک اپنے محل میں رکھنا تو یہ جو بظاہر اختلاف سا نظر آرہا ہے ۔ یہ بوجہ اختلاف احوال و اشخاص کے ہے یعنی جب حضور علیہ السلام یہ فرماتے ہیں کہ بہترین عمل نماز ہے ۔ کبھی فرماتے ہیں کہ بہترین عمل جہاد ہے ۔ کبھی فرماتے ہیں کہ بہترین عمل سلام کو پھیلانا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یہ کام من جمیع الوجوہ تمام حالات ، تمام اشخاص کے لیے ہر ایک سے بہترین ہے بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک حال میں یہ عمل سب سے بہتر ہے اور دوسرے وقت میں دوسرا عمل اس سے بہتر ہے ۔ دیکھئے نماز بہتر عمل ہے لیکن ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اور ایک نابینا کنوئیں میں گرا چاہتا ہے تو ایسے وقت میں اس نماز پڑھنے والے کے لیے بہترین عمل یہ ہے کہ نماز کو توڑ دے اور اندھے کی جان بچالے ۔ تو یہی مطلب مذکورہ بالا احادیث میں کسی ایک عمل کو افضل الاعمال قرار دینے کا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث زیر بحث میں حج سے پہلے جہاد کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ حج سے صرف ایک شخص کو نفع پہنچتا ہے اور جہاد سے پورے اسلام کی شادمانی ہوتی ہے حالانکہ حج رکن اسلام سے ہے اور جہاد رکن اسلام سے نہیں ہے ۔ خلاصہ جواب یہ ہوا کہ احادیث مذکورہ بالا میں قطعاً تعارض نہیں ہے ۔ کیونکہ یہی بات ہے کہ ہر عمل اپنے موقع و محل احوال و اشخاص کی بنیاد پر افضل الاعمال کہلایا جا سکتا ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضور علیہ السلام کو مختلف قسم کے اشخاص سے واسطہ پڑتا تھا تو آپ اپنے نورِ نبوت سے جس عمل کی کمی یا اس سے لاپرواہی ملاحظہ فرماتے تھے ۔ اس کے لیے خصوصیت کے ساتھ اسی عمل کو افضل الاعمال قرار دیتے تھے تاکہ اس شخص کے دل میں اس عمل کی اہمیت جاگزیں ہو جائے اور یہی حکمت کا تقاضا بھی تھا ۔

بَابُ اِذَا لَمْ يَكُنِ الْاِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيْقَةِ

باب اس امر کے بیان میں ، جب اسلام حقیقۃً نہ ہو بلکہ (ظاہری)

وَكَانَ عَلَى الْاِسْلَامِ اَوِ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا فَاِذَا كَانَ عَلَى الْحَقِيْقَةِ فَهُوَ عَلٰى قَوْلِهٖ جَلَّ ذِكْرُهٗ : اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اَلْاٰيَةَ

(بخاری)

جان کے ڈر سے ہو (تو وہ آخرت میں کچھ فائدہ نہ دے گا) اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے (ایسے لوگوں کے حق میں فرمایا) کہ یہ گنوار کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے تو اے محبوب ان سے فرما دو تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ بظاہر اسلام کے تابعدار ہو گئے اور اگر اسلام حقیقی طور پر ہو تو یہ ہی مراد ہے اس آیت میں کہ دین تو اللہ کے ہاں صرف اسلام ہی ہے ۔

اسلام معتبر اور اسلام غیر معتبر کا بیان

۱ - واضح ہو کہ نفس الامر میں جو اسلام اللہ کے نزدیک معتبر و مقبول ہے وہ یہی ہے کہ آدمی خلوص دل کے ساتھ ضروریات دین پر ایمان لائے اور اس کی حقانیت کا اعتراف کرے ۔ چنانچہ اس کا بیان آیہ مبارکہ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ میں ہے ۲ - اور ایک اسلام یہ ہے کہ دل سے تو اس کی حقانیت کا اعتراف اور تصدیق نہ کی جائے محض رسمی طور پر یا صلح کے طور پر یا حکایۃً یا جان کے خطرہ کی بناء پر اسلام قبول کیا جائے ۔ یہ اسلام غیر معتبر ہے اور اس کا بیان آیہ مبارکہ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا... الخ ۔ میں ہے ۔ چنانچہ یہ آیت قبیلہ بنی اسد بن خزیمہ کے ان افراد کے حق میں نازل ہوئی جو قحط سالی کے زمانہ میں مدینہ آئے

اسلام قبول کیا اور حضور علیہ السلام سے کہنے لگے ہم بغیر لڑے آپ کے مطیع ہو گئے ہیں۔ اس لئے آپ ہمارا زیادہ خیال رکھیے جس پر انہیں کہا گیا کہ تم صرف زبانی طور پر دعویٰ اسلام کرتے ہو۔ صمیم قلب کے ساتھ تم نے اسلام کی حقانیت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس لیے تم مومن نہیں ہو۔ البتہ مسلم بایں معنےٰ ہو کہ تم نے ظاہری طور پر اطاعت قبول کی ہے ۳۔ امام بخاری نے یہ باب محض اسلام معتبر و اسلام غیر معتبر میں فرق کو بیان کرنے کے لیے باندھا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نفس الامر میں وہی اسلام خدا کے نزدیک مقبول و معتبر ہے جو صمیم قلب کے ساتھ قبول کیا جائے اور اس کی حقانیت کا اعتراف کیا جائے ۴۔ اِذَا لَمْ یَکُنِ الْاِسْلَامُ عَلَی الْحَقِیْقَۃِ میں حَقِیْقَۃِ مجاز کے مقابل نہیں ہے بلکہ اس کے معنی نفس الامر کے ہیں ۵۔ اَوِالْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ کے معنی بعض شارحین نے یہ کئے ہیں کہ امام بخاری کے نزدیک حالت خوف میں قبول کیا ہوا اسلام معتبر نہیں ہے لیکن یہ بات غلط ہے اور امام بخاری کی شان سے بعید ہے۔ کیونکہ حدیث میں مذکور ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ان افراد کے اسلام کو قبول فرمایا جنہوں نے جان کے خطرہ کی بنا پر اسلام قبول کیا تھا۔ بلکہ وہ لوگ جنہوں نے یہ کہنا پسند نہیں کیا تھا کہ ہم اسلام لائے بلکہ انھوں نے یہ کہا تھا (صبلنا صبلنا) اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان کے اسلام کو رد کرتے ہوئے ان کو قتل کر دیا تھا۔ جس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ الٰہی میں خالد کے فعل سے بری ہوں معلوم ہوا کہ مطلقاً خوف کی حالت میں قبول کئے ہوئے اسلام کو غیر معتبر نہیں قرار دیا جا سکتا ۶۔ اسلام لانے کی متعدد صورتیں ہیں یہ کہ جبراً اسلام قبول کرے مگر دل سے بُرا جانے۔ یہ اسلام معتبر نہیں کیونکہ ایسے شخص نے خلوص قلب سے اسلام کی حقانیت کی تصدیق نہیں کی۔ دوم یہ کہ اس کے نزدیک کسی بھی دین میں رہنا جائز ہو اور وہ اسی بنیاد پر اسلام قبول کرے۔ اس لیے نہیں کہ اسلام حق ہے یہ اسلام بھی غیر معتبر ہے اور لَمْ یَکُنِ الْاِسْلَامُ عَلَی الْحَقِیْقَۃِ سے امام بخاری کی یہی مراد ہے تیسری شکل یہ ہے کہ خوف جان کے وقت اسلام قبول کر لیا اور پھر اس کی حقانیت کی تصدیق کرے۔ گویا اس نے خوف جان کے وقت صمیم قلب کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تو یہ اسلام معتبر ہے اور ایسا شخص مومن ہے اور امام بخاری نے ایسے شخص کے اسلام کو غیر معتبر قرار نہیں دیا ۷۔ اَوْکَانَ عَلَی الْاِسْتِسْلَامِ بہ سَلْم سے مشتق ہے۔ اس کے معنی صلح کے ہیں۔ یعنی صلح کے طور پر مجبوراً اسلام لے آئے مگر اس کی حقانیت کا قائل نہ ہو۔ یہ اسلام بھی غیر معتبر ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بحالت خوف جو اسلام قبول کرلے اور دل سے اس کی حقانیت کا معترف ہو تو وہ اسلام معتبر و مقبول ہے اور اگر تصدیق قلبی نہ ہو تو پھر نامعتبر ہے ۲۔ اس آیت سے کرامیہ اور مرجیہ کے اس قول کی تردید ہوتی ہے کہ ایمان صرف زبان سے اقرار کا نام ہے اور تصدیق قلبی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اعراب کو غیر مومن اسی بنا پر قرار دیا گیا کہ ان میں تصدیق قلبی نہ تھی۔

۲۶۔ عَنْ سَعْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَعْطٰی رَھْطًا وَّسَعْدٌ جَالِسٌ فَتَرَکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَجُلًا ھُوَ اَعْجَبُھُمْ اِلَیَّ فَقُلْتُ

حضرت سعد سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مال لوگوں میں تقسیم فرمایا (سعد وہاں بیٹھے ہوئے تھے) اور آپ نے ایک شخص کو چھوڑ دیا (کچھ نہیں دیا) حالانکہ یہ شخص مجھے بہت پسند تھا تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ آپ

يَا رَسُوْلَ اللهِ مَالَكَ عَنْ فُلَانٍ فَوَاللهِ اِنِّيْ لَاَرَاهُ مُؤْمِنًا فَقَالَ اَوْ مُسْلِمًا فَسَكَتُّ قَلِيْلًا غَلَبَنِيْ مَا اَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُ مَقَالَتِيْ فَقُلْتُ مَالَكَ عَنْ فُلَانٍ فَوَاللهِ اِنِّيْ لَاَرَاهُ مُؤْمِنًا فَقَالَ اَوْ مُسْلِمًا فَسَكَتُّ قَلِيْلًا ثُمَّ غَلَبَنِيْ مَا اَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُ مَقَالَتِيْ وَعَادَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ اِنِّيْ لَاُعْطِي الرَّجُلَ وَغَيْرُهُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْهُ خَشْيَةَ اَنْ يَّكُبَّهُ اللهُ فِي النَّارِ (بخاری)

نے اس شخص کو کیوں نہیں عطا فرمایا۔ خدا کی قسم میں تو اس کو مومن ہی جانتا ہوں۔ آپ نے فرمایا مسلمان؛ حضرت سعد کہتے ہیں پھر میں تھوڑی دیر خاموش رہا لیکن جو حال اس کا مجھے معلوم تھا اس نے مجھے پھر سوال کرنے پر مجبور کیا۔ میں نے عرض کی۔ حضور اس کو آپ نے کیوں نہیں عطا فرمایا۔ خدا کی قسم میں تو اس کو مومن سمجھتا ہوں۔ حضور نے فرمایا اور مسلمان! پھر میں تھوڑی دیر خاموش رہا۔ لیکن جو حال مجھے اس کا معلوم تھا اس نے مجھے پھر سوال کرنے پر مجبور کیا اور میں نے وہی سوال پھر دُہرا دیا۔ جس پر آپ نے فرمایا اے سعد! میں ایک شخص کو کچھ دیتا ہوں حالانکہ دوسرا (شخص جس کو نہیں دیتا) مجھے زیادہ عزیز ہوتا ہے (میں جس کو دیتا ہوں) تو اس خوف سے کہیں اللہ تعالیٰ اس کو جہنم میں اوندھا نہ گرا دے۔

فوائد و مسائل امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الزکوٰۃ میں بھی ذکر کیا ہے۔ نیز ابو داؤد و ابو نعیم نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے ۲۔ ابتداءِ اسلام میں یہ قاعدہ تھا کہ جو لوگ نئے نئے اسلام لاتے تھے۔ ان کی تالیفِ قلوب کے لیے ان کو کچھ دیا جاتا تھا۔ اس قسم کے چند افراد تھے جن کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مالی امداد فرما رہے تھے۔ آپ نے ان میں سے ایک شخص کو کچھ نہ دیا۔ جس پر حضرت سعد نے عرض کی؛ حضور! بخدا میں تو اس کو بھی مومن سمجھتا ہوں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے اس معروضہ کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ بھی مومن ہے تو حضور اس کو کیوں نہیں عطا فرماتے۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل حقیقت سے ان کو آگاہ کیا کہ جن کو میں کچھ دے رہا ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ضعیف الایمان ہیں۔ اگر ان کی تالیف نہ کی گئی تو ممکن ہے یہ اسلام سے پھر جائیں اور اللہ ان کو دوزخ میں ڈال دے۔ لیکن جن کو میں نہیں دیتا وہ اسلام کی لذت کو پا چکے ہیں اور ان کے اسلام سے پھر جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اس حکمت کی بناء پر میں ان کو دے رہا ہوں اور جس کی تم نے سفارش کی ہے اس کو نہیں دیا۔ حالانکہ یہ مجھے ان سے زیادہ عزیز ہے کیونکہ کامل الایمان ہے۔

۱۔ ابتداءِ اسلام میں مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوْب کو زکوٰۃ سے دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ بہ اجماعِ صحابہ ساقط ہو گئے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ دیا تو اب اس کی حاجت نہ رہی۔ یہ اجماع صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں منعقد ہوا۔

۲۔ اس حدیث سے گمانِ غالب پر قسم کھانے کا جواز ثابت ہوا کیونکہ حضرت نے اپنے گمانِ غالب پر ہی اس شخص کے مومن ہونے کی قسم کھائی تھی۔

۳۔ جائز سفارش کا جواز ثابت ہوا۔ حضرت سعد نے اس کے لیے سفارش کی۔

۴۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر سفارش خلافِ مصلحت ہو تو اسے قبول نہ کیا جائے جیسے حضور علیہ السلام نے قبول نہیں فرمائی۔

۵۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ جب تک دل سے اعتقاد نہ ہو زبانی اقرار کافی نہیں ہے اور مومن ہونے کے لیے تصدیقِ قلبی ضروری ہے۔

۶۔ حضرت سعد نے عرض کی واللہ میں اس کو مومن جانتا ہوں۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اَوْ مُسْلِمًا۔ یہاں ہمزہ استفہامیہ ہے اور واؤ عاطفہ ہے۔ تقدیرِ عبارت یوں ہوگی۔ اتقول مؤمن او هو مسلم یعنی تم امورِ باطنہ پر جزم و یقین کے ساتھ حکم لگاتے ہو؟ اور وہ مسلم ہو تو حضور علیہ السلام کے اس ارشاد کا مقصد نہ تو اس شخص کے ایمان کی نفی کرنا ہے اور نہ حضرت سعد کی مذمت بلکہ صرف ایک اصُول بتانا ہے کہ امُورِ باطنہ کا جب تک علم نہ ہو جائے اس وقت تک جزم و یقین کے ساتھ حکم نہیں لگانا چاہیے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جب ایک انصاری کے چھوٹے بچے کا انتقال ہوا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے فرمایا:۔

طُوْبٰی لَهٗ عُصْفُوْرٌ مِنْ عَصَافِيْرِ الْجَنَّةِ | خوشخبری ہو یہ تو جنت کے پرندوں میں سے ایک پرندہ ہے

اس پر حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَهْلًا يَا عَائِشَةُ ! | عائشہ! ٹھہر جاؤ!!

حالانکہ وہ بچہ مسلمان تھا اور اولادِ مسلمین کا جنت میں ہونا معلوم ہے۔ تو اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے حضرت سعد کو ایک اصُولی بات بتائی کہ امورِ باطنہ پر جزم و یقین کے ساتھ حکم نہ لگایا جائے۔ صحابہ کرام کی یہ حالت تھی کہ جب حضور علیہ السلام ان سے سوال فرماتے تو عرض کرتے۔

اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ | اللہ اور اس کا رسول ہی جانتا ہے۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اس حدیث کے راویوں میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالےٰ عنہ قابلِ ذکر ہیں۔ آپ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ قدیم الاسلام ہیں۔ چودہ برس کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ بدر اور اس کے بعد کے تمام مشاہد میں شریک ہوئے آپ مستجاب الدعوات تھے۔ لوگ آپ سے دعائیں کراتے تھے اور قبول ہوتی تھیں۔ آپ کا لقب فارس الاسلام ہے۔ اسلام کے لیے سب سے پہلے نیزہ پھینکنے والے اور سب سے پہلے خون بہانے والے آپ ہیں۔ آپ ان مہاجرین میں سے ہیں جنہوں نے حضور علیہ السلام کے مدینہ ہجرت فرمانے سے پہلے مدینہ ہجرت کی۔ عشرہ مبشرہ میں سب سے پہلے آپ نے ہی انتقال فرمایا۔ حضرت عمر کے زمانہ میں آپ نے مدائنِ کسریٰ کو فتح کیا اور حضرت عمر نے آپ کو عراق کا گورنر مقرر کیا۔ آپ نے قصرِ عقیق میں جو مدینہ سے دس میل کے فاصلے پر ہے ۵۶ھ میں وصال فرمایا۔ آپ کی عمر شریف ستر سال کے قریب ہوئی۔ آپ کو مدینہ لا کر جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ مروان بن حکم نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ سے ۲۷۰ حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے ۱۵ حدیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا (۵ حدیثیں صرف بخاری نے) ۱۹ حدیثیں صرف بخاری نے اور ۱۹ حدیثیں صرف مسلم نے منفرداً ذکر کیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

بَابُ اِفْشَاءِ السَّلَامِ مِنَ الْاِسْلَامِ

باب سلام کرنا علاماتِ اسلام سے ہے

وَقَالَ عَمَّارٌ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ ثَلَاثٌ مَنْ جَمَعَهُنَّ فَقَدْ جَمَعَ الْاِيْمَانَ الْاِنْصَافُ | حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ تین باتیں جس نے جمع کرلیں اس نے ایمان کو جمع کرلیا (یعنی) یہ

مِنْ نَفْسِكَ وَ بَذْلُ السَّلَامِ لِلْعَالَمِ وَالْإِنْفَاقُ مِنَ الْإِقْتَارِ

(بخاری)

تین باتیں علاماتِ ایمان سے اس نے اپنے اندر جمع کر لیں ۱- اپنے نفس سے انصاف کرنا ۲- ہر ایک کو سلام کرنا ۳- باوجود احتیاج کے خرچ کرنا

فوائد و مسائل

۱- انصاف عدل کو کہتے ہیں۔ بذل کے معنٰے خرچ کرنے کے ہیں۔ عالم سے مراد تمام لوگ ہیں ویسے عالم ماسوی اللہ کو کہتے ہیں۔ اقتار کے معنٰی غریبی و تنگدستی کے ہیں۔

۲- معنٰی حدیث یہ ہیں کہ جس میں یہ صفات پائی جائیں وہ کامل الایمان ہے۔ اوّل یہ کہ اپنے نفس کے ساتھ عدل کرنا۔ نفس کے ساتھ عدل کرنے کا مطلب یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی کو اللہ و رسول کے احکام کے مطابق گزارے۔ یعنی نفس کی جائز خواہشات کو ریا کے بغیر پورا کرے۔ بَذْلُ السَّلَامِ یعنی ہر مسلمان کو سلام کرنا۔ گو عالم کے لفظ میں کافر بھی داخل ہیں لیکن حدیث میں کافر کو سلام کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ اس لیے یہاں عالم سے مراد مسلمان ہوں گے۔

۳- باوجود احتیاج و تنگدستی کے خرچ کرنا۔ یعنی مفلسی و محتاجی کے عالم میں مہمان کی تواضع کرنا اور دوسروں کی حاجتوں کو اپنی حاجت پر مقدم رکھنا۔ یہ احسان و کرم کی انتہا ہے اور مسلمان میں ان صفات کا پایا جانا کامل الایمان ہونے کی علامت ہے۔

نوٹ :- اس عنوان کے ماتحت امام نے حدیث ۱۱ لکھی ہے جو باب اطعام الطعام من الاسلام میں گزر چکی ہے۔ اس لیے ہم نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمار جلیل القدر صحابی ہیں۔ اسلام کے لیے آپ نے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ ان کو کفار اسلام لانے کے بعد سخت سے سخت تکلیف دیا کرتے تھے۔ انہیں کے حق میں قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی۔ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا الخ ایک دن کفار نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو آگ میں ڈال دیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور یہ فرماتے تھے۔ يَا نَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰى عَمَّارٍ یعنی "اے آگ عمار پر ٹھنڈی ہو جا"۔ آگ ٹھنڈی ہوگئی (عینی جلد ۱ صفحہ ۲۳)

آپ بدر اور اس کے بعد کی تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے اور حبشہ و مدینہ کی طرف ہجرت کی اور جنگ صفین کے زمانہ ۳۷ھ میں حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کے ساتھی ہو کر شہید ہوئے۔ آپ سے ۶۲ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے تین حدیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا اور تین کو بخاری نے اور ایک حدیث مسلم نے منفرداً ذکر کی۔

بَابُ كُفْرَانِ الْعَشِيْرِ وَكُفْرٍ دُوْنَ كُفْرٍ فِيْهِ

یہ باب خاوند کی ناشکری کے بیان میں ہے اور یہ کہ ایک کفر دوسرے کفر سے کم ہوتا ہے

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اس باب میں حضرت ابو سعید نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔

کُفر کے لغوی معنیٰ اور اُس کی قسمیں

لغت میں کفر کے معنیٰ چھپانے اور ڈھانپنے کے ہیں۔ کافر کو اسی لیے کافر کہتے ہیں کہ وہ توحید کو چھپاتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو چھپاتا ہے کسان کو بھی کافر کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین میں بیج کو چھپاتا ہے۔ کفر کا لفظ دین کے متعلق بولا جاتا ہے اور کفران کا لفظ نعمت کے لیے۔ کفر کے معنیٰ انکار کے بھی آتے ہیں۔ کفر شرک کی ضد ہے اور ایمان کی نقیض ہے۔ نیز کفر کے معنیٰ برأت یعنی کسی چیز سے بیزاری کے اظہار کے بھی آتے ہیں جیسے یہ آیۂ مبارکہ:۔

اِنِّیْ کَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ | میں اس سے بیزار ہوں جو تم نے اس سے قبول شرک کیا

یہ مقولہ شیطان کا ہے جو قرآنِ حکیم نے نقل کیا ہے۔ اس میں کفر کے معنیٰ برأت و بیزاری کے آئے ہیں اور عشیر کا لفظ خاوند کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ کفر مطلق اللہ و رسول سے کفر کرنا۔ اس کی چار قسمیں ہیں:۔

اوّل: کفر انکار یعنی زبان و دل سے صراحۃً انکار کر دینا جیسے عام کافر کرتے ہیں۔

دوم: جحود یعنی معرفتِ قلب کے ساتھ زبان سے اقرار نہ کرنا جیسے کفر ابلیس و امیہ بن صلت

سوم: عناد یعنی زبان و دل سے معرفت کے باوجود ایمان کو قبول نہ کرنا جیسے حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کے اہلِ کتاب جنہوں نے باوجود اسلام کی حقانیت کے اعتراف کے اسلام قبول نہیں کیا۔

چہارم۔ نفاق یعنی دل سے انکار اور زبان سے اقرار جیسے منافقین۔

یہ چار قسم کے کفر وہ ہیں کہ ایک بھی جس میں ہوگا وہ ابدی جہنمی ہے اور اس کی بخشش نہ ہوگی۔

کُفر اور کُفرانِ نعمت کے معنیٰ

اس کے بعد کُفر کی ایک قسم اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ صدقِ دل سے ایمان لانے کے بعد گناہوں میں مبتلا ہو جانا۔ یہ کُفر، کُفرانِ نعمت (ناشکری) کے معنیٰ میں ہے اور یہ کُفر وہ نہیں ہے جو ایمان کے مقابل ہے اور جس کے پائے جانے سے آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

اس تفصیل سے ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں کتاب و سنت میں تارکِ صلوٰۃ یا زانی و شرابی وغیرہ ذالک مرتکب کبائر پر کفر کے لفظ کا اطلاق آیا ہے اور اس سے کفر حقیقی جو ایمان کی ضد ہے مراد نہیں ہے بلکہ وہ کفر مراد ہے جو انسان کو صرف مجرم قرار دیتا ہے اور دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتا۔

۲۸۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُرِیْتُ النَّارَ فَاِذَا اَکْثَرُ اَھْلِھَا النِّسَآءُ یَکْفُرْنَ قِیْلَ اَیَکْفُرْنَ بِاللّٰہِ قَالَ یَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ وَیَکْفُرْنَ الْاِحْسَانَ لَوْ اَحْسَنْتَ اِلٰی اِحْدٰھُنَّ الدَّھْرَ ثُمَّ رَاَتْ مِنْکَ شَیْئًا قَالَتْ مَا رَاَیْتُ مِنْکَ

حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ مجھے دوزخ دکھائی گئی تو میں نے وہاں عورتیں زیادہ دیکھیں۔ اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتی ہیں۔ کہا گیا۔ کیا وہ خدا سے کفر کرتی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا (نہیں) بلکہ خاوندوں کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان نہیں مانتیں تو اگر ان کے ساتھ ایک زمانہ تک

خَیْرًاً (بخاری) | احسان کرے اور پھر وہ تجھ سے کوئی خلافِ مزاج بات دیکھیں تو یہ کہیں کہ میں نے تجھ سے کبھی بھلائی نہیں پائی۔

فوائد و مسائل ۱۔ حدیث زیرِ بحث کو امام نے بابِ صلوٰۃ الکسوف۔ بدء الخلق وعشرۃ النساء وکتاب العلم میں بھی ذکر کیا ہے ۲۔ احسان قبیح کی ضد ہے۔ دھر کے معنیٰ زمانہ کے ہیں دھورا اس کی جمع ہے ابد کے معنیٰ مدّت دنیا کے ہیں۔ اس حدیث سے متعدد امُور پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے دوزخ دکھائی گئی جس سے ثابت ہوا کہ دوزخ جو دارالعذاب ہے وہ اب بھی موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا فرما دیا ہے جیسا کہ اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے۔

۲۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دنیا میں تشریف رکھتے ہوئے دوزخ کو ملاحظہ فرمایا جو آپ کی خصوصیات سے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے دوزخ میں اکثر عورتوں کو پایا جو خاوندوں کی احسان فراموشی کے جُرم میں دوزخ میں دکھلائی گئیں۔ معلوم ہوا ناشکری و احسان فراموشی (کفرانِ نعمت) کبیرہ گناہ ہے کیونکہ دوزخ کی سزا ارتکابِ حرام کی صورت میں ہی ملتی ہے۔ اسی لیے بعض علماء نے فرمایا کسی کے احسان کا اعتراف کرنا واجب ہے۔

۳۔ یہ بھی واضح ہوا کہ کُفر کا اطلاق ناشکری پر بھی آتا ہے۔

۴۔ ناشکریوں میں خاوند کی ناشکری کو بیان فرما کر خاوند کے حق کی عظمت کا اظہار فرمایا گیا ہے۔

۵۔ حضرت ابوسعید کی روایت جس کی طرف امام نے اشارہ کیا ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ صدقہ دیا کرو۔ میں نے جہنّم میں عورتوں کو کثرت سے پایا ہے۔ مستورات نے عرض کی۔ حضور (علیہ السلام) اس کا سبب کیا ہے؟ فرمایا تم لعنت بہت کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو۔

لعنت کے معنیٰ لغت میں لعنت کے معنیٰ دُوری اور پھینکنے کے ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں لعنت کے معنیٰ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دُوری کے ہیں۔ امام نووی نے فرمایا۔ لعنت کرنا معصیت ہے کبیرہ گناہ ہے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

لَعْنُ الْمُؤْمِنِ کَقَتْلِہٖ | مومن پر لعنت بھیجنا اس کے قتل کر دینے کے برابر ہے

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی کو معین کر کے اس پر لعنت کرنا خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان جائز نہیں۔ البتہ جن کا کفر پر مرنا نص سے ثابت ہے جیسے ابوجہل، ابولہب وغیرہ، ان پر لعنت کی جا سکتی ہے۔

بَابُ الْمَعَاصِیْ مِنْ اَمْرِ الْجَاھِلِیَّۃِ

باب اس امر کے بیان میں کہ جاہلیت کے گناہ کے مرتکب

وَلَا یُکَفَّرُ صَاحِبُھَا بِارْتِکَابِھَا اِلَّا بِالشِّرْكِ بِقَوْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّكَ امْرُؤٌ فِیْكَ | کو کافر نہیں کہا جائیگا۔ جب تک وہ شرک نہ کرے۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے (ابوذر) سے فرمایا۔ تم ایسے شخص ہو کہ تم میں جاہلیت کی بات پائی

جَاھِلِیَّۃٌ　　(بخاری)　　| جاتی ہے۔

توضیح فرقہ اباحیہ اور بعض خوارج و روافض یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مومنِ عاصی کی بخشش نہیں ہوگی اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ امام بخاری نے اس باب میں ان کی تردید کی ہے اور نصوصِ شرعیہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ مومنِ عاصی کی بخشش بہرحال ہوگی۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ گناہوں کی سزا میں وہ چند روز کے لیے جہنم میں داخل کیا جائے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کافروں کی طرح ہمیشہ کے لیے جہنم میں رکھا جائے۔

۲۔ معاصی۔ معصیت کی جمع ہے۔ معصیت عرف شرع میں شارع کی مخالفت یعنی واجب کو ترک کرنے اور فعلِ حرام کو اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ معصیت کا لفظ کبائر و صغائر چھوٹے بڑے تمام گناہوں کے لیے مقرر ہے۔ جاہلیۃ سے زمانہ فطرۃ مراد ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جو ظہورِ اسلام سے قبل تھا۔ اس زمانہ کو زمانہ جاہلیت اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں جہالت کی کثرت تھی۔ لَا یُکَفَّرُ یعنی جو مسلمان افعالِ جاہلیت زنا، شراب، چوری وغیرہ کا مرتکب ہوگا تو اس کو کافر نہیں قرار دیا جائے گا۔ اِلَّا بِالشِّرْكِ مگر یہ کہ وہ شرک کرے یعنی شرک کے ارتکاب پر کافر ہوگا۔ علامہ نووی نے فرمایا۔ ارتکاب کے لفظ نے یہ بتا دیا کہ جو مسلمان حرام کو حلال جان کر اختیار کریگا وہ کافر ہو جائے گا۔

مومنِ عاصی کافر نہیں اس کے ثبوت میں امام بخاری نے ایک حدیث اور دو آیتیں لکھی ہیں۔ حدیث کا تعلق حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہے۔ انہوں نے ایک بار کسی کو ماں کی گالی دیدی۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوذر تم میں جاہلیت کی خصلت پائی گئی۔ ظاہر ہے کہ گالی دینا گناہ ہے اور جاہلیت کے اخلاق و عادات سے ہے۔ تو اگر گناہ کا مرتکب کافر ہو جاتا تو حضور علیہ السلام ضرور ابوذر کو کافر قرار دیتے۔ ثابت ہوا کہ گناہوں کے ارتکاب سے خواہ وہ صغائر ہوں یا کبائر یا جاہلیت کے اخلاق و عادات سے ہوں آدمی کافر نہیں ہوتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمانہ جاہلیت کے اخلاق و عادات سے صرف کفر و شرک ہی ایسا گناہ ہے جو آدمی کو کافر بنا دیتا ہے اور جاہلیت سے صرف کفر و شرک ہی مراد لینا سخت غلطی ہے۔

وَّ قَوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا فَسَمَّاھُمُ الْمُؤْمِنِیْنَ

بے شک اللہ تعالیٰ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے اور کفر سے نیچے جو کچھ ہے۔ جسے چاہے معاف فرما دیتا ہے اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو ان میں صلح کراؤ (دیکھو لڑنے والوں کو) اللہ تعالےٰ نے مسلمان فرمایا۔

یہ دونوں آیتیں اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں۔ پہلی آیت میں اس امر کا بیان ہے کہ جو کفر پر مرے اس کی بخشش نہیں ہے۔ اس کے لیے ہمیشگی کا عذاب ہے اور جس نے کفر نہ کیا ہو وہ خواہ کتنا ہی گنہگار ہو اور بے توبہ بھی مر جائے تو اس کے لیے خلود نہیں۔ اس کی مغفرت اللہ تعالےٰ کی مشیت میں ہے چاہے معاف فرمائے یا اس کے گناہوں پر عذاب کرے پھر اپنی رحمت سے جنت میں داخل فرمائے۔ دوسری آیت میں لڑنے والوں کو مومن فرمایا گیا۔ حالانکہ مسلمانوں سے لڑنا

گناہ ہے۔ معلوم ہوا کہ گناہ کرنے والا کافر نہیں ہے۔

۲۹۔ عَنِ الْاَحْنَفِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ ذَهَبْتُ لِاَنْصُرَ هٰذَا الرَّجُلَ فَلَقِيَنِيْ اَبُوْ بَكْرَةَ فَقَالَ اَيْنَ تُرِيْدُ قُلْتُ اَنْصُرُ هٰذَا الرَّجُلَ قَالَ ارْجِعْ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِي النَّارِ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذَا الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ الْمَقْتُوْلِ قَالَ اِنَّهٗ كَانَ حَرِيْصًا عَلٰى قَتْلِ صَاحِبِهٖ (بخاری)

حضرت احنف بن قیس نے کہا کہ میں اس شخص (یعنی حضرت علی) کی مدد کو نکلا تو مجھے ابوبکرہ (نفیع بن حارث بن کلاہ صحابی) ملے۔ انھوں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا اس شخص کو مدد کرنے جا رہا ہوں۔ انھوں نے کہا لوٹ جاؤ! کیونکہ میں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں لے کر بڑھیں تو قاتل و مقتول دونوں دوزخی ہیں۔ میں نے عرض کی حضور قاتل تو خیر دوزخی ہوگا مگر مقتول دوزخی کیوں؟ فرمایا مقتول اس لیے کہ وہ اپنے مدمقابل کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے کتاب الفتن میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے ۲۔ احنف بن قیس قبیلہ بنی تمیم کے رئیس تھے۔ آپ اسلام لانے سے قبل حضور علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں (فتح الباری) جنگِ جمل کے موقعہ پر یہ اپنی قوم کے ساتھ حضرت علی کرم اللہ تعالےٰ وجہہ الکریم کی مدد کے لیے تیار ہوئے تو اس وقت حضرت ابوبکرہ نے ان کو مذکورہ بالا حدیث سُنا کر لڑائی میں شریک ہونے سے روک دیا ۳۔ علامہ قاضی عیاض نے فرمایا۔ فالقاتل والمقتول فی النار کا مطلب یہ ہے کہ یہ جرم ایسا ہے کہ اس کی سزا جہنم ہے۔ خدا چاہے تو سزا دے چاہے تو معاف فرما دے جیسا کہ دوسری روایتوں میں آیا ہے۔ ان شاء عفا عنهما۔ وان شاء عاقبهما ۴۔ یہ حدیث اس قتال پر محمول ہے کہ جو بلا وجہ شرعی ہو یا دیانت کے ساتھ تاویل و اجتہاد کی بنا پر نہ ہو یہی وجہ ہے کہ باغی سے خواہ وہ مسلمان ہی ہو لڑنا جائز ہے۔ رہیں صحابہ کرام کی باہم لڑائیاں جیسے جمل و صفین جس میں فریقین کے آدمی مارے گئے۔ ان پر اس حدیث کو چسپاں نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ حضرات مجتہد تھے۔ انھوں نے معصیت کا قصد نہیں کیا اور نہ محض دنیاوی مفاد کے لیے لڑے بلکہ ہر ایک ان میں مخلص تھا۔ گو ایک فریق حق پر تھا اور دوسرا ناحق پر تھا مگر مجتہد کو خطاء اجتہادی پر بھی ثواب ملتا ہے اور مجتہد مصیب دوگنے ثواب کا حقدار ہے۔ اس لیے مشاجراتِ صحابہ پر اس حدیث کو حمل کرنا سخت درجہ کی نادانی ہے۔ نیز الصحابۃ کلھم عدول کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ ہم مشاجراتِ صحابہ کے متعلق کسی فریق پر طعن نہ کریں۔

تعارف ابوبکرہ یہ حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ ان کا اصلی نام نفیع یا مسروح ہے فضلاء صحابہ میں ان کا شمار ہے۔ بڑے عبادت گزار تھے۔ ۵۲ھ میں بصرہ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ سے کل ۱۳۲ احادیث مروی ہیں جن میں سے ۹ پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے اور ۵ کو صرف بخاری نے اور ایک کو صرف مسلم نے منفرداً ذکر کیا ہے۔

۳۰۔ عَنِ الْمَعْرُوْرِ قَالَ لَقِيْتُ اَبَا ذَرٍّ

حضرت معرور کہتے ہیں۔ میں مقام ربذہ میں حضرت ابو ذر

بِالرَّبَذَةِ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ وَعَلَى غُلَامِهِ حُلَّةٌ فَسَأَلْتُهُ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ إِنِّي سَابَبْتُ رَجُلًا فَعَيَّرْتُهُ بِأُمِّهِ فَقَالَ لِي النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا أَبَا ذَرٍّ أَعَيَّرْتَهُ بِأُمِّهِ إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ إِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَأَعِينُوهُمْ

سے ملا۔ انھوں نے اور ان کے غلام نے (ایک سا) جوڑا پہنا ہوا تھا۔ تو میں نے ان سے اس کے متعلق پوچھا تو ابوذر رضی اللہ تعالٰے عنہ نے کہا میں نے ایک دفعہ ایک شخص کو ماں کی گالی دی۔ جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوذر! تم نے ماں کی گالی دی۔ تم ایک ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت کی بات پائی گئی۔ تمہارے خدمت گزار تمہارے بھائی کی طرح ہیں۔ اللہ نے ان کو تمہارے قبضہ میں دیا ہے۔ جو تم کھاؤ ان کو بھی وہی کھلاؤ اور جو تم پہنو، ان کو بھی وہی پہناؤ اور ان کو زیادہ مشقت کا کام نہ دو اور اگر دو تو پھر خود بھی ان کا ہاتھ بٹاؤ۔

فوائد و مسائل (۱) اس حدیث کو امام نے عتق و ادب میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم نے ایمان و نذور میں اور ابوداؤد نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے ۲۔ ربذہ مدینہ شریف سے تین منزل پر ایک جگہ کا نام ہے۔ سَابَبْتُ کے معنی گالی دینے کے ہیں۔ حُلَّۃ دو کپڑوں کو کہتے ہیں ایک تہبند اور ایک کرتا۔ فعیرتہ۔ عاریعیر۔ اس کے معنی عیب نکالنے کے ہیں۔ خولکم۔ خول کا اطلاق لونڈی، غلام، نوکر، ملازم پر آتا ہے۔ خول کے اصل معنی کسی چیز کو سنوارنے اور قرینے سے رکھنے وغیرہ کے ہیں۔

توضیح حضرت معرور نے یہ دیکھا کہ حضرت ابوذر اور ان کا غلام دونوں ایک جیسا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے عام طور پر غلام و آقا کا لباس ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اس پر انھوں نے اس کی وجہ پوچھی تو حضرت ابوذر نے مذکورہ بالا حدیث سنا دی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ غلاموں سے اچھا سلوک کرو۔ جو خود کھاؤ ان کو بھی کھلاؤ جو خود پہنو ان کو بھی پہناؤ..... الخ

۲۔ حضرت ابوذر نے حضرت بلال کو یہ کہہ دیا تھا۔ "او کالی عورت کے بچے"۔ جس پر حضرت بلال نے دربار نبوی میں شکایت کر دی۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں جاہلیت کی یہ خصلت ابتک باقی ہے یعنی اسلام میں کالا گورا ہونا کوئی فضیلت کی بات نہیں ہے۔ افضل و اعلیٰ وہ ہے جس میں تقویٰ پایا جاتا ہے۔ حضرت ابوذر نے دراصل یہ لفظ حضرت بلال کو اس وقت کہے تھے جب کہ آپ کو گالی دینے کی حرمت کا علم نہ تھا۔ ورنہ ان کا ورع اور تقویٰ، زہد و عبادت مسلم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور علیہ السلام نے ان کو تنبیہ فرمائی تو حضرت ابوذر نے حضرت بلال سے فرمایا۔ میں اپنا رخسارہ زمین پر رکھتا ہوں اور اس وقت تک نہیں اٹھاؤں گا جب تک تم میرے رخساروں کو اپنے قدموں سے نہ روند دو۔ ابن ملقن کہتے ہیں کہ حضرت بلال نے اپنا پاؤں حضرت ابوذر کے منہ پر رکھ دیا۔ تب جا کر حضرت ابوذر کو تسکین ہوئی۔ (قسطلانی)

ملازموں سے نیک سلوک کا حکم اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

ا۔ مسلمان کو گالی دینا جائز نہیں۔ اسی طرح غلام ، لونڈی کو بھی گالی نہ دی جائے۔ ایسے ہی اپنے ماتحت ملازموں سے بھی نیک سلوک روا رکھا جائے۔ احادیث میں غلام اور لونڈیوں سے سلوک اور نرمی کی بڑی تاکید آئی ہے ۲۔ ان کو اور اپنے ماتحت ملازموں کو ایسا کام نہ سپرد کیا جائے جو ان کی طاقت سے باہر ہو اور اگر کوئی مشقت کا کام دیا بھی جائے تو خود بھی ان کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔
۳۔ غلاموں اور ملازموں کو ذلیل نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک عزت والا اشرف وہ شخص ہے جس میں تقویٰ پایا جاتا ہے ۴۔ غلام اور لونڈیوں کو لباس و خوراک وہی دیا جائے جو آقا خود کھائے مگر یہ امر استحبابی ہے واجب نہیں مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ غلاموں کو بالکل ردی خوراک دینا ظلم ہے بلکہ ان کو اپنی حیثیت کے مطابق مناسب غذا دینا واجب ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس حدیث کے راویوں میں حضرت ابوذر قابل ذکر ہیں۔ بڑے عابد و زاہد متقی پرہیزگار صحابی ہیں۔ ان کا اصلی نام جندب یا بریر ہے۔ قبیلہ کنانہ سے ہیں۔ قدیم سے اسلام لائے یہ مکہ میں پانچویں شخص تھے جو اسلام سے مشرف ہوتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد یہ اپنے قبیلہ میں واپس چلے گئے۔ بدر و خندق کی لڑائی کے بعد پھر مدینہ میں آگئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں موت تک رہے۔ یہ زہد و تواضع میں مشہور رہیں۔ احادیث میں ان کے زہد کو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے زہد سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ان کے زہد و اعراض عن الدنیا کا یہ عالم تھا کہ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو اپنی حاجت سے زیادہ روپیہ رکھنا ناجائز ہے۔ یہ ان کا اجتہاد تھا جس کو جمیع صحابہ کرام نے رد کر دیا۔ ان سے کل ۲۸۱ حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے ۱۲ پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے اور ایک حدیث کو صرف بخاری نے اور ۱۷ حدیثوں کو صرف مسلم نے منفرداً ذکر کیا ہے۔ ایک خلقِ کثیر نے ان سے حدیث روایت کی ہے جن میں حضرت ابن عباس اور حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہم و تابعین کرام شامل ہیں۔ مقام ربذہ ۳۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعود نے نماز جنازہ پڑھائی۔

بَابُ ظُلْمٍ دُوْنَ ظُلْمٍ

باب اس امر کے بیان میں کہ ایک ظلم دوسرے ظلم سے کم درجہ پر ہوتا ہے

ا عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ قَالَ اَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (بخاری)

حضرت عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی "وہ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان میں کسی ناحق کی آمیزش نہ کی انہیں کے لیے امن ہے" تو اصحاب نبی علیہ السلام نے کہا۔ ہم میں کون ایسا ہے جو گناہ نہیں کرتا تو پھر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ بیشک شرک ظلم عظیم ہے۔

ظلم کے معنیٰ ظلم کا لفظ نہایت معنیٰ خیز ہے۔ یہ لفظ قرآنِ حکیم میں بھی متعدد معنے میں استعمال ہوا ہے جیسے کفر و عصیان کے معنیٰ میں بھی آیا ہے۔
باب گزشتہ میں اس امر پر روشنی ڈالی گئی تھی کہ گناہ پر بھی کفر و شرک کا اطلاق ہوتا ہے لیکن ہر گناہ ایسا نہیں جس کے

ارتکاب سے آدمی کافر ہوجاتے تاوقتیکہ کفر و شرک ایسے گناہ کو اختیار نہ کرے۔ تو اسی طرح ظلم کا لفظ بھی متعدد معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ عام گناہوں کو بھی ظلم سے تعبیر کرتے ہیں اور کفر و شرک پر بھی ظلم کا لفظ بولا جاتا ہے ۲۔ لَمْ يَلْبِسُوْا (لبس) کے معنیٰ (اختلاط) ملانے کے ہیں۔ ترتیب یہ آیہ مبارکہ نازل ہوئی کہ وہی لوگ امن میں ہیں جو اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کو نہیں ملاتے تو صحابہ کرام نے اس عموم پر محمول سمجھا اور کہنے لگے ہم میں کون ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ اس سے گناہ نہیں ہوا۔ اس پر دوسری آیت نازل ہوئی جس میں یہ بتایا گیا۔ آیہ مذکورہ میں ظلم سے مراد عام گناہ نہیں ہے بلکہ ظلم سے مراد شرک ہے۔ تو اب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ امن میں وہی لوگ ہیں جو ایمان لا کر شرک و کفر کا ارتکاب نہیں کرتے۔ فافہم

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مومن کے گناہوں پر بالکل مواخذہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ مرجیہ کا خیال ہے۔ بلکہ مطلب آیت یہ ہے کہ مومن کافر کی طرح ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا ۳۔ آیت اور حدیث سے ترجمہ باب نکل آیا کہ ایک گناہ دوسرے گناہ سے

بَابُ عَلَامَةِ الْمُنَافِقِ

اس باب میں منافق کی علامتوں کا بیان ہے

۳۲۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اٰیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ سے ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے جب وعدہ کرے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے خیانت کرے۔

فوائد و مسائل

(۱) آیۃ کے معنیٰ علامت کے ہیں۔ آیۃ القرآن کو آیۃ اسی لیے کہتے ہیں کہ کلام ختم ہونے کی علامت ہے کذب خلاف واقعہ کو کہتے ہیں۔ کذب کے معنیٰ حق سے انحراف کے بھی آتے ہیں۔ کذب صدق کی ضد ہے اؤتمن کے معنیٰ کسی شخص کو امین بنانے کے ہیں۔ خان، خیانت کے معنیٰ شے میں ناجائز تصرف کے ہیں اور اصل لغت میں اس کے معنیٰ تنقص کے ہیں ۲ وعد اور عہد میں فرق یہ ہے کہ وعدہ ایک طرف سے ہوتا ہے اور عہد جانبین سے ۳۔ امام نے اس حدیث کو کتاب الوصایا، ادب اور شہادت میں بھی ذکر کیا ہے مسلم و ترمذی و ابوداؤد نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے ۴۔ حدیث ہذا میں منافق کی تین خصلتوں کا ذکر ہے۔ جو قول اور عمل اور نیت سے متعلق ہیں۔ کذب فساد قول ہے۔ خیانت فساد عمل ہے اور عہد شکنی فساد نیت ہے ۵۔ اس پر اجماع ہے کہ اگرچہ یہ امور علامات نفاق ہیں لیکن اس کے باوجود کسی مومن مخلص میں یہ علامات نفاق جمع ہوجائیں تو اس کو کافر یا منافق نہیں کہا جائیگا ۶۔ علامہ نووی نے فرمایا کہ حدیث ہذا میں منافق کی خصلتوں کا ذکر ہے تو اگر یہ عادتیں مومن صادق میں پائی جائیں تو اس کے متعلق یہ کہا جائیگا کہ اس میں منافقانہ عادتیں پائی گئیں۔ لیکن یہ نہیں کہیں گے کہ وہ مومن صادق منافق حقیقی ہوگیا۔

۷۔ علامہ قرطبی نے فرمایا۔ نفاق دو قسم پر ہے۔ عملی اور اعتقادی۔ نفاق اعتقادی یہ ہے کہ آدمی زبان سے اسلام کا اظہار کرے اور دل میں کفر کو چھپائے۔ یعنی دل سے اسلام کا منکر و مخالف ہو۔ یہی وہ نفاق ہے جو ذلیل ترین قسم کا کفر ہے اور جس کے

متعلق قرآن حکیم نے کہا ۔ اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ۔ منافق ہی فاسق ہیں یعنی دین سے خارج ہیں اور نفاق عملی یہ ہے کہ جیسے کذب خیانت بدعہدی ایسے خصائل تو اس حدیث میں نفاق عملی کا بیان ہے کہ جس شخص میں مذکورہ بالا خصلتوں میں سے کوئی خصلت پائی گئی تو اس میں نفاق عملی پایا گیا ۔ گویا ایک نفاق تو ایمان وعقیدہ کا نفاق ہے جو بدترین قسم کا کفر ہے لیکن اس کے علاوہ کسی شخص کی سیرت کا منافقوں والی سیرت ہونا بھی ایک قسم کا نفاق ہے مگر وہ عقیدے کا نہیں بلکہ سیرت و کردار کا نفاق ہے ۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے حضرت حذیفہ سے پوچھا تھا کہ کیا تم مجھ میں نفاق پاتے ہو تو اس سے ان کی مراد نفاق عملی کے متعلق سوال تھا اعتقادی کے متعلق نہیں ۔

بعض شارحین نے یہ کہا کہ حدیث ہذا کا تعلق زمانہ نبوت کے منافقین سے ہے جو اسلام کے دعویٰ میں جھوٹے تھے دین میں خیانت کرتے تھے ۔ جو عہد کرتے اس کو پورا نہ کرتے ۔ چنانچہ حضرت ابن عباس وابن عمر وسعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم وحضرت عطاء وریاح حسن بصری واکثر شراح حدیث کی یہی رائے ہے اور اس سلسلے میں حضرت سعید بن جبیر سے یہ مروی ہے کہ حضرت ابن عباس وابن عمر نے حضور علیہ السلام سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا ۔ پھر ارشاد فرمایا کہ یہ جو میں نے فرمایا ہے جب بات کرے جھوٹ بولے ۔ اس کا بیان اس آیت میں ہے ۔ اِذَا جَآءَ الْمُنَافِقُوْنَ .... الخ اور یہ جو میں نے فرمایا ہے جب وعدہ کرے اس کا خلاف کرے ۔ اس کا بیان اس آیت میں ہے ۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتَانَا مِنْ فَضْلِهٖ اور یہ جو میں نے فرمایا ہے کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جاتے تو خیانت کرے تو اس کا بیان اس آیت میں ہے ۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ..... الآیہ ۔ تو ہر آدمی دین کا امین ہے اور ظاہر و باطن نماز پڑھتا اور روزہ رکھتا ہے لیکن منافق صرف ظاہری طور پر نماز پڑھتا ہے تو کیا تمہاری بھی یہی حالت ہے ۔ ہم نے عرض کی نہیں ۔ اس پر آپ نے فرمایا :۔

لَا عَلَيْكُمْ اَنْتُمْ مِنْ ذٰلِكَ بَرِيْءٌ (عینی ج ۱ ص ۲۵۹) | یہ تمہارے متعلق نہیں ہے تم اس سے بری ہو

تو گویا مطلب حدیث یہ ہوا کہ اس حدیث میں حضور علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے منافقوں کی نشانیاں بتائی ہیں جو ان میں خیانت، کذب، عہد شکنی، بدزبانی ایسی بدعادتیں اور خصلتیں تھیں ۔ مزید تفصیل کے لیے عینی وفتح الباری دیکھئے ۔

علامات نفاق

۳۲ - عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ ۔ (بخاری)

حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ جس میں یہ چار باتیں ہوں گی ۔ وہ منافق خالص ہے (یعنی منافق عملی ہے) اور جس میں ان خصائل میں سے ایک ہوگی ۔ اس میں ایک خصلت نفاق عملی کی پائی جائے گی [illegible] اس کو ترک کر دے ۔ جب امانت رکھی جائے [illegible] ۔ جب بات کرے جھوٹ بولے [illegible] کرے اور [illegible] جھگڑے گالی دے ۔

نفاقِ حقیقی کی تعریف

۱۔ اس حدیث کو امام نے کتاب الجزیہ میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے کتاب الایمان میں۔ واضح ہو کہ نفاق دو قسم پر ہے۔ نفاقِ اصلی و حقیقی جس کو نفاقِ اعتقادی بھی کہتے ہیں۔ وہ تو یہ ہے کہ زبان سے تو اسلام کا اظہار ہو اور دل میں کفر کو چھپایا جائے یعنی آدمی دل سے تو اسلام قبول نہ کرے بلکہ دل سے اس کا مخالف اور منکر ہو لیکن کسی وجہ سے وہ اپنے کو مومن ظاہر کرتا ہو جیسا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عبداللہ بن ابی وغیرہ مشہور منافقین کا حال تھا کہ یہ لوگ بظاہر کلمہ پڑھتے تھے اور نماز و روزہ کی پابندی بھی کرتے تھے مگر دل سے اسلام کے منکر اور دین کے دشمن تھے۔ یہ نفاق تو ایمان و عقیدے کا نفاق ہے جو کفر کی بدترین قسم ہے اور اسی کے بارہ میں قرآن حکیم نے اعلان کیا ہے۔

۱۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ	منافق ہی فاسق ہیں (یعنی دین سے خارج ہیں)
۲۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ	تحقیق منافق جہنم کے بدترین گوشہ میں ڈالے جائیں گے۔

نفاقِ عملی

دوسری قسم نفاقِ عملی ہے جس کا تعلق ایمان و عقیدہ سے نہیں بلکہ عمل و کردار سے ہوتا ہے یعنی منافقِ عملی وہ ہے جس کے ایمان و عقیدہ میں تو خرابی نہیں ہوتی مگر سیرت و کردار میں نفاق ہوتا ہے اور وہ منافقوں کی سی عادتیں اور خصلتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ پس نفاقِ اعتقادی کفر کی ذلیل ترین قسم ہے اور نفاقِ عملی معصیت اور گناہِ کبیرہ ہے اور ایک مسلمان کے لیے جیسے یہ ضروری ہے کہ وہ کفر و شرک اور اعتقادی نفاق کی نجاست سے بچے۔ اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ منافقانہ سیرت اور منافقانہ اعمال و اخلاق کی گندگی سے بھی اپنے کو محفوظ رکھے۔

بعض منافقانہ اعمال و افعال

کچھ بُری عادتیں اور خصلتیں ایسی ہیں جن کو منافقین کے ساتھ خاص نسبت اور مناسبت ہے۔ اسلام چونکہ سچائی، امانت، دیانت، ایفائے عہد اور حق پسندی ایسے اعمالِ حسنہ اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے اس لیے کتاب و سنت میں منافقانہ اعمال و کردار کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ مسلمان منافقانہ اعمال و اخلاق سے اپنے آپ کو بچائیں۔ مثلاً سورۂ توبہ رکوع ۱۳ میں جن منافقانہ اعمال و کردار کا بیان ہے ان میں سے بعض یہ ہیں :۔

۱۔ جہاد یعنی اقامتِ دین کی جد و جہد کو فتنہ کہہ کر گریز کرنا ۲۔ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں کراہت کرنا۔ صراطِ مستقیم پر چلنے سے روکنا اور باطل کی راہوں پر چلنے کا مشورہ دینا ۳۔ نماز کی ادائیگی میں تساہل برتنا ۴۔ دین کے دشمنوں سے مل کر سازشیں کرنا ۵۔ عہد و پیمان کو توڑ دینا ۶۔ جھوٹے وعدے کرنا ۷۔ جھوٹی قسمیں کھانا ۸۔ دین کے دشمنوں سے دوستی اور رابطہ قائم کرنا وغیرہ۔ ان سب کو نفاق آلود عادات و خصائل قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح احادیث میں نفاقِ عملی سے بچنے کے لیے متعدد امور کی نشاندہی کی گئی۔

حدیث زیرِ تفہیم میں خصائلِ نفاق میں سے چار کا ذکر فرمایا۔ خیانت، جھوٹ، عہد شکنی، بدزبانی اور ارشاد فرمایا کہ جس شخص میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہو اس کو سمجھنا چاہیئے کہ اس میں ایک منافقانہ خصلت ہے اور جس میں چاروں خصلتیں ہوں وہ اپنی سیرت میں خالص منافقِ عملی ہے۔

۱۔ جھوٹ میں ہر بات داخل ہے جو حق جاننے کے بعد اس کے خلاف کہی جائے اور سُنی ہوئی بات بغیر تحقیق کے اس طرح روایت کر دی جائے جیسے وہ تحقیق شدہ ہے۔

۲۔ دوسری علامتِ نفاق "خیانت" ہے۔ اس سلسلہ میں ملحوظ رہنا چاہیئے کہ امانت میں ہر وہ چیز داخل ہے جو کسی مالک کی جانب سے کسی اور کے قبضہ و اختیار میں بغرضِ حفاظت دی جائے اور وہ باوجود اس پر اختیار رکھنے کے مالک کے منشا کے خلاف یا اسکی اجازت کے بغیر استعمال کا کوئی حق نہ رکھتا ہو۔ پس جس طرح انسان ایک دوسرے کے پاس امانتیں رکھتے ہیں۔ اس طرح کچھ امانتیں اللہ نے بندوں کے پاس رکھی ہیں اور یہ مال و دولت، یہ عقل و فہم یہ جسمانی قوت و اختیار وغیرہ یہ سب اللہ ہی کی تو ملکیت ہیں جنہیں اس نے بندوں کے پاس رکھا ہے اور وہ تمام صورتیں متعین کر دی ہیں جن میں ان امانتوں کا استعمال جائز یا ناجائز ہو سکتا ہے۔

بالخصوص مومنین سے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جان و مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے۔ اس رُو سے اللہ ہی ان کی دولت و عقل و فہم کا مالک ہے۔ پس جس طرح دنیاوی معاملات میں امانت رکھنے والا امانت رکھی ہوئی شے کو مالک کے منشاء کے خلاف استعمال کرکے خائن بن سکتا ہے۔ اسی طرح ایک مومن اپنے مال، عقل و فہم، صلاحیت و اختیار کو مالک کے منشاء کے خلاف استعمال کرکے خائنین کی فہرست میں داخل ہو سکتا ہے۔ غرضیکہ خیانت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ مال میں خیانت ہر یا کسی کے راز کو افشا کر دیا جائے یا کسی عہدہ اور منصب پر فائز ہو کر ظلم کیا جائے۔ یہ سب خیانت کی صورتیں ہیں۔

تیسری علامت عہد شکنی ہے۔ اس کے متعلق دو قول ہیں۔ اوّل یہ کہ مکروہِ تحریمیہ ہے۔ دوم یہ کہ مکروہ تنزیہیہ ہے۔ کما قال النووی لیکن حدیث ترمذی میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس نے اپنے مسلمان بھائی سے اس نیت کے ساتھ وعدہ کیا کہ اس کو پورا کریگا۔ پھر پورا نہ کر سکا تو اس پر گناہ نہیں۔ اس حدیث کی روشنی میں مسئلہ یہ ہوا کہ وعدہ کرتے وقت عہد شکنی کا عزم ہو تو یہ ممنوع ہے لیکن صدقِ دل کے ساتھ وعدہ کیا جائے اور اس عزم کے ساتھ عہد کیا جائے کہ پورا کروں گا۔ پھر غفلت یا بھول یا کسی مانع کی وجہ سے پورا نہ کر سکا تو اُمید ہے کہ مؤاخذہ نہ ہوگا۔

چوتھی بدزبانی ہے۔ پھر بدزبانی بھی مومن کے ساتھ ہو تو اس کی قباحت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جہاں مسلمان بھائی کو دیکھ کر مسکرانا عبادت ہو۔ وہاں اس کے ساتھ بدزبانی سے پیش آکر اس کا دل دکھانا اس کی بُرائی کا کیا ٹھکانہ ہے۔

راہِ خدا میں جہاد

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسُهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ (رواہ مسلم)

جو شخص اس حال میں مرا کہ نہ تو اس نے جہاد کیا اور نہ کبھی جہاد کی تجویز ہی سوچیں اور تمنا کی تو وہ نفاق کی ایک صفت پر مرا۔

مطلب یہ ہے کہ جس نے ایمان کے دعویٰ کے باوجود نہ تو جہاد کیا اور نہ کبھی اس کے دل میں جہاد کا شوق اور اس کی تمنا پیدا ہوئی تو یہ منافق کی زندگی ہے اور جو اس حال میں مر گیا تو نفاق کی ایک صفت کے ساتھ دنیا سے گیا۔ ایک اور حدیث میں فرمایا۔

نماز میں سُستی

تِلْكَ صَلٰوةُ الْمُنَافِقِ يَجْلِسُ يَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰى اِذَا اصْفَرَّتْ وَكَانَتْ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ قَامَ فَنَقَرَ اَرْبَعًا لَا يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْهَا اِلَّا قَلِيْلًا

یہ تو منافق کی سی نماز ہے کہ بے پرواہی سے بیٹھا آفتاب دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ زرد ہو گیا تو نماز کے لیے کھڑا ہو گیا (اور چڑیا کی) طرح چار چونچیں مار کر نماز ختم کر دی اور اللہ کا ذکر بھی اس میں بہت کم کیا

اس حدیث میں یہ بتایا گیا کہ مومن کی شان تو یہ ہے کہ شوق کی بے چینی سے نماز کے وقت کا منتظر رہے اور جب وقت آئے تو خوشی اور مستعدی سے نماز کے لیے کھڑا ہو اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اس وقت مجھے مالک الملک کے حضور حاضری نصیب ہے۔ پورے اطمینان اور خشوع کے ساتھ نماز ادا کرے۔ قیام و قعود رکوع و سجود میں خوب خوب اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور اس سے اپنے دل کو شاد کرے۔ یہ تو ہے مومن کے نماز پڑھنے کی شان ـــــــ لیکن منافق کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ نماز کو بوجھ سمجھتا ہے۔ وقت آجانے پر بھی ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً عصر کی نماز کے لیے اس وقت اٹھتا ہے جبکہ سورج بالکل ڈوبنے کے قریب ہو جاتا ہے اور پھر جلدی جلدی چڑیا کی طرح چار چونچیں مار کر نماز پوری کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی بس برائے نام ہی کرتا ہے۔ پس یہ نماز منافق کی نماز ہے۔ جو کوئی مسلمان اس سستی و کاہلی سے نماز ادا کرتا ہے تو اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے مومنوں والی نہیں بلکہ منافقوں والی نماز پڑھی ہے۔

اذان کے بعد مسجد سے نکلنا ایک حدیث میں فرمایا کہ جو شخص مسجد میں ہو اور اذان ہو جائے اور وہ اذان کے بعد بھی بلا کسی خاص ضرورت کے مسجد سے باہر چلا جائے۔

وَهُوَ لَا يُرِيدُ الرَّجْعَةَ فَهُوَ مُنَافِقٌ (ابن ماجہ)

اور نماز میں شرکت کے لیے واپسی کا ارادہ بھی نہ رکھتا ہو تو وہ منافق ہے۔

مطلب یہ کہ اذان ہو جانے کے بعد مسجد سے نکل جانا اور شرکتِ نماز کے لیے واپسی کا ارادہ نہ رکھنا منافقانہ طرزِ عمل ہے اور ایسا کرنے والا گو منافقِ حقیقی تو نہیں مگر منافقِ عملی ضرور ہے۔ الغرض حدیث میں نفاقِ عملی کی کثیر مثالیں موجود ہیں جن میں سے چند کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو ہر قسم کے نفاق سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بَابٌ قِيَامُ لَيْلَةِ الْقَدْرِ مِنَ الْإِيمَانِ

باب لیلۃ القدر میں قیام ایمان کی علامت

۳۴ - عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَقُمْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے لیلۃ القدر میں ایمان و احتساب کے ساتھ قیام فرمایا۔ اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب الصیام میں مکرر ذکر کیا۔ اسی طرح ابوداؤد، نسائی و ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ۲۔ واضح ہو کہ مقصود ان ابواب کا چونکہ ایمان اور خلافِ ایمان امور کا بیان کرنا تھا۔ اس لیے اب پھر امام نے ان امور کے بیان کا سلسلہ جاری فرمادیا جو ایمان کے اثرات و ثمرات ہیں یعنی قیام لیلۃ القدر، جہاد، صوم رمضان وغیرہ وغیرہ۔

قیام کے معنی ۔ قیام کے معنی ایک تو قیام فی الصلوٰۃ کے ہیں یعنی لیلۃ القدر میں نماز پڑھنا یا قیام نیند کے مقابل ہے۔ یعنی لیلۃ القدر کو جاگ کر گزارنا خواہ نماز کے ساتھ یا اذکار کے ساتھ۔ قیام سے مراد رات کا قیام ہے یا بعض کا۔ کثر

شارحین نے اس سے بعض حصہ رات کا قیام مراد لیا ہے لیکن علامہ عینی فرماتے ہیں کہ جب مَنْ یَّصُمْ یوماً کہا جائے تو اس سے بعض یوم کا روزہ مراد نہیں ہوتا۔ اسی طرح مَنْ یَّقُمْ کا لفظ آیا ہے تو یہاں بھی تمام رات کا قیام مراد ہونا چاہیے اور یہ اس لیے بھی کہ "لیلۃ القدر" مَنْ یَّقُمْ کا مفعول واقع ہوا ہے اور مفعول کی شان یہ ہے کہ وہ فاعل کے فعل کو شامل ہوتا ہے لہذا قیام کو تمام رات کے ساتھ متصف ہونا چاہیے۔

ایمان واحتساب کے معنی - احادیث میں احتساب کے لفظ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے ہر عمل کا مدار ایمان پر ہے اور اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے لیکن نیت مرتبہ علم کا ہے اور احتساب علم العلم کا مرتبہ ہے یعنی احتساب نیت سے بھی اوپر ایک درجہ ہے اور مراد اس سے نیت کا استحضار اور نیت کی زیادتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس لفظ کا استعمال شارع نے ذہول مشقت کے موقع پر کیا ہے۔ مثلاً حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جس کا بچہ مرجائے تو اس کو چاہیے کہ صبر کرے اور احتساب کرے۔ اب دیکھیے بچہ کا مرجانا آفت سماوی ہے۔ اس میں انسان کے اختیار کو کچھ دخل نہیں ہے اور یہ کہ اس مصیبت کے وقت آدمی کو وہم بھی نہیں ہوتا کہ مجھے ثواب مل سکتا ہے تو یہ ذہول کی جگہ تھی اس لیے شارع نے فرمایا کہ اگرچہ یہ آفت سماوی ہے لیکن خلوص نیت کے ساتھ اگر کوئی اس مصیبت پر صبر کرے تو اس کا ثواب مل جائیگا۔

مشقت ومجاہدہ کے موقع پر بھی شارع نے اس کا استعمال فرمایا جیسے قیام لیلۃ القدر میں جب انسان عبادت میں محو ہوجاتا ہے اور مجاہدہ کرتا ہے تو ایک بہت سے اس کو ذہول ہوتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری یہ عبادت وطاعت بنفسہٖ ہے اور اس وقت وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس طاعت کی توفیق بھی خدا ہی نے دی ہے تو ایسے موقع پر اس کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ نیت میں ازدیاد پیدا کرے اور خلوص کو اور زیادہ بڑھائے تاکہ اجر میں اضافہ ہو۔

اسی طرح اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا یا نماز کے لیے دُور سے چل کر آنا یہ ایسے نیک کام ہیں جن کو آدمی یہ سمجھتا ہے کہ ان کے کرنے سے کیا ثواب ہوگا کیونکہ وہ یہ گمان کرتا ہے کہ بیوی بچوں پر خرچ کرنا ایک طبعی چیز ہے۔ اس موقع پر بھی احتساب کا لفظ استعمال کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام کیا جائے اس میں زیادہ سے زیادہ خلوص ہو۔ چنانچہ حدیث مسند احمد سے اس کی تائید ہوتی ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ كُتِبَ لَهُ عَشْرُ حَسَنَاتٍ اِذَا اَشْعَرَ بِهٖ قَلْبَهٗ وَحَرَصَ (مسند احمد)	جس نے ایک نیکی کی تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ جب کہ اس کے دل میں اس کا شعور اور حرص ہو (یعنی استحضار نیت)

حدیث ہذا سے واضح ہوا کہ خلوص نیت سے اوپر بھی ایک درجہ ہے جس کو خصوص درخلوص سے تعبیر کر لیجیے۔ غفر کے معنی چھپانے کے ہیں مغفر اسی سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ اس سے سر چھپ جاتا ہے اور آدمی تلوار کی ضرب سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ معنی حدیث یہ ہیں کہ جس نے لیلۃ القدر میں اس کے حق ہونے کے اعتقاد کے ساتھ صرف اللہ عزوجل کی خوشنودی کے لیے عبادت کی تو اس کے گذشتہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

لیلۃ القدر کے احکام | صراحۃً کسی حدیث میں شب قدر کی تاریخ متعین نہیں فرمائی گئی۔ علماء نے فرمایا کہ

اس شب کے اخفاء میں حکمت یہ ہے کہ مسلمان ہر رات اس خیال سے عبادت میں گذاریں کہ شاید یہی رات شب قدر ہو اور اسی طرح عشرۂ آخر کی راتیں خصوصیت کے ساتھ عبادت و ریاضت تسبیح وتہلیل میں گزاریں۔ البتہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

تحروا لیلۃ القدر فی الوتر من العشر الاواخر من رمضان (بخاری) | شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔

جس سے اتنا معلوم ہوا کہ شب قدر رمضان مبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں آیا کرتی ہے۔ بعض علماء نے اپنے کشف وعلم کے اعتبار سے مختلف تاریخیں بیان کی ہیں مثلاً

سیدالمفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ رمضان المبارک کی ستائیسویں رات ہے۔ سورۂ قدر میں اس کی جانب دو طرح اشارہ فرمایا۔ اوّل یہ کہ سورہ قدر تیس کلموں پر مشتمل ہے۔ ان میں ستائیسواں کلمہ لفظ ھی ہے جو لیلۃ القدر کی تعبیر ہے۔ دوسرے یہ کہ لیلۃ القدر میں نو حروف مکتوبی ہیں اور لفظ لیلۃ القدر کو سورہ قدر میں تین مرتبہ بیان فرمایا۔ نو کو تین میں ضرب دینے سے ستائیس حاصل ہوئے۔

ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا کہ وہ رمضان المبارک ہی میں ہوتی ہے اور اکثر و بیشتر رمضان کی آخری دس تاریخوں میں حضرت ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب سے بالغ ہوا ہوں رمضان میں شب قدر پاتا ہوں میرا تجربہ ہے کہ اگر پہلی تاریخ رمضان المبارک کی اتوار یا بدھ کو ہوتی ہے تو شب قدر انتیسویں رات کو ہوتی ہے اور جب پیر کو پہلی ہوتی ہے تو اکیسویں شب کو شب قدر ہوتی ہے اور جمعہ یا منگل کی پہلی ہو تو ستائیسویں رات کو شب قدر ہوتی ہے اور جب جمعرات کی پہلی ہوتی ہے تو پچیسویں کو لیلۃ القدر ہوتی ہے اور جب ہفتہ کی پہلی ہوتی ہے تو تیئیسویں شب کو لیلۃ القدر ہوتی ہے ——— مگر ظاہر ہے کہ شب قدر کی تاریخ سے متعلق بزرگوں سے جو کچھ منقول ہے وہ ظن وتخمین کے درجہ میں ہے۔ کوئی حتمی وقطعی بات نہیں ہے۔ اگر اس مقدس رات کی تلاش میں رمضان کے عشرۂ آخر کی تمام راتوں میں شب بیداری کی جائے تو کچھ عجب نہیں کہ وہ رحمٰن ورحیم خدا اس عشرہ کی برکت سے ہر رات کی عبادت کا ثواب شب قدر کے برابر ہی عطا فرما دے ——

واللہ واسع علیم ؎ ہر شب شب قدر است اگر بدانی

۲۔ شب قدر میں عبادت کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ احادیث صحاح میں تو ہے کہ رات کو قیام کرو یعنی نوافل پڑھے جائیں ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر میں شب قدر کو جان لوں تو اس رات میں کیا پڑھوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ یہ وظیفہ پڑھا کرو۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ

ویسے بزرگانِ دین وصلحائے امت سے ذکر اور نوافل کے متعدد طریقے منقول ہیں۔ مثلاً امام ابواللیث رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے ہیں کہ شب قدر کی نماز تین قسم پر ہے۔ اقل، اوسط، اکثر۔ اقل دو رکعتیں، اوسط سو رکعتیں، اکثر ایک ہزار رکعت۔ جو قسم چاہے اختیار کرے۔ ہر رکعت میں سورہ الحمد شریف کے بعد سورہ انا انزلناہ ایک مرتبہ اور سورہ

قل ھو اللہ تین مرتبہ پڑھے اور ہر رکعت پر سلام پھیرنے کے بعد بارگاہ رسالت میں ہدیۂ درود پیش کرے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ اس شب میں چار رکعت اس طرح ادا کرے کہ ہر رکعت میں سورۃ الحمد شریف کے بعد سورہ الہاکم التکاثر ایک مرتبہ اور سورہ قل ھو اللہ تین مرتبہ پڑھے۔

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالےٰ وجہہ الکریم نے فرمایا کہ جو شخص شب قدر میں بعد نماز عشا سات مرتبہ سورہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ پڑھے گا تو اللہ تعالےٰ اس کو بلاؤں سے محفوظ رکھے گا اور ستر ہزار فرشتے اس کے لیے جنت کی دعا کریں گے اور جو شخص جمعہ کے دن نماز سے پہلے اس کو تین مرتبہ پڑھے گا تو اس کے نامۂ اعمال سے ان لوگوں کی تعداد کے برابر نیکیاں لکھی جائیں گی جنھوں نے اس دن نماز جمعہ ادا کی۔ اس سے مقصد ان بزرگان دین کا یہ ہے کہ ہر مسلمان مرد و عورت اس رات میں ذکر الٰہی میں مشغول و مصروف رہے۔ خواہ مذکورہ بالا نماز ادا کرے خواہ درود شریف یا تسبیح یعنی سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ یا تہلیل یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یا تکبیر یعنی اَللّٰہُ اَکْبَرُ یا استغفار یعنی اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ جب تک ممکن ہو پڑھتا رہے۔

۳۔ سورہ قدر میں شب قدر کے مندرجہ ذیل خصائص کا بیان ہے۔

ا۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ بے شک ہم نے اسے شب قدر میں اتارا یعنی قرآن مجید کو لوح محفوظ سے آسمان دنیا کی طرف یکبارگی اس شب میں اتارا گیا۔

ب۔ لَیْلَۃُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ۔ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے یعنی شب قدر میں نیک عمل کرنا ہزار راتوں کے عمل سے بہتر ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس نے اس رات میں ایمان و اخلاص کے ساتھ شب بیداری کی اللہ تعالیٰ اس کے سال بھر کے گناہ بخش دیتا ہے (مسلم شریف) نیز حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امم سابقہ کے ایک صالح شخص کا ذکر فرمایا۔ جو تمام رات عبادت کرتا تھا اور تمام دن جہاد میں مصروف رہتا تھا۔ اس طرح اس نے ہزار مہینے گزارے تھے۔ مسلمانوں کو اس سے تعجب ہوا۔ اس پر اللہ عزوجل نے حضور علیہ السلام کو شب قدر عطا فرمائی اور یہ آیت نازل کی کہ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے (ابن جریر عن طریق مجاہد) یہ حضور علیہ السلام پر اللہ عزوجل کا کرم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی شب قدر کی ایک رات عبادت میں گزاریں تو ان کا ثواب پچھلی امت کے ہزار ماہ عبادت کرنے والوں سے زیادہ ہو۔

ج۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْھَا ...... الخ اس میں فرشتے اور جبریل اترتے ہیں۔ اپنے رب کے حکم سے ہر کام کے لیے اور سلامتی ہے صبح چمکنے تک۔ یعنی اس رات زمین پر جو بندہ کھڑا یا بیٹھا عبادت الٰہی میں مشغول ہو تو فرشتے اس کو سلام کرتے ہیں اور اس کے حق میں دعا و استغفار کرتے ہیں۔ بیہقی کی حدیث میں ہے کہ جب شب قدر ہوتی ہے تو جبریل امین ملائکہ کی جماعت کے ساتھ اترتے ہیں۔

يُصَلُّوْنَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ قَائِمٍ اَوْ قَاعِدٍ مُذَكِّرِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ (بیہقی)	تو ہر قیام و قعود کرنے والے بندے کے لیے جو ذکر و عبادت الٰہی میں مشغول ہو دعا کرتے ہیں۔

د۔ مِنْ کُلِّ اَمْرٍ یعنی اس شب میں سال بھر کے احکام نافذ کیے جاتے ہیں اور ملائکہ کو سال بھر کے وظائف و خدمات پر مامور کیا جاتا ہے۔

بَابُ الْجِهَادُ مِنَ الْاِیْمَانِ عَنِ النَّبِیِّ

باب اس امر کے بیان میں کہ جہاد بھی اسلام کے کاموں سے ہے

۳۵ - صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنْتَدَبَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ لِمَنْ خَرَجَ فِیْ سَبِیْلِہٖ لَا یُخْرِجُہٗ اِلَّا اِیْمَانٌ بِیْ اَوْ تَصْدِیْقٌ بِرُسُلِیْ اَنْ اُرْجِعَہٗ بِمَا نَالَ مِنْ اَجْرٍ اَوْ غَنِیْمَۃٍ اَوْ اُدْخِلَہُ الْجَنَّۃَ وَلَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِیْ مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَرِیَّۃٍ وَلَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ (بخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص کے لیے جو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلے اور اس کو جہاد کے مجھ پر ایمان لانے اور تمام پیغمبروں کی تصدیق ہی نے نکالا ہو۔ اس امر کا ذمہ دار ہوگیا ہے کہ یا تو اسے ثواب یا مالِ غنیمت کے ساتھ واپس کرے (جو اس نے جہاد میں پایا) یا اس کو شہید بنا کر جنت میں داخل کردے۔ اگر میں اپنی امت پر دشوار نہ سمجھتا تو کسی سریہ سے پیچھے نہ رہتا اور میں اس بات کو دوست رکھتا ہوں کہ راہِ خدا میں مارا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں۔

فوائد و مسائل

مِنْ اَجْرٍ اَوْ غَنِیْمَۃٍ میں اَوْ تردید احد الامرین کے لیے ہے اور معنی یہ ہوں گے کہ مجاہد اگر شہید ہوگیا تو اس کو اجر و ثواب ملے گا اور زندہ رہا تو اس کو غنیمت ملے گی حالانکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مجاہد کو ہر صورت میں ثواب ملتا ہے اس لیے علامہ طیبی نے فرمایا کہ اصل عبارتِ حدیث یوں ہوگی۔

مِنْ اَجْرٍ اَوْ اَجْرٍ وَّ غَنِیْمَۃٍ کہ مجاہد اگر شہید ہوجائے تو اس کو ثواب ملتا ہے اور اگر زندہ رہے تو ثواب کے ساتھ ساتھ اس کو مالِ غنیمت بھی ملتا ہے۔ گویا مِنْ اَجْرٍ اَوْ غَنِیْمَۃٍ کا لفظ محض اختصار کے لیے فرمایا گیا اور سامع پر اعتماد کیا گیا ہے کہ وہ اصل مفہوم کو خود سمجھ لے گا۔ فافہم

مجاہد کو بہر صورت ثواب ملتا ہے

الجہاد من الایمان کے معنیٰ یہ ہیں کہ جہاد بھی ایمان کی نشانی ہے انتدب اللہ کے معنیٰ دعا کی قبولیت کے ہیں گویا جب ایک مسلمان جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے جہاد کو قبول فرما کر ثوابِ جزیل عطا فرماتا ہے۔

سریہ لشکر کے ایک حصہ کو کہتے ہیں۔ خیر السرایا اربعۃ مائۃ رجل یعنی بہترین سریہ وہ ہے جس میں چار سو فوجی ہوں واقعدت خلف سریۃ حضور علیہ السلام یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میری آرزو تو یہی ہوتی ہے کہ ہر جہاد میں شریک ہوں مگر امت پر شفقت کی وجہ سے بعض سرایا میں شرکت نہیں فرماتا کیونکہ میری وجہ سے سب کو جہاد میں شریک ہونا پڑتا ہے۔

اس حدیث میں جہاد فی سبیل اللہ کی عظمت کا اظہار فرمایا گیا ہے اور یہ کہ جہاد کی تمنّا کرنا، شہادت فی سبیل اللہ کی آرزو رکھنا بڑی فضیلت کی بات ہے۔ اسی لیے فرمایا:-

نیۃ المؤمن ابلغ من عملہ | مومن کا کسی نیک کام کرنے کی نیت کرنا اس کے عمل سے بہتر ہے

ایماناً و احتساباً کی قید لگا کر یہ بتا دیا گیا کہ جہاد فی سبیل اللہ صرف یہ ہے کہ آدمی خلوصِ نیت کے ساتھ محض اللہ کے کلمہ کی بلندی کے لیے جہاد کرے اور اس میں کوئی دنیاوی غرض نہ ہو۔

مسائل حدیث جہاد فرض کفایہ ہے۔ فرض عین نہیں ہے۔ جب دو مصلحتیں متعارض ہوں تو اہم کو اختیار کرنا چاہیے اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعض سریوں میں اس لیے شمولیت نہیں فرماتے تھے کہ آپ کی وجہ سے سب کو شامل ہونا پڑتا ۲۔ جنت میں تو بہرحال تمام مسلمان داخل کیے جائیں گے لیکن شہید کو خصوصیت کے ساتھ جنتی اس لیے فرمایا کہ وہ بلاحساب کتاب سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگا۔ شہادت اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ شہادت تمام گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے مگر قرض کا نہیں یا یہ کہ مجاہد کی دو حالتیں ہوتی ہیں شہادت اور سلامت۔ شہادت کا ثواب جنت ہے اور سلامتی کی صورت میں اس کو غنیمت ملتی ہے اور لفظ او یہاں اس معنیٰ میں ہے کہ جو شخص جہاد میں سلامت رہے تو اس کو ثواب ملے گا یا غنیمت ملے گی لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غنیمت بھی ملے اور ثواب بھی یعنی لفظ او امتناع الخلوع مع امکان الجمع کے لیے ہو (عینی) ۳۔ اس حدیث کو امام نے کتاب الجہاد میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و نسائی نے بھی کتاب الجہاد میں ذکر فرمایا ہے۔

بَابٌ تَطَوُّعُ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنَ الْإِيمَانِ

باب رمضان کی راتوں میں نفل پڑھنا ایمان کی خصلت ہے

۳۶۔ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے رمضان میں قیام کیا ایمان اور خلوصِ نیت کے ساتھ تو اس کے اگلے گناہ معاف ہو جائیں گے

یہ گناہوں کی مغفرت اس شخص کے ہے جو رمضان کے مہینہ کے تمام روزے رکھے۔ کیونکہ جو رمضان کا ایک روزہ کم لے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس نے رمضان کے روزے رکھے ہیں۔ یہ خوشخبری اس شخص کے لیے بھی ہے جو بوجہ عذرِ شرعی رمضان المبارک کے روزے نہیں رکھ سکا۔ لیکن نیت اس کی یہی ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ نے اس کو شفا دی وہ ضرور چھوڑے ہوئے روزے رکھ لے گا۔ کیونکہ وہ مریض جو مرض کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھے تو اس کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا ثواب مل جاتا ہے (واللہ واسع علیم)

بَابُ الدِّيْنُ يُسْرٌ

باب دین آسان ہے

قَوْلُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ الدِّيْنِ اِلَى اللّٰهِ الْحَنِيْفِيَّةُ السَّمْحَةُ

حضور صلی اللہ علیہ نے نے فرمایا اللہ کو وہ دین پسند ہے جو حنیف اور سمحہ ہو۔ (بخاری)

فوائد و مسائل احب الدین کلام اضافی مبتدا ہے اور حنیفہ اس کی خبر ہے۔ حنیف کے معنیٰ باطل سے حق کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو حنیف اسی لیے کہتے ہیں آپ نے باطل

سے حق کی طرف میل فرمایا۔ ملۃ حنیفیہ سے ملۃ ابراہیمی مراد ہے جو آیہ مبارکہ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا سے ماخوذ ہے سمحہ کے معنیٰ آسان کے ہیں۔ مِلَّۃٌ سَمْحَۃٌ یعنی وہ دین جس میں حرج نہ ہو اور جس کے احکام پر چلنا انسان کے اختیار میں ہو علامہ عینی فرماتے ہیں۔ احب بمعنیٰ محبوب ہے اور اگر الف لام جنسی مانا جائے تو تقدیر عبارت یہ ہوگی۔ اَحَبَّ الْاَدْيَانِ اِلَى اللّٰهِ الخ اور ادیان سے شرائع ماضیہ مراد ہوں گی تو اب اَحَبُّ الدِّيْنِ کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ گزشتہ شریعتوں میں ان کے نسخ و تبدیل سے قبل دینِ اسلام ہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور اگر الف لام عہدی لیا جائے تو معنیٰ یہ ہوں گے کہ اللہ کو تمام خصالِ دینِ اسلام محبوب ہیں یعنی دینِ اسلام کے تمام کام اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں مگر ان میں وہ کام تو بہت پسند ہیں جو آسان ہیں۔

۲۔ واضح ہو کہ قرآن نے یہودیت و نصرانیت کو حنیفیہ کا مقابل ٹھہرایا جائے چنانچہ فرمایا:

قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصَارٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا (قرآن حکیم)

انھوں نے کہا یہودی یا نصرانی ہو جاؤ ہدایت پا جاؤ گے تم کہو نہیں بلکہ ملۃ ابراہیم حنیف کو اختیار کرو تو ہدایت پاؤ گے)

قرآن نے محرّف عیسائیت و نصرانیت کی مذمت کی ہے

اس موقع پر شبہ پیدا ہوتا ہے کہ توریت کے ماننے والے یہودی کہلاتے ہیں اور انجیل کو ماننے والے نصرانی۔ یہ دونوں کتابیں آسمانی ہیں وحی الٰہی ہیں تو پھر قرآن نے یہودیت و نصرانیت کی مذمت کیوں کی ہے اور اس کے مقابل دینِ حنیف اسلام کو قبول کرنے کی تاکید کی ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہود نے توریت میں اور نصاریٰ نے انجیل میں تغیر و تبدل کر دیا تھا۔ اس کے احکام میں کتر بیونت کر دی تھی۔ اس لحاظ سے یہودیت و نصرانیت نام ہے توریت محرّف اور انجیل محرّف کے متبعین کا اور قرآن شریف نے اسی مسخ شدہ نصرانیت و یہودیت کی مذمت فرمائی ہے۔ توریت و انجیل میں حضور ربِّ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر پاک، آپ کی تشریف آوری، آپ کی نبوت و رسالت کا ذکر تھا اور یہ ہدایت بھی موجود تھی کہ جب وہ آخری رسول علیہ السلام تشریف لے آئیں تو ان پر ایمان لے آنا اور ان کی شریعت کو قبول کر لینا لیکن یہود و نصاریٰ نے نہ صرف ان پیشگوئیوں کو ان کتابوں سے خارج کر دیا بلکہ ان کتب میں مسطور احکام کو بھی بدل دیا اور اب یہ لوگ نرے توریت محرّف اور انجیل محرّف کے متبع رہ گئے۔ قرآن نے ایسی محرّف دین کی مذمت فرمائی ہے اور پھر اس حقیقت کا اعلان بھی کیا کہ یہ تمام انبیا۔ اس دینِ حنیف اسلام کے پیرو تھے اور اسی کی تبلیغ فرماتے تھے۔

۳۸۔ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ وَلَنْ يُّشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاَبْشِرُوْا وَاسْتَعِيْنُوْا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِّنَ الدُّلْجَةِ

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک دینِ اسلام آسان دین ہے اور جو بھی اس میں سختی کرے گا تو یہ اس پر غالب آجائے گا تو میانہ روی اختیار کرو اور نزدیک رہو اور ثواب کی بشارت دیتے رہو اور غدوہ، روحہ اور دلجہ سے مدد لو۔

فوائد و مسائلِ حدیث ۱۔ امام نے اس حدیث کو کتاب الرقاق میں بھی ذکر کیا ہے اور نسائی نے بھی اس کو روایت کیا

ہے ۲۔ یشاد، مشادہ ۔اس کے معنیٰ "مبالغہ" یعنی ایک دوسرے پر غالب آنے کے ہیں ۔مطلب یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ میں اس قدر غلو اور زیادتی نہ کی جائے کہ آدمی پر بوجھ بن جائے اور اس طرح وہ اعمالِ صالحہ جاری نہ رکھ سکیں ۔ فسددوا، تسدید کے معنی میانہ روی کے ہیں یعنی صحیح طریقہ پر کسی کام کا کرنا اور عبارت میں صحیح طریقہ یہی ہے کہ افراط و تفریط سے بچا جائے۔ قاربوا کے معنیٰ یہ ہیں کہ آخری حد تک نہ جاؤ بلکہ وسط کو اختیار کرو والبشروا کے معنیٰ یہ ہیں کہ اعمال پر جو ثواب مقرر ہے اگرچہ کم ہی ہو ۔اس کی لوگوں کو بشارت دو ۔عدوہ صبح کے وقت چلنا ۔ دوحہ شام کے وقت چلنا ۔ دلجہ رات کے آخری حصہ میں چلنے کو کہتے ہیں ۔ تو جیسے مسافر اگر کچھ صبح کے وقت پہلے پھر شام کو پھر سحر کے وقت چلے تو ایسی معتدل رفتار سے وہ اپنا سفر بھی آسانی سے پورا کرلے گا اور منزل پر بھی پہنچ جائیگا ۔ برخلاف اس مسافر کے جو دن رات چلنا شروع کردے تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ تھک کر بیٹھ جائیگا نہ اس کا سفر پورا ہوگا اور نہ اس کو منزل ہاتھ آئیگا ۔یہی حال عبادات کا ہے ۔اس کو میانہ روی کے ساتھ جاری رکھنا چاہیئے۔

مفہومِ حدیث یہ ہے کہ جو فرائض و واجبات اللہ تعالےٰ نے مقرر فرما دیئے ہیں وہ تو بہر صورت ادا کرنے ہی ہیں لیکن اس سے زائد عبادت اور نیک کام کوئی شخص کرنا چاہے تو اس میں شدت و سختی کو اختیار نہ کرے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کام بوجھ بن جائیگا اور زیادہ عمل کے شوق میں کم سے بھی دستبردار ہونا پڑیگا ۔ اس لیے آدمی کو چاہیئے کہ وہ نیک کاموں کے کرنے میں میانہ روی اختیار کرے تاکہ وہ جاری رہیں ۔اللہ تعالےٰ کا حق بھی ادا کرے اور بندوں کے حقوق کا بھی خیال رکھے ۔اسی لیے ایک دوسری حدیث میں فرمایا ۔ کلفوا من العمل ما تطیقون نیک کام اتنے ہی کرو جس کی تم میں طاقت ہو اور اسی ہدایت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے جس کے لفظ یہ ہیں ۔ احب الدین الی اللہ ادومہ جو آگے آرہی ہے۔

توضیح اس موقع پر یہ کہنا کہ حدیثیں دو ہیں ۔ ایک وہ جس کو امام بخاری نے عنوان کے طور پر ذکر کیا ہے ۔جس کے لفظ یہ ہیں احب الدین الی اللہ الحنیفۃ السمحۃ اور دوسری حدیث وہ ہے جو الدین یسر سے شروع ہوتی ہے ۔خیال یہ ہے کہ دوسری حدیث کا ترجمۃ الباب والی حدیث سے تعلق نہیں ہونا چاہیئے اور دونوں کا مفہوم و معنیٰ جدا جدا ، یعنی احب الدین میں الف لام جنسی ہے اور احب اسم تفضیل کا صیغہ ہے ۔معنیٰ حدیث یہ ہیں کہ تمام شرائع سابقہ میں ان کی تنسیخ سے قبل اللہ تعالےٰ کو سب سے زیادہ دینِ حنیفِ اسلام ہی پسند ہے اور دوسری حدیث الدین یسر میں الف لام عہدی ہے اور اس سے مراد صرف دینِ اسلام ہے اور معنیٰ حدیث یہ ہیں کہ دینِ اسلام ایک ایسا دین ہے جس کے احکام انسان کی وسعت و اختیار کے مطابق ہیں ۔ اس کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو انسان کی قدرت سے باہر ہو ۔ لہذا جب بات یہ ہے تو دین میں سختی نہیں کرنی چاہیئے اور جن امور میں شارع نے رخصت دی ہے ۔ اس کو قبول کرنا چاہیئے ۔مثلاً اگر بوجہ مرض کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھی جاسکتی تو بیٹھ کر پڑھ لینی چاہیئے ۔ یہ نہ کہا جائے کہ چاہے مرض زیادہ ہو ، تکلیف انتہا کو پہنچ جائے ۔ پھر بھی کھڑے ہوکر ہی نماز پڑھی جائے ۔ اسی لیے اس کے بعد فرمایا ۔ لن یشاد الدین جو شخص شارع کی دی ہوئی رخصت سے کام نہیں لیتا اور اس میں سختی کرتا ہے تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ احکامِ شریعت اس پر بار ہوجائیں گے ۔

بَابُ الصَّلٰوۃِ مِنَ الْاِیْمَانِ

باب نماز بھی ایمان سے ہے

وَقَوْلُ اللّٰہِ تَعَالٰی وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَکُمْ یَعْنِیْ صَلٰوتَکُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ (بخاری)

اور اللہ عزوجل نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں۔ ایمان سے مراد وہ نماز ہے جو بیت اللہ کے پاس اور بیت المقدس کی طرف پڑھی جائے

۱۔ نماز بھی ایمان ہے۔ یعنی نماز دینِ اسلام کا ایک رکنِ عظیم ہے۔ آیت میں جو نماز پر ایمان کا اطلاق آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز ایمان کا شعبہ اور اس کی نشانی ہے۔ ۲۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کعبہ ابراہیمی قبلہ مقرر ہوگیا تو سوال ہوا کہ جن لوگوں نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ان کی نمازوں کا کیا ہوا؟ جواب میں یہ آیہ مبارکہ نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ ان کی نمازیں بھی ضائع نہیں ہوئیں؟

قیامِ مکّہ کے دوران قبلہ کس سمت تھا؟

اس میں اختلاف ہے کہ مکہ کے قیام کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کس طرف پڑھتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ قیامِ مکہ کے دوران بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی جاتی تھی۔ پھر جب آپ مدینہ ہجرت کرکے تشریف لائے تو کعبہ ابراہیمی ہمیشہ کے لیے قبلہ مقرر ہوگیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قیامِ مکہ میں کعبہ کی طرف نماز پڑھی جاتی تھی۔ پھر جب آپ ہجرت فرماکر مدینہ آگئے تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی گئی۔ اس کے بعد کعبہ ابراہیمی مقرر ہوا۔ علماء فرماتے ہیں۔ یہ دوسرا قول ضعیف ہے۔ نیز اس قول کی بنار پر دوبارہ نسخ قبلہ لازم آتا ہے۔ لہذا صحیح قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ قیامِ مکہ کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے مگر کعبہ ابراہیمی کی طرف پیٹھ نہیں کرتے تھے بلکہ کعبہ ابراہیمی کو اپنے اور بیت المقدس کے بیچ میں کر لیتے تھے۔ امام بخاری نے عند البیت کہہ کر اصح قول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ معنی یہ ہیں۔ یہ نمازیں کعبہ ابراہیمی کے پاس اور بیت المقدس کی طرف تھیں اور امام بخاری کا عند البیت پر اکتفا فرمانا اس لیے اولیٰ ہے کہ اس سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ نماز جو بیت اللہ کے پاس اور بیت المقدس کی طرف تھی ضائع نہ ہوئی تو وہ بطریقِ اولیٰ ضائع نہ ہوں گی جو بیت اللہ سے دُور اور اس کی طرف پڑھی جائیں۔ تقدیرِ عبارت یوں ہوگی۔

صَلٰوتُکُمُ الَّتِیْ صَلَّیْتُمُوْھَا اِلٰی بَیْتِ الْمَقْدِسِ عِنْدَ الْبَیْتِ اَیِ الْکَعْبَۃِ (عینی جلد ۱ ص ۲۶۹)

وہ نمازیں جو بیت اللہ (کعبہ) کے پاس اور بیت المقدس کی طرف پڑھی گئیں ضائع نہیں ہوئیں۔

تحویلِ قبلہ کی حکمت

واضح ہو تحویلِ قبلہ میں متعدد حکمتیں تھیں۔ لیکن قرآن نے اس کی تین حکمتیں بڑی واضح طور پر بیان کی ہیں۔ پہلی حکمت قرآن نے یہ بیان کی کہ اللہ تعالیٰ حاکمِ مطلق ہے اور مسلم کا کام صرف یہ ہے کہ حکمِ الٰہی کو بجا لائے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے قبلہ بدل دیا تو اس میں اعتراض کی کیا گنجائش؟ دوسری حکمت یہ بتائی کہ قبلہ میں تبدیلی اس وجہ سے بھی ہوئی تاکہ مومن و کافر میں فرق ہوجائے اور معلوم ہوجائے کہ کون رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتا ہے اور کون نہیں کرتا جس سے واضح ہوا کہ قرآن حکیم نے اتباعِ نبوی کے عقیدہ کو کفر و اسلام کی کسوٹی

قرار دیا ہے یعنی جو لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع و اطاعت کو ضروری جانتے ہیں اور حضور علیہ السلام کے اقوال و افعال کی پابندی کو اسلام سمجھتے ہیں وہی مومن ہیں اور جن کا عقیدہ یہ نہیں ہے وہ کافر و منافق ہیں۔ تیسری حکمت قرآن شریف نے یہ بتائی کہ تحویلِ قبلہ سے نبوت کی عظمت اور حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کا اظہار مقصود ہے کہ یہ وہ ہستی مقدس ہیں جن کی رضا جوئی اللہ عز وجل کو مطلوب ہے۔ یہ تینوں حکمتیں قرآن نے واضح لفظوں میں بیان کی ہیں۔

۱۔ سیقول السفہاء من الناس ما ولّٰھم الخ اس آیت میں تحویلِ قبلہ پر نکتہ چینیاں کرنے والوں کو بتایا گیا ہے کہ تمہاری یہ نکتہ چینی بے وقوفی ہے کیونکہ اللہ عز وجل حاکم مختار ہے جسے چاہے قبلہ بنائے کسی کو کیا جائے اعتراض ہے بندے کا کام فرمانبرداری ہے۔

۲۔ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا الخ اس آیت میں یہ بتایا گیا کہ تحویلِ قبلہ کی حکمت یہ ہے کہ کافر و مومن میں فرق ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ کونسا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے اور کون اتباعِ نبوی سے انکار کرتا ہے۔ یعنی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا اعتقاد رکھے وہ مومن ہے اور جو اتباعِ نبوی کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو مومن تھے انہوں نے حضور علیہ السلام کا اتباع کیا اور کفار و مشرکین و منافقین نے اتباع کی بجائے اعتراضات شروع کر دیئے۔

۳۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ الخ اس میں یہ بتایا گیا کہ کعبہ ابراہیمی کو قبلہ اس لیے مقرر کیا گیا کہ ہمارے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قبلہ بنائے جانے کو پسند فرماتے تھے۔ اس لیے ہم نے اپنے محبوب رسول کی مرضی پوری کر دی اور کعبہ ابراہیمی کو قبلہ بنا دیا تاکہ محبوب کی مرضی پوری ہو۔

یاد رہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی اپنی مرضی کا اظہار زبان سے نہیں فرمایا تھا بلکہ صرف قلب مبارک میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کعبہ ابراہیمی قبلہ ہو جائے اور اللہ عز وجل نے فرمایا۔ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا۔ ہم تمہیں پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری خوشی ہے۔ پھر مسجد حرام کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا او حیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ اے مسلمانو! تم جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف (کعبہ کی طرف) کرو۔ کیونکہ اسی میں میرے محبوب رسول کی خوشی ہے اور اس کی خوشی میری خوشی ہے۔

۳۹۔ عَنِ الْبَرَاءِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ نَزَلَ عَلٰى اَجْدَادِهٖ اَوْ قَالَ اَخْوَالِهٖ مِنَ الْاَنْصَارِ وَاَنَّهٗ صَلّٰى قِبَلَ بَيْتِ الْمُقَدَّسِ سِتَّةَ عَشَرَ شَهْرًا اَوْ سَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا وَ كَانَ يُعْجِبُهٗ اَنْ تَكُوْنَ قِبْلَتُهٗ قِبَلَ الْبَيْتِ وَاَنَّهٗ صَلّٰى اَوَّلَ صَلٰوةٍ صَلَّاهَا صَلٰوةَ الْعَصْرِ

حضرت براء سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلے پہل مدینہ تشریف لائے تو آپ نے انصار میں سے اپنے ننھیال یا ماموؤں کے ہاں قیام فرمایا اور حضور علیہ السلام نے نماز پڑھی۔ سترہ مہینہ یا سولہ مہینہ تک بیت المقدس کی طرف اور آپ کی خواہش یہ تھی کہ آپ کا قبلہ کعبہ ہو اور سب سے پہلی نماز جو آپ نے کعبہ ابراہیمی کی طرف پڑھی وہ عصر کی نماز تھی جو آپ کے ساتھیوں نے بھی آپ کے ساتھ پڑھی

وَصَلّٰی مَعَهٗ قَوْمٌ فَخَرَجَ رَجُلٌ مِّمَّنْ صَلّٰی مَعَهٗ فَمَرَّ عَلٰی اَهْلِ مَسْجِدٍ وَّهُمْ رَاكِعُوْنَ فَقَالَ اَشْهَدُ بِاللّٰهِ لَقَدْ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قِبَلَ مَكَّةَ فَدَارُوْا كَمَا هُمْ قِبَلَ الْبَيْتِ وَكَانَتِ الْيَهُوْدُ قَدْ اَعْجَبَهُمْ اِذْ كَانَ يُصَلِّيْ قِبَلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ وَاَهْلُ الْكِتٰبِ فَلَمَّا وَلّٰى وَجْهَهٗ قِبَلَ الْبَيْتِ اَنْكَرُوْا ذٰلِكَ قَالَ زُهَيْرٌ حَدَّثَنَا اَبُوْ اِسْحٰقَ عَنِ الْبَرَآءِ فِيْ حَدِيْثِهٖ هٰذَا اَنَّهٗ مَاتَ عَلَى الْقِبْلَةِ قَبْلَ اَنْ تُحَوَّلَ رِجَالٌ وَّقُتِلُوْا فَلَمْ نَدْرِ مَا نَقُوْلُ فِيْهِمْ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى (بخاری)

تو ان میں سے ایک شخص ایک مسجد پر گزرے جس میں لوگ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہے تھے اور وہ رکوع میں تھے تو انہوں نے کہا خدا کی قسم میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ کعبہ ابراہیمی کی طرف منہ کرکے نماز پڑھی ہے۔ یہ سن کر ان لوگوں نے نماز ہی میں رہتے ہوئے کعبہ ابراہیمی کی طرف منہ کر لیا اور حضور علیہ السلام کا بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا یہود و نصاریٰ کو بھی پسند تھا مگر جب آپ نے قبلہ ابراہیمی کو قبلہ بنالیا تو یہود اہل کتاب کو ناگوار ہوا۔ زہیر نے کہا ہم نے حدیث بیان کی۔ ابو اسحاق سے انہوں نے براء سے سنا کہ تحویل قبلہ سے پیشتر کچھ لوگ وفات پاگئے اور شہید ہوگئے تھے تو ہم نہیں جانتے تھے کہ ان کے حق میں کیا کہیں۔ اس پر آیت نازل ہوئی۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے تفسیر اور صلوٰۃ میں بھی ذکر کیا ہے۔ اس طرح مسلم، ترمذی و نسائی نے بھی تفسیر اور صلوٰۃ کے باب میں اس حدیث کو درج کیا ہے ۲۔ یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ اس میں تو کوئی خفا نہیں تھا۔ کسی کام کو اس کے منسوخ ہونے سے قبل کیا جائے تو وہ مقبول ہے۔ پھر صحابہ کرام نے یہ سوال کیوں کیا کہ جن لوگوں نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ان کا کیا حکم ہے جواب یہ ہے کہ تحویلِ قبلہ اسلام میں سب سے پہلا نسخ تھا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام اس مسئلہ سے واقف نہ تھے۔ اس لیے انہوں نے سوال کیا ۳۔ قیامِ مکہ کے دوران حضور علیہ السلام بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے۔

۔ پھر جب آپ مدینہ شریف ہجرت فرما کر تشریف لے آئے تو آپ کی حسب خواہش کعبہ ابراہیمی قبلہ مقرر ہوا۔

۴۔ سب سے پہلی نماز جو آپ نے کعبہ ابراہیمی کی طرف مکمل طور پر پڑھی۔ وہ عصر کی نماز تھی جو مسجد نبوی میں پڑھی گئی تھی۔ بعض کی روایات میں جو آیا ہے کہ سب سے پہلی نماز کعبہ ابراہیمی کی طرف ظہر پڑھی گئی۔ لیکن اس کی صورت یہ تھی کہ آپ نے ظہر کی دو رکعتیں ہی پڑھی تھیں کہ تحویلِ قبلہ کا حکم آگیا اور آپ نے نماز ہی میں کعبہ ابراہیمی کی طرف منہ کر لیا۔ گویا ظہر کی نماز کی دو رکعتیں بیت المقدس کی طرف اور دو رکعتیں کعبہ ابراہیمی کی طرف پڑھی گئیں۔ وہ ظہر کی نماز تھی (بیضاوی شریف)

دو قبلوں والی مسجد "مسجد بنی سلمہ" تھی (کما فی البیضاوی)

۳۔ اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ احکام میں نسخ کا جواز ثابت ہوا ۲۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ قرآن حکیم سے سنت کا نسخ ہو سکتا ہے ۳۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ نماز میں کعبہ ابراہیمی کی طرف منہ کرنا ضروری ہے ۴۔ یہ کہ خبرِ واحد واجب العمل ہے۔ چنانچہ عبادہ بن صامت کی خبر پر

صحابہ کرام نے اعتماد کیا اور جب انھوں نے کہا کہ میں حضور علیہ السلام کے ساتھ کعبہ ابراہیمی کی طرف نماز پڑھ کر آ رہا ہوں۔ تو وہ نماز ہی میں کعبہ ابراہیمی کی طرف پھر گئے۔ خبرِ واحد کے مقبول ہونے کی دلیل یہ بھی ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ایک صحابی کو کسی قبیلہ کی طرف احکامِ اسلامیہ کی تبلیغ کے لیے روانہ فرماتے تھے اور لوگ صرف ایک مبلّغ سے احکام اسلامیہ سُن کر اس پر عمل کرتے تھے ۵۔ یہ کہ اگر نماز میں یہ معلوم ہو جائے کہ قبلہ دوسری طرف ہے تو اسی طرف پھر جانا چاہیئے ۶۔ یہ کہ اگر قبلہ معلوم نہ ہو تو پھر انسان خود اپنے دل سے فیصلہ کرے اور جدھر دل جم جائے اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھے۔ پھر اگر نماز کے بعد غلطی معلوم ہو جائے تو نماز کے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے ۷۔ یہ کہ قبلہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں اگر اجتہاد کی بنا پر چاروں سمتوں کی طرف بھی نماز پڑھی تو وہ ہو گئی۔ اس لیے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے ۸۔ اسی حدیث سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے فضل و شرف اور آپ کے مرتبہ و مقام پر روشنی پڑتی ہے کہ ابھی آپ نے اپنی خواہش کا زبان سے اظہار نہ فرمایا تھا کہ اللہ عزّوجل نے آپ کی خواہش کو پورا کر دیا اور کعبہ ابراہیمی کو حضور علیہ السلام کی رضا جوئی کے لیے ہمیشہ کے لیے قبلہ مقرر فرما دیا ۹۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جن لوگوں نے بیت المقدس کی طرف نمازیں پڑھیں اور وہ وفات بھی پا چکے ان کی نمازوں کا کیا حکم ہے؟ تو اس پر آیۂ مذکورہ بالا نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ ان کی نمازیں مقبول ہیں۔ یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ سوال میں صرف اموات کو کیوں خاص کیا گیا۔ حالانکہ یہ سوال زندہ و مردہ سب کے ساتھ متعلق ہے۔ جواب اس کا مجھے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگرچہ اس سوال کا تعلق زندہ و مُردہ دونوں سے ہے۔ مگر اموات کے متعلق شاید اس خیال سے کیا گیا کہ وہ اب مکلّف نہیں رہے اور جو نمازیں انہوں نے بیت المقدس کی طرف پڑھیں اگر وہ نامقبول ہوئیں تو اس کی تلافی اب ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔ برخلاف زندوں کے کہ وہ نمازوں کا اعادہ کر کے بھی اس کی تلافی کر سکتے تھے اس لیے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سوال اُٹھا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس نام کا صحابہ میں اور کوئی ان کے سوا نہیں آیا۔ آپ جلیل القدر صحابی ہیں۔ خندق اور اس کے بعد کے تمام مشاہد میں حضور علیہ السلام کے ہمراہ رہے۔ آپ نے ۲۴ھ میں رے کو فتح کیا اور حضرت ابوموسیٰ کے ہمراہ غزوۂ تستر میں شریک ہوئے۔ آپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے ہمراہ بھی مشاہد میں شریک ہوئے۔ آپ نے کوفہ میں بزمانہ مصعب بن زبیر وصال فرمایا۔ آپ سے ایک کثیر جماعت نے روایت کی ہے۔ آپ کے والد عازب بھی صحابی ہیں۔ آپ سے ۲۰۵ حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے ۲۲ حدیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا اور ۱۵ حدیثیں صرف بخاری نے اور ۱۲ حدیثوں کو صرف مسلم نے منفرداً ذکر کیا۔

بَابُ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ

باب اسلام کے حُسن کے بیان میں

۴۰۔ اَنَّ اَبَا سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيَّ اَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا اَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ اِسْلَامُهٗ يُكَفِّرُ اللّٰهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ

ابوسعید خدری نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ جب آدمی اسلام قبول کرے اور پھر اس کا اسلام اچھا ہو (یعنی وہ احکام اسلامیہ پر عمل کرے) تو سب وہ گناہ جو اسلام سے قبل اس نے کیے اللہ تعالےٰ معاف

كَانَ زَلَفَهَا وَ كَانَ بَعْدَ ذَالِكَ الْقِصَاصُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِمَائَةِ ضِعْفٍ وَالسَّيِّئَةُ بِمِثْلِهَا اِلَّا اَنْ يَّتَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهَا (بخاری)

فرما دے گا۔ اس کے بعد حساب شروع ہوگا۔ ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ سات سو نیکیاں تک بلکہ اس سے بھی دو چند اور ایک بُرائی کے بدلے ایک بُرائی لکھی جائے گی اِلّا یہ کہ اللہ تعالےٰ (اپنے فضل سے) اس بُرائی کو بھی معاف فرمادے (یعنی جو گناہ اللہ تعالےٰ معاف فرمادے وہ لکھا ہی نہ جائیگا)

لُغاتِ حدیث

فحسن اسلامہ۔ حسنِ اسلام کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس نے ظاہراً و باطناً ہر طرح اسلام کو قبول کرلیا یعنی حقیقی معنوں میں مسلمان ہوگیا یا اس کے معنی وہ ہیں جو حدیثِ جبریل میں آئے ہیں۔ الاحسانُ تعبد اللہ کاَنَّکَ تَرَاہُ۔ احسان یہ ہے کہ تو خدا کو اس تصوّر سے پُوجے کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عبادات وطاعات میں انتہائی خلوص ہو اور احکامِ شرعیہ پر کاربند ہوجائے۔ یکفر اللہ تکفیر کے معنیٰ چھپانے کے ہیں یعنی گناہوں کو مٹا دینا اور اس کی جگہ ثواب عطا فرمانا۔ کان زلفا۔ زلف کے معنیٰ تقدیم کے ہیں۔ معنیٰ یہ ہوں گے کہ جو گناہ اس نے اسلام لانے سے پہلے کیے۔ القصاص کے معنیٰ شے کا مقابلہ شے کے ساتھ۔ یعنی ہر عمل کی جزا دی جائے گی۔ اچھے ہوں گے تو ثواب دیا جائیگا۔ بُرے ہوں گے تو اس کے مقابل میں عذاب ہوگا۔ جوہری نے کہا کہ ضعف کے معنیٰ مثل کے ہیں ضعف الشی مثلہ لیکن ازہری کہتے ہیں۔ ضعف کے معنیٰ کم از کم دُگنے کے ہیں اور زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ یعنی دُگنا، سہ گنا، چہار گنا۔ اسی لیے قرآن حکیم میں آیا۔ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا۔ یہاں ضعف سے مراد اضعاف ہے تو معلوم ہوا کہ کم از کم ضعف کے معنیٰ دُگنے کے ہیں اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔

مسائلِ حدیث

حدیثِ ہٰذا سے ذیل کے مسائل پر روشنی پڑتی ہے ۱۔ اسلام لانے کے بعد گزشتہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں ۲۔ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ہوتا ۳۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ گناہ کی سزا دے یا معاف فرمادے ۴۔ مومن سے اگر گناہ ہوجائے تو اس کے نامۂ اعمال میں صرف ایک ہی گناہ لکھا جائیگا۔ اِلّا یہ کہ گناہ اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے معاف فرمادے ۵۔ مومن جب ایک نیکی کرنے گا تو اس کے نامۂ اعمال میں ۱۰ سے لے کر ۷۰۰ تک نیکیاں لکھی جائینگی بلکہ اس کا بھی دُگنا ثواب عطا کیا جائیگا۔

ایک نیکی کا اجر دس گُنا ملتا ہے

یہ بات قرآنِ حکیم کی متعدد آیات سے ثابت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔ جو اللہ تعالےٰ کے حضور ایک نیکی لے کر آئیگا اس کے لیے ۱۰ گُنا اجر ہے اور جو بدی لے کر آئیگا تو اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائیگا جتنا کہ اس نے قصور کیا ہے (سورہ انعام) سورہ نساء میں فرمایا۔ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ تعالےٰ اسے دو چند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نیکی سے کوئی خاص نیکی مراد نہیں بلکہ اس کو مطلق رکھا گیا ہے کہ کم سے کم درجہ کی نیکی کا ثواب بھی اللہ تعالےٰ اپنے فضل و کرم سے دُگنا عطا فرماتا ہے بلکہ اتنا عطا فرماتا ہے کہ بندے کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر حیرانی کا اظہار کیا

جائے۔ اللہ تعالیٰ رب کریم ہے۔ اس کے اختیار میں ہے کہ اپنے بندوں کی جس نیکی کا چاہے ثواب عظیم عطا فرمائے۔ منکرین حدیث کا ان احادیث پر اعتراض کرنا اور یہ کہنا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا ملے در اصل قرآن پاک پر اعتراض ہے۔ حدیث نے تو وہی بات بیان کی ہے جس کا اظہار قرآن پاک نے کیا ہے۔

نوٹ: ۱۔ اس حدیث کے بعد امام نے جو حدیث ذکر کی ہے گو دونوں کے متن اور اسناد میں فرق ہے مگر مفہوم دونوں حدیثوں کا ایک ہے اس لیے ہم نے یہاں نہیں لکھی ۲۔ اس حدیث کو مسلم و بزار و بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔

بَابٌ اَحَبُّ الدِّیْنِ اِلَی اللّٰہِ

باب اس امر کے بیان میں کہ اللہ تعالیٰ کو وہ عمل بہت

۴۱۔ اَدُوْمُہٗ عَنْ عَائِشَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَیْھَا وَعِنْدَھَا امْرَاَۃٌ قَالَ مَنْ ھٰذِہٖ قَالَتْ فُلَانَۃٌ تَذْکُرُ مِنْ صَلَاتِھَا قَالَ مَہْ عَلَیْکُمْ بِمَا تُطِیْقُوْنَ فَوَاللّٰہِ لَا یَمَلُّ اللّٰہُ حَتّٰی تَمَلُّوْا وَکَانَ اَحَبُّ الدِّیْنِ اِلَیْہِ مَا دَاوَمَ عَلَیْہِ صَاحِبُہٗ۔

(بخاری)

پسند ہے جو ہمیشہ کیا ہے۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ نے فرمایا۔ یہ کون ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا یہ فلاں عورت ہے۔ پھر انہوں نے اس عورت کی عبادت کا حال بیان کیا (یہ نوافل بہت پڑھتی ہے) اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا چھوڑو۔ تم اتنا ہی عمل کرو جس کی تم طاقت رکھتے ہو۔ بخدا اللہ تعالیٰ عطا فرمانے سے تھکتا نہیں۔ حتیٰ کہ تم خود ہی تھک جاؤ گے اور حضور علیہ السلام کو وہ عمل بہت پسند تھا جس کا ذکر کرنے والا اسے ہمیشہ کرے۔

۱۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اس حدیث کو کتاب الصلوٰۃ میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و مالک نے بھی اس کو روایت کیا ہے ۲۔ احب الدین میں دین سے مراد طاعات ہیں یعنی بہترین طاعت وہ ہے جو ہمیشہ کی جائے۔ لا یمل۔ ملال کے لغوی معنے گھبراہٹ کے ہیں اور اللہ تعالیٰ گھبراہٹ سے پاک ہے۔ در اصل یہاں ملال کا اطلاق بطور مقابلہ مجازاً ہے جیسے فرمایا۔ جزاءُ سیئۃ سیئۃ مثلھا۔ مطلب حدیث یہ ہے کہ آدمی خواہ کتنی ہی نیکیاں کرے۔ رب العزت جل مجدہٗ کو اس کی ان نیکیوں کے ثواب عطا فرمانے میں کوئی دقت نہ ہوگی مگر اپنی طاقت سے زیادہ عمل کرنے والا بالآخر خود ہی گھبرا جائیگا۔ اور اس کو جاری نہ رکھ سکے گا۔ مفہوم حدیث یہ ہے کہ آدمی کو چاہیئے کہ عبادت میں میانہ روی اختیار کرے اور اتنا ہی عمل کرے جس کو آسانی کے ساتھ ہمیشہ کر سکے کیونکہ تھوڑا عمل جو ہمیشہ کیا جائے وہ اس عمل سے بہتر ہے جو انسان ہمیشہ نہ کر سکے کیونکہ زیادہ کے لالچ میں تھوڑے کو بھی چھوڑنے پر مجبور ہو جائیگا۔ اسی کو امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مثال دے کر یوں سمجھایا ہے کہ جب پتھر پر پانی قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے تو سوراخ کر دیتا ہے۔ برخلاف یکدم اگر پانی گر جائے تو اثر تک بھی نہیں ہوتا۔

بَابُ زِیَادَۃِ الْاِیْمَانِ وَنُقْصَانِہٖ

باب اس امر کے بیان میں کہ ایمان کم اور زیادہ ہوتا ہے

وَقَوْلِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ زِدْنَاھُمْ ھُدًی | (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۱۔ ہم نے ان کو ہدایت زیادہ کی

وَيَزْدَادُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِيْمَانًا وَقَالَ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ فَاِذَا تَرَكَ شَيْئًا مِنَ الْكَمَالِ فَهُوَ نَاقِصٌ (بخاری)

۲۔ اور فرمایا زیادہ ہو ایمان والوں کا ایمان ۳۔ اور فرمایا آج کے دن ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا) لہٰذا جب کمال میں سے کوئی چیز چھوڑی تو وہ ناقص ہے۔

توضیح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ ایمان کم اور زیادہ ہوتا ہے۔ پہلی دو آیتوں سے وہ یہ استدلال فرماتے ہیں کہ ایمان میں زیادتی ہوتی ہے اور تیسری آیت سے ان کا استدلال یہ ہے کہ ایمان کم بھی ہوتا ہے لیکن امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا مسلک یہ ہے کہ ایمان محض تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور یہ کمی و زیادتی کو قبول نہیں کرتا جس کی بقدرِ ضرورت تفصیل کتاب الایمان میں گزر چکی ہے۔ قارئین وہاں مطالعہ کریں۔

آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کی تفسیر

یہ عرفہ کے روز جو جمعہ کو تھا بعد عصر نازل ہوئی۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ سے متعلق مفسرین کے متعدد قول ہیں۔

۱۔ یہ کہ دین کے اکمال کے معنیٰ یہ ہیں کہ دین پچھلی شریعتوں کی طرح منسوخ نہ ہوگا اور قیامت تک باقی رہے گا ۲۔ یہ کہ امورِ تکلیفیہ میں حرام و حلال کے جو احکام ہیں وہ اور قیاس کے قانون سب مکمل کر دیئے۔ اسی لیے اس آیت کے بعد بیانِ حلال و حرام کی کوئی آیت نازل نہیں ہوئی ۳۔ یہ کہ اکمالِ دین کے معنیٰ دینِ اسلام کو غالب کرنا ہے۔ جس کا اثر یہ ہے کہ حجۃ الوداع میں جب یہ آیت نازل ہوئی۔ کوئی بھی مشرک مسلمانوں کے ساتھ حج میں شریک نہ ہوسکا۔

۴۲۔ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَفِيْ قَلْبِهٖ وَزْنُ شَعِيْرَةٍ مِنْ خَيْرٍ وَيُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَفِيْ قَلْبِهٖ وَزْنُ بُرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ وَيُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَفِيْ قَلْبِهٖ وَزْنُ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ (بخاری)

حضرت انس سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوزخ سے وہ سب لوگ نکالے جائیں گے جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور ان کے دل میں جو کے برابر بھی خیر ہے۔ پھر وہ لوگ بھی نکال لیے جائیں گے جنہوں نے لا الٰہ اللہ کہا اور ان کے دل میں گیہوں کے دانے کے برابر بھی خیر ہے اور اس کے بعد وہ لوگ بھی نکال لیے جائیں گے جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور ان کے دل میں ذرہ برابر بھی خیر ہے۔

توضیح وتشریح حدیثِ ہٰذا کو امام نے کتاب التوحید میں بھی ذکر کیا اور امام نے ایمان میں اور ترمذی نے باب صفۃ الجنۃ میں ذکر فرمایا ۲۔ چار ذرّے رائی کے ایک دانہ کے برابر ہونے ہیں۔ خوب یاد رکھیے کہ ذرہ کے معنیٰ بعض لوگوں نے ایسے لفظوں سے کئے ہیں کہ پڑھنے والا اس شبہ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ذرہ کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے بلکہ وہ محض ایک ہوائی اور موہوم مقدار ہے۔ جیسے بعض نے لکھا ہے کہ ذرّہ جو کے ایک ہزار چوبیسویں حصہ کو کہتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ان تعبیرات سے ان کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ذرّہ شی کے قلیل و صغیر حصہ کو کہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ

اس کا تعین و تصور اور مشاہدہ ذہنِ انسانی کے لیے ممکن ہی نہ ہو۔ سوئی کی نوک مقابلۃً کتنی ہی صغیر ہے مگر ذہن و قلب کے لیے اس کے وجود کا احساس اور بصیرت کے لیے اس کا مشاہدہ ممکن ہے۔ رائی کا دانہ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہی کیوں نہ ہو مگر وجود کا ایک غیر مشکوک اور ٹھوس تصور رکھتا ہے۔ اسی طرح ذرہ ایک ہوائی مقدار کا نام نہیں ہے بلکہ وہ اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ فافہم۔

حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی روایت میں خیر کی جگہ ایمان کا لفظ آیا ہے۔ نیز دیگر روایات میں مَا يَزِنُ ذَرَّةً مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنَ الْخَيْرِ مَا يَزِنُ بُرَّةً کے الفاظ بھی آئے ہیں جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا ۲۔ گیہوں کے دانہ کے برابر ایمان ہوگا۔ رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہوگا اس کی بالآخر نجات ضرور ہوگی ۳۔

امام نے اس حدیث کے ظاہری الفاظ لے کر یہ استدلال فرمایا ہے کہ جَو کا وزن گیہوں کے دانے سے اور گیہوں کے دانہ کا وزن ذرّہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہی حال ایمان کا ہے کہ کم سے کم ذرّہ کے برابر ایمان کا ہونا نجات کے لیے کافی ہوگا۔ لہٰذا ایماں میں کمی و زیادتی کا ہونا ثابت ہوا۔ جواب یہ ہے کہ اگر ثمراتِ ایمان یا ایمانِ تفصیلی میں کمی و بیشی مراد ہو تو یہ بات مسلّم بین الفریقین ہے رہا نفسِ تصدیق کا معاملہ تو اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ کتاب الایمان میں اس امر پر مفصّل گفتگو ہو چکی ہے۔

جس کے دل میں ذرّہ برابر ایمان ہوگا اسکی نجات ہوگی اسکا کیا مطلب ہے

واضح ہو کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ جس کا کام ہی دین میں نت نئے فتنے اُٹھانا اور آیات و احادیث کی تحریفِ معنوی کرنا ہے۔ وہ اس مضمون کی احادیث سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب رائی کے دانے کے برابر ایمان بھی نجات کے لیے کافی ہے تو دنیا کی اکثر غیر مسلم قومیں بھی خدا اور آسمانی کتب اور بعض انبیاء و رُسل پر ایمان رکھتی ہیں اس ایمان میں اسلام کے بالمقابل کمی اور نقص ہی سہی لیکن رائی کے دانے سے تو یہ بہرحال کم نہیں ہے۔ لہٰذا ان سب کی نجات ہوگی اور ہر مذہب جس میں کم از کم خدا پر ایمان کا وجود ہو آخر کار جنتی بنا دینے کا ضامن ہے اور منکرینِ خدا کے سوا تمام انسان دوزخ سے نکال لیے جائیں گے مستشرقینِ یورپ سے متاثر ہونے والے مسلمان یا منکرینِ حدیث کی جماعت اگر اس مضمون کی احادیث سے یہ نتیجہ نکالے اور وحدتِ ادیان اور ہر مذہب حق ہے کا نعرہ بلند کرے تو کوئی حیرانی کی بات نہ تھی مگر حیرت ہے کہ دیوبندی حضرات میں بھی ایسے لوگ بھی ہیں جو مشرک اور اعلیٰ درجہ کے کافر کے لیے بھی بالآخر جہنّم سے نجات پانے کا نظریہ رکھتے ہیں۔ مثلاً سیرۃ النبی جلد چہارم مولوی سلیمان ندوی نے اپنا مسلک یہی لکھا ہے کہ کافر و مشرک کی بھی بالآخر نجات ہوگی اور وہ بالآخر جنت میں داخل کیا جائیگا۔

اگر ندوی صاحب نے بالتصریح "وحدتِ ادیان اور ہر مذہب حق ہے" کا نعرہ بلند نہیں کیا مگر ان کے اس نظریہ کا نتیجہ و ثمرہ تو یہی نکلے گا کہ ہر مذہب میں رہ کر نجات ہو سکتی ہے کیونکہ جب کافر و مشرک کی بھی بالآخر نجات ہو جائے گی اور انہیں اپنے جُرموں کی سزا پا کر جنت میں داخل کر دیا جائیگا تو پھر اسلام کا یہ دعوےٰ تو ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائیگا کہ نجات و مغفرت اور حصولِ فردوس کا واحد ذریعہ وسیلہ میں ہی ہوں۔ بہرحال اس مضمون کی احادیث سے مذکورہ بالا نتیجہ نکالنا بالکل غلط اور اسلام کو مثلہ کرنے کے مترادف ہے اور سخت قسم کی جاہلانہ تحریف ہے۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم سے کسی بات کو اخذ کرتے وقت یہ ضروری ہے کہ پورے قرآن شریف کی نصوص کو جو اس مسئلہ سے متعلق ہیں پیشِ نظر رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر یا تو قرآن

میں تناقص وتصادم نظر آئیگا یا پھر متناقض ومتصادم نظریے اس سے اخذ ہوں گے۔ اسی لیے قرآن نے پورے قرآن پاک پر ایمان لانے کی تاکید کی ہے اور جو بعض آیاتِ قرآنیہ پر ایمان لائیں اور بعض آیات کو نظر انداز کر دیں تو ان کے لیے جہنم کی وعید سنائی۔ یہی حال سنتِ رسول اللہ کا ہے کہ حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی کسی ایک حدیث یا اس کے کسی ایک ٹکڑے سے صحیح مفہوم اخذ کرنے کے لیے ہمیں دین سے متعلق حضور علیہ السلام کی عمومی تعلیم اور اس باب کی دیگر احادیث کو بھی پیش نظر رکھنا پڑے گا تب جاکر کہیں صحیح مفہوم ومطلب واضح ہوگا۔

کتاب وسنت سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ فلاح فوزِ اخروی کا ضامن صرف اسلام ہے اور اسلام نام ہے حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی دینی دعوت کو قبول کرنے کا۔ حضور علیہ السلام کی دینی دعوت کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دین و ایمان سے متعلق جو کچھ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا ہے اس کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کیا جائے مثلاً ایمان کے متعدد اجزاء ہیں۔ ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالملائکہ، ایمان بالقدر وغیرہ وغیرہ۔ تو ایمان کے تمام اجزائے ضروریہ پر ایمان لانے والا مومن ہے اور اس کے کسی ایک جز کا بھی انکار کرنے والا کافر ہے۔ مثلاً ایک شخص اور تو سب کچھ مانے مگر ملائکہ کے مخلوقِ الٰہی ہونے کا منکر ہو یا ایک شخص ملائکہ اور ایمان کے دوسرے اجزاء کا تو قائل ہو مگر حضور علیہ السلام کے ختم الرسل ہونے کا انکار کرے۔ تو ایسا شخص ایمان کے تمام اجزاء پر ایمان رکھنے کے باوجود صرف اس کے ایک جز کے انکار کرنے کی وجہ سے بالاتفاق کافر قرار پائے گا اور نجات کا ہرگز ہرگز حقدار نہ ہوگا۔ جب یہ قاعدہ ہمیں کتاب وسنت کے نصوصِ صریحہ سے معلوم ہوگیا تو اب وہ احادیث جن میں ایمان کے کسی ایک جز کا بیان ہوگا۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری دینی دعوت کو قبول کرنا اور تمام ضروریاتِ دین پر ایمان لانا مراد لیا جائیگا۔

زیر بحث حدیث ہی کو لیجیے اس میں صرف یہ ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھنے والا نجات پائے گا لیکن مراد اس سے صرف توحید پر ایمان لانا نہیں بلکہ پورے کلمہ پر ایمان لانا ہے اور یہاں کلمہ کے جزءِ اوّل لا الہ الا اللہ کو جزء ثانی محمد رسول اللہ کا علم قرار دیا گیا ہے جیسے کہتے ہیں قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ تو اس سے مقصود صرف اتنے ہی لفظ نہیں بلکہ پوری سورۃ پڑھوانا منظور ہے۔ ایسے ہی یہاں توحید پر ایمان لانے سے مراد رسالت پر ایمان لانا بھی ہے اور اللہ ورسول پر ایمان لانے کے بعد تو بلا ریب یہ طے ہو جاتا ہے کہ جو کتاب وسنت سے ثابت ہو اس کا اقرار وتصدیق کی جائے۔

یہی حال حدیثِ زیر بحث کے اس جملہ کا ہے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا اس کی نجات ہوگی۔ یعنی جس کے دل میں تمام ضروریاتِ دین تمام اجزاء دین کی نفسِ تصدیق پائی جائے گی اور اصلِ ایمان موجود ہوگا وہ خواہ کتنا ہی بے عمل اور فاسق وفاجر کیوں نہ ہو اپنے اعمالِ بد کی سزا بھگتنے کے بعد بہر صورت جہنم سے نکال لیا جائیگا۔ "ذرہ برابر ایمان ہوگا" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو شخص اجزاءِ ایمان میں سے کسی جز کا منکر ہوگا وہ بھی نجات پائے گا۔ حدیث کے خط کشیدہ جملوں کو یہ مطلب پہنانا انتہائی درجہ کی جاہلانہ تحریف ہے اور اسلام سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔

ایمان میں کمی یا ضُعف کا کیا مطلب ہے؟

خوب یاد رکھئے کہ ایمان کا ضعف اور ایمان کا نقص یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جس کے ایمان میں ضعف ہو وہ مومن ہے اور جس کے ایمان

میں نقص ہو وہ یقیناً کافر ہے۔ نقص اور ضعف کے اس فرق کو ایک مثال سے سمجھئے۔
ایمان کے متعدد اجزاء ہیں۔ توحید، رسالت، ملائکہ، آخرت، تقدیر، ان تمام اجزا کا ایمان لانے والا اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرنے والا مسلمان ہے۔ اب جو شخص اجزاء ایمان میں سے کسی ایک جُز کا بھی انکار کرے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا ایمان ناقص ہے، ادھورا ہے۔ ادھورے ایمان کو قرآن و سنت اور اجماع اُمّت کسی درجہ میں بھی ایمان نہیں مانتے بلکہ کفر و ارتداد قرار دیتے ہیں جیسا کہ قرآن پاک نے متعدد مقامات پر صراحت کی کہ بعض پر ایمان اور بعض کی تکذیب کُل کی تکذیب ہے۔ اس لیے تمام اجزاءِ ایمان پر ایمان لانے کے باوجود کسی ایک جُز پر ایمان لانے کا مطلب ہوگا" ذرہ برابر ایمان نہ لانا"۔ رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان کا نہ ہونا اور ایسا شخص جس کا ایمان اُدھورا ہے بلاشبہ کافر ہے اور اس کی کسی صورت نجات ممکن نہیں ہے۔
اس کے برعکس" ایمان کا ضعف" یہ ایک علیحدہ مفہوم رکھتا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تمام اجزائے ایمانی کے مجموعہ پر ایمان ہو۔ یعنی بلا استثناء ایمان کے تمام اجزائے ضروریہ کا اعتقاد ہو۔ مگر اس تمام اجزاء ایمانی کے مجموعی اعتقاد کے یقین و اذعان میں ضعف ہو۔ اس کو کمی سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی ضعف کے تناسب سے ایمان کی مقدار کا فیصلہ ہوگا۔
بعض وہ لوگ ہوں گے جن کے تمام اجزاءِ ایمانی کے مجموعی اعتقاد میں یقین و اذعان کا ضعف بالکل ہوگا ہی نہیں۔ بعض وہ ہوں گے جن کے اذعان و یقین میں ذرا سا ضعف ہوگا اور بعض وہ ہوں گے جن میں یہ ضعف انتہا کو پہنچا ہوگا۔ مگر اس کے باوجود تمام اجزائے ایمانیہ کسی جزوِ ایمان سے انکار و تکذیب کی نوبت نہیں پہنچی ہوگی تو ایسے افراد کو بھی مومن ہی مانا جائے گا۔ اگرچہ یہ ضرور کہا جائیگا کہ ان کا ایمان کم ہے یا ان کا ایمان ضعیف ہے۔ اس کمی اور ضعف کے اظہار کے لیے احادیث میں رائی کے دانے یا ذرّے کی تمثیل دی گئی ہے۔
خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ ایمان کا نقص یہ ہے کہ اجزاءِ ایمان میں سے کسی ایک کا بھی انکار و تکذیب کی جائے۔ جن کے ایمان میں نقص ہوگا وہ کافر ہیں۔ ان کا ایمان ادھورا ہے۔ ظاہر ہے عیسائی، یہودی اور دیگر مذاہب کے پیرو اگر توحید کے قائل ہوں بعض کتبِ سماویہ اور بعض انبیاءؑ پر بھی ایمان رکھیں لیکن سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلامی کو قبول نہ کریں تو ان کے ایمان میں نقص ہے اور وہ کافر ہی قرار پائیں گے اور کسی حال میں بھی نجات نہ پائیں گے۔
اور ایمان کا ضعف اور اس کی کمی کا مفہوم یہ ہے کہ تمام اجزائے ایمانی کے مجموعہ کا اعتقاد ہے۔ کسی ایک بھی جز کی تکذیب اور انکار نہیں ہے۔ مگر اس مجموعی اعتقاد کے اذعان و یقین میں ضعف ہے اور یہ ضعف جب انتہا کو پہنچ جائے تب بھی ایسا شخص مومن ہے کیونکہ وہ اجزائے ایمانی میں سے کسی جز کا منکر نہیں ہے۔ ایسے ہی ضعیف الایمان افراد کے متعلق وحیِ نبوّت نے اعلان کیا کہ " جس کے دل میں ذرّہ برابر ایمان ہوگا۔ وہ بالآخر جہنّم سے نجات پائے گا"۔ فافہم

ضروری وضاحت

واضح ہو کہ حدیثِ ہٰذا سے خیر سے مراد ہم نے ایمان لیا ہے۔ جس کے چند وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ حدیث کے لفظ یہ ہیں۔ وَ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِنَ الْخَیْرِ۔ قلبہ کا قرینہ بتا رہا ہے کہ خیر سے مراد ایمان ہے۔ کیونکہ ایمان کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دوسری روایت

میں خیر کی جگہ ایمان کا لفظ آیا ہے اس لیے یہاں خیر سے مراد نورِ ایمان ہی لینا چاہیئے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں خیر کا لفظ آئے وہاں اس کے معنیٰ ایمان ہی کے لیے جائیں۔ کیونکہ خیر کے لفظ سے جس طرح ایمان مراد لیا جاتا ہے۔ اسی طرح عمل بھی مراد لے سکتے ہیں۔ بلکہ بعض احادیث میں تو ایسے مقام بھی ہیں جہاں خیر سے ایمان مراد لینا قطعاً حتماً غلط ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم ہی میں یہ حدیث موجود ہے کہ جب سب لوگ سفارش کر چکیں تو اس کے بعد ارشادِ باری ہو کہ فرشتوں کی نبیوں کی اور مومنین کی سفارش ہو چکی اور ان کی سفارش قبول ہو گئی۔

اِلَّا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ فَیَقْبِضُ قَبْضَةً فَیُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا مَّا لَمْ یَعْمَلُوْا خَیْرًا قَطُّ (بخاری و مسلم)

بس اب ارحم الراحمین ہی باقی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ خود اپنی مغفرت و رحمت کے ہاتھ سے نکال لے گا۔ جنہوں نے کبھی کوئی نیک عمل کیا ہی نہ ہوگا۔

اس حدیث میں خیر سے مراد عمل ہے ایمان نہیں۔ اگر یہاں بھی خیر سے مراد ایمان لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ بھی بخش دیئے جائیں گے۔ جن کے دل میں قطعاً ایمان ہوگا ہی نہیں۔ حالانکہ یہ بات نصوصِ قرآن کے خلاف ہے پھر یَعْمَلُوْا کا لفظ بھی یہاں قرینہ ہے کہ خیر سے مراد یہاں عمل ہے۔ نیز اس حدیث کا آخری ٹکڑا یہ ہے۔

هٰؤُلَآءِ عُتَقَاءُ اللّٰهِ الَّذِیْنَ اَدْخَلَهُمُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ بِغَیْرِ عَمَلٍ عَمِلُوْهُ وَلَا خَیْرٍ قَدَّمُوْهُ (بخاری و مسلم)

یہ لوگ ہیں اللہ کے آزاد کردہ۔ اللہ نے ان کو جنت میں داخل فرمایا بغیر عمل کے جو انہوں نے کیا اور بغیر خیر کے جو انہوں نے پیش کیا۔

یہاں بھی خیر سے مراد عمل ہی ہے۔ یعنی یہ لوگ وہ ہوں گے جن کے پاس سوائے ایمان کے کوئی عملِ صالح نہ ہوگا۔ ان کو بھی اللہ عزوجل اپنی رحمتِ کاملہ سے جنت میں داخل فرمائے گا۔

آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ کے نزول کا بیان

۴۳۔ لَوْ عَلَیْنَا مَعْشَرَ الْیَهُوْدِ نَزَلَتْ لَا تَّخَذْنَا ذٰلِكَ الْیَوْمَ عِیْدًا قَالَ اَیُّ اٰیَةٍ قَالَ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا قَالَ عُمَرُ قَدْ عَرَفْنَا ذٰلِكَ الْیَوْمَ وَالْمَکَانَ الَّذِیْ نَزَلَتْ فِیْهِ عَلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ یَوْمَ جُمُعَةٍ

حضرت عمر بن الخطاب سے روایت ہے کہ آپ سے ایک یہودی نے کہا اے امیر المومنین! آپ کی کتاب (قرآن) میں ایک آیت ہے اگر وہ ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو ہم روزِ نزول کو عید ٹھہرا لیتے۔ آپ نے فرمایا وہ کونسی آیت ہے؟ اس نے کہا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ۔ آپ نے فرمایا میں اس دن کو جانتا ہوں اور اس جگہ کو بھی پہچانتا ہوں جہاں یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ وہ مقام عرفات کا تھا اور جمعہ کا دن تھا اور حضور علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے۔

اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب المغازی، کتاب التفسیر اور کتاب الاعتصام میں بھی ذکر کیا ہے۔ نسائی و ترمذی و مسلم

انے بھی اس حدیث کو لیا ہے۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

یوم نزولِ نعمت کو عید منانے کا ثبوت

جس یہودی نے یہ سوال کیا۔ وہ کعبؓ احبار تھے اس نے سوال کیا کہ یہ آیت جس میں اسلام کے غلبہ کی بشارت تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا بیان ہے۔ یہ تو بڑی خوشی کا دن ہے۔ مسلمان اس دن کو عید کیوں نہیں مناتے۔ اس پر حضرت فاروقِ اعظم نے فرمایا۔ ہم اس دن سے غافل نہیں ہیں۔ ہم اس دن کی عظمت کو بھی سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ آیت کس جگہ پر کس موقع پر اور کونسے دن نازل ہوئی تھی اور اس وقت ہمارے حضور علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے یعنی ہم مسلمان اس دن کو معظم سمجھتے ہیں اور اس کو عید کی طرح مناتے ہیں یعنی ہم نے تو اس دن کو عید کا دن کر لیا ہے۔

علامہ نووی نے فرمایا۔ مَعْنَاهُ مَا تَرَكْنَا تَعْظِيمَ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَالْمَكَانِ اَمَّا الْمَكَانُ فَهُوَ عَرَفَاتٌ وَهُوَ مُعْظَمُ الْحَجِّ الَّذِيْ اَحَدُ اَرْكَانِ الْاِسْلَامِ وَاَمَّا الزَّمَانُ فَهُوَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ وَيَوْمُ عَرَفَةَ وَهُوَ يَوْمٌ اِجْتَمَعَ فِيْهِ فَضْلَانِ وَشَرَفَانِ مَعْلُوْمٌ تَعْظِيْمُنَا لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا فَاِذَا اجْتَمَعَا زَادَ التَّعْظِيْمُ فَقَدِ اتَّخَذْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ عِيْدًا وَ عَظَّمْنَا مَكَانَهُ اَيْضًا (عینی ج ۱ ص ۲۰۶)

بلکہ اس دن کے ساتھ اس مکان کی عزت کرتے ہیں۔ اسی طرح ترمذی میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ آپ سے بھی ایک یہودی نے ایسا ہی سوال کیا۔ آپ نے فرمایا۔ جس روز یہ آیت نازل ہوئی۔ اس دن دو عیدیں تھیں۔ جمعہ و عرفہ۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی دینی کامیابی کے دن کو خوشی کا دن منانا اور اس کی یادگار قائم کرنا جائز ہے۔ صحابہ کرام سے ثابت ہے۔ ورنہ حضرت ابن عباس اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم صاف فرما دیتے کہ جس دن کوئی خوشی کا واقعہ ہو اس کی یادگار قائم کرنا اور اس روز کو عید منانا ہم بدعت جانتے ہیں۔ اس سے عید میلاد النبی کا جواز بھی ثابت ہوا۔ کیونکہ وہ تو صرف قرآنِ پاک کی ایک آیت کے نزول کا دن تھا اور ماہ فاخر ربیع الاوّل صاحبِ قرآن کے ظہور کا مہینہ ہے۔ لہٰذا عید میلاد کہ اعظم نعم الٰہیہ کی یادگار اور شکر گزاری ہے اور حتماً جائز ہے۔

مثلِ فارس زلزلے ہوں نجد میں ذکرِ آیاتِ ولادت کیجئے

بَابُ الزَّكٰوةِ مِنَ الْاِسْلَامِ

باب اس امر کے بیان میں کہ زکوٰۃ بھی اسلام کا ایک شعبہ ہے

وَقَوْلُهُ تَعَالٰى وَمَا اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا خالص اللہ ہی کی بندگی کی نیت سے اس کو پوجیں اور نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ دیں۔ یہ ہی دینِ حق ہے۔

گزشتہ باب میں ایمان کی کمی و بیشی کا بیان تھا اور اعمالِ صالحہ سے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے اور اس میں کمی سے کمی مذکورہ بالا عنوان قائم کرکے امام یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو شخص زکوٰۃ ادا کرے اس کا اسلام کامل ہے اور جو زکوٰۃ نہیں دیتا اس کا اسلام ناقص ہے۔

۴۴- جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرَ الرَّاسِ نَسْمَعُ دَوِیَّ صَوْتِهٖ وَلَا نَفْقَهُ مَا یَقُوْلُ حَتّٰی دَنَا فَاِذَا هُوَ یَسْئَلُ عَنِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَمْسُ صَلٰوةٍ فِی الْیَوْمِ وَاللَّیْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَیَّ غَیْرُهَا قَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَصِیَامُ رَمَضَانَ قَالَ هَلْ عَلَیَّ غَیْرُهٗ قَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ وَذَکَرَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الزَّکٰوةَ قَالَ هَلْ عَلَیَّ غَیْرُهَا قَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَاَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ یَقُوْلُ وَاللّٰهِ لَا اَزِیْدُ عَلٰی هٰذَا وَلَا اَنْقُصُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَفْلَحَ اِنْ صَدَقَ (بخاری)

ایک شخص اہلِ نجد سے جن کے بال پراگندہ تھے خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہم ان کی آواز کی گونج کو سنتے تھے مگر ان کی بات ہمیں سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ حتّٰی کہ وہ قریب آئے (تو معلوم ہوا) کہ وہ اسلام کے متعلق حضور علیہ السلام سے سوال کر رہے ہیں۔ حضور نے فرمایا۔ ۵ نمازیں اللہ تعالیٰ نے دن اور رات میں فرض کی ہیں۔ اس نے عرض کی ان کے سوا بھی مجھ پر کوئی نماز فرض ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں مگر یہ کہ تو نفل پڑھنا چاہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رمضان کے روزے۔ اس نے عرض کی۔ رمضان کے روزوں کے سوا بھی مجھ پر واجب تو نہیں۔ فرمایا نہیں مگر یہ کہ تو نفلی روزے رکھے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زکوٰۃ۔ اس نے عرض کی کہ زکوٰۃ کے سوا تو اور مجھ پر واجب نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نہیں مگر یہ کہ تو صدقہ دینا چاہے۔ پھر یہ شخص واپس ہوئے اور کہتے تھے۔ خدا کی قسم اس پر زیادہ کروں گا اور نہ کم۔ جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر یہ سچ کہتا تو فلاح پاتا۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمۃ نے کتاب الشہادات اور صوم اور باب ترک الحیل میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے ایمان میں اور ابوداؤد و نسائی نے صلوٰۃ و صوم میں۔ حدیثِ ہٰذا کے راوی یہ ہیں۔ اسمٰعیل حضرت امام مالک وہ اپنے چچا ابوسہیل سے وہ اپنے والد مالک بن ابی عامر سے انہوں نے حضرت طلحہ سے سنا۔

حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ جلیل القدر صحابی عشرہ مبشرہ سے ہیں۔ ان کے والد کا نام عبید اللہ بن عثمان قرشی ہے۔ بدر کے سوا تمام مشاہد میں حضور علیہ السلام کے ہمراہ رہے۔ جنگِ احد میں حضور علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق ثابت قدم رہے اور حضور علیہ السلام کو کفار کے حملوں سے بچانے میں آپ کو ۷۵ زخم آئے۔ چھنگلی انگلی بھی کٹ گئی۔ آپ کا نام حضور علیہ السلام نے طلحۃ الخیر و طلحۃ الجواد رکھا ہے۔ آپ سے کل [illegible] حدیثیں مروی ہیں جن میں سے دو پر بخاری و مسلم کا اتفاق ہے۔ دو حدیثوں کو بخاری نے اور تین کو مسلم نے منفرداً ذکر کیا۔

... جمل کی لڑائی میں کسی نامعلوم تیر سے دسویں جمادی الاول ۳۶ھ میں شہید ہوئے اور بصرہ میں مدفون ہوئے۔
... کہتے ہیں کہ در اصل ان کو مقامِ قنترہ میں دفن کیا گیا تھا۔ مگر تیس سال بعد آپ نے اپنی صاحبزادی کو خواب میں
... سیل کی شکایت کی تو آپ کو قبر سے نکالا گیا۔ جسم مبارک بالکل تروتازہ تھا۔ آپ کو بصرہ میں دفن کیا گیا (عینی جلد)
... نجد کے متعلق متعدد قول ہیں۔ وہ بلند زمین جو یمامہ سے ارضِ عراق تک ہے نجد ہے ۳۔ حجاز و عراق کے
... نجد ہے ۴۔ عراق اور جرہ عمرۃ اور طائف کے درمیان کی جگہ نجد ہے۔ لغت میں نجد بلند زمین کو کہتے ہیں۔ ثائر
... منتشر کے ہیں جیسے کہتے ہیں ثار الغبار۔ حاصل یہ ہے کہ اس شخص کے بال پراگندہ تھے۔ دوی۔ وال کے زبر ...
... کے ساتھ بلند اور منکر آواز کو کہتے ہیں۔ جس کا مفہوم سمجھ میں نہ آئے۔ فلاح کے معنی کامیابی ... کے ہیں۔ بعض
... ہے فلاح چار امور سے مرکب ہے بقا بلا فنا۔ تونگری فقر کے بغیر، عزت ذلت کے بغیر، علم جہالت کے بغیر۔

... حدیث

اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارکانِ اسلام بتائے ہیں جو یہ ہیں:
۱۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ یہ ارکانِ اسلام سے ہیں۔ دن میں پانچ وقت نماز فرض ہے ...
... کے روزے فرض ہیں اور مال کے نصاب پر پہنچنے اور سال گزرنے پر صرف زکوٰۃ فرض ہے ۲۔ جو ... ان امور
... نے وہ فلاح یافتہ ہے ۳۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف مسائلِ دینی معلوم کرنے کے لیے سفر کرنا مستحب ہے۔

... شروع کرنے سے واجب ہو جاتا ہے

حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ نے اس حدیث سے یہ استدلال فرمایا ہے کہ نفل شروع کرنے سے واجب نہیں ہوتا۔ البتہ جیسے نفل کا شروع ... ہے اسی طرح نفل کا پورا کرنا بھی مستحب ہونا چاہیئے۔ چنانچہ وہ اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ میں استثنا منقطع مانتے ہیں اور فرماتے ... حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان فرائض کے علاوہ یہ مستحب ہے کہ تو نوافل میں مشغول ہو جائے۔ اس بنا پر وہ کہتے ہیں کہ ... نفلی روزہ شروع کیا تو اس کے لیے اس روزہ کو پورا کرنا مستحب ہے اور اس کا افطار جائز ہے اور نوافل شروع کرنے ... نہیں ہوتے۔ اپنے اس خیال کی تائید میں امام شافعی ان احادیث کو بھی پیش کرتے ہیں جن میں یہ آیا ہے کہ حضور ... اللہ علیہ وسلم نے نفلی روزہ رکھا اور پھر اس کو پورا نہیں فرمایا بلکہ افطار فرما لیا۔ لہٰذا باقی نفلی عبادات کا بھی یہی حکم ہو ... حضرت امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ یہ فرماتے ہیں۔

... تطوع میں استثنا متصل ہے اور استثنا میں اتصال ہی اصل ہے۔ لہٰذا مطلب حدیث یہ ہوگا کہ نفلی روزہ یا نماز ... سے اس کا اتمام واجب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قرآنِ پاک میں لَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَکُمْ اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔ ... کے علاوہ اگر کسی نے نفل شروع کر دیئے تو اس کو پورا کرنا واجب ہے اور اگر اس نے نفلی روزہ شروع کر کے توڑ دیا ... قضا واجب ہے۔ چنانچہ مسندِ احمد میں حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتی ہیں۔ میں نے اور حضرت حفصہ ... ہم نفلی روزہ سے تھیں کہ اتنے میں ایک بکری بطور ہدیہ ہمیں دی گئی تو ہم نے روزہ افطار کر لیا اور بکری کا گوشت ... علیہ السلام کو اطلاع ہوئی تو فرمایا:۔

... یَوْمًا مَکَانَہٗ (احمد) | تم دونوں اس روزہ کی جگہ ایک روزہ رکھو

نیز دار قطنی میں ہے کہ حضرت جویریہ نے نفلی روزہ رکھ کر توڑ دیا ۔ حضور علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس کی قضا کرو ۔ اس سے واضح ہو گیا کہ نفلی روزہ شروع کرنے سے اس کا اتمام واجب ہوتا ہے اور اگر کسی وجہ سے اس کو فاسد کر دیا تو اس کی قضا واجب ہے ۔ رہیں وہ احادیث جن میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نفلی روزہ رکھ کر افطار کر لیا' اس سے صرف اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ نفلی روزہ رکھ کر کسی عذر معقول کی وجہ سے اس کو افطار کر لینا جائز ہے ۔ مگر جب کر لیا تو اسکی قضا واجب نہیں ہے ۔ حدیثِ مذکورہ سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی بلکہ جو احادیث ہم نے ذکر کیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نفلی روزہ کو فاسد کرنے کی صورت میں اس کی قضا واجب ہے ۔ نیز اس کے علاوہ اجماع سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور حج کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ نفلی حج شروع کرنے سے واجب ہو جاتا ہے ۔ اگر فاسد ہو جائے تو بھی) اس کے ارکان کا پورا کرنا ضروری ہے۔

۲- وَاللهِ لَا اَزِيْدُ وَلَا اَنْقُصُ عَلٰى هٰذَا یعنی جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ارکانِ اسلامیہ بتا دیئے تو سائل نے عرض کی خدا کی قسم نہ میں اس پر زیادہ کروں گا اور نہ کم کروں گا ۔ بعض علمائنے فرمایا اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وتر واجب نہیں ہیں ۔ لیکن حق یہ ہے کہ سائل کے ان کلمات سے یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ تو محاورہ ہے یعنی سائل یہ کہنا چاہتا ہے کہ حضور آپ نے جو فرائض بیان کیے ہیں ۔ ان میں نہ میں اپنی طرف سے کچھ زیادتی کروں گا اور نہ کمی کروں گا ۔ یا یہ جو کچھ میں نے سُنا ہے اس کو من وعن دوسروں تک پہنچا دوں گا ۔ چنانچہ اس کی تائید بخاری کتاب الصوم کی حدیث سے ہوتی ہے کہ سائل نے عرض کی ۔ وَالَّذِیْ اَكْرَمَكَ لَا اَتَطَوَّعُ شَيْئًا وَلَا اَنْقُصُ مِمَّا فَرَضَ اللهُ عَلَيَّ شَيْئًا ۔ فافهم ـــــــ اس کے بعد حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ شخص کامیاب ہو گیا ۔ اگر اس نے سچ کہا ہے ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث میں صرف ان دو ارکانِ اسلام کی ادائیگی کی بنا پر اس کے لیے فلاح کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے ۔ جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مختصر ہے ۔ بخاری میں جو دوسری حدیث ہے ۔ اس میں یہ تفصیل بھی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی احکامِ شرعیہ بھی اس کو ارشاد فرما دیئے ۔ الفاظِ حدیث یہ ہیں :- فاخبره بشرائع الاسلام فادبر الرجل وقال الخ

بَابُ اِتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ مِنَ الْاِيْمَانِ

باب جنازہ کے ساتھ جانا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے

۴۵- عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ اِيْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا وَكَانَ مَعَهُ حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهَا وَيَفْرُغَ مِنْ دَفْنِهَا فَاِنَّهُ يَرْجِعُ مِنَ الْاَجْرِ بِقِيْرَاطَيْنِ كُلُّ قِيْرَاطٍ مِثْلُ اُحُدٍ وَمَنْ صَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ اَنْ تُدْفَنَ فَاِنَّهُ يَرْجِعُ مِنَ الْاَجْرِ بِقِيْرَاطٍ

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں ۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ جو کسی مسلمان کے جنازہ کے ساتھ جائے اور اس کے ساتھ رہے ۔ حتیٰ کہ نماز پڑھے اور اس کے دفن سے فارغ ہو تو وہ دو قیراط ثواب لے کر لوٹے گا ۔ ہر قیراط احد پہاڑ کے برابر ہوگا اور جس نے صرف نماز جنازہ پڑھی اور دفن سے قبل واپس ہو گیا تو وہ صرف ایک قیراط اجر لے کر لوٹے گا ۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو نسائی نے کتاب الایمان میں درج کیا ہے ۲۔ جنازہ ۔ ج کے زبر و زیر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ میّت کو کہتے ہیں۔ جوہری نے کہا۔ جنازہ اس نعش کو کہتے ہیں جو چارپائی پر ہو۔ عباب میں ابن عربی نے کہا۔ جنازہ بالفتح میّت۔ بالکسر سریر۔ اصمعی نے اس کا عکس کیا ہے۔ بہرحال عام طور پر جنازہ اس لاش کو کہتے ہیں جس کو نہلا دھلا کر کفن پہنا کر پلنگ پر ڈال دیا جائے (اتبع) اس کے معنی پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ ۔ فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیچھا کیا۔ بہرحال اتباع کا لفظ اسی وقت تک کے لیے بولا جاتا ہے۔ جب تک کسی کے پیچھے رہا جائے خواہ اس کے تعاقب کے لیے یا حملہ کے لیے اور جب ساتھ مل جائے تو آگے نکل جائے تو اس کے لیے اتباع کا لفظ نہیں بولتے قِیْرَاط۔ حدیث ہذا میں قیراط سے جو مراد ہے وہ خود زبان نبوت نے بیان فرما دیا۔ یعنی اُحد پہاڑ کے برابر ثواب۔ یہ محض ثواب کی زیادتی کی تمثیل ہے۔ اُحُد ۔ یہ مدینہ کے پہلو میں دو میل شمال کی طرف ایک پہاڑ ہے۔ اُحد کو اُحد توحد کی وجہ سے کہتے ہیں۔ یہ الگ تھلگ اس گوشہ میں ایک ہی پہاڑ ہے۔ اس مقدس پہاڑ کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُحد پہاڑ میں سیدنا ہارون علیہ السلام کی قبر مبارک بھی ہے ۳۔ حدیثِ ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔ ۱۔ جنازہ کے ساتھ شریک ہونا اور دفن تک وہاں رہنا اور نماز پڑھنا بڑے ثواب کا موجب ہے۔ دو قیراط ثواب اُحد پہاڑ کے برابر ملتا ہے۔ حدیثِ ہذا میں یہ ثواب اس شخص کے لیے بیان ہوا ہے جو جنازہ کے ساتھ چلے۔ دفن تک وہاں رہے اور نماز بھی پڑھے اور اگر صرف نماز جنازہ کے ساتھ شرکت کرے تو ایک قیراط کا ثواب ہے ۲۔ اتباع کے لفظ نے یہ بتایا کہ جنازہ کے پیچھے پیچھے چلنا اولیٰ و افضل ہے اور اس میں میّت کی تعظیم بھی ہے۔ جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم اور امام اوزاعی علیہ الرحمۃ کا مذہب ہے اور حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے۔ حضرت امام شافعی کے ہاں جنازہ کے آگے چلنا اولیٰ ہے۔ لیکن لفظ اتبع حضرت امام اعظم کے مسلک کی زبردست تائید کرتا ہے۔ فافہم

بَابُ خَوْفِ الْمُؤْمِنِ اَنْ يَّحْبَطَ عَمَلُهٗ

باب مومن کا اس سے ڈرنا کہ اعمال حبط نہ ہو جائیں

وَهُوَ لَا يَشْعُرُ (بخاری) | اور اس کو خبر بھی نہ ہو

فوائد و مسائل یہ عنوان آیت اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ سے ماخوذ ہے۔ حَبِطَ يَحْبَطُ باب عَلِمَ يَعْلَمُ سے ہے۔ حبط کے معنی مٹنے، ضائع ہونے کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں حبط اعمال کا معنی یہ ہے کہ اعمال کا ثواب ضائع کر دیا جائے۔ علماء فرماتے ہیں کہ حبط عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جبکہ آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے لیکن امام بخاری کا مقصد اس عنوان کے قائم کرنے سے مرجیہ کے اس قول کی تردید مقصود ہے کہ تصدیق قلبی (ایمان) کے ہوتے ہوئے گناہ کوئی نقصان نہیں دیتا۔ امام نے یہ باب قائم کر کے بتایا ہے کہ عدم اخلاص اور کفر حبط عمل کا موجب ہوتے ہیں۔

قَالَ اِبْرَاهِيْمُ التَّيْمِيُّ مَا عَرَضْتُ قَوْلِيْ | ابراہیم تیمی نے فرمایا۔ جب میں نے اپنے قول کا

عَلٰی عَمَلِیْ اِلَّا خَشِیْتُ اَنْ اَکُوْنَ مُکَذِّبًا
(بخاری)

مقابلہ عمل سے کیا تو مجھے ڈر ہوا کہ لوگ کہیں مجھے جھوٹا نہ کہیں۔

حضرت ابراہیم تیمی

حضرت ابراہیم تیمی اپنے وقت کے نہایت پاکباز متقی، پرہیزگار بزرگ تھے۔ حجاج نے حضرت امام نخعی کی گرفتاری کا حکم دیا تو سپاہی غلطی سے ابراہیم تیمی کو پکڑ لائے اور ان کو جیل میں بند کردیا۔ آپ سے بھی کہا گیا کہ آپ کو غلطی سے پکڑ لیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ایک بے گناہ کی جگہ میں جیل میں رہوں تو یہ بہتر ہے۔ چنانچہ آپ کا جیل ہی میں انتقال ہوا۔ آپ بہت زبردست واعظ بھی تھے۔ یہ جملے آپ نے ازراہِ انکساری فرمائے ہیں۔ امام بخاری کا مقصد ان جملوں سے یہ بتانا ہے کہ مومن ہر وقت ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں میرا عمل میرے قول کے مخالف نہ ہو جائے یا میرے عمل میں خلوص نہ رہے اور اس کی جگہ ریا و سمعہ آ جائے۔ لہٰذا واعظ کو بہ نسبت دوسروں کے زیادہ تقویٰ اختیار کرنا چاہیئے۔

قَالَ ابْنُ اَبِیْ مُلَیْکَۃَ اَدْرَکْتُ ثَلَاثِیْنَ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّھُمْ یَخَافُ النِّفَاقَ عَلٰی نَفْسِہٖ مَا مِنْھُمْ اَحَدٌ یَقُوْلُ عَلٰی اِیْمَانِ جِبْرَائِیْلَ وَمِیْکَائِیْلَ
(بخاری)

عبداللہ بن ابی ملیکہ نے کہا۔ میں نے حضور علیہ السلام کے تیس صحابیوں سے ملاقات کی۔ وہ سب کے سب اپنے نفس پر نفاق کے واقع ہونے سے ڈرتے تھے۔ کوئی ان میں ایسا نہ تھا جو یہ کہتا ہو کہ میرا ایمان جبرائیل و میکائیل کا سا ہے۔

ابنِ ابی ملیکہ

یہ تابعی ہیں۔ انہوں نے عبادلہ اربعہ، حضرت عائشہ و حضرت اسماء حضرت ام سلمہ و ابوہریرہ و دیگر صحابہ کرام سے یہ حدیث سنی ہے۔ یہ حضرت ابن زبیر کے قاضی و مؤذن تھے۔ وہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تیس صحابیوں سے ملاقات کی ہے۔ یہ تمام صحابی اس امر سے ڈرتے تھے کہ کہیں ہم میں نفاق پیدا نہ ہو جائے۔ یخاف النفاق۔ خوف آئندہ کے غم و اندیشہ کو کہتے ہیں۔ حضرت ابن ابی ملیکہ کے اس قول کا مطلب جو صرف لفظی ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ صرف اسقدر ہے کہ جن تیس صحابہ سے ان کی ملاقات ہوئی وہ سب اپنے نفسوں کو معصوم نہیں سمجھتے تھے اور ہمیشہ اپنے نفس پر نفاق کے واقع ہونے سے ڈرا کرتے تھے۔ ظاہر ہے ہر مومن مسلمان کفر و شرک اور نفاق میں مبتلا ہونے سے ڈرتا ہے اور ہمیشہ بحضور رب العالمین یہ دعا کرتا رہتا ہے کہ الٰہی صراطِ مستقیم پر چلانا اور یہ بات خود ایمان کی نشانی ہے۔

ایک مغالطہ کا جواب

ابن ملیکہ کے اس قول اور اسی قسم کے اور اقوال سے مخالفین صحابہ جہلاء کو سخت مغالطہ دیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ دیکھو بخاری میں ہے کہ صحابہ نفاق سے ڈرا کرتے تھے۔ ثابت ہوا معاذ اللہ، صحابہ میں نفاق تھا جبھی تو ڈرتے تھے۔ مخالفین صحابہ کا اس قول سے یہ نتیجہ نکالنا انصاف و دیانت کا خون کرنا ہے۔ کیونکہ کفر و شرک اور نفاق میں مبتلا ہونے سے ڈرنا ایمان و اخلاص کی نشانی ہے۔ ہر مخلص مومن کفر و نفاق سے پناہ مانگتا ہے اور اپنے حسنِ خاتمہ کی دعائیں کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ جو نفاق سے ڈرے اس میں نفاق پایا بھی جاتا ہے۔ دسیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد امور سے پناہ مانگی ہے۔ حالانکہ حضور سید المعصومین ہیں۔ مگر تعلیم امت کے لیے آپ نے

بھی متعدد باتوں سے پناہ مانگی ہے تو گویا مخالفینِ صحابہ اپنی اُلٹی منطق کی رُو سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی یہی کہیں گے؟ الغرض یہ بدیہی بات ہے کہ کسی بُری چیز سے پناہ مانگنا یا اُس سے ڈرنا یا اس سے بچنے کی اللہ سے دُعا کرنا یہ ایمان و اخلاص کی اعلیٰ نشانی ہے اور مخالفینِ صحابہ کا اس قول سے صحابہ کرام کو (معاذ اللہ) منافق ثابت کرنا صرف ہٹ دھرمی اور تعصب کا نتیجہ ہے۔ فافہم

چنانچہ اس قول کے آخری جملہ کہ "وہ صحابی اپنے ایمان کو جبریل کے ایمان کی طرح نہیں سمجھتے تھے"۔ اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے یعنی جبریل معصوم ہیں۔ ان کے ایمان میں نفاق کا آنا ممکن ہی نہیں ہے اور مومن چونکہ معصوم نہیں ہوتا ہے اس لیے وہ کفر و نفاق سے ڈرتا ہے اور ہمیشہ بارگاہِ خداوندی میں اپنے حُسنِ خاتمہ کی دُعائیں کرتا ہے حضرت حسن بصری کا ارشاد ہے کہ

وَ یُذْکَرُ عَنِ الْحَسَنِ مَا خَافَہٗ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَّلَا اَمِنَہٗ اِلَّا مُنَافِقٌ (بخاری)

حضرت حسن بصری سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا مومن ہی نفاق سے ڈرتا ہے اور منافق نفاق سے نہیں ڈرتا۔

ابنِ تین نے اس قول کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور مُنافق اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا۔ گو یہ ترجمہ بھی صحیح ہے مگر امام بخاری کے مقصد کے خلاف ہے۔ بہرحال ان دونوں قولوں کا مطلب و منشا یہ ہے کہ مومن کو اپنی ذات کو معصوم نہیں سمجھنا چاہیئے اور ہمیشہ خلافِ شرع امُور کفر و شرک سے پناہ مانگتے رہنا چاہیئے اور بحضور رب العالمین حُسنِ خاتمہ کی دُعا کرتے رہنا چاہیئے۔

وَ مَا یُحَذَّرُ مِنَ الْاِصْرَارِ عَلَی النِّفَاقِ وَالْعِصْیَانِ مِنْ غَیْرِ تَوْبَۃٍ لِقَوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَ لَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَ ھُمْ یَعْلَمُوْنَ

(اس باب میں بیان ہے) ان چیزوں کا جن سے ڈرایا جاتا ہے۔ یعنی اصرار علی النفاق اور عصیان بلا توبہ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وہ گناہ میں جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔

۱۔ واضح ہو کہ امام بخاری نے دو عنوان باندھے تھے اوّل: الخوف من حبط العمل ثانی: الحذر من الاصرار علی النفاق۔ پہلے عنوان کے تحت امام نے تین آثار ذکر فرمائے یعنی اثر ابراہیم تیمی و ابن ملیکہ و حسن بصری۔ یہ تینوں آثار عنوانِ اوّل سے تعلق رکھتے ہیں۔ عنوانِ ثانی جو زیرِ تبصرہ ہے اس کے ماتحت امام نے ایک آیت اور دو مرفوع حدیثیں ذکر فرمائی ہیں آیت اور حدیثِ اوّل کا تعلق عنوانِ ثانی سے ہے لیکن دوسری حدیث جو حضرت عبادہ سے ہے اس کا تعلق عنوانِ اوّل سے ہے گویا لف و نشر غیر مرتب ہے۔ امام نے یہ آیت فرقہ مرجیہ کی تردید کے لیے ذکر فرمائی۔ جو یہ کہتے ہیں۔ ایمان ہو تو گناہ کچھ نقصان نہیں دیتا۔ چنانچہ آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گناہ کر کے توبہ نہ کرنے والا سخت خطرہ میں ہے اور ایمان کے ساتھ اگر گناہ ہو جائے تو وہ نقصان دیتا ہے۔

گناہ پر اصرار کے معنیٰ

یہ آیت سورہ آلِ عمران کی ہے۔ پوری آیت یہ ہے۔ وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ وَ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَ ھُمْ یَعْلَمُوْنَ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ

مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ الخ

روایتِ کلبی میں اس آیت مبارکہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک انصاری اور ثقفی دونوں کے درمیان حضور علیہ السلام نے مواخات (بھائی چارہ) قائم فرما دیا تھا۔ یہ دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ اتفاق سے حضور علیہ السلام ایک غزوہ میں تشریف لے گئے تو ثقفی بھی حضور علیہ السلام کے ساتھ چلے گئے اور ثقفی نے انصاری کو اپنے اہل وعیال کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کر دیا۔ ایک دن اس انصاری کی نظر ثقفی کی بیوی پر پڑ گئی جو نہا کر بال کنگھا رہی تھی۔ اس کے حسن وجمال کو دیکھ کر ان کی نیت بدلی۔ انہوں نے اس کو بلایا اور اس نے انکار کیا۔ انہوں نے اس کے رخسار پر زبردستی ہاتھ رکھ کر ہاتھ چوم لیا۔ اس کے فوراً بعد نادم ہوئے اور گھر سے دیوانہ وار بھاگتے ہوئے ایک پہاڑ کی طرف چلے گئے جہاں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگنے لگے۔ اس عرصہ میں وہ ثقفی بھی آ گئے۔ بیوی نے سارا ماجرا ان کو سنا دیا۔ وہ انصاری کی تلاش میں پہاڑ کے قریب پہنچے تو دیکھا انصاری سجدے میں گرا ہوا ہے۔ آنسوؤں سے بھتر تر ہیں اور یہ کہہ رہا ہے ——— رَبِّ ذَنْبِیْ ذَنْبِیْ قَدْ خُنْتُ اَخِیْ۔ الٰہی میرا گناہ، میرا گناہ۔ میں نے اپنے بھائی کی اہل میں خیانت کی ہے ——— انہوں نے جب یہ حال دیکھا تو کہنے لگے۔ اٹھو۔ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلیں۔ ممکن ہے تمہاری توبہ کا کوئی راستہ نکل آئے۔ یہ دونو ر عصر کے وقت خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ سارا واقعہ سنایا۔ جبریل امین مذکورہ بالا آیات لے کر نازل ہوئے۔ جس میں فرمایا گیا۔ جو لوگ گناہ کریں اور پھر نادم ہوں اور وہ اس پر اصرار نہ کریں اور توبہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ ان کے گناہ معاف دیتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے عرض کی۔ حضور (علیہ السلام)! یہ آیت اسی انصاری کے لیے خاص ہے یا سب کے لیے ہے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لیے ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا جو گناہ کر کے توبہ کرنے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ جو توبہ نہ کرے وہ سخت خطرہ میں ہے اور وہی گناہ پر اصرار کرنے والا ہے۔ معلوم ہوا گناہ پر اصرار کرنے والا وہ ہے جو گناہ کر کے نادم نہ ہو اور توبہ نہ کرے لیکن جن سے بمقتضاءِ بشریت گناہ ہو جائے اور وہ نادم ہو اور توبہ کر لے تو وہ گناہوں پر اصرار کرنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ ترمذی میں باسنادِ حسن حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو روایت ہے اس کا مضمون ہے کہ جو شخص گناہ کر کے توبہ کرے اگرچہ ستر مرتبہ گناہ کر کے توبہ کرے وہ گناہوں پر اصرار کرنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ اس خصوص میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین قابلِ ذکر ہیں۔ ان نفوسِ قدسیہ سے بمقتضائے بشریت اگر گناہ ہو جاتا تو فوراً نادم ہوتے اور توبہ کر لیتے۔ چنانچہ امت نے اجماع کیا کہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاسق نہیں ہو سکتا۔

۴۶۔ وَعَنْ زُبَيْدٍ قَالَ سَأَلْتُ اَبَا وَائِلٍ عَنِ الْمُرْجِئَةِ فَقَالَ حَدَّثَنِیْ عَبْدُ اللّٰهِ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ۔
(بخاری)

زبید سے روایت ہے وہ کہتے ہیں۔ میں نے ابا وائل سے مرجیہ کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا مجھ سے حدیث بیان کی عبداللہ بن مسعود نے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال کرنا (یعنی اس کو حلال جاننا) کفر ہے۔

فوائد ومسائل | ۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے ادب میں اور مسلم نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے۔ ترمذی نے

بھی اس حدیث کو لیا ہے ۲۔ سباب کے معنیٰ آدمی کے ناموس کو عیب لگانے کے ہیں یعنی گالی دینا۔ فسوق۔ فسق و فجور۔ اس کے اصل معنیٰ نکلنے کے ہیں۔ جیسے بولتے ہیں۔ فَسِقَتِ الرَّطِبَۃُ کھجور اپنے چھلکے سے نکل گئی لیکن اصطلاحِ شرح میں فسق کے معنیٰ حق سے نکلنے، اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں شیطان کے متعلق ہے۔ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ یعنی شیطان اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل گیا اور اللہ کا حکم اس نے نہیں مانا۔ واضح ہو کہ فسق کا اطلاق کفر، شرک اور گناہ پر آتا ہے۔ یعنی کبھی فسق سے مراد کفر و شرک ہوتا ہے اور کبھی وہ گناہ جو کفر و شرک نہ ہو۔ ہر جگہ سیاق و سباق اور دلائلِ شرعیہ کو نظر میں رکھتے ہوئے معنیٰ متعین کئے جائیں گے۔

زبید تابعی نے حضرت ابا وائل سے سوال کیا تھا کہ مرجیہ یہ کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ گناہ کچھ نقصان نہیں دیتا۔ کیا یہ درست ہے؟ اس پر حضرت ابا وائل نے مذکورہ بالا حدیث سُنا کر مرجیہ کے خیال کی تردید فرمائی۔

وقتالہ کفر ۔ مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔ یہاں کفر سے وہ اصطلاحی کُفر مراد نہیں جو آدمی کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے بلکہ کفر کا اطلاق گناہ پر تغلیظاً و تنبیہاً کیا گیا ہے۔ مطلب حدیث یہ ہے کہ مسلم کا مسلم پر حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ محبت و اتفاق کے ساتھ رہے اور جو شخص بلا وجہ شرعی مسلمان سے جنگ کرتا ہے وہ حقِ مسلم کو تلف کرتا ہے گویا کفر سے مراد کفرانِ حقوقِ مسلم ہے اور ظاہر ہے کہ مسلمان سے جنگ کرنا اس کو گالی دینے سے زیادہ اشد ہے تو اسی شدت کے اظہار کے لیے قتالِ مسلم پر (جو اشد کبیرہ ہے) کفر کا اطلاق کیا گیا اور ایک معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ بلا وجہ شرعی قتل و قتالِ مسلم کو حلال جاننا کُفر ہے۔

۴۶۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عُبَادَۃُ بْنُ الصَّامِتِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَرَجَ یُخْبِرُ بِلَیْلَۃِ الْقَدْرِ فَتَلَاحٰی رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ فَقَالَ اِنِّیْ خَرَجْتُ لِاُخْبِرَکُمْ بِلَیْلَۃِ الْقَدْرِ وَاِنَّہٗ تَلَاحٰی فُلَانٌ وَّفُلَانٌ فَرُفِعَتْ وَعَسٰی اَنْ یَّکُوْنَ خَیْرًا لَّکُمْ فَالْتَمِسُوْھَا فِی السَّبْعِ وَالتِّسْعِ وَالْخَمْسِ (بخاری)

حضرت انس کہتے ہیں مجھے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب قدر کی اطلاع دینے کے لیے باہر تشریف لائے۔ اتنے میں دو مسلمان جھگڑنے لگے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا میں شب قدر کی تاریخ بتانے آیا تھا لیکن فلاں فلاں جھگڑ رہے تھے اس لیے وہ اُٹھالی گئی اور شاید لیلۃ القدر کی تاریخ کا اُٹھا لیا جانا تمہارے لیے بہتر ہو (اب تم) لیلۃ القدر کو رمضان کی ۲۷-۲۹-۲۵ تاریخ کو تلاش کرو۔

فوائد و مسائل فتلاحی: باب تفاعل سے ہے۔ اس کے معنیٰ جھگڑنے کے ہیں۔ ملاحاۃ: جھگڑنے اور گالی دینے کو کہتے ہیں۔ التمسوھا: التماس کے معنیٰ طلب کرنے کے ہیں۔ رجلان: سے مراد عبداللہ بن ابی حدرد اور کعب بن مالک ہیں۔ کعب کے عبداللہ قرضدار تھے۔ اس قرض کے مطالبہ میں ان کے درمیان جھگڑا ہوا اور ان کی آوازیں حضور علیہ السلام کی موجودگی میں بلند ہوگئیں جس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اس لیے تشریف لایا تھا کہ تم کو شب قدر کی تاریخ بتاؤں مگر تمہارے جھگڑنے اور آواز بلند کرنے کی وجہ سے شب قدر اُٹھالی گئی۔

یعنی اب اس تاریخ کے بتانے سے مجھے روک دیا گیا۔ رُفِعَتْ کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اب رمضان کے مہینہ میں شب قدر کے وجود ہی کو ختم کر دیا گیا۔ کیونکہ اگر یہ مطلب ہوتا تو پھر حضور علیہ السلام یہ نہ فرماتے کہ اب تم رمضان کی ۲۷، ۲۹ یا ۲۵ تاریخ کو شب قدر تلاش کرو بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ اس کی صحیح تاریخ اٹھالی گئی ۲۔ حضرت کعب اپنے قرض کے سلسلہ میں جھگڑے تھے اور ظاہر ہے کہ اپنے حق کی وصولی کے لیے جھگڑنا بلکہ مسجد میں جھگڑنا کوئی بُری بات نہ تھی مگر چونکہ بحضور نبوی علیہ السلام وہ جھگڑے اور انکی آوازیں بلند ہوگئیں جو اگرچہ بے اختیار بلند ہوئیں مگر پھر بھی یہ امر اللہ رب العزّت کو ناگوار رہا اور ان کے جھگڑنے کی وجہ سے شبقدر کی تاریخ اُٹھالی گئی مگر حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت نے اس موقعہ پر بھی ساتھ دیا اور آپ نے فرمایا کہ گو تمہارے جھگڑنے کی وجہ سے تاریخ تو اُٹھالی گئی ہے مگر شب قدر کی تاریخ کا اُٹھ جانا یہ بھی تمہارے لیے خیر ہے، اور خیر اس لیے ہے کہ اب جبکہ تمہیں اصل تاریخ معلوم نہیں ہے تو رمضان کی ان تاریخوں میں ضرور قیام کرو گے اور اس کی تلاش کی کوشش کروگے۔ پھر اگر واقعی شبقدر کو پالوگے تو اس نعمتِ عظمےٰ کو حاصل کرلوگے اور اس کے ساتھ ساتھ شبقدر کی تلاش میں جو وقت صرف ہوا ہے اور شبقدر کے پانے کے لیے ہر رات میں جو عبادتیں کی ہیں ان کا اجر علیحدہ مل جائیگا (واللہ واسع علیم)

۳۔ اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب الصوم میں بھی ذکر کیا ہے اور نسائی نے اعتکاف میں۔ یہ حدیث عنوانِ اوّل سے تعلق رکھتی ہے مگر اس سلسلہ میں شارحین نے عنوان سے اس حدیث کی جو مناسبت بیان کی ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔

بَابُ سُؤَالِ جِبْرِيْلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

عَنِ الْإِيْمَانِ وَالْإِسْلَامِ وَالْإِحْسَانِ وَعِلْمِ السَّاعَةِ وَبَيَانِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهٗ ثُمَّ قَالَ جَاءَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ فَجَعَلَ ذٰلِكَ كُلَّهٗ دِيْنًا وَمَا بَيَّنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِوَفْدِ عَبْدِ الْقَيْسِ مِنَ الْإِيْمَانِ وَقَوْلِهٖ تَعَالٰى وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (بخاری)

باب حضرت جبرئیل علیہ السلام کا حضور علیہ السلام سے ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کے متعلق سوال کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب دینا۔ پھر یہ فرمانا۔ یہ جبرئیل تھے تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب باتوں کو دین فرمایا (اور اس باب میں اس کا بھی بیان ہے) جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد عبد القیس کے لیے امور ایمان بتائے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”جو کوئی اسلام کے سوا دوسرا دین چاہے تو ہرگز قبول نہ ہوگا۔“

واضح ہو کہ ان عنوانات سے امام کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اسلام، ایمان، احسان، قیامت کا اعتقاد وغیرہ یہ سب دین ہے اور یہ کہ اسلام اور ایمان دونوں ایک چیز ہیں۔ حالانکہ حدیثِ ہذا سے اسلام و ایمان میں مغائرت ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح اس آیت سے بھی امام نے یہ استدلال کیا ہے کہ اسلام اور دین ایک چیز ہے۔

۴۷۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَارِزًا يَوْمًا لِلنَّاسِ

حضرت ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے

فَاَتَاہُ رَجُلٌ فَقَالَ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ الْاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَبِلِقَآئِہٖ وَرُسُلِہٖ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ قَالَ مَا الْاِسْلَامُ قَالَ الْاِسْلَامُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکَ بِہٖ وَتُقِیْمُ الصَّلٰوۃَ وَتُؤَدِّیَ الزَّکٰوۃَ الْمَفْرُوْضَۃَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ قَالَ مَا الْاِحْسَانُ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ قَالَ مَتَی السَّاعَۃُ قَالَ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْھَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ وَ سَاُخْبِرُکَ عَنْ اَشْرَاطِھَا اِذَا وَلَدَتِ الْاَمَۃُ رَبَّھَا وَ اِذَا تَطَاوَلَ رُعَاۃُ الْاِبِلِ الْبُھْمُ فِی الْبُنْیَانِ فِیْ خَمْسٍ لَا یَعْلَمُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ ثُمَّ تَلَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ الْاٰیَۃَ ثُمَّ اَدْبَرَ فَقَالَ رُدُّوْہُ فَلَمْ یَرَوْا ھٰذَا جِبْرِیْلُ جَآءَ یُعَلِّمُ النَّاسَ دِیْنَھُمْ

(بخاری)

(ظاہر ہوتے مجمع صحابہ ہیں) تو ایک آدمی آیا اس نے سوال کیا کہ ایمان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اللہ تعالیٰ کی لقاء پر، اس کے رسول پر اور مرنے کے بعد اُٹھنے پر ایمان رکھے۔ اس نے سوال کیا۔ اسلام کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کہ تو خاص اللہ کی عبادت کرے۔ اس کا کسی کو شریک نہ بنائے نماز قائم کرے۔ زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اس نے سوال کیا احسان کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے اس طرح گویا کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تو اس کو نہیں دیکھتا تو وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔ پھر اس نے سوال کیا۔ قیامت کب آئے گی؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جس سے قیامت کے متعلق پوچھا گیا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ ہاں میں تجھ کو [illegible]ت کی نشانیاں بتاتا ہوں (جو یہ ہیں) جب کہ عورت اپنے [illegible] کو جنے اور جب سیاہ اونٹ چرانے والے بڑی بڑی عمارتوں میں رہیں (اور تکبر و تفاخر کا اظہار کرنے لگیں) اور پانچ امور ہیں جن کو (بالذات) کوئی نہیں جانتا۔ سوائے خدا کے۔ پھر حضور علیہ السلام نے آیت اِنَّ اللّٰہ عندہ علم الساعۃ پڑھی جس میں امورِ خمسہ کا ذکر ہے۔ قیامت وغیرہ کا ذکر ہے۔ پھر وہ سائل چلا گیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اس کو بلاؤ تو صحابہ کو کچھ نظر نہ آیا۔ اس پر حضور نے فرمایا یہ جبریل تھے لوگوں کو ان کا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو علماء محدثین نے ام السنہ بھی کہا ہے۔ گویا جس طرح قرآنِ مجید کے تمام اہم مطالب و مف[illegible] پر بالاجمال حاوی ہونے کی وجہ سے سورہ فاتحہ کا نام ام الکتاب ہے۔ اسی طرح یہ حدیث اپنی [illegible] کی وجہ سے ام السنہ کہے جانے کی مستحق ہے۔ اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے امام مسلم نے مسلم کو اسی حدیث سے شروع کیا ہے اور امام بغوی نے اپنی دونوں تالیفوں مصابیح اور شرح السنۃ کا آغاز اسی مضمون کی حدیث سے کیا ہے۔ علامہ قاضی عیاض نے فرمایا۔ یہ حدیث تمام وظائف و عبادات ظاہریہ و باطنیہ کو حاوی ہے۔ حتیٰ کہ تمام شریعت کے علوم کا ماخذ ہے۔ امام بخاری نے تفسیر و زکوٰۃ میں بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ مسلم نے ایمان میں۔ ابن ماجہ نے سنن و فتن میں۔ ابوداؤد نے سنت میں اور نسائی نے ایمان میں۔ ترمذی، احمد، بزار ابنِ عوانہ وغیرہم محدثین نے بھی اس حدیث کو اپنے مصنف میں ذکر کیا ہے۔

۲- بارزاً کے معنیٰ ظاہر ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً تو زمین کو ظاہر دیکھے گا یعنی اس پر کوئی سایہ وغیرہ نہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ حضور علیہ السلام بھی ایک دن مجمع صحابہ میں ظاہر ہوئے فَأَتَاهُ رَجُلٌ رجل سے مراد جبریل ہیں جو بصورتِ رجل آئے۔ ملائکہ کی جمع ملائک ہے۔ اصل اس کی مَلْأَكٌ ہے مَفْعَلٌ کے وزن پر ملائکہ اجسامِ نوری ہیں، جن کو اللہ تعالےٰ نے یہ طاقت دی ہے کہ جو شکل چاہیں بن جائیں۔ وَرُسُلِهٖ یہ جمع ہے رسول کی۔ رسول وہ ہے جس پر کتاب نازل ہوئی یا فرشتہ اُترا ہو اور نبی وہ ہے جس پر کتاب یا فرشتہ نازل نہ ہوا ہو۔ اس لحاظ سے ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں۔ بِالْبَعْثِ اس سے مراد قبروں سے اٹھنا یعنی مرنے کے بعد زندہ کیا جانا ہے۔ تَعْبُدَ اللّٰهَ عبادت غایت خضوع اور انتہائے تذلل کو کہتے ہیں اور اس میں یہ شرط ہے کہ جس کی عبادت کی جائے اس کی اُلوہیت کا اعتقاد بھی ہو۔ اللہ رب العزت جل مجدہٗ کا علم ذاتی ہے۔ جس میں شرکت نہیں ہوتی۔ اللہ وہ ذاتِ مقدس ہے جو واجب الوجود ہے متصرف بالذات ہے۔ تمام خوبیوں کا جامع اور عیبوں سے پاک ہے اور ساری کائنات کا خالق و رازق ہے۔ خدا کی اطاعت کو عبادت کہتے ہیں۔ احسان کے لغوی معنیٰ نیکی کے ہیں۔ یہ ضد ہے بُرائی کی۔ اشراط۔ یہ شرط کی جمع ہے۔ اس کے معنیٰ علامت (نشانی) کے ہیں۔ رب کے معنیٰ مالک، سردار، تربیت دینے والا، پالنے والا (مربی و مصلح) کے آتے ہیں۔ یہ اللہ عزوجل کی صفت بھی ہے۔ جب بغیر اضافت کے رب کا لفظ بولا جائے تو اس سے مراد اللہ عزوجل ہوتا ہے اور اضافت کے ساتھ غیر اللہ پر بھی اس لفظ کا استعمال جائز ہے جیسے اس حدیث میں رب بمعنی سردار آیا ہے یا جیسے ماں باپ کو رب کہتے ہیں کیونکہ وہ بچہ کی تربیت کرتے ہیں۔ گھر کے مالک کو، آقا کو، حاکم کو بھی رب کہتے ہیں۔ بہرحال غیر اللہ پر اس کا اطلاق اضافت کے بغیر کرنا جائز نہیں ہے۔ إِذَا تَطَاوَلَ کے معنیٰ فخر و تکبر کے ہیں یعنی یہ قیامت کی علامت ہے کہ ذلیل اور کمینے لوگ اونچے اونچے محلوں میں رہیں اور تکبر و غرور کریں۔ بُهْمٌ، ب کے پیش کے ساتھ وہ چیز جو بالکل سیاہ ہو۔

ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کا بیان

حدیث زیر بحث کو امام بخاری نے کتاب الزکوٰۃ و کتاب التفسیر میں بھی ذکر کیا ہے۔ محدثین کرام اس حدیث کو امام السنہ سے موسوم کرتے ہیں۔ جیسے سورہ فاتحہ قرآن کریم کا خلاصہ ہے۔ ایسے ہی یہ حدیث علوم سنت کا خلاصہ ہے اور اس کی جڑ ہے۔

۲- حدیثِ ہٰذا میں ایمان، اسلام، احسان، قیامت اور اس کی علامات کا ذکر ہے ۳- ایمانیات میں ایمان باللہ، ملائکہ، انبیاء کرام، لقاءِ الٰہی اور بعث کا ذکر ہے اور اسلام میں عبادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ کا ذکر ہے۔ یہ حدیث دراصل مختصر ہے۔ مفصل میں ایمانیات میں کتبِ سماویہ، روزِ قیامت اور ہر خیر و شر کی تقدیر کا بھی ذکر ہے اور اسلام میں حج بیت اللہ اور توحیدِ خداوندی و رسالتِ محمدی کا بھی ذکر ہے۔ یہاں ہم حدیثِ ہٰذا میں جن امور کا ذکر ہے بیان کرتے ہیں۔

ایمان کے معنیٰ

ایمان کے اصل معنیٰ کسی کے اعتبار و اعتماد پر کسی بات کو سچ ماننے کے ہیں۔ کما فی القرآن۔ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِيْنَ (سورہ یوسف ع ۲) —— لیکن اصطلاح شرع میں ایمان یہ ہے کہ جو علم اور ہدایت اللہ کے پیغمبر اللہ کی طرف سے لائیں، اس کی تصدیق کرنا اور ان کو حق جان کر قبول کرنا۔ پیغمبر کی اس قسم کی کسی بات کو نہ ماننا ہی اس کی تکذیب ہے جو انسان کو کافر کر دیتی ہے۔ لہٰذا مومن ہونے کے لیے ضروری ہے

کلّ مَا جَآءَ بِهِ الرَّسُوْلُ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ان تمام چیزوں اور حقیقتوں کی جو اللہ کے پیغمبر اللہ کی طرف سے لائے تصدیق کی جائے۔ لیکن ان سب چیزوں کی پوری تفصیل معلوم ہونی ضروری نہیں ہے۔ یعنی ایمانیات سے متعلق حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر تشریح خود فرمادی ہے اس کو اسی قدر تشریح کے ساتھ ماننا ضروری ہے اور ایمان کی جن باتوں کو حضور نے مجمل رکھا، ان کو اسی اجمال کے ساتھ ماننا ضروری ہے۔ غرضیکہ جن امور کا ثبوت حضور علیہ السلام سے ایسے قطعی و بدیہی طریقہ سے ہو جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو دین کی ایسی باتوں کو اصطلاحِ شرع میں ضروریاتِ دین کہتے ہیں۔ ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کسی کا انکار کرے مومن نہیں رہے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ایمان کی جو ضروری باتیں بیان فرمائی ہیں۔ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر ان کا اسی تشریح و تعین کے ساتھ بیان آیا ہے مثلاً سورہ بقرہ کے رکوع ۱، ۲۲ و ۴۰ ہیں اور سورہ نسا کے رکوع ۲۰ ہیں۔

ایمان باللہ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے موجود وحدہٗ لاشریک خالقِ کائنات متصرفِ موجودات اور رب العالمین ہونے پر یقین کیا جائے۔ عیب و نقص کی ہر بات سے پاک اور ہر صفتِ کمال سے اس کو متصف سمجھا جائے اور اس کی تمام صفاتِ علم و قدرت اور کلام، سمع و بصر و حیات پر ایمان لایا جائے۔

ایمان بالملائکہ فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوقات میں ایک مستقل نوع کی حیثیت سے ان کے وجود کو حق مانا جائے اور یہ یقین کیا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ و محترم مخلوق ہیں۔ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ (انبیاء ع ۲) ——— جن میں شر، شرارت، عصیان اور بغاوت کا مادہ ہی نہیں ہے۔ وہ چھوٹے بڑے گناہوں سے پاک ہیں۔ اللہ کے حکم کے خلاف نہ بھول کر کھاتے ہیں اور نہ قصداً۔ ان کا کام صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت ہے لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (تحریم ع ۲) ——— فرشتے نہ مرد ہیں نہ عورت، ان کو قدیم ماننا، یا ان کی ادنیٰ توہین کرنا، یا ان کے وجود سے انکار کرنا یا یہ کہنا کہ نیکی کی قوت فرشتہ ہے یہ سب باتیں کفر ہیں۔ فرشتوں کے متعلق مختلف فرائض ہیں جو یہ بحکم الٰہی ادا کرتے ہیں۔ مثلاً پانی برسانا، جان نکالنا۔ ماں کے پیٹ میں بچہ کی صورت بنانا وغیرہ وغیرہ۔ قرآنِ حکیم نے فرشتوں کے فرائض اور ان کی صفات کو تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بعض آیاتِ قرآنیہ کا خلاصہ ہم یہاں ذکر کئے دیتے ہیں۔

۱۔ فرشتے اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان پیام رسانی کے فرائض ادا کرتے ہیں۔ الحج ع ۱۰

۲۔ انبیاء علیہم السلام پر وحی لانے کی خدمت بھی انہی کے سپرد ہے۔ شوریٰ ع ۵

۳۔ یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لے کر بھی اترتے ہیں۔ حضرت زکریا و مریم کو بشارت دینے کے لیے اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب لے کر آئے۔ مریم ع ۲ و ہود ع ۷

۴۔ فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں اور ان کے ثواب اور گناہ کے کاموں کو لکھتے ہیں۔ انفطار ع ۱، رعد ۱، انعام ع ۸، ق ع ۲۔

۵۔ فرشتے انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا تعالیٰ کی رحمت یا لعنت لے کر نازل ہوتے ہیں۔ انبیاء ع ۷، الصفت ع شوریٰ ع ۱

۶- اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں اور مومنوں کے لیے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔ آلِ عمران ع ۹ بقرہ ع ۱۹
۷- جنت و دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیرِ اہتمام ہوگا۔ زمر ع ۸، رعد ع ۳، مدثر ع ۱
۸- قیامت کے دن بھی یہ تختِ الٰہی کے حامل ہوں گے۔ حاقہ ع ۱، انبیاء ع ۲
۹- فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔ ہمیشہ اس کی تہلیل و تقدیس اور حمد و ثناء میں مصروف رہتے ہیں اور بحکمِ الٰہی پوری مملکتِ الٰہیہ میں خدا کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کرتے ہیں۔ شوریٰ ع ۱ والمدبرات امراً ۱

قرآنِ حکیم کی ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتے انسانوں اور جنوں سے ایک علیحدہ مستقل مخلوق ہیں۔ چنانچہ ملائکہ کے وجود پر اور اس پر کہ وہ ذوات قائم بالنفسہا ہیں۔ تمام عقلاء کا بھی اتفاق ہے۔ البتہ ان کی حقیقت میں اختلاف ہے فلاسفہ کے نزدیک یہ نفوس ناطقہ کے علاوہ جواہر مجردہ قائمہ بالنفسہا ہیں۔ نصاریٰ کی ایک جماعت انہیں نفوسِ بشریہ مفارقہ بتاتی ہے اکثر اہلِ اسلام کے نزدیک ملائکہ، اجسامِ لطیفہ نورانیہ ہیں۔ ایک فرماں بردار معصوم مخلوق ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے اشکالِ مختلفہ و صورِ متفارقہ میں متشکل ہونے کی قدرت عطا فرمائی ہے۔

ملائکہ کے متعلق ایک شبہ اور اس کا جواب

جو لوگ وجودِ ملائکہ کے منکر ہیں یا اس کو وہمی یا خیالی چیز سمجھتے ہیں وہ ان کے عدمِ وجود پر سب سے اہم دلیل صرف یہ دیتے ہیں کہ اگر وہ موجود ہوتے تو نظر آتے۔ لیکن یہ سخت جاہلانہ شبہ ہے۔ دنیا میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کے وجود کو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن وہ نظر نہیں آتیں۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے جبکہ خوردبین کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ ہوا، پانی، خون کے قطرہ میں جراثیم کیا کسی نے دیکھے تھے؟ لیکن آج خوردبین کے ذریعے ہر آنکھ والا ان جراثیم کو دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح رُوح کو لیجئے کیا یہ نظر آتی ہے اور کیا اقلیمِ بدن میں جو چیز جان کے نام سے موسوم ہے اور جس کے وجود کو ایک دہریہ بھی تسلیم کرتا ہے کسی آلہ سے دیکھی جا سکتی ہے تو جیسے ہماری آنکھیں خود اپنی روح یا جان کو دیکھنے سے عاجز ہیں۔ اسی طرح وہ فرشتوں کے دیکھنے سے بھی قاصر ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ جو چیز نظر نہ آسکے اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ سخت جاہلانہ خیال ہے۔

لقاءِ الٰہی پر ایمان

لقاءِ الٰہی پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی تصدیق کی جائے کہ آخرت میں اللہ عزوجل کا دیدار ہوگا۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے لقاءِ الٰہی کو مومن کے لیے بہترین نعمت قرار دیا ہے اور فرمایا ہے۔ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا کہ جو شخص آخرت میں دیدارِ باری تعالیٰ کی تمنا رکھتا ہے اس کو چاہیئے عملِ صالح کو اختیار کرے اور اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ غرضکہ یہ یقین کرنا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار حق ہے اور آخرت میں اللہ کے نیک بندوں کو اللہ کا دیدار ہوگا یہ بھی ایمانیات میں داخل ہے۔

ایمان بالرسل

رسولوں پر ایمان لانا یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ اللہ عزوجل نے مخلوق کی ہدایت کے لیے جسقدر انبیاء و مرسلین مبعوث فرمائے۔ وہ سب اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور پیغمبر ہیں انہوں نے جو کچھ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا وہ حق ہے اور انہوں نے اپنے فرضِ نبوت کو کما حقہٗ ادا فرمایا۔ قرآنِ پاک میں ہے:-

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ ع ۴۰)

ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا۔ ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

نیز سورہ نساء کے رکوع ۲۰ میں فرمایا۔ جس نے خدا کا اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور قیامت کا انکار کیا وہ سخت گمراہ ہوا، نیز سورۂ نساء کے رکوع ۲۱ میں فرمایا کہ ماننے کے معاملے میں خدا اور رسول میں کچھ فرق نہیں ہے اور جو اللہ تعالےٰ کے بعض رسولوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا۔ وہ یقیناً کافر ہیں۔ گویا یہ عقیدہ صرف اور صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس میں مومن ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیاء کی نبوت و رسالت کی تصدیق کی جائے۔ اس کے برعکس دنیا کے کسی مذہب میں یہ بات نہیں ہے۔ چنانچہ ایک یہودی کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں ہے۔ ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کر کے بھی عیسائی رہ سکتا ہے۔ ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ، شودر، چنڈال، ناپاک وغیرہ کہہ کر بھی ہندو رہ سکتا ہے۔ لیکن حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناممکن کر دیا کہ کوئی ان کی پیروی کے دعویٰ کے ساتھ ان سے پہلے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے۔ غرضکہ اسلام میں تمام پیغمبروں کی نبوّت کی تصدیق کرنا اور ان کا پورا احترام کرنا ایمانیات میں داخل ہے۔ پھر نبوت و رسالت کے متعلق مندرجہ ذیل امور کو ماننا بھی ضروری ہے۔

۱۔ ہر نبی مستقل طور پر نبی ہے۔ نبوت کی کوئی قسم نہیں ہے۔ تمام انبیاءِ کرام نفسِ نبوت میں برابر ہیں۔ کسی نبی کی نبوت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ظل یا عکس یا پرتو نہیں اور نہ یہ کہ حضور علیہ السلام کی نبوت قدیم ہے اور باقی کی حادث۔ نفسِ نبوت میں گو تمام انبیاء کرام برابر ہیں مگر رتبہ و مقام میں فرق ضرور ہے۔ ہمارے حضور علیہ السلام تمام انبیاء کے سردار امام المرسلین اور خاتم النبیین ہیں اور آپ کا درجہ تمام انبیاء علیہم السلام سے بلند و بالا ہے ۳۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک نبوت کا سلسلہ جاری رہا اور حضور اکرم آخری نبی ہیں۔ آپ پر نبوت و رسالت کو ختم کر دیا گیا اور دین کامل ہو گیا۔ اب قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے لیے نجات و فلاح صرف آپ ہی کے اتباع اور آپ کی ہی ہدایات کی پیروی میں ہے ۴۔ انبیاء کرام کے خصائص و فضائل و معجزات کو ماننا بھی ضروری ہے اور ان کی تعظیم فرضِ عین بلکہ تمام فرائض کی اصل ہے۔ ان کی ادنیٰ توہین کفر و ارتداد ہے ۵۔ انبیاء کرام چھوٹے بڑے گناہ سے قبلِ نبوت و بعدِ نبوت پاک ہیں اور تمام انبیاء معصوم ہیں ۶۔ انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ ایک آن کے لیے ان پر وعدہ الٰہی کے مطابق موت آئی اور پھر وہ زندہ ہو گئے۔ ان کی زندگی شہیدوں کی زندگی سے بڑھ کر ہے (تکمیل الایمان شیخ عبد الحق محدث دہلوی) ۷۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو غیوب پر مطلع کیا۔ خصوصاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غیوبِ کثیرہ وافرہ کا عالم بنایا اور زمین و آسمان کا ہر ذرّہ آپ کے پیش کر دیا (حدیث طبرانی)۔ ۸۔ ہمارے حضور افضل الخلق اور اللہ عزوجل کے نائبِ مطلق ہیں۔ آپ تمام انبیاء علیہم السلام کے نبی ہیں اور تمام جہان میں کوئی کسی خوبی میں آپ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ آپ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے قاسم ہیں۔ آپ کو مرتبۂ معراج عطا ہوا۔ حضور علیہ السلام نے بچشمِ خود رب العزت جل مجدہٗ کے دیدار کا شرف حاصل کیا اور عرش و فرش کے تمام عجائب و غرائب کا شبِ معراج

مشاہدہ فرمایا۔

نوٹ:۔ یہ چند ضروری باتیں یہاں لکھ دی ہیں۔ عقائد کی تفصیل کے لیے بہارِ شریعت حصہ اوّل کا مطالعہ کیجئے۔

اسلام کے معانی اور اس کی حقیقت

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایمانیات کو بیان فرما چکے تو پھر سائل نے آپ سے اسلام کے متعلق سوال کیا۔ واضح ہو کہ اسلام کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنے آپ کو کسی کے سُپرد کر دینا اور بالکل اسی کے تابع فرمان ہو جانا۔ انبیاءِ کرام کے لائے ہوئے دین کو اسلام اسی لیے کہتے ہیں کہ اس میں بندہ اپنے کو بالکل اللہ تعالےٰ کے سپرد کر دیتا ہے اور اس کی مکمل اطاعت کو اپنی زندگی کا دستور بنا لیتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:۔

۱۔ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا (حج ع ۵)	تمہارا اللہ وہی الہ واحد ہے لہذا تم اسی کے مطیع (مُسلم) ہو جاؤ۔
۲۔ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ (نساء ع ۱۷)	اس سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔ جس نے اپنے خدا کے سُپرد کر دیا (یعنی وہ بندہ مُسلم ہو گیا)
۳۔ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (آل عمران ع ۹)	اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے وہ ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آدمی آخرت میں سخت نقصان میں رہے گا۔

غرضیکہ اسلام کی رُوح یہی ہے کہ آدمی اپنے کو کلی طور پر اللہ تعالیٰ کے سُپرد کر دے اور ہر پہلو سے اس کا مطیع ہو جائے۔ انبیاءِ کرام جو شریعتیں لائے۔ اس میں اسلام کے لیے انہوں نے چند ارکان کی نشاندہی فرمائی۔ جن کی حقیقت اس "حقیقتِ اسلام" کے پیکرِ محسوس کی سی ہے اور اس حقیقت کا نشو و نما اور اسکی تازگی انہیں ارکان سے ہوتی ہے جو تعبدی امور ہوتے ہیں اور ظاہری نظر انہیں ارکان کے ذریعہ ان لوگوں میں فرق و امتیاز کرتی ہے۔ جنہوں نے اپنا دستورِ حیات اسلام کو بنایا ہے اور جنہوں نے نہیں بنایا۔ بہر حال حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا جو آخری اور مکمل دستورِ حیات ہمارے سامنے رکھا اس میں آپ نے عبادتِ الٰہی، نماز، زکوٰۃ اور روزہ کو قرار دیا اور مفصل حدیث میں توحیدِ خداوندی اور رسالتِ محمدی کی شہادت نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج بیت اللہ کو ارکانِ اسلام قرار دیا (مسلم شریف) اور فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے:

۱۔ کلمہ شہادت ۲۔ نماز ۳۔ روزہ ۴۔ زکوٰۃ اور ۵۔ حج

عبادت کے معنیٰ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام یہ ہے کہ خاص اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ عبادت کے معنیٰ انتہاءِ تذلل اور غایتِ خضوع کے ہیں۔ یعنی انسان اپنے آپ کو کسی کے سامنے ذلت و پستی کے اس آخری درجے میں سمجھے کہ جس کے بعد عاجزی اور ذلت کا کوئی درجہ ہی نہ ہو۔ اس قسم کی عاجزی کرنے والا عابد ہے اور ایسی عاجزی عبادت ہے۔ عبادت کا تعلق نہ تو ما فوق الاسباب امور سے ہے اور نہ غائبانہ ندا سے ہے۔ بلکہ اس کا تعلق محض اعتقاد سے ہے اور ظاہر ہے ایسی عاجزی اور ایسی ذلت و پستی کا اظہار اسی ہستی کے لیے کیا جا سکتا ہے جس

کے متعلق صفاتِ مستقلہ کا اعتقاد رکھا جائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی ہیں (خود بخود اس میں موجود ہیں۔ کسی نے اس کو کوئی صفت دی نہیں) اور یہ صفاتِ ذاتیہ استحقاقِ عبادت کا مناط و مدار ہیں۔ ان صفاتِ ذاتیہ کا کسی میں ثابت کرنا استحقاقِ عبادت و اُلوہیت کا ثابت کرنا ہے اور جو صفت استحقاقِ عبادت کا مناط ہے۔ خواہ وہ علم ہو یا قدرت تصرف ہو یا خالقیت، ان کا ذاتی اور مستقل ہونا ضروری ہے ورنہ افرادِ ممکنات کا مستحقِ عبادت ہونا لازم آئیگا۔ کیونکہ عطائی غیر مستقل حادث صفات" افرادِ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ استحقاقِ عبادت کے لیے صفاتِ مستقلہ لازم ہیں اور صفاتِ مستقلہ کے لیے استحقاقِ عبادت لازم ہے۔ کسی کو مستحقِ عبادت کہنا اس کے لیے استقلالِ ذاتی کو ثابت کرنا ہے اور کسی کو مستقل بالذات ماننا مستحقِ عبادت قرار دینا ہے۔

عبادت و تعظیم میں فرق

یہیں سے عبادت و تعظیم میں فرق معلوم ہوگیا۔ عبادت میں تعظیم بھی ہوتی ہے اور جس کی تعظیم کی جائے اس کے واجب الوجود اور مستحقِ عبادت ہونے کا اعتقاد بھی ہوتا ہے اور تعظیم میں یہ اعتقاد نہیں ہوتا یعنی ہر عبادت تعظیم ہے مگر ہر تعظیم عبادت نہیں ہے۔ لہٰذا غیر اللہ کی عبادت شرک ہے تعظیم شرک نہیں ہے بلکہ جائز بلکہ بعض کی تعظیم فرضِ عین ہے۔ مثلاً قرآنِ پاک کی، انبیاء کرام علیہم السلام و ملائکہ کی تعظیم و توقیر۔ بعض کی تعظیم واجب ہے مثلاً والدین کی۔ بعض لوگ تعظیم و عبادت میں فرق نہیں کرتے یا ان کے مفاہیم سے جاہل ہیں۔ جہاں وہ غیر اللہ کی تعظیم ہوتے دیکھتے ہیں جھٹ شرک کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں حالانکہ یہ بدیہی ہے کہ تعظیم کی وہی صورت شرک قرار دی جائے گی جس میں معظم کی اُلوہیت کا اعتقاد ہو۔ اس کے علاوہ تعظیم کی جتنی بھی صورتیں اور شکلیں ہیں ان میں سے بعض ناجائز و حرام تو ہو سکتی ہیں مگر شرک و کفر ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً قبر کو سجدہ کرنا اور مقبور کی اُلوہیت اور واجب الوجود ہونے کا عقیدہ رکھ کر اور اس کے لیے صفاتِ مستقلہ مان کر سجدہ کرنا شرک ہے۔ لیکن یہ اعتقاد نہ ہو اور محض قبور کی تعظیم کے لیے سجدہ کرے تو یہ ناجائز و حرام ہے مگر شرک نہیں ہے۔ غرضیکہ وہ تعظیم جو معظم کی اُلوہیت و واجب الوجود ہونے کے اعتقاد کے ساتھ نہ کی جائے اس میں تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس تعظیم کی کچھ صورتیں ناجائز و حرام ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ مذکورہ بالا اعتقاد کے ساتھ جو تعظیم کی جائے وہ شرک قرار پا جائے۔ سجدہ ہی کو لیجیے۔ مطلقاً غیر اللہ کو سجدہ کرنا اگر شرک مان لیا جائے تو پھر تو (معاذ اللہ) تمام ملائکہ اور برادرانِ یوسف علیہ السلام بھی مشرک قرار پائیں گے۔ کیونکہ قرآنِ پاک نے یہ تصریح کی ہے کہ ملائکہ نے حضرت آدم کو اور برادرانِ حضرت یوسف نے حضرت یوسف کو سجدہ کیا تھا بلکہ یہ کہنا پڑے گا کہ خود اللہ عزوجل نے شرک کا حکم دیا (معاذ اللہ)

ظاہر ہے کہ ملائکہ کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا اور برادرانِ یوسف کا جناب یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا، ان کو واجب الوجود جان کر سجدہ کرنا نہ تھا بلکہ اللہ کا بندہ اور اس کی مخلوق سمجھ کر محض تعظیم کے لیے سجدہ تھا۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو تعظیم معظم کی اُلوہیت اور واجب الوجود ہونے کے عقیدے کے ساتھ نہ کی جائے وہ شرک ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی۔

ہم اہلِ سنت و جماعت انبیاء کرام و بزرگانِ عظام کی تعظیم ضرور کرتے ہیں۔ ان سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں مگر انہیں اللہ نہیں مانتے اور نہ استقلالِ ذاتی ان کے لیے ثابت کرتے ہیں اور نہ انہیں مستحقِ عبادت جانتے ہیں اور نہ واجب الوجود لہٰذا ہم پر

محض تعظیم کے جرم میں وہابیہ و دیوبندیہ کا شرک کا فتویٰ دینا کسی طرح بھی درست نہیں ہے کیونکہ ہم تعظیم کی ان صورتوں کو بھی نہیں اپناتے جو ناجائز و حرام ہیں اور جن کے ناجائز ہونے پر دلائل شرعیہ مل جاتے ہیں جیسے سجدہ تعظیمی ہم اس کو حرام و ناجائز سمجھتے ہیں کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر اللہ کے لیے سجدہ تعظیمی کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ فافہم

شرک کی تعریف

شرک کے معنیٰ اللہ کے سوا کسی اور کو خدا جاننا یا عبادت کے لائق سمجھنا یا خدا کی صفات جیسی کہ اس میں ہیں کسی اور میں ماننا یعنی اللہ کی تمام صفتیں ازلی، ابدی، قدیم اور ذاتی ہیں۔ مثلاً اس کا علم ذاتی ہے۔ اس کا ہر کمال ابدی ہے۔ کسی نے اس کو دیا نہیں۔ وہ خود بخود علیم، عالم الغیب، قادر اور مختار ہے۔ تو بالکل اسی طرح غیر اللہ میں کسی صفت کو مانا جائے تو یہ یقیناً شرک ہے اور اگر اس طرح نہ مانا جائے تو یہ ہرگز ہرگز شرک نہیں۔ شرح عقائد نسفی میں ہے۔

الاشراك هو اثبات الشريك في الالوهية يعني واجب الوجود كما للمجوس او بمعنى استحقاق العبادة كما لعبدة الاصنام

شرک یہ ہے کہ کسی کو الوہیت میں شریک ثابت کیا جائے بمعنی وجوب وجود جیسا مجوس کرتے ہیں یا بمعنی استحقاق عبادت جیسا بت پرست کرتے ہیں (شرح عقائد)

حضرت شیخ محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں "بالجملہ شرک سہ قسم است در وجود و در خالقیت و در عبادت"۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ شرک تین طرح پر ہوتا ہے ایک یہ کہ اللہ کی طرح کسی کو واجب الوجود جانے ـــــ دوم یہ کہ اور کو اللہ کے سوا خالق جانے ـــــ سوم یہ کہ غیر خدا کی عبادت کرے (یا اس کو مستحق عبادت سمجھے) جلد اول صفحہ ۶۱)

ان عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۔ واجب الوجود اپنی ذات اور کمالات میں دوسرے سے بالکل بے نیاز اور غنی بالذات صرف اللہ عزوجل ہے اور فقط وہی عبادت کا مستحق ہے اور کوئی نہیں ۲۔ اب جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کو واجب الوجود مانے یعنی یہ کہے کہ یہ شخص اپنی ذات اور کمالات میں کسی کا محتاج نہیں ہے یا اللہ کے سوا کسی اور کو عبادت کا مستحق ٹھہرائے جیسے ہندوستان کے آریہ روح اور مادہ کو قدیم مانتے ہیں اور واجب الوجود سمجھتے ہیں۔ یعنی یہ کہتے ہیں کہ روح اور مادہ کی ذات بنانے والے سے بے نیاز ہے یہ مشرک ہیں ۳۔ اسی طرح اگر کوئی کسی کے کمالات کو ذاتی مانے اور اس کے کمال میں اس کو دوسرے سے غنی اور بے نیاز سمجھے تو شرک ہے خواہ وہ کمال علم ہو یا قدرت یا حیات یا سمع یا بصر ہو جیسے ستارہ پرستوں کا خیال ہے کہ عالم کے تغیرات کواکب کی تاثیرات سے ہیں اور کواکب ان تاثیرات میں غنی بالذات ہیں۔ کسی کے محتاج نہیں۔ یہ عقیدہ بھی شرک ہے اور ایسے اعتقاد رکھنے والے مشرک ـــــ اسی طرح اگر کوئی کسی دوسرے کی عبادت کرے جس کو ہندی میں پوجا اور فارسی میں پرستش کہتے ہیں یہ بھی شرک ہے جیسے بت پرست بتوں کو مستحق عبادت سمجھتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں یہ مشرک ہیں۔ لیکن ! جو لوگ اللہ کے عطا کیے ہوئے کمالات اس کے بندوں میں مانتے ہیں اور کمالات کو عطاء الٰہی جانتے ہیں وہ ہرگز مشرک نہیں۔ مثلاً کوئی شخص آدمی کو سمیع و بصیر کہے اور یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صفت سمع و بصر عطا فرمائی ہے تو وہ مومن اور موحد ہے مشرک نہیں۔ مشرک جب ہوتا ہے کہ یہ مانتا ہے کہ آدمی میں سمع و بصر کی صفت ذاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے اللہ عزوجل کی صفات میں سمیع و بصیر ذکر کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود انسان کو بھی سمیع و بصیر قرار دیا ہے۔ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۔ الغرض شرک اس لیے نہیں کہ انسان میں جو سمع و بصر ثابت کی گئی ہے

وہ عطائی ہے خدا میں ذاتی ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں کتب وسنت سے دی جا سکتی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ کسی بھی کمال کو جو ممکن البشر ہے غیر اللہ میں عطائی مانا جائے تو شرک نہیں اور ذاتی مانا جائے تو شرک ہے۔ اگر ذاتی وعطائی کا فرق نہ کیا جائے تو پھر تو انسان ہر بات میں مشرک ہو جائے۔ مثلاً یہ کہے، میں سُنتا ہوں، میں دیکھتا ہوں۔ میں موجود ہوں۔ غذا نے قوت دی۔ پانی نے پیاس بجھائی۔ آگ نے جلایا۔ سردی نے نقصان پہنچایا۔ دوا نے فائدہ دیا، یہ سب باتیں شرک ہو جائیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ جب ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ دوا نے شفا دی تو اس عقیدے کے ساتھ کہتا ہے کہ دوا میں شفا دینے کی طاقت اور تاثیر اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔ اگر خدا نہ چاہے تو نہ میں دیکھ سکوں اور نہ دوا اپنا اثر دکھا سکے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی کمال کو غیر اللہ میں اگر ذاتی مان لیا جائے تو وہ شرک ہے اور اگر عطائی طور پر مانا جائے تو وہ ہرگز شرک نہیں ہے۔ جو شخص عطائی کمال کو غیر اللہ میں ماننے کو شرک کہتا ہے وہ جاہل ہے اور اگر جان بوجھ کر کہتا ہے تو خود کافر ہے کیونکہ اس نے عطائی کمال ماننے والے کو مشرک کہہ کر یہ ظاہر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے کمالات اور صفات عطائی ہیں اور وہ مستغنی اور بے نیاز نہیں ہے۔

احسان کے معنیٰ

ایمان اور اسلام کے بعد سائل نے احسان کے متعلق حضور علیہ السلام سے پوچھا کہ احسان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ احسان بھی دراصل اسلام اور ایمان کی طرح دینی اور قرآنی اصطلاح ہے ارشادِ ربانی ہے:۔

۱۔ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ	ہاں جس نے اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا اور وہ محسن ہے (یعنی وصفِ احسان اس میں موجود ہے) تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے۔
۲۔ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ	اور اس سے اچھا دین اور کیا ہو سکتا ہے۔ جس نے اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دیا اور وہ محسن ہے۔

معلوم ہوا کہ احسان قرآنِ پاک کی ایک خاص اصطلاح ہے اور یہ ایک خاص وصف ہے جو مومن مخلص میں پایا جاتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے ثوابِ عظیم ملتا ہے۔ ویسے تو احسان کے معنیٰ کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے ہیں لیکن حدیثِ ہٰذا میں جس احسان کا ذکر ہے۔ اس کی حقیقت خود زبانِ نبوت نے بیان فرما دی ہے یعنی احسان یہ ہے کہ:۔

"خدا کی بندگی ایسے کی جائے کہ وہ قہار و قدوس ذوالجلال والجبروت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور گویا ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔"

اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ غلام ایک تو اپنے آقا کے احکام کی تعمیل اس وقت کرتا ہے جب کہ وہ اس کے سامنے موجود ہو اور اس کو یقین ہو کہ وہ مجھے اچھی طرح دیکھ رہا ہے اور ایک رویہ اس کا اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ آقا کی غیر موجودگی میں کام کرتا ہے عموماً ان دونوں وقتوں کے طرزِ عمل میں فرق ہوتا ہے اور عام طور پر جس خوش اسلوبی، محنت اور دیانت کے ساتھ وہ آقا کی موجودگی میں کام کرتا ہے۔ مالک کی عدم موجودگی میں اس کا وہ حال نہیں ہوتا تو یہی حال بندوں کا اپنے مالکِ حقیقی کے ساتھ ہے۔

جس وقت بندہ یہ محسوس کرے کہ میرا رب میری ہر حرکت و سکون کو دیکھ رہا ہے۔ وہ حاضر و ناظر ہے۔ میرے ہر کام کی اس کو خبر ہے۔ اس تصور کے ساتھ جب بندہ عبادت کرتا ہے تو اس کی بندگی میں ایک خاص شانِ نیازمندی ہوگی جو اس وقت نہیں ہو سکتی۔ جب کہ بندہ کا دل اس احساس سے خالی ہو۔ تو احسان یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اس طریقہ سے کی جائے کہ گویا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہم اس کے سامنے ہیں اور وہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احسان اور احتساب دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ احتساب کے معنی یہ ہیں کہ عمل میں خلوص انتہا کو پہنچ جائے اور ریا کا شائبہ بھی نہ رہے اور یہ جبھی ہو سکتا ہے جب کہ یہ یقینِ محکم ہر وقت قائم رہے کہ اس قادر و قدیر خدا سے ہماری کوئی حرکت پوشیدہ نہیں ہے اور جب اس تصور سے عمل کیا جائے تو یقیناً اس میں خلوص ہوگا۔

ہر عمل میں احسان

پھر احسان کا تعلق صرف نماز ہی سے نہیں ہے کہ بس نماز کو پورے خشوع و خضوع سے ادا کر لیا جائے بلکہ اس کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ اسی لیے اس واقعہ کی دوسری روایات کے الفاظ یہ ہیں:۔

۱۔ اَنْ تَخْشَى اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ	احسان یہ ہے کہ تم خدا سے اس طرح ڈرو گویا کہ اس کو دیکھ رہے ہو۔
۲۔ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ كَاَنَّكَ تَرَاهُ	احسان یہ ہے کہ تم ہر کام اللہ کے لیے اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

ان دونوں روایتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احسان کا تعلق صرف نماز سے نہیں بلکہ تمام اعمالِ خیر سے ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر عبادت و بندگی اور اس کے حکم کی اطاعت و فرمانبرداری اس طرح کی جائے اور اس کے مواخذہ سے اس طرح ڈرا جائے کہ گویا وہ ہمارے سامنے ہے اور ہماری ہر حرکت و سکون کو دیکھ رہا ہے۔ یہی احسان ہے۔

کیا دُنیا میں دیدارِ الٰہی ممکن ہے؟

بعض لوگ كانك تراه حدیث کے اس ٹکڑے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دنیا میں اللہ عزوجل کا دیدار ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ تَعْبُدُ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ اشارہ ہے مقامِ فنا کی طرف کہ جب بندہ اپنی ذات کو بالکل فراموش کر دے گا گویا کہ اس کا وجود ہی نہیں ہے تو اس منزل پر پہنچ کر وہ خدا کو دیکھ لے گا لیکن یہ معنیٰ کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس کے متعلق تو نصوص موجود ہیں کہ دنیا میں خدا کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ مسلم شریف میں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّكُمْ حَتّٰى تَمُوْتُوْا	جان لو تم اس دنیا میں خدا کو نہیں دیکھ سکتے حتیٰ کہ تم مر جاؤ (مسلم شریف)

۱۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دنیا میں دیدارِ باری تعالیٰ ممکن نہیں البتہ آخرت میں ہر مومن کو اس کے دیدار کا شرف حاصل ہوگا۔ جیسا کہ اہلِ سنت و جماعت کا مذہب ہے ۲۔ اس کے بعد قرآنِ پاک میں ہے:۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ	اپنے رب کی موت آنے تک عبادت کرو

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اس وقت تک مکلف ہے جب تک کہ زندہ ہے اور مرجانے کے بعد اس پر کچھ فرض نہیں رہتا۔ تو اگر عبادت میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوجاتا ہے تو پھر تو دیدارِ باری کے بعد اس پر نماز فرض ہی نہیں رہے گی کیونکہ دیدارِ باری موت کے بعد ہی ہوتا ہے تو چاہیئے کہ جس کو خدا کا دیدار ہوجائے وہ عبادت ہی ترک کردے حالانکہ یہ بات نہیں ہے

۳۔ نیز الفاظِ حدیث بھی اس مطلب کے متحمل نہیں ہیں کیونکہ "کَاَنَّکَ تَرَاہُ" کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم عبادت میں اتنا خلوص خشوع اور خضوع پیدا کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ فان لم تراہ۔ تو اگر چہ تم اس کو دیکھتے نہیں تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے اور جب وہ تم کو دیکھ رہا ہے تو پھر عبادت و بندگی ایسی ہونی چاہیئے جیسی کہ مالک کی موجودگی میں ہوتی ہے۔ غرضیکہ حدیث کا یہ مطلب لینا کسی طرح درست نہیں ہے کہ عبادت میں جب بندہ محو ہوجائے اور اپنی ذات کو فنا کردے تو پھر وہ خدا کو دیکھ لیتا ہے ۴۔ ہاں بعض عرفا کرام نے حدیث کے اس ٹکڑے کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس میں عبادت کے دو درجوں کی طرف اشارہ ہے۔

اول: کَاَنَّکَ تَرَاہُ عبادت کرو اللہ کی گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ یعنی عبادت مشاہدۂ حق کے ساتھ ہو۔ یہ مقام ہے عرفا کاملین کا دوم: فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ۔ پس اگر یہ مقام (مشاہدہ) تمہیں حاصل نہ ہو تو پھر عبادت کرو اللہ کی اس طرح کہ ہم اس کے سامنے ہیں اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ یہ مقام ہے درجہ دوم کے عارفوں کا مگر یہ ظاہر ہے کہ یہاں مشاہدۂ حق سے ذاتِ خدا کی رویت مراد نہیں بلکہ تجلّیات و انوارِ صمدیہ کی رویت مراد ہے اور یہ بات بالکل حق ہے کہ ہر ایک کو یہ مقام حاصل نہیں ہوتا کہ وہ برکاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرے۔ اس کا مدار تو قلب کی صفائی، باطن کی پاکیزگی اور تقویٰ کی زیادتی پر ہے۔ جس کا تقویٰ بڑھا ہوا ہوگا وہ یقیناً انوارِ صمدیت اور برکاتِ احدیت کا مشاہدہ کرے گا اور جو اس درجہ پر ہوگا وہ نہ کرسکے گا۔ بہرحال اس توجیہہ پر احسان کے دو درجے ہوگئے۔

قیامت کا اعتقاد

اس کے بعد سائل نے پوچھا۔ حضور (علیہ السلام) قیامت کب آئے گی اس کے جواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس سے سوال ہو رہا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا یعنی قیامت امورِ غیب سے ہے اور غیب کا علم بے تعلیمِ الٰہی بحسابِ عقل کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی جس میں امورِ خمسہ کا ذکر ہے کہ ان کو بالذات خدا ہی جانتا ہے۔ ان اللہ عندہ علم السّاعۃ الخ واضح ہو دینِ اسلام کے ایمانیات کی آخری کڑی قیامت پر ایمان رہا ہے۔ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ۔ یعنی ایک دن ساری کائنات فنا ہوجائے گی۔ اور اللہ عزوجل کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور پھر جب اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ دوبارہ مخلوق کو پیدا فرمائے گا۔ قرآن پاک میں قیامت کا بیسیوں ناموں سے ذکر آیا ہے اور ہر نام اس کے خاص پہلو نمایاں کرتا ہے۔ مختصر لوں لیجئے کہ ایک دن ایسا آنا ہے جب کہ سوا خداوند عالم کے سب کچھ فنا ہوجائے گا۔ اس کے بعد دوبارہ زندگی ملے گی۔ اعمال کا مواخذہ ہوگا۔ حساب و کتاب کے بعد نیکیوں کا ثواب ملے گا اور برائیوں پر سزا دی جائے گی۔ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داخل کردیئے جائیں گے اور حیات و ممات کا سلسلہ ختم ہوجائے گا۔

قیامت کی علامتیں

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی علامتیں بیان فرمائی ہیں۔ حدیث

ہذا میں صرف دو علامتوں کا ذکر فرمایا۔ لیکن دوسری احادیث میں علاماتِ قیامت کا تفصیلی بیان ہے۔ اس حدیث میں قیامت کی صرف دو خاص نشانیاں بیان ہوئی ہیں :۔

اوّل : یہ کہ جب لونڈی اپنے آقا کو جنے گی ——— گو شارحین نے اس جملے کے متعدد مفہوم بیان فرمائے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ راجح توجیہ جو الفاظ حدیث سے بالکل مطابق ہے۔ یہی ہے کہ قربِ قیامت میں ماں باپ کی نافرمانی عام ہو جائے گی اسی واقعہ کی دوسری روایت میں ربتھا کا لفظ آیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جب لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی یعنی عام طور پر لڑکیاں جن میں والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کا عنصر بہت غالب ہوتا ہے اور جن سے لڑکوں کے بالمقابل والدین سے سرکشی بظاہر بہت ہی مشکل ہوتی ہے وہ بھی قربِ قیامت میں نہ صرف یہ کہ والدین کی نافرمان ہو جائیں گی بلکہ اُلٹی ان پر حکومت چلائیں گی۔ جس طرح ایک مالکہ اپنی زرخرید لونڈی پر حکومت کرتی ہے۔ اسی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں تعبیر فرمایا کہ عورت اپنی مالکہ کو جنے یعنی عورت سے جو لڑکی پیدا ہوگی وہ بڑی ہو کر خود اپنی ماں پر حکومت چلائے گی اور جب لڑکیوں کا یہ عالم ہوگا تو لڑکوں کا کیا حال ہوگا۔

دوم : دوسری علامت حضور علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمائی کہ قربِ قیامت میں کالے اونٹ چلانے والے اونچے اونچے محل بنوائیں گے اور تکبر و غرور کریں گے۔ عرب میں سیاہ اُونٹ حقیر سمجھے جاتے تھے۔ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ دنیاوی دولت حکومت ان کمینوں اور رذیلوں کے ہاتھ آجائے گی جو اس کے اہل نہ ہوں گے۔ یہ شاندار محل بنوانے اور اپنے عیش و آرام کے سامان مہیا کرنے میں مصروف رہیں گے اور اسی کو سرمایۂ فخر و مباہات جانیں گے اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے جوڑ توڑ کرتے رہیں گے۔ ان کے دلوں میں قوم کا درد نہ ہوگا۔ یہ متکبر اور ظالم ہوں گے اور اسی ظلم و تکبر میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کریں گے۔ اسی مضمون کو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے :۔

اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ	جب حکومت اور مناصب نااہلوں کے سپرد ہونے لگیں تو پھر قیامت کا انتظار کرو۔

کوئی شک نہیں، زبانِ نبوت کی ان پیش گوئیوں کے ظہور کی ابتداء ہو چکی ہے۔

جبریل کی واپسی

جب یہ سوال و جواب ختم ہو گئے تو سائل اُٹھ کر چلے گئے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا ان کو تلاش کرو صحابہ نے تلاش کیا مگر نہ ملے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا یہ جبرئیل امین تھے۔ اس لیے آئے تھے تاکہ تمہیں تمہارا دین سکھائیں۔ ظاہر ہے کہ جبریل علیہ السلام سائل بن کر آئے نہ کہ معلم مگر اس کے باوجود ان کو معلم اس لیے فرمایا کہ ان کے سوال کے ذریعہ سے صحابہ کو دین کی تمام ضروری باتوں کا علم ہو گیا اور زبانِ نبوت سے دین کا خلاصہ اور لب لباب بیان فرما کر صحابہ کے علم کی تکمیل کرا دی گئی اور ان کو اس امانت کا امین بنا دیا گیا۔

کیا قیامت کا علم کسی کو نہیں

منکرینِ علمِ غیب نبوی بخاری کی اس حدیث کو بڑے زور شور سے پیش کیا کرتے ہیں کہ دیکھو جب جبریل امین نے حضور علیہ السلام سے قیامت کا وقت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں سائل سے زیادہ نہیں جانتا اور اسی پر بس نہیں۔ حضور علیہ السلام نے اس کے بعد قرآنِ پاک کی وہ آیت بھی بطور استشہاد پڑھی جس میں یہ ہے کہ پانچ غیب ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ انہیں

میں قیامت بھی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کا علم نہیں اور آپ جمیع اشیا کے عالم نہیں ہیں۔

جواب: جو آیہ مبارکہ حضور سیّد عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے تلاوت فرمائی اس کا مفہوم یہ ہے کہ پانچ باتیں ایسی ہیں جن کا علم حقیقی خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے اور وہ یہ ہیں ۱۔ قیامت کا وقت ۲۔ بارش کب ہوگی ۳۔ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی ۴۔ کل یہ کیا کرے گا ۵۔ اور کس زمین پر مرے گا ——— لہٰذا ضروری ہے کہ دیانتداری کے ساتھ دلائل شرعیہ پر نظر رکھتے ہوئے یہ غور کیا جائے کہ اس آیت کا صحیح مطلب کیا ہے۔

۱۔ یہ پانچ غیب کی باتیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالےٰ کسی کو بتانے پر قادر نہیں ہے اگر مطلب یہ لیا جائے تو عقلاً و نقلاً باطل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر قادر ہے۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۵ لہٰذا یہ مان لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان پانچ امور غیبیہ پر کسی کو مطلع کرنے پر بھی قادر ہے۔

۲۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے مطلع کر دینے اور بتا دینے سے بھی کوئی ان غیب کی باتوں پر مطلع نہیں ہوتا تو ایسا کہنا صریحاً جہالت ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کا علم عطا فرما دیا تو وہ شخص اس چیز کا عالم ہو گیا۔ عالم کو جاہل کہنا اپنی جہالت کا اعتراف ہے۔

۳۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا تو یہ بھی غلط ہے اور ایسا کہنا قرآن اور حدیث کی متعدد نصوص کا انکار کرنا ہے جو کفر ہے۔ کیونکہ قرآن پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر اپنے برگزیدہ رسولوں کو مطلع کرتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ جس سے قطعی طور پہ یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص رسولوں کو غیب پر مطلع فرماتا ہے۔

۴۔ یہ کہ غیب پر مطلع تو فرماتا ہے مگر ان پانچ چیزوں پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا تو ایسا کہنا بھی غلط ہے۔ کیونکہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ عزوجل نے ان پانچ امور کا علم بھی عطا فرمایا جیسا کہ ابھی ہم ذکر کریں گے۔

لہٰذا اس توضیح سے آیت کا مفہوم صحیح یہ معلوم ہوا کہ یہ پانچ امورِ غیبیہ بالذات صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ ان کے سوا کوئی نہیں جانتا کیونکہ خدا کا علم ذاتی ہے اور اللہ کے سوا کوئی بھی چیز کا بالذات عالم نہیں ہے تو آیت زیر بحث میں جو یہ فرمایا گیا کہ ان پانچ باتوں کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس علم سے علمِ ذاتی مراد ہے۔ اب رہا یہ کہ اللہ تعالےٰ کے بتانے سے بھی کسی کو ان پانچ باتوں کا علمِ عطائی نہیں حاصل ہوتا ہے اس میں اس کی ہرگز ہرگز نفی نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی غیر اللہ سے غیب کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد یہی ذاتی علم کی نفی ہے عطائی کی نہیں اور جب آیت میں ذاتی علم کی نفی ہے تو حضور علیہ السلام کے ان کلمات کہ: "جس سے سوال کیا جا رہا ہے وہ قیامت کے وقت کے متعلق سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔" میں بھی ذاتی علم کی نفی ہے یعنی اٹکل سے یا بالذات نہ تم وقتِ قیامت کو جانتے ہو اور نہ میں۔ رہا اللہ تعالیٰ کی تعلیم دینے سے جاننا اس کی نفی نہ آیت میں ہے اور نہ حضور علیہ السلام کے ان کلمات میں۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ کتاب الایمان میں تحریر فرمایا ہے کہ:

مراد آنست کہ بے تعلیم الٰہی بحساب عقل ہیچ کس اینہا را نداند از امور غیب اند کہ جز خدا کسے آن را نداند مگر	یعنی مراد یہ ہے کہ ان امور غیب کو بغیر اللہ کے بتائے ہوئے عقل کے اندازے سے کوئی نہیں جان سکتا کیونکہ ان کو خدا کے

آں کہ دے تعالیٰ از نزد خود کسے را بوحی و الہام بدانانند	سوا کوئی نہیں جانتا مگر وہ جس کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے بتا دے وحی سے یا الہام سے۔

تفسیرات احمدیہ میں اسی آیت کے ماتحت شیخ ملّا جیون استاد عالمگیر بادشاہ علیہ الرحمۃ نے تحریر فرمایا کہ اگرچہ ان پانچوں باتوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن جائز ہے کہ اللہ عزوجل اپنے محبوبوں اور ولیوں میں سے جس کو چاہے بتا دے کیونکہ لفظ خبیر بمعنی مخبر ہے (تفسیرات احمدیہ)

یہی مضمون تفسیر صاوی زیر آیت، ماذا تکسب غداً تفسیر عرائس البیان زیر آیت یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ و تفسیر روح البیان اور دیگر تفاسیر میں ہے کہ ان پانچوں باتوں کا علم بے تعلیم الٰہی کسی کو نہیں لیکن اللہ کی تعلیم دینے سے انبیاء کرام کو اور ان کے وسیلہ سے اولیاء کرام کو بھی حاصل ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل معلومات اور مکمل جوابات کے لیے کتاب الکلمۃ العلیا مصنفہ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین صاحب علیہ الرحمۃ مرادآبادی کا دیکھنا مفید ہوگا۔ حدیث چونکہ زیر بحث آگئی ہے اس لیے مختصر گفتگو کی گئی۔

اب ہم ان احادیث کو بھی پیش کر دیں جن سے یہ واضح ہوگا کہ حضور علیہ السلام کو "امورِ خمسہ" کا علم بھی عطا ہوا۔ چنانچہ بخاری شریف کی کتاب بدء الخلق و ذکر الانبیاء میں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائے آفرینش سے تا قیامِ قیامت کی خبر دیدی۔ حتیٰ کہ اہلِ جنت جنت میں اور اہلِ دوزخ دوزخ میں پہنچ گئے۔ یعنی از روزِ اول تا قیام قیامت ایک ایک ذرہ کی خبر حضور علیہ السلام نے دیدی۔ مسلم شریف کے الفاظ ہیں۔

۱۔ فَاَخْبَرَنَا بِمَا هُوَ کَائِنٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (مشکوٰۃ باب المعجزات)	ہم کو حضور علیہ السلام نے تمام ان واقعات کی خبر دیدی جو قیامت تک ہونے والے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب حضور علیہ السلام نے قیامت تک کے تمام ہونے والے واقعات بیان فرما دئے تو اب یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کو قیامت کا علم نہ ہو کیونکہ دنیا ختم ہوتے ہی قیامت ہے اور حضور علیہ السلام کو یہ علم ہے کہ کونسا واقعہ کس کے بعد ہوگا۔ تو جو آخری واقعہ ارشاد فرمایا وہی دنیا کی انتہا ہے اور قیامت کی ابتداء تو اس حدیث سے ثابت ہوئی کہ حضور علیہ السلام کو قیامت کے وقت کا علم ہے۔

۲۔ ترمذی بَابُ الْعَلَامَاتُ بَیْنَ یَدِیِ السَّاعَةِ میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ فتنہ یاجوج ماجوج کے بعد اللہ تعالیٰ عالمگیر مینہ بھیجے گا۔

مشکوٰۃ باب لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰی اَشْرَارِ النَّاسِ میں حضور علیہ السلام نے فرمایا جب سب لوگ مر جائیں گے تو بارش ہوگی۔ جس سے آدمیوں کے جسم بحال ہو جائیں گے۔ دیکھئے بارش کب آئے گی؟ اس کی خبر حضور علیہ السلام سینکڑوں برس پہلے دے رہے ہیں۔

۳۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام مہدی کے پیدا ہونے کی اطلاع دی۔ اس سے واضح ہوا کہ حضور علیہ السلام کو لڑکا پیدا ہونے کی اس وقت سے ہے جب نطفہ بھی باپ کی پیٹھ میں نہیں۔ ایسے ہی حضور علیہ السلام نے حضرت

امام حسین علیہ السلام کے پیدا ہونے کی اطلاع دی۔ (مشکوٰۃ شریف)

۴۔ کل کی بات کی اطلاع اسی حدیث سے ثابت ہو رہی ہے جس میں حضور علیہ السلام نے قیامت تک ہونے والے واقعات بیان فرما دیئے۔ نیز بوقتِ جنگِ خیبر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کل ہم فوج کا نشان ایسے شخص کو دیں گے جس کے ہاتھ پر خیبر فتح ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ کل کی خبر حضور علیہ السلام نے دی۔

۵۔ خود اپنی وفات شریف کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ معاذ قریب ہے کہ اس سال کے بعد ہماری تمہاری ملاقات نہ ہو اور تم میری اس مسجد اور قبر پر گزرو۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ عسیٰ ان لاتلقانی بعد عامی ھذا ولعلک ان تمر بمسجدی ھذا وقبری۔ اس حدیث میں حضور علیہ السلام نے نہ صرف اپنی وفات کی اطلاع دی بلکہ اپنی وفات کی جگہ اور قبر مبارک کی جگہ بھی بتا دی۔ بہرحال اس قسم کے مضمون کی سینکڑوں حدیثیں ہیں جو اس امر پر دال ہیں کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ عزوجل نے ان پانچ باتوں کا علم بھی عطا فرمایا۔ اور مفسرِ شہیر حضرت علامہ سید محمود آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں :۔

لَمْ یَقْبِضْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی عَلَّمَ کُلَّ شَیْءٍ یُمْکِنُ الْعِلْمَ بِہٖ (تفسیر روح المعانی ج ۱۵ صـ ۱۵۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تک وفات نہیں کی جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر اس چیز کا علم نہیں دے دیا۔

جس کا علم آپ کو دینا ممکن تھا ——— اور قیامت کے وقت کا علم عطا ہونا محال نہیں ہے۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام کو قیامت برپا کرنے کا جب حکم ہوگا تو وقتِ قیامت ان پر ظاہر ہوگا۔ جب حضرت اسرافیل کو قیامت کے وقت کا علم دیا جانا ممکن ہے تو حضور سید العلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیوں ناممکن ہو۔ اسی لیے شارح بخاری علامہ قسطلانی فرماتے ہیں۔

(وَلَا یَعْلَمُ مَتٰی تَقُوْمُ السَّاعَۃُ) اَحَدٌ (اِلَّا اللّٰہُ) اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَسُوْلٍ فَاِنَّہٗ یُطْلِعُہٗ عَلٰی مَا یَشَاءُ مِنْ غَیْبِہٖ والولی التَّابِعُ یاخُذُ عَنْہُ

اللہ تعالیٰ کے سوا وقت وقوع قیامت کو کوئی نہیں جانتا سوا ان کے جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہے جو اللہ کے رسول ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر جس کو چاہتا ہے مطلع فرما دیتا ہے اور اولیاء اللہ جو رسولوں کے تابع ہوتے ہیں وہاں سے غیب کا علم حاصل کرتے ہیں۔

بلکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور آپ تو تمام کمالاتِ اوّلین و آخرین کے جامع ہیں۔ علامہ امام قرطبی اور علامہ آلوسی اور سیدی احمد بن مبارک تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اولیاء کرام کو بھی حضور کے وسیلہ سے علوم خمسہ کا علم حاصل ہوتا ہے ——— امام قرطبی فرماتے ہیں :۔

فَمَنِ ادَّعٰی عِلْمَ شَیءٍ غَیْرِ مُسْنَدٍ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ کَاذِبًا دَعْوَہُ

جس شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کے بغیر ان پانچ چیزوں کے علم کا دعویٰ کیا وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہوگا۔

اور سیدی غوث عبدالعزیز دباغ رضی اللہ عنہ سے جب ان پانچ چیزوں کے علم کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا۔

فَقَالَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ وَ عَنْ سَادَتِنَا الْعُلَمَاءِ وَ کَیْفَ یَخْفٰی اَمْرُ الْخَمْسِ عَلَیْہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالْوَاحِدُ مِنْ اَھْلِ التَّصَرُّفِ مِنْ اُمَّتِہِ الشَّرِیْفَۃِ لَا یُمْکِنُہُ التَّصَرُّفُ اِلَّا بِمَعْرِفَتِھَا (ابریز ص۲۸۲)

سیدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء کرام نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان پانچ چیزوں کا علم کیسے مخفی ہو سکتا ہے جب کہ آپ کی اُمّت کے اولیاء سے بھی ان کا علم پوشیدہ نہیں ہے اور اس وقت تک اولیاء امت اس کائنات میں تصرف نہیں کر سکتے جب تک ان علوم خمسہ کا انہیں علم نہ ہو۔

اہلِ علم و فکر کے لیے یہاں یہ بات خصوصی طور پر غور و فکر کی متقاضی ہے کہ حضرت جبرائیل کے سوال پر نبی علیہ السلام نے وقتِ قیامت کے علم کی نفی نہیں فرمائی۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ مجھے وقتِ قیامت کا علم نہیں ہے بلکہ نہایت لطیف انداز میں یہ فرمایا کہ قیامت کے بارے میں سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ آپ کو وقتِ قیامت کا علم تو تھا مگر متعدد حکمتوں کی بناء پر اس کا اظہار اس لیے نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو علمِ قیامت کے بتانے سے حضور کو منع فرما دیا تھا جیسا کہ قسطلانی آلوسی اور علامہ صاوی نے تصریح فرمائی۔

نبی علیہ السلام کو تین قسم کے علم عطا ہوئے

حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے علم عطا فرمائے ہیں (مدارج ج ۱ صفحہ ۱۶۸) اوّل وہ علم جس کا تعلق تبلیغِ دین سے ہے (یعنی اسلام کے وہ احکام و مسائل، عقائد و اعمال جن کی تبلیغ اور انہیں امت تک پہنچانا آپ کا فرضِ نبوّت ہے اور جن کی تبلیغ میں کوتاہی آپ کی ذاتِ اقدس سے ممکن ہی نہیں ہے اور جس کے متعلق سورہ مائدہ میں ارشاد ہے۔

یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَہٗ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ: ۶۷)

اے رسول پہنچا دو جو کچھ نازل ہوا تم پر تمہارے رب کی طرف سے۔ ایسا نہ ہوا تو تم نے رب کا کوئی پیغام نہ پہنچایا اور اللہ تمہاری نگہبانی کرے گا لوگوں سے۔

دوم، وہ علم جس کے متعلق حضور علیہ السلام کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ جسے اس علم کا اہل سمجھیں اُسے بتا دیں جیسے صحابہ کرام میں خصوصی طور پر حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منافقین کی پہچان کا علم دیا (اسد الغابۃ ج: ۱ ص ۳۹۱) یا جیسے بعض وہ علوم جن کے ساتھ حضور نے حضرت ابو ہریرہ کو خاص کیا اور انہیں وہ علوم عطا فرمائے۔ چنانچہ جناب ابو ہریرہ فرماتے ہیں:

حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وِعَاءَیْنِ فَاَمَّا اَحَدُھُمَا بَثَثْتُ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُہٗ قُطِعَ ھٰذَا الْبُلْعُوْمُ (بخاری ج ۱: ص ۲۳)

میں نے نبی علیہ السلام سے دو برتن علم کے بھرے ہیں۔ ایک تو وہ جس کو میں نے نشر کر دیا اور دوسرے برتن کے علم کو ظاہر کر دوں تو میری شہ رگ کاٹ دی جائے۔

سوم وہ علم جو اللہ تعالیٰ نے حضور کو دیا مگر دوسروں پر اس کے انکشاف سے منع فرمادیا۔ جیسے علوم خمسہ (یعنی قیامت کا علم، بارش کب ہوگی، کل کیا ہوگا، کون کہاں وفات پائیگا۔ شکمِ مادر میں کیا ہے) اور سب کا علم بھی اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ مگر دوسروں پر اس کے اظہار و بیان سے منع فرمادیا۔

چنانچہ علامہ شیخ احمد صاوی مالکی فرماتے ہیں۔
قَالَ الْعُلَمَاءُ الْحَقُّ اِنَّهٗ لَمْ يَخْرُجْ نَبِيُّنَا مِنَ الدُّنْيَا حَتّٰى اَطْلَعَهُ اللّٰهُ عَلٰى تِلْكَ الْخَمْسِ وَلٰكِنَّهٗ اَمَرَهٗ بِكَتْمِهَا
(تفسیر صاوی ج ۳ ص ۲۱۵)

علماءِ کرام نے فرمایا کہ حق بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا سے اس وقت تک وفات نہیں پائی جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پانچ چیزوں کے علوم پر مطلع نہیں فرمادیا۔ لیکن آپ کو ان علوم کے مخفی رکھنے کا حکم فرمادیا۔

اب رہا یہ سوال کہ علمِ قیامت کے انکشاف سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیوں منع فرمادیا تھا تو اس کی متعدد وجوہ ہیں جن میں سے دو یہ ہیں۔ سورہ اعراف میں ارشادِ ربانی ہے۔

لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً | قیامت نہیں آئے گی مگر تم پر اچانک

تو اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام قیامت کے وقت کا اظہار فرمادیتے تو تصریحِ قرآنی کے مطابق قیامت (بغتۃً) اچانک نہ رہتی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر قیامت کے وقوع کا وقت معلوم ہوجائے تو سارا نظامِ عالم درہم برہم ہوجائے اور قیامت کے قریب آنے سے پہلے ہی انسان پر قیامت قائم ہوجائے جو کہ ناممکن ہے اس لیے علمِ قیامت کے اظہار سے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرمادیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ جب جبرائیل امین نے قیامت کی علامات سے متعلق سوال کیا تو حضور نے علاماتِ قیامت میں سے چند بیان فرمادیں اور بعض احادیث میں وقوعِ قیامت کا دن، مہینہ، تاریخ تک بیان فرمادی۔ مثلاً یہ کہ محرّم کی دس تاریخ جمعہ کے دن قیامت آئے گی۔ صرف سن نہیں بتایا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ کو قیامت کا علم نہ تھا۔ بلکہ وجہ یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کے اظہار و انکشاف سے منع فرمادیا تھا۔ (فافہم)

الغرض حضور علیہ السلام کے جوابی کلمات ما المسئول عنہا اعلم من السائل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ حضور علیہ السلام کو قیامت کا علم نہیں تھا۔ پھر اعلم اسم تفضیل کا صیغہ ہے جس کے معنیٰ ہیں "بہت جاننا" تو حضور علیہ السلام نے اپنے جاننے کی نفی نہیں کی بلکہ زیادہ جاننے کی نفی فرمائی۔ اسی لیے جبریل امین نے حضور علیہ السلام سے قیامت کی نشانیاں پوچھیں تو آپ نے بتائیں بلکہ کثیر علاماتِ قیامت متعدد دوسری احادیث میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ جس کو قیامت کا علم نہ ہو اس سے قیامت کی نشانیاں پوچھنا کیا معنی رکھتا ہے۔ نیز نبی علیہ السلام نے جس انداز سے جبریل امین کو جواب دیا۔ اس سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ وقتِ قیامت کا علم بالذات اللہ تعالیٰ کو ہے اور یہ کہ ایک مومن کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ قیامت پر ایمان لائے اور قیامِ قیامت کو حق سمجھے اور بس لیکن

وقتِ قیامت کے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس حدیث کی شرح میں حضرت مُلّا علی قاری نے مرقات جلد اول میں اور امام قسطلانی اور علامہ عینی نے تحریر فرمایا ہے:۔

فَمَنِ ادَّعٰی عِلْمَ شَیْءٍ مِّنْهَا غَیْرَ مُسْتَنِدٍ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ کَاذِبًا فِیْ دَعْوَاهُ (عینی جلد ا ص ۳۴۷)

جو شخص ان پانچ چیزوں میں سے کسی چیز کے علم کا دعویٰ کرے حضور علیہ السلام کی طرف نسبت کے بغیر وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

یعنی جو شخص یہ کہے کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کے بغیر قیامت کے وقت کو جانتا ہوں وہ جھوٹا ہے کیونکہ حضور اکرم علیہ السلام کے واسطہ کے بغیر کوئی غیب پر مطلع نہیں ہو سکتا۔ لمعات میں حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

اَلْمُرَادُ لَا تَعْلَمُ بِدُوْنِ تَعْلِیْمِ اللّٰهِ تَعَالٰی

مراد یہ ہے کہ ان پانچ باتوں کو اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر کوئی نہیں جانتا۔

حضرت ملا علی قاری علیہ الرحمۃ نے اسی حدیث کی شرح میں لکھا کہ جب رُوح روشن ہو جائے اس کی نورانیت اور اشراق میں اضافہ ہو جائے اور آئینۂ قلب کدوراتِ نفسانیہ سے پاک ہو جائے اور بندہ علم و عمل پر مواظبت کرے یعنی حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلے اور شریعت کی پابندی کرے۔

حَتّٰی یُقْوِیَ النُّوْرُ وَیَنْبَسِطُ مِنْ فَضَاءِ قَلْبِهٖ فَتَنْعَکِسُ فِیْهِ النُّقُوْشُ الْمُرْتَسِمَۃُ فِی اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ وَیَطَّلِعُ عَلَی الْغَیْبَاتِ وَیَتَصَرَّفُ فِیْ اَجْسَامِ الْعَالَمِ السُّفْلِیْ بَلْ یَتَجَلّٰی حِیْنَئِذٍ الْفَیَّاضُ الْاَقْدَسُ بِمَعْرِفَتِهِ الَّتِیْ هِیَ اشْرَفُ الْعَطَایَا فَکَیْفَ بِغَیْرِهَا

حتّٰی کہ اس کا نور قوی ہو جائے اور فضا قلب میں پھیل جائے تو پھر قلب پر لوح محفوظ کے نقوش کا عکس آتا ہے اور آدمی مغیبات پر مطلع ہوتا ہے اور اجسام عالم سفلی میں تصرف کرتا ہے بلکہ اس وقت فیاضِ اقدس کی معرفت کا انکشاف ہوتا ہے جو کہ بہترین نعمت ہے تو دیگر نعمتیں کس شمار میں؟

حضرت مُلّا علی قاری کے اس ارشاد کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب بندہ تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر پہنچتا ہے تو اس کے لیے لوحِ محفوظ کے نقوش اور غیوب ظاہر ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ایک مومن و متقی کا یہ حال ہے تو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مرتبہ ہوگا۔

مسائل حدیث

حدیث زیرِ بحث سے مندرجہ ذیل مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

۱- ایمان یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کے رسولوں پر اور بعث و نشور پر ایمان لائے۔ یعنی ان حقیقتوں پر ایمان لایا جائے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائیں ۲- اسلام یہ ہے کہ بندہ بالکل اپنے کو اللہ کا مطیع و فرماں بردار بنا دے۔ اسی کا نام اسلام ہے اور ارکانِ اسلام عبادت نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اسی کے مظاہر ہیں۔ احسان یہ ہے کہ اللہ کی ہستی کا ایسا استحضار اور دل کو مراقبہ حضور و شہود کی ایسی کیفیت نصیب ہو جائے کہ اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی بندگی اس طرح ہونے لگے گویا کہ وہ پاک، بے نیاز اپنے پورے جمال و جلال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہم کو دیکھ رہا ہے اور ہم اُسے دیکھ رہے ہیں۔

مسلم شریف میں ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ سے دین کی باتیں پوچھ لو۔ صحابہ کرام سوالات کے لیے تیار ہوئے تو پھر جبریل امین انسانی شکل میں حاضر ہوئے اور انھوں نے مذکورہ سوالات کیے (مرقات ج ۱ ص ۴۴)

معلوم ہوا کہ جبریل امین کی حاضری اس لیے تھی تاکہ وہ اپنے عمل سے بتا دیں کہ نبی (علیہ السلام) کے دربار میں حاضری کے آداب کیا ہیں اور نبی سے سوال کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

سلیمان تیمی کی روایت میں ہے کہ جبریل امین دربارِ نبوت میں ایسے بیٹھے جیسے نمازی نماز میں بیٹھتا ہے۔ کما یجلس احدنا فی الصلوٰۃ (عینی ج ۱ ص ۳۲۹) مسلم شریف میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو روایت ہے اس میں یہ بھی ہے کہ جبریل امین حضور علیہ السلام کے دربار میں دو زانو ہو کر بیٹھے اور آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھ دیئے۔

حضرت ملا علی قاری اس موقع پر لکھتے ہیں کہ جبریل امین بالکل انسانی شکل میں حاضر ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نوری لباسِ بشری میں آتے ہیں اور اس میں حکمت یہ تھی کہ لوگوں کا ان سے رابطہ ہو جائے کیونکہ جنس اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحضور مریم علیہ السلام بھی جبریل انسانی شکل میں آئے تھے۔ قرآن میں ہے۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم دربارِ نبوّت میں تھے کہ اچانک ایک شخص نے طلوع کیا جس کا حلیہ یہ تھا۔ بال بہت کالے، کپڑے انتہائی سپید، ان پر سفر کے اثرات بھی نہ تھے۔ پھر انہوں نے حضور علیہ السلام سے سوالات کیے۔ آپ نے جواب دیئے۔ ان کے جانے کے بعد حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ یہ جبریل امین تھے تم کو تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔ معلوم ہوا کہ نُور جب لباسِ بشریت میں آئے تو اس کے ظاہری لباس کی وجہ سے اس پر بشر کا اطلاق ہو جاتا ہے مگر اس لباسِ بشری کے باوجود رہتا نُور ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جبریل امین کو لباسِ انسانی میں دیکھا تو ان کو رجل کہا لیکن ان کو بعد میں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ انسان نہیں بلکہ فرشتہ تھے۔ تو اسی طرح حضور سید عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں لباسِ بشریت میں جلوہ گر ہوئے ہیں اور اسی لباسِ بشریت کی وجہ سے آپ پر لفظِ بشر کا اطلاق ہوتا ہے یعنی ؎

محمد سرِّ وحدت ہے کوئی رمز اس کی کیا جانے شریعت میں تو بندہ ہے حقیقت میں خدا جانے

جبریل امین نے عرض کی یارسول اللہ اخبرنی مجھے خبر دیجئے۔ ملا علی قاری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ یہاں امر استدعا کے لیے ہے کیونکہ یہ قطعی بات ہے کہ انبیاء کرام ملائکہ علویہ سے افضل و اعلیٰ ہیں (مرقات جلد اول ص ۴۵)

علامہ قسطلانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ جبریل امین حضور علیہ السلام سے صحابہ کی موجودگی میں سوالات کرنا اس لیے تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم علم و معرفت کا خزینہ ہیں۔ حضرت مُلّا علی نے وتؤتی الزکوٰۃ کے تحت لکھا ہے کہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے یعنی جب تک کسی مستحق آدمی کو زکوٰۃ کا روپیہ دے کر اس کو اس کا مالک نہ بنایا جائے اس وقت تک زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

۴۸۔ یہاں امام نے حدیث ہرقل لکھی ہے جو مع تفہیم و ترجمہ کے اوپر گزر چکی ہے۔ دیکھئے حدیث نمبر ۶

بَابُ فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَاءَ لِدِيْنِهٖ

باب اسکی فضیلت کے بیان میں جو دین کی حفاظت کیلیے (گناہوں) سے بچے

زہد کے معنیٰ دُنیا میں انہماک سے بچنے کے ہیں اور ورع کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی شبہات سے پرہیز کرے۔ عنوان باب کا حاصل یہ ہے کہ دین میں احتیاط کی جائے اور شبہات سے بچنے والا اس شخص سے افضل ہے جو شبہات سے پرہیز نہیں کرتا۔ اس عنوان کے تحت امام نے جو حدیث درج کی ہے۔ علماء و فضلاء نے اس کی شرح میں مستقل رسالے لکھے ہیں اور اس کو مہمات حدیث سے قرار دیا ہے۔

۴۹۔ حَدَّثَنَا اَبُوْ نُعَيْمٍ حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِيْرٍ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْحَلَالُ بَيِّنٌ وَّالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَّبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَّا يَعْلَمُهَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الْمُشْتَبِهَاتِ اسْتَبْرَاَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَاعٍ يَّرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يُّوَاقِعَهٗ اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا اِنَّ حِمَى اللّٰهِ فِيْ اَرْضِهٖ مَحَارِمُهٗ اَلَا وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ (بخاری شریف)

عامر کہتے ہیں میں نے نعمان بن بشیر سے سُنا وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ حلال و حرام دونوں واضح ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں مشتبہات ہیں جن کو بہت لوگ نہیں جانتے پھر جو کوئی شبہ کی چیزوں سے بچے۔ اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا اور جو کوئی ان شبہ کی چیزوں میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو بادشاہ کی محفوظ زمین کے آس پاس اپنے جانوروں کو چرائے تو قریب ہے کہ وہ اس محفوظ زمین میں داخل ہو جائیں۔ سُن لو ہر بادشاہ کی ایک محفوظ جگہ ہوتی ہے اور اللہ کا حمی وہ امور ہیں جو اس نے حرام قرار دیئے۔ خبردار اقلیم بدن میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے اگر درست ہے تو سارا جسم درست ہے اگر وہ بگڑ گیا تو سارا جسم بگڑ گیا اور وہ دل ہی ہے۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری و مسلم و نسائی نے کتاب البیوع میں بھی ذکر کیا ہے اور ابن ماجہ نے کتاب الفتن میں ۲۔ حضرت نعمان بن بشیر مشہور صحابی ہیں۔ ان کے والد اور والدہ بھی صحابی تھے۔ یہ ہجرت کے بعد انصار میں سب سے پہلے مولود ہیں۔ ۶۵ھ میں ان کی شہادت ہوئی۔ ان سے کل ۱۱۴ حدیثیں مروی ہیں۔ نعمان نامی صحابی تقریباً ۳۰ ہوئے ہیں مگر نعمان بن بشیر یہی ایک ہیں۔

حلال اور حرام شریعت کی مشہور اصطلاح ہے۔ بیّن اس کے معنیٰ ظاہر اور واضح کے ہیں۔ یعنی وہ امور جن کا حکم بالکل ظاہر ہو ـــ مشتبہات وہ بات ہے جس کا حکم ظاہر نہ ہو ـــ استبراء براءت کے اصل معنیٰ کسی چیز سے دُور ہونے یا زائل کرنے کے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں فلاں اس بات سے بری ہے یا فلاں میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ مضغہ گوشت کے لوتھڑے کو کہتے ہیں۔ قلب دل کو کہتے ہیں۔ کبھی قلب سے مراد عقل بھی لی جاتی ہے۔ جیسے اس آیت میں اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ　　اس قرآن میں نصیحت ہے اس کے لیے جو قلب سلیم رکھتا ہے یعنی عقل صحیح رکھتا ہے۔ الحِمیٰ۔ ح کے زیر اور م کے زبر کے ساتھ زمین کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جو بادشاہ اپنے لیے مخصوص کر لیتا ہے اور کسی اور کو اس میں آنے یا اس کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ قال الجوهری هذا شئ حمی ای محصور لا یقرب منه

مطلب حدیث

۱۔ فرمایا حلال و حرام بالکل واضح ہیں۔ یعنی جن چیزوں کو قرآن و حدیث نے حرام یا حلال قرار دیا ہے ان کی حرمت و حلت بالکل ظاہر و واضح ہے۔ ان میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی حلت و حرمت مشتبہ ہوتی ہے اور دلائل میں تعارض کی وجہ سے بہت لوگ ان کے اصلی حکم کو نہیں مانتے لہذا جو شخص مشتبہات سے پرہیز نہیں کرتا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے چرواہا ایسی زمین کے اردگرد بکریاں چرائے جو زمین بادشاہ نے اپنے لیے مخصوص کر رکھی ہے تو لامحالہ ایک دن ایسا آئیگا کہ بکریاں اس محفوظ زمین میں داخل ہو جائیں گی تو یہی حال مشتبہات کو اختیار کرنے والے کا ہے ۲۔ بعض علمائے نے اس حدیث کے یہ معنی لیے ہیں کہ حدیث ہذا میں احکام و مسائل سے حوادث و وقائع کی طرف انتقال ہے لہذا معنی حدیث یہ ہے کہ جو شبہ سے بچا اس نے اپنے دین کو ضائع ہونے سے بچا لیا اور جس نے تہمت کی جگہ سے پرہیز کیا اس نے اپنی عزت و ناموس کو بچا لیا۔

۳۔ علامہ نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اشیاء تین قسم پر ہیں۔ اوّل وہ جن کا حلال ہونا بالکل واضح ہے جیسے پانی، روٹی، میوہ وغیرہ دوم، وہ جن کی حرمت بالکل ظاہر ہے جیسے شراب، خنزیر، خون، زنا، سود وغیرہ سوم، شبہات وہ امور جن کی حلت و حرمت واضح نہیں ہوتی۔ اسی لیے عوام ان کے حکم کو نہیں جانتے تو علماء مجتہدین ایسے امور کے احکام بھی نص یا اجماع یا قیاس سے معلوم کر لیتے ہیں اور جب کسی چیز کا حکم واضح نہیں ہوتا تو مجتہد قرآن و حدیث جو دین کی اصل ہے اس میں غور کر کے دلیل شرعی کے ساتھ مشتبہات کا حکم معلوم کر کے اس کو حرام یا حلال کی فہرس میں شامل کر دیتے ہیں۔

علامہ خطابی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے ارشاد لا یدری کثیر من الناس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اکثر لوگ (عوام) مشتبہات کے حکم کو نہیں جانتے مگر بعض جانتے ہیں یعنی علماء مجتہدین اجتہاد سے اس کا حکم بھی معلوم کر لیتے ہیں تو یہ چیزیں مشتبہ ان لوگوں کے لیے ہیں جو اجتہادی بصیرت کے مالک نہیں ہیں (عینی جلد اول ص۳۵۰)

واضح ہو کہ وہ چیزیں اور وہ کام جن کی حلت و حرمت کے متعلق شریعت خاموش ہے یا ان کے کرنے یا نہ کرنے کی ہدایت نہیں دی گئی ہے ایسی تمام چیزیں یا کام الحلال بیّن میں داخل ہیں کیونکہ مشتبہات سے وہی کام اور چیزیں مراد ہیں جن کے متعلق شریعت سے کوئی واضح حکم نہیں ملتا اور دلائل شرعیہ میں غور کرنے سے اس کے حکم میں شک پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کو حلال قرار دیا جائے یا حرام، ایسے مشتبہ امور سے بچنا چاہیے پھر اس میں بھی دو طبقے ہو جائیں گے۔

۱۔ عام لوگ۔ جو اجتہادی بصیرت نہیں رکھتے ان کے لیے ایسے امور بہر حال مشتبہات ہی رہیں گے۔

۲۔ مجتہدین کرام۔ جو اجتہادی بصیرت کے مالک ہیں وہ دلائل پر غور و فکر کر کے ان کا حکم معلوم کریں گے۔ ان کے لیے یہ امور مشتبہ نہ رہیں گے لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مجتہد باوجود کوشش بسیار کے اور دلائل میں نظر و فکر کے ان کا حکم معلوم نہ کر سکے۔

تو اس صورت میں مجتہد کے لیے بھی یہ امور مشتبہ رہیں گے۔

چنانچہ حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ نَبِیذِ تَمر کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں خود اس کو استعمال نہیں کرتا۔ لیکن اگر کوئی مجھے ہفت اقلیم کی سلطنت دے اور کہے کہ اس کو حرام قرار دیدو تو میں اس کو حرام قرار دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں اور وجہ اس کی وہی اشتباہ ہے۔ بہرحال ورع اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ امور مشتبہ سے پرہیز کیا جائے۔

تحقیق لفظ مشتبہات واضح ہو کہ مشتبہات کا لفظ قرآن میں بھی آیا ہے۔ لیکن کہیں اس کے معنیٰ التباس کے ہیں اور کہیں تصدیق کے اور اصل یہ ہے کہ اگر تشابہ کا صلہ علیٰ ہو۔ اگرچہ محذوف ہی ہو تو معنیٰ التباس کے ہوں گے۔ جیسے ان دونوں آیتوں میں ۱۔ اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَہَ عَلَیْنَا ای اِلْتَبَسَ عَلَیْنَا۔ ۲۔ مِنْہُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ۔ ان دونوں آیتوں میں التباس کے معنی میں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب صلوں کے تغایر کی وجہ سے لفظوں کے معنیٰ میں تغایر پیدا ہو جائے تو وہ لفظ مشترک معنوی ہو جاتا ہے۔ فافہم۔

بَابُ اَدَاءُ الْخُمُسِ مِنَ الْاِیْمَانِ

باب مالِ غنیمت سے پانچواں حصہ دینا علامتِ ایمان ہے

حدیث وفد عبد القیس اس باب نے امام بخاری نے ایک حدیث ذکر کی ہے۔ جس کے ابتدائی جملوں کا خلاصہ یہ ہے۔ ابی حمزہ سے حضرت ابن عباس نے بیان کیا کہ جب وفد عبد القیس دربارِ نبوی میں حاضر ہوا تو حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ تم کس قوم سے ہو۔ انہوں نے جواب دیا۔ ربیعہ سے۔ آپ نے ان کو مرحبا کہا۔ انہوں نے عرض کی حضور ہمارے اور کفار مضر کے درمیان جنگ رہتی ہے۔ اس لیے ہم صرف ان مہینوں میں حاضر ہو سکتے ہیں جن میں لڑائی بند رہتی ہے یعنی شہر الحرم (ذی قعد، ذی الحجہ و محرم) (واضح ہو کہ ان مہینوں کا کفار بھی احترام کرتے تھے اور لڑائی وغیرہ بند کر دیتے تھے)۔ تو حضور (علیہ السلام) ہم کو چند اصولی باتیں بتا دیجئے جس کی وجہ سے ہم جنت میں جائیں۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چار باتوں کا حکم فرمایا اور چار باتوں سے منع فرمایا۔ ان کو حکم دیا کہ ایک خدا پر ایمان لاؤ۔ فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اکیلے خدا پر ایمان لانا کیا ہے۔ انہوں نے کہا نہیں۔ فرمایا۔

۵۰ - قَالَ شَہَادَۃُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَاِقَامُ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءُ الزَّکٰوۃِ وَصِیَامُ رَمَضَانَ وَاَنْ تُعْطُوْا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمُسَ وَنَھَاھُمْ عَنْ اَرْبَعٍ عَنِ الْحَنْتَمِ وَالدُّبَّاءِ وَالنَّقِیْرِ وَالْمُزَفَّتِ وَرُبَّمَا قَالَ الْمُقَیَّرِ وَقَالَ احْفَظُوْھُنَّ وَاَخْبِرُوْھُنَّ مَنْ

شہادت دینا اس امر کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور مالِ غنیمت سے پانچواں حصہ (بیت المال اسلامی) میں جمع کرانا اور چار باتوں سے منع فرمایا۔ حنتم و نقیر، مزفت یا مقیر سے پھر

وَرَاءَكُمْ (بخاری شریف) | فرمایا۔ ان باتوں کو یاد کر لو اور دوسروں تک پہنچا دو

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے ۱۰ جگہ ذکر کیا۔ زکوٰۃ، صلوٰۃ، خمس، مغازی، خبر واحد، کتاب العلم، ادب و مناقب قریش اور توحید میں اور مسلم نے ایمان میں۔ ابوداؤد نے کتاب الاشربہ میں اور سنت میں اور ترمذی نے سیر اور ایمان میں اور نسائی نے علم اور ایمان اور صلوٰۃ میں ذکر کیا ہے۔

۲۔ دُبّاء۔ اس برتن کو کہتے ہیں جو طائف کے باشندے کدو کے دو ٹکڑے کر کے سکھا دیا کرتے تھے۔ نَقِیر، کھجور کی جڑ کے پیالہ کو کہتے ہیں جو یمامہ کے باشندے بناتے تھے۔ مُزَفَّت، جس برتن پر رال وغیرہ کا پلستر ہوتا ہے۔ اس کو قار اور قیر بھی کہتے ہیں۔ حَنتَم، مٹکا سُرخ رنگ کا جس کی ٹونٹی ایک جانب ہوتی ہے یا وہ مٹکا جو مٹی اور بال وغیرہ سے بنایا جاتا تھا اور اس میں شراب رکھی جاتی تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے قبیلوں کے وفود اسلامی احکام معلوم کرنے آیا کرتے تھے اور پھر واپس لوٹ کر یہ وفود اپنے قبیلوں میں اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ وفد عبد القیس بھی اسی سلسلہ میں آیا تھا اور حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی ضروری باتیں جو حدیثِ بالا میں مذکور ہیں تعلیم فرمائیں ۲۔ اس حدیث میں حج کا ذکر نہیں ہے حالانکہ حج بھی فرائض و ارکانِ اسلام سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وفد ۸ھ میں فتح مکہ سے قبل آیا تھا اور حج فتح مکہ کے بعد ۹ھ میں فرض ہوا۔ کما قالہ القاضی عیاض (عینی ج ۱ ص ۳۶۲)

۳۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دُبّا، حَنتَم، نقیر اور مزفت نامی برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا کیونکہ ان برتنوں میں شراب استعمال ہوتی تھی۔ یا یہ کہ ان برتنوں میں شیرہ رکھا جائے تو نشہ جلد پیدا ہوتا ہے۔ جب شراب حرام ہوئی تو آپ نے ان برتنوں کے استعمال کی احتیاطاً ممانعت فرمادی تاکہ کسی موقع پر بھی شراب کا خیال نہ آئے (مرقات جلد ۱ صفحہ ۷۹) یا اس کی وجہ یہ بھی کہ ان برتنوں میں شراب کا اثر باقی تھا اور جب یہ اثر جاتا رہا تو اس کے بعد آپ نے ان کے استعمال اجازت عطا فرمادی۔ جیسا کہ بخاری کتاب الاشربہ میں اجازت والی حدیث موجود ہے اور مسلم میں بھی ہے۔ واللہ اعلم

بَابُ مَا جَاءَ اِنَّ الْاَعْمَالَ بِالنِّيَّةِ وَالْحِسْبَةِ

باب اس امر کے بیان میں کہ اعمال کا ثواب نیت اور اخلاص پر مبنی ہے

وَلِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى فَدَخَلَ فِيْهِ الْاِيْمَانُ وَالْوُضُوْءُ وَالصَّلٰوةُ وَالزَّكٰوةُ وَالْحَجُّ وَالصَّوْمُ وَالْاَحْكَامُ (بخاری شریف)

اور ہر آدمی کے لیے وہی ہے جو وہ نیت کرے (امام بخاری کہتے ہیں) اس میں ایمان، وضو، نماز، زکوٰۃ، حج روزہ اور تمام معاملات داخل ہوئے (یعنی ان میں نیت شرط ہے۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس باب کے قائم کرنے سے امام کی غرض ان لوگوں کی تردید ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ایمان صرف زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے۔ امام نے یہ بتایا کہ ایمان دل کا فعل ہے اور اس میں نیت شرط ہے۔ جیسے دیگر اعمال میں نیت شرط ہے ۲۔ گذشتہ باب سے اس باب کا تعلق یہ ہے کہ اس میں ان امور کا ذکر تھا جن

کے کرنے سے آدمی جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس باب میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اعمال کے لیے نیت شرط ہے ۲۔ اس کے بعد امام نے سات چیزیں ذکر کی ہیں جو یہ ہیں:۔

۱۔ **ایمان** ۔ وہ کہتے ہیں ایمان کے لیے بھی نیت شرط ہے۔

۲۔ **وضو** ۔ امام بخاری کے نزدیک اور اسی طرح امام مالک و شافعی و احمد و عامہ اصحاب الحدیث کے نزدیک وضو میں بھی نیت شرط ہے لیکن احناف کے نزدیک وضو کے لیے نیت شرط نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب تک وضو نیت کے ساتھ نہ کیا جائے تو اس کا ثواب نہیں ملتا۔

۳۔ **نماز** ۔ اس میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ نماز کے لیے نیت شرط ہے بغیر نیت کے نماز ہوگی ہی نہیں کیونکہ یہ عبادۃ مقصودہ ہے۔

۴۔ **زکوٰۃ** ۔ تمام ائمہ متفق ہیں کہ زکوٰۃ بغیر نیت کے ادا نہیں ہوتی۔

۵۔۶۔ **حج و روزہ** ۔ اس میں ائمہ اربعہ کے نزدیک نیت شرط ہے۔ البتہ امام اعظم علیہ الرحمۃ کے نزدیک صرف روزے کی نیت کافی ہے۔ رمضان کی تخصیص ضروری نہیں ہے۔ لیکن عطاء، مجاہد اور امام زفر کا مسلک یہ ہے کہ صحیح و مقیم کے لیے رمضان میں مطلق نیت کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ رمضان میں نفل روزہ صحیح نہیں ہوتا۔

۷۔ **والاحکام** ۔ یعنی امام بخاری و شافعی کے نزدیک تمام معاملات بیع و شراء، نکاح و طلاق وغیرہ میں نیت شرط ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے بغیر نیت کے یہ کہہ دیا کہ میں نے بیچا، خریدا، رہن رکھا، طلاق دی، تو امام بخاری و امام شافعی کے نزدیک واقع نہ ہوگی۔ لیکن معاملات میں امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک نیت شرط نہیں۔ امام کے نزدیک صرف عباداتِ مقصودہ میں نیت شرط ہے جیسے نماز، روزہ، حج زکوٰۃ وغیرہ اور اعمال کا ثواب نیت سے ملتا ہے نہ یہ کہ نیت کے بغیر عمل معتبر ہی نہیں ہوتا۔ ان امور کے متعلق تفصیلی بحث گزشتہ اوراق میں ہو چکی ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ

اور اللہ تعالےٰ نے فرمایا میرے محبوب تم فرما دو ہر شخص اپنی طبیعت کے مطابق عمل کرتا ہے۔

۱۔ امام بخاری نے شاکلۃ کا ترجمہ "نیت" کیا ہے۔ ویسے اصل معنیٰ اس کے "طبیعت" کے ہیں۔ یعنی ہر انسان اپنی طبیعت کے مطابق کام کرتا ہے جو خلقۃً اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ یعنی اگر وہ سعید ہے تو اچھے کام کریگا اور اگر شقی ہے تو بُرے کام کرے گا ۲۔ حضرت حسن بصری، قتادہ، معاویہ بن قرۃ المزنی نے اس کے معنیٰ نیت کے کیے ہیں اور بعض مفسرین نے شاکلہ کے معنیٰ دین اور مذہب کے کیے ہیں اور بعض نے طریقہ کے۔

وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَّنِيَّةٌ (بخاری)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جہاد اور نیت باقی ہے۔

یہ اس حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جو فتح مکہ کے وقت حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمائی تھی کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں کیونکہ اب مکہ دار السلام ہو گیا ہے لیکن جہاد اور نیت قیامت تک باقی ہیں تو اگرچہ ہجرت منقطع ہو گئی ہے مگر جہاد

اور نیتِ ثواب بھی باقی ہیں۔ان کے ذریعے آدمی ثواب حاصل کرسکتا ہے۔

وَنَفَقَةُ الرَّجُلِ عَلٰی اَهْلِهٖ يَحْتَسِبُهَا صَدَقَةٌ

اور آدمی جو اپنے اہل وعیال پر خرچ (خلوص نیت کے ساتھ) کرتا ہے وہ بھی صدقہ ہے۔

یعنی جیسے صدقہ (باعثِ ثواب ہے) میں ثواب ملتا ہے اسی طرح اس میں ثواب ملتا ہے۔یہ مضمون آیندہ حدیث میں آرہا ہے۔

حدیث "اَلْاَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ" کے چند اہم فوائد و مسائل

۵۱۔عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْاَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ وَلِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوٰی الخ .

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اعمال کا ثواب نیت سے ہے اور ہر شخص کے لیے وہی ہے جو وہ نیت کرے۔

توضیح یہ حدیث ابتدائے کتاب میں مع تفہیم و ترجمانی کے گزر چکی ہے۔یہاں مزید نئے فوائد ذکر کیے جاتے ہیں۔اس حدیث سے جو اصول نکلتا ہے وہ یہ ہے۔اعمال خواہ وہ فرائض ہوں یا واجبات، مستحبات ہوں یا مباحات، ان کا ثواب اسی وقت ملے گا جب کہ نیت صالح ہو۔نیز یہ بات یاد رکھئے کہ اس حدیث سے اعمال سے کوئی خاص عمل مراد نہیں ہے۔لہٰذا اس میں وہ عمل بھی داخل ہے جس کے متعلق شریعت نے نہ کرنے کا حکم دیا ہے اور نہ اس سے منع کیا ہے یعنی مباح۔تو اب اس اصول کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر وہ کام جو مباح ہو اور جس کے کرنے پر ثواب بھی مقرر نہ ہو۔اگر اسی کام کو آدمی نیت خیر کے ساتھ کرے تو وہ عبادت ہو جائے گا اور اس کا ثواب ملے گا۔چنانچہ علامہ عینی علیہ الرحمہ اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں۔

۱۔وَفِيْهِ الْحَثُّ عَلٰی نِيَّةِ الْخَيْرِ مُطْلَقًا وَاِنَّهٗ يُثَابُ عَلَی النِّيَّةِ

(عینی جلد اوّل صفحہ ۳۶۵)

اس حدیث میں نیتِ خیر کی ترغیب دی گئی ہے مطلقاً اور یہ کہ آدمی کو اس کے عمل کا ثوابِ نیت کی وجہ سے مل جائیگا۔

۲۔حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں لکھتے ہیں کہ احادیث میں آیا ہے۔جب ملائکہ بندوں کے اعمال آسمانوں پر لے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔اَلْقِ تِلْكَ الصَّحِيْفَةَ۔اس صحیفہ کو پھینک دو۔یعنی یہ ہمیں منظور نہیں ہے۔فرشتے عرض کریں گے۔الٰہی اس بندے نے نیک کام کیے۔ہم نے سُنے اور دیکھے اور لکھ لیے ان کو کیسے پھینک دیں۔حکم ہوگا۔لَمْ يُرِدْ بِهٖ وَجْهِيْ۔چونکہ اس بندے نے اس عمل کے ساتھ میری رضا کا ارادہ نہیں کیا۔اس لیے یہ میرے حضور میں مقبول نہیں ہیں۔اسی طرح ایک دوسرے فرشتے کو حکم ہوگا۔اُكْتُبْ لِفُلَانٍ كَذَا وَكَذَا۔فلاں بندے کے اعمال نامے میں فلاں فلاں عمل لکھ لے۔فرشتہ عرض کریگا۔الٰہی یہ کام تو اس نے کیا ہی نہیں؟ ارشاد ہوگا کہ گو وہ کر نہیں سکا مگر اس کا ارادہ اور نیت تو اس کام کے کرنے کی تھی۔دیکھئے نیت صالح سے عمل کے بغیر ہی ثواب مل گیا اور بُری نیت سے کیے ہوئے اعمال ضائع ہو گئے۔

۳۔حضرت رومی علیہ الرحمۃ نے مثنوی میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے مسجد کے پاس اپنا مکان بنوایا اور مسجد کی طرف ایک

کھڑکی رکھ لی۔ اس کے پیر نے پوچھا یہ کھڑکی کیوں رکھی ہے جواب دیا ہوا کے لیے۔ آپ نے فرمایا۔ اگر تو یہ نیت کرتا کہ کھڑکی اس لیے رکھتا ہوں تاکہ اذان کی آواز یا جماعت کے کھڑے ہوجانے کا علم ہوجایا کرے تو ہوا تو خود بخود آجایا کرتی اور تجھے تیری نیت کا ثواب ملتا۔

۴۔ غریب کی مدد کرنا کارِ ثواب ہے۔ قرآن و حدیث نے اس عمل پر ثواب مقرر کیا ہے تو اب اگر کسی ایسے غریب کی مدد کرے جو اس کا رشتہ دار ہے اور نیت یہ کرے کہ غریب رشتہ دار کو دینے میں صلہ رحمی بھی ہے تو ایسی صورت میں تعدد نیت کی وجہ سے اس کو دو ثواب مل جائیں گے۔ ایک صدقہ کا۔ دوسرا صلہ رحمی کا۔

۵۔ نماز پڑھنا کارِ ثواب ہے لیکن آپ ایک ایسی مسجد میں جاکر نماز پڑھتے ہیں جو ویران ہے اور آپ کی نیت ہے کہ اس ویران مسجد میں جب نماز پڑھوں گا تو میری وجہ سے اور لوگ بھی یہاں آئیں گے اور مسجد آباد ہوجائے گی۔ یہاں بھی تعددِ نیت کی وجہ سے ڈبل ثواب ملے گا۔ ایک نماز کا۔ دوسرے مسجد کو آباد کرنے کا۔

۶۔ مسجد میں بیٹھنا ایک عمل ہے۔ اگر اس کے ساتھ اعتکاف کی نیت کرے تو ثوابِ اعتکاف مل جائیگا۔ پھر اعتکاف کے ساتھ یہ نیت بھی ہو کہ جماعت کا انتظار رہے تو بحکمِ حدیث جماعت کا منتظر نماز میں ہے نماز کا ثواب ملے گا۔ پھر اعتکاف یہ نیت کرے کہ جتنی دیر مسجد میں ٹھہروں گا تمام اعضاء کی جملہ برائیوں سے حفاظت ہوگی تو یہ ثواب بھی مل جائیگا۔ پھر اسکے ساتھ درود شریف پڑھنے کی نیت کرے مسجد میں علم کا افادہ یا استفادہ ہوگا یا کوئی دینی بھائی مل جائیگا۔ اس کی زیارت کرونگا یا کوئی سلام کہے گا اس کا جواب دوں گا۔ کسی کو چھینک آئے گی تو یرحمک اللہ کہوں گا الغرض جتنی نیتیں کرے گا۔ سب کا ثواب مل جائیگا۔ دیکھئے کام ایک ہی ہے مگر نیتیں متعدد ہیں اور نیتوں کا الگ الگ ثواب مل رہا ہے کیونکہ حدیثِ بالا کے الفاظ لکل امرءٍ ما نویٰ کا یہی مطلب ہے کہ جو نیت کریگا وہی پائیگا۔

۷۔ ایک شخص اپنی ضرورت سے بازار جا رہا ہے۔ بازار جانا ایک مباح عمل ہے لیکن اگر وہ اس میں یہ نیت کرلے کہ رستہ میں جو تکلیف دہ چیز ہوگی۔ اس کو ہٹا دوں گا۔ اسلام کی اشاعت کروں گا۔ کسی کو برا کام کرتے دیکھوں گا تو منع کروں گا کسی مسلمان بھائی کو خوش کرنے کے لیے مسکرا دوں گا۔ جتنی نیتیں کریگا۔ سب کا الگ الگ ثواب مل جائیگا اور یہ بازار جانا کارِ ثواب ہوگا۔ پھر لطف یہ کہ ارادہ تو ان امور کرنے کا کرلیا مگر کر نہ سکا تو بھی ثواب مل جائے۔ اسی لیے حدیث میں فرمایا۔ نِیَّۃُ الْمُؤْمِنِ اَبْلَغُ مِنْ عَمَلِہٖ کہ مومن کی نیت اس کے عمل سے زیادہ معتبر ہے۔

۸۔ غرض کہ اس حدیثِ مبارکہ سے یہ اصول نکلتا ہے کہ ہر وہ کام جس کی ممانعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی جب وہ نیک نیتی سے کیا جائے تو وہ کام عبادت ہوجائیگا اور اس پر ثواب ملے گا۔

چنانچہ اس اصول کی روشنی میں اگر دیانت داری سے مسائل کی حیثیت دیکھی جائے تو بہت سے ایسے مسائل حل ہوجاتے ہیں جن میں آج بحث و مباحثہ، مکابرہ و مجادلہ کا بازار گرم ہے۔

۱۔ مثلاً مجلس میلاد کے قیام و اہتمام کو لیجئے۔ اگر نیت یہ ہے کہ حضور سید عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ظاہر ہو۔ آپ کے فضائل و مناقب بیان ہوں اور آپ کی سیرتِ مبارکہ قوم کے سامنے رکھی جائے تو اس حدیث کی رو سے جائز

ہے اور کار ثواب ہے۔ اگر مجلس میلاد کے قیام کی غرض ریا و سمعہ ہو یا اس کو فرض و واجب سمجھ لیا جائے اور یہ خیال کیا جائے صرف ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ کو ہی یہ مجلس قائم ہو سکتی ہے اور دنوں میں ذکر رسول ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ نیت غلط ہے اور اس کی اصلاح کر دینی چاہیئے۔

۲۔ یا مثلاً میت کے تیسرے، ساتویں یا چالیسویں دن کھانا پکا کر مساکین کو کھلایا جائے اور یہ نیت ہو کہ دن مقرر کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مساکین جمع کر لیے جاتے ہیں تو حدیث ہذا کی روشنی میں اس کے جواز میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اگر نیت یہ ہو کہ دن مقرر کرکے ہی فاتحہ دینے میں ثواب پہنچتا ہے ویسے نہیں یا کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ دینا ضروری ہے تو اس کی اصلاح کر دینی چاہیئے اور بتا دینا چاہیئے کہ ثواب پہنچانے کے لیے دن مقرر کرنا ضروری نہیں ہے جس روز بھی ایصالِ ثواب کیا جائے خواہ کھانا پکا کر غرباء میں تقسیم کیا جائے یا قرآن پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچایا جائے ہر طرح جائز ہے ہاں اگر ان قیود میں کوئی مصلحت ہو تو حرج نہیں کیونکہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔

۳۔ اسی طرح میت کے دفن کے بعد لوگ جمع رہتے ہیں اور کلمہ پڑھتے ہیں۔ ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ بیکار بیٹھے رہنے اور فضول گفتگو کرنے سے بہتر ہے کہ کلمہ طیبہ جس کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ افضل الذکر ہے پڑھتے رہیں تو یقیناً موجب برکت ہے۔ پھر اگر بعض روایات کے مطابق ستر ہزار بار ہو جائے اور میت کو بخشا جائے تو امیدِ مغفرت ہے۔ لہٰذا اس حدیث کی رو سے ضرور ان کو اجر ملے گا اور پھر وہ میت کو بخشیں گے تو ضرور میت کو پہنچے گا۔ کیونکہ اعمال کا مدار نیت پر ہے اور جب اعمال کا مدار نیت پر ہے تو اب مذکورہ بالا کام کرنے والوں کو جب کہ ان کی نیت حسن ہے بدعتی کہنا اور جاہلوں کو یہ کہہ کر مغالطہ دینا کہ کیا یہ کام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا کیسا فضول اعتراض اور کس قدر جہالت ہے بہرحال دیانت و امانت ہو اور نفسانیت و ہٹ دھرمی نہ ہو تو اس قسم کے بہت سے مختلف فیہ مسائل اسی حدیث کی روشنی میں حل ہو جاتے ہیں۔ فافہم

الدِّینُ النَّصِیحَۃ اللہ کے لیے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات و صفات پر ایمان لایا جائے اور ہر نقص اور عیب سے اسے پاک و منزہ مانا جائے اور اس کے منشا و مرضی کے مطابق زندگی گزار دی جائے رسول کے لیے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے رسول علیہ السلام نے پیش کیا ہے۔ اس کی تصدیق کی جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ اس کے اوامر پر عمل کیا جائے اور نواہی سے بچا جائے اور ہر وقت اور ہر آن آپ کا ادب و احترام کیا جائے۔ آپ کی سنتوں کو زندہ کیا جائے اور آپ کے اہلبیت و اصحاب سے محبت کی جائے۔ کتاب اللہ کے لیے نصیحت کے معنیٰ یہ ہیں کہ قرآنِ پاک کے کلامِ الٰہی ہونے پر ایمان لایا جائے اور یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اس مثل بنایا جانا محال ہے۔ اس میں کمی و زیادتی، تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ائمہ کے لیے نصیحت کے معنیٰ یہ ہیں کہ معروف میں ان کی اطاعت کی جائے تلوار سے ان پر خروج نہ کیا جائے۔ ان کے پیچھے نماز پڑھی جائے۔ ان کے ساتھ مل کر جہاد کیا جائے اور صدقات و زکوٰۃ ان کی تحویل میں دی جائے۔ عام شارحین نے ائمہ سے اصحاب حکومتِ اسلامیہ مراد لیا ہے اور بعض علماء کو مراد لیتے ہیں کہ ان کی عزت کی جائے اور جو وہ حکمِ شرعی بیان کریں اس کو تسلیم کیا جائے۔ عام مسلمانوں کے لیے نصیحت ہے کہ معنیٰ یہ ہیں مسلمان آپس میں محبت کے ساتھ رہیں۔ نیکی کے ساتھ تعاون کریں اور برائی سے عدمِ تعاون کریں اور اپنے بھائی مسلمان کے حقوق

ادا کرتے رہیں۔

۵۲ - ۱ - عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلٰی اَھْلِہٖ یَحْتَسِبُھَا فَھِیَ لَہٗ صَدَقَۃٌ (بخاری)

حضرت ابو مسعود سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب کوئی اپنے گھر والوں پر ثواب کی نیت سے خرچ کرے تو صدقہ کا ثواب پائیگا۔

۵۳ - ۲ - عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ اَنَّہٗ اَخْبَرَہٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَۃً تَبْتَغِیْ بِھَا وَجْہَ اللّٰہِ اِلَّا اُجِرْتَ عَلَیْھَا حَتّٰی مَا تَجْعَلُ فِیْ فَمِ امْرَاَتِكَ (بخاری)

عامر بن سعد نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے سُنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو جو کچھ خرچ کرے اور اس سے نیت تیری اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہو تو تجھ کو اس کا ثواب ملے گا۔ یہاں تک اس پر بھی جو لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے۔

فوائد و مسائل ۱۔ حدیث اول کو امام بخاری نے مغازی اور نفقات میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و نسائی نے کتاب الزکوٰۃ میں۔ یہ حدیث عنوانِ ثانی یعنی والحسبۃ سے متعلق ہے۔ حدیث دوم کو امام نے مغازی، دعوات، طب، فرائض میں بھی درج کیا ہے اور مسلم و ترمذی و ابن ماجہ و ابوداؤد نے کتاب الوصایا میں درج کیا ہے۔ دونوں حدیثیں اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں اور ان میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے۔ کسی غریب و محتاج کی مدد کی جائے حتیٰ کہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کیا جائے اور مقصود اس سے رضائے الٰہی ہو تو اس پر بھی ثواب مل جائیگا۔ حدیث دوم میں فِیْ فَمِ امْرَاَتِكَ کے الفاظ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب اپنی بیوی کے منہ میں ایک لقمہ دینا باعث اجر ہے تو غریب و محتاج کو کھانا کھلانے اور ان کی امداد و اعانت کرنے میں کس قدر ثواب ہوگا۔

بَابُ قَوْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

باب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا

اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَ لِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِھِمْ وَقَوْلِہٖ تَعَالٰی اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (بخاری)

کہ دین نصیحت ہے اللہ کے لیے رسول کے لیے مسلمان حاکموں کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے اور اللہ تعالٰے نے سورہ توبہ میں فرمایا جب وہ اللہ اور رسول کی خیر خواہی میں رہیں۔

فوائد و مسائل نصیحۃ۔ نصح الرجل ثوبہ سے ماخوذ ہے یعنی کپڑے کو سوئی سے سینا۔ توبۃ النصوح بھی اسی سے ماخوذ ہے۔ گناہ سے دین میں خلا پیدا ہوتا ہے تو توبہ اس خلا کو پُر کر دیتی ہے۔ امام مازری نے کہا نصیحۃ مشتق ہے نصحت العسل سے یعنی شہد کو اس کی آلائش سے پاک و صاف کرنا۔ اسی لیے وہ بات جو غل و غش سے پاک ہو اس کو نصیحت کہتے ہیں۔ الدین النصیحۃ کے معنی یہ ہیں کہ معظم ارکانِ دین نصیحت ہے۔ جیسے کہتے ہیں الحج العرفۃ۔

۵۴ - عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الْبَجَلِيِّ قَالَ بَايَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ (بخاری)

جریر ابن عبد اللہ بجلی کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر شرائطِ ذیل پر بیعت کی۔ اقامۃ الصلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، ہر مسلمان کی خیر خواہی۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے زکوٰۃ اور صلوٰۃ میں بھی ذکر فرمایا ہے اور مسلم نے کتاب الایمان میں اور ترمذی نے بیعت میں ذکر کیا ہے ۲۔ جریر ابن عبد اللہ بن جابر بجلی وفاتِ نبوی سے چالیس دن قبل اسلام لائے یہ بہت حسین صحابی تھے۔ اسی لیے لوگ ان کو یوسف کہا کرتے تھے۔ ان کی دیانت وللّٰہیت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ان کے غلام نے تین سو روپے میں ایک گھوڑا خریدا۔ انہوں نے جب گھوڑا دیکھا تو کہنے لگے یہ گھوڑا تو تین سو روپے سے زیادہ کا ہے تو سستا لایا ہے۔ فوراً مالک کے پاس گئے اور کہا اس کی قیمت تین سو روپے تو نے کم لی ہے۔ قیمت زیادہ کر۔ اس نے کچھ روپے اور زیادہ کر دیے۔ مگر انہوں نے اس کو کل رقم نو سو روپے دیئے۔ ان سے ایک سو حدیثیں مروی ہیں۔ یہ کوفہ سے قرقیسیا چلے گئے تھے۔ وہاں ۵۱ھ میں وصال ہوا۔

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف اوقات میں بیعتیں ہوئی ہیں۔ انہیں میں یہ بیعت ہے۔ جس میں قیامِ نماز، ادائیگی زکوٰۃ پر بیعت کا ذکر ہے۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ ایک مسلمان کا فرضِ مذہبی یہ بھی ہے کہ حتی المقدور اپنے مسلمان بھائی کا خیر خواہی کرے۔

۵۵ - عَنْ زِيَادِ بْنِ عِلَاقَةَ قَالَ سَمِعْتُ جَرِيْرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ يَوْمَ مَاتَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ قَامَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ وَقَالَ عَلَيْكُمْ بِاتِّقَاءِ اللّٰهِ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَالْوَقَارِ وَالسَّكِيْنَةِ حَتّٰى يَاْتِيَكُمْ اَمِيْرٌ فَاِنَّمَا يَاْتِيْكُمُ الْاٰنَ ثُمَّ قَالَ اسْتَعْفُوْا لِاَمِيْرِكُمْ فَاِنَّهٗ كَانَ يُحِبُّ الْعَفْوَ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّيْ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْتُ اُبَايِعُكَ عَلَى الْاِسْلَامِ فَشَرَطَ عَلَيَّ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ فَبَايَعْتُهٗ عَلٰى هٰذَا وَرَبِّ هٰذَا الْمَسْجِدِ اِنِّيْ لَنَاصِحٌ لَكُمْ ثُمَّ اسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ (بخاری)

زیادہ بن علاقہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں۔ میں نے جریر بن عبد اللہ سے سنا۔ جس دن مغیرہ بن شعبہ (حاکم کوفہ) کا انتقال ہوا تو وہ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور اللہ کی تعریف بیان کی اور کہا کہ تم پر لازم ہے کہ صرف اللہ سے ڈرو جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور وقار و سکینہ کو لازم پکڑو۔ یہاں تک کہ تمہارا دوسرا حاکم آجائے اور وہ اب آتا ہے اور پھر کہا اپنے سابق امیر کے لیے استغفار کرو اس لیے کہ وہ بھی عفو و درگزر کو پسند کرتا تھا۔ پھر کہا۔ جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت ہونے کے لیے حاضر ہوا اور عرض کی میں اسلام پر بیعت ہوتا ہوں تو آپ نے اسلام کی شرط کے ساتھ النصح لکل مسلم کی شرط بھی لگا کر مجھے بیعت فرمایا میں نے اس شرط پر آپ سے بیعت کر لی۔ مجھے اس مسجد کے رب کی قسم میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ پھر آپ نے استغفار کیا اور

اور منبر پر سے اُتر گئے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے شروط میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے کتاب الایمان میں اور نسائی نے بیعت میں ذکر کیا یہ حدیث حضرت عبداللہ بجلی صحابی کا ایک خطبہ ہے جو انھوں نے اس وقت دیا تھا جب کہ کوفہ کے حاکم مغیرہ بن شعبہ کا انتقال ہو گیا تھا اور یہ ان کی جگہ حاکم مقرر ہوئے تھے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی وفات ۵۰ھ میں ہوئی بزمانہ امیر امیر معاویہ کوفہ کے حاکم تھے اور ان کے انتقال کے بعد حضرت عبداللہ بجلی کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔

وقار کے معنیٰ صبر و تحمل کے ہیں۔ سکینہ اضطراب کی ضد ہے۔ استعفوا کے معنیٰ عفو و درگزر کے ہیں۔ رب ہذا المسجد سے مراد مسجد حرام ہے۔ جیسا کہ طبرانی کی حدیث میں مسجد کی جگہ رب الکعبہ کے لفظ آئے ہیں۔ حضرت جریر نے یہ خطبہ زمامِ حکومت سنبھالنے کے بعد دیا اور اس میں عوام کو صبر و تحمل کی تلقین کی اور اپنی ذات کے متعلق یہ یقین دلایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور تمہاری بھلائی و خیر خواہی میرا فرضِ منصبی ہے۔

حضرت امام بخاری علیہ الرحمہ نے اس حدیث پر کتاب الایمان کو ختم کیا ہے اور اس طرف اشارہ کیا ہے کہ میں بھی قومِ مسلم کا خیر خواہ ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑی خیر خواہی اور کیا ہو سکتی ہے کہ انہوں نے ہماری فلاحِ دینی و دنیوی کے لیے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو مرتب کر کے ہمیں دیدیا۔ قومِ مسلم پر امام کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

اللہ تعالیٰ بطفیل سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم حضرت امام بخاری کی رُوحِ مطہر پر اپنی بے پایاں رحمتوں کی بارش فرمائے اور اعلیٰ علیین میں اعلیٰ ترین مراتب و درجات سے سرفراز فرمائے اور آخرت میں ہم نیاز مندوں کا انہیں کے ساتھ حشر فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

کتاب العلم

علم کی تعریف اور اس کے اقسام فلاسفہ کے نزدیک حُصُوْلُ الصُّوْرَۃِ (یا) اَلصُّوْرَۃُ الْحَاصِلَۃِ کا نام علم ہے اور ماتریدیہ کے نزدیک علم ایک صفت ہے جو قلب میں ودیعت ہوتی ہے۔ جیسے قوتِ باصرہ آنکھ میں ہوتی ہے جس کی وجہ سے اشیاء کا انکشاف ہوتا ہے ۔ یہاں امام بخاری کا مقصد علم کی ماہیت و حقیقت کو بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ بات اس فنِ شریف سے تعلق نہیں رکھتی۔ ان کا مقصد علم کے متعلقات کو بیان کرنا ہے۔ یہاں علم سے وہ علم مراد ہے جس سے اللہ عزوجل کی رضا حاصل ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا علم صرف انبیاء کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ وہی یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کس بات میں ہے۔ اس لیے ایسے علم کے حصول کے لیے نبوت پر ایمان لانا شرط ہے۔

علامہ قسطلانی فرماتے ہیں کہ علم اپنی معلومات کے لحاظ سے متعدد قسم کا ہوتا ہے۔ اس میں سے ایک علم ظاہر ہے یعنی علم

شرح - یہ مجموعہ ہے تفسیر، فقہ اور حدیث کا اور علامہ شیخ عزالدین بن عبد السلام نے کہا۔ علم صرف ونحو واصول وغیرہ ایسے علوم ہیں جو بدعت ہیں مگر ان کا حصول واجب ہے (کیونکہ ان کے ذریعے قرآن وحدیث کے معانی ومفاہیم پر آدمی مطلع ہوتا ہے اور علم باطن دو قسم پر ہے اول، علم معاملہ یہ فرض عین ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی دل کو پاک وصاف کرے۔ نفس کو مہذب بنائے اخلاق ذمیمہ کو ترک کرے اور اخلاق حمیدہ صبر، شکر، زہد، تقویٰ، قناعت کو اختیار کرے۔

دوسری قسم علم المکاشفہ ہے جو قلب میں اس کے تزکیہ کے بعد ظاہر ہوتا ہے تو پھر اس کے ذریعہ معانی مجملہ کھل جاتے ہیں۔ معرفت وصفات الٰہی حاصل ہوتی ہے۔

وَتَنْكَشِفُ لَهُ الْاَسْتَارُ عَنْ مُخَبَّاتِ الْاَسْرَارِ | اور اسرار خفیہ سے پردے اٹھ جاتے ہیں

علم مکاشفہ کا انکار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جو اس سے انکار کرتا ہے وہ ہلاک ہوجاتا ہے (قسطلانی جلد اول ص۱۵۴)

بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

یہ باب علم کی فضیلت کے بیان میں ہے

اس باب میں امام بخاری نے ذیل کی دو آیتیں ذکر کی ہیں۔ جن میں علم اور علماء کی فضیلت کا بیان ہے۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ وَقَوْلِهٖ تَعَالٰى رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۔ (بخاری)

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بلند کیا۔ جو تم میں سے ایمان لائے اور علم والوں کو درجے کی بلندی عطا فرمائی۔ اور قول باری تعالیٰ ہے۔ اے اللہ مجھے زیادہ علم دے

توضیح | پہلی آیت میں اس کا بیان ہے کہ مومن عالم کے درجے مومن غیر عالم سے بلند ہوں گے جس سے علم اور علم والوں کی فضیلت کا اظہار ہوا۔ دوسری آیت میں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ آپ اپنے رب سے علم کی زیادتی کی دعا فرمایا کریں۔ علم دین اور علماء دین کے احادیث نبویہ میں کثیر فضائل وارد ہوئے ہیں جن کی تفصیل کیلئے دفتر درکار ہے

بَابُ مَنْ سُئِلَ عِلْمًا وَّهُوَ مُشْتَغِلٌ فِيْ حَدِيْثِهٖ

باب اس امر کے بیان میں جس سے کوئی علم کی بات پوچھی جائے اور وہ

فَاَتَمَّ الْحَدِيْثَ ثُمَّ اَجَابَ السَّائِلَ (بخاری)

مصروف گفتگو ہو اور پھر اپنی بات کو پورا کرکے سائل کو جواب دے۔

۵۸ - عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ بَيْنَمَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ مَجْلِسٍ يُحَدِّثُ الْقَوْمَ جَآءَهٗ اَعْرَابِيٌّ فَقَالَ مَتَى السَّاعَةُ فَمَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَدِّثُ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ سَمِعَ مَا قَالَ فَكَرِهَ مَا قَالَ وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَمْ يَسْمَعْ حَتّٰى اِذَا

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ میں بیٹھے ہوئے ان سے گفتگو فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک گنوار آیا اور پوچھنے لگا کہ قیامت کب آئے گی۔ آپ اپنی گفتگو میں مصروف رہے (حاضرین میں سے بعض نے کہا کہ آپ نے گنوار کی بات سنی مگر پسند نہ کی اور بعض یہ کہنے لگے کہ آپ نے اس کی بات سنی ہی

فَقَضٰى حَدِيْثَهٗ قَالَ اَيْنَ اُرَاهُ السَّائِلُ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ هَا اَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَاِذَا ضُيِّعَتِ الْاَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ فَقَالَ كَيْفَ اِضَاعَتُهَا قَالَ اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰى غَيْرِ اَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ (بخاری)

نہیں۔ جب آپ گفتگو پوری کر چکے تو فرمایا قیامت کو پوچھنے والا کہاں گیا۔ گنوار نے کہا میں حاضر ہوں یا رسول اللہ۔ فرمایا سن لے جب امانت اٹھ جائے تو قیامت کا انتظار کر۔ اس نے کہا۔ حضور امانتداری کے اٹھنے کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا جب کام نااہل کے سپرد کر دیا جائے تو پھر قیامت کا انتظار کر۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے کتاب الرقاق میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و ترمذی وغیرہ نے اس حدیث کو روایت نہیں کیا ۲۔ حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

۱۔ جب مسائلِ دین کے متعلق سوال ہو تو عالم کا جواب دینا واجب ہے ۲۔ سائل کو چاہیئے کہ جب تک عالم دوسرے سے بات کر رہا ہے خاموش رہے۔ جب بات ختم ہو جائے تو پھر بات کرے ۳۔ عالم و مفتی کو چاہیئے کہ سائلوں کو ترتیب وار جواب دے ۴۔ عالم کو چاہیئے کہ سوالات کے جواب بقدرِ ضرورت دے اور اس میں سائل کے حال کا خیال رکھے ۵۔ قیامت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اقتدار نااہلوں کے سپرد ہو جائے یا لوگ جاہلوں کو اپنا امام، پیشوا، مفتی اور خلیفہ بنالیں۔ ظاہر ہے سنار کا کام اگر لوہار کے سپرد کر دیا جائے۔ ترکھان کا کام حساب کے پروفیسر کو دے دیا جائے۔ انصاف کی خدمت ظالم و جابر کے سپرد کر دی جائے۔ وزارت و امارت خودغرض، لالچی اور کمینہ افراد کے ہاتھ میں آجائے۔ جاہل اور کودن محض افراد کو شیخ الاسلام اور مفتی اعظم بنالیا جائے تو قیامت قبل از قیامت کا برپا ہونا لازمی ہے ۶۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو تاخیر سے جواب کیوں دیا جب کہ وہ ایک امر دینی کے متعلق سوال کر رہا تھا۔ جواب یہ ہے کہ اول تو قیامت کی تاریخ اور وقت کے متعلق بتانا ضروری نہ تھا۔ کیونکہ یہ ان امور سے ہے جن کو مخفی رکھا گیا ہے۔ ثانیاً، ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام کسی اور سائل کا جواب دے رہے ہوں یا کوئی مسئلہ بیان فرما رہے ہوں کہ جس کے بیچ میں جواب دینے سے اور سلسلہ کلام کے ٹوٹ جانے سے اس کے مفہوم میں اختلاط پیدا ہونے کا خطرہ ہو یا سائل کے سوال سے بھی زیادہ اہم حضور علیہ السلام صحابہ کو سمجھا رہے ہوں۔

بَابُ مَنْ رَفَعَ صَوْتَهٗ بِالْعِلْمِ

جو علم کی بات پکار کر کہے اس کا بیان

یعنی بوقتِ ضرورت کسی مسئلہ شرعی کو بلند آواز سے بھی سنایا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ لوگ غافل ہوں یا ہجوم ہو یا دور ہوں یا کسی امر دینی کو کما حقہٗ ادا نہ کر رہے ہوں۔

۵۹۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ تَخَلَّفَ عَنَّا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفْرَةٍ سَافَرْنَاهَا فَاَدْرَكَنَا وَقَدْ اَرْهَقَتْنَا الصَّلٰوةَ

حضرت عبداللہ بن عمر کا بیان ہے کہ ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ حضور ہم سے پیچھے رہ گئے اور اس وقت ہم سے آ کر ملے جب کہ (عصر) کی نماز کا وقت

وَنَحْنُ نَتَوَضَّأُ فَجَعَلْنَا نَمْسَحُ عَلٰى اَرْجُلِنَا فَنَادٰى بِاَعْلٰى صَوْتِهٖ وَيْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلٰثًا

(بخاری)

ہو گیا تھا اور ہم وضو کر رہے تھے اور پاؤں یونہی سا دھو رہے تھے۔ اس پر آپ نے فرمایا خرابی ہو ایڑیوں کے لیے جہنّم سے۔ دو مرتبہ یا تین مرتبہ (یہ جملہ آپ نے بلند آواز سے فرمایا۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب العلم میں مکرر اور طہارت میں بھی ذکر کیا ہے اور نسائی نے کتاب العلم میں اور مسلم نے طہارت میں۔ وَیْل۔ جہنّم کی ایک وادی ہے۔ جس کی حرارت کا یہ عالم ہے کہ اگر پہاڑ اس میں ڈال دیئے جائیں تو پگھل جائیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ویل جہنموں کی راد، پیپ کو کہتے ہیں۔ ویسے عموماً عرب ویل کا لفظ اس شخص کے لیے بولتے ہیں جو ایسا کام کرے جو اس کی شان کے خلاف ہو۔ ویح کا لفظ بھی ویل کے ہم معنیٰ بولا جاتا ہے اور اس کے اصل معنیٰ ہلاکت اور عذاب کے ہیں۔ حدیثِ ہٰذا سے معلوم ہوا کہ وضو میں پاؤں دھونا فرض ہے اور دھونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ پانی عضو پر ایک بار بہہ جائے۔ محض تیل کی طرح چپڑ لینے کو دھونا نہیں کہتے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اعضائے وضو سے کوئی عضو ذرا بھی خشک رہ گیا تو وضو درست نہ ہوگا۔

۲۔ اگرچہ امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے مسح کی شرح میں یہ لکھا ہے کہ ابتدا میں پاؤں کا مسح کیا جاتا تھا۔ پھر یہ منسوخ ہو گیا اور وضو میں پاؤں دھونا فرض قرار پایا لیکن اگر یہ بات ہوتی تو حضور علیہ السلام مسح کی منسوخی کے لیے ویل کا لفظ استعمال نہ فرماتے کیونکہ وعید اس مقام پر سنائی جاتی ہے جہاں لوگ کسی حکم شرعی میں کوتاہی کر رہے ہوں۔ لفظ ویل تو قرینہ ہے اس بات کا کہ وضو کرنے والے پاؤں دھونے میں احتیاط نہیں برت رہے تھے۔ یعنی ایسے دھو رہے تھے کہ ایڑیاں خشک رہ گئی تھیں۔ چنانچہ حدیث مسلم اس کی تائید کرتی ہے۔ اس میں یہ وضاحت ہے کہ یہ سفر مکّہ سے مدینہ کی طرف تھا۔ راستہ میں نماز کا وقت ہو گیا تو صحابہ جلدی میں وضو کرنے لگے۔ وھم عجال اور اسی جلدی میں دھونے کی وجہ سے ایڑیاں خشک رہ گئیں۔ اس پر حضور علیہ السلام نے وعید سنائی اور فرمایا۔ ویل لاعقاب

بَابُ قَوْلِ الْمُحَدِّثِ حَدَّثَنَا وَاَخْبَرَنَا وَ اَنْبَاَنَا

باب محدّث کا حدثنا، اخبرنا اور انبانا کہنے کے بیان میں

فوائد و مسائل اس باب کو قائم کر کے امام بخاری علیہ الرحمۃ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ محدّث کبھی حدثنا کہتا ہے، کبھی انبانا کبھی اخبرنا۔ تو ان تینوں جملوں کا حاصل ہے ایک اور ان میں مفہوم و معنیٰ کے لحاظ سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

۱۔ قال الحمیدی کان عند ابن عیینہ حدثنا و اخبرنا وانباءنا و سمعت واحداً

۲۔ قَالَ ابن مسعود حدثنا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وَسَلَّمَ

۳۔ وقَالَ شفیق عن عبداللہ سمعت النبی صلی اللہ عَلَیْہ وَسَلَّمَ

۴۔ وقَالَ حذیفۃ حدثنا رسول اللہ صلی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حدیثین

امام نے ان تین تعلیقوں کو پیش کر کے یہ بتایا ہے کہ دیکھو صحابی کبھی حدثنا (حدیث بیان کی ہم سے) کہتا ہے۔ کبھی اخبرنا

وانباءنا (خبر دی ہم کو) کہتا ہے اور کبھی سَمِعْتُ (میں نے سُنا) کہتا ہے جس سے ثابت ہوا کہ ان تینوں کا مطلب ایک ہے
۲۔ اس کے بعد امام نے ذیل کی تین تعلیقیں اور لکھی ہیں۔
۱۔ عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۲۔ قالَ ابو ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۳۔ قالَ انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یرویہ عن ربہ
ان تین تعلیقوں کو پیش کرکے امام نے یہ بتایا ہے کہ جس روایت میں عن عن ہو تو وہ سماع پر محمول ہوگی بشرطیکہ راوی کی ملاقات ثابت ہو جائے۔ یعنی جب راوی حدیث عن عن کے ساتھ روایت کریگا تو یہ سمجھا جائیگا کہ راوی نے یہ حدیث خود حضور سے یا صحابی سے یا تابعی سے سُنی ہے۔ امام نے ان چھ تعلیقات کو دوسرے مقامات پر اسناد سے ذکر کیا ہے۔ ۳۔ کتاب العلم سے اس عنوان کی مناسبت ظاہر ہے کیونکہ محدث کے لیے ضروری ہے کہ ان کلمات کے معنی ومفہوم کو جانے اور باب اوّل سے اس کی مناسبت یہ ہے کہ اس میں اس امر کا بیان تھا کہ بوقتِ ضرورت عالم کو بلند آواز سے حاضرین کو خطاب کرنا اور مسائلِ شرعیہ سُنانا جائز ہے۔ تاکہ حاضرین ان مسائل کو خوب اچھی طرح سُن لیں اور دوسروں تک پہنچائیں۔ اب ظاہر ہے کہ حاضرین جب ان مسائل شرعیہ کو روایت کریں گے تو مذکورہ بالا الفاظ میں سے کسی لفظ کو استعمال کرنا ان کے لیے ناگزیر ہوگا۔ یعنی حاضرین میں سے جو صاحب بھی ان مسائل کو دوسروں تک پہنچائیں گے تو وہ حدثنا، انباءنا یا، سَمِعْتُ کے لفظ ہی بیان کریں گے اور یوں کہیں گے کہ حضور علیہ السلام نے ہم کو یہ مسئلہ بتایا یا ہم نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ بات سُنی۔ لہٰذا اس باب میں ان الفاظ کے معنی ومفہوم کو بیان کرنا مناسب ہوا۔

بَابُ طَرْحِ الْاِمَامِ الْمَسْئَلَةَ عَلٰٓى اَصْحَابِهٖ لِيَخْتَبِرَ مَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (بخاری)

باب بطور امتحان امام کا اپنے اصحاب سے سوال کرنا

اس عنوان میں امام بخاری نے جو حدیث درج کی ہے اس میں عنوان کے مطابق لفظ حدّثونی ہے۔

۶۰۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَاِنَّهَا مَثَلُ الْمُسْلِمِ فَحَدِّثُوْنِيْ مَا هِيَ فَوَقَعَ النَّاسُ فِيْ شَجَرِ الْبَوَادِيْ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ وَوَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ اَنَّهَا النَّخْلَةُ فَاسْتَحْيَيْتُ قَالُوْا حَدِّثْنَا مَا هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ هِيَ النَّخْلَةُ (بخاری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ درختوں میں ایک درخت ہے جس کے پتے نہیں گرتے اور یہ ہی مثال ہے مسلمان کی۔ بتاؤ وہ کونسا درخت ہے۔ یہ سُن کر لوگوں کا خیال جنگل کے درختوں کی طرف گیا۔ عبداللہ کہتے ہیں۔ میرے دل میں آیا کہ وہ درخت کھجور کا ہے۔ لیکن میں نے شرم سے نہ کہا۔ صحابہ نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! آپ ہی بیان فرمائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے۔

فوائد و مسائل

۱۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اس حدیث کو کتاب العلم میں تین مرتبہ ذکر کیا ہے۔ مسلم نے کتاب العلم میں اور ترمذی و نسائی نے اختلافِ الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے ۲۔ حدیثِ ہذا میں مسلمان کو کھجور کے درخت سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی جیسے کھجور کا درخت اور اس کے اجزاء و پھل بہت فائدہ مند ہوتے ہیں تو ایسے ہی مومنِ کامل کا وجود معاشرہ کے لیے موجبِ خیر و برکت ہوتا ہے۔ ۳۔ بعض علماء نے وجہ تشبیہ یہ بیان کی ہے کہ جیسے کھجور کے درخت کا سر کاٹ دیا جائے تو وہ باقی نہیں رہتا۔ یہی حال مسلمان کا ہے یا یہ کہ کھجور کے درخت مذکر و مونث دونوں ہوتے ہیں یا اس میں بھی انسان کی طرح مادہ ہوتا ہے یا انسان کی طرح اس میں جذباتِ عشق و محبت پائے جاتے ہیں۔ مگر یہ تمام وجوہ تشبیہ ضعیف ہیں۔ کیونکہ یہ تمام امور کافر میں بھی پائے جاتے ہیں اور حدیثِ ہذا میں صرف مومن کو تشبیہ دی گئی ہے)۔

یہ حدیث مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ اُستاد اور عالم کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے اصحاب یا شاگردوں کا امتحان لینے کے لیے ان سے سوال کرے جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم سے سوال کیا ۲۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے محض حیاء کی وجہ سے جواب نہ دیا۔ حالانکہ صحیح جواب ان کے خیال میں آچکا تھا جس سے واضح ہوا کہ ایسے مواقع پر حیا کرنا جہاں کسی دینی امر میں خلل واقع نہ ہو جائز ہے لیکن جہاں خلل ہو وہاں حیاء جائز نہیں ہے جیسے مسائل حیض و نفاس نہ بتانا یا عورتوں کا نہ پوچھنا کہ اگر وہ ان مسائل سے واقف نہ ہوں گی تو صوم و صلوٰۃ جو فرائض ہیں ان کی ادائیگی کیسے کریں گی اس لیے حسبِ موقع و ضرورت عالم کو عورتوں کے مخصوص مسائل بتانے میں حیا کرنا جائز نہیں ۳۔ کھجور اور اس کا پھل برکت والا ہے۔ کھجور کے فوائد اظہر من الشمس ہیں۔ قرآن پاک میں شجرہ طیبہ سے مراد اکثر مفسرین نے کھجور کے درخت ہی کو مراد لیا ہے تو جیسے کھجور کے درخت کی جڑیں زمین میں نہایت گہری اور مضبوط ہوتی ہیں۔ اسی طرح مومن کے قلب میں ایمان جاگزیں ہوتا ہے یا جیسے کھجور کا درخت آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ اسی طرح مومن کے اعمالِ صالحہ کا کثیر ثواب عطا کیا جاتا ہے ۴۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امثال و اشباہ سے مسائل کو سمجھانا مستحب ہے تاکہ سامع خوب اچھی طرح سمجھ جائے ۵۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوا کہ تشبیہ میں مشبہ کو سب باتوں میں مشبہ بہ کے مثل ہونا ضروری نہیں ہے۔ جیسے مسلم کو کھجور کے درخت سے تشبیہ دی گئی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کھجور اور مسلمان میں من کل الوجوہ مشابہت و مماثلت ہے یا جیسے بہادر انسان کو شیر سے تشبیہ دی جاتی ہے تو صرف وصفِ بہادری میں یا جیسے قرآن پاک میں فرمایا:۔

مَامِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ	(کلمہ حصر بھی یہاں موجود ہے اور لفظی ترجمہ آیت کا یہی ہے) یہ جانور اور پرندے وغیرہ تمہاری طرح ایک اُمت ہیں۔

حالانکہ ظاہر ہے جانور اور پرندے مکلف نہیں۔ ان پر انسان کی طرح نماز روزہ وغیرہ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے تو یہ تشبیہ بھی محض اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونے میں ہے کہ جیسے انسان اللہ کی مخلوق ہے۔ ایسے ہی یہ جانور وغیرہ بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اس سے ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے جو حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنے جیسا انسان ثابت کرنے کے لیے انما انا بشر مثلکم کی رٹ لگایا کرتے ہیں ۶۔ اسی حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سوال کرنا عدمِ علم پر دلالت نہیں

کرتا جیسا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے سوال کیا۔ حالانکہ آپ کو جواب معلوم تھا۔ یا جیسے اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ حالانکہ اللہ عزوجل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی چیز کا علم تھا۔ منکرین علم نبوی اس مضمون کی حدیثیں پیش کرکے کہا کرتے ہیں کہ دیکھو حضور علیہ السلام نے سوال کیا تو آپ کو اگر علم غیب ہوتا تو آپ سوال کیوں کرتے۔ حالانکہ ایسا کہنا سخت جہالت ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سائل کو جواب معلوم ہوتا ہے مگر اس کے باوجود سوال کرتا ہے جیسے کہ اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا یا حضور علیہ السلام نے صحابہ کرام سے سوال کئے۔ لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کرنے کو آپ کے عدم علم کی دلیل بنانا ہر طرح باطل ہے۔

بَابُ الْقِرَاءَةِ وَالْعَرْضِ عَلَى الْمُحَدِّثِ (بخاری)

باب محدث کے سامنے پڑھنے اور اس پر اسکی کتاب سنانے کے بیان میں

اس عنوان کے قائم کرنے سے امام کا مقصود یہ بتانا ہے کہ روایت حدیث کا ایک طریقہ یہ ہے کہ استاد یا شیخ اپنے شاگرد کو خود حدیث سنائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ شاگرد استاد کی کتاب حدیث کو حفظ کرکے یا ناظرہ استاد کو پڑھ کر سنائے۔ یہ دونوں طریقے جائز اور قابل اعتماد ہیں۔ امام نے اس امر کے ثبوت میں حضرت حسن بصری، حضرت سفیان ثوری و امام مالک وغیرہم کے اقوال پیش کیے ہیں مثلاً امام مالک، حسن بصری و سفیان ثوری نے شاگرد کے پڑھنے کو جائز کہا اور بعض نے حدیث ضمام بن ثعلبہ سے اس کے جواز پر استدلال کیا۔ حضرت ضمام خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ عرض کی کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم لوگ نماز پڑھیں؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا! ہاں۔ تو گویا یہ حضور علیہ السلام کے سامنے پڑھنا ہوا۔ پھر حضرت ضمام نے انہی امور کو اپنی قوم تک پہنچایا اور انہوں نے ان کی باتوں کو تسلیم کر لیا۔ حضرت امام مالک نے صک سے استدلال کیا۔ یعنی صاحب معاملہ کو دستاویز پڑھ کر سنائی جائے اور اس کا اقرار اور تصدیق کرے اور پھر اس سے روایت کرنا صحیح ہوگا تو اس توضیح کے بعد امام بخاری نے اس سوال کے متعلق یہ حدیث لکھی ہے۔

۶۲۔ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ يَقُوْلُ بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ دَخَلَ رَجُلٌ عَلٰى جَمَلٍ اَنَاخَهٗ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ عَقَلَهٗ ثُمَّ قَالَ اَيُّكُمْ مُحَمَّدٌ وَّالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَّكِئٌ بَيْنَ ظَهْرَانِيْهِمْ فَقُلْنَا هٰذَا الرَّجُلُ الْاَبْيَضُ الْمُتَّكِئُ فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ يَا ابْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَجَبْتُكَ فَقَالَ الرَّجُلُ اِنِّيْ سَائِلُكَ فَمُشَدِّدٌ عَلَيْكَ فِي الْمَسْاَلَةِ فَلَا تَجِدْ عَلَيَّ فِيْ نَفْسِكَ فَقَالَ سَلْ عَمَّا

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک بار ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ اتنے میں ایک شخص اونٹ پر سوار آیا اور اس نے اپنا اونٹ بٹھایا اور مسجد میں باندھ دیا۔ پوچھنے لگا تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ اور حضور علیہ السلام اس وقت تکیہ لگا کر تشریف فرما تھے۔ ہم نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں۔ گورے چٹے تکیہ لگائے بیٹھے ہوئے تو وہ حضور علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ عبدالمطلب کے بیٹے! حضور علیہ السلام نے جواب میں فرمایا۔ میں سن رہا ہوں۔ وہ کہنے لگا۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں اور سختی سے پوچھوں گا تو آپ اپنے

بِذَالِكَ فَقَالَ اَسْئَلُكَ بِرَبِّكَ وَرَبِّ مَنْ قَبْلَكَ آللّٰهُ اَرْسَلَكَ اِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ فَقَالَ اللّٰهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ اَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ آللّٰهُ اَمَرَكَ اَنْ نُّصَلِّيَ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ قَالَ اللّٰهُمَّ نَعَمْ قَالَ اَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ آللّٰهُ اَمَرَكَ اَنْ نَّصُوْمَ هٰذَا الشَّهْرَ مِنَ السَّنَةِ قَالَ اللّٰهُمَّ نَعَمْ قَالَ اَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ آللّٰهُ اَمَرَكَ اَنْ تَاْخُذَ هٰذِهِ الصَّدَقَةَ مِنْ اَغْنِيَآءِنَا فَتَقْسِمَهَا عَلٰى فُقَرَآءِنَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ الرَّجُلُ اٰمَنْتُ بِمَا جِئْتَ بِهٖ وَاَنَا رَسُوْلُ مَنْ وَّرَائِيْ مِنْ قَوْمِيْ وَاَنَا ضِمَامُ ابْنُ ثَعْلَبَةَ اَخُوْ بَنِيْ سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ (بخاری)

دل میں بُرا نہ منایئے گا۔ فرمایا جو تیرا جی چاہے پوچھ۔ اس نے کہا میں قسم دیتا ہوں آپ کو اپنے رب کی اور آپ سے پہلے والوں کے رب کی۔ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اللھم نعم (ہاں) اس نے کہا میں آپ کو اپنے آپ کے رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا اللہ تعالےٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم دن اور رات میں پانچ نمازیں پڑھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں! اس نے کہا میں آپ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم سال میں ایک مہینے کے روزے رکھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں، اس نے کہا کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے اغنیاء سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے فقراء پر خرچ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں، اس نے کہا جو آپ لائے ہیں اس پر ایمان لایا اور میں اپنی قوم کا قاصد ہوں ضمام ابن ثعلبہ، سعد ابن بکر کی قوم سے۔

فوائد ومسائل

۱۔ اس حدیث کو ابن ماجہ و ابو داؤد نے کتاب الصلوٰۃ اور نسائی نے کتاب الصوم میں ذکر کیا۔ فَلَا تَجِدْ۔ اس کے معنی غضب اور حزن کے آتے ہیں۔ وَجَدَ، یجد، وجدا نًا۔ فَاَنَاخَہٗ یعنی اس نے اونٹ کو بٹھایا اور اس کی ٹانگ کو موڑ کر باندھ دیا۔ ابو نعیم احمد و حاکم کی روایت میں یہ تصریح ہے کہ اس نے اونٹ کو مسجد کے دروازے پر باندھا تھا۔ مسجد میں اونٹ نہیں لایا تھا۔ حضور علیہ السلام نے اس کے سوال کے جواب میں اللّٰھم نعم فرمایا۔ اللّٰھم کی اصل یا اللہ ہے۔ حرفِ ندا کو حذف کر دیا اور میم کو اس کے بدلے میں لے آئے اللّٰھم ہو گیا۔ اس لفظ کا استعمال تین مقامات پر ہوتا ہے۔ ندا محض کے لیے مستثنیٰ کی ندرت کے بیان کے لیے۔ جواب میں قوت اور یقین کو پیدا کرنے کے لیے جیسے کسی نے پوچھا اَزَيْدٌ قَائِمٌ کیا زید کھڑا ہے تو جواب دیا۔ اَللّٰهُمَّ نَعَمْ۔ ہاں کھڑا ہے۔ اب یہاں اللّٰھم کا لفظ جواب میں قوت اور یقین کے پیدا کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

۲۔ حضرت ضمام ابن ثعلبہ نے یہ گفتگو جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی، ایمان لانے سے قبل کی تھی یعنی جب وہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور سوال کئے اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے ورنہ صحابہ کرام کے ادب و احترام کا یہ عالم تھا کہ وہ حضور علیہ السلام سے سوال کرنے میں جلدی نہیں کرتے تھے اور اس کے منتظر رہتے تھے کہ کوئی گاؤں کا گنوار آئے اور حضور علیہ السلام سے بلا تکلف سوال کرے اور ہم بھی سن لیں۔ اس حدیث سے یہ واضح ہوا کہ خبرِ واحد واجب العمل ہے اور

ضروریاتِ دین پر اجمالی طور پر ایمان لے آنا کافی ہے۔

بَابُ مَا يُذْكَرُ فِي الْمُنَاوَلَةِ وَكِتَابِ اَهْلِ الْعِلْمِ بِالْعِلْمِ اِلَى الْبُلْدَانِ

باب مناولہ و مکاتبہ کے بیان میں

مقصودِ باب یہ بتانا ہے کہ مناولہ بھی حجت ہے اور اس کے ساتھ اجازت بھی مقترن ہو جائے تو اس میں اور زیادہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مکاتبہ بھی حجت ہے بشرطیکہ اس میں کاتب و مکتوب الیہ کی تعیین ہو۔

مناولہ و مکاتبہ | مناولہ کی صورت یہ ہے کہ استاد اپنی کتاب شاگرد کو دے کر یہ کہے کہ اس میں جو حدیثیں میں نے لکھی ہیں فلاں سے سنی ہیں اور تم کو میں اجازت دیتا ہوں کہ اس کتاب کی حدیثوں کو تم روایت کرو۔ چنانچہ اس زمانہ میں حدیث کی سندیں دینے کا یہی طریقہ مروّج ہے۔

مکاتبہ یہ ہے کہ استاد اپنے ہاتھ سے خط لکھے یا دوسرے سے لکھوائے اور اپنے شاگرد کو بھیج دے اور یہ اجازت دے کہ ان احادیث کو تم روایت کر سکتے ہو۔ امام بخاری علیہ الرحمہ کے نزدیک مکاتبہ بھی قوت میں مناولہ کی طرح ہے لیکن دوسرے علمائے مناولہ کو مکاتبہ سے قوی قرار دیا ہے کیونکہ مناولہ میں بالمشافہ اجازت دی جاتی ہے۔ امام نے مناولہ و مکاتبہ کے محبت ہونے کے ثبوت میں امور ذیل کو پیش کیا ہے۔

اوّل، حضرت انس کہتے ہیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کے متعدد نسخے لکھوا کر مختلف شہروں میں بھیج دیے تھے۔ ابوحاتم نے کہا آپ نے سات عدد نسخے لکھوائے تھے۔ جنہیں شام، عراق، بحرین، بصرہ، کوفہ، مکہ اور یمن بھیجا تھا۔ **دوم،** اہلِ حجاز نے حدیثِ ذیل سے دلیل لی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے امیرِ لشکر کو ایک خط لکھ دیا اور فرمایا جب تم فلاں مقام پر پہنچو تو اس خط کو پڑھ کر سنا دینا۔ چنانچہ جب وہ اس مقام پر پہنچے تو انہوں نے خط کو کھولا اور حکمِ نبوی کو لوگوں تک پہنچا دیا۔ **سوم،** مناولہ و مکاتبہ کے قابلِ قبول ہونے کے متعلق امام نے ذیل کی دو حدیثوں سے بھی دلیل لی ہے۔

۶۳- اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ اَخْبَرَهُ اَنَّ رَسُوْلَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ بِكِتَابِهٖ رَجُلًا وَّاَمَرَهٗ اَنْ يَّدْفَعَهٗ اِلٰى عَظِيْمِ الْبَحْرَيْنِ فَدَفَعَهٗ عَظِيْمُ الْبَحْرَيْنِ اِلٰى كِسْرٰى فَلَمَّا قَرَاَهٗ مَزَّقَهٗ فَحَسِبْتُ اَنَّ ابْنَ الْمُسَيَّبِ قَالَ فَدَعَا عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّمَزَّقُوْا كُلَّ مُمَزَّقٍ (بخاری)

عبد اللہ بن عباس نے خبر دی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط عظیم بحرین کی طرف بھجوایا اور عظیم البحرین نے وہ خط کسریٰ تک پہنچایا۔ جب کسریٰ نے اس کو پڑھا تو پھاڑ دیا۔ (ابن شہاب) کہتے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ سعید ابن المسیب نے یہ کہا کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ کے لیے بد دعا کی کہ وہ بالکل تباہ و برباد ہو جائے۔

توضیح و تشریح | امام نے اس حدیث کو مغازی میں اور امام نسائی نے سِیَر میں ذکر کیا ہے ۲۔ رجلاً سے مراد

حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی ہیں۔ حضرت حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنگِ احد میں زخمی ہونے پر وفات پائی تھی۔ حضرت عبداللہ قدیم سے اسلام لائے اور مہاجرینِ اولین سے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ بدر کی لڑائی میں شریک ہوئے تھے۔ زمانہ فاروقی میں رومی نے ان کو قید کر لیا تھا۔ حضرت عثمان کے عہد میں ان کا انتقال ہوا۔

عظیم البحرین ۔ بحرین کے گورنر کا نام منذر بن ساوی ہے۔ حضرت عبداللہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ میرا خط عظیم البحرین کو دے دینا اور بحرین کے رئیس نے وہ خط کسریٰ تک پہنچا دیا تھا۔ کسریٰ نے جب نامہ مبارک پڑھا تو اس کو چاک کر دیا۔ کسریٰ کا نام پرویز بن ہرمز بن نوشیرواں ہے۔ یہ بڑی شان و شوکت کا بادشاہ تھا۔ عجم کا یہ طریقہ تھا کہ سلاطین کو جو خط لکھتے۔ اس میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خط بھیجا اس میں پہلے اللہ عزوجل کا نام تھا اور اس کے بعد من محمد رسول اللہ کے لفظ تھے۔ پرویز یہ دیکھ کر جل بھن گیا اور اس کو اپنی تحقیر سمجھا۔ نامہ اقدس کو غصہ میں چاک کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز کے بعد سلطنتِ عجم کے پرزے اُڑ گئے۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ کسریٰ نے نامہ مبارک پڑھنے کے بعد یمن کے گورنر باذان کو فرمان بھیجا کہ کسی کو حجاز بھیجو اور اس نئے مدعی نبوت سے توبہ کراؤ۔ بصورتِ دیگر اس کا سر کاٹ کر میرے دربار میں پیش کرو۔ جب باذان کے آدمی خدمت نبوی میں پہنچے تو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم لوگ جاؤ اور کہہ دینا کہ اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی"۔ (طبری)

اور ابن سعد کی روایت میں ہے کہ باذان کے آدمی خدمتِ نبوی میں پہنچے تو حضور علیہ السلام نے تبسم فرمایا اور فرمایا۔

اِنَّ رَبِّیْ قَتَلَ کِسْرٰی فِیْ هٰذِهِ اللَّیْلَةِ لِسَبْعِ سَاعَاتٍ مَضَتْ مِنْهَا (عینی جلد اول ص۱۴۷)	کہ میرے رب نے کسریٰ کو اسی رات قتل کر دیا ہے۔ ابھی سات ساعت گزری ہیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ابھی باذان کے قاصد یمن پہنچے ہی تھے کہ خبر آئی کہ شیرویہ (خسرو پرویز کا بیٹا) نے اپنے باپ پرویز کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ ۷ھ کا ہے اور پھر خلافتِ فاروقی میں ایران کی سلطنت تمام دنیا سے اُٹھ گئی اور حضور علیہ السلام کی پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی ؎ تمہارے منہ سے جو نکلی وہ بات ہو کے رہی

۶۴ - عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَتَبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابًا اَوْ اَرَادَ اَنْ يَّكْتُبَ فَقِيْلَ لَهٗ اِنَّهُمْ لَا يَقْرَءُوْنَ كِتَابًا اِلَّا مَخْتُوْمًا فَاتَّخَذَ خَاتَمًا مِّنْ فِضَّةٍ نَقْشُهٗ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (بخاری)	حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط لکھا یا لکھنے کا ارادہ فرمایا تو آپ سے کہا گیا کہ عجم یا روم کے بادشاہ وہی خط پڑھتے ہیں جس پر مہر ثبت ہو تو حضور علیہ السلام نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی۔ اس کے نگینہ پر محمد رسول اللہ لکھا تھا۔

امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الجہاد و اللباس میں بھی ذکر کیا ہے۔ مسلم نے لباس میں اور امام نسائی نے سیر اور علم اور کتاب التفسیر میں ذکر فرمایا ہے۔ امام بخاری نے ان دونوں حدیثوں کو مکاتبہ کے ثبوت میں ذکر کیا ہے۔

ان دونوں حدیثوں سے ذیل کے مسائل معلوم ہوئے۔

۱۔حدیث کو لکھنا، کفار کو دعوتِ اسلام دینا، کفار پر بددعا کرنا، قاضی، بادشاہ یا حاکم کو اپنے فرمان یا خط پر مُہر لگانا، انگوٹھی کے نگینہ پر کوئی عبارت یا اپنا نام یا اللہ عزوجل کا نام کندہ کرانا۔ یہ سب امُور جائز ہیں۔ واضح ہو کہ مرد کے لیے صرف چاندی کی انگوٹھی جو مردانہ وضع کی ہو اس کا نگینہ ایک ہو اور ساڑھے چار ماشہ سے کم وزن کی ہو، پہننا جائز ہے مگر ترک افضل ہے البتہ بادشاہ، حاکم و مفتی کو مُہر کی غرض سے پہننا سُنّت ہے۔

بَابُ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِي بِهِ الْمَجْلِسُ

باب اس امر کے بیان میں کہ جو شخص وہاں بیٹھے جہاں مجلس

وَمَنْ رَأَى فُرْجَةً فِي الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيهَا (بخاری)

کی انتہا ہو اور جو شخص وہاں بیٹھ جائے جہاں حلقہ میں جگہ ہو

یہاں مجلس وحلقہ سے وعظ وتذکیر کی مجلس مراد ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ طالب علم کو علم کی مجلس میں کہاں بیٹھنا چاہیے۔امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اس باب میں جو حدیث لکھی ہے اس کے ابتدائی جملوں کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت ابوواقد لیثی کا بیان ہے۔ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں صحابہ کرام کے ساتھ جلوہ فرما تھے کہ اتنے میں تین آدمی آئے ایک تو ان میں سے واپس ہوگیا اور دو مجلسِ نبوی میں شریک ہونے کے لیے آپ کے پاس کھڑے رہے۔پھر ایک نے حلقہ میں تھوڑی سی خالی جگہ دیکھی وہاں بیٹھ گیا اور دوسرا لوگوں کے پیچھے بیٹھا جب حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم وعظ سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ کیا میں تم کو ان تینوں آدمیوں کا حال نہ بتاؤں؟ آپ نے فرمایا:۔

۶۵۔ اَمَّا اَحَدُهُمْ فَاَوَى اِلَى اللّٰهِ فَاٰوَاهُ اللّٰهُ مِنْهُ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَاَعْرَضَ وَاَعْرَضَ اللّٰهُ عَنْهُ (بخاری)

ان میں سے ایک نے اللہ تعالیٰ کے دامنِ رحمت میں پناہ لی تو اللہ نے اس کو جگہ دے دی۔ دوسرے نے اندر گھسنے میں لوگوں سے شرم کی تو اللہ نے بھی اس کو جزا دی (یعنی ثواب عطا فرمایا) اور دوسرا اس نے اعراض کیا۔ اللہ نے بھی اس سے اعراض کیا۔

فوائد و مسائل ۱۔اس حدیث کو امام بخاری نے صلوٰۃ میں، مسلم و ترمذی نے استیذان میں اور امام نسائی نے کتاب العلم میں ذکر کیا ہے ۲۔راویوں میں ابوواقد قابلِ ذکر ہیں۔ان کا نام حارث بن عوف ہے جنگِ یرموک میں شریک ہوئے۔مکہ میں وفات پائی اور مقبرۂ مہاجرین میں دفن ہوئے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے ۲۴ حدیثیں رُوایت کیں۔صحابہ میں ابوواقد کنیت کے تین اصحاب ہوئے ہیں۔

فاوی الی اللہ سے معلوم ہوا کہ مجالسِ وعظ ونصیحت میں شریک ہونا باعثِ ثواب ہے تو مجلس میں جگہ خالی ہو تو اس کو پُر کر دینا بہتر ہے بشرطیکہ لوگوں کو ایذا نہ پہنچے۔مجمع میں انتشار نہ ہو ورنہ جہاں جگہ مل جائے وہیں بیٹھ جانا چاہیے۔مجالسِ وعظ ونصیحت میں شریک ہونے والا اللہ تعالیٰ کی رحمت میں ہوتا ہے۔ فاوی الی اللہ یہ اس لیے فرمایا جس نے حلقہ میں جگہ دیکھی تو وہاں جا کر بیٹھ گئے جس سے واضح ہوا کہ اگر مجلسِ وعظ میں جگہ خالی ہو تو اس کو پُر کر دینا بہتر ہے مگر اس صورت میں

جب کہ لوگوں کو ایذا نہ پہنچے اور مجمع میں انتشار نہ پھیلے ورنہ جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جائے۔

فاستحی اللہ : یہ دوسرے شخص کے متعلق فرمایا جس نے حلقہ کے اندر آنے میں شرم کی تھی اور لوگوں کے پیچھے ہی بیٹھ گئے تھے۔ مطلب یہ کہ وہ ادباً حلقہ میں نہ آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل پر ثواب عطا فرمایا۔

فاعرض اللہ عنہ : یہ اس شخص کے متعلق فرمایا جس نے اس مجلسِ وعظ سے اعراض کیا۔ مطلب یہ کہ وہ مجلسِ وعظ کی خیر و برکت سے محروم رہے۔

۲۔ علامہ ابن حجر نے فاعرض اللہ کے ماتحت لکھا کہ یہ وعید اس شخص کے لیے بھی ہے جو مجلسِ خیر میں بلا عذر شریک نہ ہو لیکن یہ ظاہر ہے کہ عذر ہو یا نہ ہو ہر مجلسِ وعظ و تذکیر میں حاضر ہونا فرض و واجب کہاں ہے جس پر وعید سنائی جاتی۔ بعض شارحین نے پہلے شخص کو سب سے افضل قرار دیا ہے اور تیسرے کو محروم بلکہ بعض نے منافق تک لکھ دیا ہے حالانکہ بعض حدیث میں اس کے متعلق اشارہ بھی نہیں ہے۔ حدیث زیرِ بحث میں تو صرف اس خاص مجلس کے شرکار کے احوال کا بیان ہے اور مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ وہ بھی ——— جو حیا کی وجہ سے آگے نہیں بڑھے اور لوگوں کے پیچھے بیٹھ گئے اور دوسرے جنہوں نے جگہ دیکھی اور وہیں بیٹھ گئے۔ ان دونوں نے اس مجلس کے ثواب کو پالیا اور ان دونوں کو ان کی صحتِ نیت کے مطابق ثواب مل گیا۔ لیکن تیسرے شخص جو اس مجلس میں شامل نہ ہوئے وہ اس خاص مجلس کے ثواب سے محروم رہے اور بس۔ البتہ اس حدیث سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ واعظ و نصیحت کی مجالس میں شریک ہونا باعثِ اجر و ثواب ہے اور جو شریک نہیں ہوتا تو وہ اس خاص مجلس کے ثواب سے محروم رہے گا۔ (واللہ اعلم)

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

باب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ارشاد کے متعلق

رُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَىٰ مِنْ سَامِعٍ (بخاری) | کہ بعض اوقات مبلَّغ، سامع سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے

فوائد و مسائل رب تقلیل کے لیے آتا ہے لیکن تکثیر کے لیے کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ مُبلَّغ یعنی الیہ جار و مجرور کو حذف کر دیا۔ اَوعیٰ : افضل التفضیل سے وعیٰ سے اس کے معنیٰ حفظ و ضبط کے ہیں۔ لفظ ترجمہ ترمذی میں مذکور ہے اور بخاری کتاب الحج میں بھی ہے۔ مطلبِ حدیث یہ ہے کہ جن کو حدیث پہنچائی جائے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اصل سامع سے زیادہ حافظہ رکھتے ہیں اور فہم و ضبط کا مادہ ان میں زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا انہیں چاہیئے کہ دینی مسائل کو جب سنو، دوسروں تک پہنچا دو تاکہ تبلیغ و اشاعتِ دین کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے۔

اس باب میں امام بخاری نے جو حدیث ذکر کی ہے اس کے ابتدائی جملوں کا ترجمہ یہ ہے :۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ اپنے آپ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے ذکر کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ منیٰ میں ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو اونٹ پر جلوہ فرما ہوئے ایک صاحب نے اونٹ کی نکیل تھامی۔ پھر حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ آج کیا دن ہے؟ ہم سب خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دن کا کوئی اور نام لیں گے۔ فرمایا۔

آج یوم نحر نہیں؟ ہم نے عرض کی جی ہاں۔ فرمایا۔ یہ کونسا مہینہ ہے؟ ہم خاموش رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینہ کا کوئی اور نام لیں گے۔ پھر

۶۶۔ قَالَ اَلَیْسَ لِذِی الْحِجَّۃِ قُلْنَا بَلٰی قَالَ فَاِنَّ دِمَآءَکُمْ وَ اَمْوَالَکُمْ وَ اَعْرَاضَکُمْ بَیْنَکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْ شَھْرِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا لِیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ فَاِنَّ الشَّاھِدَ عَسٰی اَنْ یُّبَلِّغَ مَنْ ھُوَ اَوْعٰی لَہٗ مِنْہُ (بخاری)

فرمایا۔ کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے۔ ہم نے عرض کی ہاں۔ فرمایا۔ تمہارے خون، اموال اور عزتیں آپس میں (ایک دوسرے پر) حرام ہیں۔ جیسے اس دن کی حرمت اس مہینہ میں اور اس دن میں۔ پس حاضر کو چاہئے کہ وہ غائب کو میرا یہ ارشاد پہنچا دے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ حاضر سے غائب میرے ارشاد کو زیادہ یاد رکھنے والا ہو۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے فتن، تفسیر اضاحی میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم نے دیات میں۔
۲۔ اوعیٰ۔ کے معنی حفظ و فہم کے ہیں۔ فان دماءکم تقدیر عبارت یہ ہے۔ فان سفك دماءكم واخذ اموالكم وسلب اعراضكم۔ زمانہ جاہلیت میں قتل و قتال، لوٹ مار اور عزت و ناموس پر حملے کرنا عربوں کی طبیعت ثانیہ تھی۔ حضور علیہ السلام نے اپنے اس خطبہ میں جو آپ نے مقام منیٰ ذوالحجہ کی ۱۰ تاریخ کو ارشاد فرمایا۔ حاضرین کو نہایت حکیمانہ انداز میں مسلمان کی عزت و ناموس کی حرمت و عزت کا احساس دلایا اور فرمایا۔ ذوالحجہ کا مہینہ حرمت والا ہے۔ اس کی حرمت کے تم بھی قائل ہو۔ اسی طرح مکہ کی عزت و عظمت کے بھی تم لوگ قائل ہو سن لو کہ مسلمان کے جان و مال، عزت و ناموس کی حرمت اس مہینہ اور اس شہر کی طرح ہے۔

۳۔ حدیث زیر بحث مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ عالم کو منبر یا سواری پر بیٹھ کر وعظ کرنا جائز ہے ۲۔ عالم کو چاہیے کہ جہاں اور جس وقت جس مسئلہ کے اظہار کی زیادہ ضرورت ہو وہاں اس مسئلہ کو خصوصی طور پر بیان کرے ۳۔ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی عزت و آبرو کا پاس و لحاظ لازمی ہے اور حتی المقدور اپنے مسلمان بھائی کے جان و مال کی حفاظت کرنا اس کا فرض اسلامی ہے ۴۔ تمام مسلمانوں کی عزت و ناموس کا درجہ مساوی ہے۔ امیر و غریب، شاہ و فقیر حقوق انسانیت میں مساوی درجہ رکھتے ہیں ؎

عبد مسلم کم تر از احرار نیست خون شاہ برتر از معمار نیست

۵۔ حضور علیہ السلام اپنی احادیث کی تبلیغ و اشاعت کا حکم فرمایا کرتے تھے اور صحابہ کرام احادیث نبویہ کو دوسروں تک پہنچاتے تھے ۶۔ صحابہ کرام کے ادب و احترام کا یہ عالم تھا کہ جب حضور علیہ السلام ان سے کوئی سوال کرتے تو وہ عموماً اللہ و رسولہ اعلمُ (اللہ اور اس کا رسول جانتا ہے) کہا کرتے تھے۔

بَابُ الْعِلْمِ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ

باب اس امر کے بیان میں کہ علم قول اور عمل پر مقدم ہے

لِقَوْلِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ جان لو کوئی معبود نہیں سوا

اِلَّا اللّٰهُ فَبَدَأَ بِالْعِلْمِ (بخاری) | اللہ کے تو اللہ نے علم سے ابتدا فرمائی

یعنی آیت میں پہلے یہ فرمایا کہ اس امر کو جان لو کہ معبودِ حقیقی سوا اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں۔ اس کے بعد فرمایا۔ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ اور استغفار ایک عمل ہی ہے تو آیت میں عمل کا حکم علم کے بعد دیا گیا جس سے واضح ہوا کہ علم عمل پر مقدم ہے۔

علم وعلماء و فضائل

وَاَنَّ الْعُلَمَآءَ هُمْ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ وَرَّثُوا الْعِلْمَ مَنْ اَخَذَهٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ | علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء نے علم ورثہ میں چھوڑا۔ جس نے علم حاصل کیا۔ اس نے پورا حصہ حاصل کیا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل

یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔ جس کو ابن حبان، حاکم، ترمذی و ابوداؤد نے حضرت ابودرداء سے روایت کیا ہے۔ پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص علمِ دین کی طلب کے لیے سفر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنّت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔ طالبانِ علم دین کے لیے ملائکہ اپنے پر بچھاتے ہیں اور زمین و آسمان کی مخلوقات اس کے لیے استغفار کرتی ہے۔ حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں بھی۔ عالمِ دین کی فضیلت، عابد پر ایسے ہے جیسے چودھویں کے چاند کو تمام ستاروں پر اور علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء کرام میراث میں درہم و دینار نہیں چھوڑتے بلکہ ان کی میراث علم ہوتی ہے تو جس نے علمِ دین حاصل کیا۔ اسے میراثِ انبیاء کا پورا حصہ مل گیا۔ قرآنِ پاک سے بھی اس مضمون کی توثیق ہوتی ہے۔ ارشادِ باری ہے۔ ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا ـــــــ امام بخاری کا مقصود اس باب سے علم و علماء کی شان اور فضیلت بیان کرنا ہے تو جب علم انبیاء کی میراث ہوا تو اس سے علم و علماء کی فضیلت واضح ہوتی کہ جیسے نبوّت سے کوئی فضیلت زیادہ نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی شرف وراثتِ نبوت سے زیادہ نہیں ہو سکتا اور یہ فضیلت نفسِ علم کی ہے۔ اگر اس کے ساتھ عمل بھی ہو تو سبحان اللہ۔

وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَطْلُبُ بِهٖ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ (بخاری) | اور جو ایسے راستہ کو اختیار کرے جس سے علمِ دین طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنّت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

یہ بھی مذکورہ بالا حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔ امام مسلم نے اس کو روایت کیا۔ سھل اللہ کا مطلب یہ ہے کہ علمِ دین کی برکت سے اللہ تعالیٰ حسنِ عمل کی توفیق عطا فرمائے گا۔ جس کی وجہ سے جنّت میں جگہ ملے گی۔

وَقَالَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا | اور اللہ جل شانہٗ نے فرمایا۔ اور وہی لوگ اللہ سے زیادہ ڈرتے ہیں جو عالم ہیں۔

یعنی جو شخص جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی صفات کا عارف ہوگا۔ اتنی ہی زیادہ خوف و خشیت اس میں ہوگی اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں۔

۴- وَقَالَ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ | اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں جانتے ان کو مگر عالم

یعنی قرآنِ پاک میں جو امثال ہیں۔ ان کے فوائد و نتائج کو عالم ہی جانتے ہیں۔

۵- وَقَالَ وَقَالُوْا لَوْكُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَاكُنَّا فِي اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انھوں نے کہا کہ اگر ہم سنتے اور عقل رکھتے تو ہم دوزخی نہ ہوتے۔

۶- وَقَالَ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (بخاری)

اور اللہ نے فرمایا کیا برابر ہوسکتے ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے۔

۱- یعنی جب کفار کو دوزخ میں ڈالا جائیگا تو وہ کہیں گے کہ اے کاش ہم عقل رکھتے اور حق کو قبول کرتے تو حق کو قبول کرنا، یہ اوصافِ علم سے ہے تو مطلب یہ کہ کفار قیامت کے دن کہیں گے کہ اگر ہم علم والے ہوتے تو اپنے فرائض کو سمجھتے اور جہنم سے نجات پاتے۔

۲- دوسری آیت میں عالم اور جاہل میں فرق بتایا گیاہے کہ علم والوں کا درجہ بہت بڑا ہے اور علم کی مدح اور جہالت کی مذمت کی گئی ہے۔

۷- وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے ساتھ اللہ بھلائی کرنا چاہتاہے

۸- وَاِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ

اور علم وہی ہے جو سیکھنے سے حاصل ہو

۹- وَقَالَ اَبُوْذَرٍّ لَوْ وَضَعْتُمُ الصَّمْصَامَةَ عَلٰى هٰذِهٖ وَاَشَارَ اِلٰى قَفَاهُ ثُمَّ ظَنَنْتُ اَنِّيْ اُنْفِذُ كَلِمَةً سَمِعْتُهَا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ تُجِيْزُوْا عَلَيَّ اِلَّا نَفَذْتُهَا

اور حضرت ابوذر نے فرمایا اگر تم تلوار رکھو اس پر ا اشارہ کیا اپنی گردن کی طرف اور پھر اس حالت میں بھی یہ سمجھوں کہ بس ایک بات جو میں نے حضور علیہ السلام سے سُنی ہے اس کو لوگوں تک پہنچا سکوں گا (گردن کٹنے سے پہلے) تو پھر، اس کو ضرور پہنچا دوں گا۔

۱۰- قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ حُلَمَاءَ فُقَهَاءَ حُكَمَاءَ

اور حضرت عبداللہ ابن عباس نے فرمایا۔ ربانیین میں سے ہو جاؤ۔ بردبار، فقیہ اور عالم

۱۱- وَيُقَالُ الرَّبَّانِيُّ الَّذِيْ يُرَبِّي النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ قَبْلَ كِبَارِهٖ (بخاری)

اور کہا گیاہے (عالم ربانی وہ ہے جو دین کے قواعد کلیہ سے قبل جزئیات مسائل لوگوں کو سمجھائے۔

عالم ربّانی - یہ نسبت ہے رب کی طرف۔ یعنی وہ شخص جو علم و عمل میں اللہ کے حکم کا خیال رکھے۔ ابن اعرابی نے کہا کہ عالم ربانی اس کو کہیں گے جو خود بھی عامل ہو —— حکماء۔ حکیم کی جمع ہے حکمت کے معنی صحیح قول و عمل کے ہیں۔ نیز حکمت اشیاء کی حقیقت کے جاننے کو بھی کہتے ہیں —— حلماء۔ حلیم کے معنی بُردبار کے ہیں یعنی بوقتِ غیظ و غضب جو شخص اپنے غصہ کو قابو میں رکھے۔

۲- حضرت ابوذر نے فرمایا۔ اگر میری گردن پر تلوار رکھ دی جائے اور اس حالت میں بھی حضور علیہ السلام کی کوئی حدیث بیان کرسکوں تو اس کو ضرور کردوں گا۔ جس سے یہ واضح ہوتاہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حدیث

نبوی کو دین سمجھتے تھے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کو ایک اہم فرض جانتے تھے۔

بَابُ مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

باب اس امر کے بیان میں کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

يَتَخَوَّلُهُمْ بِالْمَوْعِظَةِ وَالْعِلْمِ كَيْلَا يَنْفِرُوْا

وعظ و نصیحت میں لوگوں کی رعایت کرتے تھے تاکہ وہ اُکتا نہ جائیں

تبلیغ کا طریق کار یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امت پر رحیم و کریم تھے۔ وعظ و نصیحت میں یہ خیال رکھتے تھے کہ لوگ اکتا نہ جائیں اور سلسلہ وعظ اسی وقت تک جاری رکھتے تھے جب تک لوگ خوشی سے سن سکیں اور موقع و وقت دیکھ کر انہیں سمجھاتے تھے۔

۶۷۔ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ فِي الْاَيَّامِ كَرَاهَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا

حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ ہمارے نصیحت کرنے کے وقت ڈھونڈتے تھے دنوں میں۔ آپ اس کو بُرا سمجھتے تھے کہ ہم اُکتا جائیں۔

مطلب حدیث یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت میں تبلیغ فرماتے تھے جب کہ لوگ خوش و خرم ہوں اور اطمینان سے سن سکیں۔ آپ نے وعظ کے دن معیّن فرما دیے تھے تاکہ لوگ اکتا نہ جائیں اور وعظ و نصیحت میں لوگوں کے مزاج کا خیال فرمایا کرتے تھے۔

فائدہ۔ اس حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمہ نے دعوات میں بھی ذکر کیا ہے۔ امام مسلم نے توبہ میں ذکر کیا ہے اور امام ترمذی علیہ الرحمہ نے استیذان میں ذکر فرمایا ہے۔

۶۹۔ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا

حضرت انس سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں پر آسانی کرو۔ سختی نہ کرو اور بشارت دو نفرت نہ دلاؤ۔

اس حدیث میں تبلیغ کے اصول ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ عالم کو چاہیے کہ نرمی کے ساتھ لوگوں کو احکام اسلامی کی تبلیغ کرے۔ سخت کلامی سے کام نہ لے۔ عذابِ الٰہی سے اس قدر نہ ڈرائے کہ لوگ اللہ کی رحمت ہی سے مایوس ہو جائیں بلکہ تصویر کے دونوں رُخ ان کے سامنے رکھے۔ جب اللہ عزوجل کی قہاری کا ذکر کرے تو اس کی رحمت و مغفرت کا تذکرہ بھی کرے۔ ف۔ اس حدیث کو امام بخاری نے ادب میں۔ امام مسلم نے مغازی میں اور امام نسائی نے بھی ذکر کیا ہے۔

بَابُ مَنْ جَعَلَ لِاَهْلِ الْعِلْمِ اَيَّامًا مَّعْلُوْمَةً

باب اس امر کے بیان میں کہ طالبینِ علم کی تعلیم کے لیے دن مقرر کیا جائے

عَنْ وَائِلٍ قَالَ كَانَ عَبْدُ اللّٰهِ يُذَكِّرُ النَّاسَ فِي كُلِّ خَمِيْسٍ۔ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ يَا اَبَا

حضرت ابو وائل (شفیق بن سلمہ) سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود ہر جمعرات کو وعظ کہا کرتے۔ ایک آدمی نے

عَبْدِ الرَّحْمٰنِ لَوَدِدْتُ اَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا كُلَّ يَوْمٍ قَالَ اَمَا اِنَّهٗ يَمْنَعُنِيْ مِنْ ذٰلِكَ اَنِّيْ اَكْرَهُ اَنْ اُمِلَّكُمْ وَاِنِّيْ اَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّاٰمَةِ عَلَيْنَا۔

کہا اے عبدالرحمٰن ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں ہر روز وعظ کریں۔ عبداللہ بن مسعود نے جواب دیا (روزانہ وعظ کہنے سے) جو بات مجھے روکتی ہے وہ یہ ہے کہ میں تم کو تنگی میں ڈالنا پسند نہیں کرتا اور میں تمہاری فرصت اور خوشی کا وقت ڈھونڈتا ہوں جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو وعظ سنانے کے لیے ہماری فرصت اور خوشی کا وقت تلاش فرماتے تھے تاکہ ہم اکتا نہ جائیں۔

جائز کام کے لیے دن مقرر کرنے کا ثبوت

اس حدیث میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وعظ ونصیحت کے لیے لوگوں کے فرصت کا وقت مقرر کیا جائے تاکہ وہ اطمینان سے سن سکیں نیز دن مقرر کرکے وعظ کرنے کا اس سے جواز بھی ثابت ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجالسِ خیر کے لیے وقت و دن مقرر کرنے میں عوام کو آسانی رہتی ہے۔ جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں دن وعظ ہے تو وہ فرصت کا وقت نکال کر اس میں شامل ہوتے ہیں۔ بعض لوگ دن کے تقرر سے بہت چڑتے ہیں اور محفلِ میلاد و اعراسِ بزرگان دین کو اس لیے بھی بدعت کہتے ہیں کہ یہ دن مقرر کرکے کیے جاتے ہیں حالانکہ اگر ضد وتعصب سے علیحدہ ہوکر غور کیا جائے تو اس حدیث سے ہی یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی جائز کام کو دن مقرر کرکے کرنا جائز بلکہ مستحسن ہے۔

بَابٌ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ

باب جس کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین کی سمجھ دیتا ہے

۷۰۔ مُعَاوِيَةَ خَطِيْبًا يَقُوْلُ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَاِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ وَلَنْ تَزَالَ هٰذِهِ الْاُمَّةُ قَائِمَةً عَلٰى اَمْرِ اللّٰهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ

(بخاری)

حضرت معاویہ نے اپنے خطبہ میں کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے اور میں قاسم ہوں اور اللہ عطا فرمانے والا ہے اور میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے دین پر قائم رہے گی جو ان کا خلاف کرے گا وہ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ حتیٰ کہ اللہ کا امر آجائے۔

امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حدیث ہذا کے راویوں میں امیر معاویہ قابلِ ذکر ہیں۔ جلیل القدر صحابی ہیں۔ معاویہ بن ابی سفیان صخر بن حرب الاموی عام الفتح میں ایمان لائے کاتب الوحی تھے۔ رجب ۶۰ھ میں ۸۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان سے کل ۱۳۶ حدیثیں مروی ہیں۔ امام بخاری نے صرف آٹھ حدیثیں اور مسلم نے صرف پانچ حدیثیں ان سے روایت کیں اور ۴ پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا۔ صحابہ میں معاذ

ان صحرصرف یہی ہیں۔

فقہ کی تعریف لغت میں فقہ کے معنی فہم کے ہیں اور عرف میں فقہ احکام شرعیہ فرعیہ کے اس علم کا نام ہے جو احکامِ مذکورہ کے دلائل تفصیلیہ سے حاصل کیا جاتا ہے ۲۔ احکامِ شرعیہ کی قید سے احکامِ عقلیہ وحرفیہ ونحویہ وغیرہ کو تعریف سے خارج کرنا مقصود ہے ۳۔ احکامِ شرعیہ دو قسم پر ہیں۔ اصلیہ وفرعیہ —— وہ احکام شرعیہ جن کا تعلق اعتقاد سے ہے۔ انہیں اصطلاحِ شرعیہ میں اصلیہ کہتے ہیں —— اور جن کا تعلق عمل سے ہے وہ احکامِ شرعیہ فرعیہ کہلاتے ہیں۔

۴۔ علمِ احکام شرعیہ اصلیہ کو "علمِ کلام" کہتے ہیں اور علمِ احکامِ شرعیہ فرعیہ کو فقہ کہتے ہیں ۵۔ احکام خواہ اصلیہ ہوں یا فرعیہ ان کا استخراج واستنباط کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماع وقیاس (ادلہ اربعہ) پر موقوف ہے۔ حدیث ہذا میں یہ بتایا گیا ہے کہ دین کی فہم وبصیرت یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اس کو دی جاتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا فضلِ عظیم ہو۔ اس سے علماءِ مجتہدین کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ وہ دین کی اعلیٰ فہم رکھتے ہیں۔

۶۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے متعلق فرمایا کہ دینے والا خدا ہے اور تقسیم کرنے والا میں ہوں یعنی اللہ کی تمام نعمتوں کی تقسیم میرے سپرد ہے۔ میرے واسطہ اور وسیلہ کے بغیر کسی کو کچھ نہیں مل سکتا۔

۷۔ ولن تزال سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ اُمت آخری اُمت ہے اور اسی پر قیامت قائم ہوگی اور اس اُمت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور کسی مخالف کی مخالفت ان کو حق سے ہٹا نہ سکے گی یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائیگا۔

واضح ہو کہ حدیث ہذا میں حتی یاتی امر اللہ سے مراد وہ ہوا ہے جو قرب قیامت میں چلے گی اور جس کی وجہ سے ہر مسلمان کی وفات واقع ہوگی اور پھر صرف کفار ومشرکین زندہ رہ جائیں گے۔ جن پر قیامت آئے گی کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب تک دنیا میں ایک بھی اللہ کہنے والا موجود رہے گا قیامت نہیں آئے گی۔ دوسری حدیث میں فرمایا۔ قیامت شرار الخلق پر قائم ہوگی۔ لہٰذا امر اللہ سے وہ ہوا مراد لی جانی چاہیے جو قرب قیامت میں چلے گی اس حدیث سے واضح ہوا کہ چاہے اسلام کتنا ہی ضعیف کیوں نہ ہو جائے مگر ہر زمانہ میں ایک جماعت ایسی ضرور موجود رہے گی جو حق پر قائم رہے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے افراد کثیر ہوں گے یا ان کو دنیاوی غلبہ (حکومت) بھی حاصل ہوگا بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ ہر زمانہ میں صحیح اسلام کو اپناتے ہوئے ایک جماعت ضرور موجود رہے گی۔ خواہ دنیاوی لحاظ سے مجبور ومقہور کیوں نہ ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی جماعت جو حق پر قائم رہے گی وہ کون ہے؟ ظاہر ہے یہ وہ جماعت ہے جو ما انا علیہ واصحابی کی مصداق ہوگی یعنی اہل سنت وجماعت۔

بَابُ الْفَهْمِ فِي الْعِلْمِ

باب علم کو سمجھنے کے لیے عقل وفراست کی ضرورت ہے

۱۷۔ اس عنوان کا مطلب یہ ہے کہ دین کو سمجھنے کے لیے عقل وفراست کی ضرورت ہے یعنی جو شخص عقل وفراست کا مالک ہے وہ قرآن وحدیث کی نصوص پر غور وفکر کرتا ہے۔ سیاق وسباق اور اس کے اشارات کو سمجھتا ہے اور پھر صحیح

بات تک پہنچ جاتا ہے۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیدیا ہے (کہ وہ دنیا میں رہے یا آخرت کا سفر کرے) سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رونے لگے اور لوگوں نے تعجب کیا کہ یہ روتے کیوں ہیں؟ لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خداداد فہم وفراست سے یہ جان لیا تھا کہ اس بندے سے مراد خود حضور اکرم علیہ السلام کی ذاتِ اقدس ہے اور اب حضور علیہ السلام سفر آخرت اختیار فرمانے والے ہیں اسی لیے صحابہ کہا کرتے تھے کہ صدیق اکبر ہم سب میں زیادہ علم رکھتے ہیں۔ امام نے اس عنوان کے تحت وہی حدیث لکھی ہے جس میں حضور علیہ السلام نے صحابہ سے سوال کیا تھا کہ ایک درخت ایسا ہے جو مسلمان کی طرح ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سمجھ گئے کہ وہ کھجور کا درخت ہے مگر بوجہ اپنی کمسنی کے ادباً واحتراماً خاموش رہے۔ اس سے حضرت عبداللہ بن عمر کے فہم وذکار کا حال معلوم ہوا۔ یہ حدیث مع تفہیم کے گزشتہ اوراق میں گزر چکی ہے۔ اس لیے ہم نے یہاں نہیں لکھی۔ ملاحظہ ہو حدیث نمبر ۶۰، ۶۷

بَابُ الْاِغْتِبَاطِ فِی الْعِلْمِ وَالْحِکْمَةِ

باب علم وحکمت میں رشک کرنے کے بیان میں

کسی میں کمال کو دیکھ کر رشک کرنا اور یہ تمنا کرنا کہ اے اللہ! یہ کمال مجھے عطا فرما جائز ہے۔ غبطہ اسی کو کہتے ہیں اور حسد کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے فضل وشرف کو دیکھ کر جل جانا اور اس کے زوال کو چاہنا یہ ناجائز وحرام ہے۔ اس باب میں امام بخاری علیہ الرحمہ نے یہ بتایا ہے کہ اگر رشک کے قابل کوئی چیز ہے تو وہ علم وحکمت ہی ہے کیونکہ علم دین تمام دینی واُخروی برکات وحسنات کا ذریعہ اور فلاحِ دارین کا وسیلہ ہے۔

وَقَالَ عُمَرُ تَفَقَّهُوْا قَبْلَ اَنْ تُسَوَّدُوْا (بخاری)

حضرت فاروق اعظم نے فرمایا۔ حاکم (سردار) بننے سے پہلے دین کا علم حاصل کرو۔

مطلب یہ ہے کہ حکومت وسرداری ملنے سے پہلے علم دین حاصل کرلو تاکہ نظامِ حکومت کو شریعت اسلامیہ کے مطابق چلا سکو۔ ایک معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ حاکم بننے کے بعد عام طور پر آدمی طالب علم کی صف میں بیٹھنے سے ہچکچاتا ہے اور اس طرح دین کی ضروری باتوں سے جاہل رہتا ہے۔ لہٰذا آدمی کو چاہیئے کہ سرداری پر فائز ہونے سے پہلے ہی یہ مرحلہ طے کرلے اور دین کی ضروری باتوں سے باخبر ہوجائے۔

قَالَ اَبُوْعَبْدِ اللّٰهِ بَعْدَ اَنْ تُسَوَّدُوْا وَقَدْ تَعَلَّمَ اَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ كِبَرِ سِنِّهِمْ (بخاری)

امام بخاری (ابو عبداللہ) نے کہا حاکم بن جانے کے بعد بھی علم دین حاصل کرو اور اصحاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑھاپے میں بھی علم دین حاصل کیا۔

مطلب یہ کہ دین کا علم حاصل کرنے میں شرم مت کرو کیونکہ دین کا علم حاصل کرنا کسی عمر یا کسی درجہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر عمر اور ہر درجہ کے آدمی کو علم دین حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ چنانچہ صحابہ کرام علیہ الرحمہ والرضوان بڑھاپے میں بھی علم دین حاصل کرتے تھے اور اس کی تبلیغ واشاعت میں سرگرم عمل رہتے تھے۔

۷۲۔ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا حَسَدَ اِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلٰى هَلَكَتِهٖ فِي الْحَقِّ وَرَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رشک جائز نہیں مگر دو باتوں میں۔ اول جس کو اللہ نے دولت دی اور وہ اس کو نیک کاموں میں خرچ کرتا ہے۔ دوم۔ جس کو اللہ نے حدیث کا علم دیا اور وہ اس کے موافق فیصلہ کرتا اور تعلیم دیتا ہے۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے کتاب الزکوٰۃ، احکام، اعتصام میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے زکوٰۃ میں۔ نسائی نے علم میں اور ابن ماجہ نے زہد میں لکھا ۲۔ لَا حَسَدَ۔ حسد سے مراد یہاں غبطہ ہے یعنی رشک کرنا۔ حضور سید عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو باتیں ایسی ہیں جن میں رشک کیا جا سکتا ہے۔ وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دی اور وہ اس کو مصارفِ خیر میں خرچ کرتا ہے۔ وہ شخص جس کو اللہ نے علمِ دین کی دولت عطا فرمائی اور وہ اس کے مطابق فیصلے دے۔ یہ دو باتیں ایسی ہیں جو قابلِ رشک و تمنّا ہیں ۳۔ رشک اگر نیک باتوں پر کیا جائے تو یہ محمود ہے اسی کے متعلق فرمایا۔ فلیتنافس المتنافسون اور اگر رشک معصیت اور برائیوں پر کیا جائے تو یہ مذموم ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا۔ لاتنافسوا۔ یعنی کسی کو برائی کرتے دیکھ کر رشک مت کرو اور امرِ مباح میں رشک کرنا مباح ہے اور حسد حرام ہے۔ احادیث میں اس کی بہت مذمت وارد ہوئی ہے۔ حسد کے یہ معنیٰ ہیں کہ کسی شخص میں خوبی دیکھی اس کو اچھی حالت میں پایا تو اب دل میں یہ آرزو کی جائے کہ یہ نعمت اس سے جاتی رہے اور مجھے مل جائے۔

۲۔ حدیث زیرِ بحث میں حسد سے مراد غبطہ ہے۔ امام بخاری علیہ الرحمہ نے جو عنوان باندھا ہے اس سے بھی یہ پتہ چلتا ہے۔ البتہ بعض علماء نے حدیث زیرِ بحث کا یہ مطلب بھی لیا ہے کہ حدیث مذکورہ کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر حسد جائز ہوتا تو ان دو باتوں میں جائز ہوتا مگر ان میں بھی جائز نہیں جیسا کہ حدیث لا شوم الا فی الدار میں اسی قسم کی تاویل کی جاتی ہے۔

۳۔ یقضی۔ فتویٰ اور قضا میں فرق ہے۔ فتویٰ کا تعلق صرف مسئلہ سے ہوتا ہے۔ واقعہ سے اس کو کوئی سروکار نہیں ہوتا اور قضا کا، علم مسئلہ اور علم واقعہ دونوں سے ہوتا ہے۔ حکمۃ سے مراد یا تو قرآنِ حکیم ہے جیسا کہ حدیث ابوہریرہ میں وارد ہوا۔ رجل علمہ القرآن اور حکمت سے مراد حدیث نبوی بھی ہو سکتی ہے۔

بَابُ مَا ذُكِرَ فِيْ ذِهَابِ مُوْسٰى فِي الْبَحْرِ

باب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کی تلاش

اِلَى الْخَضِرِ وَقَوْلِهٖ تَعَالٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰى اَنْ تُعَلِّمَنِ

میں دریا کے کنارے جانا اور اللہ تعالیٰ کا سورہ کہف میں حضرت موسیٰ کا یہ قول نقل کرنا هَلْ اَتَّبِعُكَ الخ

گزشتہ باب میں اس امر کا بیان تھا کہ علم ایک عظیم نعمت ہے اور اس پر رشک کرنا جائز ہے۔ اب اس باب میں امام نے جو حدیث ذکر کی ہے اس سے وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ علمِ دین کے حصول کے لیے مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں اور دشوار گزار سفر کرنے ہوتے ہیں۔ نیز علم کے حصول میں شرم نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے حضرت

خضر علیہ السلام سے علم حاصل کرنے میں شرم نہیں فرمائی اور ان سے ملاقات کے لیے سفر کیا ۲۔ اس باب میں امام نے جو آیت لکھی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے۔ "کیا میں تمہیں ساتھ رہوں اس شرط پر کہ تم مجھے سکھا دو گے وہ نیک بات جو تمہیں تعلیم ہوئی" امام نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ آدمی کو علمِ دین کی طلب میں رہنا چاہیئے چاہے وہ خود کتنا ہی بڑا عالم ہو مگر پھر بھی علم کے مزید حصول کے لیے کوشاں رہے اور یہ کہ جس سے علمِ دین حاصل کرے اُس کے ساتھ ادب و تواضع سے پیش آئے۔

اس باب میں امام نے جو حدیث لکھی ہے اس کے ابتدائی جملوں کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس اور حضرت حر بن قیس کے درمیان اس امر میں اختلاف ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کس کے پاس گئے تھے۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام ہیں اور حُر بن قیس حضرت خضر کی بجائے کسی اور کا نام لیتے تھے تو حضرت ابی ابن کعب وہاں سے گزرے۔ حضرت ابن عباس نے ان کو اپنے اختلاف کا قصہ سنایا اور کہا کیا اس معاملہ میں تم نے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سُنا ہے تو حضرت ابی ابن کعب نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے۔

۷۳۔ يَقُوْلُ بَيْنَمَا مُوْسٰى فِيْ مَلَاٍ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اِذْ جَآءَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ هَلْ تَعْلَمُ اَحَدًا اَعْلَمَ مِنْكَ قَالَ مُوْسٰى لَا فَاَوْحَى اللّٰهُ اِلٰى مُوْسٰى بَلٰى عَبْدُنَا خَضِرٌ فَسَاَلَ مُوْسَى السَّبِيْلَ اِلَيْهِ فَجَعَلَ اللّٰهُ لَهُ الْحُوْتَ اٰيَةً وَّقِيْلَ لَهٗ اِذَا فَقَدْتَّ الْحُوْتَ فَارْجِعْ فَاِنَّكَ سَتَلْقَاهُ فَكَانَ يَتَّبِعُ اَثَرَ الْحُوْتِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ لِمُوْسٰى فَتَاهُ اَرَاَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسَانِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا فَوَجَدَا خَضِرًا فَكَانَ مِنْ شَاْنِهِمَا مَا قَصَّ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ كِتَابِهٖ

ایک دن موسیٰ جماعت بنی اسرائیل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک شخص آیا کہا۔ آپ ایسے شخص کو جانتے ہیں جو آپ سے زیادہ علم رکھتا ہو۔ حضرت موسیٰ نے کہا نہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی کی۔ ہمارا ایک بندہ ہے خضر جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے ان سے ملاقات کا راستہ پوچھا تو اللہ نے ایک مچھلی ان کے لیے نشان مقرر کر دی اور فرمایا جب یہ مچھلی گم ہو جائے تو لوٹ جانا خضر سے ملاقات ہو جائے گی تو حضرت موسیٰ مچھلی کے نشان پر سمندر کے کنارے چلے۔ ان کے خادم (یوشع) نے کہا جب ہم صخرہ کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کا (قصہ) بیان کرنا بھول گیا اور شیطان ہی نے مجھے بھلایا کہ میں آپ سے اس کا ذکر کرتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ ہم تو اسی جگہ کی تلاش میں تھے۔ پس دونوں اپنے نشاناتِ قدم پر واپس ہوئے اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہو گئی اور وہ معاملہ پیش آیا جس کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں بیان فرمایا ہے۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے بخاری شریف میں دس جگہ ذکر کیا ہے۔ مسلم و ترمذی نے علی الترتیب احادیث الانبیاء و تفسیر میں ذکر کیا ۲۔ من بنی اسرائیل سے مراد اولادِ یعقوب علیہ السلام ہے۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام ہے۔ آپ کے بارہ فرزند تھے جن کے نام یہ ہیں ۱۔ یوسف ۲۔ بنیامین

۳۔ دانی ۴۔ نقیالی ۵۔ زابلون ۶۔ وجاد ۷۔ یستاخر ۸۔ اشیر ۹۔ روبیل ۱۰۔ یہودا ۱۱۔ شمعون ۱۲۔ لاوی ان بارہ کو اسباط کہتے ہیں۔ اسباط عربی میں اس درخت کو کہتے ہیں جو کثیر ٹہنیاں رکھتا ہو کیونکہ یہ بارہ ہر قبیلہ کے والد ہیں اس لیے ان کو اسباط کہتے ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ قصہ خضر علیہ السلام میں موسیٰ سے مراد موسیٰ بن عمران ہیں موسیٰ بن عشا نہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام سے متعلق ضروری معلومات

۳۔ خضر بفتح خا و کسر ضاد معجمہ یہ لقب ہے۔ آپ کا نام بلیا یا ابلیا یا ارمیا یا السمیع ہے۔ بعض نے کہا آپ کا نام خضرون ہے اور کنیت ابوالعباس ہے۔ آپ نبی ہیں صاحب وحی ہیں۔ قرآن پاک میں آپ کے متعلق فرمایا۔ اتینه رحمة رحمت سے مراد نبوت ہے مافعلته امری کے لفظ بھی یہ بتاتے ہیں کہ آپ نبی ہیں ۴۔ حضرت خضر علیہ السلام کو علم باطن حاصل تھا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔ ایک علم مجھے اللہ تعالیٰ نے ایسا عطا فرمایا ہے جو آپ نہیں جانتے اور ایک علم آپ کو ایسا عطا فرمایا ہے جو میں نہیں جانتا۔ مفسرین و محدثین فرماتے ہیں۔ جو علم حضرت خضر علیہ السلام کے اپنے خاص فرمایا وہ علم باطن و مکاشفہ ہے اور اہل کمال کے لیے یہ باعث فضل ہے کیونکہ علم باطن کی وجہ سے جو افعال صادر ہوں گے وہ حکمت سے ہوں گے اگرچہ بظاہر خلاف معلوم ہوں ۵۔ اکثر علماء، مشائخ و صوفیاء و اہل عرفان اس پر متفق ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں اور یہ ممکن ہے کہ اللہ عزوجل اپنے کسی بندے کو طویل عمر عطا فرمائے ——— حضرت امام بخاری، ابن مبارک، ابن الجوزی، ابن المنادی اور علماء کا ایک طائفہ حیات خضر علیہ السلام کا قائل نہیں ہے اور حیات خضر کا مسئلہ ضروریات دین سے بھی نہیں ہے ۶۔ قرآن حکیم میں یہ واقعہ سورہ کہف میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ۷۔ بعض جاہل صوفی کہا کرتے ہیں کہ "حضرت موسیٰ کو حضرت خضر علیہم السلام سے علم حاصل کرنے کا حکم ہوا حالانکہ وہ ولی ہیں۔ میاں! ولی کا مرتبہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ جو علم ولی کے پاس ہوتا ہے وہ نبی کے پاس بھی نہیں ہوتا" (معاذ اللہ) ——— ایسا کہنا کفر جلی ہے۔ ولی تو نبی پر ایمان لانے اور اس کے نقش قدم پر چلنے سے مرتبہ ولایت کو پاتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ولی نبی سے بڑھ جائے۔ اس کے علاوہ حق یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام بھی نبی تھے۔ چنانچہ علامہ بدرالدین عینی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے۔

والصحيح انه نبي وجزم به جماعة (عینی جلد ۱ ص ۴۴۷)	صحیح یہ ہے کہ حضرت خضر نبی ہیں اور علماء کی ایک جماعت نے اس پر جزم کیا ہے۔

۸۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سائل کے جواب میں فرمایا۔ لا یعنی مجھ سے زیادہ علم کسی کو نہیں ہے۔ آپ کا یہ جواب بالکل حق و صواب تھا کیونکہ نبی اپنی امت کے تمام افراد سے قطعاً و حتماً افضل و اعلم ہوتا ہے لیکن آپ کے ان لفظوں پر اللہ تعالیٰ نے مواخذہ فرمایا یعنی آپ کی شان اعلیٰ و ارفع کے زیادہ مناسب یہ تھا کہ آپ اللہ اعلم سے جواب دیتے۔

۹۔ فَجَعَلَ اللّٰهُ الْحُوْتَ .... الخ مچھلی کو نشانی اس طرح بنایا گیا کہ آپ کو ہدایت کی گئی کہ ایک مچھلی اپنے تھیلے

ہیں رکھ لیجیے۔ جس جگہ وہ گم ہو جائے وہی ملاقاتِ خضر علیہ السلام کا مقام ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ فتاہ سے مراد حضرت یوشع بن نون ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خدمت گار رہتے اور آپ سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔

مسائل حدیث کسی مسئلہ میں طلبِ حق کے لیے بحث کرنا جائز ہے جیسے حضرت ابن عباس اور حر ابن قیس میں بحث ہوئی ۲۔ بوقتِ اختلاف اہلِ علم کی طرف رجوع کرنا چاہیے ۳۔ اہلِ علم کو مزید علم و معرفت حاصل کرنی چاہیے ۴۔ سفر کی حالت میں ناشتہ وغیرہ ساتھ لے جانا جائز ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب سفر فرمایا تو ناشتہ وغیرہ ساتھ لے لیا تھا ۵۔ استاد کو شاگرد سے خدمت لینا جائز ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت یوشع بن نون سے خدمت لیتے تھے۔ (واللہ اعلم)

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

باب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بیان میں کہ

اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ

اے اللہ ان کو کتاب کا علم عطا فرما۔

۴۷۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ ضَمَّنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ (بخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے گلے سے لگا لیا اور فرمایا۔ الٰہی اس کو کتاب (قرآن) کی سمجھ عطا فرما۔

فوائد و مسائل امام بخاری علیہ الرحمہ نے اس حدیث کو فضائلِ صحابہ میں اور طہارت میں بھی ذکر کیا ہے۔ امام مسلم نے فضائلِ ابن عباس میں، ترمذی نے مناقب میں اور امام نسائی اور ابن ماجہ نے سُنت میں ذکر کیا ہے۔ ۲۔ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے کیونکہ جنسِ مطلق کامل پر محمول ہوتی ہے۔ یا الکتاب پر "الف لام" عہدی ہے۔ ویسے عرف شرع میں کتاب سے مراد قرآن ہی لیا جاتا ہے ۳۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے یہ دعائیہ جملے مختلف لفظوں سے مروی ہیں علمه الحكمه ابن ماجہ علمه الحكمه و تاويل الكتاب ترمذی اللهم فقهه بخاری۔ کتاب سے مراد قرآنِ حکیم ہے اور حکمت سے مراد سنتِ نبوی ہے۔ چنانچہ امام احمد نے روایت کیا ہے کہ قرآن حکیم میں اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولوں کی تشریح و توضیح ہے۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر دعا مقبول ہے۔ علامہ کرمانی کہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے حضرت ابن عباس کے لیے جو دعا فرمائی اس کی قبولیت میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ حضرت ابن عباس سید المفسرین ہیں۔ حبر الامّہ، بحر العلم اور ترجمان القرآن ہیں۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلا تشریف لے گئے تو حضرت ابن عباس نے ایک لوٹا پانی کا آپ کے لیے رکھ دیا۔ حضور علیہ ا۔ م نے فرمایا۔ کس نے رکھا۔ لوگوں نے عرض کی ابن عباس نے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے ان کو گلے سے لگایا اور مذکورہ بالا دعا دی ۴۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معانقہ کرنا جائز ہے۔

علامہ عینی نے لکھا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ اور امام ابو منصور ماتریدی اس جواز کے قائل ہیں اور وہ معانقہ مکروہ ہے جو علی وجہ الشہوۃ ہو (عینی جلد اوّل ص۳۵۶)

بَابُ مَتٰی یَصِحُّ سَمَاعُ الصَّغِیْرِ

باب اس امر کے بیان میں کہ بچہ کا حدیث سننا کب معتبر ہے

اس باب میں امام بخاری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حدیث کے تحمل (سُننے وغیرہ) میں بالغ ہونا شرط نہیں ہے بلکہ جب بچہ اس قابل ہو جائے کہ بات سمجھ لے تو اس کی کہی ہوئی حدیث معتبر ہوگی۔ یحییٰ بن معین کا مسلک یہ ہے کہ تحملِ حدیث کے لیے کم از کم پندرہ برس کی عمر ہونا ضروری ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے غزوۂ احد میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو شریک نہیں کیا۔ اسی طرح غزوۂ بدر میں حضرت براء وغیرہ کو نہیں لیا کیونکہ ان کی عمریں پندرہ برس سے کم تھیں۔ امام احمد بن حنبل نے جواب دیا کہ غزوۂ احد میں پندرہ برس سے کم عمر بچوں کو واپس کرنا تو اس امر پر مبنی تھا کہ یہ حضرات لڑائی کی قوت اور تجربہ نہیں رکھتے تھے اور حدیث کے تحمل کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ متعدد حدیثیں ایسی ہیں جو بحالتِ بچپن صحابہ نے سُنیں اور بالغ ہو کر ان کو بیان کیا اور وہ روایتیں مقبول ہوئیں۔ امام اوزاعی نے فرمایا کہ نابالغ جب کہ بات سمجھنے اور اس کو یاد رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی سُنی ہوئی حدیث اس لیے بھی معتبر ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب بچہ سات برس کا ہو جائے تو اس کو نماز پڑھنے کا حکم دو۔ نیز تحمّل حدیث کے باب میں فہم وضبط اس لیے بھی کافی ہے کہ اگر آدمی ۵۰ برس کا بھی ہو اور فہم وضبط نہ رکھے تو اس کی حدیث نامقبول ہے۔

۷۵۔ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَقْبَلْتُ رَاكِبًا عَلٰى حِمَارٍ اَتَانٍ وَّ اَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ نَاهَزْتُ الْاِحْتِلَامَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ بِمِنًى اِلٰى غَيْرِ جِدَارٍ فَمَرَرْتُ بَيْنَ يَدَيْ بَعْضِ الصَّفِّ وَ اَرْسَلْتُ الْاَتَانَ تَرْتَعُ وَ دَخَلْتُ الصَّفَّ فَلَمْ يُنْكِرْ ذٰلِكَ عَلَيَّ اَحَدٌ

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ میں ایک گدھی پر سوار ہو کر آیا۔ میں بلوغ کے قریب تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں بغیر آڑ کے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں بعض صفوں کے سامنے سے گزرا اور گدھی کو چھوڑ دیا وہ چرنے لگی اور میں صف میں شریک ہو گیا تو میرے اس فعل پر کسی نے اعتراض نہ کیا۔

فوائد و مسائل امام نے اس حدیث کو کتاب الصلوٰۃ میں بھی ذکر کیا اور مسلم و ترمذی و ابن ماجہ نے بھی کتاب الصلوٰۃ میں ذکر کیا ۲۔ حمار اتان مادہ خر کو کہتے ہیں۔ ناھزتُ کے معنیٰ قاربت کے ہیں مطلب یہ کہ اس وقت میں بالغ ہونے کے قریب تھا۔ منیٰ، مکہ سے ۳ میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے جہاں مناسکِ حج ادا کیے جاتے ہیں اور قربانی ادا کی جاتی ہے ۳۔ اس حدیث کو ذکر کر کے امام نے یہ بتایا کہ تحملِ حدیث کے لیے بالغ ہونا شرط نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس اس وقت بالغ نہ تھے مگر بایں ہمہ ان کی بیان کی ہوئی حدیث تسلیم کی گئی۔ فقہائے نے فرمایا کہ سات برس کی عمر میں فہم وضبط کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ الی غیر جدار یعنی حضور علیہ السلام بغیر سُترہ کے نماز پڑھ رہے تھے۔ جس سے واضح ہوا کہ نمازی کے آگے سے اگر آدمی جانور یا کوئی چیز گزر جائے تو نماز فاسد نہیں ہوتی۔

حضرت ابن عباس صف کے آگے سے گزرے۔ ظاہر ہے کہ نمازی کے آگے سے گزرنا گناہ ہے مگر گزرنے کا مطلب یہ ہے کہ گزرنے والے کے اعضا نمازی کے محاذی بن جائیں۔ اور جب کہ ابن عباس سواری پر تھے تو ایسا نہ ہوا ہوگا یا یہ کہ صف میں شامل ہونے کے لیے آگے سے گزرنا ضروری ہوا ہوگا۔ اس کے بعد امام نے مزید ثبوت کے لیے تحمل حدیث کے لیے بلوغ شرط نہیں صرف فہم وضبط کافی ہے۔ یہ اثر ذکر کیا ہے۔

۷۶۔ عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ الرَّبِیْعِ قَالَ عَقَلْتُ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَجَّۃً مَجَّہَا فِیْ وَجْہِیْ وَاَنَا ابْنُ خَمْسِ سِنِیْنَ مِنْ دَلْوٍ　(بخاری)

محمود ابن ربیع بن سراقہ انصاری کہتے ہیں۔ مجھے اس امر کا شعور ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک ڈول سے پانی لے کر مجھ پر کُلی فرمائی۔ میں اس وقت پانچ سال کا تھا۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے طہارت میں بھی ذکر کیا۔ نسائی و ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سماعِ صغیر صحیح و معتبر ہے ۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم برکت پہنچانے کے لیے تحنیک فرمایا کرتے تھے۔ حضور علیہ السلام کا کُلی فرمانا برکت کے لیے تھا۔ جس سے اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ بزرگانِ دین کے پس خوردہ میں برکت ہوتی ہے اور تحنیک سنت ہے۔

بَابُ الْخُرُوْجِ فِیْ طَلَبِ الْعِلْمِ

باب علم کے طلب کرنے کے سفر کرنا

یعنی علمِ دین کے حصول کے لیے سفر کرنا خواہ برّی ہو یا بحری۔ مسلم میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص علمِ دین کے حاصل کرنے کے لیے سفر کرے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

وَرَحَلَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰہِ مَسِیْرَۃَ شَھْرٍ اِلٰی عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ اُنَیْسٍ فِیْ حَدِیْثٍ وَّاحِدٍ　(بخاری)

اور جابر بن عبداللہ نے حضرت انیس سے صرف ایک حدیث حاصل کرنے کے لیے ایک ماہ کی مسافت کا سفر کیا۔

۷۷۔ امام نے اس کے بعد ۷۳ حدیث ذکر کی ہے جس میں حضرت خضر و موسیٰ علیہما السلام کا واقعہ مذکور ہے جو مع تفہیم کے گزشتہ اوراق میں گزر چکی ہے ملاحظہ ہو۔ اسی لیے ہم نے یہاں درج نہیں کی۔ امام نے حدیثِ خضر کو ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ دیکھو سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے علم حاصل کرنے کے لیے ایک طویل سفر اختیار فرمایا۔

بَابُ فَضْلِ مَنْ عَلِمَ وَعَلَّمَ

باب علم حاصل کرنا اور دوسروں کو سکھانے کی فضیلت

فوائد و مسائل واضح ہو کہ احادیثِ نبویہ میں جب علم کا لفظ بلا کسی اضافت و تشریح کے آتا ہے تو اس سے مراد علمِ دین ہوتا ہے یعنی وہ دین جس کے اصول اور کچھ فروع قرآن پاک نے بتائے اور اس کے اصولوں کی تشریح و توضیح حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے فرمائی۔ جس کا نام دینِ اسلام

ہے جو انسان کو یہ بتاتا ہے کہ اس کی حیثیت کائنات میں کیا ہے۔ خالق کی طرف سے اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور اس دنیا میں اسے کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے اور اپنے عقائد و اعمال کی گاڑی کو کن لائنوں پر چلانا چاہیے۔

اسی طرح جب عالم کا لفظ احادیث میں بلا کسی تخصیص و تشریح کے آتا ہے تو اس سے مراد وہ افراد ہوتے ہیں جو علم دین سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ضروری حد تک اس پر عمل کرتے ہوں۔ ورنہ وہ لوگ جو دین کا علم تو رکھتے ہیں مگر خود عمل نہیں کرتے یا جنہوں نے دین کو صرف دنیا کمانے کا ذریعہ بنا رکھا ہے ان کے لیے تو احادیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔

دین کی تبلیغ کی اہمیت

پھر اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں علم دین حاصل کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور علم و علماء کے عظیم فضائل ارشاد فرمائے ہیں وہاں اس سے کہیں زیادہ دین کی تبلیغ و اشاعت پر زور دیا ہے اور مبلغین دین اسلام کی عظمت و رفعت کے خطبے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمائے ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا:-

۱- فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِیْ عَلٰی اَدْنَاکُمْ (ترمذی)

عالم دین کی برتری اور فضیلت عابد پر اتنی ہے جیسے میری برتری تم میں سے کسی ادنیٰ پر

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰئِکَتَہٗ وَ اَھْلَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ حَتَّی النَّمْلَۃَ فِیْ جُحْرِھَا وَ حَتَّی الْحُوْتَ لَیُصَلُّوْنَ عَلٰی مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَیْرَ (ترمذی) (عینی ج ۱)

اللہ عزوجل رحمت نازل فرماتا ہے اور اس کے فرشتے ساکنانِ زمین و آسمان یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں تک دعائے خیر کرتی ہیں اس شخص کے لیے جو دین کی تعلیم دیتا ہے۔

اس حدیث میں عالم سے مراد وہ شخصیت ہے جو اپنے علم کو چھپاتے نہیں بلکہ مخلوقِ خدا تک پہنچاتے ہیں اور عابد سے مراد وہ لوگ ہیں جو فرائض و واجبات کے علاوہ عباداتِ نافلہ میں اپنے لیل و نہار بسر کرتے ہیں اور منکرات و معاصی کے علاوہ شبہات تک سے بچتے ہیں لیکن اس کے باوجود فرمایا جاتا ہے کہ مبلغ اسلام کا درجہ اور رتبہ اس عابد سے بہر صورت زیادہ ہے تو اس فضلِ عظیم کی بنیاد و علت یہی ہے کہ عابد عبادت میں اپنے لیل و نہار کو صرف کر کے صرف اپنی ذات کے لیے سامانِ فلاح و نجات مہیا کرتا ہے مگر مبلغ اسلام اپنے علم کو پھیلا کر سینکڑوں کو راہِ ہدایت دکھاتا ہے۔ اس کے چراغ علم سے بے علموں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ دین کی تبلیغ و اشاعت کر کے معاشرہ میں پھیلی ہوئی تاریکی کو چھانٹتا ہے۔ غرضکہ اس حدیث میں یہ بتایا گیا جو اعمال انفرادی تزکیہ و فلاح کا ذریعہ ہوں وہ اپنی مقدار کے اعتبار سے کتنے ہی کثیر ہوں مگر ان سے بدرجہا بہتر وہ اعمال و افعال ہیں۔ جن سے اجتماعی و عمومی منافع حاصل ہوں۔ امام بخاری قدس سرہ العزیز نے فضل من عَلِمَ وعَلّمَ کا عنوان باندھ کر تبلیغ دین کی اہمیت اور اس کی افادیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

۷۸- عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰہُ

حضرت ابی موسیٰ اشعری سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جس ہدایت اور علم کو دے

بِهٖ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ اَصَابَ اَرْضًا فَكَانَ مِنْهَا نَقِيَّةٌ قَبِلَتِ الْمَاءَ فَاَنْبَتَتِ الْكَلَاَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيْرَ وَكَانَتْ مِنْهَا اَجَادِبُ اَمْسَكَتِ الْمَاءَ فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا وَاَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً اُخْرٰى اِنَّمَا هِيَ قِيْعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَّلَا تُنْبِتُ كَلَاً فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِي الدِّيْنِ وَنَفَعَهٗ بِمَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ وَمَثَلُ مَنْ لَّمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَاْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰهِ الَّذِيْ اُرْسِلْتُ بِهٖ

(بخاری)

کر مجھے مبعوث کیا۔ اس کی مثال زور کے مینہ کی سی ہے جو زمین پر برسا۔ اب زمین میں بعض زمین عمدہ تھی جس نے پانی چوس لیا۔ اس نے گھاس اور سبزی خوب اُگائی اور بعض سخت تھی (پتھریلی) اس نے پانی کو روک لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے لوگوں کو فائدہ دیا تو لوگوں نے اس سے پانی پیا اور پلایا اور کھیتی کی اور بعض ایسی زمین پر یہ مینہ برسا جو صاف چٹیل تھی نہ تو اس نے پانی روکا اور نہ اس نے گھاس اُگائی۔ پس یہی مثال ہے اس شخص کی جس نے دین میں سمجھ پیدا کی اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مجھے دے کر بھیجا ہے اس سے اس کو فائدہ ہوا۔ اس نے خود سیکھا دوسروں کو سکھایا اور اس شخص کی مثال ہے جس نے اس طرف سر اٹھایا ہی نہیں اور اس ہدایت کو قبول نہیں کیا۔ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے صرف ایک بار اسی باب میں ذکر کیا اور مسلم نے فضائل النبی میں اور نسائی نے علم میں ذکر کیا ہے۔ علم سے مراد یہاں ادلہ شرعیہ ہیں۔ غیث بارش کو کہتے ہیں۔ نقیہ کے معنیٰ صاف ستھری عمدہ۔ اجادب، جدب، جدب قحط کو کہتے ہیں۔ جس زمین پر بارش نہ ہو اس کو ارضِ جدبہ کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد ایسی سخت زمین ہے جو بارش کے پانی کو قبول نہ کرے (پتھریلی زمین) قیعان۔ قاع کی جمع۔ وہ زمین جو ایسی چکنی ہو کہ پانی اس پر ٹھہر نہ سکے بہہ جائے۔ قرآن پاک میں قاع کے لفظ کے ساتھ صفصف کا لفظ آیا ہے جس کے معنیٰ ہموار زمین کے ہیں۔

اس حدیث میں دینِ اسلام کو زوردار بارش سے تشبیہ دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ جیسے بارش سے مُردہ زمین زندہ ہوتی ہے اسی طرح دین سے مُردہ دل زندگی پاتے ہیں۔ پھر زمین کئی قسم کی ہوتی ہے۔ ایک زمین وہ جس پر بارش ہو تو وہ اس کے اثر کو قبول کرتی ہے، خود سرسبز و شاداب ہوتی ہے اور دوسروں کو اپنی سبزی و میوہ جات و اناج سے فائدہ پہنچاتی ہے یہ مثال ہے اس شخص کی جو دینِ اسلام کا علم حاصل کرتا ہے خود بھی اس پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو اس کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ دوسری قسم زمین کی وہ ہے جو اجادب ہے۔ سخت زمین کا یہ حال ہے کہ خود پانی کے اثر کو قبول کر کے سرسبز و شاداب نہیں ہوتی مگر اس کے جمع کئے ہوئے پانی سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے دین کا علم سیکھا۔ خود تو اس پر پورا پورا عمل نہیں کیا مگر دوسروں تک پہنچایا اور اس کی تعلیم دی۔ تیسری قسم وہ ہے جو قیعان ہے جس پر نہ پانی ٹھہرتا ہے اور نہ سبزہ وغیرہ اُگتا ہے۔ گویا اس پر نسیمِ سحری کے جھونکے آتے ہیں۔ پانی برستا ہے مگر بہہ جاتا ہے۔ اس زمین میں اتنی صلاحیت بھی نہیں ہوتی جو پانی کو روک کے رکھے تاکہ دوسرے ہی اس پانی سے

فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے دین کے سیکھنے اور سکھانے کی طرف توجہ ہی نہ دی اور آفتابِ ہدایت و مہتابِ نبوت سے فیض لینے کی کوشش ہی نہ کی۔

بَابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَظُهُوْرِ الْجَهْلِ

باب علم کے اٹھنے اور جہل کے پھیلنے کے بیان میں

یہاں علم سے مراد علم دین ہے کہ آخر زمانہ میں دینی علوم سے عام بے رغبتی ہو جائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جہل و جہالت کا دور دورہ ہو جائے گا۔

قَالَ رَبِيْعَةُ لَا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ شَيْءٌ مِّنَ الْعِلْمِ اَنْ يُّضَيِّعَ نَفْسَهٗ

حضرت ربیعہ نے فرمایا جس کے پاس تھوڑا سا بھی علم ہو تو اس کو ضائع نہ کرے۔

یعنی جس کے پاس قرآن پاک و حدیث شریف کا تھوڑا علم ہو تو وہ بھی اس کے تعلیم و تعلّم میں اپنے نفس کو مشغول رکھے اور بیکار نہ بیٹھا رہے۔ حضرت ربیعہ بن ابی عبدالرحمن مدنی تابعی حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کے استاد ہیں انہوں نے اپنے اس ارشاد میں علم دین کی تبلیغ و اشاعت پر زور دیا ہے۔

۷۹۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يُّرْفَعَ الْعِلْمُ وَيَثْبُتَ الْجَهْلُ وَ يُشْرَبَ الْخَمْرُ وَيَظْهَرَ الزِّنَا (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ علم اُٹھ جائیگا اور جہل اس کی جگہ پائیگا۔ لوگ شراب پئیں گے اور زنا عام ہو جائیگا۔

۸۰۔ يَقُوْلُ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يَّقِلَّ الْعِلْمُ وَيَظْهَرَ الْجَهْلُ وَيَظْهَرَ الزِّنَا وَتَكْثُرَ النِّسَآءُ وَيَقِلَّ الرِّجَالُ حَتّٰى يَكُوْنَ لِخَمْسِيْنَ اِمْرَاَةً الْقَيِّمُ الْوَاحِدُ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ علم کم ہو جائے گا۔ جہل اور زنا کی کثرت ہو جائے گی۔ عورتیں زیادہ اور مرد کم ہو جائیں گے حتّٰی کہ پچاس عورتوں کا نگہبان (قیم) ایک مرد ہوگا۔ (بخاری)

۱۔ حدیث ۷۹ کو امام مسلم نے قدر میں اور امام نسائی نے کتاب العلم میں ذکر کیا اور حدیث ۸۰ کو مسلم نے قدر میں ترمذی نے فتن میں۔ نسائی نے علم میں اور ابن ماجہ نے کتاب الفتن میں ذکر کیا ہے ۲۔ ان دونوں حدیثوں میں قربِ قیامت کی چند نشانیاں بیان فرمائی گئی ہیں ۳۔ علم کے اُٹھ جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ علماء کے سینہ سے علم سلب کر لیا جائیگا بلکہ اس کی وضاحت خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی کہ قربِ قیامت میں علمائے دین اٹھا لیے جائیں گے اور ان کے ساتھ علمِ دین بھی اُٹھ جائے گا اور پھر جب دین کے عالم نہ رہیں گے تو لوگ جاہلوں کو اپنا مفتی بنالیں گے۔ ان سے سوال کریں گے اور وہ بغیر علم کے جواب دیں گے تو وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ جہالت کا دور دورہ ہوگا۔ شراب عقل میں فتور ڈالے گی۔ زنا نسب میں خلل انداز ہوگا۔ فتنوں کی کثرت مال و

نفس میں فساد پیدا کرے گی۔ عورتیں مردوں سے زیادہ ہوجائیں گی۔ بعض روایات میں یکثر العلم کے لفظ بھی آئے ہیں یعنی قربِ قیامت میں علم و علماء کی کثرت ہوجائے گی۔ اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ علماء کی تو کثرت ہوگی مگر تبلیغ کا دائرہ اتنا وسیع ہوجائیگا اور دین میں اسقدر زیادہ فتنے پیدا ہوجائیں گے کہ مبلغین اسلام کی کثیر جماعت اس پر قابو نہ پاسکے گی۔ چنانچہ فی زمانہ یہی حالت ہے یا اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ علماء کی تو کثرت ہوگی۔ علم کا چرچا بھی ہوگا۔ دینی درسگاہوں کی بہتات ہوگی۔ مگر علماء میں خلوص وللہیت کی کمی آجائے گی اور اس طرح گمراہی و بے دینی کے سیلاب آتے چلے جائیں گے۔ واللہ اعلم

بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

باب فضلِ علم کے بیان میں

یہاں فضل بمعنیٰ فضیلت بھی ہوسکتا ہے اور مناسبت یہ ہوگی کہ گزشتہ باب میں عالم کی فضیلت کا بیان تھا اور اب علم کی فضیلت کا بیان ہے کہ علمِ دین انبیاء کرام علیہم السلام کی میراث ہے یا فضل بمعنیٰ ما بقیٰ کے ہیں جیسے کہتے ہیں فضل الوضوء وضو کا بچا ہوا پانی۔ جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ علم، تعلیم و تعلّم سے کم نہیں ہوتا۔ جیسے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بچا ہوا دُودھ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیا مگر حضور علیہ السلام کے علم میں کمی نہ ہوئی۔ یعنی دیگر اشیاء کا یہ حال ہے کہ اس میں سے اگر کسی کو کچھ دے دیا جائے تو وہ کم ہوجاتی ہیں۔ مگر علم ایسی دولت ہے کہ جسے نہ آگ جلاسکتی ہے اور نہ چور چُرا سکتا ہے اور نہ خرچ کرنے سے اس میں کمی آتی ہے۔

۸۱ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَيْنَمَا اَنَا نَائِمٌ اُتِيْتُ بِقَدَحِ لَبَنٍ فَشَرِبْتُ حَتّٰى اِنِّىْ لَاَرَى الرِّيَّ يَخْرُجُ فِىْ اَظْفَارِىْ ثُمَّ اَعْطَيْتُ فَضْلِىْ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ قَالُوْا فَمَا اَوَّلْتَهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الْعِلْمُ (بخاری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا۔ میں سو رہا تھا کہ میرے سامنے دودھ کا ایک پیالہ لایا گیا۔ میں نے پیا تو میں نے دیکھا کہ تازگی میرے ناخنوں سے بہہ رہی ہے۔ پھر میں نے اپنا بچا ہوا (دودھ) حضرت عمر کو دے دیا۔ صحابہ نے عرض کی اس کی تعبیر کیا ہوئی۔ فرمایا۔ علم (دودھ سے علم مراد ہے)

فوائد و مسائل امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب التعبیر میں بھی ذکر کیا ہے۔ امام مسلم نے فضائل میں اور ترمذی نے رؤیا میں اور امام نسائی نے مناقبِ عمر میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ دودھ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم مراد لیا۔ جس سے سیدنا فاروق اعظم کی فضیلت ثابت ہوئی کہ وہ علمِ نبوت کے وارث ہیں۔ ان کا علم وسیع ہے اور فضل [illegible] ہے ۳۔ علامہ عینی نے فرمایا چونکہ انبیاء علیہم السلام کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں اس لیے اس کو تخیّل نہیں بلکہ واقعہ [illegible] سمجھنا چاہیے ۴۔ علم کو دودھ سے اس لیے تشبیہ دی گئی کہ جیسے مُربّی بدن ہے اور اعلیٰ درجہ کا ٹانک ہے اسی طرح علم [illegible] ہے یا جیسے بچہ کی حیات دودھ سے ہوتی ہے۔ ایسے قلوب کی حیات کا مدار علمِ دین پر ہے ۵۔ اس

حدیث سے علم کی فضیلت نکلتی ہے کہ علمِ دین حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا فضلہ ہے۔

بَابُ الْفُتْيَا وَهُوَ وَاقِفٌ

عَلٰى ظَهْرِ الدَّآبَّةِ اَوْ غَيْرِهَا

باب اس امر کے بیان میں

جانور وغیرہ پر سوار ہو کر فتویٰ دینا جائز ہے

۸۲ - عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَفَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ بِمِنًى لِلنَّاسِ يَسْئَلُوْنَهُ فَجَآءَ رَجُلٌ فَقَالَ لَمْ اَشْعُرْ لَحَلَقْتُ قَبْلَ اَنْ اَذْبَحَ قَالَ اذْبَحْ وَلَا حَرَجَ فَجَاءَ اٰخَرُ فَقَالَ لَمْ اَشْعُرْ فَنَحَرْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ قَالَ ارْمِ وَلَا حَرَجَ قَالَ فَمَا سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلَا اُخِّرَ اِلَّا قَالَ افْعَلْ وَلَا حَرَجَ

(بخاری)

حضرت عبد اللہ بن عمرو ابن العاص سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں ٹھہرے لوگوں کے لیے ـــــ لوگ آپ سے سوال کرتے تھے۔ ایک شخص آیا۔ اس نے عرض کی میں بھول کر قربانی سے پہلے سر منڈا لیا ہے۔ آپ نے فرمایا قربانی کر کچھ حرج نہیں۔ ایک اور شخص آیا کہنے لگا مجھے خیال نہیں رہا۔ میں نے کنکریاں مارنے سے قبل قربانی کر لی۔ آپ نے فرمایا۔ کوئی حرج نہیں۔ حضرت عبد اللہ کہتے ہیں اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے امورِ حج کے متعلق پہلے یا پیچھے کرنے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے یہی جواب دیا کہ کچھ مضائقہ نہیں۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے کتاب العلم اور نذور میں بھی ذکر کیا اور مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی و ابن ماجہ نے کتاب الحج میں ذکر فرمایا ـــــ ۲۔ عنوانِ باب سے یہ حدیث مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سواری پر ہونا مذکور نہیں ہے لیکن امام کی عادت یہ ہے کہ ایک حدیث ذکر کرتے ہیں اور اس کے دوسرے طریق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی حدیث کو کتاب الحج میں امام نے روایت کیا ہے۔ وہاں صاف تصریح ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اونٹنی پر سوار تھے۔ عنوان میں اوغیرھا کا لفظ امام نے یہ بتانے کے لیے لکھا ہے کہ حدیث میں اونٹ پر سوار ہو کر سائل کو جواب دینے کی تخصیص نہیں ہے ـــــ بلکہ یہ بات عام ہے خواہ اونٹ پر سواری کی حالت میں جواب دیا جائے یا کسی اور چیز میں بیٹھ کر ہر طرح جائز ہے۔

حِجّۃ الوداع ح کے زبر اور زیر دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یہ حج حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی عمرِ مبارک کا آخری حج تھا اور اس موقع پر حضور علیہ السلام نے ایک لاکھ صحابہ کو قصویٰ نامی اونٹنی پر سوار ہو کر خطاب فرمایا تھا۔ اس زمانہ میں آواز پہنچانے کے لیے لاؤڈ سپیکر تو تھے نہیں مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ اعجاز تھا کہ پورے مجمع کو آواز برابر پہنچ رہی تھی۔ حتیٰ کہ دورانِ خطبہ حضور علیہ السلام نے کسی صحابی سے فرمایا۔ بیٹھ جاؤ ـــــ حضرت عبد اللہ بن رواحہ کہتے ہیں "بیٹھ جاؤ" ـــــ کی آواز میں نے اپنے گھر پر سنی اور وہیں حکمِ نبوی کی تعمیل میں تعظیماً بیٹھ گیا۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے اس مضمون کی متعدد حدیثیں خصائص کبریٰ میں ذکر کیں کہ خطبہ مبارکہ کی آواز پردہ نشین مستورات کو گھروں میں پہنچ رہی تھی ــــ منیٰ مکّہ سے ۵ ۲ میل کے فاصلہ پر ایک قریہ ہے جہاں حاجی قربانی کرتے ہیں اور جمعرات کو رمی کرتے ہیں ــــ ۴۔ حدیث ہذا سے ذیل کے مسائل معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ بوقت ضرورت عالم سے سوال کرنا جائز ہے۔ خواہ وہ سوار ہو یا مقیم ہو یا پیدل سفر کر رہا ہو ــــ ۲۔ عالم کو سواری کی حالت میں جواب دینا جائز ہے ــــ ۳۔ کسی اونچی چیز پر بیٹھ کر وعظ کرنا جائز ہے تاکہ لوگ خطیب کو دیکھ سکیں اور اچھی طرح متوجہ ہو کر سن سکیں ــــ ۴۔ اس حدیث سے امام شافعی و احمد، مجاہد، طاؤس اور عطا نے یہ استدلال کیا کہ اعمال حج میں ترتیب سُنّت ہے واجب نہیں تو اگر کسی نے ترتیب سے یہ مناسک ادا نہ کیے تو اس پر دم نہیں ہے وہ کہتے ہیں لَا حَرَجَ کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ ایسے شخص پر نہ ترتیب ہے نہ فدیہ اور نہ گناہ کیونکہ سائل کے جواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کوئی حرج نہیں۔ کفارہ وغیرہ کا حکم نہیں دیا تو اگر مناسک حج میں ترتیب واجب ہوتی ترک ترتیب پر کفارہ کا حکم دیا جاتا لاحرج نہ فرمایا جاتا ــــ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ و امام مالک علیہما الرحمۃ فرماتے ہیں کہ مناسک حج میں ترتیب واجب ہے اور لَا حَرَجَ کا مطلب یہ ہے کہ تونے چونکہ بھول کر ایسا کیا ہے اس لئے تجھ پر اس بھول کی وجہ گناہ نہیں ہے جیسا کہ دوسری حدیث میں نَسِیْتُ کا لفظ موجود ہے جس کو امام طحاوی نے باسناد صحیح روایت کیا ہے کہ گویا لاحرج سے کفارہ کی نفی نہیں ہوئی بلکہ گناہ کی نفی ہوتی ہے ــــ رہا کفارہ تو حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ جس نے حج کے امور سے کسی چیز کو پہلے یا بعد میں ادا کیا تو اس پر دم لازم ہے۔ یہ مسائل تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ العزیز کتاب الحج میں آجائیں گے۔

بَابُ مَنْ اَجَابَ الْفُتْيَا بِاِشَارَةِ الْيَدِ وَالرَّاسِ

باب اس امر کے بیان میں جو ہاتھ کے اشارہ یا سر کے اشارہ سے سوال کا جواب دے

۸۳۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ فِيْ حَجَّتِهٖ فَقَالَ ذَبَحْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ قَالَ فَاَوْمَا بِيَدِهٖ قَالَ وَلَا حَرَجَ وَقَالَ حَلَقْتُ قَبْلَ اَنْ اَذْبَحَ فَاَوْمَا بِيَدِهٖ وَلَا حَرَجَ (بخاری)

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے حج میں سوال کیا کہ میں نے رمی سے قبل ذبح کیا تو آپ نے ہاتھ سے اشارہ نہیں فرمایا کچھ حرج نہیں (دوسرے صاحب) نے سوال کیا میں ذبح سے پہلے سر منڈایا۔ آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا فرمایا۔ حرج نہیں۔

۸۴۔ عَنْ سَالِمٍ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُقْبَضُ الْعِلْمُ وَيَظْهَرُ الْجَهْلُ وَالْفِتَنُ وَيَكْثُرُ الْهَرْجُ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ علم اٹھا لیا جائے گا۔ جہل پھیل جائے گا اور فتنوں کی کثرت ہو جائے گی۔ پوچھا گیا۔ یا رسول اللہ! ہرج کیا ہے؟

وَمَا الْهَرَجُ فَقَالَ هٰكَذَا بِيَدِهِ فَحَرَّكَهَا كَاَنَّهٗ يُرِيْدُ الْقَتْلَ (بخاری)

تو آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا (اسی طرح ہاتھ خم کر کے) گویا اس سے آپ کی مراد قتل تھی۔

فوائد و مسائل ہرج کے معنیٰ فتنہ شے کی کثرت اختلاط کے آتے ہیں۔ ہراجہ جماعت کو کہتے ہیں اور بعض نے کہا لغتِ حبشہ میں ہرج کے معنیٰ قتل کے ہیں لیکن اصل لغتِ عرب میں ہرج فتنہ کے معنیٰ میں آتا ہے۔ ۲۔ ان دونوں حدیثوں سے واضح ہوا کہ سوال کا جواب اشارہ سے دینا بھی جائز ہے ۳۔ علامہ طحاوی نے لکھا ہے کہ نفی حرج مذہب حنفی کے مخالف نہیں کیونکہ لاحرج کے معنیٰ یہ ہیں کہ چونکہ تم نے بھول کر ایسا کیا ہے اس تم پر گناہ نہیں ہے لیکن یہ بات کہ اس فعل سے کفارہ نہیں آتا لاحرج کے جملہ سے اس کی نفی نہیں ہوتی (فافہم)

۸۵۔ عَنْ اَسْمَآءَ قَالَتْ اَتَيْتُ عَائِشَةَ وَهِيَ تُصَلِّيْ فَقُلْتُ مَا شَاْنُ النَّاسِ فَاَشَارَتْ اِلَى السَّمَآءِ فَاِذَا النَّاسُ قِيَامٌ فَقَالَتْ سُبْحَانَ اللّٰهِ قُلْتُ اٰيَةٌ فَاَشَارَتْ بِرَاْسِهَا اَيْ نَعَمْ فَقُمْتُ حَتّٰى عَلَانِي الْغَشْيُ فَجَعَلْتُ اَصُبُّ عَلٰى رَاْسِي الْمَآءَ فَحَمِدَ اللّٰهَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ مَا مِنْ شَيْءٍ لَّمْ اَكُنْ اُرِيْتُهٗ اِلَّا رَاَيْتُهٗ فِيْ مَقَامِيْ هٰذَا حَتَّى الْجَنَّةَ وَالنَّارَ فَاُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّكُمْ تُفْتَنُوْنَ فِيْ قُبُوْرِكُمْ مِثْلَ اَوْ قَرِيْبَ لَا اَدْرِيْ اَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ اَسْمَآءُ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ يُقَالُ مَا عِلْمُكَ بِهٰذَا الرَّجُلِ فَاَمَّا الْمُؤْمِنُ اَوِ الْمُوْقِنُ لَا اَدْرِيْ اَيَّهُمَا قَالَتْ اَسْمَآءُ فَيَقُوْلُ هُوَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ جَآءَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى فَاَجَبْنَاهُ وَاتَّبَعْنَاهُ مُحَمَّدٌ ثَلٰثًا فَيُقَالُ نَمْ صَالِحًا قَدْ عَلِمْنَا اِنْ كُنْتَ لَمُوْقِنًا بِهٖ وَاَمَّا الْمُنَافِقُ اَوِ الْمُرْتَابُ لَا اَدْرِيْ اَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ اَسْمَآءُ

حضرت اسماء کہتی ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آئی وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں نے کہا لوگوں کا کیا حال ہے (یعنی لوگ گھبرائے ہوئے کھڑے ہیں) حضرت عائشہ نے آسمان کی طرف اشارہ کیا (یعنی اشارہ سے بتایا کہ سورج گہن ہوا ہے) پس لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے کہا سبحان اللہ! میں نے کہا کوئی نشانی ہے؟ (یعنی کوئی قیامت یا عذاب کی نشانی ہے؟) حضرت عائشہ نے سر سے اشارہ کیا کہ ہاں! تو میں بھی نماز کے لیے کھڑی ہوئی یہاں تک کہ مجھ کو غش آنے لگا۔ میں اپنے سر پر پانی ڈالنے لگی۔ پھر نماز کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور پھر فرمایا ہر وہ شے جو مجھے نہیں دکھلائی گئی تھی میں نے اس کو اپنے اس مقام سے دیکھ لیا۔ مجھ پر وحی آئی ہے کہ تم قبروں میں آزمائے جاؤ گے مثل فتنہ مسیح دجال کے ـــــــ نہیں معلوم اسماء نے مثل کا لفظ کہا یا قریب کا۔ قبر میں میت سے پوچھا جائیگا کہ یہ جو شخص کریم ہیں۔ ان کی نسبت تیرا کیا اعتقاد ہے تو مومن یا موقن (نہیں جانتے کہ حضرت اسماء نے مومن کا لفظ کہا یا موقن کا) جواب دے گا وہ محمد ہیں وہ رسول اللہ ہیں۔ ہمارے پاس معجزات یا اور ہدایت لے کر آئے۔ ہم نے قبول کیا اور ان کا اتباع

فَيَقُولُ لَا أَدْرِي سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُولُونَ شَيْئًا فَقُلْتُهُ (بخاری)

کیا وہ محمد ہیں تین بار ایسا ہی کہے گا۔ پس قبر میں مومن سے کہا جائیگا کہ سو جا آرام سے۔ ہم پہلے ہی جانتے تھے کہ تو ان پر یقین رکھتا ہے لیکن منافق یا مرتاب۔ (نہیں معلوم اسمار نے مرتاب کا لفظ کہا یا منافق کا) (وہ فرشتوں کے سوال کے جواب میں کہے گا میں نہیں جانتا لوگوں کو جو کہتے سنا میں نے بھی وہی کہا۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام نے ابواب ذیل میں ذکر کیا ہے۔ طہارت، الاعتصام، خسوف، کسوف، جمعہ، کتاب السہو، خطبہ ۲۔ باب سے مناسبت یہی ہے کہ حضرت اسمار کے سوال پرسیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سر کے اشارہ سے جواب دیا ۳۔ علانی الغشی اہل طب کے نزدیک قوائے محرکہ حساسہ کا ضعف قلب کی وجہ سے معطل ہو جانے کو غشی کہتے ہیں۔ لغت میں تغشی کے معنے ڈھانپنے کے ہیں۔ حضرت اسمار رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مقصود یہ بتانا ہے گرمی میں لمبے قیام کی وجہ سے مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ تفتنون کے معنے امتحان لیے جانے کے ہیں۔ جوہری نے کہا الفتنة الامتحان۔ سونے کو جب پگھلا کر پرکھتے ہیں تو عرب فتنت الذہب بولتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم جیسے فتنۂ دجال کے ذریعے آزمائے جاؤگے اور تمہارے ایمان و استقامت علی الحق کا امتحان ہوگا۔ اسی طرح قبر میں بھی امتحان لیا جائے گا۔

دجال، فعال کے وزن پر دجل سے ہے۔ اس کے معنیٰ حق و باطل کے ملانے کے ہیں۔ اس کو مسیح اس لیے کہتے ہیں کہ دجال روئے زمین کا چالیس راتوں میں چکر لگائے گا۔ یا اس لیے کہ اس کی ایک آنکھ مٹی ہوئی ہوگی (عینی جلد ۱ ص ۴۸۶) دجال کا نکلنا اور دنیا میں فساد ڈالنا اور اس کے ذریعے مسلمانوں کا امتحان ہونا یہ سب حق ہے۔ احادیث میں حضور علیہ السلام نے دجال کے متعلق مندرجہ ذیل امور بیان فرمائے ہیں :۔

دجال کے متعلق حدیث کی تصریحات

۱۔ حضرت نواس ابن سمعان کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور علیہ السلام نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا اگر وہ میری موجودگی میں نکل آئے تو میں اس کا مقابل تمہاری طرف سے ہوں گا۔ مگر میری عدم موجودگی میں اس کا ظہور ہوا تو اس وقت ہر شخص اپنے نفس کی طرف سے اس کا مقابلہ کرے۔ خدا تعالیٰ ہر مسلمان کا مددگار ہے۔

دیکھو! دجال جوان ہوگا۔ اس کے بال گھنگھریالے ہوں گے۔ اس کی آنکھ میں ناخونہ ہوگا۔ میں اس کو عبدالعزیٰ ابن قطن کے ساتھ تشبیہ دیتا ہوں ـــــــ ایک دوسری روایت میں ہے۔ اس کا خروج شام اور عراق کے (درمیانی) ایک راستہ میں ہوگا۔ پس دائیں بائیں فساد کرتا پھرے گا۔ اللہ کے بندو! تم ثابت قدم رہنا۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ زمین میں کب رہے گا۔ فرمایا چالیس روز تک رہے گا۔ (جس میں) ایک سال کا ایک روز ہوگا۔ ایک ماہ کا ایک روز ہوگا۔ ایک ہفتہ کا ایک روز ہوگا۔ باقی ایام اپنے معمولی طریقہ پر ہوں گے۔ ہم نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! جو دن ایک سال کے برابر ہوگا۔ اس دن ہماری ایک روز کی نماز کافی ہوگی۔ نہیں اس میں اندازہ کرکے پڑھنا۔ ہم نے عرض کی اس کا

زمین میں چلنا پھرنا کس صورت پر ہوگا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ چلنا پھرنا اس کا بارش کی طرح ہوگا۔ جس کو ہوا اڑا کر لاتی ہے۔ وہ ایک قوم کے پاس آکر اپنی عبادت کی طرف بلائے گا۔ یہ لوگ اس کے قول پر ایمان لائیں گے۔ وہ آسمان سے کہے گا تو وہ پانی برسائے گا۔ زمین اس کے حکم سے سبزہ اگائے گی۔ اس وقت ان کے مویشی خوب موٹے تازے کوکھیں بھرے ہوئے موٹے تھنوں والے ہو کر آئیں گے۔ پھر وہ ایک دوسری قوم کے پاس آئیگا لیکن وہ اس کی بات اس کے منہ پر مار دیں گے۔ وہ وہاں سے واپس چلا آئیگا۔ لیکن یہ لوگ صبح ہوتے ہی مفلسی کی حالت میں ہو جائیں گے دجال ایک ویرانہ میں آکر کہے گا۔ اپنے خزانے نکال زمین اپنے خزانے نکال دے گی۔ یہ خزانے اس کے پیچھے شہد کی مکھیوں کی طرح چلیں گے۔ پھر وہ ایسے شخص کو بلائے گا جو جوانی میں بھرا ہوا ہوگا۔ اس کو تلوار سے مار کر دو ٹکڑے کر دیگا پھر اس کو جلائیگا۔ وہ شخص ہنستا ہوا اس کے پاس آئیگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بہت رونق ہوگی۔

الغرض یہ افعال کرتا پھرے گا کہ اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم کو روانہ فرمائے گا۔ وہ دمشق کے مشرقی جانب کے سپید میناروں پر دو زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے دو فرشتوں کے شانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے نازل ہوں گے۔ جس وقت سر جھکائیں گے تو پسینہ کے مانند ان کے سر سے پانی ٹپکے گا اور وہ جب سر اٹھائیں گے تو موتی اور چاندی کے دانوں کی طرح وہ قطرے گریں گے۔ جس کافر کو اس کی ان کی سانس پہنچے گی وہ کافر مر جائے گا۔ ان کی سانس انتہائے نظر تک جائے گی۔ وہ آکر دجال کو تلاش کرتے کرتے باب لُد کے قریب گھیر لیں گے اور اس کو قتل کر دیں گے پھر عیسیٰ علیہ السلام کے پاس ایسی قوم آئے گی جس کو اللہ تعالیٰ نے دجال کے فتنوں سے محفوظ رکھا تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام اس قوم کے چہروں پر ہاتھ پھیر پھیر کر ان کے سامنے درجاتِ جنت بیان فرمائیں گے۔ وہ اب ایسی حالت میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحی ہوگی کہ میں اپنے ایسے بندوں کو نکالتا ہوں۔ جن سے لڑائی کی کسی میں طاقت نہیں۔ لہٰذا تم میرے ان بندوں کو لے کر کوہِ طور پر محفوظ ہو جاؤ۔ حضرت عیسیٰ ہمراہوں کو لے کر کوہِ طور پر محفوظ ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کو باہر نکالے گا وہ ہر مقام پر دوڑ پڑیں گے۔

۲۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ دجال کے ہمراہ اصفہان کے ستر ہزار یہودی ہوں گے ان کا لباس ریشمی چادروں کا ہوگا۔

۳۔ حضرت فاطمہ بنت قیس کہتی ہیں تمیم داری نے بیان کیا۔ جب ہم جزیرہ میں داخل ہوئے تو ہم کو ایک عورت نظر آئی جس کے جسم پر بال بہت کثرت سے تھے وہ اپنے بالوں کو گھسیٹتی چلی جاتی تھی اور مثل جانوروں کے معلوم ہوتی تھی۔ اس سے ہم نے کہا تو کون ہے؟ تو اس نے کہا جساسہ ہوں۔ تم اس مکان کی طرف جاؤ۔ جب میں اس مکان میں گیا تو ایک شخص کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے پایا جو اپنے بال گھسیٹ رہا تھا اور آسمان اور زمین کے درمیان کودتا تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا تو کون ہے؟ اس نے کہا۔ میں دجال ہوں۔ عنقریب مجھے نکلنے کی اجازت دی جائے گی۔ میں نکل کر تمام روئے زمین پر چالیس راتوں میں پھر لوں گا۔

۴۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جب تین باتیں ظہور پذیر ہو جائیں گی تو اس

وقت کسی نفس کو اس کا ایمان لانا مفید نہ ہوگا۔ نہ ایمان کی حالت میں کسی نفس کی بہتری کرنا اس کے واسطے مفید ہوگا۔ وہ تین باتیں یہ ہیں۔ مغرب سے آفتاب کا طلوع ہونا۔ دابۃ الارض کا ظاہر ہونا۔ دجال کا خروج

۵۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا سب سے پہلی جو نشانی قیامت کی ہوگی وہ مغرب سے آفتاب کا طلوع ہونا، پھر چاشت کے وقت دابۃ الارض کا نکلنا اور جو علامت پہلے ظاہر ہوتی جائے گی۔ اس کی بعن (یعنی دوسری علامات) اس کے پیچھے قریب ہی ہوتی چلی جائے گی۔

مندرجہ صدر احادیث کے ملاحظہ کے بعد ہمارے سامنے حسب ذیل امور آتے ہیں:۔

قیامت کی پہلی نشانی آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا ہے۔ پھر دابۃ الارض کا نکلنا۔ پھر دجال کا خروج ہونا ہے دجال ستر ہزار یہودیوں کے ساتھ شام اور عراق کے درمیان ظاہر ہوگا۔ دجال ایک جوان شخص ہوگا۔ اس کی آنکھ میں ناخونہ ہوگا۔ اس کی صورت عبدالعزیٰ بن قطن (یہ شخص بہ زمانہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھا) کی سی ہوگی۔ وہ زمین پر چالیس روز رہے گا۔ وہ الوہیت کا دعوے کریگا۔ ایک قوم اس پر ایمان لا کر اس کے ذریعے دنیاوی تمتع حاصل کرے گی اور ایک قوم اس سے انکار کر کے دنیاوی خسارہ مول لے گی۔ وہ آسمان سے بارش برسائے گا۔ وہ ویرانہ میں جا کر اپنے حکم سے خزانے نکالے گا۔ وہ نہایت تیز رفتار ہوگا۔ اسی اثناء میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور وہ اس کو تلاش کرتے ہوئے بابِ لُد کے قریب گھیر کر اس کو قتل کر ڈالیں گے۔ پھر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر پناہ لیں گے۔ قوم یاجوج ماجوج زمین میں پھیل جائے گی اور فتنہ عام کا ظہور ہوگا۔

الغرض ایسے ہی واقعاتِ نادرہ کا تواتر جاری رہے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ یہ ہے حقیقتِ دجال اور اس کے زمانے کی جس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

حضور علیہ السلام نے ساری کائنات کا مشاہدہ فرمایا

اس حدیث میں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَا مِنْ شَیْءٍ جو چیز بھی مجھے نہیں دکھائی گئی تھی وہ میں نے آج اس جگہ کھڑے کھڑے دیکھ لی۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں کہ یہاں رویت سے یا تو آنکھ سے دیکھنا مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے حجابات اٹھا دیئے اور حضور علیہ السلام نے مشاہدہ فرما لیا اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ رویت سے رویتِ علم مراد ہو یعنی اللہ عزوجل نے:۔

وَحْیٌ بِاِطِّلَاعِهٖ وَ تَعْرِيْفِهٖ مِنْ اُمُوْرِهِمَا تَفْصِيْلًا مَا لَمْ نَعْرِفْهُ قَبْلَ ذٰلِكَ

(عینی ج ۱ ص ۴۸۹)

ان تمام امور کی اطلاع بذریعہ وحی تفصیلی طور پر آپ کو دے دی جن کو آج سے پہلے حضور علیہ السلام نہیں جانتے تھے۔

؎ عالم میں کیا ہے جس کی تجھ کو خبر نہیں
ذرّہ ہے کونسا تری جس پر نظر نہیں

واضح ہو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف رکھتے ہوئے جن عجائب و غرائب قدرت کا مشاہدہ و معائنہ فرماتے تھے۔ صحاح میں اس کے متعلق کثیر حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ جن کو اگر جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے۔

یہاں ہم چند احادیث پیش کیے دیتے ہیں۔ حضور سیّد عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

۱۔ اِنِّیْ رَأَیْتُ الْجَنَّۃَ وَ اُرِیْتُ النَّارَ	میں نے جنّت کو دیکھا اور دوزخ مجھے دکھائی گئی
۲۔ لَقَدْ جِیْئَ بِالنَّارِ ثُمَّ جِیْئَ بِالْجَنَّۃِ (بخاری و مسلم باب الکسوف)	میرے پاس جنّت اور دوزخ لائی گئی (یعنی مجھے دکھائی گئی)

ایک بار سورج گرہن ہوا۔ آپ صحابہ کے ساتھ نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور بہت دیر تک قرأت، رکوع اور سجود میں مصروف رہے۔ صحابہ کرام نے دیکھا کہ آپ نے نماز میں ایک بار ہاتھ کو آگے۔ پھر دیکھا کسی قدر پیچھے ہٹے۔ نماز کے بعد صحابہ کرام کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا:۔

۳۔ اِنِّیْ رَأَیْتُ الْجَنَّۃَ فَتَنَاوَلْتُ مِنْھَا عُنْقُوْدًا لَوْ اَخَذْتُہٗ لَاَکَلْتُمْ مِنْہُ مَا بَقِیَتِ الدُّنْیَا۔ (ابوداؤد ص ۲۲۶)	میں نے ابھی جنّت کو دیکھا (جنّت میں انگور کے خوشے لٹک رہے تھے) چاہا کہ توڑ لوں۔ اگر میں ان کو توڑ لیتا تو تا قیامت تم اس کو کھاتے۔ (بخاری کتاب الاذان، باب رفع الید)

پھر میں نے دوزخ کو دیکھا۔ جس سے زیادہ بھیانک چیز میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ لیکن میں نے اس میں زیادہ تر عورتوں کو پایا۔ صحابہ نے عرض کی حضور اس کی وجہ؟

فرمایا، اپنے خاوندوں کی ناشکری کے سبب۔ اگر ایک عورت پر تم عمر بھر احسان کرو۔ پھر ایک دفعہ وہ تمہارے کسی فعل سے آزردہ ہو جائے تو وہ کہے گی۔ میں نے کبھی تمہارا اچھا برتاؤ نہیں دیکھا۔

۴۔ وَرَأَیْتُ فِیْھَا اَخَابَنِیْ دَعْدَعٍ سَارِقَ الْحَجِیْجِ (ابوداؤد و باب مقراۃ فی الصلوٰۃ الکسوف)	(میں نے دوزخ میں) اس چور کو دیکھا جو حاجیوں کا اسباب چرایا کرتا تھا۔

میں نے دوزخ میں اس یہودی عورت کو دیکھا جس پر اس لیے عذاب ہو رہا تھا کہ اس نے ایک بلّی کو باندھ دیا تھا اس کو کھانے کو کچھ نہ دیتی تھی اور نہ اس کو چھوڑتی تھی کہ وہ زمین پر گری پڑی چیزیں کھائے۔ آخر اسی بھوک سے مر گئی۔

ایک اور حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا۔

۵۔ قَالَ اِطَّلَعْتُ فِی الْجَنَّۃِ	میں جنّت میں جا نکلا (بخاری جلد ۲ ص ۹۶۹)

دیکھا کہ یہاں کے باشندوں کی بڑی تعداد ان کی ہے جو دنیا میں غریب تھے اور دوزخ میں جا کر دیکھا تو اس میں بڑی تعداد عورتوں کی پائی (بخاری باب صفۃ الجنۃ)

۶۔ عمر مبارک کے اخیر سال میں آپ شہدائے اُحد کے مزارات پر تشریف لے گئے اور وہاں سے واپس آکر آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں یہ بھی فرمایا ——— میں اپنے حوضِ کوثر کو یہیں سے دیکھ رہا ہوں اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں میرے حوالے کی گئی ہیں (بخاری کتاب الجنائز و باب ما یحذر زہرۃ الدنیا)

اس خطبہ میں یہ بھی فرمایا۔ مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرنے لگو گے لیکن میں ڈرتا ہوں اس بات سے کہ

اس دُنیا کی دولت میں پڑکر آپس میں رشک وحسد نہ کرنے لگو۔

۷۔ ایک دن آپ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک ٹیلے پر چڑھے پھر فرمایا۔

هَلْ تَرَوْنَ مَا اَرٰى قَالُوْا لَا قَالَ فَاِنِّىْ لَاَرٰى الْفِتَنَ تَقَعُ خِلَالَ بُيُوْتِكُمْ كَوَقْعِ الْمَطَرِ (بخاری جلد ۲ صـ۱۰۴۲ و مسلم باب الفتن ا)

(اے لوگو! جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں) وہ تم بھی دیکھ رہے ہو؟ لوگوں نے عرض کی نہیں۔ فرمایا میں تمہارے گھروں کے درمیان فتنوں کو بارش کی طرح برستے دیکھ رہا ہوں۔

۸۔ ایک جہاد میں مسلمانوں کی طرف سے ایک آدمی مارا گیا۔ لوگوں نے کہا وہ شہید ہوا۔ آپ نے فرمایا:۔

قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ فُلَانًا قَدِ اسْتُشْهِدَ قَالَ كَلَّا قَدْ رَاَيْتُهٗ فِى النَّارِ بِعَبَاءَةٍ قَدْ غَلَّهَا (ترمذی باب ما جاء فی الغلول صـ۱۹۱)

ہرگز نہیں میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ہے کیونکہ اس نے مالِ غنیمت میں سے ایک جبّا چرائی تھی۔

۹۔ ایک دفعہ آپ دوپہر کو گھر سے نکلے تو آپ کے کانوں میں ایک آواز آئی تو فرمایا:۔

فَسَمِعَ صَوْتًا فَقَالَ يَهُوْدُ تُعَذَّبُ فِىْ قُبُوْرِهَا (بخاری کتاب الجنائز صـ۱۸۴ ج ۱)

یہود کو ان کی قبروں میں عذاب دیا جا رہا ہے۔

علامہ قسطلانی نے طبرانی کی ایک حدیث ذکر کی ہے جس میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا۔ یہود کو ان کی قبروں میں جو عذاب ہو رہا ہے اس کی آوازیں میرے کانوں میں آرہی ہیں۔

۱۰۔ بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ آپ نے فرمایا۔ میں نے جہنم کو دیکھا کہ اس کے شعلے ایک دوسرے کو توڑ رہے ہیں —— اور اس میں عمرو بن عامر کو دیکھا جو اپنی آنتیں گھسیٹ رہا ہے"۔

۱۱۔ حضرت ورقہ بن نوفل کے متعلق حضرت ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ حضور! ورقہ جنت میں گئے یا دوزخ میں۔ انہوں نے تو آپ کی تصدیق کی تھی مگر آپ کے اظہارِ نبوّت سے پہلے وفات پا گئے۔ فرمایا:۔

اُرِيْتُهٗ فِى الْمَنَامِ وَعَلَيْهِ ثِيَابٌ بِيْضٌ وَلَوْ كَانَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ لَكَانَ عَلَيْهِ لِبَاسٌ غَيْرُ ذٰلِكَ (ترمذی، احمد، مشکوٰۃ، کتاب الرؤیا)

مجھے ان کو خواب میں دکھایا کہ وہ سپید کپڑے پہنے ہیں۔ اگر وہ دوزخ میں ہوتے تو ان کے جسم پر یہ لباس نہ ہوتا۔

۱۲۔ رات میں نے دیکھا کہ میں جنت میں ہوں۔ سامنے ایک محل نظر آیا۔ اس میں ایک عورت بیٹھی وضو کر رہی تھی میں نے پوچھا یہ کس کا محل ہے۔ جواب دینے والے نے جواب دیا کہ یہ عمر کا مسکن ہے۔ میں نے چاہا کہ اندر جاؤں مگر عمر کی غیرت یاد آئی تو اُلٹا پھر گیا۔

حضرت عمر سن کر رو پڑے۔ عرض کی حضور! میں آپ سے غیرت کرتا۔ (صحیح بخاری جلد ۱ صـ۴۶۵ و مسلم ترمذی کتاب الرؤیا و مناقب عمر) ۱۲

۱۳۔ ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلال تم کونسا ایسا نیک عمل کرتے ہو کہ میں جب جنت میں گیا تو تمہارے

جوتوں کی چاپ کی آواز سنی۔ عرض کی حضور علیہ السلام ہمیشہ باوضو رہتا ہوں اور جب نیا وضو کرتا ہوں تو دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہوں (بخاری مناقب بلال، ترمذی مناقب عمر)

۱۴۔ ایک مرتبہ آپ نے خطبہ دیا جس میں ابتدائے آفرینش سے جنت و دوزخ تک کے احوال بیان فرما دیے۔ عمر بن اخطب کے یہ الفاظ ہیں۔

فَاَخْبَرَنَا بِمَا هُوَ كَائِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (مشکوٰۃ باب المعجزات) | حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ان تمام واقعات کی اطلاع دی جو قیامت تک ہونے والے تھے۔

۱۵۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالٰے نے زمین کے تمام کناروں کو میرے سامنے کر دیا۔

فرایت مشارق الارض ومغاربہا | میں نے اس کے مغرب و مشرق کو دیکھ لیا

۱۶۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔ خدا نے میرے لیے دنیا کو پیش فرما دیا تو میں دنیا میں جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے اس کو اس طرح دیکھ رہا ہوں۔

كَاَنَّمَا اَنْظُرُ اِلٰى كَفِّيْ هٰذِهٖ | جیسے اپنے اس ہاتھ کو (مواہب لدنیہ، زرقانی)

۱۷۔ آپ نے ایک خطبہ میں فرمایا، مجھ سے جو چاہو سوال کرو، بخدا جب تک میں اس منبر پر ہوں۔ تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔ ایک شخص کھڑا ہوا۔ عرض کی حضور! میرا ٹھکانہ کہاں ہے؟

قَالَ النَّارُ ۔ فرمایا جہنم۔ پھر عبداللہ بن حذافہ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے عرض کی۔ میرا باپ کون ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ حذافہ

ثُمَّ كَثَّرَ اَنْ يَّقُوْلَ سَلُوْنِيْ سَلُوْنِيْ (بخاری، کتاب الاعتصام) | پھر آپ نے متعدد بار فرمایا۔ لوگو! پوچھو، پوچھو

۱۸۔ ایک مرتبہ فرمایا۔ جس طرح آدم (علیہ السلام) پر ان کی اولاد اپنی اپنی صورتوں میں پیش کی گئی تھی۔ اسی طرح مجھ پر میری اُمت لوگوں کی پیدائش سے پہلے پیش کی گئی مجھے بتا دیا گیا ہے کہ کون مجھ پر ایمان لائے گا اور کون نہیں۔ حضور علیہ السلام کے ان جملوں کی اطلاع منافقین کو پہنچی وہ کہنے لگے۔ یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اب یہ گمان کرتے ہیں کہ انہیں مومن و کافر کی خبر ہے۔ حالانکہ ہم ان کے ساتھ ہیں۔ وہ ہم کو نہیں جانتے۔ جب منافقین کی یہ باتیں آپ تک پہنچیں تو آپ منبر پر تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔

مَا حَالُ اَقْوَامٍ طَعَنُوْا فِيْ عِلْمِيْ لَا تَسْئَلُوْنِيْ عَنْ شَيْءٍ فِيْمَا بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ السَّاعَةِ اِلَّا اَنْبَأْتُكُمْ بِهٖ (خازن، پارہ ۴) | اس قوم کا کیا حال ہے جو ہمارے علم میں طعن کرتے ہیں (حالانکہ) اب سے لے کر قیامت تک جس چیز کے متعلق پوچھو گے ہم اس کی تم کو خبر دیں گے

۱۹۔ حتیٰ کہ ایک بار جب آپ مصروف نماز تھے۔ جمال الٰہی بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ جمال الٰہی بے پردہ میرے سامنے ہے۔ خطاب ہوا تم جانتے ہو فرشتگان کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں۔ عرض کی! نہیں یارب العالمین۔

پھر خدا نے اپنا ہاتھ دونوں مونڈھوں کے بیچ میں میری پیٹھ پر رکھا۔ جس کی ٹھنڈک میرے سینہ تک پہنچ گئی۔

فَعَلِمْتُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (مشکوٰۃ شریف باب المساجد) | اور آسمان وزمین کی تمام چیزیں میری نگاہوں کے سامنے آگئیں

اب خطاب ہوا۔ فرشتگانِ خاص کس امر پر گفتگو کر رہے ہیں۔ میں نے عرض کی ان اعمال کی نسبت جو گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔ خطاب ہوا وہ کیا ہیں؟ عرض کی نماز باجماعت کی شرکت کے لیے قدم اٹھانا۔ نماز کے بعد مسجد میں ٹھہر جانا اور ناگواری کے باوجود اچھی طرح وضو کرنا۔ جو ایسا کرے گا اس کی زندگی اور موت دونوں بخیر ہوں گے۔ وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو جائے گا جیسے اس دن جب اس کی ماں نے اس کو جنا۔

پھر سوال ہوا یا محمد! اور درجات کیا ہیں؟ عرض کی کھانا کھلانا جب دنیا سوتی ہو تو اٹھ کر نماز پڑھنا (مسند احمد بن حنبل ج ۵ صہ ۳۴۳) ——— الغرض اس نوع کے کثیر مشاہدات او مسموعات ہیں جو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو وقتاً فوقتاً پیش آیا کرتے تھے اور یہ بات بھی حضور علیہ السلام سے خصائص سے تھی۔

قبر میں حضور علیہ السلام کے متعلق سوال

ما علمك یہ خطاب مقبور کو ہوگا اور ھذا الرجل سے مراد حضور علیہ السلام کی ذاتِ اقدس ہے اور سوال کرنے والے دو فرشتے ہیں جو قبر میں آتے ہیں جن کو منکر و نکیر کہتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ ھذا اسم اشارہ ہے جو مشار الیہ حسّی کو چاہتا ہے یعنی ہٰذا سے اس چیز کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو محسوس بھی ہو اور نظر بھی آئے تو کیا قبر میں خود بنفسِ نفیس حضور علیہ السلام تشریف لاتے ہیں یا آپ کی تصویر پیش کی جاتی ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ نہ تو حضور علیہ السلام خود قبر میں آتے ہیں اور نہ آپ کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے مقامِ ارفع و اعلیٰ میں جلوہ فرما ہوتے ہیں۔ حجاب اور پردہ تو مقبور کے لیے ہوتا ہے بحکمِ خداوندی مقبور کے لیے وہ حجاب اٹھ جاتے ہیں اور مقبور کو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نظر آتے ہیں اور فرشتہ آپ کی ذاتِ اقدس کی طرف اشارہ کرکے پوچھتے ہیں کہ ان کے متعلق تیرا کیا اعتقاد ہے؟ تو مومن اس سوال کا جواب دینے میں حضور علیہ السلام کی رسالت و نبوت کا اقرار کرے گا اور کافر اس امتحان میں فیل ہو جائے گا اور وہ کہے گا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اس پر مومن سے کہا جائیگا کہ اب امن و سلامتی کے ساتھ سو جا ——— علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ نے اپنے رسالہ المنٰی یا باظھار ما کان خفیا میں لکھا ہے کہ قبر میں حضور علیہ السلام کے متعلق سوال ہونا یہ آپ کی خصوصیات سے ہے۔ کسی اور نبی کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہے کہ اس کی نبوت و رسالت کے متعلق قبر میں بھی سوال ہوگا۔ اس سوال سے مقصود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ و مقام کی برتری اور آپ کے عزّ و شرف کا اظہار ہے۔

کیا قبر میں کافر سے بھی سوال ہوگا؟

بعض علماء کا خیال ہے کہ قبر میں صرف مومن اور منافق سے سوال ہوگا جو دنیا میں اسلام کے مدعی تھے اور یہاں مسلمانوں کی سی زندگی گزارتے تھے اور کافر مجاہر جو ظاہراً و باطناً کافر تھا اس سے سوال نہیں ہوگا۔ وہ کہتے ہیں ان سوالات کا منشا یہ ہے کہ مومن و

منافق میں فرق ہو جاتے اور کافر مجاہر میں التباس تھا ہی نہیں لہٰذا اس سے سوال کیوں ہو؟ حیرت ہے کہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ وہ "شرح الصدر" میں لکھتے ہیں کہ ابن البر نے کہا کہ یہ سوال صرف مومن اور منافق کے ساتھ مخصوص ہے اور جن احادیث میں کافر کا لفظ آیا ہے اس سے بھی منافق ہی مراد ہے۔ لیکن اگر ان حضرات کے نزدیک کافر سے سوال نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے ہی سے ممتاز ہے تو یہ تمیز و امتیاز تو مومن کو بھی حاصل ہے۔ لہٰذا یہ کہنا چاہیئے کہ مومن سے بھی قبر میں سوال نہ ہوگا۔ صرف منافق سے ہوگا اور شاید اسی اعتراض سے بچنے کے لیے علامہ ابن قیم نے کتاب الروح میں یہ لکھا ہے کہ سوال صرف منافق سے ہی ہوگا۔

بہر حال مسئلہ مختار یہ ہے کہ قبر میں تینوں سے سوال ہوگا۔ منافق سے بھی مومن سے بھی اور کافر مجاہر سے بھی اور منشار سوال التباس کو دور کرنا اور مومن و منافق میں فرق کرنا نہیں۔ چنانچہ احادیث میں یہ تصریح ہے کہ جب مومن سوالات کے صحیح جواب دے گا تو فرشتے اس سے یہ کہیں گے کہ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ تو حضور علیہ السلام کی رسالت و نبوت پر یقین رکھتا ہے۔ اس سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ قبر کے سوالات کا منشار مومن و منافق میں فرق کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی حکمت حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و رفعت کا اظہار ہے۔ خود علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ نے اپنے رسالہ "ثریا" میں لکھا۔

اِنَّمَا الْمَقْصُوْدُ مِنَ السُّوَالِ اُمُوْرٌ اَحَدُ هُمَا اِظْهَارُ شَرَفِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	اس سوال سے مقصود متعدد امور ہیں۔ ایک ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف کا اظہار بھی ہے۔

جب مقصودِ سوال حضور علیہ السلام کے فضل و شرف کا اظہار ہے کہ یہ وہ ذاتِ مقدس ہیں۔ جن کی رسالت و نبوت کے متعلق قبر میں بھی پوچھا جاتا ہے تو یہ سوالات مومن، منافق اور کافر تینوں سے ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تکملہ میں ان آیات کی تفسیر اس طرح کی ہے:۔

۱- يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ (هو كلمة التوحيد)

۲- فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (فى القبر)

۳- وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ (الكفار فلا يهتدون للجواب الصواب)

اس تفسیر سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قبر میں کافر سے بھی سوال ہوگا ——— لہٰذا جب مقصودِ سوال حضور علیہ السلام کے فضل و شرف کا اظہار ہے تو یہ سوالات کافر، منافق اور مومن تینوں سے ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ اس باب کی احادیث میں اما المنافق والکافر بھی آیا ہے۔ واوٗ عاطفہ مغایرت کے لیے آتی ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا کہ یہ سوال کافر اور منافق دونوں سے ہوں گے۔ چنانچہ آیت يثبت الله الذين امنو (الی) یضل الله الظالمين سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہاں ظالمین کا ذکر امنوا کے مقابل کیا گیا ہے اور لفظ ظالم، کافر اور منافق دونوں کو شامل ہے۔ نیز طبرانی میں حدیثِ مرفوع بسندِ حسن آئی ہے۔ ابن حبان نے اس کو اپنی صحیح میں درج کیا جس کا مضمون یہ ہے۔

"کافر سے جب سوال ہوگا تو وہ صحیح جواب نہ دے سکے گا جس پر قبر اس کے لیے تنگ ہو جائے گی یہاں تک اس کی پسلیاں ادھر ادھر ہو جائیں گی۔ اسی کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے۔ من اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا۔"
ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے میں کافر اور منافق دونوں شامل ہیں۔

مسائل حدیث ۱۔ واضح ہو کہ یہ نماز جس کا ذکر حدیث زیرِ بحث ہے کسوف کی نماز تھی۔ جو ۹ھ میں عین اس وقت ہوا تھا جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انتقال فرمایا تھا اور نماز کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا تھا۔ حدیث زیرِ بحث، مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔
۲۔ جنت و دوزخ پیدا ہو چکی ہیں اور آج موجود ہیں۔ یہی مذہب ہے اہلسنت وجماعت کا۔ جس پر آیات و احادیث اور اخبارِ متواتر دال ہیں۔ البتہ معتزلہ اس بات کا انکار کرتے اور کہتے ہیں کہ جنت و دوزخ حساب وعقاب سے ایک روز قبل پیدا کی جائیں گی۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ معتزلہ کا یہ کہنا:

هٰذَا بَاطِلٌ وَتَلَاعُبٌ بِالدِّيْنِ وَانْسِلَالٌ عَنْ اِجْمَاعِ الْمُسْلِمِيْنَ (عینی ج ۱ ص ۴۹)	باطل ہے دین سے تلاعب ہے اور اجماع المسلمین کے بھی خلاف ہے۔

۳۔ عذابِ قبر اور قبر میں منکر نکیر کا سوال کرنا برحق ہے ۴۔ صلوٰۃ کسوف سنت اور اس میں قیام طویل اور نماز کے بعد خطبہ دینا مسنون ہے ۵۔ عمل قلیل سے نماز فاسد نہیں ہوتی ۶۔ ایسی بیہوشی جس میں عقل باقی رہے ناقضِ وضو نہیں ہے ۷۔ خطبہ کے اول میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ہونی چاہیے ۸۔ منافق اس کو کہتے ہیں جو بظاہر کلمہ پڑھے اور دل میں کفر رکھے اور مرتاب وہ ہے جو اسلام کی حقانیت وصداقت میں شک کرے۔

ایک شبہ کا ازالہ مخالفینِ تقلید نے اس موقع پر عجیب وغریب شبہ پیدا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے تقلید کی مذمت نکلتی ہے کیونکہ منافق فرشتے کے سوال پر یہ جواب دیگا کہ میں نے جیسے لوگوں کو کہتے سنا وہی میں نے کہا۔ مطلب یہ کہ اس نے نہ خود غور کیا اور نہ تحقیق کی بلکہ ایمان تقلیدی کا اظہار کیا لیکن ان کا یہ استدلال اتنا کچا اور بودا اور لایعنی ہے کہ جس کی مثال نہیں ملے گی۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ وہ اُمور جو ایمان سے تعلق رکھتے ہیں جیسے توحید و رسالت، حشر ونشر، قیامت۔ اسی طرح وہ احکام جو کتاب وسنت نے واضح طور پر بتا دیئے ہیں جیسے پانچ نمازیں، تیس روزے، شراب وخنزیر کی حرمت وغیرہ ذالک، مسائل واحکام صریحہ یہ وہ امور ہیں جن میں نہ تقلید جائز ہے اور نہ کوئی مقلد ان امور میں کسی امام کی تقلید کرتا ہے تو جب مقلدین ائمہ اربعہ کے نزدیک ایمانیات اور احکام صریحہ منصوصہ میں تقلید جائز ہی نہیں ہے تو حدیثِ مذکورہ سے تقلید کی مذمت کیسے ثابت ہوئی۔ تقلید تو صرف ان اُمور کی کی جاتی ہے جنہیں قرآن وحدیث نے بیان نہیں کیا اور جنہیں مجتہد دلائل شرعیہ کی روشنی میں اجتہاد واستنباط کرکے نکالتا ہے اور حدیث میں جن امُور کے متعلق قبر میں سوال ہونے کا ذکر ہے۔ یہ اُمور تقلیدی نہیں ہیں۔

حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا حدیثِ ہٰذا کے راویوں میں حضرت اسماء بھی ہیں۔ آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بہن ہیں۔ حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت زبیر کے نکاح میں تھیں۔ ان سے ۵۶ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے ۴ کو بخاری نے منفرداً ذکر کیا اور ۱۴ پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے۔ انھوں نے مکہ میں ماہ جمادی الاول ۷۳ھ میں بعد شہادت حضرت عبداللہ بن زبیر کے انتقال کیا۔ ان کی عمر مبارک ایکسو سال ہوئی۔ اس عمر میں بھی کوئی دانت نہ گرا اور نہ عقل میں فتور آیا۔

بَابُ تَحْرِیْضِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

باب اس امر کے بیان میں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

وَیُخْبِرُوْا مَنْ وَّرَآءَھُمْ وَقَالَ مَالِکُ ابْنُ الْحُوَیْرِثِ قَالَ لَنَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ارْجِعُوْا اِلٰی اَھْلِیْکُمْ فَعَلِّمُوْھُمْ

(بخاری)

نے وفد عبدالقیس کو رغبت دلائی کہ وہ ایمان اور علم کی باتیں یاد رکھیں اور دوسروں تک پہنچائیں اور مالک ابن حویرث کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ جاؤ اور ان کو دین کی باتیں سکھاؤ۔

فوائد و مسائل تحریص، کے معنیٰ ہیں کسی کام کی رغبت دلانے، برانگیختہ کرنے اور ابھارنے کے۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی وفد کو یا اشخاص و افراد کو دین کے احکام و مسائل تعلیم فرماتے تو یہ بھی تاکید فرماتے تھے کہ تم نے جو کچھ مجھ سے سیکھا ہے اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔

یہ تعلیق حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس کو امام نے کتاب الصلوٰۃ اور ادب میں موصولاً ذکر فرمایا ہے۔ امام مسلم نے بھی اس کو ذکر کیا ہے ۲۔ مالک بن حویرث بن حشیش صحابی ہیں۔ یہ پانچ افراد کے ہمراہ خدمت نبوی میں حاضر ہو کر اسلام لائے اور چند دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہے اور پھر اپنی قوم کی طرف واپس ہونے کی اجازت چاہی تو حضور علیہ السلام نے ان کو مذکورہ بالا حکم دیا۔ ان سے کل ۱۵ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے دو پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا اور ایک حدیث کو بخاری نے منفرداً ذکر کیا۔ حضرت مالک بن حویرث نے ۹۴ھ میں بصرہ میں انتقال فرمایا۔ ایک جماعت نے آپ سے روایت کی ہے ۳۔ اس کے بعد امام بخاری نے ایک حدیث ۸۶ ذکر کی ہے جو کتاب الایمان میں مع تفہیم کے گزر چکی ہے۔ یعنی حدیث وفد عبدالقیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اس لیے ہم نے اس کو چھوڑ دیا۔

بَابُ الرِّحْلَۃِ فِی مَسْئَلَۃِ النَّازِلَۃِ

باب جب کوئی مسئلہ آ پڑے تو اس کے جواب کے حصول کے لیے سفر کرنا

علامہ دوانی نے شرح عقائد میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ ایک عالم دین کا انتظام و انصرام کریں تاکہ لوگ اس سے اپنے مسائل ضروریہ نازلہ پوچھ سکیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔

۸۷۔ عَنْ عُقْبَۃَ بْنِ الْحَارِثِ اَنَّہٗ تَزَوَّجَ ابْنَۃً لِاَبِیْ اِھَابِ بْنِ عَزِیْزٍ فَاَتَتْہُ امْرَاَۃٌ فَقَالَتْ اِنِّیْ قَدْ اَرْضَعْتُ

عقبہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے نکاح کیا ابواہاب بن عزیز کی بیٹی سے تو ایک عورت آئی کہنے لگی میں نے عقبہ کو اور اس لڑکی

عُقْبَةَ وَالنَّبِيُّ تَزَوَّجَ بِهَا فَقَالَ لَهَا عُقْبَةُ مَآ اَعْلَمُ اِنَّكِ اَرْضَعْتِنِيْ وَلَا اَخْبَرْتِنِيْ فَرَكِبَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ فَسَاَلَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ وَ قَدْ قِيْلَ فَفَارَقَهَا عُقْبَةُ وَنَكَحَتْ زَوْجًا غَيْرَهٗ

(بخاری)

جس سے عقبہ نے نکاح کیا ہے، دُودھ پلایا ہے۔ عقبہ نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ تُو نے مجھے دُودھ پلایا ہے اور نہ تُو نے اس سے قبل کبھی اس کا ذکر کیا پھر عقبہ سواری پر سوار ہو کر مدینہ منورہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا کیسے اور جب کہ کہا گیا ہے — پس عقبہ نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور اس عورت نے دوسرا خاوند کر لیا۔

فوائد و مسائل اس حدیث کا باب سے تعلق یہ ہے کہ اس میں حضرت عقبہ کا مسئلہ پوچھنے کے لیے سفر کا ذکر ہے۔ ۲- امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الشہادات میں بھی ذکر کیا ہے۔ تفصیلی بحث ہم انشاءاللہ العزیز اسی مقام پر کریں گے ۳- کیف وقد قیل، کا حاصلِ معنیٰ یہ ہے کہ تم ایک ایسی عورت کے ساتھ ازدواجی تعلقات کیسے قائم رکھ سکتے ہو جس کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ تمہاری رضاعی بہن ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف ایک عورت کے قول سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی اور نہ محض اس کے قول کی بناء پر نکاح فاسد ہو سکتا ہے۔ لہٰذا حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد محض احتیاطی ہے یعنی ورع اور تقویٰ کا تقاضا یہی ہے کہ تہمت کے مواضع سے بھی بچا جائے۔

رضاعت کا ثبوت اس باب میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ رضاع کا ثبوت اسی طرح ہوگا جس طرح مال کا ہوتا ہے یعنی دو مردوں کی شہادت یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت۔ صرف ایک عورت کا قول نہیں مانا جائے گا کیونکہ ثبوتِ حرمت بابِ نکاح میں لوازم الملک سے ہے اور ملک کا زوال ایک عورت کی شہادت سے نہیں ہوتا۔ لہٰذا حرمت ثابت نہ ہوگی اور امام شافعی یہ فرماتے ہیں۔ ثبوتِ شہادت چار عورتوں کی شہادت سے ہو جائیگا اور امام مالک کے نزدیک دو عورتوں کی شہادت سے اور امام احمد کے نزدیک صرف مرضعہ کے کہنے سے رضاعت کا ثبوت ہو جائے گا۔ ان کی دلیل حدیث زیرِ بحث ہے۔

بَابُ التَّنَاوُبِ فِي الْعِلْمِ

باب علم حاصل کرنے کے لیے باری مقرر کرنا

۸۸- عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ كُنْتُ اَنَا وَجَارٌ لِّيْ مِنَ الْاَنْصَارِ فِيْ بَنِيْ اُمَيَّةَ بْنِ زَيْدٍ وَّهِيَ مِنْ عَوَالِي الْمَدِيْنَةِ وَكُنَّا نَتَنَاوَبُ النُّزُوْلَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں اور میرا ہمسایہ انصاری عوالی مدینہ کے ایک گاؤں بنی اُمیّہ بن زید میں رہتے تھے اور ہم دونوں باری باری حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک دن وہ اور ایک دن میں دربارِ نبوی میں حاضری دیتا تو

يَنْزِلُ يَوْمًا وَ اَنْزِلُ يَوْمًا فَاِذَا نَزَلْتُ جِئْتُهُ بِخَبَرِ ذٰلِكَ الْيَوْمِ مِنَ الْوَحْيِ وَ غَيْرِهٖ وَاِذَا نَزَلَ فَعَلَ مِثْلَ ذٰلِكَ فَنَزَلَ صَاحِبِي الْاَنْصَارِيُّ يَوْمَ نَوْبَتِهٖ فَضَرَبَ بَابِيْ ضَرْبًا شَدِيْدًا فَقَالَ اَثَمَّ هُوَ فَفَزِعْتُ فَخَرَجْتُ اِلَيْهِ فَقَالَ حَدَثَ اَمْرٌ عَظِيْمٌ فَدَخَلْتُ عَلٰى حَفْصَةَ فَاِذَا هِيَ تَبْكِيْ فَقُلْتُ اَطَلَّقَكُنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ لَا اَدْرِيْ ثُمَّ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ وَاَنَا قَائِمٌ اَطَلَّقْتَ نِسَآءَكَ قَالَ لَا فَقُلْتُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ

(بخاری)

اس دن جو وحی ہوتی اور جو مسائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرماتے ہیں اپنے ساتھی انصاری کو اس کی اطلاع دیتا اسی طرح وہ بھی کرتا تو ایک دن میرے ساتھی انصاری کی باری تھی۔ وہ لوٹ کر آیا اور اس نے زور سے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا یہاں عمر ہیں؟ میں گھبرا گیا اور مکان سے باہر آیا۔ اس نے کہا آج بہت بڑا حادثہ رونما ہوا ہے (یعنی حضور علیہ السلام نے اپنی بی بیوں کو طلاق دیدی ہے) پس میں حفصہ کے ہاں آیا اور ان کو روتا ہوا پایا۔ میں نے کہا کیا تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دیدی ہے؟ تو حفصہ نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ پھر میں خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا اور کھڑے کھڑے عرض کی۔ آپ نے اپنی بیبیوں کو طلاق دیدی ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نہیں! میں نے کہا اللہ اکبر

فوائد و مسائل (۱) اس حدیث کو امام بخاری نے نکاح اور مظالم میں بھی ذکر کیا ہے اور امام مسلم نے طلاق میں ترمذی نے تفسیر میں۔ نسائی نے صوم اور عشرۃ النساء میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ اس حدیث سے ذیل کے مسائل معلوم ہوئے۔ خبر واحد اور صحابہ کے مراسیل پر عمل درست ہے ___ صحابہ کرام علم دین کے حریص تھے اور جو کچھ حضور علیہ السلام سے سُنتے دوسروں تک پہنچاتے ___ باپ کو اپنی بیٹی کے گھر اس کے خاوند سے اجازت لیے بغیر جانا جائز ہے۔

بَابُ الْغَضَبِ فِي الْمَوْعِظَةِ

باب خلاف شرع بات دیکھنے پر تعلیم

وَالتَّعْلِيْمِ اِذَا رَاٰى مَا يَكْرَهُ

وتعلیم میں غصہ کا اظہار کرنا

۸۹۔ عَنْ اَبِيْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَا اَكَادُ اُدْرِكُ الصَّلٰوةَ مِمَّا يُطَوِّلُ بِنَا فُلَانٌ فَمَا رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ مَوْعِظَةٍ اَشَدَّ غَضَبًا مِنْ يَوْمَئِذٍ فَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّكُمْ مُنَفِّرُوْنَ فَمَنْ صَلّٰى بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ فَاِنَّ فِيْهِمُ الْمَرِيْضَ

ابی مسعود الانصاری سے ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! میں نماز کو نہیں پا سکتا بوجہ لمبا کرنے فلاں شخص کے نماز کو (ابی مسعود کہتے ہیں، میں نے کسی وعظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دن سے زیادہ غصہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پھر آپ نے فرمایا تم لوگوں کو نفرت دلاتے ہو۔ پس جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو اس میں تخفیف کرے۔ کیونکہ نماز پڑھنے والوں میں

وَالضَّعِيفَ وَ ذَالحَاجَةِ (بخاری) | مریض بھی ہوتے ہیں اور ضعیف بھی اور حاجت مند بھی۔

فوائد و مسائل

۱۔ امام بخاری نے اس حدیث کو صلوٰۃ' ادب اور احکام میں بھی ذکر فرمایا ہے۔ مسلم نے صلوٰۃ میں نسائی نے علم میں اور ابن ماجہ نے محمد بن عبداللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے ۲۔ شکایت کرنے والے کا نام حزم ابن ابی کعب ہے اور نماز پڑھانے والے معاذ ابن جبل تھے۔ لا اکاد ادرک الصلوٰۃ۔ یعنی حزم نے عرض کی کہ معاذ بن جبل اتنی لمبی نماز پڑھاتے ہیں کہ میں نماز کو پا نہیں سکتا۔ حالانکہ ظاہر کہ جب قیام طویل ہوگا تو ہر شخص نماز کو بآسانی پالیتا ہے اس لیے شارحین نے ان جملوں کی متعدد تفسیریں کی ہیں۔ بعض نے کہا ادرک کی جگہ اترک کا لفظ تھا۔ یعنی طویل قیام کی وجہ سے قریب تھا کہ میں نماز کو چھوڑ دوں۔ لیکن یہ تاویل الفاظ حدیث کے موافق نہیں ہے۔ البتہ ابن الزناد و سراج نے جو معنی بیان کئے ہیں وہ خوب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس شخص کو ضعف تھا اور جب امام نے نماز کو طول دیا تو وہ بوجہ ضعف و کمزوری رکوع اور سجدہ نہ کرسکتے تھے یعنی امام کے ساتھ نماز پوری کرنے کے قابل نہ رہے ۳۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غضب کے لہجہ میں فرمایا کہ تم لوگوں کو نفرت دلاتے ہو۔ لہٰذا جب کوئی نماز پڑھائے تو لمبی نہ کرے اور مریض، ضعیف اور حاجتمندوں کی رعایت کرے۔

مسائل حدیث

حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

۱۔ جب کوئی شخص اکیلا نماز پڑھے تو جسقدر اس کی طاقت ہو نماز کو طول دے سکتا ہے لیکن جب وہ امامت کرے تو سنت کے مطابق اس کو ادا کرے اور اتنا طول نہ دے کہ لوگ اکتا جائیں۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ اطالۃ الصلوٰۃ پر تعزیر بالکلام جائز ہے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غضب کا اظہار فرما کر اس فعل سے منع فرمایا ۲۔ جب امور دین میں منکر نظر آئے تو وہاں کا غضب کا اظہار جائز ہے ۳۔ جس سے کوئی خلاف شرع بات صادر ہو تو اس کا نام لے کر بیان کرنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ بتا دینا چاہیئے الا یہ کہ مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ نام لیا جائے تو پھر نام لے کر مسئلہ بیان کرنے میں حرج کیا ہے۔

۹۰۔ عَنْ زَيْدِ ابْنِ خَالِدِنِ الْجُهَنِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَاَلَهُ رَجُلٌ عَنِ اللُّقَطَةِ فَقَالَ اَعْرِفْ وِكَاءَهَا اَوْقَالَ وِعَاءَهَا وَعِفَاصَهَا ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً ثُمَّ اسْتَمْتِعْ بِهَا فَاِنْ جَاءَ رَبُّهَا فَاَدِّهَا اِلَيْهِ قَالَ فَضَالَّةُ الْاِبِلِ فَغَضِبَ حَتّٰى احْمَرَّتْ وَجْنَتَاهُ (اَوْقَالَ احْمَرَّ وَجْهُهُ) فَقَالَ مَالَكَ وَلَهَا مَعَهَا سِقَاءُهَا وَحِذَاءُهَا تَرِدُ الْمَاءَ وَتَرْعَى الشَّجَرَ

زید ابن خالد الجہنی سے روایت ہے ایک شخص نے لقطہ کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ آپ نے فرمایا اس کا بندھن یا اس کا برتن یا تھیلی خوب یاد رکھ اور ایک سال تک اس کی تشہیر کر پھر نفع اٹھا۔ پس اگر اس کا مالک آجائے تو وہ چیز اس کو دیدے۔ اس نے عرض کی گمشدہ اونٹ کسی کو ملے تو اس کا کیا حکم ہے اس پر آپ نے غصہ کا اظہار فرمایا یہاں تک کہ آپ کے دونوں رخسارے یا چہرۂ اقدس سرخ ہوگیا۔ پھر فرمایا تجھے اونٹ سے کیا واسطہ اس کی مشک ہے اس کا موزہ ہے۔ وہ

فَذَرْهَا حَتّٰى يَلْقَاهَا رَبُّهَا قَالَ فَضَالَّةُ الْغَنَمِ قَالَ لَكَ اَوْ لِاَخِيْكَ اَوْ لِلذِّئْبِ

(بخاری)

خود پانی پر جاتا ہے اور درخت چرتا ہے، اونٹ کو اس کے حال پر چھوڑ دے یہاں تک کہ اس کا مالک اس سے مل جائے پھر اس نے عرض کیا اگر گم شدہ بکری کسی کو ملے تو اس کا کیا حکم ہے؟ یا وہ تیری ہے یا تیرے بھائی کی ہے یا پھر بھیڑیے کے لیے ہے۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے لقطہ و ادب میں بھی ذکر کیا۔ مسلم نے قضاء میں۔ ابوداؤد نے لقطہ میں۔ ترمذی و ابن ماجہ نے احکام میں۔ ابوداؤد نے ضوال اور لقطہ میں ذکر فرمایا ۲۔ حضرت خالد صحابی ہیں۔ جہینہ کی طرف منسوب ہیں۔ فتح مکہ کے دن ان کے ہاتھ میں قبیلہ جہینہ کا جھنڈا تھا۔ آپ سے کل اکاشی حدیثیں مروی ہیں۔ امام بخاری نے آپ سے پانچ حدیثیں لی ہیں۔ مدینہ منورہ یا مصر میں بعمر ۸۵ سال ۷۸ھ میں انتقال فرمایا ۳۔ لقطہ کے لغوی معنیٰ کسی چیز کے بغیر طلب اور جستجو کے مل جانے کے ہیں۔ وکاء، اس تاگہ یا رسی کو کہتے ہیں جس سے تھیلی یا رسی کا منہ باندھا جاتا ہے۔ وعاء، اس برتن یا تھیلے کو کہتے ہیں جس میں آدمی اپنا سامان یا زادِ راہ وغیرہ رکھتا ہے۔ عفاص، اس کپڑے کو کہتے ہیں جو تھیلی کے منہ پر رکھ کر باندھا جاتا ہے۔ اعرف وکاءھا۔ معرفۃ سے یہ مطلب یہ ہے کہ وہ چیز جس تھیلی یا برتن وغیرہ میں ملے اس کو خوب اچھی طرح یاد رکھا جائے تاکہ جب اس کا مالک ملے تو اس سے نشانی پوچھی جائے اور ان کی تکذیب یا تصدیق کی جا سکے۔ ثم عرفھا۔ یعنی اٹھانے والے پر ایک سال تک اس کی تشہیر واجب ہے۔ اگر مالک مل جائے تو اس کو دیدیا جائے ورنہ اس کو کام میں لایا جائے۔ فَغَضِبَ یعنی جب سائل نے اونٹ کے متعلق پوچھا تو حضور علیہ السلام نے اس سوال پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور یہ اس لیے کہ انھوں نے اونٹ کو بھی لقطہ میں شمار کر لیا۔ حالانکہ لقطہ اس کو کہتے ہیں جو مالک سے جدا ہو جائے اور خود مالک تک نہ پہنچ سکے اور اگر اس کو وہیں چھوڑ دیا جائے تو اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو برخلاف اونٹ کے کہ اس کے مرنے کا احتمال بہت کم ہے کیونکہ وہ خود چرتا ہے۔ ہفتہ بھر کا پانی یکدم پی لیتا ہے اور بھیڑیے وغیرہ سے بھی محفوظ رہتا ہے اور عموماً مالک اس کو تلاش کر لیتا ہے۔ لہٰذا اونٹ کو پکڑنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اونٹ کے متعلق یہ حکم اسی زمانہ کے ساتھ خاص معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے موجودہ ماحول میں اونٹ اگر بغیر مالک ملے گا تو ممکن ہے اس کی ذات کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ مگر دوسروں کو ضرور نقصان پہنچ جائیگا۔ بلکہ اس زمانہ میں تو لوگ ہاتھی کو بھی نہیں چھوڑتے تو اونٹ کو کون چھوڑے گا۔ لہٰذا اونٹ اگر آوارہ مل جائے تو اس کو بھی اپنی حفاظت میں اس نیت سے لے لینا جائز ہے کہ مالک کا پتہ ملنے پر اس کے سپرد کر دیا جائے۔

لقطہ کے مسائل

۱۔ ہر قسم کی پڑی چیز کا اٹھا لانا جائز ہے۔ مثلاً متاع، جانور بلکہ اونٹ وغیرہ، پڑا ہوا مال کہیں ملا اور یہ خیال ہو کہ میں اس کے مالک کو تلاش کر کے دیدوں گا تو اٹھا لینا مستحب ہے اور اگر اندیشہ ہو کہ شاید میں خود ہی رکھ لوں اور مالک کو تلاش نہ کر سکوں تو چھوڑ دینا بہتر ہے اور اگر ظنِ غالب ہو کہ مالک کو نہ دوں گا تو اٹھانا ناجائز ہے اور پڑا ہوا مال اپنے لیے اٹھانا حرام ہے۔ اگر یہ ظن غالب ہو کہ اگر نہ اٹھاؤں گا تو یہ چیز ضائع ہو جائے گی تو اٹھا لینا

ضروری ہے ۲۔ اس حدیث میں آیا کہ لقطہ کی ایک سال تک تشہیر کی جائے۔ اٹھانے والے پر تشہیر کرنا لازم ہے یعنی بازاروں اور شارع عام میں اور مساجد میں اور آج کے زمانہ میں بہترین ذریعہ ریڈیو اور اخبارات ہیں۔ ان کے ذریعے تشہیر کرایے۔ تشہیر کی مدت میں اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک اتنے زمانہ تک تشہیر کرے کہ ظن غالب ہو جائے کہ مالک اب تلاش نہ کرتا ہوگا۔

۳۔ لقطہ اٹھانے والے کے ہاتھ میں امانت ہوتا ہے۔ یعنی اگر ملتقط نے اس کی اپنے مال کی طرح حفاظت کی مگر اس کے باوجود تلف ہو گیا تو اس پر تاوان نہ ہوگا مگر اس میں یہ شرط ہے کہ اٹھاتے وقت کسی کو گواہ بنا لیا ہو اور اگر گواہ نہ کیا تو تلف ہونے کی صورت میں تاوان دینا پڑے گا۔ ہاں اگر وہاں کوئی نہ ہو تو یہ اندیشہ ہو کہ گواہ بنائے گا تو ظالم چھین لے گا اور مالک تک نہ پہنچائے گا تو اس صورت میں تلف ہو جانے پر ضمان نہیں ہے۔

۴۔ تشہیر کی مدت پوری ہو جانے کے بعد اٹھانے والے کو اختیار ہے کہ یا تو لقطہ کی خود حفاظت کرے تا آنکہ اس کا مالک مل جائے یا کسی غریب و مسکین کو دیدے یا اگر خود غریب و نادار ہے تو اپنے کام میں لے آئے لیکن ان سب صورتوں میں جب بھی مالک آ گیا اس کو اختیار ہے کہ یا تو صدقہ کو جائز کر دے یا اگر وہ چیز بعینہ موجود ہے تو اس کو لے لے اور اگر ہلاک ہو گئی ہے تو تاوان لے لے۔

۵۔ امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک غریب و امیر دونوں کے لیے جائز ہے کہ تشہیر کی مدت پوری ہو جانے پر خود اپنے استعمال میں لے آئے۔ مگر حنفیہ کے ہاں دولت مند کو لقطہ اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے۔ مفصل مسائل کے لیے بہار شریعت حصہ دہم کا مطالعہ مفید ہوگا۔

۹۱ - عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سُئِلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ اَشْیَاءَ کَرِھَھَا فَلَمَّا اُکْثِرَ عَلَیْہِ غَضِبَ ثُمَّ قَالَ اَیُّھَا النَّاسُ سَلُوْنِیْ عَمَّا شِئْتُمْ فَقَالَ رَجُلٌ مَنْ اَبِیْ قَالَ اَبُوْکَ حُذَافَۃُ فَقَامَ اٰخَرُ فَقَالَ مَنْ اَبِیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَبُوْکَ سَالِمٌ مَوْلٰی شَیْبَۃَ فَلَمَّا رَاٰی عُمَرُ مَا فِیْ وَجْھِہٖ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّا نَتُوْبُ اِلَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چند امور کے متعلق سوال کیا گیا جن کو آپ کے ناپسند فرمایا۔ جب سوالات کی کثرت ہوگئی تو آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور لوگوں سے کہا مجھ سے جس چیز کے متعلق چاہو پوچھ لو۔ ایک صاحب کھڑے ہوئے عرض کی۔ میرا باپ کون ہے۔ فرمایا تیرا باپ حذافہ ہے ایک اور صاحب کھڑے ہوئے پوچھا میرا باپ کون ہے؟ فرمایا تیرا باپ سالم ہے مولیٰ شیبہ کا۔ پس جب حضرت عمر نے حضور علیہ السلام کی ناپسندیدگی کو دیکھا تو عرض کی یا رسول اللہ ہم اللہ کے حضور توبہ کرتے ہیں۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے کتاب الاعتصام میں باب مایکرہ من کثرۃ السوال اور فضائل میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ ان تینوں حدیثوں کا باب سے تعلق یہی ہے کہ تعلیم و تعلم و وعظ و نصیحت میں غضب

کا اظہار حسبِ موقع و حال جائز ہے ۳۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگ ایسے سوالات کر رہے تھے۔ جن کا تعلق فرضِ نبوت سے نہ تھا۔ اس پر آپ نے اظہارِ ناراضگی فرمایا کہ ایسے سوالات جو غیر ضروری ہیں وہ نہ کیے جائیں لیکن جب سوالات کی کثرت ہو گئی تو آپ نے فرمایا "مجھ سے جو چاہو پوچھ لو" ـــــ اس جملہ سے یہ بتانا مقصود تھا کہ اللہ تعالٰی نے مجھے ہر چیز کا علم عطا فرمایا ہے۔ میرا سینہ علم و معرفت کا خزینہ ہے۔ اگر تم ایسے امور سے متعلق سوال کرو گے جن کے جواب کی مجھ پر ذمہ داری نہیں ہے تو میں ان کے جواب بھی دینے کی قدرت رکھتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے اس کا عملی ثبوت اسی وقت دیدیا۔ جن صاحب نے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا تھا کہ میرا باپ کون ہے؟ تو آپ نے اس کے باپ کا نام بتا دیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر چیز کے عالم ہیں

۴۔ چنانچہ سلونی عما شئتم کہ مجھ سے جو چاہو پوچھو اس میں کوئی قید نہیں ہے بلکہ عموم و اطلاق ہے جس کا منشاء و مفہوم یہ ہے کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کی طاقت رکھتا ہوں خواہ تمہارا وہ سوال دین سے متعلق ہو یا دنیا سے، غیب سے اس کا تعلق ہو یا شہادت سے (سبحان اللہ) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عالم کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ سائل کے بیکار اور فضول سوالات کا بھی جواب دے جیسا کہ آج کل رواج ہو گیا ہے کہ لوگ دین کے ضروری مسائل تو پوچھتے نہیں۔ سوال کرتے ہیں تو یہ کہ حضرت عیسٰی نے کتنے مُردے زندہ کیے تھے؟ اور اصحابِ کہف کے کُتّے کا رنگ اور عمر کتنی تھی؟ حضرت موسٰی کے عصا کی لمبائی کتنی تھی؟ آج کل عوام اسی قسم کے سوالات کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ایسے بیکار سوالات کے جوابات دینے کی عالم پر ذمہ داری نہیں ہے۔

۵۔ اس حدیث پر غور کیجیے کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالٰی عنہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کس قدر ادب و احترام کرتے تھے کہ مزاجِ نبوی کے خلاف امر کو دیکھ کر نہ صرف ان کو روک دیا بلکہ اس فعل پر اللہ تعالٰی کے حضور توبہ کرنے کی تلقین کی۔

بَابُ مَنْ بَرَكَ رُكْبَتَيْهِ عِنْدَ الْإِمَامِ اَوِ الْمُحَدِّثِ

باب محدّث یا امام کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھنا

یعنی آدابِ متعلّم سے یہ ہے کہ وہ استاذ کے سامنے ادب و احترام سے بیٹھے جیسا کہ دربارِ نبوت صحابہ کرام بیٹھا کرتے تھے۔ اس باب میں امام نے وہی حدیث ذکر کی ہے جو ابھی ابھی مع تفہیم کے ہم پیش کر چکے ہیں۔ البتہ اس میں یہ مضمون اور زیادہ ہے جو عنوان کے متعلق ہے کہ جب عبداللہ نے یہ سوال کیا کہ میرا باپ کون ہے؟ تو حضور علیہ السلام نے جواب دیا اور متعدد بار یہ فرماتے رہے سَلُونِی ـــــ مجھ سے پوچھ لو، مجھ سے پوچھ لو۔

۹۲ ـ فَبَرَكَ عُمَرُ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ فَقَالَ رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَبِيًّا

تو حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے زانووں پر رکھے (یعنی دو زانو ہو کر نہایت ادب و احترام سے دربارِ نبوت میں بیٹھے) اور عرض کی ہم اللہ

فَسَکَتَ (بخاری)

کے رب ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر راضی ہوئے (حضرت عمر نے یہ جملے عرض کیے تو تب جا کر) حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہوئے۔

۲۔ احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی بھی کوئی شخص دربارِ نبوی میں حضور اکرم کے مزاجِ اقدس کے خلاف کوئی بات کرتا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اظہارِ ناراضگی فرماتے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ مذکورہ بالا جملے عرض کر دیتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان جملوں پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی ختم ہو جاتی تھی۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ دربارِ نبوی میں حضرت فاروق اعظم کا ایک خاص مقام تھا۔ وہ مزاج نبوت کو سمجھتے تھے اور آدابِ دربارِ نبوی سے لوگوں کو آگاہ کرتے تھے۔ پھر لطف یہ کہ حضور علیہ السلام چاہے کیسے کچھ برہم کیوں نہ ہوں فاروق اعظم کے یہ عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے جملے مزاج نبوت میں سکون پیدا کر دیتے تھے۔

بَابُ مَنْ اَعَادَ الْحَدِیْثَ ثَلٰثًا لِیُفْهَمَ عَنْهُ

باب ایک بات کو تین بار کہنا تاکہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں

گزشتہ باب میں سائل اور متعلم کی شان کا بیان تھا کہ اس کو استاد کے سامنے ادب و احترام سے بیٹھنا چاہیے۔ یہ باب شانِ معلم سے متعلق ہے کیونکہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بات کئی بار اس لیے دہراتے تھے کہ سامعین و متعلمین آپ کے کلام کو اچھی طرح سن لیں اور آپ کی باتیں خوب اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔

فَقَالَ اَلَا وَ قَوْلُ الزُّوْرِ فَمَا زَالَ یُکَرِّرُهَا (بخاری)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا سن لو جھوٹ (بولنا) اور کئی بار آپ نے یہ کلمہ دہرایا۔

یہ حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس کو امام نے کتاب الشہادات میں مکمل لکھا ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کیا میں تمہیں سنگین قسم کے گناہوں سے مطلع نہ کروں (تین بار فرمایا) صحابہ نے عرض کی فرمایئے تو فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا۔ والدین کی نافرمانی کرنا۔ پھر آپ تکیہ لگا کر بیٹھ گئے اور تین بار فرمایا۔ خبردار جھوٹی گواہی (تین بار فرمایا)

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هَلْ بَلَّغْتُ ثَلٰثًا (بخاری)

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا۔ کیا میں نے تم کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا۔

۹۳۔ اَنَّهُ کَانَ نَکَلَّمَ بِکَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلٰثًا حَتّٰی تُفْهَمَ عَنْهُ وَ اِذَا اَتٰی عَلٰی قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَیْهِمْ سَلَّمَ عَلَیْهِمْ ثَلٰثًا (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام کرتے تو تین بار کرتے اور جب کوئی بات کرتے تو تین بار اس کو دہراتے (تاکہ لوگ خوب اچھی طرح سمجھ لیں)۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمہ نے استیذان میں بھی ذکر کیا ہے اور ترمذی نے استیذان و مناقب میں ذکر کیا ہے۔ تین بار سلام کرنا یہ حضور علیہ السلام کا ہمیشہ کا قاعدہ نہ تھا۔ ممکن ہے آپ نے تین بار سلام اس وقت کیا ہو جب کہ لوگوں نے سنا نہ ہو۔ علامہ قسطلانی نے اس کی توجیہہ یہ کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

جب کسی قوم کے پاس جاتے تو سلام کرتے۔ یہ استیذان کا سلام ہوا۔ پھر جب اندر داخل ہوتے تو سلام کرتے یہ تحیت کا سلام ہوا۔ پھر جب لوٹتے تو سلام کہتے یہ رخصت کا سلام ہوا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ تین مرتبہ سلام کرنا ضروری نہیں ہے اور اگر حضور علیہ السلام ہر ایک کو تین مرتبہ سلام کیا کرتے تو امت میں یہی رائج ہوتا ۲۔ بعض اوقات حضور علیہ السلام جب کوئی بات کرتے تو اس کو تین بار ارشاد فرماتے تھے۔ تاکہ وہ بات لوگوں کے خوب ذہن نشین ہو جائے ۳۔ ابن منیر نے کہا کہ اس ترجمہ باب، سے امام بخاری نے یہ ثابت کیا ہے کہ جس نے حدیث کا دوبارہ بیان کرنا مکروہ کہا ہے۔ اس کا قول غلط ہے۔ اسی طرح طالب کی درخواست پر دوبارہ بیان کرنے کو مکروہ سمجھنا یا اس کو کند ذہن قرار دینا بھی غلط ہے کیونکہ طبائع اور اذہان بھی مختلف ہوتے ہیں اس سے واضح ہوا کہ عالم اگر ضرورت محسوس کرے تو کسی مسئلہ کو بار بار بیان کر سکتا ہے۔ بلکہ ایسا کرنا مسنون ہے اور جب کوئی شخص دوبارہ مسئلہ سننا چاہے تو عالم کو عذر نہ ہونا چاہیے اور دوبارہ مسئلہ بتا دینا چاہیئے ۵۔ اس باب میں امام نے بالکل اسی مضمون کی حدیث اور ذکر کی ہے اور ایک اور حدیث بھی لکھی ہے جو (باب من رفع صوته بالعلم) میں مع تفہیم و ترجمانی کے گزر چکی ہے۔ اس لیے ہم نے ان دونوں حدیثوں کو چھوڑ دیا ہے ۵۔ تین بار سلام کرنے کی ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ جب حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو تین بار سلام کرتے جیسے آج کل بھی اس کا رواج ہے کہ جب کسی مجمع میں آدمی پہنچتا ہے تو پہلے ابتدا میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کرتا ہے۔ پھر درمیان میں پہنچ کر اور پھر آخر میں پہنچتا ہے تو سلام کرتا ہے (واللہ اعلم)

بَابُ تَعْلِيْمِ الرَّجُلِ اَمَتَهٗ وَاَهْلَهٗ

باب اپنی لونڈی اور گھر والوں کو علم دین سکھانے کے بارے میں

۹۶۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلٰثَةٌ لَّهُمْ اَجْرَانِ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ وَّالْعَبْدُ الْمَمْلُوْكُ اِذَا اَدّٰى حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوَالِيْهِ وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَةٌ يَّطَاُهَا فَاَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ تَادِيْبَهَا وَعَلَّمَهَا فَاَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا ثُمَّ اَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهٗ اَجْرَانِ ثُمَّ قَالَ عَامِرٌ اَعْطَيْنٰكَهَا بِغَيْرِ شَيْءٍ قَدْ كَانَ يُرْكَبُ فِيْمَا دُوْنَهَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ

(بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین آدمیوں کو دوہرا ثواب ملے گا۔ ایک اہل کتاب سے جو ایمان لایا۔ اپنے نبی پر اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی۔ دوم، وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرے اور اپنے مالکوں کا بھی۔ سوم وہ جس کے قبضہ میں لونڈی ہے وہ اس سے صحبت کرتا ہے۔ پھر اس کو بہترین ادب سکھایا اور بہترین تعلیم دی۔ پھر اس کو آزاد کیا۔ پھر اس کے ساتھ نکاح کر لیا تو اس کے لیے دوہرا ثواب ہے۔ عامر نے کہا ہم نے تم کو یہ حدیث بلاعوض دیدی اور ایک زمانہ وہ تھا کہ اس سے کم تر کی حدیث کے لیے لوگ مدینہ تک کا سفر کرتے تھے۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے عتق، جہاد، احادیث انبیاء اور نکاح میں بھی ذکر کیا ہے اور ترمذی و نسائی اور ابن ماجہ نے بھی کتاب النکاح میں درج ۲۔ دو اجر کا استحقاق صرف ان تین قسم کے

افراد کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ وہ لوگ بھی دوہرے ثواب کے مستحق ہوں گے جو نماز بھی پڑھیں اور روزہ بھی رکھیں یا وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرے اور اپنے والدین کی خدمت بھی کرے تو نماز کا ثواب علیحدہ ہے۔ لہٰذا نماز روزہ کا پابند بھی دو اجر کا مستحق ہوگا اور جمہور کا مذہب بھی یہی ہے کہ کسی چیز پر نص کر دینا اس کے سوا کی نفی نہیں کرتا واللہُ واسعٌ علیم۔ ۳۔ اس حدیث میں فرمایا کہ جس کی لونڈی ہو وہ اس سے صحبت بھی کرتا ہو اور اس کی تعلیم و تربیت باحسن وجوہ کی ہو۔ پھر اس سے نکاح کر لیا تو ایسا شخص دو اجر کا مستحق ہے۔ یہ بات تو بالکل ظاہر ہے کہ لونڈی نکاح میں لینا ایک نیکی ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت کرنا دوسری نیکی ہے لیکن یہ جو فرمایا کہ اس سے صحبت بھی کرتا تھا۔ یہ جملہ یا تو اس امر کے اظہار کے لیے ہے کہ لونڈی سے وطی کرنا جائز ہے جیسا کہ بعض شارحین نے لکھا ہے لیکن میرے خیال میں اس جملہ سے مقصود اس شخص کے خلوص اور نیک نیتی کا اظہار ہے اور یہ بالکل واضح بات ہے کہ لونڈی اس کی ملک میں ہے۔ مالک کو اس میں تصرف کا حق حاصل ہے۔ حتیٰ کہ اس کو بغیر نکاح کے صحبت کرنی بھی جائز ہے اور وہ صحبت کر بھی رہا ہے لیکن اس کے باوجود مالک اپنی لونڈی سے نکاح کرتا ہے تو اس کا یہ عمل اس کے خلوص وللّٰہیت اور نیک نیتی پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے لونڈی سے جو نکاح کیا ہے محض ثواب کی خاطر کیا ہے۔ کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں کیا ہے کیونکہ دنیاوی غرضیں تو اپنی لونڈی سے نکاح کے بغیر بھی پوری کر سکتا تھا بلکہ پوری کر رہا تھا۔ فافہم۔

اہلِ کتاب سے کون مراد ہیں

حدیث زیرِ بحث میں رجل من اھل الکتاب کے الفاظ آئے ہیں یعنی اہلِ کتاب سے جو شخص اپنے نبی پر ایمان لایا تو یہ اس کے لیے دو عمل ہوئے۔ لہٰذا یہ شخص دو اجروں کا مستحق ہوگا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اہلِ کتاب سے کون مراد ہیں ـــــ اگر یہودی مراد لیے جائیں تو یہ بھی مشکل ہے کیونکہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوّت کا انکار کر کے کافر ہو گئے تھے اور کافر کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہودیوں سے جو لوگ حضور علیہ السلام پر ایمان لائے تو وہ دو اجر کے مستحق نہیں ہو سکتے ـــــ اور اگر اہلِ کتاب سے نصاریٰ کو مراد لیا جائے جیسا کہ حدیث بخاری میں یہ الفاظ آئے ہیں رجل اٰمن بعیسیٰ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب سے صرف نصاریٰ مراد ہیں لیکن اس صورت میں ایک اشکال اور پیدا ہوتا ہے کہ یہ حدیث قرآنِ کریم کی آیت سے مستفاد ہے۔ اولٰئك یؤتون اجرھم مرّتین اور اس پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھ جو حضور علیہ السلام پر ایمان لائے ان کے حق میں نازل ہوئی جو پہلے یہودی تھے۔

قرآنِ حکیم نے اعلان کیا کہ ان کے لیے دو اجر ہیں۔ ایک اپنے نبی پر ایمان لانے کا اور دوسرا اجر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب سے یہود و نصاریٰ دونوں ہی مراد ہیں اور بات بھی صحیح ہے کیونکہ اس مسئلہ کے متعلق صریح حدیث بھی ملتی ہے۔ نسائی میں آیت من لم یحکم بما انزل اللہ کی تفسیر میں حدیثِ طویل وارد ہوئی ہے اور یؤتکم کفلین من رحمتہ کے تحت یہ الفاظ آئے ہیں۔

اجرین بایمانھم بعیسٰی و بالتوراۃ و بالانجیل و بایمانھم بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم (نسائی جلد۲ صفحہ ۳۰۷)

یہ لوگ دو اجر کے مستحق ہیں۔ توریت و انجیل پر ایمان لانے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے۔

اور اہلِ کتاب میں یہود کو شامل کرنے کی صورت میں جو اشکال پیدا ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے جناب عیسٰی علیہ السلام کا انکار کیا اور ان کے اعمال حبط ہوئے وہ، وہ لوگ تھے جن کے لیے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی اور جن کو حضرت عیسٰی نے اپنی شریعت کی طرف دعوت دی تھی (یعنی بنی اسرائیل) تو جن کی طرف حضرت عیسٰی علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور آپ نے انہیں دعوت توحید و شریعت دی وہ یہود شام تھے اور شام کے یہودیوں میں سے جو بھی حضور علیہ السلام پر ایمان لایا وہ ایک اجر کا مستحق ہوگا کیونکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا انکار کرکے وہ کافر ہوگئے اور حضرت موسٰی علیہ السلام پر ایمان لانے کا اجر بسبب کفر کے برباد ہوگیا۔

لیکن یہودِ مدینہ یہ وہ لوگ تھے جن کو حضرت عیسٰی علیہ السلام کی دعوت پہنچی ہی نہیں۔ یہ تو شام سے بھاگ کر مدینہ میں آباد ہوگئے تھے۔ جیسا کہ تاریخ میں مذکور ہے اور ان کے مدینہ میں آباد ہو جانے کے دو سال بعد حضرت عیسٰی علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی۔ چنانچہ مدینہ شریف کی معتبر تاریخ وفا میں لکھا ہے کہ مدینہ کے نواح میں ایک پتھر پایا گیا۔ جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

ھٰذا قبر رسول رسول عیسٰی علیہ السلام جاءَ للتبلیغ فلم یقدر لہ الوصول الیھم

یہ قبر ہے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نائب[1] کی جس کو حضرت عیسٰی نے تبلیغ کے لیے بھیجا تھا مگر وہ (مدینہ کے یہود تک) پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔

اس لیے (یہودِ مدینہ) جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ جو یہودیت پر قائم رہے اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے۔ وہ دو اجر کے مستحق ہوں گے کیونکہ یہودِ مدینہ کو جناب عیسٰی علیہ السلام کی دعوت نہیں پہنچی۔ لہٰذا وہ یہودیت پر قائم رہے اور جناب موسٰی علیہ السلام کی نبوت تسلیم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آیا۔ ان میں سے ایک طائفہ نے جن میں حضرت عبداللہ بن سلام بھی تھے اسلام کو قبول کیا۔ انہیں حضرات کے متعلق قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِہٖ ھُمْ بِہٖ یُؤْمِنُوْنَ (الی قولہ)
اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَّرَّتَیْنِ (عینی جلد ا صفحہ ۵۱۵)

[1] یہ عبارت وفاکی ہے اور تاریخ طبری میں بھی یہ عبارت موجود ہے مگر وہاں کاتب کی غلطی سے رسولُ رسول عیسٰی کے الفاظ کی جگہ رسولِ عیسٰی کا لفظ درج ہوگیا۔ مرزائی طبری کے اسی غلط حوالہ کو لے کر عوام کو دھوکہ دیتے ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی قبر تو مدینہ میں بھی ہے حالانکہ کتب تواریخ میں جس قبر کا ذکر ہے وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی نہیں ہے بلکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حواری کی ہے جس کو آپ نے مدینہ شریف کی طرف تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا اور وہ فرض تبلیغ ادا کرنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔

رہا یہ سوال کہ حضرت عبد اللہ بن سلام نے شریعتِ عیسٰی علیہ السلام کو قبول کیوں نہیں کیا اور اپنے سابقہ دینِ یہودیت پر کیوں قائم رہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر عیسٰی علیہ السلام کی دعوت ان کو پہنچ جاتی۔ تو ان کے لیے اس کا قبول کرنا واجب ہوتا۔ مگر حال یہ ہے کہ یہودِ اہلِ مدینہ کو دعوت پہنچی ہی نہیں اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے وہ حواری جنہیں آپ نے تبلیغ کے لیے مدینہ کی طرف روانہ کیا تھا وہ تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ ایسی صورت حضرت عبد اللہ اور دیگر یہودِ مدینہ پر شریعت عیسوی کو قبول کرنا واجب نہ تھا۔ اس لیے یہ لوگ اپنے دینِ یہودیت پر قائم رہے تا آنکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا اور انھوں نے حضور علیہ السلام کی غلامی کو اختیار کر لیا —— البتہ انھیں ظہورِ عیسٰی علیہ السلام کی اطلاع ملی اور حضرت عبد اللہ بن سلام کی سلامتیٔ فطرت، حق گوئی و حق کوشی کو دیکھتے ہوئے یہ یقین ہوتا ہے کہ ظہور عیسوی کی خبر پا کر ضرور انھوں نے نبوتِ عیسٰی علیہ السلام کی تصدیق کی ہوگی۔ بلکہ مدینہ کا ہر یہودی جو صحیح معنوں میں دینِ یہودیت پر قائم ہے اس نے ضرور نبوتِ عیسٰی علیہ السلام کی تصدیق کی ہوگی۔ غرضکہ ان دلائل کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب میں یہود و نصاریٰ دونوں شامل ہیں اور مراد ان سے مومنین اہلِ کتاب ہی ہیں۔

بَابُ عِظَةِ الْإِمَامِ النِّسَآءَ وَتَعْلِيْمِهِنَّ

باب امام کا عورتوں کو وعظ کہنا اور ان کو دین کی تعلیم دینا

۹۷- اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ وَمَعَهُ بِلَالٌ فَظَنَّ اَنَّهُ لَمْ يُسْمِعِ النِّسَآءَ فَوَعَظَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ فَجَعَلَتِ الْمَرْاَةُ تُلْقِي الْقُرْطَ وَالْخَاتَمَ وَبِلَالٌ يَاْخُذُ فِيْ طَرَفِ ثَوْبِهٖ (بخاری)

حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام (مردوں کی مجلس سے) باہر تشریف لائے۔ آپ کے ساتھ بلال تھے۔ آپ نے خیال کیا کہ عورتوں تک میری آواز نہیں پہنچی۔ آپ نے عورتوں کو وعظ و نصیحت فرمائی اور صدقہ و خیرات کا حکم دیا تو عورتوں نے اپنی بالیاں اور انگوٹھیاں دیں جن کو بلال اپنے کرتے کے دامن میں لے رہے تھے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام مسلم، ابو داؤد، ابن ماجہ نے کتاب الصلوٰۃ میں ذکر کیا اور نسائی نے کتاب الصلوٰۃ اور کتاب العلم میں ذکر فرمایا ہے۔

صدقہ صدقہ وہ مال ہے جو آدمی ثواب کی نیت سے کرتا ہے۔ یہ لفظ فرض اور نفل دونوں میں بولا جاتا ہے لیکن یہاں اس سے مراد محض نفلی صدقہ ہے۔ **قُرْط** ہر اس زیور کو کہتے ہیں جو عورتیں کان کی لو میں پہنتی ہیں خواہ وہ

---

[۱] حضرت عیسٰی علیہ السلام نے یہودِ مدینہ کو تبلیغ کے لیے جو اپنا حواری بھیجا تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی بعثت حضور علیہ السلام کی طرح عام تھی؛ کیونکہ عیسٰی علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے اور یہودِ مدینہ بنی اسرائیل ہی تھے جو شام سے بھاگ کر مدینہ میں آباد ہو گئے تھے اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کا رسولِ بنی اسرائیل ہونا نصِ قرآن پاک سے ثابت ہے۔ اسلیے آپ نے یہودِ مدینہ کو جو دعوت پہنچانا چاہی اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ کی بعثت عام تھی بلکہ یہ تھی کہ یہود بنی اسرائیل سے تھے فافہم

کسی چیز کا بنا ہوا ہو۔ خَاتَم انگوٹھی کو کہتے ہیں۔ خیتام۔ خاتام۔ خاتم سب کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔

حدیثِ ہٰذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ عورتوں کو وعظ و نصیحت کرنا، دین کی باتیں بتانا، آخرت کو یاد دلانا اور صدقہ و خیرات کی ترغیب دینا مستحب ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ وعظ و موعوظ (سامعین) کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہوں یعنی پردہ وغیرہ کا انتظام ہو اور وہاں کسی غیر شرعی فعل کے رونما ہونے کا خدشہ نہ ہو ۲۔ نفلی صدقہ کے لیے ایجاب و قبول کی ضرورت نہیں ہے۔ ۳۔ صدقاتِ نافلہ کا مصرف امام کی رائے ہے جہاں وہ مناسب خیال کرے خرچ کرے ۴۔ اس حدیثِ صحیح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کو اپنے ذاتی مال میں سے شوہر کی اجازت کے بغیر صدقہ و خیرات کرنا جائز ہے لیکن نسائی و ابنِ ماجہ کی حدیث میں ہے کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عورت کو اپنے شوہر کی بلا اجازت صدقہ دینا جائز نہیں تو اس کا جواب یہ ہے اوّل تو یہ حدیث ثابت نہیں۔ ثانیاً۔ احادیثِ صحیحہ کے مقابل اس کی وہ حیثیت نہیں ثالثاً۔ اگر اس حدیث کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ شوہر سے اجازت لے کر صدقہ و خیرات کرے یعنی شوہر سے اجازت لینا بیوی کے لیے اولیٰ و الیق ہے فرض یا واجب نہیں ہے رابعاً۔ یہ کہ حدیث ابوداؤد کا تعلق صرف مالِ زوج سے ہے۔ یعنی مطلبِ حدیث یہ ہو کہ بیوی کو شوہر کے ذاتی مال سے اس کی اجازت کے بغیر صدقہ و خیرات کرنا حلال نہیں ہے تو اس توجیہ پر دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔ فافہم

بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ حدیثِ مذکورہ کا مطلب ہی یہ ہے کہ عورت کو اپنے خاوند کی ملک میں بلا اجازت تصرف کرنا جائز نہیں کیونکہ عورت کا اپنی ملک میں بلا اجازت تصرف کرنا اور اس کا جائز ہونا تو قرآنِ پاک کی مندرجہ ذیل نصوص سے ثابت ہے:۔

۱۔ فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّا اَنْ يَّعْفُوْنَ ۲۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا

بَابُ الْحِرْصِ عَلَى الْحَدِيْثِ

باب حدیث سننے پر حرص کرنے کے بیان میں

۹۸۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ ظَنَنْتُ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ اَنْ لَّا يَسْئَلَنِيْ عَنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ اَحَدٌ اَوَّلُ مِنْكَ لِمَا رَاَيْتُ مِنْ حِرْصِكَ عَلَى الْحَدِيْثِ اَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قیامت کے روز کون شخص آپ کی شفاعت سے سعادتمند ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے ابوہریرہ مجھے معلوم تھا کہ مجھ سے اس بات کو تجھ سے پہلے کوئی نہ پوچھے گا کیونکہ میں دیکھ چکا ہوں تیری حرص کو حدیث سننے پر۔ قیامت کے دن میری شفاعت سے وہ سعادتمند ہوگا جس نے صدقِ دل کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہا ہو (راوی کو شک ہے) کہ

اِلَّا اللّٰہُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِہٖ اَوْ نَفْسِہٖ | لفظ قلب ارشاد فرمایا یا نفس کا

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے باب صفۃ الجنۃ میں اور نسائی نے علم میں ذکر کیا ہے ۲۔ سعادۃ۔ نحوست اور شقاوت کی ضد ہے۔ جیسے عرب بولتے ہیں۔ سعد الرجل (فھو سعید) یہاں اسعد یا تو بمعنی سعید ہے یا اسعد کو اپنے حقیقی معنیٰ پر رکھا جائے تو اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور اب معنیٰ یہ ہوں گے کہ اخلاص ورع و تقویٰ کے لحاظ سے شفاعت سے مشرف ہونے والوں کے لیے درجے ہوں گے اور مومن مخلص کی سعادت زیادہ ہوگی ۳۔ علامہ حافظ ابن حجر علیہ الرحمۃ نے حدیث ہٰذا کی شرح میں لکھا ہے کہ کثیر افراد شفاعت سے سعادتمند ہوں گے۔ لیکن مومن مخلص اسعد الناس ہوگا کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت مختلف امور پر مشتمل ہوگی۔ یعنی

۱۔ آپ قیامت کے دن کی شدت و تکلیف سے نجات دلانے کے لیے شفاعت فرمائیں گے ۲۔ بعض مومنوں کو جہنم سے نکالے جانے کے لیے شفاعت فرمائیں گے ۳۔ بعض کو جہنم سے بچانے کے لیے شفاعت فرمائیں گے ۴۔ بعض کے لیے جنت میں بلا حساب و کتاب داخل ہونے کے لیے شفاعت فرمائیں گے ۵۔ بعض کے لیے جنت میں درجہ کی بلندی کے لیے شفاعت فرمائیں گے ۶۔ حتیٰ کہ بعض کافروں کے لیے تخفیف عذاب کے لیے بارگاہِ خداوندی میں عرض کریں گے۔ جیسا کہ ابوطالب کے حق میں حدیث وارد ہوئی ہے۔ (ترجمہ من و عن از فتح الباری العلامہ ابن حجر علیہ الرحمۃ)

حدیث ہٰذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دینی معلومات حاصل کرنے کا بہت شوق رکھتے تھے اور عام صحابہ کرام بھی حدیث نبویہ کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا دینی فرض سمجھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک دین کا ماخذ و منبع کتاب و سنت ہی تھا۔ ۲۔ شفاعت حق ہے حضور علیہ السلام کو اذن شفاعت مل چکا ہے ۳۔ شفاعت صرف ان افراد کی ہوگی جو مومن ہوں گے خواہ کیسے ہی گنہگار کیوں نہ ہوں۔ کافر و مشرک کے لیے شفاعت نہیں ہے ۴۔ علامہ قاضی عیاض علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ مسئلہ شفاعت حق ہے عقلاً و وجوباً ــــــ اور اس باب میں جو احادیث آئی ہیں وہ مجموعی طور پر تواتر کو پہنچ جاتی ہیں اور سلف نے اس پر اجماع کیا ہے اور مذہب اہلسنت بھی ہے کہ شفاعت حق ہے۔ البتہ خوارج اور بعض معتزلہ شفاعت کے منکر ہیں (عینی ج ۱ ص ۵۲۵)

بَابُ كَيْفَ يُقْبَضُ الْعِلْمُ

باب علم دین کے اُٹھ جانے کے بیان میں

وَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ اِلٰى اَبِيْ بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ اُنْظُرْ مَا كَانَ مِنْ حَدِيْثِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاكْتُبْهُ فَاِنِّيْ خِفْتُ دُرُوْسَ الْعِلْمِ وَ ذَهَابَ الْعُلَمَآءِ وَلَا تَقْبَلْ اِلَّا حَدِيْثَ النَّبِيِّ وَلْيُفْشُوا الْعِلْمَ وَلْيَجْلِسُوْا حَتّٰى يُعَلَّمَ فَاِنَّ

حضرت عمر بن عبد العزیز نے ابی بکر ابن حزم کو کہا کہ جو حدیث نبوی تم پاؤ اس کو لکھو۔ کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں علم مٹ نہ جائے اور عالم دین وفات پا جائیں اور حدیث نبوی کے سوا کسی کی بات قبول نہ کرو اور حدیث نبوی کی اشاعت کرو اور علم کی تبلیغ کرو اور علم کی تعلیم کے لیے مجالس قائم کرو۔ علم نہیں اُٹھتا جب تک اس کو چھپایا

اَلْعِلْمَ لَا یَهْلِكُ حَتّٰی یَكُوْنَ سِرًّا
(بخاری)

نہیں جاتا (یعنی جب علم دین کی تبلیغ و اشاعت نہ کی جائے اور اس کو سینہ میں بند رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ یہ علم کی ہلاکت ہے۔

فوائد و مسائل ۱۔حضرت عمر بن عبدالعزیز کا شمار خلفائے راشدین میں کیا گیا ہے۔ یعنی آپ کی خلافت و حکومت، آپ کا ورع و تقویٰ، دیانت اور عدالت عہد خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم کی نظیر تھا۔ آپ نے حضرت ابوبکر بن حزم جو آپ کی طرف سے مدینہ منورہ میں حاکم و قاضی تھے ان کو حکم دیا تھا کہ احادیث نبویہ کو جمع کریں اور کتابی شکل میں لے آئیں ۲۔ مقدمہ میں ہم تفصیل کے ساتھ حدیث کی جمع و تدوین پر بحث کر چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ حدیث کی جمع و تدوین اور کتابت کا کام حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی جناب مقدس میں شروع ہو چکا تھا اور اس کے بعد ہر دور میں صحابہ و تابعین و تبع تابعین نے علم حدیث کی حفاظت کی ہے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی سعی کرتے رہے ہیں۔

۹۹۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهٗ مِنَ الْعِبَادِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰى اِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اِتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوْسًا جُهَّالًا فَسُئِلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا

عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا۔ اللہ تعالیٰ علم دین کو یکدم نہیں اٹھائے گا۔ لیکن علم دین کا اُٹھنا وفات علمارِ دین کی وجہ سے ہوگا۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم دین نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنائیں گے۔ پس ان سے مسائل پوچھے جائیں گے وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے تو خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ (بخاری)

فوائد و مسائل ۱۔اس حدیث کو امام نے کتاب الاعتصام میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے قدر میں، ترمذی نے علم میں اور ابن ماجہ نے سنن میں اور نسائی نے علم میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علم دین کو اس طرح نہیں اٹھائیگا کہ لوگوں کے دل سے وہ محو ہو جائے یا آسمان پر یکدم اٹھا لیا جائے بلکہ علم دین کے اُٹھنے کی صورت یہ ہوگی کہ علم دین کے حامل علمار انتقال کر جائیں گے ۳۔ بِغَیْرِ عِلْمٍ یعنی جب جاہلوں کو مفتی بنا لیا جائیگا تو پھر وہ اپنی ذاتی رائے سے فتویٰ دیں گے ۴۔ معلوم ہوا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں کوئی مجتہد نہ رہے جیسا کہ جمہور کا مذہب ہے ۵۔ جاہلوں کو امام و مفتی بنانا حرام ہے ۶۔ علم دین کے حفظ و بقا و اشاعت و تبلیغ کے لیے کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے ۷۔ فتویٰ ہی حقیقی ریاست ہے ۸۔ علم کے بغیر فتویٰ دینا نہایت مذموم فعل ہے۔

اس حدیث میں عنوان کے متعلق لکن یقبض العلم کا جملہ ہے۔

بَابٌ هَلْ يُجْعَلُ لِلنِّسَاءِ يَوْمٌ عَلٰى حِدَةٍ فِي الْعِلْمِ

باب کیا عورتوں کی تعلیم کے لیے علیحدہ دن مقرر کیا جا سکتا ہے؟

۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ عورتوں نے

قَالَ قَالَتِ النِّسَآءُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَلَبَنَا عَلَيْكَ الرِّجَالُ فَاجْعَلْ لَنَا يَوْمًا مِّنْ نَفْسِكَ فَوَعَدَهُنَّ يَوْمًا لَقِيَهُنَّ فِيْهِ فَوَعَظَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ فَكَانَ فِيْمَا قَالَ لَهُنَّ مَا مِنْكُنَّ امْرَاَةٌ تُقَدِّمُ ثَلٰثَةً مِّنْ وَّلَدِهَا اِلَّا كَانَ لَهَا حِجَابًا مِّنَ النَّارِ فَقَالَتِ امْرَاَةٌ وَّاثْنَيْنِ فَقَالَ وَاثْنَيْنِ۔

(بخاری)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ آپ کے حضور مرد ہم پر غالب آگئے تو آپ اپنی طرف سے ہمارے لیے ایک دن مقرر کر دیجئے۔ حضور علیہ السلام نے ان سے وعدہ فرمایا اور اس دن عورتوں کے پاس تشریف لے گئے ان کو وعظ کیا اور احکام دیئے تو اسی وعظ میں آپ نے فرمایا تم میں جس عورت نے تین بچے آگے بھیجے (یعنی تین نابالغ بچے اس کے وفات پا گئے) تو یہ اس کے لیے جہنم سے حجاب بن جائینگے۔ ایک عورت نے عرض کی حضور جس کے دو بچے فوت ہوئے آپ نے فرمایا۔ دو کا بھی یہی حکم ہے۔

فوائد و مسائل

امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اس حدیث کو جنائز اعلم الاعتصام میں بھی ذکر کیا اور امام مسلم علیہ الرحمۃ نے ادب میں اور نسائی نے کتاب العلم میں درج کیا ۲۔ حدیث حسب ذیل مسائل پر مشتمل ہے۔

۱۔ عورتوں کا دینی معلومات حاصل کرنے اور شریعت کے ضروری مسائل پوچھنے کے لیے مردوں سے گفتگو کرنا اور عالم دین کا جواب دینا اور عورتوں کی مجلس میں وعظ کرنا جائز ہے لیکن یہ ضروری بات ہے کہ پردہ کا مکمل انتظام ہو ۲۔ وعظ و نصیحت کے لیے دن مقرر کرنا جائز ہے ۳۔ صحابہ کرام کی مستورات وعظ سننے اور دین کی باتوں کا علم حاصل کرنے کی شوقین تھیں ۴۔ مسلمانوں کے نابالغ بچے جنتی ہیں کیونکہ جب ان نابالغ بچوں کی وجہ سے ماں باپ جنت میں داخل ہوں گے تو بچوں کا جنتی ہونا بالکل ظاہر ہے ۔۔۔۔ ۵۔ علامہ مازری فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام کے نابالغ بچے جو وفات پا گئے ان کے جنتی ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

۶۔ حدیث ہذا کا مفہوم صرف اسقدر ہے کہ جس عورت کے تین یا دو بچے ہونے سے پہلے مر گئے تو وہ بچے اس کے لیے جہنم سے حجاب بن جائیں گے۔ حجاب بن جانے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل، یہ کہ وہ بچے اپنے ماں باپ کی شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ بچوں کی موت پر والدین صبر و شکر سے کام لیں تو والدین کا صبر و شکر کرنا ان کی مغفرت اور دخول جنت کا باعث ہوگا جیسا کہ مسلم کی حدیث میں ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اے انصاری عورتو تم میں سے جس کے تین بچے وفات پا گئے اور اس نے صبر کیا تو وہ بھی جنتی ہے۔

بَابُ مَنْ سَمِعَ شَيْئًا فَلَمْ يَفْهَمْهُ فَرَاجَعَهُ حَتّٰى يَعْرِفَهُ

باب ، کوئی مسئلہ سنا سمجھ میں نہ آیا تو اس کو سمجھنے کے لیے دوبارہ پوچھنا

۱۰۳۔ اَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَا تَسْمَعُ شَيْئًا لَا تَعْرِفُهُ اِلَّا رَاجَعَتْ فِيْهِ حَتّٰى تَعْرِفَهُ

حضرت عائشہ صدیقہ حضور علیہ السلام کی زوجہ مقدسہ کا یہ حال تھا کہ جب حضور علیہ السلام سے کوئی بات سنتیں اور نہ سمجھتیں تو خوب سمجھنے تک اس کو دوبارہ پوچھتیں۔ ایک

وَاَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ حُوْسِبَ عُذِّبَ قَالَتْ عَائِشَۃُ فَقُلْتُ اَوَلَیْسَ یَقُوْلُ اللّٰہُ تَعَالٰی فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَسِیْرًا قَالَتْ فَقَالَ اِنَّمَا ذٰلِكَ الْعَرْضُ وَلٰکِنْ مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ یَھْلِكُ

(بخاری)

دن حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص سے حساب ہوگا اس کو عذاب ہوگا۔ اس پر حضرت عائشہ نے عرض کی۔ کیا اللہ تعالےٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ پھر قریب ہے کہ وہ حساب کیا جائے آسانی سے آپ نے فرمایا۔ اس آیت میں جس حساب کا ذکر ہے۔ اس سے (ترازو) کے سامنے لایا جانا مراد ہے اور جس سے مناقشہ ہوگا۔ وہ ہلاک ہوگا۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے تفسیر و رقاق میں بھی ذکر کیا ہے اور امام مسلم نے بھی کتاب التفسیر میں ذکر کیا ہے ۲۔ نوقش ۔ مناقشہ کے معنیٰ پُورا پُورا حساب لینے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان خطا و نسیان سے مرکب ہے۔ بحضور رب العالمین پورا پورا حساب دینے کی کس میں طاقت ہے۔ اس لیے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس سے قیامت کے دن مناقشہ ہوگا وہ ہلاک ہوگا۔ اس پر سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی۔ حضور قرآنِ پاک میں تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا۔ جس کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اس سے حساب آسان ہوگا۔ یعنی اس کو عذاب نہ ہوگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ میرا ارشاد قرآنِ پاک کے خلاف نہیں ہے کیونکہ آیت میں حساب سے مراد صرف عرضِ اعمال ہے یعنی داہنے ہاتھ میں نامۂ اعمال دیئے جانے والوں سے سہل حساب لیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ان کے اعمال پیش کر دیئے جائیں گے۔ وہ اپنی طاعت کو اور اپنی بدیوں کو پہچانیں گے۔ پھر طاعت پر انہیں ثواب دیا جائیگا اور معصیت سے تجاوز کیا جائیگا۔ یہ ہے سہل حساب۔ جس میں نہ شدّت مناقشہ ہوگا۔ نہ یہ کہا جائیگا کہ ایسا کیوں کیا اور نہ عذر کی طلب ہوگی اور نہ اس پر حجت قائم کی جائے گی لیکن جس سے مناقشہ ہوگا اور یہ پوچھا جائیگا کہ یہ کام کیوں کیا؟ تو اسے کوئی عذر ہاتھ نہ آئے گا اور نہ وہ کوئی حجّت پائیگا۔ اس لیے ہلاک ہوگا (اللہ تعالیٰ ہمیں مناقشہ سے پناہ دے)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے بعض نمازوں میں حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا کرتے سُنا ہے:۔

اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَّسِیْرًا قُلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ مَا الْحِسَابُ الْیَسِیْرُ قَالَ اَنْ یُّنْظَرَ فِیْ کِتَابِہٖ فَیُتَجَاوَزَ عَنْہُ اِنَّہٗ مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ یَوْمَئِذٍ یَا عَائِشَۃُ ھَلَكَ (مسند احمد بن حنبل)

اے اللہ! میرا حساب آسان فرمایا! میں نے عرض کیا۔ یا نبی اللہ! آسان حساب کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا" آسان حساب یہ ہے کہ بندہ کے اعمال پر نظر ڈالی جائے اور اس سے درگزر کی جائے (یعنی کوئی پوچھ گچھ اور جرح نہ کی جائے) بات یہ ہے کہ جس کے حساب میں اس دن جرح کی جائیگی اے عائشہ (اس کی خیر نہیں) وہ ہلاک ہو جائے گا۔

واضح ہو کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا آسان حساب کیے جانے کی دعا فرمانا تعلیم اُمّت کے لیے تھا کیونکہ یہ قطعی بات ہے کہ حضور علیہ السلام مرحوم ومغفور ومعصوم ہیں۔ شفیع المذنبین ہیں۔ آپ کی شفاعت اور آپ کے وسیلہ سے تو کروڑوں کی نجات ہوگی ۲۔ اس حدیث سے یہ ہدایت ملتی ہے کہ جب کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آئے یا بظاہر اس میں تضاد کا شُبہ پیدا ہو تو دوبارہ پوچھ کر سمجھ لینا چاہیئے اور عالم کو چاہیئے کہ دوبارہ سوال کرنے والے کو بھی جواب دے تاکہ وہ مسئلہ اچھی طرح سمجھ جائے اور وہ احادیث جن میں سوال کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ بے ضرورت خواہ مخواہ کٹ حجتی کے لیے سوال کرنا منع ہے۔

اس حدیث سے سیدہ عفیفہ، طیبہ، طاہرہ، عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے کہ وہ علمِ دین کے حصول کی کوشش فرماتی تھیں۔ مسائل شرعیہ کے سمجھنے پر حریص تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ احکام شرعیہ کا ایک چوتھائی حصہ آپ سے منقول ہے اور آپ کی فقاہت واعلمیت کا جلیل القدر صحابہ کرام نے اعتراف کیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ وہ ہوں گے جن سے پورا پورا حساب لیا جائیگا اور بعض وہ ہوں گے جن پر صرف ان کے اعمال پیش کر دیئے جائیں گے اور ان سے کوئی پوچھ اور جرح نہ کی جائے گی۔

بَابُ لِيُبَلِّغِ الْعِلْمَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ

باب کہ جو حاضر ہو غائب کو علمِ دین کی بات پہنچا دے

اس باب میں امام بخاری نے جو حدیث ذکر کی ہے اس کے ابتدائی جملوں کا ترجمہ یہ ہے کہ ابو شریح خویلد بن عمرو بن ضخر خزاعی کعبی مشہور صحابی نے عمرو بن سعید بن عاص بن امیہ قرشی اموی سے کہا۔ جب کہ وہ مکہ معظمہ کی طرف لشکر روانہ کر رہا تھا (یہ واقعہ ۶۱ھ کا ہے) اے امیر مجھے اجازت دے تاکہ میں تجھ کو ایک حدیث سناؤں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے روز (یعنی ۲۰ رمضان ۸ھ ہجری میں) ارشاد فرمائی تھی۔ اس حدیث کو میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے اور میری دونوں آنکھوں نے دیکھا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حمد وثنائے الٰہی کے بعد فرمایا:۔

۱۰۴۔ لَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ فَلَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ اَنْ يَّسْفِكَ بِهَا دَمًا وَّلَا يَعْضُدَ بِهَا شَجَرَةً فَاِنْ اَحَدٌ تَرَخَّصَ لِقِتَالِ رَسُوْلِ اللّٰهِ فِيْهَا فَقُوْلُوْا اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذِنَ لِرَسُوْلِهٖ وَلَمْ يَاْذَنْ لَّكُمْ وَاِنَّمَا اَذِنَ لِيْ فِيْهَا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ثُمَّ عَادَتْ حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْاَمْسِ وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَقِيْلَ لِاَبِيْ شُرَيْحٍ مَا

مکہ کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا۔ لوگوں نے نہیں کیا۔ کسی مسلمان کو جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ مکہ میں خون بہائے اور وہاں کے درخت کاٹے پھر اگر کوئی شخص مکہ میں لڑائی کے جواز کی یہ دلیل بنائے کہ وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی کی ہے تو اس کا جواب یوں دو کہ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے رسول کو اجازت دی تھی تم کو نہیں دی اور مجھے بھی جو لڑائی کی اجازت ملی تھی وہ ایک ساعت دن کے لیے تھی۔ اس کے بعد اس کی حرمت آج کے دن ایسی ہی ہوگئی جیسی

قَالَ عَمْرٌو وَقَالَ اَنَا اَعْلَمُ مِنْكَ يَا اَبَا شُرَيْحٍ لَا تُعِيْذُ عَاصِيًا وَلَا فَارًّا بِدَمٍ وَلَا فَارًّا بِخَرْبَةٍ (بخاری)

کل بھی چاہیئے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو یہ حکم پہنچا دے حضرت ابوشریح سے پوچھا گیا کہ یہ حدیث سُن کر عمرو بن سعید نے کیا جواب دیا تو حضرت ابوشریح نے کہا۔ یہ جواب دیا کہ اے ابوشریح اس بات کو میں تجھ سے زیادہ جانتا ہوں مگر یہ گنہگار کو اور نہ اس کو جو خون یا چوری کر کے بھاگے پناہ نہیں دیتا۔

فوائد و مسائل ۱۔ امام نے اس حدیث کو حج و مغازی میں۔ امام مسلم نے حج میں اور ترمذی نے حج و دیات میں اور نسائی نے حج اور علم میں ذکر کیا ہے ۲۔ حضرت ابوشریح صحابی ہیں ۳۔ عمرو بن سعید کا لقب اشدق ہے۔ یہ مدینہ کا گورنر تھا۔ علامہ عینی اور علامہ ابن حجر نے لکھا ہے۔ یہ تابعین باحسان میں سے نہ تھا اور اس کے باپ کے صحابی ہونے میں بھی اختلاف ہے ۴۔ حضرت معاویہ کی وفات کے بعد جب یزید پلید تخت پر بیٹھا تو اس نے سیدنا امام حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بیعت لینا چاہی۔ ان دونوں حضرات نے بیعت سے انکار کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر حرم مکہ میں پناہگزین ہو گئے۔ یزید نے گورنر مدینہ عمرو بن سعید کو مکہ پر فوج کشی کا حکم دیا۔ جب عمرو بن سعید مکہ کی طرف لشکر بھیج رہا تھا۔ اس وقت حضرت ابوشریح صحابی نے گورنر مدینہ کو حدیثِ بالا سُنا کر یہ بتایا تھا کہ مکہ حرم ہے اور وہاں لڑائی کرنا منع ہے حضرت عبداللہ بن زبیر نے نہ کسی کا خون کیا ہے اور نہ چوری کی ہے۔ لہٰذا خدا سے ڈر اور یزید کا ساتھ نہ دے۔ عمرو بن سعید نے اس کا جواب یہ دیا کہ یہ بات مجھے بھی معلوم ہے لیکن مکہ مجرم کو پناہ نہیں دیتا۔ اس جواب سے اس کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ عبداللہ بن زبیر نے بیعت سے انکار کیا ہے اس لیے وہ باغی ہیں اور باغی کو مکہ میں پناہ نہیں مل سکتی۔ لیکن سعید کا یہ جواب دراصل غلط تھا حضرت عبداللہ بن زبیر بے قصور تھے اور یزید سے ہزار درجہ افضل تھے۔ صحابی تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نواسے تھے۔ پھر دیندار اور نہایت ہی پرہیزگار تھے۔ علامہ قسطلانی نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ یزید پلید سے خلافت کے زیادہ مستحق تھے۔ کیونکہ آپ سے پہلے بیعت ہو چکی تھی اور یزید سے بعد میں ہوئی ۵۔ عنوان سے متعلق حدیث کا صرف یہ جملہ ہے۔ وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ کہ حاضر غائب کو یہ حدیث پہنچائیں۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم دین سے متعلق جو ہدایات اپنے قول و عمل سے دیتے تھے تو اس کے متعلق یہ بھی تاکید فرماتے تھے کہ اس کی تبلیغ کی جائے۔ چنانچہ صحابہ کرام اس حکم کی تعمیل میں ہدایاتِ نبویہ کی اشاعت و تبلیغ کو اپنی زندگی کا اہم فرض سمجھتے تھے۔

۱۰۵۔ عَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ ذَكَرَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ قَالَ مُحَمَّدٌ وَاَحْسِبُهٗ قَالَ وَاَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَا اَلَا لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ وَكَانَ مُحَمَّدٌ

حضرت ابوبکرہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا اور کہا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ تمہارے خون اور تمہارے مال (ابن سیرین کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا) کہ تمہاری عزتیں و آبروئیں ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ جیسے اس دن کی (یوم النحر) کی حرمت ہے۔ اس مہینہ میں سُن رکھو۔ جو شخص حاضر ہے وہ غائب کو یہ بات

يَقُوْلُ صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ ذٰلِكَ. اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ مَرَّتَيْنِ (بخاری)

پہنچادے۔ ابنِ سیرین (محمدؒ) کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا سچ ہوا۔ جو لوگ اس وقت موجود تھے انہوں نے یہ حدیث دوسروں تک پہنچادی۔ حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ خبردار میں نے حقِ تبلیغ ادا کردیا ہے۔ دو مرتبہ فرمایا۔

مسائل حدیث

یہ دونوں حدیثیں دراصل قرآن کی ان آیات سے مستفاد ہیں۔ جن میں مکہ کی حرمت (بزرگی) کا بیان ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بحضور رب العالمین عرض کی تھی۔ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا۔ اے پروردگار! اس شہر کو امن والا کردے۔ اللہ عزوجل نے اعلان فرمایا۔ اِنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا "ہم نے حرم مکہ کو امن والا کردیا"۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا "جو حرم میں داخل ہوا مامون ہوگیا"۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آیات کی توضیح وتبیین فرمائی اور حرم کے احکام ومسائل بیان فرمائے۔ مکہ معظمہ کے اردگرد کئی کوس تک حرم کا جنگل تھا۔ ہر طرف اس کی حدیں بنی ہوئی ہیں۔ ان حدوں کے اندر تر گھاس اکھیڑنا، خود رو پیڑ کا کاٹنا، وہاں کے وحشی جانور کو تکلیف دینا حرام ہے۔ حتّٰی کہ اگر سخت دھوپ ہو اور ایک ہی درخت ہے۔ اس کے سایہ میں ہرن بیٹھا ہے تو جائز نہیں کہ اپنے بیٹھنے کے لیے اسے اٹھائے۔ حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ نے حدیث کے الفاظ يسفك بها دمًا سے یہ استدلال فرمایا کہ جو شخص حرم میں پناہ گزین ہوجائے اس کو قتل نہ کیا جائے۔

بَابُ اِثْمِ مَنْ كَذَبَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

باب حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کے گناہ کے بیان میں

۱۰۶۔ سَمِعْتُ رِبْعِيَّ بْنَ حِرَاشٍ يَقُوْلُ سَمِعْتُ عَلِيًّا يَقُوْلُ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَكْذِبُوْا عَلَيَّ فَاِنَّهٗ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَلِجِ النَّارَ (بخاری)

ربعی بن حراش کہتے ہیں میں نے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھ پر جھوٹ مت باندھو کیونکہ جو مجھ پر جھوٹ باندھے چاہئے کہ وہ جہنم میں جائے۔

فوائد ومسائل

اس حدیث کو امام مسلم علیہ الرحمۃ نے مقدمہ کتاب میں، ترمذی نے علم اور مناقب میں اور ابن ماجہ نے سنت میں ذکر کیا ہے۔

حضور علیہ السلام پر جھوٹ باندھنا سخت گناہ ہے

گزشتہ باب میں اس امر کا بیان تھا کہ حاضر، غائب کو دین کی بات پہنچادے۔ اب اس باب میں ان احادیث کا ذکر ہے جس میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی ایسی بات کی نسبت نہ کی جائے جو آپ نے نہیں فرمائی۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا گناہِ کبیرہ ہے اور اس کی سزا جہنم ہے ۲۔ کذب۔ یہ صدق کی ضد ہے۔ جو بات واقع کے مطابق ہو وہ صدق ہے اور جو بات واقع کے خلاف ہو وہ کذب ہے — لا تکذبوا یہ نہی کا صیغہ ہے اور ہر قسم کے کذب کو عام ہے۔ ویسے تو ہر شخص پر جھوٹ باندھنا حرام ہے۔ لیکن اس حدیث میں حضور نے

فرمایا کہ "میرے اوپر جھوٹ باندھنا" جس سے یہ واضح ہوا کہ حضور علیہ السلام پر جھوٹ باندھنے کا گناہ غیر پر جھوٹ باندھنے کے گناہ سے اشد ہے کیونکہ جو بات حضور کی طرف جھوٹ منسوب کر دی جائے گی وہ دین اور شریعت بن جائے گی اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا خدا پر جھوٹ باندھنا ہوگا ۳- فلیلج النار- اس کا ترجمہ یہ ہے "چاہیئے کہ وہ جہنم میں جائے" یہ جواب الشرط ہے- اسی لیے یہاں ف موجود ہے- اگرچہ یہ امر کا صیغہ ہے لیکن مراد اس سے خبر ہے یعنی مفہوم یہ ہے کہ جو مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ جہنم میں جائیگا اور بعض شارحین نے اس کو بددعا کا جملہ قرار دیا ہے- بہرحال حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو آپ نے نہیں فرمائی اشد کبائر سے ہے اور اگر توبہ کیے بغیر مرے گا تو جہنم میں جائے گا ۴- علامہ عینی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ ترہیب و ترغیب کے لیے بھی حدیث وضع کرنا اکثر کبائر سے ہے- اسی طرح جس حدیث کا موضوع ہونا ثابت ہے اس کو صحیح قرار دینا اور اس سے استدلال کرنا بھی حرام ہے اور ایسا شخص اس وعید میں داخل ہے۔

حضرت ربعی بن حراش

اس حدیث کے راویوں میں ربعی اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم قابلِ ذکر ہیں- ربعی بن حراش بڑے عابد و زاہد، متقی و پرہیزگار شخص تھے- کہتے ہیں کہ انہوں نے عمر میں کبھی جھوٹ نہیں بولا- ان کے دو لڑکے تھے جن پر حجاج ناراض تھا اور ان کے قتل کا حکم دیا تھا- یہ دونوں لڑکے اپنے گھر میں چھپ گئے تھے- حجاج سے کہا گیا کہ ان کے باپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر ربعی سے پوچھا جائے کہ تیرے دونوں لڑکے کہاں ہیں تو فوراً صحیح صحیح بتا دیں گے- چنانچہ جب ربعی سے پوچھا گیا تو جواب دیا- میرے دونوں لڑکے گھر میں ہیں- حجاج نے جب ان کی یہ صداقت دیکھی تو معاف کر دیا- کہا جاتا ہے کہ ربعی نے قسم کھائی تھی- جب تک میرا جنتی یا دوزخی ہونا معلوم نہ ہو جائے ہرگز نہیں ہنسوں گا- چنانچہ وہ عمر بھر نہیں ہنسے- حتیٰ کہ جب ان کا حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانۂ خلافت (۱۰۱ھ یا ۱۰۴ھ) میں انتقال ہوا تو غاسل نے بتایا کہ ان کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم

امیر المومنین سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم جلیل القدر صحابی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ چہارم ہیں- نہایت عابد، زاہد، متقی اور پرہیزگار تھے اور ہر کمال و خوبی میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے- بچوں میں سب سے پہلے آپ اسلام لائے مدینہ کی طرف ہجرت کی- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک میں اُترنے کا آپ کو شرف حاصل ہے- آپ کی کنیت ابوالحسن ہے- حضور علیہ السلام نے آپ کی کنیت ابوتراب رکھی اور فرمایا تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو- بنی ہاشم میں پہلے خلیفہ ہیں- آپ عشرہ مبشرہ اور ان چھ اہل الرائے اصحاب میں سے ہیں جن سے حضور علیہ السلام راضی تھے- تمام مشاہد میں تبوک کے سوا حضور علیہ السلام کے ساتھ رہے- جنگِ اُحد میں آپ کے ۱۲ زخم آئے- خیبر میں لڑائی کے وقت فوجی جھنڈا حضور علیہ السلام نے آپ کو عطا کیا اور فرمایا "ان کے ہاتھ خیبر فتح ہوگا" سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد آپ خلیفہ ہوئے- پانچ برس خلافت کے فرائض انجام دیتے رہے ۶۳ سال کی عمر ہوئی- کوفہ کی جامع مسجد میں اتوار کی رات ۱۹ رمضان ۴۰ھ میں شقی ازلی ابن ملجم کی زہر آلود تلوار سے آپ نے شہادت پائی- رضی اللہ تعالیٰ عنہ- آپ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کل ۵۸۶ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے ۲۰ پر بخاری و مسلم نے اتفاق

کیا اور ۹ کو بخاری نے اور ۵ اکو مسلم نے انفراداً ذکر کیا۔

۱۰۷ - عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قُلْتُ لِلزُّبَيْرِ اِنِّىْ لَا اَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا تُحَدِّثُ فُلَانٌ فُلَانٌ قَالَ اَمَا اِنِّىْ لَمْ اُفَارِقْهُ وَلٰكِنْ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ مَنْ كَذَبَ عَلَىَّ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (بخاری)

عامر ابن عبداللہ بن زبیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت زبیر بن عوام سے کہا کہ میں تم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں سُنا کرتا جیسے فلاں فلاں حدیث بیان کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت زبیر بن عوام نے فرمایا کہ میں حضور علیہ السلام سے جُدا تو نہیں ہوا۔ لیکن میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جو مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنّم میں بنالے۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو ابن ماجہ نے سُنت میں اور نسائی و ابوداؤد نے کتاب العلم میں ذکر کیا ۲۔ حضرت زبیر نے اپنے توقف کی وجہ یہ بتائی کہ حضور اکرم نے فرمایا ہے کہ مجھ پر جھوٹ باندھنے والا اپنا ٹھکانہ جہنّم میں بنالے۔ اس سے ان کا مقصد یہ بتانا ہے کہ میں صرف وہی حدیثیں بیان کرتا ہوں جو مجھے یاد رہتی ہیں اور جن کے متعلق مجھے وثوق ہوتا ہے۔ رہے وہ صحابی جو مجھ سے زیادہ حدیثیں بیان کرتے ہیں تو وہ مجھ سے زیادہ حدیثیں یاد رکھ سکتے ہیں۔ اس لیے وہ زیادہ حدیثیں بیان کر دیتے ہیں ——— حدیث ہذا میں عبداللہ بن زبیر اور حضرت زبیر قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر

ان کی کنیت ابوخبیب ہے۔ صحابی ابن صحابی ہیں اور امیر المومنین ہیں۔ یہ مہاجرین مدینہ میں سب سے پہلے اسلام میں پیدا ہونے والے ہیں۔ ان کی والدہ کا نام اسماء ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی ہیں۔ قبا میں جب پیدا ہوئے تو حضور علیہ السلام کی گود میں ان کو ڈال دیا گیا آپ نے کھجور چبا کر ان کو کھلائی۔ اپنا لعابِ دہن ان کے مُنہ میں ڈالا اور تحنیک کی اور دُعا دی گویا سب سے پہلے جو غذا ان کو ملی۔ وہ حضور علیہ السلام کا لعاب مبارک تھا۔ آپ اطلس تھے۔ ڈاڑھی نہ تھی۔ آپ قائم اللیل اور صائم الدہر تھے۔ رات کو نفل کے لیے کھڑے ہوتے تو صبح کر دیتے۔ یزید کے مرنے کے بعد ۶۲ھ میں اہل عراق، یمن اور اہل حجاز نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ نے عمارتِ کعبہ کی تجدید کی اور اس کے دو دروازے بنا دیئے۔ ۹ حج کئے اور خلافت کے امور انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ حجاج نے مکہ کا محاصرہ کیا (ماہ ذی الحجہ ۷۲ھ میں) اور یہ محاصرہ جاری رہا۔ حتیٰ کہ آپ کے ایک پتھر لگا اور اس سے آپ شہید ہو گئے۔ آپ کے جسم مبارک کو سُولی پر چڑھایا گیا اور سر مبارک خراسان میں لے جایا گیا۔ آپ سے ۳۲ حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے امام بخاری نے چھ حدیثیں ذکر فرمائی ہیں۔

حضرت زبیر بن عوام

آپ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ مہاجر ہیں۔ حواری نبی ہیں۔ یہ اسلام لانے میں چوتھے یا پانچویں ہیں۔ ان کی والدہ کا نام صفیہ بنت عبدالمطلب ہے جو حضور علیہ السلام کی پھوپھی تھیں۔ آپ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر ۱۶ برس کی عمر میں اسلام لائے۔ تمام مشاہد میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے۔ آپ سے ۳۸ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے دو پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا اور سات حدیثیں بخاری نے منفرداً ذکر

ہیں۔ جمل کی لڑائی سے آپ علیحدہ ہو گئے تھے تو ایک جماعت نے آپ کو وادی السباع میں ۳۶ھ میں شہید کر دیا۔ آپ وادی السباع میں جو بصرہ کے قریب ہے وہیں دفن ہوئے لیکن بعد میں آپ کو بصرہ میں منتقل کر دیا گیا۔

۱۰۸۔ قَالَ اَنَسٌ اِنَّهٗ لَيَمْنَعُنِيْ اَنْ اُحَدِّثَكُمْ حَدِيْثًا كَثِيْرًا اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَعَمَّدَ عَلَيَّ كَذِبًا فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (بخاری)

حضرت انس نے فرمایا کہ مجھے زیادہ حدیثیں بیان کرنے سے یہ بات روکتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس نے قصداً مجھ پر جھوٹ باندھا تو چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔

فوائد و مسائل امام مسلم نے اس حدیث کو زہیر سے روایت کیا اور نسائی نے کتاب العلم میں ذکر کیا۔ زیادہ حدیثیں نہ بیان کرنے کی وجہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ بتائی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مجھ پر قصداً جھوٹ باندھنے والا جہنمی ہے گویا وہ یہ بتا رہے ہیں کہ حدیث رسول کے بیان کرنے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے اور صرف انہی حدیثوں کو بیان کرنا چاہیے جن کے متعلق سننے والے کو پورا پورا یقین ہو کہ یہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام احادیث نبویہ کی تبلیغ و بیان میں بہت احتیاط کرتے تھے اور ان باتوں کی نسبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے تھے۔ جن کے متعلق ان کو یقین ہوتا تھا کہ حضور علیہ السلام نے ایسا فرمایا ہے ۲۔ اس باب میں امام نے بالکل اسی مضمون کی ایک اور حدیث بھی ذکر کی ہے۔ جسے ہم نے چھوڑ دیا ہے۔ [109]

۱۱۰۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَسَمَّوْا بِاسْمِيْ وَلَا تَكْتَنُوْا بِكُنْيَتِيْ وَمَنْ رَاٰنِيْ فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَاٰنِيْ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِيْ صُوْرَتِيْ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرے نام پر نام رکھو لیکن میری کنیت پر کنیت مت رکھو۔ جس نے مجھے خواب میں دیکھا۔ اس نے درحقیقت مجھے ہی دیکھا۔ کیونکہ شیطان میری صورت نہیں بن سکتا اور جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

فوائد و مسائل ۱۔ امام نے اس حدیث کو ادب میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم نے مقدمہ کتاب میں ذکر فرمایا ہے۔

۲۔ لاتکتنوا، یہ باب تفعیل سے یا تفعل سے یا افتعال سے ہے۔ کنایہ کے اصل معنیٰ یہ ہیں کہ کسی چیز کا ذکر کیا جائے اور مراد اس کا غیر ہو ۳۔ اسم علم، اگر مدح و ذم کا اظہار کرے تو اس کو لقب سے موسوم کرتے ہیں اور اگر مدح و ذم کا اظہار نہ کرے بلکہ اس سے ماں یا باپ کا ہونا ظاہر ہو تو اس کو کنیت کہتے ہیں اور اگر یہ بھی نہ ہو تو اس کو اسم کہتے ہیں مثلاً حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک مُحَمَّد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور کنیت ابوالقاسم ہے اور لقب تو آپ کے بہت ہیں۔ مثلاً سید المرسلین، امام النبیین وغیرہ وغیرہ۔

اس حدیث میں چار امور بیان ہوئے ہیں۔ اوّل، حضور علیہ السلام کے نام پر نام رکھنا۔ دوم، حضور علیہ السلام کی کنیت پر کنیت نہ رکھنا۔ سوم، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنا۔ چہارم، آپ پر جھوٹ نہ باندھنا۔

حضور علیہ السلام کے نام پر نام رکھنا جائز ہے

اوّل و دوم - اہلِ ظاہر نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت کو اختیار کرنا مطلقاً منع ہے خواہ بیٹے کا نام محمد و احمد رکھا ہو یا نہ رکھا ہو۔ امام شافعی کا مسلک بھی یہی ہے ۲۔ قاضی عیاض نے فرمایا کہ بعض اہلِ علم نے کہا کہ بیٹے کا نام قاسم رکھنا منع ہے کیونکہ جب بیٹے کا نام قاسم ہوگا تو یہ بات سبب بنے گی ابوالقاسم کنیت رکھنے کی کیونکہ حضور علیہ السلام نے انما انا قاسم فرما کر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ابوالقاسم کنیت میرے ساتھ خاص ہے۔
۳۔ اہلِ علم کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ جب بیٹے کا نام محمد و احمد نہ ہو تو کنیت ابوالقاسم رکھنا جائز ہے لیکن اگر بیٹے کا نام محمد اور احمد ہو تو کنیت ابوالقاسم رکھنا منع ہے ۴۔ لیکن جمہور سلف اور علماء کا مسلک یہ ہے کہ یہ نہی اب منسوخ ہے یا یہ حکم حضور علیہ السلام کی حیاتِ ظاہری تک تھا۔ اس کے بعد نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ سلف نے اپنے بچوں کا نام محمد و احمد اور اپنی کنیت ابوالقاسم رکھی۔ دراصل حضور علیہ السلام نے اپنی کنیت رکھنے سے اس لیے منع فرمایا تھا کہ بعض لوگ ابوالقاسم کہہ کر پکارتے تو حضور علیہ السلام اس کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ جواب دیتے کہ ہم نے آپ کو نہیں بلایا یا یہود ازراہِ شرارت ابوالقاسم کہہ کر پکارتے اور جب حضور جواب دیتے تو کہتے ہم نے آپ کو نہیں بلایا۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ مبارکہ میں مذکورہ بالا حکم دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ ظاہری تک کے لیے تھا۔ اس کے بعد یہ حکم باقی نہ رہا۔ چنانچہ اس کی تائید حدیث ابوداؤد سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے عرض کی۔ حضور! کیا آپ کی وفات کے بعد میں اپنے بچوں کا نام محمد اور اپنی کنیت ابوالقاسم رکھ سکتا ہوں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں"۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنا

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کرنا بڑی فضیلت کی بات ہے اور حق یہ ہے کہ خواب میں شیطان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں نہیں آسکتا۔ لہٰذا جس کو زیارتِ نبوی کا شرف حاصل ہو اس کو یقین کر لینا چاہیے کہ اس نے حضور علیہ السلام کی زیارت کی۔ یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ ہم ان شاء اللہ العزیز حدیث کے اس ٹکڑے پر مکمل بحث اور اس میں علماء کے اقوال وغیرہ کی تفصیل آئندہ صفحات میں کریں گے یعنی کتاب الرویا میں۔
چہارم۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا اور حدیثیں گھڑنا اور اس کو حضور علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا اشد کبائر سے ہے اور اس کی سزا جہنم ہے اسی طرح حضور علیہ السلام کی خواب میں زیارت نہ ہو اور جھوٹ موٹ کہہ دینا کہ میں نے زیارت کی ہے یہ بھی اس وعید میں داخل ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ اگر کسی راوی کا ایک مرتبہ بھی عمداً کذب ثابت ہو جائے تو اس کی تمام روائتیں رد کر دی جائیں گی۔ بہرحال یہ وعید علماء و واعظین حضرات کو بھی یہ ہدایت کرتی ہے کہ وہ حدیث کے بیان کرنے میں کامل احتیاط سے کام لیں اور جو ثابت شدہ مضمون ہے اسی کو وعظ میں بیان کریں اور اپنی طرف سے حدیث میں کسی لفظ کی کمی یا زیادتی نہ کریں۔ البتہ وعظ میں یا پڑھاتے وقت اصل حدیث کو پیش کر کے اس کی تشریح و توضیح کرنا اور الفاظ حدیث سے استدلال اور استنباط کرنا اور اس کے مسائل و معارف و نکات کو بیان کرنا جائز ہے بلکہ محمود و مطلوب ہے۔

فائدہ امام بخاری نے اس باب میں جس ترتیب سے حدیثیں ذکر کی ہیں وہ بہت خوب ہے۔ پہلے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی روایت کو پیش کیا ہے جس میں باب کا مقصد ہے۔ پھر حضرت زبیر کی حدیث ذکر کی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے سے ڈرتے تھے۔ پھر حضرت انس کی حدیث لائے ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام حدیث کے بیان کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لیتے تھے اور اس حدیث کو بیان کرنے سے پرہیز کرتے تھے جس میں ان کو شک ہوتا تھا۔ آخر میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث ذکر کی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام پر جھوٹ باندھنا ہر طرح حرام ہے خواہ بیداری میں آپ سے ملنے کا دعویٰ کرے یا خواب میں۔

بَابُ كِتَابَةِ الْعِلْمِ

باب علم کی کتابت کے بیان میں

گزشتہ باب میں اس امر کا بیان تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا گناہِ کبیرہ ہے اور اس کی سزا جہنم ہے اور اس سے بچنا ضروری ہے۔ اب اس بیان میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ احادیثِ نبویہ کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی ہر طرح سے حفاظت کرنا قومِ مسلم کا فریضۂ حیات ہے خواہ علمِ دین کو حفظ یاد رکھ کر اس فریضہ کو ادا کیا جائے یا کتابت کی صورت دے کر اس کی حفاظت کی جائے۔

اس باب میں امام بخاری نے جو حدیثیں درج کی ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علم کی کتابت جائز ہے اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین دین سے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو لکھ لیا کرتے تھے۔ بعض اوقات خود حضور علیہ السلام بھی لکھوا دیا کرتے تھے۔ منکرینِ حدیث کہا کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے کی ممانعت کر دی تھی۔ بخاری کا یہ عنوان ہی ان کے دعویٰ کے باطل ہونے کی واضح دلیل ہے ——— منکرینِ سنت بخاری کی حدیث لاتکتبوا عنی کو لے کر یہ شبہ پیدا کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے اپنی حیات میں حدیثیں لکھنے سے منع کر دیا تھا لہٰذا حدیث کے حفظ و بقاء کا کوئی ذریعہ ہی نہ رہا اور موجودہ ذخیرہ حدیث جعلی اور وضعی ہے۔ ملّاں نے گڑھا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

کیا حضور علیہ السلام نے کتابتِ حدیث سے منع فرمادیا تھا؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ جب منکرینِ سنت کے نزدیک احادیث کا موجودہ ذخیرہ ہی ناقابلِ اعتبار ہے تو پھر حدیث بخاری سے استدلال کرنے کا ان کو کیا حق ہے؟ ثانیاً۔ یہ کیا ضروری ہے کہ جو بات قیدِ کتابت میں نہ آئے اس کے باقی رہنے کی کوئی سبیل ہی نہ رہے۔ ثالثاً، کتابت کی ممانعت، حفظ یاد رکھنے، حدیث کی تبلیغ کرنے اور اس کو زندگی کا لائحہ عمل بنانے کی ممانعت کو کب مستلزم ہے۔ رابعاً، حضور علیہ السلام کے مذکورہ بالا ارشاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کے لیے کتابتِ حدیث کی ممانعت فرما دی تھی یا کتابتِ حدیث سے اس لیے منع فرمایا تھا کہ حدیث دین نہیں ہے۔ اس ممانعت کا مقصود تو صرف اسقدر تھا کہ حدیث کو قرآنِ پاک کے ساتھ ملا کر مت لکھو۔ کیونکہ قرآن و حدیث کی عبارت کو ایک جگہ لکھنے سے التباس ہوگا۔ چنانچہ اسی حدیث کے آخری جملے یہ ہیں کہ وحدثوا

عنی مجھ سے حدیث سن کر بیان کرو۔ اس کی تبلیغ کرو اور مسند احمد بن حنبل میں بالکل واضح الفاظ موجود ہیں کہ۔

اکتبوا کتاب اللہ واخلصوا کتاب اللہ (مسند احمد بن حنبل)	قرآنِ پاک کو لکھو۔ اور قرآن کو بالکل علیحدہ لکھو

یعنی متن قرآنِ پاک کے ساتھ کسی اور چیز کو مت لکھو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو حدیث اور قرآنِ حکیم کو مخلوط طور پر لکھنے سے منع فرمایا تھا مگر منکرینِ سنّت نے انتہائی فریب کاری اور کج فہمی کے ساتھ حدیث کے مذکورہ بالا جملہ کو یہ مفہوم پہنا دیا کہ حضور علیہ السلام نے تو حدیث لکھنے سے ہی منع کر دیا تھا۔ حالانکہ بخاری وصحاح کی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خود حضور علیہ السلام نے یہ حدیثیں لکھوائیں۔ اور صحابہ کی ایک جماعت حدیثیں لکھا کرتی تھی۔ اگر حضور علیہ السلام نے علی الدوام کتابتِ احادیث سے منع فرمادیا تھا تو پھر خود لکھوانے اور صحابہ کرام کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟

چنانچہ حضرت عبداللہ نے عرض کی یا رسول اللہ جو بات آپ سے سنوں اس کے لکھنے کی اجازت ہے۔ قال فاذن لی۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اجازت دیدی۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیثیں لکھنا شروع کیں اور اس کا نام صادقہ رکھا تھا۔ اس مضمون کی ایک نہیں بیسیوں حدیثیں مل جاتی ہیں۔ جن میں صریح طور پر کتابتِ حدیث کی اجازت مذکور ہے مگر ہٹ دھرمی کا کیا علاج؟

۱۱۱۔ عَنْ اَبِیْ جُحَیْفَۃَ قَالَ قُلْتُ لِعَلِیٍّ هَلْ عِنْدَكُمْ كِتَابٌ قَالَ لَا اِلَّا كِتَابُ اللّٰهِ اَوْ فَهْمٌ اُعْطِیَهٗ رَجُلٌ مُسْلِمٌ اَوْ مَا فِیْ هٰذِهِ الصَّحِیْفَةِ قَالَ قُلْتُ وَمَا فِیْ هٰذِهِ الصَّحِیْفَةِ قَالَ الْعَقْلُ وَفَكَاكُ الْاَسِیْرِ وَلَا یُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ (بخاری)	حضرت ابی جحیفہ کہتے ہیں۔ میں نے حضرت علی سے کہا کیا آپ کے پاس کوئی کتاب ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا نہیں مگر اللہ کی کتاب (قرآنِ پاک) یا وہ فہم جو ایک مسلم کو عطا ہوتی ہے یا جو کچھ اس صحیفہ میں ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس صحیفہ میں کیا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے کہا۔ عقل۔ فکاک الاسیر اور لا تقتل مسلم الخ (ایسے مسائل اس میں درج ہیں)

فوائد و مسائل ۱۔ اس روایت کو امام بخاری علیہ الرحمہ نے جہاد اور دیات میں بھی ذکر کیا ہے اور ترمذی و ابن ماجہ نے دیات میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ عقل۔ کے معنیٰ دیت کے ہیں اور مراد اس سے دیت کے احکام اور اس کی مقدار ہے۔ فکاک الاسیر کے معنیٰ قیدی کو چھڑانے کے ہیں۔ اسی لیے رہن رکھی ہوئی چیز کو چھڑانے پر عرب فک الرہن کہتے ہیں۔

صحیفۂ علی کی حقیقت ھل عندکم۔ ابی جحیفہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے سوال کیا۔ آپ کے پاس کوئی کتاب ہے؟ یہ سوال انہوں نے اس لیے کیا کہ بعض لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت اطہار کو خصوصاً حضرت علی کو دینِ اسلام سے متعلق ایسی باتیں بتائی ہیں جن کا علم کسی اور کو نہیں ہے۔ ان لوگوں کے خیال کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے

مذکورہ بالا سوال ہوا تو آپ نے فرمایا میرے پاس دین کے ایسے احکام تو نہیں ہیں جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف مجھے بتائے ہوں اور دوسروں کو بتانے سے منع کر دیا ہو۔ میرے پاس قرآنِ حکیم ہے اور وہ علم و بصیرت ہے جو ایک مسلمان کو دی جاتی ہے یا یہ صحیفہ ہے لیکن اس میں بھی دیت اور فکاک اسیر کے احکام درج ہیں اور یہ لکھا ہے کہ کافر کے بدلے مسلمان کو نہ مارا جائے۔

امام بخاری نے کتاب الجہاد میں جو روایت ذکر کی ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ سے ابو جحیفہ نے یہ سوال کیا کہ کیا آپ کے پاس قرآنِ حکیم کے علاوہ بھی کوئی وحی ہے؟ یعنی بعض لوگ کہتے ہیں کہ وحی کا ایک حصہ ایسا ہے جو حضور علیہ السلام نے صرف حضرت علی ہی کو بتایا ہے۔ اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے حضرت جحیفہ نے پوچھا تو حضرت علی نے فرمایا۔ میرے پاس یہی قرآنِ پاک ہے جو سب کے پاس ہے یعنی وحی الٰہی جو حضور علیہ السلام پر نازل ہوئی وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ اس کو چھپایا جاتا یا کسی ایک فرد تک اس کے بعض اجزاء کو محدود رکھا جاتا ——— وحی کے متعلق تو قرآنِ حکیم کا حکم ہے کہ سب تک بلا کم و کاست پہنچا دی جائے اور اس کی تبلیغ کی جائے۔ اس حکم کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن تھا کہ حضور علیہ السلام وحی کا کچھ حصہ صرف مجھ تک محدود رکھتے اور کسی اور کو نہ بتاتے۔

حضرت ابو جحیفہ ان کا نام وہب بن عبد اللہ السوائی ہے۔ انہوں نے حضور علیہ السلام سے ۴۵ حدیثیں روایت کی ہیں جن میں سے دو پر بخاری اور مسلم نے اتفاق کیا اور دو کو بخاری نے اور تین کو مسلم نے منفرداً ذکر کیا۔ ابو جحیفہ کو حضرت علی بہت محبوب رکھتے تھے اور ان پر آپ کو اعتماد بھی بہت تھا۔ آپ نے کوفہ میں بیت المال کا افسر بھی آپ کو ہی بنایا تھا۔ یہ صحابہ میں سب سے چھوٹی عمر کے صحابی تھے۔ ۷۲ھ میں کوفہ میں ان کا انتقال ہوا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

مسائل یہ روایت مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

۱۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے پاس دین کے ایسے احکام و مسائل نہ تھے جو صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہی بتائے ہوں یا ان کی تبلیغ و اشاعت سے منع فرما دیا ہو۔ دینِ اسلام ایک تبلیغی دین ہے اور اس کے احکام و مسائل چھپانا حرام و ناجائز ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ حضرت علی احکامِ اسلامیہ کو چھپائیں یا حضور علیہ السلام ان کو احکامِ اسلامی بتائیں اور یہ تاکید بھی فرما دیں کہ ان کی تبلیغ نہ کرنا ۲۔ حضرت علی نے احکامِ شرعیہ لکھ رکھے تھے جس سے علم کی کتابت کا جواز ثابت ہوا ۳۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ امام سے ایسے امور کے متعلق سوال کرنا جو اس کی ذات سے متعلق ہوں جائز ہے۔ ۴۔ ابن منیر کہتے ہیں کہ حضرت علی کے اس جملہ سے کہ "وہ فہم جو ایک مسلمان کو دی گئی"۔ واضح ہوتا ہے کہ حضرت علی کے پاس صحیفہ میں وہ مسائلِ فقہ تھے جو انھوں نے اپنے علم و بصیرت سے قرآنِ پاک سے اخذ فرمائے تھے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآنِ پاک میں غور و فکر کر کے ان مسائل کو نکالنا جو قرآنِ کریم میں صراحتہً مذکور نہیں ہیں جائز ہے۔ بشرطیکہ وہ مسائل اصولِ شرعیہ کے خلاف نہ ہوں ۵۔ اس حدیث سے امام مالک شافعی و احمد علیہم الرحمۃ نے یہ استدلال کیا ہے کہ مسلمان کو ذمی کافر کے بدلے قصاصاً نہیں قتل کیا جائیگا۔ امام اوزاعی، ثوری، اسحٰق، ابوبکر رازی اہلِ ظاہر اور ایک جماعتِ تابعین کا یہی مسلک ہے۔

اگر مسلمان ذمی کافر کو قتل کر دے تو اس سے ضمان لیا جائیگا یا نہیں

۲۔ حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ کا مسلک یہ ہے کہ اگر مسلمان ذمی کافر کو ناحق قتل کر دے تو اس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ امام طحاوی نے فرمایا کہ ولا یقتل مسلم بکافر میں کافر سے مراد حربی کافر ہے کیونکہ حدیث کے پورے الفاظ یہ ہیں۔ لَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ وَلَا ذُوْ عَهْدٍ فِي عَهْدِهٖ یہاں ضروری ہے کہ کافر سے حربی مراد لیا جائے تاکہ ذمی کافر اور عہد میں تقابل قائم رہے۔ چنانچہ اس کی تائید ذیل کی حدیث سے بھی ہوتی ہے جو اگرچہ منقطع ہے۔

اُتِيَ بِرَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ قَدْ قَتَلَ مُعَاهِدًا مِنْ اَهْلِ الذِّمَّةِ فَاَمَرَ بِهٖ فَضَرَبَ عُنُقَهٗ وَقَالَ اَنَا اَوْلٰى مَنْ وَفٰى بِذِمَّتِهٖ (طحاوی)

حضور علیہ السلام کی خدمت میں ایک مسلمان کو لایا گیا جس نے ایک معاہد ذمی کافر کو ناحق قتل کر دیا تھا۔ حضور علیہ السلام نے اس مسلمان کو قصاصاً قتل کرنے کا حکم دیا اور فرمایا۔ میں اس کے ذمہ کی زیادہ وفا کرنے والا ہوں۔

اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ وہ کافر جس کے مال وجان عزت و آبرو ناموس کی حفاظت وصیانت کا مسلم حکومت نے ذمہ لیا ہے اگر اس کو کوئی مسلمان قتل کر دے تو اس کے قصاص میں مسلمان کو بھی قتل کیا جائے تاکہ انصاف کا تقاضا پورا ہو۔ حربی کا خون و مال حلال ہے۔ لیکن جب وہ کافر ہماری حفاظت میں آجاتا ہے اور جزیہ ادا کرتا ہے تو اس کے خون اور مال کی حرمت ویسی ہی ہوجاتی ہے جیسی کہ خونِ مسلم کی حرمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص ذمی کافر کا مال چرائے تو اس کا ہاتھ حداً کاٹ جاتا ہے خواہ چور مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ لہذا جب اس کے مال چرانے پر ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے تو اس کے خون بہانے پر تو بطریق اولٰے قصاص لینا چاہیئے۔ حضرت امام نخعی شعبی، حضرت سعید ابن مسیب ومحمد ابن ابی لیلیٰ وجناب فاروق اعظم وعبداللہ بن مسعود وعمر بن عبدالعزیز کا بھی یہی مسلک ہے کہ مسلمان کو ذمی کافر کے بدلے قصاصاً قتل کیا جائے۔ یہاں ہم نے بہت مختصر گفتگو کی ہے۔ تفصیل کے لیے اہلِ علم طحاوی "باالمؤمن تقتل الکافر متعمداً" کا مطالعہ فرمائیں۔ ہم انشاءاللہ العزیز کتاب القصاص والدیات میں اس مسئلہ پر مزید وضاحت سے گفتگو کریں گے۔

۱۲۔ عَنْ اَبِيْ سَلَمَةَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ خُزَاعَةَ قَتَلُوْا رَجُلًا مِّنْ بَنِيْ لَيْثٍ عَامَ فَتْحِ مَكَّةَ بِقَتِيْلٍ مِّنْهُمْ قَتَلُوْهُ فَاُخْبِرَ بِذٰلِكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَكِبَ رَاحِلَتَهٗ فَخَطَبَ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ حَبَسَ عَنْ مَكَّةَ الْقَتْلَ اَوِ الْفِيْلَ قَالَ مُحَمَّدٌ وَاجْعَلُوْهُ عَلَى الشَّكِّ كَذَا قَالَ اَبُوْ نُعَيْمٍ اَلْقَتْلَ اَوِ الْفِيْلَ وَغَيْرُهٗ

ابو سلمہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص نے بنی لیث کے ایک شخص کو فتح مکہ کے دن قتل کر دیا۔ اس مقتول کے بدلے میں جس کو بنی لیث نے قتل کیا تھا۔ جب اس کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ نے اونٹنی پر سوار ہو کر خطبہ دیا۔ فرمایا اللہ تعالےٰ نے مکہ میں قتل کو یا فیل کو روک دیا اور اللہ کے رسول اور مسلمان اہلِ مکہ پر غالب کیے گئے۔ مکہ مجھ سے پہلے بھی کسی کے لیے حلال نہیں ہوا اور نہ میرے بعد

يَقُوْلُ الْفِيْلَ وَ سُلِّطَ عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اَلَا وَ اِنَّهَا لَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ وَلَا تَحِلُّ لِاَحَدٍ بَعْدِيْ اَلَا وَ اِنَّهَا حَلَّتْ لِيْ سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ اَلَا وَ اِنَّهَا سَاعَتِيْ هٰذِهٖ حَرَامٌ لَا يُخْتَلٰى شَوْكُهَا وَلَا يُعْضَدُ شَجَرُهَا وَلَا يُلْتَقَطُ سَاقِطَتُهَا اِلَّا لِمُنْشِدٍ فَمَنْ قُتِلَ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ اِمَّا اَنْ يُّعْقَلَ وَ اِمَّا اَنْ يُّقَادَ اَهْلُ الْقَتِيْلِ فَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْيَمَنِ اُكْتُبْ لِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ اكْتُبُوْا لِاَبِيْ فُلَانٍ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ قُرَيْشٍ اِلَّا الْاِذْخِرَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاِنَّا نَجْعَلُهٗ فِيْ بُيُوْتِنَا وَ قُبُوْرِنَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا الْاِذْخِرَ اِلَّا الْاِذْخِرَ (بخاری)

کسی کے لیے حلال ہوگا۔ خبردار! صرف میرے لیے حرم میں قتل کرنا صرف ایک گھڑی دن کے لیے حلال ہوا تھا۔ خبردار! اب یہ ساعت (جس میں خطبہ دے رہا ہوں) مکہ حرم ہے۔ حرم کے کانٹے نہ کاٹے جائیں۔ یہاں کے درخت نہ اُکھیڑے جائیں۔ یہاں کا لُقطہ (پڑی ہوئی چیز) نہ اٹھائی جائے۔ مگر وہ شخص لقطہ اٹھائے) جو مالک تک اس کو پہنچائے۔ پھر جس کا کوئی شخص مارا جائے۔ اس کو اختیار ہے دو باتوں میں سے ایک کا جو اس کو پسند آئے یا دیت لے یا قصاص لے تو ایک شخص یمنی آئے عرض کی حضور! یہ احکام مجھے لکھ دیجئے۔ فرمایا فلاں کو یہ احکام لکھ دو۔ پھر ایک قریشی نے عرض کی مگر اذخر گھاس (یعنی اس کو حرم سے کاٹنا منع نہ فرمایا جائے) کیونکہ اذخر ہمارے گھروں اور قبروں کے کام آتی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مگر اذخر! مگر اذخر!

فوائد و مسائل

۱۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اس حدیث کو کتاب الدیتہ اور لُقطہ میں بھی ذکر کیا۔ امام مسلم نے حج میں نیز ترمذی، ابن ماجہ، ابو داؤد نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

۲۔ ان اللہ حبس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ میں قتل کو حرام فرما دیا ہے۔ راوی کو شک ہے کہ حضور علیہ السلام نے قتل کا لفظ ارشاد فرمایا یا فیل کا۔ فیل ہاتھی کو کہتے ہیں۔ اس صورت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہوگا جو سورہ الم ترکیف میں آیا ہے کہ ابرہہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر مکہ مکرمہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے اس کی فوج کو مع ہاتھیوں کے ہلاک کر دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت اہلِ مکہ مسلمان نہ تھے اور اب جبکہ اہلِ مکہ نے اسلام قبول کر لیا تو اب اس کی حرمت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ شوکھا۔ یعنی حرم کے کانٹے اور درخت نہ کاٹے جائیں۔ لیکن وہ کانٹے جن سے نقصان پہنچے ان کو کاٹنا جائز ہے۔ جیسے حرم کے موذی جانوروں کو مارنا جائز ہے۔ الّا لمنشد: انشاد کے اصل معنیٰ آواز بلند کرنے کے ہیں۔ اسی سے انشاد الشعر ماخوذ ہے۔ نشدت الضالۃ عرب اس وقت بولتے ہیں جب کہ گم شدہ چیز کے مالک کو تلاش کریں۔ حرم کے لُقطہ کے متعلق امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ پانے والا اس کا انشاد (اعلان) کرتا ہی رہے تا آنکہ اس کا مالک مل جائے۔ امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ لقطہ حرم و حل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ منشد کے معنیٰ وہ یہ کرتے ہیں کہ جیسے عام جگہوں کے لقطہ کے متعلق ایک سال تک اعلان کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حرم کے لقطہ کے متعلق بھی اعلان کیا جائے۔ پھر جب یہ یقین ہو جائے کہ اب مالک نہیں مل سکتا تو پانے والا مالک ہو جائے گا۔ امام اعظم علیہ الرحمۃ کے نزدیک بھی حرم و حل کے لقطہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

رہا یہ سوال کہ اگر فرق نہیں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم کے لقطہ کو خصوصی طور پر کیوں بیان کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خصوصی طور پر بیان کرنے کی علت یہ نہیں ہے کہ حرم اور غیر حرم کے لقطہ میں فرق ہے بلکہ اس کی علت یا تو وہاں کی عظمتِ شان ہے اور یا یہ کہ لوگوں کو خیال ہو سکتا تھا کہ حرم کی گری پڑی چیز کے متعلق اعلان کرنے کا خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو سکتا کیونکہ حرم ایک ایسی جگہ ہے جہاں مختلف بلاد و امصار کے مسلمان کثیر تعداد میں جمع ہوتے ہیں اور پھر کوئی آتا ہے اور کوئی اپنے وطن کو واپس ہو جاتا ہے۔ اس لیے حضور علیہ السلام نے حرم کے لقطہ کے متعلق خصوصی طور پر ہدایت دی کہ اس کا بھی ضرور اعلان کیا جائے۔ وھو بخیر النظرین۔ یہاں خیر افعل التفضیل کے معنیٰ میں ہے۔ عبارت یہ ہوگی۔ افضل النظرین مطلب یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء یا تو دیت لیں یا قصاص اما ان یعقل سے یہ بتایا گیا ہے کہ قصاص قاتل ہی سے لیا جائے یہ نہیں کہ قاتل پر قابو نہ چلے تو اس کے کسی رشتہ دار یا خاندان کے کسی فرد یا قبیلہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیا جائے۔

مسائلِ حدیث

حدیثِ ہٰذا مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے:۔ ۱۔ علم کی کتابت جائز ہے ۲۔ حضور علیہ السلام نے اپنی حدیثیں لکھنے کی اجازت دی ۳۔ خطبہ کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر دینا زیادہ مستحب ہے خواہ جمعہ کا ہو یا عام خطبہ ۴۔ حرم کا احترام فرض ہے۔ وہاں کے باشندوں سے قتال و جدال جائز نہیں ہے ۵۔ حرم کے درخت اور کانٹوں کو کاٹنا جائز نہیں ہے ۶۔ حضرت امام اعظم، ابو یوسف، محمد، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری، عبداللہ بن ذکوان، عبداللہ بن شبرمہ و حسن بن حی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ قتلِ عمد میں یا تو قصاص لیں یا معاف کر دیں۔ ہاں اولیاء مقتول کو دیت لینے کا بھی اختیار ہے۔ بشرطیکہ قاتل دیت دینے پر راضی ہو جائے۔ چنانچہ حدیث زیرِ بحث امام کے مسلک کی بھی دلیل ہے۔ رہی یہ بات اس میں قاتل کی رضا کا ذکر نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ قاتل کا مال دینے پر راضی ہو جانا بدیہی بات ہے مشکل تو یہ امر ہے کہ اولیاء مقتول کو دیت لینے پر راضی کیا جائے کیونکہ جان کے بدلے مال لینے پر کم لوگ ہی تیار ہوتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مالکِ شریعت ہیں

۴۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک قریشی نے استدعا کی کہ اذخر گھاس ہمارے کام کی چیز ہے۔ اس کو حرام نہ کیا جائے۔ حضور علیہ السلام نے حرم کی اذخر گھاس کاٹنے کی اجازت دیدی۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضور علیہ السلام کو یہ اختیار دیا ہے کہ حرام چیزوں میں جس چیز کو چاہیں حلال فرما دیں۔ جیسے آپ کو اختیار ہے کہ جس مباح کو چاہیں واجب کر دیں۔ چنانچہ کتاب وسنت سے واضح ہوتا ہے کہ احکامِ شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کی۔ حضور! کیا حج ہر سال فرض ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ اگر میں ہاں کہہ دوں تو ہر سال واجب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا! مجھے چھوڑے رہو، جب تک میں تم کو چھوڑے رہوں۔ اگلی امتیں اسی کثرتِ سوال اور اپنے انبیاء کے خلافِ مراد چلنے سے ہلاک ہوئیں۔ جب میں کسی بات کا حکم دوں تو بجا لاؤ۔ منع کر دوں تو اسے چھوڑ دو! جس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ کھود کھود کر مت پوچھو۔ میری زبان حق کی ترجمان ہے۔ اگر میں نے کسی بھی چیز کے واجب یا حرام ہونے کا حکم دے دیا تو وہ واجب یا حرام ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت امام شعرانی میزان شریف میں لکھتے ہیں کہ شریعت کی دوسری قسم وہ ہے جو مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے رب عزوجل نے ماذون فرمایا کہ خود اپنی رائے سے ان بسنہ

علی رأیہ) جو راہ چاہیں قائم فرما دیں۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کا مردوں کے لیے ریشم پہننا حرام کرنا اور حرمتِ مکہ سے اذخر گھاس کو استثنا فرما دینا اسی قبیل سے ہے۔ منہ ـــــ اس مسئلہ کی زیادہ تفصیل کے لیے ہماری کتاب "روح الایمان" کا مطالعہ کیجیے۔ جو دفتر "رضوان" لاہور سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

۱۱۳۔ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا هُرَيْرَةَ يَقُوْلُ مَا مِنْ اَصْحٰبِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَدٌ اَكْثَرَ حَدِيْثًا عَنْهُ مِنِّيْ اِلَّا مَا كَانَ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو فَاِنَّهٗ كَانَ يَكْتُبُ وَلَا اَكْتُبُ (بخاری)

ہمام بن منبہ نے کہا۔ میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی مجھ سے زیادہ حدیث روایت نہیں کرتا۔ مگر عبد اللہ بن عمر۔ کیونکہ وہ حدیث سن کر لکھ لیتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔

فوائد و مسائل اس روایت کو ترمذی نے علم اور مناقب میں اور نسائی نے صرف مناقب میں ذکر کیا ہے۔ ترجمہ باب سے اس حدیث کا تعلق بالکل ظاہر ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو افاضل صحابہ سے ہیں وہ احادیثِ نبویہ کو لکھا کرتے تھے۔ اسی سے منکرینِ حدیث کے اس دعویٰ کا رد ہو جاتا ہے کہ حدیث کی کتابت عہدِ نبوی میں نہیں ہوئی یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے سے منع فرما دیا تھا۔ حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات اپنے ارشادات لکھوائے۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت حدیث کو لکھتی بھی تھی اور حفظ بھی کرتی تھی اور دوسری جماعت صرف حفظِ حدیث پر اکتفا کرتی تھی۔ چنانچہ بیہقی اور مسندِ امام احمد میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر نے حضور علیہ السلام سے حدیث لکھنے کی اجازت مانگی تو آپ نے ان کو اجازت دیدی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حافظہ واضح ہو کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پانچ ہزار تین سو حدیثیں مروی ہیں اور آٹھ سو تابعین نے آپ سے روایت کی ہیں اور حضرت عبد اللہ بن عمر سے صرف سات سو حدیثیں مروی ہیں لہٰذا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فرمانا کہ صحابہ میں مجھ سے زیادہ کوئی حدیث روایت نہیں کرتا سوائے عبد اللہ بن عمر کے ـــــ یہ قول ان کا ابتدائی حالت کا ہے جب کہ حضور علیہ السلام نے ان کے لیے دعائے برکت نہ کی تھی۔ اس وقت یہ کیفیت تھی کہ حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے زیادہ حدیثوں کے حافظ تھے لیکن جب حضور علیہ السلام کی خدمت میں انھوں نے اپنے حافظ کی کمزوری کی شکایت کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جھولی میں کچھ ڈال دیا تو پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حالت ہو گئی کہ جو کچھ حضور علیہ السلام سے سنتے نہ بھولتے۔ چنانچہ بارگاہ نبوی سے قوتِ حافظہ پانے کے بعد حضرت ابوہریرہ ہی سب سے زیادہ حافظِ حدیث قرار پائے ۲۔ روایت زیرِ بحث سے یہ بھی ثابت ہے کہ علم کی کتابت جائز ہے (واللہ اعلم)

۱۱۴۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا اشْتَدَّ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهٗ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِكِتَابٍ اَكْتُبُ لَكُمْ كِتَابًا

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مرض زیادہ ہوا تو آپ نے فرمایا۔ میرے پاس سامانِ کتابت لاؤ۔ میں ایک تحریر

لا تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ قَالَ عُمَرُ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غَلَبَهُ الْوَجَعُ وَعِنْدَنَا کِتَابُ اللّٰهِ حَسْبُنَا فَاخْتَلَفُوْا وَکَثُرَ اللَّغَطُ قَالَ قُوْمُوْا عَنِّیْ وَلَا یَنْبَغِیْ عِنْدِیَ التَّنَازُعُ فَخَرَجَ ابْنُ عَبَّاسٍ یَقُوْلُ اِنَّ الرَّزِیَّةَ کُلَّ الرَّزِیَّةِ مَا حَالَ بَیْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَبَیْنَ کِتَابِهٖ

(بخاری)

لکھ دوں تاکہ تم اس کے بعد گمراہ نہ ہو تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درد غالب ہے اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب (قرآن کریم) ہے اور وہ ہم کو کافی ہے۔ پس حاضرین میں اختلاف ہوا اور باتیں بڑھیں تو حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ میرے پاس سے اُٹھ جاؤ اور میرے پاس جھگڑا کرنا مناسب نہیں۔ پھر ابن عباس یہ کہتے ہوئے نکلے کہ مصیبت ہے بڑی مصیبت جو حائل ہوگئی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اور آپ کی تحریر کے درمیان۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام بخاری نے مغازی اور طب اور الاعتصام میں بھی ذکر فرمایا ہے اور مسلم نے وصایا میں اور نسائی نے علم اور طب میں ذکر کیا ہے ۲۔ حدیثِ ہذا کا باب سے تعلق بالکل واضح ہے یعنی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتابتِ حدیث عہدِ نبوی میں ہی مروّج ہوگئی تھی اور یہ کہ حدیث کی کتابت جائز ہے۔

حدیثِ قرطاس

واضح ہو کہ یہ حدیث، حدیثِ قرطاس کے نام سے موسوم ہے۔ بخاری میں واقعہ قرطاس کی حدیث سات جگہ آئی ہے۔ ان تمام حدیثوں پر نظر رکھتے ہوئے جو مضمون حاصل ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری عمر میں وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا کہ کاغذ قلم دوات لاؤ ایک تحریر لکھوا دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوگے۔ حضرت عمر نے کہا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت بیماری کی تکلیف زیادہ ہے اور ہمارے لیے کتاب اللہ کافی ہے۔ لوگوں نے کہا۔ اھجر استفهموه یعنی کیا جدائی کا وقت قریب آگیا آپ سے دریافت تو کرلو۔ مخالفین کہتے ہیں کہ لفظ ھجر کے معنیٰ یہاں ہذیان کے ہیں اور یہ لفظ حضرت عمر نے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں استعمال کیا ہے۔

اس قصہ قرطاس میں تین الزامات حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر قائم کیے جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ انھوں نے رسول کو ہذیان بکنے والا کہا اور سخت توہینِ رسول کی۔ دوم یہ کہ انھوں نے ایسی ضروری تحریر نہ لکھنے دی جو اُمت کو گمراہی سے بچاتی۔ سوم یہ کہ کتاب اللہ کو کافی کہہ کر انھوں نے حدیثِ رسول کا لغو اور بے کار ہونا ظاہر کیا۔

جواب:۔ پہلے الزام کا ہے کہ اوّل تو لفظِ ھجر حضرت عمر کا مقولہ نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں سات جگہ یہ روایت ہے مگر کہیں بھی یہ لفظ حضرت عمر سے منقول نہیں۔ قالوا بصیغہ جمع ہے یعنی لوگوں نے کہا۔ اب یہ کہنے والے کون لوگ تھے ان کا نام معلوم نہیں۔ شارحین نے اپنے قیاس سے کام لیا ہے۔ کسی نے کہا یہ قول اس جماعت کا ہے جو لکھوانے کی موید تھی اور کسی نے کہا۔ کچھ لوگ نومسلم تھے یہ ان کا مقولہ ہے۔ غرضیکہ حضرت عمر کی طرف اس قول کو منسوب کرنا بالکل بے اصل و بے بنیاد ہے۔ حدیث کی کتاب میں کوئی صحیح معتبر روایت اس مضمون کی نہیں ہے کہ یہ لفظ حضرت عمر نے کہا۔ مخالفینِ صحابہ نے بڑا زور لگایا اور اور ان کے بیان سے معلوم ہوا کہ تقریباً ایک سو برس سے مجتہدین اس تلاش میں سرگرداں ہیں کہ کوئی روایت مل جائے۔

جس میں یہ لفظ حضرت عمر کا مقولہ ہو مگر نہیں ملی۔ دوسری بات یہ ہے کہ لفظ ھجر کے معنیٰ یہاں ہذیان نہیں ہے بلکہ بمعنیٰ جدائی کے ہیں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیماری کی حالت میں ایسی تحریر لکھوانے کا ارادہ ظاہر کیا جو آخری وقت میں ہوئی ہے تو صحابہ کرام کے قلوب پر ایک بجلی سی گری اور ان میں سے کسی نے کہا۔ اَھَجَرَ استفھموہ۔ کیا جدائی کا وقت آگیا پوچھو تو۔ یہ پوچھنے کا مضمون صاف قرینہ اس امر کا ہے کہ ھجر بمعنی ہذیان نہیں۔ جس کو ہذیان ہو گیا ہو اس سے پوچھنا کیا۔ یہ لفظ بمعنی جدائی قرآنِ مجید میں بھی مستعمل ہے۔ قولہٗ تعالیٰ واھجرھم ھجراً جمیلا۔ تیسری بات یہ ہے کہ لفظِ ہمزہ استفہام کے ساتھ مروی ہے۔ چنانچہ بخاری کی چھ روایتوں میں ہمزہ کے ساتھ ہے۔ صرف ایک میں بغیر ہمزہ ہے۔ لہٰذا حسبِ قاعدہ اصولِ حدیث جو روایت بے ہمزہ کے ہے اس میں بھی ہمزہ مانا جائے گا۔ پس یہ لفظ بمعنی ہذیان ہو تو بھی استفہامِ انکاری ہے۔

المختصر رسول کو ہذیان گو کہنے کا الزام حضرت عمر تو کیا کسی پر بھی قائم نہیں ہوتا۔ **جواب** دوسرے الزام کا یہ ہے کہ تحریر نہ لکھوانے کا الزام حضرت عمر پر ہرگز نہیں آسکتا۔ کیونکہ اگر وہ تحریر ہی ایسی ضروری تھی تو اس واقعہ کے بعد پانچ دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں رہے۔ اس مدت میں جب حضرت عمر نہ ہوتے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہیئے تھا کہ لکھوا دیتے یا حضرت علی پر لازم تھا کہ وہ لکھوا لیتے اور حضرت عمر اگر اس تحریر کو روک بھی رہے تھے تو ان کا روکنا چیز ہی کیا تھا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت عمر سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ڈرتے تھے اور مارے ڈر کے ان کے خلاف نہ کر سکتے تھے تو نبوت ایک کھیل ہو جائے گی اور سارا دین ناقابلِ اعتبار ہو جائے گا۔ یہ بات کس کی عقل میں آسکتی ہے کہ وہ رسول جس نے مکہ میں کفارِ مکہ سے کچھ خوف نہ کیا اور توحید کا اعلان اور شرک کا ابطال کیا وہ حضرت عمر سے اس قدر ڈر جائے کہ اپنی امت کے لیے ایک ایسی ضروری تحریر نہ لکھوائے۔ ان ھذا لشئ عجیب ـــــ اس مقام پر ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس واقعہ قرطاس سے بہت پہلے یہ آیۂ قرآنی نازل ہو چکی تھی۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ یعنی آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی۔ اگر واقعی کوئی ایسی تحریر باقی تھی تو بغیر اس کے دین کامل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اگر مذکورہ بالا الزام مان لیا جائے تو آیتِ قرآنی کے خلاف ہے۔

ضروری نوٹ واقعہ قرطاس کے متعلق یہاں ہم نے نہایت ہی مختصر گفتگو کی ہے کیونکہ اس موضوع پر ہم نے ایک کتابچہ بنام "حدیثِ قرطاس" علیحدہ شائع کر دیا ہے۔ اس میں حدیثِ قرطاس پر محققانہ تبصرہ ہے اور ان تمام اعتراضات وشبہات والزامات کے مکمل و مدلل ومفصل جوابات دیے ہیں۔ جو اس سلسلہ میں کیے جاتے ہیں۔ یہ کتابچہ دفتر رسالہ "رضوان" لاہور سے مل سکتا ہے۔

بَابُ الْعِلْمِ وَالْعِظَةِ بِاللَّيْلِ

باب رات کے وقت تعلیم و وعظ کے بیان میں

علم کے معنیٰ اپنے نفس کو وعظ کرنے کے ہیں اور وعظ کے معنیٰ دوسروں کو نصیحت کرنے کے ہیں۔

۱۱۵۔ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ اِسْتَيْقَظَ | حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک رات

النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَیْلَۃٍ فَقَالَ سُبْحَانَ اللّٰہِ مَاذَا اُنْزِلَ اللَّیْلَۃَ مِنَ الْفِتَنِ وَمَاذَا فُتِحَ مِنَ الْخَزَائِنِ اَیْقِظُوْا صَوَاحِبَ الْحُجَرِ فَرُبَّ کَاسِیَۃٍ فِی الدُّنْیَا عَارِیَۃٌ فِی الْاٰخِرَۃِ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو فرمایا! سبحان اللہ! آج رات کو کیا کیا فتنے اُترے اور کیا کیا خزانے کھلے۔ ان حجرے والیوں کو (عبادت کے لیے) جگاؤ۔ بہت عورتیں جو دنیا میں پہنے اوڑھے ہیں۔ آخرت میں ننگی ہوں گی۔ (بخاری)

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کا باب سے تعلق واضح ہے ۲۔ امام نے حدیث ہذا کو ابواب ذیل میں ذکر فرمایا ہے صلوٰۃ اللیل، علامات النبوۃ، کتاب الادب، کتاب اللباس، کتاب الفتن ـــــــ اور ترمذی نے کتاب الفتن میں ذکر کیا ہے ۳۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج سے ہیں۔ ان کا نام ہند یا رملہ ہے۔ یہ سہل بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم کی صاحبزادی ہیں۔ ان سے کل ۳۷۸ حدیثیں مروی ہیں۔ ۱۳ حدیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے۔ ۴۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ، اللہ کی تسبیح ہے۔ ایک روایت میں انزل اللہ آیا ہے۔ انزال کے معنیٰ کسی چیز کو اوپر سے نیچے اُتارنے کے ہیں۔ یہاں حقیقی معنیٰ نہیں بن سکتے، مجازی لیے جائیں گے۔ "یعنی اللہ تعالیٰ نے امورِ مقدرہ کی ملائکہ کو اطلاع دی"۔ اسی طرح انزل اللہ القرآن میں انزال کے مجازی معنیٰ ہی مراد ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن وہ معنیٰ ہے جو قائم بالذات ہے تو اس کا انزال یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کلمات وحروف کو وجود میں لایا جو معنیٰ پر دلالت کریں اور ان کو لوح محفوظ میں ثبت کر دیا اور اگر قرآن حکیم سے مراد الفاظ ہو تو اس کا انزال صرف ان لفظوں کو لوح محفوظ میں ثبت کرنا ہوگا۔ کیونکہ انزال وجود شے کے بعد ہی ہو سکتا ہے ـــــــ انزال کتب سماویہ کے معنیٰ یہ ہیں کہ فرشتہ نے اللہ تعالیٰ سے تلقی روحانی پائی یا لوح محفوظ سے اس کو حفظ کیا اور اس کو لے کر اُترا اور انبیاء کرام تک پہنچایا۔

مَاذَا اُنْزِلَ اللَّیْلَۃَ منصوب علی الظرفیۃ ہے حاصل معنیٰ یہ ہوں گے کہ اس رات اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو آئندہ رُونما ہونے والے فتنوں سے اطلاع دی یا ان کا مشاہدہ کرایا۔ چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا۔ میں بارش کے مسلسل قطرات کی طرح فتنوں کو اُترتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں قیامت تک ہونے والے واقعات و حادثات کی اطلاع دی۔ (بخاری و مسلم)

ماذا میں چند وجہیں ہیں ۱۔ ما استفہام کے لیے اور ذا اشارہ کے لیے ۲۔ ما اشارہ کے لیے ذا موصول بمعنی الذی ۳۔ ما زائدہ اور ذا اشارہ کے لیے ۴۔ ماذا، ترکیب میں کلمہ استفہام ہو ۵۔ ما نکرہ موصوفہ بمعنی شی ۶۔ ما استفہام کے لیے ذا زائدہ ہو ـــــــ ایک جماعت نے جن میں ابن مالک بھی شامل ہیں، اس کو جائز رکھا ہے۔ اُنزِل صیغہ مجہول ہے۔

وَمَاذَا فُتِحَ مِنَ الْخَزَائِنِ

عام شارحین نے خزائن سے صحابہ کرام کی فتوحات مراد لی ہیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشگوئی فرمائی۔ حضرات خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہاتھوں پوری ہوئی۔ انہیں کے زمانہ میں روم و ایران کی سلطنتیں زیر وزبر ہوئیں اور ان دونوں ملکوں پر اسلام کا قبضہ ہوا اور قیصر و کسریٰ کے خزانے ہاتھ آئے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۱۳ھ

میں مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کو پھر حضرت خالد بن ولید کو ملک ایران کی طرف بھیجا اور بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کو ملا۔ ابھی ایران کا کوئی شہر فتح نہ ہونے پایا تھا کہ قیصر روم کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ یرموک کی عظیم الشان لڑائی پیش آئی۔ جس میں مسلمانوں کو بڑی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور دمشق بھی آپ کے وقت میں فتح ہوا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فتوحات تو حدِ شمار سے باہر ہیں۔ روم، ایران، مصر آپ کے زمانہ میں فتح ہوئے ازالۃ الخفاء میں ہے کہ ایک ہزار چھتیس شہر مع ان کے مضافات کے مفتوح ہوئے اور چار ہزار مسجدیں بنیں اور چار ہزار گرجے ویران ہوئے اور نوسو منبر مسجدوں میں بنائے گئے۔ یعنی ۹ سو جامع مسجدیں بنیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں بھی عظیم فتوحات ہوئیں۔ قسطنطنیہ، افریقہ، جزیرہ قبرص بحری و بری جنگوں کے بعد فتح ہوئے اور ہرقل انہیں کے زمانہ میں فی النار ہوا۔ اس کے علاوہ بعض وہ ممالک جو باغی ہو گئے تھے۔ مثلاً ہمدان، رے، اسکندریہ، فارس، خراسان، آذربائیجان از سرِ نو فتح ہوئے۔

غرضیکہ اللہ عزوجل نے جن فتوحاتِ آئندہ کی اطلاع دی یا حضور علیہ السلام کو ان کا مشاہدہ کرایا۔ وہ حضرات خلفائے ثلاثہ کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئیں۔ جس سے حضرات خلفائے ثلاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی خلافت کا برحق ہونا بھی ثابت ہوا۔

اس کے بعد آپ نے صواحب الحُجر یعنی ازواجِ مطہرات کو جگانے کا حکم دیا تاکہ وہ رات کے نوافل پڑھیں۔ یہ حضور علیہ السلام کی عادتِ کریمہ تھی کہ جب کسی اہم بات کا ظہور ہوتا تو آپ عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے اور اوروں کو بھی اس طرف متوجہ فرماتے۔ چونکہ اس وقت ازواجِ مطہرات ہی حاضر تھیں اس لیے ان کو جگانے کا حکم دیا۔

رُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا یعنی بہت سی عورتیں جو اس دنیا میں تو پہنے اوڑھے نظر آتی ہیں مگر آخرت میں ننگی ہوں گی۔ اس میں عورتوں کی خصوصی طور پر عمل کی ترغیب دی گئی ہے کہ ان کو چاہیئے کہ وہ احکامِ اسلامیہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔

مسائل حدیث حدیثِ ہٰذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ آدمی کو رات میں اپنے اہل وعیال کو اللہ تعالیٰ کے ذکر و عبادت کے لیے جگانا مستحب ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ کسی اہم بات کا ظہور ہو۔ ۲۔ تعجب کے اظہار کے لیے سُبحان اللہ کہنا جائز ہے۔ ۳۔ رات کے وقت علم دین کی تعلیم دینا اور نصیحت کرنا بھی جائز ہے۔

بَابُ السَّمَرِ فِي الْعِلْمِ

باب رات کو سونے سے قبل علم کی باتیں کرنا

سمر: اس گفتگو کو کہتے ہیں جو رات کو سونے سے پہلے کی جاتی ہے۔ عموماً لوگ اپنی خوابگاہوں میں نیند آنے سے پہلے قصے کہانیاں اور فضول باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ سو جاتے ہیں۔ ایسا سمر جو امورِ خیر پر مشتمل نہ ہو ممنوع ہے لیکن یہاں اس سے مراد وعظ و نصیحت کی گفتگو ہے جو مستحب اور محمود عند الشرع ہے۔

۱۱۶ - اِنَّ عَبْدَ اللّٰهِ ابْنَ عُمَرَ قَالَ صَلّٰى بِنَا النَّبِيُّ | حضرت عبداللہ بن عمر نے بیان کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ فِي آخِرِ حَيَاتِهِ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ قَالَ أَرَأَيْتَكُمْ لَيْلَتَكُمْ هَذِهِ فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقَى مِمَّنْ هُوَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ

نے اپنی حیات کے آخری ایام میں ہمیں نمازِ عشا پڑھائی جب سلام پھیرا تو کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ تم بتاؤ تو اپنی اس رات کا حال جتنے لوگ اس وقت زمین پر ہیں اب سے سو برس کے بعد ان میں سے کوئی نہیں رہے گا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے کتاب الصلوٰۃ میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم نے فضائل میں گزشتہ باب میں رات کو وعظ و نصیحت کرنے کا ذکر تھا۔ اس باب میں سونے سے قبل وعظ و نصیحت کا بیان ہے ۲۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نماز ادا فرمائی وہ عشاء کی نماز تھی اور اپنے وصال کے ایک ماہ قبل یہ نماز پڑھائی تھی۔ جس کو راوی نے آخر حیاتہ کے الفاظ سے ظاہر کیا ہے ۳۔ اس حدیث میں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر کی ناپائیداری کی طرف توجہ دلائی ہے اور اللہ عزوجل کی بندگی و فرماں برداری میں وقت گزارنے اور امورِ خیر میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی ہدایت دی ہے۔

لَا يَبْقَى علامہ نووی نے فرمایا حدیث کے اس حد کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حضور علیہ السلام کے تکلم کے وقت زمین پر موجود ہیں وہ سو سال سے زیادہ مدت تک زندہ نہیں رہیں گے۔ لیکن جو لوگ اس تکلم کے بعد پیدا ہوئے وہ اس میں داخل نہیں ہیں یعنی ان کے لیے یہ حکم نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ حالانکہ وہ بھی زندہ ہیں اور شیطان بھی زندہ ہے۔ جواب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا تعلق بنی نوع انسان سے اور وہ بھی جو زمین پر ہو کیونکہ وجہ الارض کا لفظ موجود ہے اور خطاب بھی صرف انسانوں سے ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر نہیں ہیں بلکہ آسمانوں پر ہیں اور شیطان بنی آدم سے نہیں ہے بلکہ جن ہے۔ اسی طرح حضرت خضر کی موت پر بھی استدلالِ تام نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اس وقت حضرت خضر زمین پر نہ ہوں بلکہ سمندر میں ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ زمین سے مراد ہی عرب کی زمین ہو جیسا کہ آیتِ قرآنی الم تکن ارض اللہ واسعۃ میں ارض سے مراد مدینہ کی زمین ہے اور حضرت خضر اس رات عرب کی زمین پر نہ ہوں۔ غرضکہ ساکنانِ بحر و آسمان و ہوا اور غیر انسان اس ارشادِ نبوی میں داخل ہی نہیں ہیں۔ بعض شارحین نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس وقت مجلسِ نبوی میں موجود تھے ان سے یہ فرمایا کہ جن کو تم دیکھتے اور جانتے ہو۔ وہ سو برس سے زیادہ زندہ نہیں رہیں گے۔ چنانچہ سب سے آخری صحابی ابو الطفیل عامر بن واثلہ ہیں۔ جنہوں نے ۱۱۰ھ مکہ میں اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ میں اسی مدت کے اندر وفات پائی۔ واللہ اعلم۔

۱۱۷۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بِتُّ فِي بَيْتِ خَالَتِي مَيْمُونَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَهَا فِي لَيْلَتِهَا فَصَلَّى النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ ثُمَّ جَاءَ

حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے میمونہ بنت الحارث جو میری خالہ ہیں اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیوی ہیں۔ ان کے ہاں رات گزاری اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نمازِ عشا پڑھی۔ پھر اپنے حجرہ میں آکر چار رکعت

إِلَى مَنْزِلِهِ فَصَلَّى أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ ثُمَّ نَامَ ثُمَّ قَامَ ثُمَّ قَالَ نَامَ الْغُلَيِّمُ أَوْ كَلِمَةً تُشْبِهُهَا ثُمَّ قَامَ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ فَجَعَلَنِيْ عَنْ يَمِيْنِهِ فَصَلَّى خَمْسَ رَكَعَاتٍ ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ نَامَ حَتّٰى سَمِعْتُ غَطِيْطَهٗ أَوْ خَطِيْطَهٗ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلٰوةِ (بخاری)

پڑھیں۔ پھر سو رہے پھر اُٹھے اور فرمایا، غُلیم سو گیا یا اسی کے مشابہ کوئی کلمہ فرمایا۔ پھر آپ نماز کے لیے کھڑے ہوئے (میں بھی جاگا) اور آپ کے بائیں طرف کھڑا ہوا۔ آپ نے مجھے اپنی سیدھی طرف کرلیا اور پھر پانچ رکعت پڑھیں۔ پھر دو رکعت پڑھیں۔ پھر آپ سو گئے۔ حتیٰ کہ میں نے آپ کے خراٹے کی آواز سُنی۔ پھر آپ نمازِ فجر کے لیے (مسجد میں) تشریف لے گئے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے کتاب الصلوٰۃ میں ذکر کیا۔ اسی طرح ابو داؤد و نسائی نے۔ غُلَیِّم۔ غلام کی تصغیر ہے۔ اس سے حضرت ابن عباس مراد ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عشار کے بعد کل گیارہ رکعتیں پڑھیں ۶ نفل ۳ وتر۔ اس کے بعد دو رکعتیں۔ یہ سنّتِ فجر تھیں۔

حدیثِ ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ اس حدیث سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی فضیلت نکلتی ہے کہ باوجود کم سنی کے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رات کے اعمال پر نگاہ رکھتے تھے ۲۔ نفل نماز با جماعت پڑھ سکتے ہیں۔ ۳۔ عملِ یسیر سے نماز فاسد نہیں ہوتی ۴۔ اگر مقتدی ایک ہو تو وہ امام کے دائیں طرف کھڑا ہو ۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند ناقضِ وضو نہیں اور اس پر اُمت کا اجماع بھی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سوال کیا کہ آپ سو کر اُٹھتے ہیں تو بغیر وضو فرمائے نماز ادا فرمالیتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے جواب دیا کہ "عائشہ میری آنکھیں سوتی ہیں دل جاگتا ہے" ـــــ معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کی نیند بھی بے مثل ہے۔ لوگ سوتے ہیں تو ان کی آنکھیں اور دل بھی سو جاتے ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبِ مقدس ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔

بَابُ حِفْظِ الْعِلْمِ

باب علمِ دین کو یاد رکھنے کے بیان میں

اس باب میں امام بخاری نے سوائے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے کسی اور سے روایت نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیدنا ابوہریرہ حافظِ حدیث ہیں۔ یہ حضور علیہ السلام سے جو بات سنتے تھے اُسے بھولتے نہ تھے اور یہ ایک ایسی خصوصیت تھی جو کسی اور صحابی میں نہ تھی۔

۱۱۸۔ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ إِنَّ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ أَكْثَرَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ وَلَوْلَا آيَتَانِ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مَا حَدَّثْتُ حَدِيْثًا ثُمَّ يَتْلُوْ إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى إِلٰى قَوْلِهِ الرَّحِيْمُ إِنَّ إِخْوَانَنَا

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ ابوہریرۃ نے بہت حدیثیں روایت کیں اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں یہ دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث روایت نہ کرتا (قرآن میں سورۃ بقرہ) اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ جو لوگ چھپاتے ہیں ان کھلی ہوئی نشانیوں

مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفْقُ بِالْاَسْوَاقِ وَاِنَّ اِخْوَانَنَا مِنَ الْاَنْصَارِ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الْعَمَلُ فِیْ اَمْوَالِهِمْ وَاِنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَلْزَمُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشِبَعِ بَطْنِهٖ وَيَحْضُرُ مَا لَا يَحْضُرُوْنَ وَيَحْفَظُ مَا لَا يَحْفَظُوْنَ

(بخاری)

اور ہدایت کو جو ہم نے اُتاریں - اخیر تک (یعنی التواب الرحیم تک) ہمارے بھائی مہاجرین تو بازاروں میں خرید فروخت میں مشغول رہتے اور ہمارے بھائی انصار کھیتی باڑی میں مصروف رہتے اور ابوہریرہ (تجارت کرتا نہ زراعت) وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حاضر رہتا شکم سیر ہو کر اور ایسے موقعوں پر حاضر رہتا جہاں لوگ حاضر نہ رہتے اور وہ باتیں یاد رکھتا جن کو لوگ یاد نہ رکھتے۔

فوائد ۱- اس حدیث کو امام نے باب الزراعت اور الاعتصام میں ذکر کیا اور مسلم نے فضائل میں - ابن ماجہ نے سنت میں ذکر فرمایا - اکثر ابوہریرۃ - یہ لوگوں کے کلام کی حکایت ہے - یعنی لوگ کہتے ہیں - ابوہریرہ بہت حدیثیں روایت کرتے ہیں - ولولا ایتان - حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں - اگر قرآن میں کتمانِ دین کی ممانعت نہ ہوتی تو میں حدیث بیان نہ کرتا لیکن قرآن حکیم نے دین کے چھپانے سے منع فرمادیا تو اب مجھ پر واجب ہو گیا کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنوں اس کو دوسروں تک پہنچا دوں - صفق کے لغوی معنی پُشتِ دست پر ہاتھ مارنے کے ہیں - اس سے مراد بیع وشراء ہے - من الانصار - انصاری وہ لوگ ہیں جنھوں نے مدینہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جگہ دی اور ہر طرح سے آپ کی مدد کی - العمل فی اموالهم سے مراد کھیتی باڑی ہے - مسلم میں تصریح ہے کان یشغلهم عمل ارضهم مطلب یہ کہ مہاجرین و انصار خرید و فروخت و زراعت میں مشغول رہتے - اس وجہ سے ان کو دربارِ نبوی میں زیادہ حاضری کا موقع نہ ملتا اور حضرت ابوہریرہ تجارت و زراعت سے بے نیاز تھے - خود ہی فرماتے ہیں - میں تو مساکینِ صفہ میں سے ایک مسکین تھا اور پھر حضرت ابوہریرہ مجلسِ نبوی کے حاضر باش تھے - یہ بات بھی ان کی کثرتِ روایت کا سبب ہی ہے -

مسائل حدیث معلوم ہوا کہ صحابہ کرام حدیثِ رسول کو دین سمجھتے تھے اور دین سے متعلق قولاً و عملاً حضور علیہ السلام جو بھی ہدایات دیتے اس کے اظہار کو واجب جانتے تھے ۲- حضرت ابوہریرہ نے جن دو آیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے - ان میں ایک تو یہاں مذکور ہے - دوسری آیت بھی اسی صورت میں ہے یعنی یکتمون ما انزل اللہ من الکتب ویشترون بہ ثمنًا قلیلًا - اخیر تک - مطلب ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ہے کہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کے لیے بڑے عذاب کا وعدہ کیا ہے اور ان پر لعنت کی ہے جو دین کی بات کو چھپائیں - اس لیے جو حدیثیں مجھ کو معلوم ہیں ان کو بیان کرتا ہوں -

۱۲۰/۱۱۹ - عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اَسْمَعُ مِنْكَ حَدِيْثًا كَثِيْرًا اَنْسَاهُ قَالَ ابْسُطْ رِدَاءَكَ فَبَسَطْتُهٗ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی یارسول اللہ! میں آپ سے بہت باتیں سُنتا ہوں اور بھول جاتا ہوں - آپ نے فرمایا - اپنی چادر

فَغَرَفَ بِيَدَيْهِ ثُمَّ قَالَ ضُمَّ فَضَمَمْتُهُ فَمَا نَسِيْتُ شَيْئًا بَعْدُ (بخاری)

پھیلا ۔ میں نے چادر پھیلائی ۔ آپ نے میری چادر میں دو مٹھی بھر کر (ڈال دیا) فرمایا ۔ چادر سمیٹ لے ۔ میں نے اس کے بعد پھر میں کوئی بات نہ بھولا۔

فوائد اس حدیث کو امام بخاری نے علامات النبوۃ میں ذکر کیا ہے اور ترمذی نے مناقب میں ذکر کیا اور کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے ۔ ابن عیینہ کی روایت میں زہری سے ہے کہ ابوہریرہ نے کہا ۔ جب سے حضور علیہ السلام نے میری چادر میں کچھ ڈالا ہے ۔ خدا کی قسم جو کچھ آپ سے سنتا ہوں بھولتا نہیں ہوں ۔ یہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ آپ نے حضرت ابوہریرہ کو قوّتِ حافظہ عطا فرمائی ۔ اس سے معلوم ہوا کہ حسبِ ضرورت اپنی واقعی فضیلت کو بیان کرنا جائز ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ نے اپنی فضیلت بیان کی ۔ ہاں ازراہِ تکبّر وغرور اپنی فضیلت کو بیان کرنا ممنوع ہے ۔

۱۲۱ ۔ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِعَائَيْنِ فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ الْبُلْعُوْمُ مَجْرَى الطَّعَامِ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں ۔ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو برتن بھرے ہیں ۔ ایک برتن کو تو میں نے پھیلا دیا (اس کی تبلیغ کر دی) دوسرے برتن کو اگر پھیلاؤں تو میرا نرخرہ کاٹ دیا جائے (امام بخاری نے فرمایا ۔ بلعوم وہ ہے جس سے کھانا اُترتا ہے)

فوائد و مسائل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قسم کے علم حاصل کیے ۔ ایک وہ جن کا تعلق دین سے تھا تو جو حدیثیں دین اور شریعت سے متعلق تھیں ان کو میں نے پھیلا دیا کیونکہ ان کی تبلیغ و اشاعت فرض تھی لیکن دوسرا علم جس کا احکامِ شرعیہ سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کا اظہار بھی ضروری نہ تھا اس کو میں نے ظاہر نہیں کیا ۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کتمانِ دین حرام ہے اور جس کو دین کی کوئی بات معلوم ہو اس کا اظہار اور اس کی تبلیغ واجب ہے ۔ اس لیے سابقہ حدیث میں حضرت ابوہریرہ نے فرمایا کہ اگر قرآن پاک میں دین کے چھپانے کی ممانعت نہ ہوتی تو میں حدیث بیان کرنے میں اتنی کوشش نہ کرتا ۔

بَابُ الْاِنْصَاتِ لِلْعُلَمَاءِ

باب عالموں کی بات خاموش رہ کر سننے کا بیان

انصات ۔ کے معنیٰ گوشِ ہوش سے سننے کے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ جب وعظ و نصیحت کی بات کی جائے تو حاضرین کو خاموشی کے ساتھ سننا چاہئے ۔

۱۲۲ ۔ عَنْ جَرِيْرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهُ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ اِسْتَنْصِتِ النَّاسَ فَقَالَ لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ

حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں ۔ مجھے حجۃ الوداع کے دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ لوگوں کو خاموش کرو ۔ پھر فرمایا ۔ میرے بعد ایک دوسرے کو قتل کر کے کافروں کے سے کام نہ کرنا ۔

فوائد و مسائل ۱۔حدیثِ ہذا کو امام نے مغازی اور دیات میں بھی ذکر فرمایا۔مسلم نے ایمان اور جنایات، نسائی نے علم میں ابن ماجہ نے فتن میں ۲۔جریر ابن عبد اللہ بجلی ابو ذرعہ کے دادا تھے۔نہایت خوبصورت بلند قامت، مضبوط بدن کے صحابی تھے۔ان کا قد اونٹ کے کوہان تک پہنچتا تھا اور جوتے کی لمبائی ایک ہاتھ تک ہوتی تھی۔آپ رمضان سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع سے پہلے مسلمان ہوئے ۳۔یہ روایت دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خطبہ کا ٹکڑا ہے جو آپ نے حجۃ الوداع کے دن جب کہ لوگ رمی جمار کے لیے جمع تھے، ارشاد فرمایا جیسا کہ مسلم شریف میں ہے۔۴۔حدیث کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ میرے بعد ایک دوسرے کی گردنیں مار کر کافر نہ بن جانا۔لیکن اس سے افعالِ کفار کی مشابہت مراد ہے۔یعنی کافروں کے سے کام نہ کرنا۔چنانچہ دیگر دلائلِ شرعیہ سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کو ظلماً مارنے والا کافر نہیں ہوتا اور اس پر اجماع بھی ہے یا پھر حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قتلِ مومن کو حلال سمجھنا کفر ہے۔

مسائل حدیث مسلمان کے قتل کو حلال سمجھنا کفر ہے اور حرام جانتے ہوئے ظلماً ناحق مارنا گناہِ کبیرہ ہے اور اس فعل پر کتابِ مجید میں سخت وعید آئی ہے ۲۔جب وعظ و نصیحت کی مجلس قائم ہو تو حاضرینِ مجلس کو سکون و اطمینان سے سننا چاہیے۔

بَابُ مَا يَسْتَحِبُّ لِلْعَالِمِ إِذَا سُئِلَ

باب جب عالم سے یہ سوال ہو کہ لوگوں میں سب سے بڑا عالم کون

أَيُّ النَّاسِ أَعْلَمُ فَيَكِلَ الْعِلْمَ إِلَى اللهِ | ہے تو اس کو جواب میں یہ کہنا مناسب ہے کہ اللہ ہی جانے۔

۱۲۳- اس باب میں امام نے وہی حدیث ذکر کی ہے۔جس میں حضرت خضر و موسیٰ علیہما السلام کا واقعہ ہے۔اس حدیث میں باب سے متعلق صرف اتنا واقعہ ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا۔لوگوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ آپ نے فرمایا میں ہوں۔اگرچہ آپ کا یہ جواب بالکل حق و صواب تھا۔کیونکہ نبی اپنی امت میں سب سے زیادہ وظائفِ نبوت و امورِ شریعت کو جانتا ہے اور علم کے لحاظ سے بھی سب سے اعلم و افضل ہوتا ہے۔مگر یہ جواب عند اللہ زیادہ مناسب نہ قرار پایا۔اس وجہ سے اللہ عزوجل نے آپ پر عتاب فرمایا اور حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق بتایا کہ ان کو ہم نے وہ علم دیا ہے جس کے تم حامل نہیں ہو۔حدیث کے اس ٹکڑے سے امام نے یہ استدلال فرمایا ہے کہ جب اس قسم کا سوال ہو تو اللہ اعلم کے لفظ سے جواب دینا زیادہ مناسب ہے۔یہ حدیث مع تفہیم کے پہلے گزر چکی ہے اور امام نے اس حدیث کو تقریباً ۱۰ مقام پر ذکر کیا ہے اس لیے یہاں دوبارہ نہیں لکھی۔

بَابُ مَنْ سَأَلَ وَهُوَ قَائِمٌ عَالِمًا جَالِسًا

باب ایک شخص کھڑے کھڑے سوال کرے اور عالم بیٹھا ہوا ہو

علامہ ابن حجر نے فرمایا۔اس باب میں یہ بتانا مقصود ہے کہ سائل کھڑے کھڑے سوال کرے اور عالم بیٹھا ہوا ہو اور جواب دے تو جائز ہے بشرطیکہ بیٹھ کر جواب دینا ازراہِ تکبر وغرور نہ ہو۔اس سے معلوم ہوا کہ حسبِ ضرورت جس ہیئت میں ہو جواب دینا جائز ہے ۲۔عنوان کی ترکیب یہ ہے۔من موصولہ و حالیہ عالما مفعول ہے سأل کا اور جالسا صفت

۱۲۴ - عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا الْقِتَالُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاِنَّ اَحَدَنَا یُقَاتِلُ غَضَبًا وَّ یُقَاتِلُ حَمِیَّۃً فَرَفَعَ اِلَیْہِ رَاْسَہٗ قَالَ فَرَفَعَ اِلَیْہِ رَاْسَہٗ اِلَّا اَنَّہٗ کَانَ قَآئِمًا فَقَالَ مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (بخاری)

حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سوال کیا — یارسول اللہ قتال فی سبیل اللہ کیا ہے۔ کیونکہ ہم میں سے کوئی غصّے کی وجہ سے لڑتا ہے اور کوئی (شخصی یا قومی یا ملکی) حمیت (غیرت) کی وجہ سے لڑتا ہے۔ آپ نے اس کی طرف سر اُٹھایا۔ اس لیے کہ آپ بیٹھے ہوئے تھے اور سائل کھڑا تھا۔ فرمایا جو کوئی اس لیے لڑے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو وہ لڑنا اللہ کی راہ میں لڑنا ہے۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے جہاد، توحید اور کتاب الخمس میں ذکر کیا۔ ترمذی، ابوداؤد، مسلم و ابن ماجہ نے کتاب الجہاد میں ذکر کیا۔ یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ عمل کا مدار نیت پر ہے جب تک عمل میں اخلاص نہ ہو مقبول نہ ہوگا ۲۔ مجاہد وہ ہے جو صرف اللہ کے کلمہ کی بلندی کے لیے لڑے۔ ذاتی یا دنیوی مفاد کو اس میں قطعاً دخل نہ ہو۔ غضب اور غصہ کبھی دنیا کے لیے ہوتا ہے کبھی خدا کے لیے۔ تو جو غصہ اور غیرت اللہ کے لیے ہو وہ مطلوب و محبوب ہے۔ باعثِ اجر و ثواب ہے اور جو دنیا کے لیے ہے وہ دنیا ہی کے لیے ہے۔ یہ حدیث جوامع الکلم سے ہے۔ حضور علیہ السلام نے سائل کو بہت جامع مانع جواب دیا اور حمیت و غیرت کی تقسیم نہیں فرمائی کیونکہ پھر کلام طویل ہو جاتا آپ نے اصولی بات ارشاد فرمائی۔

"اللہ کے کلمہ کی بلندی کے لیے لڑنے والا مجاہد فی سبیل اللہ ہے"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کلماتِ طیبات کی شرح کی جائے تو دفتر بھر جائیں۔

بَابُ السُّؤَالِ وَالْفُتْیَا عِنْدَ رَمْیِ الْجِمَارِ

باب رمی جمار کے وقت مسئلہ پوچھنے اور جواب دینے کے بیان میں

۱۲۵۔ حافظ ابن حجر نے فرمایا۔ اس باب سے امام کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اگر عالم عبادت میں مشغول ہو اور وہ عبادت ایسی ہو۔ جس میں بولنا جائز ہو تو سائل کو ایسی حالت میں سوال کرنا اور عالم کو جواب دینا جائز ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت سوال کیا گیا جب کہ آپ جمرہ عقبہ کے پاس تھے اور آپ نے سائل کو جواب بھی دیا اس باب میں امام نے جو حدیث ذکر کی ہے وہ باب الفتیا علی الدابۃ میں مع شرح کے گزر چکی ہے۔ اسلیے ہم نے یہاں نہیں لکھی۔

بَابُ قَوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی

باب اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بیان میں

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا — کہ تم کو علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا

اللہ تعالیٰ کا علم غیر متناہی ہے اس باب سے امام بخاری کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مخلوقات کو جس قدر علوم عطا

ہوئے ہیں وہ اللہ عزّوجل کے سامنے بہرحال قلیل ہیں اور مخلوقات میں سے کوئی خواہ نبی ہو یا غیر نبی، اللہ عزّوجل کے علم کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ بخاری میں حدیثِ خضر میں ہے کہ ایک چڑیا نے کشتی کے کنارہ پر بیٹھ کر جب دریا میں اپنی چونچ تر کی تو حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا۔ اے موسیٰ میرا علم تیرا علم اور تمام مخلوقات کا علم باری تعالیٰ کے علم کے سامنے ایسا ہی ہے جیسے کہ دریا کے مقابلے میں اس چڑیا کا چونچ تر کرلینا۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ وما اوتیتم کے خطاب میں آپ بھی شامل ہیں؟ ہاں میں بھی اور تم بھی۔ مطلب یہ کہ انبیا کے علوم ہوں یا غیر انبیا کے وہ علوم الٰہیہ کے حضور قلیل ہی ہیں اور وہ نسبت بھی نہیں رکھتے جو ذرّہ کو آفتاب سے اور قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے۔ علامہ خفاجی حواشی بیضاوی میں طیبی سے نقل فرماتے ہیں کہ:۔

غیب السموات والارض وما یبدونہ و مایکتمونہ قطرۃ منہا

آسمانوں اور زمینوں کے غیب علم الٰہی سے ایک قطرہ ہیں۔ (بیضاوی)

حضور علیہ السلام کا علم اللہ تعالیٰ کے علم سے ایک قطرہ ہے

ہم اہلسنت وجماعت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم ماکان ومایکون کا اثبات کرتے ہیں۔ تو یہ بھی اللہ عزّوجل کے سامنے قلیل ہی ہے۔ مخلوقات میں سے کسی کو نہ تو اللہ عزّوجل کے برابر علم ہوسکتا ہے اور نہ تمام معلوماتِ الٰہیہ کا کوئی احاطہ کرسکتا ہے۔ غرضکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ علم جو غیب السموٰت والارض اور لوح وقلم کے علوم کا احاطہ کئے ہوئے ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے قلیل ہی ہے مگر مخلوقات کے سامنے کثیر ہے اور ایسا کثیر ہے کہ تمام مخلوقات کا علم بلکہ لوح وقلم کے علوم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم سے ایک قطرہ ہیں۔

۱۲۶۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ بَيْنَا اَنَا اَمْشِيْ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ خَرِبِ الْمَدِيْنَةِ وَهُوَ يَتَوَكَّاُ عَلٰى عَسِيْبٍ مَعَهٗ فَمَرَّ بِنَفَرٍ مِنَ الْيَهُوْدِ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ سَلُوْهُ عَنِ الرُّوْحِ وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَا تَسْئَلُوْهُ لَا يَجِيْئُ فِيْهِ بِشَيْئٍ تَكْرَهُوْنَهٗ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لَنَسْاَلَنَّهٗ فَقَالَ يَا اَبَا الْقَاسِمِ مَا الرُّوْحُ فَسَكَتَ فَقُلْتُ اِنَّهٗ يُوْحٰى اِلَيْهِ فَقُمْتُ فَلَمَّا انْجَلٰى عَنْهُ فَقَالَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا

حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مدینہ کے ویران مکانوں میں چل رہا تھا اور حضور کھجور کی چھڑی سے ٹیک لگائے ہوئے تھے جو آپ کے ساتھ تھی۔ پھر آپ چند یہودیوں کے سامنے سے گزرے۔ ان میں سے بعض نے بعض سے کہا۔ ان سے رُوح کے متعلق سوال کرو تو بعض نے کہا روح کے متعلق سوال مت کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جواب میں ایسی بات کہیں جو تم کو بُری لگے اور بعض نے کہا ہم ضرور سوال کریں گے۔ پس سوال کیا اے ابوالقاسم روح کیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے سکوت فرمایا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ حضور پر وحی آرہی ہے۔ اس لیے میں کھڑا ہوگیا۔ پھر جب وحی کی کیفیت جاتی رہی۔ آپ نے فرمایا (یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ تم سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ تم فرمادو،

(بخاری) | رُوح امرِ ربی سے ہے اور ان کو علم نہیں دیا گیا مگر کم

فوائد حدیث ا۔اس حدیث کو امام بخاری نے توحید، الاعتصام، باب مایکرہ من کثرۃ السّوال میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم نے رقاق میں، ترمذی و نسائی نے تفسیر میں ذکر فرمایا ہے ۲۔امام بخاری نے عنوان باندھا تھا کہ مخلوقات کو جو علم دیا گیا ہے۔ وہ علمِ الٰہی کے مقابل قلیل ہے۔ چنانچہ آیہ مبارکہ میں اسی کا ذکر ہے ۳۔اصل واقعہ یہ تھا کہ جب قریش حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق و امانت، چال چلن پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ کر سکے اور حضور علیہ السلام نے نبوّت کا اظہار فرمادیا تو اب انہوں نے طے کیا کہ اس معاملہ میں یہود سے مدد لی جائے۔ چنانچہ انہوں نے یہود سے مشورہ لیا۔ یہودیوں نے کہا آپ سے تین سوال کرو۔ اگر تینوں کا جواب دیدیں یا تینوں کا جواب نہ دیں تو یہ نبی نہیں اور اگر دو کا جواب دیں اور ایک کا جواب نہ دیں تو یہ ضرور نبی ہیں۔ قریش نے حضور علیہ السلام سے تین سوال کئے۔ اصحابِ کہف، ذوالقرنین اور رُوح کے متعلق، حضور علیہ السلام نے اوّل الذکر دونوں سوالوں کا تفصیل کے ساتھ جواب دیدیا۔ مگر رُوح کے متعلق آپ خاموش رہے۔ حتیٰ کہ وحی آگئی۔ چنانچہ قریش سوال کر کے نادم ہوئے۔ واضح ہو کہ توریت میں بھی روح کے متعلق مبہم ہی جواب تھا۔ اس لیے یہود نے حضور علیہ السلام کی صداقت کا معیار یہ مقرر کیا کہ آپ رُوح کے متعلق جواب نہ دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال پر سکوت فرمایا۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:۔

قالت الیھود ان فسر الروح فلیس بنبی فلذلك لم یجبھم (عینی ج ا صا۲۱۱) | یہود نے یہ طے کیا کہ آپ نے رُوح کی تفسیر کردی تو آپ نبی نہیں۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جواب نہ دیا۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سکوت فرمانے اور وحی کا انتظار کرنے کو اس امر کی دلیل بنانا غلط ہے کہ آپ کو روح کی حقیقت کا علم نہ تھا کیونکہ حضور علیہ السلام کا سکوت فرمانا تو اس لیے تھا کہ کفار نے آپ کی صداقت کا معیار یہ ٹھہرایا تھا کہ آپ رُوح کے متعلق سوال کا جواب نہ دیں۔ چنانچہ حضرت علامہ عینی شارح بخاری علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ رائے قائم کی کہ اللہ تعالیٰ نے روح کے معاملہ کو خلق پر مبہم رکھا ہے حتیٰ کہ انھوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی رُوح کی حقیقت سے واقف نہ تھے۔

قُلْتُ جُلُّ مَنْصَبُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ حَبِیْبُ اللّٰہِ وَ سَیِّدُ خَلْقِہٖ اَنْ یَکُوْنَ غَیْرَ عَالِمٍ بِالرُّوْحِ وَکَیْفَ وَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَیْہِ بِقَوْلِہٖ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا (عینی جلد ا صـ۲۱۱) | میں کہتا ہوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب بہت جلیل ہے وہ حبیب اللہ ہیں اور تمام مخلوقاتِ الٰہیہ کے سردار ہیں تو کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ رُوح کے عالم نہ ہوں جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر احسان فرمایا (اور قرآنِ حکیم میں آپ کے متعلق فرمایا) ہم نے آپ کو سکھا دیا جو آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر تو اللہ کا فضلِ عظیم ہے۔

دیکھئے علامہ عینی نے آیہ مبارکہ "علمك مالم تکن تعلم" میں "ما" کو عموم پر رکھا اور ما سے یہ استدلال فرمایا کہ اس کے عموم میں روح بھی داخل ہے۔ پھر کیسے یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو روح کا علم نہ دیا ہو۔

اس کے بعد علامہ عینی لکھتے ہیں۔ آیت یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو روح کا علم نہیں دیا یا حضور علیہ السلام روح کی حقیقت نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ وَقَدْ قَالَ اَکْثَرُ الْعُلَمَاءِ لَیْسَ فِی الْاٰیَۃِ دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّ الرُّوْحَ لَایُعْلَمُ وَلَاعَلٰی اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمْ یَکُنْ یَعْلَمُھَا (عینی ج ۲ ص ۲۱۲)

بَابُ مَنْ تَرَكَ بَعْضَ الْاِخْتِیَارِ مَخَافَۃً

باب ایک راجح کام کو اس وجہ سے چھوڑ دینا کہ لوگوں کی

اَنْ یَّقْصُرَ فَھْمُ بَعْضِ النَّاسِ فَیَقَعُوْا فِیْ اَشَدَّ مِنْہُ

عقلیں اس حکمت تک نہ پہنچیں اور اس کو کرنے سے لوگ اس سے بڑھ کر کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائیں۔

اس باب میں امام نے جس امر کی طرف توجہ دلائی ہے وہ فی زمانہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ امام یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جو فی نفسہٖ اچھے ہوتے ہیں لیکن ان اچھے کاموں کے کرنے سے جب یہ خطرہ محسوس ہو کہ لوگ ان کی اچھائی نہیں سمجھیں گے اور کسی بڑے فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے تو ان کاموں کو نہ کرنا بہتر ہے۔

۱۲۷ - قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا عَائِشَۃُ لَوْلَا اَنَّ قَوْمَكِ حَدِیْثٌ عَھْدُھُمْ قَالَ ابْنُ الزُّبَیْرِ بِکُفْرٍ لَنَقَضْتُ الْکَعْبَۃَ فَجَعَلْتُ لَھَا بَابَیْنِ بَابًا یَدْخُلُ النَّاسُ وَبَابًا یَخْرُجُوْنَ مِنْہُ فَفَعَلَہُ ابْنُ الزُّبَیْرِ

(بخاری شریف)

حضرت عائشہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تمہاری قوم کا زمانہ نیا نہ ہوتا (ابن الزبیر نے فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر قریش کے کفر کا زمانہ قریب نہ گزرا ہوتا اور اسلام لائے ہوئے ان کو عرصہ گزر گیا ہوتا) تو میں عمارت کعبہ کو گرا دیتا اور اس کے دو دروازے کر دیتا۔ ایک سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے دروازے سے نکلتے۔ پس حضرت ابن الزبیر نے کعبہ کے دو دروازے کر دیے۔

فوائد اس حدیث کو امام نے حج اور تمنی میں ذکر کیا ہے۔ مسلم و ابن ماجہ نے حج میں ذکر کیا۔ "حدیث عہدہم" کے حاصل معنیٰ یہ ہیں کہ قریش نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں اور ابھی وہ اس مقام پر نہیں پہنچے ہیں کہ افعال کی حکمت کو سمجھ سکیں اور افضل و ادنیٰ میں فرق کر سکیں ۲۔ حضور علیہ السلام کعبہ شریف کی عمارت کو قواعد ابراہیم علیہ السلام پر بنانا چاہتے تھے اور اس کے دو دروازے رکھنا چاہتے تھے مگر آپ نے محض اس مصلحت کی بنا پر اس کو ترک فرما دیا کہ قریش کے دل میں کعبہ معظمہ کی عظمت بہت ہے۔ کہیں وہ میرے اس فعل کی حکمت کو نہ سمجھیں اور کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائیں ۳۔ علامہ عینی لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے کعبہ ملائکہ نے تعمیر کیا۔ پھر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس کے بعد عمالقہ نے اس کے بعد قبیلہ جرہم نے۔ اس کے بعد قریش نے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شامل کیا تھا۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ کے مطابق کعبہ شریف کو بنایا۔ لیکن ظالم حجاج نے پھر ویسے ہی کر دیا جیسا کہ جاہلیت کے زمانہ میں تھا اور اب تک اسی حالت میں ہے ۴۔ ہارون نے امام مالک سے سوال کیا تھا کہ کیا اب کعبہ اسی طرح نہ بنا دیا جائے جیسا کہ

حضور علیہ السلام چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ ایسا مت کرو۔ اس لیے کہ پھر یہ کام ایک کھیل بن جائے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی افضل کام کو اس خطرہ کی بنا پر ترک کیا جا سکتا ہے کہ اس کے کرنے سے لوگ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ وہ کام فرض و واجب نہ ہو کیونکہ جو امور فرض و واجب ہیں وہ تو بہرصورت انجام دیئے جائیں گے۔ اس میں حکام کو بھی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ امورِ سلطنت کو انجام دینے میں مصلحتِ وقت کا خیال رکھیں۔ رُوح کے متعلق مزید گفتگو انشاء اللہ العزیز کتاب التفسیر میں ہوگی۔

بَابُ مَنْ خَصَّ بِالْعِلْمِ قَوْمًا

باب علم کی بعض باتیں ایک قوم کو بتانا اور دوسری

دُوْنَ قَوْمٍ كَرَاهِيَةَ اَنْ لَّا يَفْهَمُوْا قَالَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُوْنَ اَتُحِبُّوْنَ اَنْ يُّكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (بخاری)

کو نہ بتانا اس خیال سے کہ وہ نہ سمجھیں گے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا لوگوں سے وہ باتیں بیان کرو جو وہ سمجھ سکیں۔ کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کہ وہ اللہ و رسول کو جھٹلائیں۔

گزشتہ باب میں اس کا بیان تھا کہ کسی افضل کام کو اس لیے ترک کیا جا سکتا ہے کہ اس کے کرنے سے لوگ کسی بڑے فتنہ میں پڑ جائیں گے۔ اس باب میں فعل کی جگہ قول کا لفظ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے كَلِّمُوْهُمْ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ کہ لوگوں سے ان کے فہم و عقل کے موافق کلام کیا جائے اور ایسے امور جو مجمل و مبہم ہوں اور ایسے الفاظ جن کے ظاہری معنیٰ مراد نہ ہوں۔ وہ بغیر تفسیر و تشریح کے عوام کے سامنے نہ رکھے جائیں کیونکہ جو لوگ دین کی عمومی تعلیم اور قرآن و حدیث کے طرزِ بیان سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ صرف ترجمہ سے کچھ کا کچھ سمجھ جاتے ہیں اور یہ بات اللہ و رسول کی تکذیب کا سبب بن جاتی ہے اور اس کی متعدد وجوہات ہوتی ہیں۔

کبھی لفظ مجمل ہوتا ہے اور جب تک اس کی شرح نہ کر دی جائے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کبھی لفظ کے ظاہری معنیٰ مراد نہیں ہوتے اور یہ بتانا پڑتا ہے کہ یہ لفظ یہاں اس معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں لفظ کے حقیقی اور کہیں مجازی معنیٰ مراد ہوتے ہیں اور کہیں سیاق و سباق کو دیکھ کر اور دیگر دلائلِ شرعیہ کو پیشِ نظر رکھ کر معنیٰ متعین کیے جاتے ہیں۔ کہیں شارع علیہ السلام کا کوئی حکم یا فعل کسی خاص موقع یا محل کے لیے خاص ہوتا ہے اور لوگ صرف ترجمے سے اس کو عام حکم سمجھ جاتے ہیں اور شارع کے مرادی معنیٰ تک ان کی فہم نہیں پہنچتی ہے۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے ارشاد کا یہی مطلب ہے کہ عوام کے سامنے دینی مسائل و عقائد اسی طرح بیان کیے جائیں گے کہ وہ مسائل و عقائد کو سمجھ جائیں۔

۱۲۸- قَالَ ثَنَا اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمُعَاذٌ رَدِيْفُهٗ عَلَى الرَّحْلِ قَالَ يَا مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ

حضرت انس بن مالک راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو جب کہ وہ آپ کے ساتھ ایک ہی کجاوے پر سوار تھے پکارا اور فرمایا یا معاذ! انہوں نے عرض کی لبیک یا رسول اللہ وسعدیک۔ تین مرتبہ

يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ ثَلٰثًا قَالَ مَا مِنْ اَحَدٍ يَّشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ صِدْقًا مِّنْ قَلْبِهٖ اِلَّا حَرَّمَهُ اللهُ عَلَى النَّارِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اَفَلَا اُخْبِرُ بِهِ النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوْنَ قَالَ اِذًا يَّتَّكِلُوْا وَاَخْبَرَ بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهٖ تَاَثُّمًا (بخاری)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ جس کسی نے صدقِ دل سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دی تو اللہ تعالیٰ نے دوزخ پر ایسے شخص کو حرام کر دیا ۔ حضرت معاذ نے عرض کی کیا میں لوگوں کو اس کی خبر نہ کر دوں تاکہ وہ خوش ہوں ۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا ۔ پھر وہ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے ۔ پھر حضرت معاذ نے کتمانِ علم کے خوف سے بوقتِ وفات یہ حدیث لوگوں سے بیان کی ۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام مسلم نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے ۔ امام بخاری نے اسی مضمون کی ایک اور حدیث اس باب میں ذکر کی ہے مضمون دونوں کا ایک ہے ۔ اس لیے ہم نے اس کو چھوڑ دیا ۲۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت معاذ کو بشارت دینے سے منع فرمانا نہی تنزیہی تھی تحریمی نہ تھی ۔ اسی لیے حضرت معاذ نے بوقتِ وفات اس حدیث کو بیان کیا ۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام حدیثِ رسول کو دین سمجھتے تھے اور اس کے چھپانے کو گناہِ عظیم ۳۔ چونکہ مذکورہ بالا حدیث کے مضمون سے بعض افراد کا اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا امکان تھا کہ "نجات کے لیے صرف توحید و رسالت کا اقرار کافی ہے ۔ عمل کی ضرورت نہیں ہے"۔ اس لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احتیاطاً حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس بشارت کی اشاعت سے نہایت حکیمانہ انداز میں منع فرمایا اور ارشاد فرمایا ۔ "پھر لوگ اسی پر بھروسہ کر لیں گے"۔ اس لیے علمائے کرام کو یہ ہدایت ملتی ہے کہ وہ ایسی آیات اور احادیث کو جن کا مضمون مجمل یا مبہم ہو تفسیر و تشریح سے بیان کریں ۔ تاکہ عوام شارع علیہ السلام کی اصل مراد تک پہنچ جائیں اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں ۔

کیا صرف اقرارِ توحید و رسالت نجات کے لیے کافی ہے

متعدد حدیثوں کا یہ مضمون ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول اللہ کی رسالت کی صدقِ دل سے گواہی دی وہ جنتی ہے بلکہ بعض حدیثوں میں صرف اقرار توحید پر جنت کی بشارت دی گئی ۔ تو اس مضمون کی تمام حدیثوں میں اللہ کی توحید اور حضور علیہ السلام کی رسالت کی شہادت ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری ایمانی دعوت کو قبول کرے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین بنا لے ۔ اسی لیے ان دونوں شہادتوں کے ادا کرنے کا مطلب ہمیشہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس شخص نے حضور علیہ السلام کی ایمانی دعوت کو قبول کر لیا اور اسلام کو اپنا دین بنا لیا ۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے کافر و مسلمان بھی توحید و رسالت کی شہادت اور لا الہ الا اللہ کی شہادت کا مطلب حضور کی پوری دعوت کو قبول کر لینا ہی سمجھتے تھے ۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے آج کل اردو محاورہ میں اسلام قبول کرنے کو کلمہ پڑھنے سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت پورے اسلام کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے ۔ پس جس نے اس کلمہ کی شہادت ادا کی ۔ اس نے درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے پورے دین کو مان لیا اور پورے دین کے ماننے کا مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جن جن امور پر ایمان لانے کا حکم دیا ان سب کی تصدیق کی جائے اور زبان سے ان کا اقرار کیا جائے۔ لہذا حدیثِ زیر بحث کا مطلب یہ ہوا جس نے کلمہ پڑھ لیا یعنی حضور کے لاتے ہوئے دین کو اور آپ کی ایمانی دعوت کو مکمل طور پر قبول کر لیا اور اگر اسی حال میں مر گیا تو جنّت میں ضرور جائیگا۔ چنانچہ اس کی تائید و توثیق کہ توحید و رسالت پر ایمان لانے سے حضور علیہ السلام کی پوری دعوتِ ایمانی کو قبول کرنا اور پورے اسلام کو دین ماننا ہے۔ بخاری شریف ہی کی متعدد روایتوں سے ہوتی ہے جن میں توحید و رسالت کے ساتھ ساتھ دیگر ضروریاتِ دین کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔

لہذا اگر کوئی توحید و رسالت کا اقرار کرے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری دعوت قبول نہ کرے۔ توحید و رسالت کے علاوہ دوسرے ایمانیات کا انکار کرے مثلاً تقدیر، ملائکہ اور قیامت وغیرہ کو نہ مانے تو ایسا شخص ہرگز اس بشارت کا مستحق نہیں ہے اور جو لوگ مذکورہ بالا مضمون کی احادیث سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ توحید و رسالت کی شہادت ادا کرنے والا خواہ کتنا ہی بدعقیدہ ہو اور ایمانیات میں سے چاہے کسی ایک کا منکر ہو۔ وہ بہر حال مسلمان ہے اور عذابِ دوزخ سے محفوظ رہے گا۔ وہ ان بشارتی حدیثوں کے صحیح مفہوم و مدعا کے سمجھنے سے محروم ہیں اور قرآن و حدیث کے محاورہ و طرزِ بیان سے بالکل ناواقف ہیں۔ بعض لوگ ان ——— بشارتی حدیثوں کا یہی مطلب لیتے ہیں اور عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ دوسرے ابواب کی حدیثیں بلکہ قرآنِ پاک کی آیتیں ان کے اس نظریہ کی واضح لفظوں میں تردید کرتی ہیں۔ غرضکہ جن حدیثوں میں توحید یا توحید و رسالت کی گواہی پر مبنی ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔ ان کا صحیح مفہوم صرف یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری دعوت کو قبول کر لے۔ اسلام کو اپنا دین بنائے اور تمام ضروریاتِ دین کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کرے۔ پھر اگر اسی حال میں مر جائے تو عذابِ دوزخ سے ضرور محفوظ رہے گا۔

بَابُ الْحَيَاءِ فِي الْعِلْمِ

باب علم میں شرم کرنے کے بیان میں

وَقَالَ مُجَاهِدٌ لَا يَتَعَلَّمُ الْعِلْمَ مُسْتَحْيٍ وَلَا مُسْتَكْبِرٌ

اور امام مجاہد نے فرمایا جس کو حیا ہوگی یا غرور ہوگا وہ علم نہیں سیکھ سکتا۔

یعنی جو شخص متکبّر ہوگا اور اپنے آپ کو بڑا سمجھے گا اور وہ شخص جو کسی سے پڑھنے اور علم سیکھنے میں شرم کریگا وہ کیا حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لیے عقلائے نے کہا۔ علم کے لیے آفتیں ہیں۔ ان سب میں بڑی آفت استنکاف ہے جس کا ثمرہ جہالت ہے۔ سیدنا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا۔ آپ کو یہ علمِ عظیم کیسے حاصل ہوا تو آپ نے جواب دیا کہ میں نے کسی کو علم کے بتانے میں بخل نہیں کیا اور کسی سے علم حاصل کرنے میں شرم نہیں کی۔

وَقَالَتْ عَائِشَةُ نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْأَنْصَارِ لَمْ يَمْنَعْهُنَّ الْحَيَاءُ أَنْ يَتَفَقَّهْنَ فِي الدِّينِ (بخاری)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا انصار کی عورتیں کیا اچھی عورتیں ہیں جن کو شرم مسائلِ دینیہ کے سمجھنے سے نہیں روک سکی۔

یعنی انصار کی عورتوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ضروری مسائل پوچھنے میں شرم نہیں کی۔جس کی وجہ سے سارے عالم کی عورتوں کو فائدہ پہنچا اور عورتوں سے مخصوص بہت سے دینی مسائل معلوم ہو گئے۔

۱۳۰- عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ جَاءَتْ أُمُّ سُلَيْمٍ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ فَهَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ مِنْ غُسْلٍ إِذَا احْتَلَمَتْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ فَغَطَّتْ أُمُّ سَلَمَةَ تَعْنِي وَجْهَهَا وَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَوَتَحْتَلِمُ الْمَرْأَةُ قَالَ نَعَمْ تَرِبَتْ يَمِينُكِ فَبِمَ يُشْبِهُهَا وَلَدُهَا (بخاری)

حضرت ام سلیم (حضرت انس کی والدہ) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں۔عرض کی حضور اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے حیا نہیں فرماتا۔کیا عورت کو احتلام ہو تو اس پر غسل ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں (اس پر غسل واجب ہے جب کہ وہ منی کو دیکھے۔اپنے کپڑے پر) یہ سن کر حضرت ام سلمہ ام المؤمنین نے اپنا منہ ڈھانپ لیا اور عرض کی یا رسول اللہ! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے۔حضور نے فرمایا۔ہاں! (تیرے ہاتھ گرد آلود ہوں) اسی لیے تو عورت کا بچہ اس کا ہم شکل ہوتا ہے۔

فوائد و مسائل ۱۔اس حدیث کو امام بخاری نے طہارت میں بھی ذکر کیا ہے۔اسی طرح ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے بھی طہارت میں ذکر کیا ہے اور مسلم نے طہارت و علم میں ذکر فرمایا ہے۔یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

۱۔بوقت ضرورت مسائل دینیہ کے معلوم کرنے میں شرم نہیں کرنی چاہیے ۲۔عورت کو اگر خواب میں احتلام ہو تو اس پر بھی غسل فرض ہے۔

۲۔ارسطو کا نظریہ یہ ہے کہ عورت کے بھی منی ہوتی ہے اور بچہ عورت اور مرد دونوں کی منی سے بنتا ہے۔لیکن جالینوس کا خیال یہ ہے کہ بچہ صرف مرد کی منی سے بنتا ہے اور عورت کے منی نہیں ہوتی۔ایک رطوبت ہے جو منی کے مشابہ ہے حدیث میں ہے مرد کی منی غلیظ اور بودار ہوتی ہے اور عورت کی منی رقیق زردی مائل ہوتی ہے تو زوجین میں سے جس کی منی غالب آجائے بچہ اسی کی شکل پر ہوتا ہے۔اس حدیث نے جالینوس کے خیال کی تردید کردی۔

۳۔حضرت ام سلیم نے احتلام کے متعلق سوال کیا اور اس سے شرم نہ کی جس سے واضح ہوا کہ مسائل و احکام دین کے سمجھنے اور پوچھنے میں شرم کرنا مذموم ہے ۴۔امہات المؤمنین کو اللہ عزوجل نے حاضری خدمت سے پہلے بھی احتلام سے محفوظ رکھا اس لیے کہ احتلام میں شیطان کی مداخلت ہوتی ہے اور شیطانی مداخلتوں سے ازواج مطہرات پاک ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب ام سلیم نے احتلام کے متعلق سوال کیا تو حضرت ام المؤمنین ام سلمہ کو اس سوال پر تعجب ہوا۔

نوٹ اس کے بعد امام نے وہی حدیث ذکر کی ہے جو کتاب العلم کے شروع میں گزر چکی ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے سوال کیا تھا کہ درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے۔مسلمان کی وہی مثال ہے بتاؤ وہ کونسا درخت ہے۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ میرا ذہن کھجور کے درخت کی طرف گیا۔مگر میں نے بوجہ شرم جواب نہ دیا۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا۔اگر تم اس وقت جواب دیدیتے تو:-

فَقَالَ لَاَنْ تَكُوْنَ قُلْتَهَا اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ يَّكُوْنَ لِيْ كَذَا وَكَذَا (بخاری)

تمہارا جواب مجھے کثیر دولت مل جانے سے زیادہ محبوب ہوتا

شارحین نے لکھا ہے کہ امام بخاری نے حدیث کے اتنے ٹکڑے سے یہ استدلال کیا ہے کہ دین کی بات میں شرم کرنا اچھا نہیں۔ جبھی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ملامت کی کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سوال فرمارہے تھے اور تمہارے ذہن میں جواب آیا تھا تو عرض کیوں نہ کردیا اور اگر تم عرض کردیتے تو مجھے بہت سے خزانے مل جانے سے زیادہ خوشی ہوتی اور یہی ترجمۃ الباب ہے۔

بَابُ مَنِ اسْتَحْيٰى فَاَمَرَ غَيْرَهٗ بِالسُّؤَالِ

باب، جو علم کی بات خود پوچھنے میں شرم کرے پس دوسرے کو سوال کرنیکا حکم دے

۱۳۲۔ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ كُنْتُ رَجُلًا مَذَّاءً فَاَمَرْتُ الْمِقْدَادَ اَنْ يَّسْاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلَهٗ فَقَالَ فِيْهِ الْوُضُوْءُ

(بخاری شریف)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کہتے ہیں میں ایک مرد تھا بہت مذی والا۔ میں نے مقداد سے کہا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت کریں پس انہوں نے حضور سے پوچھا۔ آپ نے فرمایا۔ مذی کے نکلنے پر وضو ہے (غسل نہیں)

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے دوسری بار طہارت میں ذکر کیا ہے۔ نسائی و مسلم نے طہارت و علم میں ذکر فرمایا ہے۔

۲۔ **مذی**۔ اس لیسدار رطوبت کو کہتے ہیں جو بوقتِ بوس و کنار مرد کی شرمگاہ سے نکلتی ہے۔ مذی کے نکلنے سے شہوت ختم نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس منی گاڑھی ہوتی ہے۔ اس میں بدبو بھی ہوتی ہے۔ جب یہ خارج ہو تو لذت آتی ہے اور منی کے نکلنے کے بعد سکون ہوجاتا ہے۔ اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ابتدا میں جو رطوبت نکلتی ہے۔ جس کو مذی کہتے ہیں صرف اس کے نکلنے سے غسل واجب نہیں ہوتا البتہ وضو ٹوٹتا ہے۔

۳۔ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد بھی تھے اس لیے انہوں نے خود اس مسئلہ کے پوچھنے میں شرم کی اور حضرت مقداد کے ذریعہ مسئلہ معلوم کرایا جس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی خود مسئلہ پوچھنے میں شرم کرے تو دوسرے کے ذریعے معلوم کرائے۔ اسی طرح اگر عورتیں اپنے مخصوص مسائل خود معلوم کرنے میں شرم محسوس کریں تو اپنے شوہروں کے ذریعہ سے معلوم کرائیں۔

بَابُ ذِكْرِ الْعِلْمِ وَالْفُتْيَا فِي الْمَسْجِدِ

باب، مسجد میں علم کی باتیں کرنا اور فتویٰ دینا

۱۳۳۔ اس باب میں امام بخاری نے ایک حدیث ذکر کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ ایک شخص نے مسجد نبوی میں کھڑے ہوکر حضور علیہ السلام سے حج کے متعلق پوچھا اور حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا ـــــ حدیث کے اس ٹکڑے سے امام بخاری نے یہ استدلال کیا کہ مسجد میں دین کا درس دینا اور مقدمات کا فیصلہ کرنا جائز ہے۔ یہ

حدیث کتاب الحج میں آرہی ہے۔ وہاں اس پر مفصل گفتگو کی جائے گی۔

بَابُ مَنْ اَجَابَ السَّائِلَ بِاَكْثَرَ مِمَّا سَاَلَهُ

باب، سوال کرنے والے نے جتنا سوال کیا اس سے زیادہ جواب دینا

۱۳۴- اس باب میں امام نے حدیث ذکر کی ہے کہ ایک شخص نے حضور علیہ السلام سے سوال کیا کہ جو احرام باندھے ہوئے ہو وہ کیا پہنے؟ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔ قمیص، عمامہ، پاجامہ اور ٹوپی نہ پہنے۔ امام نے اس حدیث سے یہ استدلال فرمایا کہ سائل کے سوال سے زیادہ جواب دینا جائز ہے۔ کیونکہ سائل نے صرف یہ پوچھا تھا کہ محرم کونسا لباس پہنے؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا فلاں فلاں لباس نہ پہنے۔ جواب سوال سے زیادہ ہے یہ حدیث کتاب الحج میں آرہی ہے۔ وہاں ہم مفصل گفتگو کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

خاتمہ کتاب العلم ختم ہوگئی۔ اس کے بعد کتاب الوضوء شروع ہوگئی۔ کتاب العلم میں کل ۱۰۶ حدیثیں ہیں۔ ان میں متابعات بہ صیغہ تعلیق ۱۸ ہیں اور جن تعلیقوں کو امام نے وصل نہیں کیا چار ہیں۔ باقی اسّی حدیثیں موصول ہیں جن میں مکرر ۱۶ احادیث ہیں۔ بحذف مکرر اس کتاب میں صرف ۶۴ حدیثیں ہیں۔

كِتَابُ الْوُضُوْءِ

۱- چونکہ ایمان کے بعد سب سے اہم فرض نماز ہے اور نماز کے لیے طہارت شرط ہے اس لیے اب وضوء کا بیان شروع ہوتا ہے۔ بخاری کے بعض نسخوں میں کتاب الوضوء کی جگہ کتاب الطہارت کے الفاظ آئے ہیں جو زیادہ مناسب تھے کیونکہ طہارت عام ہے اور وضوء خاص ہے۔ پھر لفظ کتاب بھی متقاضی تھا کہ بڑا عنوان لفظ عام (طہارت) سے قائم کیا جاتا۔

۲- اس کتاب میں طہارت کی ایک نوع وضوء کو بیان کرنا مقصود ہے۔

۳- وضوء وضاءۃ سے ہے۔ اس کے معنیٰ نظافت کے ہیں۔ اس میں تین لغت ہیں۔ وُضوء یہ نام ہے فعل کا، وَضوء وہ پانی ہے جس سے نظافت حاصل کی جائے ــــــ وِضوء آلہ نظافت کو کہتے ہیں اور اصطلاح شرع میں وضوء ہاتھ پاؤں اور چہرہ کو دھونے اور سر کے مسح کرنے کو کہتے ہیں۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ

باب اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے متعلق کہ فرمایا

اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ (بخاری)	جب تم نماز کا ارادہ کرو (اور بے وضوء ہو) تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں سمیت دھوؤ اور اپنے پاؤں ٹخنوں سمیت دھوؤ

۱- امام نے آیت بطور تبرک لکھی ہے اور یہ بتانے کے لئے بھی کہ مسائل وضوء میں آیت اصل (جڑ) کا حکم رکھتی ہے اور حدیث میں وضوء سے متعلق جو ہدایات بیان ہوں گی وہ اسی آیت سے مستفاد ہیں اور اسی کی تشریح و توضیح ہیں ــــ

صلوٰۃ، صَلیٰ سے مشتق ہے۔ صلی اس ہڈی کو کہتے ہیں جس پر سرین قائم ہے اور اصطلاحِ شرع میں صلوٰۃ ارکانِ مخصوصہ و اذکارِ معلومہ کا نام ہے۔ فَاغْسِلُوْا۔ غسل کے معنیٰ شریعت میں عضو پر پانی بہانے کے ہیں۔ اس طرح کہ کم از کم دو بوند پانی عضو سے بہہ جائے۔ صرف عضو کو بھگو لینے یا تیل کی طرح پانی چپڑ لینے یا ایک آدھ بوند پانی بہہ جانے کو غسل (دھونا) نہیں کہیں گے نہ اس سے وضو و غسل ادا ہوگا اور اگر عضو پر نجاست ہو تو پھر دھونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس طرح پانی بہایا جائے کہ نجاست بالکل زائل ہو جائے۔ وُجُوْهَكُمْ۔ وجہ کی جمع ہے۔ شروع پیشانی سے جہاں سے بال جمنے کی ابتدا ہو۔ ٹھوڑی تک طول میں اور عرض میں ایک کان سے دوسرے کان تک چہرہ ہے۔ اس حد کے اندر جلد کے ہر حصہ پر ایک مرتبہ پانی بہہ جانا ضروری ہے۔ اگر بال برابر بھی سوکھا رہ گیا وضو نہ ہوگا۔ وایدیکم۔ جمع ہے ید کی۔ مرافق جمع ہے مرفق کی۔ مرفق کہنی کو کہتے ہیں یعنی وضو میں ہاتھ کہنی سمیت دھوئے جائیں۔ وامسحوا مسح کے متعدد معنیٰ ہیں۔ ہاتھ پھیرنا، حرارت کا (؟) ...... ناپنا، سفر کرنا۔ عرب بولتے ہیں۔ مسح الارض مساحۃ مسح المرأۃ مسحہ بالسیف۔ مسحت الابل یومہا (فافہم) ——— اصطلاحِ شرع میں ہاتھ پر پانی کی جو تری رہ جائے اس کو عضو پر پھیرنے کا نام مسح ہے۔ خواہ وہ تری اعضاء کے دھونے کے بعد رہ گئی ہو یا نئے پانی سے ہاتھ کو تر کیا گیا ہو۔ رؤسکم، راس کی جمع ہے ——— احناف کے نزدیک چوتھائی سر کا مسح کرنا فرض ہے۔ ارجلکم، رجل کی جمع ہے اور کعب پاؤں کے ٹخنے کو کہتے ہیں۔ وضو میں ٹخنوں سمیت پاؤں کا دھونا بھی فرض ہے۔

وضو میں ایک بار اعضاء کو دھونا فرض ہے

وَقَالَ اَبُوْعَبْدِ اللّٰهِ وَبَيَّنَ النَّبِيُّ اِنَّ فَرْضَ الْوُضُوْءِ مَرَّةً مَرَّةً وَتَوَضَّاءَ اَيْضًا مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ وَثَلَاثًا وَلَمْ يَزِدْ عَلٰى ثَلَاثٍ وَكَرِهَ اَهْلُ الْعِلْمِ الْاِسْرَافَ فِيْهِ اَنْ يُّجَاوِزُوْا فِعْلَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (بخاری)

امام بخاری نے کہا کہ حضور علیہ السلام نے (حدیث میں) بیان کر دیا کہ وضو میں ایک ایک بار اعضاء کا دھونا (فرض) ہے۔ نیز آپ نے دو دو بار اعضاءِ وضو کو دھویا اور تین بار بھی۔ مگر تین بار سے زیادہ نہیں دھویا اور اہلِ علم نے وضو میں اسراف اور حضور علیہ السلام کے فعل سے بڑھ جانا مکروہ سمجھا ہے۔

واضح ہوا کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اعضاءِ وضو کو ایک ایک بار دو دو بار اور تین تین بار تک دھونا ثابت ہے۔ لیکن تین بار سے زائد دھونا ثابت نہیں۔ حضرات علی و عثمان و ابی امامہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے تین بار دھونا مروی ہے اور حضرت ابن عباس و فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ایک بار اور حضرت عبداللہ بن زید سے دو بار دھونا مروی ہے (طحاوی) جس سے واضح ہوا کہ اعضاءِ وضو کو ایک ایک بار دھونا فرض ہے اور تین بار دھونا سنّت ہے۔ کیونکہ اگر دو دو بار یا تین تین بار دھونا فرض ہوتا تو حضور علیہ السلام ایک بار دھونے پر اکتفا نہ فرماتے۔ اسی لیے ائمہ اربعہ اس امر پر متفق ہیں کہ تین بار سے زائد دھونا مکروہِ تنزیہی ہے اور خلافِ سنّت ہے۔ نیز ابن ماجہ و ابوداؤد میں ہے کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس نے تین بار سے زائد دھویا (فَقَدْ اَسَاءَ وَتَعَدّٰى وَظَلَمَ) اس نے زیادتی کی کیونکہ حدِ سنّت سے

تجاوز کیا۔ ظلم کیا کیونکہ اس نے چیز کو اس کے محل میں نہ رکھا بُرا کیا کیونکہ افضل کو ترک کیا۔

بَابٌ لَا تُقْبَلُ صَلٰوةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ

باب، بغیر وضو کے نماز قبول نہیں ہوتی

۱۳۵۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُقْبَلُ صَلٰوةُ مَنْ اَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّأَ قَالَ رَجُلٌ مِنْ حَضْرَمَوْتَ مَا الْحَدَثُ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ فُسَاءٌ اَوْ ضُرَاطٌ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو حدث ہوا اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ جب تک وضو نہ کرے ایک شخص جو حضر موت کے رہنے والے تھے انہوں نے پوچھا ابوہریرہ! حدث کسے کہتے ہیں؟ کہا پھُسکی یا گوز کو!

فوائد و مسائل ۱۔ امام بخاری نے اس حدیث کو باب ترک الحیل میں بھی ذکر کیا ہے۔ امام مسلم و ترمذی و ابوداؤد نے کتاب الطہارت میں ذکر کیا ہے ۲۔ فساء اس ریح کو کہتے ہیں جو پاخانہ کے مقام سے نکلے اور اس میں آواز نہ ہو اور جس میں آواز ہو اس کو ضُراط کہتے ہیں۔ لا تقبل صلاۃ، قبول کے حقیقی معنیٰ یہ ہیں کہ عمل کا ثواب ملے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو اور فرض ذمہ سے ساقط ہوجائے لیکن یہاں قبول کے حقیقی معنیٰ مراد نہیں بلکہ قبول کے معنیٰ صحت کے ہیں اور لا تقبل صلاۃ کے معنیٰ یہ ہیں کہ بے وضو کی نماز صحیح نہیں ہوتی اور یہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کاہن کے پاس جائے اس کی نماز قبول نہیں۔ یہاں قبول کے حقیقی معنیٰ مراد ہیں یعنی ایسے شخص کی نماز تو صحیح ہے مگر بارگاہِ خداوندی میں شرف قبولیت حاصل نہیں کرتی اور ثواب نہیں ملتا۔ معلوم ہوا کہ ہر مقبول عمل صحیح ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر صحیح عمل مقبول بھی ہو۔ صلاۃ سے ہر قسم کی نماز مراد ہے۔ خواہ وہ فرض نماز ہو یا سُنّت یا واجب۔ ہر نماز کی صحت وضوء وطہارت پر موقوف ہے۔

مَنْ اَحْدَثَ کا معنیٰ یہ ہے کہ جس نے حدث کو پایا۔ حدثِ اکبر جنابت حیض و نفاس ہے اس سے غسل فرض ہوتا ہے اور حدثِ اصغر وہ چیزیں جن سے وضوء لازم آتا ہے۔ جیسے مرد و عورت کے آگے سے منی (بلا شہوت کا اخراج) مذی، ودی، پاخانہ یا پیشاب کا نکلنا یا پیچھے سے ہوا کا خارج ہونا۔ لیٹ کر سونا اور منہ بھر قے کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو حدث ہو تو جب تک وہ حدث کو دُور نہ کرلے اس وقت تک اسکی نماز صحیح نہ ہوگی۔ حتیٰ توضاء۔ یہ "نفی قبول" کی غایت کا بیان ہے کہ نماز اس کی صحیح ہوگی جو کہ وضوء کرکے نماز پڑھے اور اگر پانی پر قدرت نہ ہو تو تیمم کرلے کیونکہ تیمم وضوء کے قائم مقام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلصَّعِيْدُ الطَّيِّبُ وُضُوْءُ الْمُسْلِمِ | پاک مٹی مسلمان کا وضوء ہے۔

فُسَاءٌ اَوْ ضُرَاطٌ کے معنی سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف پیچھے سے ہوا خارج ہونے کو حدث کیوں کہا؟ حالانکہ پیشاب و پاخانہ کا خارج ہونا بھی حدث ہے۔ شارحین نے اس سوال کے متعدد جواب دیئے ہیں۔ اوّل، سائل کو چونکہ باقی انواعِ حدث کا علم تھا۔ اس

لیے ابوہریرہ نے صرف "ہوا کے خارج ہونے" کے بیان پر اکتفا کیا۔ دوم، حضرت ابوہریرہ نے ہوا کے خارج ہونے پر اکتفا اس لیے کیا کہ جب ہوا کا خارج ہونا حدث ہے تو اس کی جگہ پیشاب پاخانہ یا منی وغیرہ خارج ہوگا تو وہ بطریق اولیٰ حدث ہوگا۔ سوم، حضرت ابوہریرہ کا مقصد حصر نہیں ہے کہ صرف فساء وضراط ہی حدث ہیں۔ چہارم یہ کہ سائل نے پوچھا تھا کہ نماز کے اندر حدث کیا ہوتا ہے تو حضرت ابوہریرہ نے بتایا کہ نماز میں حدث یہی ہے کہ ہوا خارج ہو جائے۔ کیونکہ پاخانہ وپیشاب عموماً نماز میں نہیں آتے تو ابوہریرہ نے سائل کے سوال کے مطابق جواب دیدیا۔

مسائل حدیث حدیثِ ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔
ہر قسم کی نماز کے لیے وضوء شرط ہے۔ خواہ وہ نماز فرض ہو یا واجب، جنازہ کی ہو یا عیدین کی اور اس مسئلہ پر علمائے اُمّت کا اجماع ہے۔ بعض شافعیہ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ جس نے قصداً بے وضو نماز پڑھی وہ سخت گناہگار ہے اور حضرت امام اعظم سے منقول ہے کہ ایسا شخص کافر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص ازراہِ تمسخر واستہزاء بے وضو نماز پڑھے وہ کافر ہے ۲۔ نماز پڑھتے ہوئے حدث ہو تو نماز باطل ہو جائے گی۔

بَابُ فَضْلِ الْوُضُوْءِ وَالْغُرُّ الْمُحَجَّلُوْنَ

باب، وضوء کی فضیلت اور ان لوگوں کی جو قیامت کے دن وضوء کے نشانوں سے سپید پیشانی والے ہوں گے

مِنْ اٰثَارِ الْوُضُوْءِ

۱۳۶۔ عَنْ نُعَيْمِ الْمُجْمِرِ قَالَ رَقِيْتُ مَعَ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَلٰى ظَهْرِ الْمَسْجِدِ فَتَوَضَّاءَ فَقَالَ اِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اُمَّتِيْ يُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ غُرًّا مُّحَجَّلِيْنَ مِنْ اٰثَارِ الْوُضُوْءِ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ يُّطِيْلَ غُرَّتَهٗ فَلْيَفْعَلْ (بخاری شریف)

نعیم بن عبداللہ مجمرؒ سے روایت ہے انہوں نے کہا میں ابوہریرہ کے ساتھ مسجد کی چھت پر چڑھا۔ ابوہریرہ نے وضوء کیا۔ پھر کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ میری اُمت کے لوگ قیامت کے دن بُلائے جائیں گے۔ سپید پیشانیوں اور سفید ہاتھ پیر والے وضوء کے نشانوں سے تو جو کوئی تم میں سے سفیدی بڑھانا چاہے۔ وہ بڑھائے۔

فوائد ومسائل ۱۔ اس حدیث کو امام مسلم علیہ الرحمۃ نے طہارت میں ذکر کیا ہے ۲۔ یہ حدیث گیارہ صحابہ کرام نے روایت کی ہے ۳۔ غُرٌّ، اغرائی کی جمع ہے۔ محجلین جمع ہے محجل کی۔ وہ سپیدی جو گھوڑے کے اگلے دونوں پاؤں میں ہو اس کو محجل کہتے ہیں۔ المسجد میں الف لام عہدی ہے۔ اس سے مسجدِ نبوی مراد ہے۔ نعیم مجمر مجمر اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اجمار کے معنیٰ عود وعنبر ولوبان وغیرہ سے دھونی دینے کے ہیں کیونکہ حضرت نعیم مسجدِ نبوی میں خوشبو کرنے کے لیے لوبان وغیرہ سُلگایا کرتے تھے۔ اس لیے ان کو مجمر کہا گیا۔ یُدْعَوْنَ۔ دُعا بمعنی ندا ہے۔ یعنی اُمّتِ محمدیہ قیامت کے دن میزان پر بُلائی جائے گی اور ان کے اعضاء وضوء نورانی ہوں گے اور عرصاتِ محشر میں اعضاءِ وضوء کی نورانیت ان کو دیگر انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں سے ممتاز کردے گی۔

۳- حدیث ہذا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مِنْ اٰثَارِ الْوُضُوْءِ تک ہیں فَمَنِ اسْتَطَاعَ یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اپنا کلام ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کی روایت میں خود نعیم یہ کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ یہ جملہ حضور علیہ السلام کا فرمودہ ہے یا حضرت ابوہریرہ کا قول ہے۔ اس کے علاوہ دس صحابہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے مگر کسی میں یہ آخری جملہ نہیں ہے۔ ان یطیل غرتہ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے اعضائے وضو کی نورانیت کو زیادہ کرنا چاہے تو وہ ان اعضاء کو جس حد تک کہ ان کا دھونا ضروری ہے۔ اس سے زیادہ دھوئے۔ مثلاً ہاتھ کہنیوں تک دھوئے جاتے ہیں تو ہاتھ کو مونڈھوں تک دھوئے۔ اس طرح دوسرے اعضاء کو دھوئے۔ یہ حضرت ابوہریرہ کا اپنا مسلک ہے جو مقبول نہیں ہوا لیکن ان یطیل غرتہ' کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہر نماز کے لیے تازہ وضوء کیا جائے تو جیسے ایک چیز کو ایک بار دھونے کے بعد دوسری بار دھونے سے نظافت و پاکیزگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی وضوء پر وضو کرنے سے آخرت میں اعضائے وضوء کی نورانیت میں اضافہ ہوگا۔

۴- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد کی چھت پر وضوء کیا؛ اس سے مسجد کی چھت پر وضوء کرنے کا جواز نکلتا ہے اور چونکہ مسجد اور اس کی چھت سب کا حکم ایک ہے۔ اس بناء پر حضرت ابن عباس وابن عمر وعطاء ونخعی وطاؤس و ابن قاسم وغیرہ صحابہ کرام وفقہاء عظام نے مسجد میں وضو کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ جو جگہ مسجد میں وضوء کے لیے مقرر کر دی گئی ہے وہاں تو جائز ہے لیکن مسجد میں وضوء کرنا مکروہ ہے۔ امام اعظم علیہ الرحمۃ کا یہ قول در اصل حضور علیہ السلام کی ان قولی احادیث سے مستفاد ہے۔ جن میں مسجد کی نظافت و پاکیزگی کو قائم رکھنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

واضح ہو کہ جو اہلِ علم مسجد میں وضوء کے جواز کے قائل ہیں۔ وہ یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ جائز اس صورت میں ہے کہ جب مسجد خراب نہ ہو اور نمازیوں کو تکلیف نہ ہو۔ اس زمانہ میں مسجدیں کچی ہوتی تھیں۔ زمین ریتلی تھی۔ پانی گرا اور جلد جذب ہو گیا۔ اس لیے انھوں نے جواز کا قول کیا لیکن ہمارے زمانہ میں اگر مسجد کے اندر وضوء کی اجازت ہو جائے تو پھر فرش کے خراب ہونے کے علاوہ نمازیوں کو بھی کافی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا اور مسجد کی نظافت و پاکیزگی میں فرق آ جائیگا۔ ان امور کے پیش نظر سوائے اس مقام کے جو وضوء کے لیے مقرر ہے۔ مسجد کے باقی حصص پر وضوء کرنا مکروہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض شافعی علمائے نے کہا کہ مسجد میں وضو اس وقت جائز ہے جب کہ پانی وغیرہ برتن میں رہے۔ فرش زمین پر نہ گرے۔

۵- علماءِ کرام نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے وضو کرنے والوں کے اعضا نورانی ہوں گے اور یہ حضور علیہ السلام کی اُمت کے خصائص سے ہے۔ کسی دوسرے نبی کی اُمت میں یہ بات نہ ہوگی۔

۶- حدیثِ ہذا سے وضوء کرنے والوں کی فضیلت معلوم ہوئی اور یہ کہ قیامت حق ہے۔ علامہ عینی نے لکھا کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ:-

مَا اَطْلَعَ اللّٰهُ نَبِيَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ الْمُغَيَّبَاتِ الْمُسْتَقْبَلَةِ الَّتِيْ لَا يَطَّلِعُ	کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو مغیباتِ مستقبلہ و اُخرویہ کے ان احوالات وصفات اور حالات پر مطلع

عَلَيْهَا نَبِيًّا غَيْرَهُ مِنْ أُمُوْرِ الْآخِرَةِ وَ صِفَاتِ مَا فِيْهَا

فرمایا۔ جن پر کسی اور نبی کو مطلع نہیں کیا گیا۔
(عینی ج ۱ ص ۶۷۰)

بَابُ لَا يَتَوَضَّأُ مِنَ الشَّكِّ حَتّٰى يَسْتَيْقِنَ

باب محض شک کی وجہ سے وضوء نہ کرے جبتک کہ حدیث کا یقین نہ آجائے

۱۳۷۔ عَنْ عِبَادِ بْنِ تَمِيْمٍ عَنْ عَمِّهٖ اَنَّهٗ شَكَى اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّجُلُ الَّذِيْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ اَنَّهٗ يَجِدُ الشَّيْءَ فِي الصَّلٰوةِ فَقَالَ لَا يَنْفَتِلُ اَوْ لَا يَنْصَرِفُ حَتّٰى يَسْمَعَ صَوْتًا اَوْ يَجِدَ رِيْحًا (بخاری)

حضرت عباده بن تمیم اپنے چچا (عبداللہ بن زید) سے راوی ہیں کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ ایک شخص ہے جس کو نماز میں ہوا نکلنے کا شبہ ہوا۔ آپ نے فرمایا (وہ نماز کو نہ چھوڑے یا نہ مڑے جب تک کہ ہوا نکلنے کی آواز نہ سنے یا بد بو نہ پائے۔

فوائد و مسائل ۱۔اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب البیوع اور باب من لم یرائی ... الخ میں ذکر کیا اور نسائی، ابن ماجہ، ترمذی، ابوداؤد نے کتاب الطہارت میں ذکر فرمایا ۲۔مطلب حدیث یہ ہے کہ جب تک حدث کا یقین نہ ہو جائے تب تک نماز نہ چھوڑے اور وضوء کے لیے نہ جائے۔ یعنی اگر نماز میں شک ہوا کہ ہوا نکلی ہے تو محض شک کی وجہ سے وضوء نہ جائے گا۔ ہاں اگر یقین ہو جائے کہ ہوا خارج ہوئی ہے خواہ آواز ہو یا نہ ہو۔ بد بو محسوس ہو یا نہ ہو مگر یہ یقین ہو کہ ہوا نکلی ہے تو اس صورت میں وضو جاتا رہے گا اور یہ حکم صرف نماز کے ساتھ خاص نہیں ہے یعنی اگر خارج نماز ہوا نکلنے کا شبہ ہو تو جب تک یقین نہ ہو وضو نہیں ٹوٹے گا البتہ شک کی صورت میں دوبارہ وضوء کرنے میں حرج نہیں۔ بشرطیکہ وسوسہ کے مرض میں مبتلا نہ ہو۔

چنانچہ علامہ عینی نے حدیث ہذا کے اس ٹکڑے "حَتّٰى يَسْمَعَ اَوْ يَجِدَ رِيْحًا" کے تحت لکھا ہے جو شخص بہرا ہو وہ آواز نہیں سن سکتا اور جس کی قوت شامہ ختم ہو گئی ہو اس کو بد بو نہیں آسکتی۔ اس کے علاوہ بعض اوقات ہوا نکلنے کا احساس ہوتا ہے اور یقین ہوتا ہے کہ ہوا نکلی ہے مگر اس میں آواز اور بو نہیں ہوتی تو اس سے واضح ہوا کہ یہ حکم بُو اور بُو کی آواز کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ مطلب حدیث یہ ہے کہ جب ہوا نکلنے کا یقین ہو تو وضوء جاتا رہتا ہے۔ خواہ آواز یا بُو ہو یا نہ ہو۔ علماء و فقہاء نے فرمایا کہ حدیث ہذا سے ایک کلیہ قاعدہ نکلتا ہے کہ کوئی یقینی کام شک کی وجہ سے زائل نہ ہوگا۔ یعنی ہر شے اپنے اصل حکم پر باقی رہے گی تا وقتیکہ اس کے خلاف پر یقین نہ آجائے اور محض شک سے اس شے کا اصل حکم باطل نہ ہوگا مثلاً ہر کپڑا، ہر فرش یا ہر جگہ پاک ہے تو اگر شک ہو کہ یہ نجس ہوگا تو وہ پاک ہی سمجھا جائیگا۔ محض شک کی وجہ سے اُسے نجس نہ کہیں گے جب تک یقینی طور پر نجاست معلوم نہ ہو جائے۔ اسی طرح با وضوء ہونے پر یقین ہے۔ تو محض اس شبہ کی بناء پر کہ ممکن ہے وضوء ٹوٹ گیا ہو، وضوء نہیں ٹوٹے گا یا مثلاً وضو کے بعد شک ہوتا ہے کہ کسی عضو کو نہیں دھویا ہے یا اعضاء وضو میں سے کوئی جگہ سوکھی رہ گئی ہوگی تو اس صورت میں محض شک وضوء کی صحت میں خلل انداز نہ ہوگا۔ یونہی کسی کے منہ سے شراب کی بد بو آرہی

ہے مگر وہ نہ تو اقراری ہے اور نہ ہی اس پر کوئی گواہ ہے۔ تو ایسی صورت میں حد جاری نہیں کی جائے گی کیونکہ حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ حدیث ہذا میں وہمیوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ وہم میں مبتلا نہ ہوں۔ وہم پر کسی چیز کی بنیاد نہ رکھیں۔ اسی سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ محض شک و شبہ کی بنا پر کسی مسلمان سے بدگمان نہ ہونا چاہیے۔

بَابُ التَّخْفِيْفِ فِي الْوُضُوْءِ

باب ہلکا وضوء کرنے کے بیان میں

ہلکا وضوء کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ اعضاء وضو میں سے کسی عضو کو نہ دھویا جائے یا صرف تیل کی طرح پانی اس طرح چپڑ لیا جائے کہ دو قطرے پانی بھی نہ ٹپکے بلکہ ہلکا وضوء کرنے سے مراد یہ ہے کہ تین تین مرتبہ دھونے کی بجائے ایک ایک بار دھویا جائے یا ایسے دھوئے کہ اعضاء پر سے زیادہ پانی نہ بہے بلکہ صرف دو قطرے ہر عضو سے بہیں۔

۱۳۸- اِبْنُ عَبَّاسٍ قَالَ بِتُّ عِنْدَ خَالَتِيْ مَيْمُوْنَةَ لَيْلَةً فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ اللَّيْلِ فَلَمَّا كَانَ فِيْ بَعْضِ اللَّيْلِ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ وَسَلَّمَ فَتَوَضَّاءَ مِنْ شَنٍّ مُّعَلَّقٍ وُضُوْءً خَفِيْفًا يُخَفِّفُهُ عَمْرٌو وَيُقَلِّلُهُ وَقَامَ يُصَلِّيْ فَتَوَضَّاْتُ نَحْوًا مِمَّا تَوَضَّأَ ثُمَّ جِئْتُ فَقُمْتُ عَنْ يَّسَارِهِ وَرُبَّمَا قَالَ سُفْيَانُ عَنْ شِمَالِهِ فَحَوَّلَنِيْ فَجَعَلَنِيْ عَنْ يَّمِيْنِهِ ثُمَّ صَلّٰى مَا شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ اضْطَجَعَ فَنَامَ حَتّٰى نَفَخَ ثُمَّ اَتَاهُ الْمُنَادِيْ فَاٰذَنَهُ بِالصَّلٰوةِ فَقَامَ مَعَهُ اِلَى الصَّلٰوةِ فَصَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ قُلْنَا لِعَمْرٍو اِنَّ نَاسًا يَقُوْلُوْنَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَنَامُ عَيْنُهُ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهُ قَالَ عَمْرٌو سَمِعْتُ عُبَيْدَ بْنَ عُمَيْرٍ يَقُوْلُ رُؤْيَا الْاَنْبِيَآءِ وَحْيٌ ثُمَّ قَرَاَ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ

(بخاری شریف)

حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے اپنی خالہ زاد ام المومنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں رات گزاری حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہوئے۔ جب تھوڑی رات گزر گئی۔ آپ اٹھے اور آپ نے ایک پرانی مشک جو لٹک رہی تھی۔ اس سے وضوء فرمایا (عمر بن دینار اس وضوء کے ہلکے پن کو بیان کرتے تھے) اور نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ میں نے بھی آپ کی طرح وضوء کیا اور آپ کی بائیں طرف کھڑا ہو گیا (سفیان نے یسارہ کی جگہ شمالہ کا لفظ روایت کیا دونوں کے معنیٰ ایک ہیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی دائیں طرف کھڑا کر لیا۔ پھر حضور نے نفل پڑھے جتنے اللہ نے چاہے۔ اس کے بعد کروٹ پر آرام فرما ہوئے یہاں تک خراٹے لینے لگے۔ پھر مؤذن آیا اور آپ کو نماز کے لیے جگایا۔ آپ اس کے ساتھ نماز کے لیے تشریف لے گئے اور نماز پڑھی مگر وضو نہ کیا۔ سفیان نے کہا ہم نے عمرو سے کہا بعض لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی آنکھیں سوتی ہیں۔ دل نہیں سوتا۔ عمرو نے جواب دیا۔ میں نے عبید بن عمیر سے سنا وہ کہتے تھے انبیاء کے خواب وحی ہیں۔ پھر سورہ صافات کی آیت پڑھی۔ انی اری فی المنام ... الخ یعنی بیٹا میں خواب میں دیکھتا

ہوں کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے کتاب الصلوٰۃ کتاب العلم میں بھی ذکر کیا ہے۔ مسلم و ترمذی نے صلوٰۃ میں، ابن ماجہ و نسائی نے طہارت میں ذکر کیا۔ حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

۱۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند ناقضِ وضو نہیں کیونکہ نیند کی حالت میں بھی حضور علیہ السلام کا دل بیدار رہتا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے خواب وحی ہوتے ہیں حضرت عبید بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورہ صافات کی آیت سے یہ استدلال فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں۔ کیونکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے خواب کی ہدایت پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کا اقدام فرمایا تھا اور قرآنِ پاک نے ان کے اس اقدام کو غلط نہیں ٹھہرایا بلکہ اس کی مدح کی جس سے ثابت ہوا کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی نہیں ہوتے تو نہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ذبح فرزند کا اقدام کر سکتے تھے اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تحسین ہو سکتی تھی۔ جس سے واضح ہوتا ہے انبیاء کرام کا خواب بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے جاگتے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ہو یا بذریعہ فرشتہ کوئی حکم اُترا ہو۔ یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس خواب کے من جانب الٰہی ہونے پر پورا بھروسہ تھا تو انھوں نے اپنے فرزند سے فانظر ما ذا تریٰ کیوں فرمایا۔ جب یہ خدا کا حکم تھا تو بیٹے سے رائے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ اس شبہ کے جواب میں مفسرین نے فرمایا کہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس خواب کے وحی الٰہی ہونے میں تو قطعی حتماً کوئی شبہ و تذبذب نہ تھا لیکن اس سوال سے خود بیٹے کی آزمائش ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب سیدنا ابراہیم خلیل اللہ نے فرمایا۔

يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ	اے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں تو تیری کیا رائے ہے۔

سیدنا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے جواب دیا۔

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ	اے باپ! جو آپ کو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کیجئے۔ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

غور کیجئے سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کا یہ جواب بھی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ خود بھی اس خواب کو وحی ربانی سمجھتے تھے جبھی تو انھوں نے "ما تؤمر" (جو آپ کو حکم ملا ہے) اس کی تعمیل کیجئے" فرمایا۔ اگر خالی اپنے والد مکرم کی اطاعت مقصود ہوتی تو آپ کے جواب کے الفاظ یہ ہوتے" افعل ما تریٰ جو آپ مناسب سمجھیں کیجئے"۔ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام نے ان الفاظ سے جواب نہیں دیا بلکہ افعل ما تؤمر کے الفاظ کہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ نبی کا خواب بھی وحی الٰہی ہوتا ہے۔

انبیاء کرام کے خواب شیطانی اثر و تسلط سے پاک ہوتے ہیں ۱۔ انبیائے کرام کے خواب شیطانی اثر و تسلط سے قطعاً حتماً محفوظ ہوتے ہیں اور انہیں وحی کے بارے میں یہ شک ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ معاذ اللہ شیطانی ہے یا رحمانی۔ انبیائے کرام کو وحی الٰہی میں دھوکہ، مغالطہ، شبہ و لغزش اور خطا و غلطی نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ بتقاضائے حکمتِ الٰہیہ اللہ تعالیٰ کے نبی کو تعبیر رویا کے بارے میں

کبھی ابتداءً عارضی خفا لاحق ہو جائے جس کا وقوع بھی بغیر اذنِ الٰہی نہیں ہوتا۔ پھر حکمتِ خداوندی پورا اُترتے ہی وہ خفا و تردّد زائل ہو جاتا ہے یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وحی بھیجنے کے بعد اس کی تعبیر و مراد اور اصل مقصود و مطلوب کو ابتداً امر میں اپنی حکمت پورا کرنے کے لیے نبی پر مخفی فرما دے اور نبی کو وحی کے اصل مقصود و مطلوب کے سمجھنے میں عارضی خفا لاحق ہو جائے اور پھر وہ خلافِ مرادِ الٰہی ایک کام کا ارادہ فرمائے۔ ایسا تھا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بھی واقع ہوا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ذبحِ فرزند کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر کو پردۂ خفا میں رکھا گیا کیونکہ مرادِ الٰہی ذبحِ اسمٰعیل علیہ السلام نہ تھی اگر ذبحِ اسمٰعیل ہی مرادِ الٰہی ہوتی تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بات کا ارادہ کرے اور وہ پوری نہ ہو۔ پس اس خواب میں جو انھوں نے دیکھا مرادِ الٰہی تو مینڈھے کا ذبح ہونا ہی تھا مگر اللہ عزّ وجل نے اپنی حکمت پورا کرنے کے لیے اس خواب کی اصل مراد کو حضرت ابراہیم پر مخفی فرما دیا اور (خلافِ مرادِ الٰہی) ذبحِ فرزند پر تیار ہو گئے۔ تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل کو بچا لیا اور اس کی جگہ مینڈھا ذبح ہو گیا۔ جس سے واضح ہوا کہ اس خواب سے مرادِ الٰہی ذبحِ اسمٰعیل علیہ السلام نہ تھی۔ اگر ہوتی تو ان کو ذبح ہونے سے نہ بچایا جاتا۔ چنانچہ مفسرین عظام نے لکھا کہ:-

"سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بارگاہِ خیال میں جو صورت دیکھی تھی اس سے اصل مقصود ذبحِ ولد کی تعبیر ذبحِ کبش کے ساتھ تھی ورنہ حضرت اسمٰعیل کو ذبح ہونے سے نہ بچایا جاتا۔"

صاحب روح البیان نے لکھا:-

"سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بارگاہِ خیال میں جو صورت دیکھی تھی اس سے وہ اصل مقصود کی طرف بایں طور تجاوز فرماتے کہ اپنے تمثیلی خواب یعنی ذبحِ ولد کی تعبیر ذبحِ کبش کے ساتھ لیتے (یعنی جو خواب انھوں نے دیکھا کہ میں اپنے فرزند کو ذبح کر رہا ہوں۔ اس خواب سے مرادِ الٰہی تھی یعنی دنبہ کا ذبح ہونا اور وہ دنبہ ذبح فرما دیتے) تو اہلِ آفاق پر ان کے کمالِ فنا اور جذبۂ ایمان و استسلام ظاہر نہ ہوتا۔ اسی طرح ان کے بیٹے کے جذبۂ فرمانبرداری و اطاعت و کمالِ صبر و استقامت کا ظہور بھی نہ ہوتا۔ اس حکمت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے خواب کی تعبیر کو ان پر مخفی فرما دیا۔ تاکہ ان کی کمالِ اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار ہو جائے۔ گویا خواب کے اصل مقصود کو ان پر مخفی رکھا۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم نے اپنے خواب کو سچا کر دکھایا۔" (روح البیان جلد ۹ صـ۴۷۷)

یا جیسے کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

رَاَیْتُ فِی الْمَنَامِ اِنِّیْ اُھَاجِرُ مِنْ مَکَّۃَ اِلٰی اَرْضٍ بِھَا نَخْلٌ فَذَھَبَ وَھْلِیْ اِلٰی اَنَّھَا الْیَمَامَۃُ اَوْ ھَجَرُ فَاِذَا ھِیَ مَدِیْنَۃُ یَثْرِبَ (بخاری و مسلم)

خواب میں دیکھا کہ میں کھجوروں والی زمین کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہوا کہ وہ زمین یمامہ ہے یا ہجر ہے۔ مگر وہ ہجرت گاہ مدینہ نکلا۔

ہجرت کے متعلق حضور علیہ السلام نے جو خواب دیکھا اور پھر ابتدائے امر میں اس خواب کی تعبیر آپ پر مخفی رہی۔ آپ نے خیال فرمایا۔ مقامِ ہجرت یمامہ یا ہجر ہے مگر مقامِ ہجرت مدینہ قرار پایا۔ یہ بھی ایک عارضی خفا تھا۔

وہ آپ کو لاحق ہوا اور حکمت الٰہی پوری ہو جانے کے بعد وہ زائل ہو گیا۔ غرضکہ نبی کو اپنے خواب کے حق و صواب ہونے اور منجانب اللہ ہونے میں قطعاً کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا۔ البتہ خواب کی تعبیر اور اس کے اصل مقصود و مراد الٰہی کے بارے میں حکمت خداوندی کے مطابق کبھی ابتداءً عارضی خفا لاحق ہو سکتا ہے ____ خوب یاد رکھیے! کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو اگر اپنے رویائے مقدسہ سمجھنے میں کبھی تردد و تفکر واقع ہوتا ہے تو اس کو غلطی سے تعبیر کرنا جائز نہیں بلکہ یہ تامل ان کی عدم توجہ پر مبنی ہوتا ہے اور اس کی حکمت یہ ہوتی ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کو کسی وقت بھی ایسے حالات پیش آئیں تو ہو سکتا ہے کہ عوام ان کے علم کو ذاتی تصور کر لیں اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو جائیں۔ لہذا خالق مخلوق اور علم ذاتی وعطائی کے فرق کو برقرار رکھنے کے لیے انبیاء علیہم السلام پر عدم توجہ اور ذہول جیسے حالات طاری ہو جاتے ہیں اور ان کا طریان عارضی ہوتا ہے۔ حکمت الٰہیہ کے پورا ہو جانے کے بعد وہ خفا اور تردد ایک آن کے لیے باقی نہیں رہتا۔ (فافہم)

۲۔ اس حدیث کے باقی مسائل یہ ہیں :۔ وضوء میں اعضاء کو دھونا فرض ہے اور تین تین بار ہر عضو کو دھونا سنت ہے اور کم سے کم دھونے کا درجہ یہ ہے کہ اعضاء پر اس طرح پانی بہایا جائے کہ دو قطرے پانی بہہ جائے کیونکہ عضو کے دھونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس عضو کے ہر حصہ پر کم از کم دو بوند پانی بہہ جائے۔ صرف بھیگ جانے یا تیل کی طرح پانی چپڑ لینے یا ایک آدھ بوند پانی بہہ جانے کو دھونا نہیں کہتے۔ نہ اس سے وضوء یا غسل ادا ہو گا۔ اس امر کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے اور نمازیں اکارت جاتی ہیں۔

۳۔ اس حدیث میں ہلکا وضو کرنے کا یہی مطلب ہے کہ اعضاء کو ایک ایک بار دھویا جائے تو وضوء ہو جائے گا یا یہ کہ اس طرح اعضاء کو دھویا جائے کہ پانی زیادہ نہ بہے بلکہ دو بوند بہہ جائے۔

۴۔ نیند سے انبیاء علیہم السلام کا وضو نہیں جاتا کیونکہ ان کا قلب ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل میں نیند ناقض وضو نہیں ہے۔ بلکہ نیند کو ناقض وضوء اس لیے کہتے ہیں کہ جب آدمی سوتا ہے تو بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور ہوا کے نکلنے کا احساس نہیں ہوتا حالانکہ ہوا نکل جاتی ہے۔ برخلاف انبیاء کے کہ ان کی آنکھیں بظاہر نیند میں ہوتی ہیں مگر دل پر غفلت طاری نہیں ہوتی۔

۵۔ جب مقتدی ایک ہو تو وہ امام کے دائیں طرف کھڑا ہو۔ امام احمد کا قول یہ ہے کہ بائیں طرف کھڑا ہونے سے نماز باطل ہو جائے گی۔ حضرت امام اعظم فرماتے ہیں کہ اگر مقتدی ایک ہی ہو تو وہ امام کے بائیں طرف کھڑا ہو یا امام کے پیچھے کھڑا ہو جائے تو نماز باطل نہ ہو گی البتہ ایسا کرنا خلاف سنت ہے اور برا ہے۔

۶۔ ایک ہی وضوء سے نفل اور فرض پڑھ سکتے ہیں بلکہ جب تک وضو باقی رہے اسی وضوء سے جس قدر فرائض و نوافل چاہیں پڑھے جا سکتے ہیں ۷۔ نفل نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔

۸۔ دو آدمی ہوں تو ایک آدمی مقتدی اور دوسرا امام بن جائے جماعت کا ثواب مل جائیگا۔

۹۔ جس طرح فرض نماز کلام کرنے سے باطل ہو جاتی ہے اسی نفل بھی باطل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت

ابن عباس حضور علیہ السلام کے بائیں جانب کھڑے ہوئے تو آپ نے ان کا سر پکڑ کر یا ہاتھ پکڑ کر یا بازو پکڑ کر اپنی دائیں طرف پھیر لیا اور کلام نہ فرمایا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتنے عمل سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

۱۰۔ نماز کی اصلاح کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانا جائز ہے ۱۱۔ مؤذن کا نماز کے لیے امام کو جگانا یا بلانا درست ہے

۱۲۔ ہوشیار بچہ کی نماز درست ہے اگرچہ نابالغ کی امامت درست نہیں ہے۔

اس حدیث میں رات کے نوافل کا ذکر ہے جو پہلے واجب تھے پھر ان کی واجبیت منسوخ ہو گئی۔ اب رات کو سونے کے بعد تہجد پڑھنا سنت ہے اور تہجد پڑھنے والوں کو حج وعمرہ کا ثواب ملتا ہے (ترمذی شریف)

بَابُ اِسْبَاغِ الْوُضُوْءِ

باب پورا وضوء کرنے کے بیان میں

لغت میں اسباغ کے معنیٰ پورا کرنے اور تمام کرنے کے آتے ہیں۔ وضوء میں اسباغ یہ ہے کہ اعضاء وضوء کے ہر حصہ کو مکمل طور پر دھویا جائے۔ اس طرح کہ عضو کا کوئی حصہ خشک نہ رہے خواہ ایک ہی بار دھوئے لیکن اسباغ کے فضائل کی حدیث پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اسباغِ وضوء کا یہ مطلب ہونا چاہیئے کہ ہر عضو کے ہر حصہ کو تین تین بار دھویا جائے۔

قَالَ ابْنُ عُمَرَ اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ الْاِنْقَاءُ

حضرت ابن عمر نے فرمایا۔ اسباغ وضوء کے معنیٰ اعضاء کو خوب اچھی طرح دھونے کے ہیں

اس تعلیق کو امام عبد الرزاق علیہ الرحمۃ نے موصولاً اسنادِ صحیح کے ساتھ اپنے مصنف میں ذکر کیا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسباغ کی تفسیر انقاء کے لفظ سے کی ہے ——— یہ ظاہر ہے کہ اسباغ کے معنیٰ لغت میں اتمام کے ہیں اور اتمام کو انقاء لازم ہے تو حضرت ابن عمر نے شئ کی تفسیر اس کے لازم سے فرما دی کیونکہ جب ہر عضو کو تین تین بار خوب اچھی طرح دھویا جائیگا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اعضاء سے میل کچیل زائل ہو جائے گا۔

۲۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابن عمر پاؤں کو سات بار دھوتے تھے۔ لیکن وہ ہمیشہ ایسا نہیں کرتے تھے اور نہ سات بار دھونے کو سنت سمجھتے تھے بلکہ بوقتِ ضرورت جب کہ پاؤں پر زیادہ میل کچیل جم جاتا ہوگا تو اس صورت میں ایسا کرتے ہوں گے اور یہ جائز ہے۔

۱۳۹۔ دَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ عَرَفَۃَ حَتّٰی اِذَا کَانَ بِالشِّعْبِ نَزَلَ فَبَالَ ثُمَّ تَوَضَّاَ وَلَمْ یُسْبِغِ الْوُضُوْءَ فَقُلْتُ الصَّلٰوۃَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَقَالَ الصَّلٰوۃُ اَمَامَکَ فَرَکِبَ فَلَمَّا جَاءَ الْمُزْدَلِفَۃَ نَزَلَ

حضرت اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرفات سے واپس ہوئے جب گھاٹی میں پہنچے (جدھر سے حاجی جاتے ہیں) تو آپ اترے پیشاب کیا پھر وضوء کیا لیکن پورا وضوء نہیں کیا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ نماز پڑھیے گا۔ آپ نے فرمایا۔ آگے چل کر پڑھیں گے۔ پھر آپ سوار ہوئے۔ جب مزدلفہ پہنچے تو اترے

فَتَوَضَّأَ فَأَسْبَغَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ أُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ فَصَلَّى الْمَغْرِبَ ثُمَّ أَنَاخَ كُلُّ إِنْسَانٍ بَعِيْرَهٗ فِيْ مَنْزِلِهٖ ثُمَّ أُقِيْمَتِ الْعِشَاءُ فَصَلّٰى وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا

(بخاری شریف)

اور وضوء کیا پورا وضوء۔ پھر نماز کی تکبیر کہی گئی۔ آپ نے مغرب کی نماز پڑھی۔ بعد اس کے کہ ہر آدمی نے اپنا اونٹ اپنے ٹھکانے میں (جہاں وہ اُترنا چاہتا تھا) بٹھایا۔ پھر عشاء کی تکبیر ہوئی۔ آپ نے عشاء کی نماز پڑھی اور دونوں کے درمیان کوئی نماز نہیں پڑھی (یعنی مغرب وعشاء کے فرضوں کے درمیان کوئی سنت یا نفل نہیں پڑھی)

فوائد ومسائل

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے حج وطہارت میں اور مسلم، نسائی اور ابوداؤد نے صرف حج میں ذکر کیا۔

۲۔ حضرت اسامہ بن زید حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابی ہیں۔ ان کے والد اور دادا بھی صحابی تھے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)، آپ کے والد زید کا نام قرآن کریم میں آیا۔ آپ کی انگوٹھی کے نقش کی عبارت، حُبُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ، اللہ کے رسول کا محبوب) تھی۔ آپ سے کل ایک سو اٹھائیس حدیثیں مروی ہیں۔ جن پر بخاری ومسلم نے پندرہ پر اتفاق کیا اور دو کو بخاری نے اور دو کو مسلم نے منفرداً ذکر کیا۔ اُسامہ نامی چھ صحابی ہیں لیکن اسامہ بن زید صرف یہی ہیں حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور اقدس علیہ السلام نے ۱۸ سال کی عمر میں لشکر کا سردار بنایا تھا۔ بوقت وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عمر ۲۰ سال تھی۔ وادی القریٰ میں بعد شہادتِ عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا ۵۴ھ میں وفات پائی۔

۳۔ یہ واقعہ حج کے موقع کا ہے جب کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وقوف عرفات سے فارغ ہو کر مزدلفہ آرہے تھے راستہ میں آپ نے پیشاب کیا اور اس کے بعد خفیف وضو فرمایا۔ حضرت اسامہ نے عرض کی۔ حضور مغرب کی نماز پڑھیے گا؟ فرمایا۔ نماز کی جگہ تیرے آگے ہے یعنی مغرب وعشا کے وقت میں مزدلفہ پہنچ کر پڑھی جائے گی۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ومحمد بن حسن نے اس سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ عرفات سے واپسی مغرب کو عشا کے وقت تک مؤخر کرنا واجب ہے۔ اگر کسی نے راستہ میں مغرب اس کے وقت میں پڑھ لی تو جائز نہ ہوگی۔ اس کو مغرب دوبارہ عشا کے وقت میں مزدلفہ پہنچ کر پڑھنا ہوگی۔ مغرب کو عشا کے وقت میں پڑھنے کا حکم صرف اس شخص کے لیے ہے جو عرفات سے مزدلفہ آئے۔ لیکن وہ شخص جو رات کو عرفات ہی میں رہ گیا یا مزدلفہ کے سوا کسی دوسرے راستہ سے آیا تو اُسے مغرب کی نماز اپنے وقت میں پڑھنی ضروری ہے۔ امام زفر اور کوفیوں کی ایک جماعت کا بھی یہی مذہب ہے۔

۴۔ اس حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے مزدلفہ پہنچ کر پہلے مغرب پڑھی۔ پھر لوگوں نے اپنے اپنے اونٹ اور سامان محفوظ کیا۔ اس کے بعد عشاء پڑھی گئی۔ جس سے واضح ہوا کہ مغرب وعشاء کے درمیان موالات واجب نہیں ہے لیکن حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ افضل یہ ہے کہ مزدلفہ پہنچتے ہی اسباب وغیرہ اتارنے سے پہلے مغرب اور پھر عشاء پڑھی جائے اور مغرب وعشاء کے درمیان فصل نہ کیا جائے جیسا کہ صحیح روایات میں آیا ہے۔ اِنَّهُمْ صَلَّوْا قَبْلَ

حَطِّ رِحَالِهِمْ حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کا بھی یہی قول ہے۔

۴۔ اس حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے بعد سُنتیں وغیرہ نہیں پڑھیں بلکہ اس کے بعد عشار پڑھی۔ معلوم ہوا کہ مغرب کی سنتیں اور عشار کی سنتیں اور وتر وغیرہ عشا کے بعد پڑھے جائیں گے۔ اسی سے امام اعظم علیہ الرحمۃ نے یہ استدلال کیا کہ اگر مغرب کے بعد سنتیں پڑھ لیں یا کوئی اور کام کیا پھر عشار پڑھی تو یہ بات مغرب و عشار کی جمع میں مخل ہوگئی۔ اس لیے اب عشار کے وقت بھی اقامت کہی جائے گی۔ جیسا کہ حدیثِ زیربحث میں مذکور ہے کہ مغرب کے لیے الگ اقامت کہی گئی۔

۵۔ حضرت عبدالرحمٰن بن یزید، اسود، مالک، شافعی و امام احمد بن حنبل و حضرت فاروق اعظم و ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ مغرب کے لیے علیحدہ اور عشار کے لیے علیحدہ اقامت کہی جائے۔

۶۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ و ابو یوسف و امام محمد کا مسلک یہ ہے کہ مزدلفہ میں مغرب و عشار کے لیے ایک اذان اور ایک اقامت کہی جائے جیسا کہ حضرت جابر و عبداللہ بن عمر و ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے اور اگر مغرب کے بعد کوئی اور کام کرلیا تو پھر عشار کے لیے بھی اقامت کہی جائے۔ اس مسئلہ میں امام کی دلیل حدیث زیربحث ہی ہے (فافہم)

۷۔ اس حدیث میں اذان کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن امام شافعی، امام احمد، ابوثور، عبدالملک بن الماجشون المالکی فرماتے ہیں کہ صحیح یہی ہے کہ مغرب کے لیے اذان کہی جائے، عشار کے لیے نہیں۔ امام طحاوی کا یہی مذہب ہے۔

۸۔ مزدلفہ پہنچ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضوء میں اسباغ فرمایا۔ یعنی خوب اچھی طرح وضوء فرمایا یا اعضار وضوء کو تین تین مرتبہ دھویا۔ باب سے حدیث کے صرف اتنے ہی ٹکڑے کا تعلق ہے۔ وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا کا مطلب یہ ہے کہ مغرب و عشار کی سنتیں اور وتر وغیرہ عشار کے بعد پڑھے جائیں تو جب مغرب و عشار کے فرضوں کے درمیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی سنتوں کو بھی نہیں پڑھا تو اس سے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ مغرب و عشار کے فرضوں کے درمیان کسی کام کو کر کے فصل نہ کیا جائے مگر جب کہ ضرورت ہو تو حرج نہیں۔ جیسے صحابہ کرام نے اونٹوں کو مغرب پڑھ کر باندھ دیا کیونکہ ان کے کھلے رہنے میں حرج تھا۔

۹۔ اس حدیث سے امام شافعی نے یہ استدلال فرمایا ہے کہ قضا نماز کے پڑھنے کے لیے صرف اقامت کہی جائے اذان نہیں لیکن ان کا یہ استدلال تام نہیں کیونکہ اس موقع پر مغرب کو جو عشار کے وقت پڑھا جا رہا ہے یہ قضا نہیں ہے بلکہ ادا ہے اسی لیے مغرب کو ادا کی نیت سے پڑھتے ہیں نیز شارع علیہ السلام نے اس موقع پر مغرب کے لیے عشار کا وقت مقرر فرمایا ہے تو اس لحاظ سے بھی یہ ادا ہی ہے قضا نہیں ہے۔

بَابُ غَسْلِ الْوَجْهِ بِالْيَدَيْنِ مِنْ غُرْفَةٍ وَّاحِدَةٍ

باب ایک ہاتھ سے پانی کا چلو لے کر دونوں ہاتھوں سے منہ دھونے کے بیان میں

۱۔ اس عنوان سے امام بخاری کا مقصد یہ بتانا ہے کہ وضوء کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے چلو لینا واجب نہیں ہے

جیسا کہ اس حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے ایک ہاتھ سے پانی کا چلو لیا اور منہ دھوتے وقت دونوں ہاتھوں سے دھویا اور فرمایا۔ اس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے ۲۔ دونوں بابوں میں مناسبت یہ ہے کہ پہلے میں حضور علیہ السلام کے وضو کے طریقہ کا بیان تھا۔ اس میں اسی کی تفصیل ہے۔

۱۴۰- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ تَوَضَّاَ فَغَسَلَ وَجْهَهٗ اَخَذَ غُرْفَةً مِّنْ مَّاءٍ فَتَمَضْمَضَ بِهَا وَاسْتَنْشَقَ ثُمَّ اَخَذَ غُرْفَةً مِّنْ مَّاءٍ فَجَعَلَ بِهَا هٰكَذَا اَضَافَهَا اِلٰى يَدِهِ الْاُخْرٰى فَغَسَلَ بِهَا يَدَهُ الْيُمْنٰى ثُمَّ اَخَذَ غُرْفَةً مِّنْ مَّاءٍ فَغَسَلَ بِهَا يَدَهُ الْيُسْرٰى ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهٖ ثُمَّ اَخَذَ غُرْفَةً مِّنْ مَّاءٍ فَرَشَّ عَلٰى رِجْلِهِ الْيُمْنٰى حَتّٰى غَسَلَهَا ثُمَّ اَخَذَ غُرْفَةً اُخْرٰى فَغَسَلَ بِهَا رِجْلَهٗ يَعْنِي الْيُسْرٰى ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّاُ (بخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے وضو کیا اپنا منہ دھویا۔ ایک چلو پانی لیا۔ اس سے کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا۔ پھر ایک چلو پانی لیا (ایک ہی ہاتھ سے) اور اس طرح کیا کہ اس کو جھکا کر دوسرے ہاتھ پر ڈال لیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دھویا۔ پھر ایک اور چلو پانی لیا اور اس سے اپنا سیدھا ہاتھ دھویا۔ پھر ایک اور چلو پانی لیا اور اس سے اپنا بایاں ہاتھ دھویا۔ پھر اپنے سر پر مسح کیا۔ پھر ایک اور چلو پانی لیا۔ دائیں پاؤں پر چھڑکا۔ اس کو دھو ڈالا۔ پھر ایک اور چلو پانی لیا۔ اس سے بائیں پاؤں کو دھویا۔ اس کے بعد کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو ابن ماجہ، نسائی اور ابو داؤد نے طہارت میں ذکر کیا۔ نسائی کی حدیث میں کانوں کے مسح کرنے کا ذکر ہے۔ امام بخاری حضرت ابن عباس سے اس حدیث میں منفرد ہیں۔ امام مسلم نے حضرت ابن عباس سے وضو کے باب میں کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ ۲۔ **مضمضہ** کے لغوی معنیٰ پانی کو منہ میں لے کر حرکت دینے کے ہیں اور وضو میں اس کا مطلب یہ ہے کہ منہ میں پانی کو لے کر حرکت دی جائے تاکہ سارے منہ میں پھر جائے۔ اس کے بعد کلی کر دی جائے۔ **استنشاق** کے معنیٰ ناک میں پانی داخل کرنے کے ہیں اور وضو میں اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی کو ناک میں کھینچا جائے۔ یہاں تک کہ نرم ہڈی (جہاں پانی پہنچ کر لگتا ہے) تک پانی پہنچ جائے اس کے بعد اس کو جھاڑ دیا جائے۔ وضو میں کلی کرنا اور ناک میں پانی لینا سنت مؤکدہ ہے اور غسل میں فرض ہے۔ لہٰذا غسل جنابت میں اس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے ورنہ غسل نہ ہوگا۔

مسائل حدیث ۱۔ اس حدیث میں ایک ایک مرتبہ ہر عضو کے دھونے کا بیان ہے۔ جس پر سب کا اجماع ہے کہ اسقدر فرض ہے ۲۔ جس ترتیب سے حضرت ابن عباس نے وضو کر کے دکھایا اسی ترتیب سے وضو کرنا مسنون ہے ۳۔ حضرت ابن عباس نے ایک ہی چلو پانی سے کلی بھی کی اور ناک میں پانی لیا یہ جائز ہے لیکن مضمضہ

واستنشاق کے لیے الگ الگ پانی لینا افضل ہے جیسا کہ طبرانی وابوداؤد میں حدیث ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں فَاَخَذَ لِکُلِّ وَاحِدٍ مَآءً جَدِیْدًا ۴۔ یہ بھی سنت ہے کہ مضمضہ واستنشاق داہنے ہاتھ سے کیا جائے۔ حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے سیدھے ہاتھ سے ناک میں پانی لیا۔ اس پر حضرت معاویہ نے اعتراض کیا اور کہا کہ یہ سنت رسول سے جہالت ہے۔ حضرت امام حسن نے فرمایا۔ سنت تو ہمارے گھروں سے نکلی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا۔ اَلیَمِیْنُ لِلْوَجْهِ وَالْیَسَارُ لِلْمَقْعَدِ۔ سیدھا ہاتھ منہ کے لیے ہے اور بایاں ہاتھ استنجے کے لیے (بدائع) البتہ ناک بائیں ہاتھ سے صاف کرنی چاہیئے ۵۔ اس حدیث میں سر کے مسح کے لیے پانی لینے کا ذکر نہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسح کے لیے ہاتھ تر ہونا ضروری ہے اور جو تری اعضاء کے بعد رہ گئی ہو اس سے بھی مسح کیا جا سکتا ہے۔ حضرت امام اوزاعی وحسن وعروہ کا یہی مسلک ہے لیکن امام شافعی ومالک کہتے ہیں ہاتھ میں جو تری رہ جاتی ہے اس سے مسح جائز نہیں۔ بلکہ مسح کے لیے دوبارہ ہاتھ کو تر کرنا چاہیئے جیسا کہ ابوداؤد کی حدیث میں ہے کہ ابن عباس نے مسح کے لیے ایک چلو پانی لیا اور ہاتھ کو جھاڑ کر مسح کیا۔ لیکن یہ بھی ثابت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ میں جو تری رہ گئی اس سے مسح کیا اور از سر نو ہاتھ کو تر نہ کیا تو جب دونوں طرح حدیث میں مذکور ہے تو اعضاء کے دھونے کے بعد جو تری رہ جاتی ہے اس سے بھی مسح جائز ہونا چاہیئے اور یہ بھی جائز ہے کہ مسح کے لیے نئے پانی سے ہاتھ کو تر کرے ۶۔ امام مالک علیہ الرحمۃ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فعل سے کہ انہوں نے مسح کے لیے نئے پانی سے ہاتھ کو تر نہ کیا بلکہ جو تری باقی تھی اسی سے مسح کر لیا، یہ استدلال کیا ہے کہ پانی مستعمل طاہر و مطہر ہے کیونکہ جب ایک بار پانی عضو سے مل گیا تو وہ پانی مستعمل ہو گیا۔ پھر جب اعضاء وضو میں سے ایک (عضو مسح) میں اس کا استعمال جائز ہوا تو سب میں جائز ہونا چاہیئے۔ علامہ عینی فرماتے ہیں امام مالک علیہ الرحمۃ کا یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ پانی مستعمل اس کو کہتے ہیں جو عضو سے بہہ جائے اور جب تک پانی عضو پر رہے اور ٹپکے نہیں اس کو مستعمل نہیں کہا جا سکتا ۷۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوا کہ وضو میں پاؤں دھونا ضروری ہے۔ صرف پانی چھڑک دینا کافی نہیں ہے۔

بَابُ التَّسْمِیَةِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ وَّعِنْدَ الْوِقَاعِ

باب ہر کام کے وقت بسم اللہ پڑھنا اور صحبت کے وقت بھی

۱۴۱۔ قَالَ لَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ اِذَآ اَتٰی اَهْلَهٗ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطٰنَ مَا رَزَقْتَنَا فَقُضِیَ بَیْنَهُمَا وَلَدٌ لَّمْ یَضُرَّهٗ (بخاری شریف)

حضرت ابن سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی اپنی بی بی سے صحبت کرنی چاہے تو یوں کہے۔ بسم اللہ۔ اے اللہ ہم کو شیطان سے بچائے رکھ اور جو اولاد تم کو عطا ہو اس سے شیطان کو دور رکھ۔ پھر جو اولاد ہو گی اس کو شیطان نقصان نہ پہنچائے گا۔

فوائد حدیث اس باب میں یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر کام سے پہلے بسم اللہ کہنا مسنون ہے۔ حتیٰ کہ جماع کے وقت بھی بسم اللہ پڑھنا باعث برکت ہے اور بسم اللہ ہر حال میں پڑھی جا سکتی ہے۔ خواہ آدمی پاک ہو یا

ناپاک، بے وضو ہو یا جنبی ۴۔ اس حدیث کو امام نے ذیل کے ابواب میں ذکر کیا ہے۔ توحید، دعوات، نکاح، صفۃ ابلیس اور مسلم و ابوداؤد نے نکاح میں اور نسائی نے باب عشرۃ النساء میں ذکر کیا ہے۔

کیا وضوء سے پہلے بسم اللہ پڑھنا واجب ہے حدیث ہذا سے معلوم ہوا کہ جماع سے پہلے بسم اللہ پڑھنا باعثِ برکت ہے۔ جو اولاد ہوگی وہ شیطان کے شر سے محفوظ رہے گی ۴۔ اہلِ ظاہر اور اسحٰق بن راہویہ کا قول یہ ہے کہ وضوء سے پہلے بسم اللہ پڑھنا واجب ہے اور جس نے قصداً عمداً بسم اللہ نہیں پڑھی اس کا وضو نہیں ہوگا۔ یہ لوگ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دلیل لاتے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس کا وضو نہیں اس کی نماز نہیں ہوئی۔ وَلَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَمْ یَذْکُرِ اسْمَ اللّٰہِ جس نے بسم اللہ نہیں پڑھی اس کا وضو نہیں ہوگا۔ یہ حدیث اگرچہ متعدد طرق سے مروی ہے۔ امام احمد، ابوداؤد و ابن ماجہ نے بھی اس کو روایت لیا ہے۔ مگر اس مضمون کی تمام حدیثوں میں علمائے نے کلام کیا ہے۔ علامہ مروزی و بزار نے کہا کہ اس باب میں کوئی صحیح حدیث نہیں ملتی۔ تفصیل کیلئے نیل الاوطار جلد ا ص ۱۳۵ کا مطالعہ کافی ہوگا۔ غرضکہ اس باب میں کوئی حدیث صحیح ہے ہی نہیں تو ان سے واجب کا قول کرنا درست نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوائے غیر مقلدین کے آئمہ اربعہ میں سے کسی نے وضو کے لیے بسم اللہ پڑھنے کو واجب قرار نہیں دیا۔ ۵۔ حضرت امام اعظم، مالک، شافعی، احمد بن حنبل آئمہ اربعہ و جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ وضوء سے پہلے بسم اللہ پڑھنا سُنّت ہے۔ اگر کسی نے بسم اللہ نہیں پڑھی تو اس کا وضوء ہو جائیگا۔ یہ حضرات متعدد حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ جس کی تفصیلی بحث طحاوی میں مذکور ہے اور امام بیہقی نے متعدد حدیثوں سے یہی ثابت کیا ہے کہ وضوء کے لیے بسم اللہ پڑھنا سنت ہے واجب نہیں۔

ہر نیک کام سے پہلے بسم اللہ شریف پڑھنا فائدہ، حدیث زیر بحث اگرچہ جماع کے متعلق ہے کہ اس وقت بھی بسم اللہ پڑھ لینا باعثِ برکت ہے لیکن اس سے ایک عمومی ہدایت یہ ملتی ہے کہ ہر وہ موقع و محل جہاں شیطان کے دخل کا امکان ہو وہاں بسم اللہ پڑھ لی جائے اور ظاہر ہے کہ شیطان ہر موقع و محل پر آدمی کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ وضوء ہو نماز ہو ہر جگہ ہر مقام پر فساد ڈالتا ہے۔ اس لیے امام بخاری علیہ الرحمۃ نے علیٰ کلِ حال کے الفاظ سے عنوان قائم کر دیا اور بتا دیا کہ جب بوقتِ جماع بسم اللہ پڑھنے کی ہدایت دی گئی ہے تو وضوء کرنے وقت تو بطریقِ اولیٰ بسم اللہ کی مشروعیت ہونی چاہیئے۔ (۲) رہا یہ سوال کہ بسم اللہ پڑھنے کے باوجود بھی بعض کاموں میں فساد پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ نہیں ہونا چاہیئے تو جواب یہ ہے کہ بسم اللہ کی اصل تاثیر تو یہی ہے کہ جس کام سے پہلے اس کو پڑھ لیا جائے وہ فساد سے محفوظ و مصئون رہے اور اس میں برکت پیدا ہو جائے مگر اس کے لیے کچھ شرائط اور موانع بھی ہیں۔ اگر شرائط پائے جائیں اور موانع اُٹھ جائیں تو ضرور بالضرور اس کام میں برکت ہو۔ اس کو یوں سمجھ لیجیئے کہ کتبِ طب میں دواؤں کے خواص بیان کیے جاتے ہیں۔ مثلاً لکھا جاتا ہے کہ اطریفل استعمال کرنے والا ہمیشہ نزلہ سے محفوظ رہے گا۔ اب اس سے یہ سمجھ لینا کہ اطریفل کا استعمال کرنیوالا تیل، ترشی وغیرہ انتہائی درجہ کی نزلہ پیدا کرنے والی چیزیں بھی کھاتا رہے اس کو بھی کبھی نزلہ نہیں ہوگا، سخت نافہمی اور طبائع

کے طرزِ کلام سے ناواقفی ہے۔ اس مثال سے واضح ہوگیا کہ اطریفل کی اپنی خاصیت تو یہ ہے کہ اس کے استعمال سے نزلہ سے محفوظ رہے لیکن اس کے ساتھ بدپرہیزیاں بھی کی جائیں تو وہ بھی اپنا اثر دکھائیں گی اور اس وقت یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اطریفل میں نزلہ دُور کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہی حال بسم اللہ کا ہے۔ اس کی اصل خاصیت یہی ہے کہ جب پڑھی جائے برکت ہو لیکن اس کے ساتھ دوسری بداعمالیاں بھی ہوں تو پھر برکت نہ ہوگی اور یہ قصور بسم اللہ کا نہیں بلکہ انسان کا خود اپنا ہوگا کہ وہ بسم اللہ کی برکت کو دوسرے اعمالِ قبیحہ کا ارتکاب کرکے ضائع کردیتا ہے دیکھئے پانی کی اصل خاصیت تو یہی ہے کہ وہ پودوں کی نشوونما کرے لیکن اگر کوئی باغبان صبح کو تو پودوں کو پانی دے اور شام کو جو پتے اور کونپل پیدا ہوں ان کو کاٹ ڈالے تو اس میں پانی کا نہیں خود باغبان کا اپنا قصور ہے۔

۳۔ خوب یاد رکھئے، اُمت کے طبیبِ اعظم اور معلمِ کائنات حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اعمالِ خیر پر بشارت دی ہے۔ مثلاً فرمایا وضو کرنے والے کے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں یا جن دواؤں کے خواص بیان فرماتے ہیں مثلاً فرمایا کہ کلونجی تمام بیماریوں کے لیے شفا ہے یا جن کلمات کے متعلق آپ نے فرمایا کہ ان کا پڑھنا باعثِ برکت ہے تو اس نوع کی جملہ ہدایات کا مقصد ومطمحِ نظر کسی عملِ خیر یا کسی چیز کی ذاتی خاصیت اور اس کے اصلی اثر کو بتلانا ہوتا ہے قطع نظر اس سے کہ اگر دوسرے اعمال کا تقاضا اس کے خلاف ہوا تو پھر انجام کیا ہوگا۔ لہٰذا اگر کسی عمل یا کلمہ کے پڑھنے سے اس کی وہ خاصیت اور فائدہ ظاہر نہ ہو جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس عمل میں خاصیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس عمل میں تو حضور علیہ السلام کی ارشاد فرمودہ خاصیت تھی اور اس کے اثرات بھی فی الواقع مرتب ہوتے مگر کسی مانع کی وجہ سے اس کا ظہور نہیں ہوا۔ یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے کوئی جذباتی دخطابی نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے کہ اگر اس چھوٹے سے نکتہ کو ملحوظ رکھا گیا تو وعد وعید، ترغیب وترہیب کے سلسلہ کی صدہا حدیثوں کے بارے میں لوگوں کو جو غلط فہمی ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے جو اُلجھن ہوتی ہے وہ انشاء اللہ العزیز نہ ہوگی۔ فافہم

بَابُ مَا يَقُولُ عِنْدَ الْخَلَاءِ

باب بیت الخلاء جانے وقت کیا پڑھے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ باب تو ہے وضوء کا اور امام نے استنجاء کے احکام ومسائل کی حدیثیں ذکر کرنی شروع کردیں جواب یہ ہے کہ امام بخاری کا اندازِ فکر یہ ہے کہ وہ جب کسی امر کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے متعلقات بھی ذکر فرما دیتے ہیں چنانچہ گزشتہ باب میں ہر کام کے ابتداء میں بسم اللہ پڑھنے کا بیان تھا۔ اب امام نے اس کی نظیر میں یہ بتایا کہ بیت الخلاء جاتے وقت بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر مستحب ہے۔ پھر چونکہ بیت الخلاء کا ذکر آگیا تو اس کے آداب واحکام کی احادیث بھی ذکر کردیں

۱۴۲ - قَالَ سَمِعْتُ اَنَسًا يَقُوْلُ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ قَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ (بخاری)

عبدالعزیز بن صہیب کہتے ہیں۔ میں نے حضرت انس سے سُنا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت الخلاء جاتے تو یوں فرماتے یا اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں خبث اور خبائث سے۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے دعوات میں بھی ذکر کیا اور مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابو داؤد نے طہارت میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ خلاء، لغت میں خالی مکان کو کہتے ہیں۔ یہاں سے مراد بیت الخلاء ہے۔ خبث و خبائث، خبث جمع ہے خبیث کی اور مراد اس سے شیاطین و جنّات کے مرد و عورتیں ہیں جو ایسی خالی جگہ اور ناپاک جگہ میں رہتے ہیں۔ شرح السنہ میں ہے خبث سے مراد کفر اور خبائث سے مراد شیطان ہے۔ ابن بطال نے کہا کہ خبث تمام بُرائیوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ ابن الاعرابی نے فرمایا کہ کلامِ عرب میں خبث کا اطلاق (مکروہ) ناپسندیدہ چیز پر آتا ہے۔ اگر وہ کلام میں ہو تو اس کو شتم کہتے ہیں، دین میں ہو تو کفر، کھانے میں ہو تو حرام، پینے کی چیز میں ہو تو اس کو ضار کہتے ہیں۔ بعض نے خبث کے معنیٰ بُرائی یا گناہ کے بھی کیے ہیں۔ بہرحال مقصود یہ ہے کہ بیت الخلاء ایک ایسی جگہ ہے جہاں شیاطین اور دیگر مضر اور نقصان دہ چیزیں ہو سکتی ہیں۔ اس لیے اس مقام پر جاتے وقت استعاذہ کی تعلیم دی گئی تاکہ آدمی اللہ تعالیٰ کے ذکر اور استعاذہ کی برکت سے اس مقام کے اثرات سے محفوظ رہے۔

۳۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کا بیت الخلاء جاتے وقت یہ دُعا پڑھنا اور شیطان سے پناہ مانگنا تواضع کے لیے اور اُمّت کی تعلیم کے لیے تھا ورنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تو شیاطین جنّ و انس سے قطعاً حتماً محفوظ ہیں۔ کیا دیکھا نہیں کہ حضور علیہ السلام نے اپنی مسجد شریف کے ایک ستون سے ایک شیطان کو باندھ دیا تھا (عینی ج ۱ ص ۶۹۸)۔

۴۔ بعض علماء نے کہا کہ اعوذ کے ساتھ بسم اللہ بھی ملا لے۔ چنانچہ ایک حدیث میں جو شرطِ مسلم پر ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ جب حضور علیہ السلام بیت الخلاء جاتے تو فرماتے۔ بِسْمِ اللّٰهِ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ (عینی ج ۱ ص ۶۹۸) — (۵) حدیثِ ہٰذا میں اِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ کا لفظ آیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ بیت الخلاء میں جانے کا ارادہ فرماتے اس وقت دعا پڑھتے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے فرمایا۔ فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ تو اس کے معنیٰ یہی ہیں کہ جب قرآن پڑھنے کا قصد کیا جائے تو اعوذ پڑھی جائے۔ اسی طرح یہاں ہے (چنانچہ خود امام نے (ادبِ مفرد) میں جو حدیث درج کی ہے۔ اس میں اِذَا اَرَادَ الدُّخُوْلَ کے لفظ صراحۃً موجود ہیں (فافہم) جب پاخانہ جانے کا ارادہ کیا جائے تو اس وقت بسم اللہ پڑھ لی جائے اور اگر پاخانہ بنا ہوا نہ ہو تو حاجت شروع کرنے یعنی کپڑا اُٹھانے سے پہلے یہ دُعا پڑھی جائے ۶۔ پاخانہ میں داخل ہو کر یا قضائے حاجت کرتے وقت زبان سے اللہ کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔

بَابُ وَضْعِ الْمَآءِ عِنْدَ الْخَلَاءِ

باب بیت الخلاء کے پاس پانی رکھنا

۱۴۳۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ الْخَلَاءَ فَوَضَعْتُ لَهٗ وَضُوْءًا قَالَ مَنْ وَضَعَ هٰذَا فَاُخْبِرَ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ (بخاری)

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء گئے تو میں نے آپ کے لیے وضو کا پانی رکھا۔ آپ نے باہر آکر پوچھا۔ یہ پانی کس نے رکھا۔ لوگوں نے عرض کی ابن عباس نے فرمایا نے فرمایا اے اللہ اس کو دین کی سمجھ عطا فرما۔

فوائد و مسائل حدیثِ ہٰذا کو امام نے کتاب الصلوٰۃ میں بھی ذکر کیا ہے۔ ترمذی، نسائی، ابن ماجہ و مسلم و ابوداؤد نے کتاب الطہارۃ میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ حدیثِ ہٰذا عنوان سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ عنوان تو یہ ہے کہ پاخانہ پیشاب کرتے وقت قبلہ کی طرف مُنہ کر سکتے ہیں جب کہ کوئی آڑ ہو۔ لیکن حدیثِ ہٰذا میں مطلقاً ممانعت موجود ہے۔ یعنی کوئی آڑ ہو یا نہ ہو بہرصورت قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف استدبار و استقبال نہ ہونا چاہیئے۔ امام بخاری کی طرف سے شارحین نے اس اشکال کے دو جواب دیے ہیں۔ اول یہ کہ امام نے یہ حدیث محض ممانعت کے اثبات کے لیے ذکر کی ہے اور عمارت کا استثناء حدیث ابن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جو آگے آ رہی ہے اس سے ثابت کیا ہے۔ دوم، یہ کہ غائط اس جگہ کو کہتے ہیں جو میدان میں ہو جہاں کوئی آڑ وغیرہ نہ ہو۔ لہٰذا میدان میں قبلہ کی طرف استقبال و استدبار کی ممانعت سے یہ سمجھا گیا کہ عمارت میں ایسا کرنا جائز ہے۔

واضح ہو کہ اس مسئلہ میں متعدد قول ہیں جن کی تفصیل کے لیے عینی و فتح الباری، نیل الاوطار کا مطالعہ کیجیے۔ ا۔ امام شافعی و امام مالک و اسحٰق و احمد و شعبی و حضرت ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ بوقتِ قضاء حاجت کعبہ کی طرف مُنہ اور پیٹھ کرنا کھلے میدان میں جبکہ آڑ نہ ہو منع ہے لیکن اگر عمارت یا پاخانے بنے ہوں یا آڑ ہو تو پھر جائز ہے۔ ان کی دلیل حدیث ابن عمر ہے جو آگے آ رہی ہے ۲۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ و امام مجاہد اور ابراہیم نخعی و سفیان ثوری و ابی ثور و احمد (فی روایۃ) و ابو ایوب انصاری، ابوہریرہ و ابن مسعود و سراقہ بن مالک و عطاء و اوزاعی و سلف صحابہ و تابعین اور اکثر علماء محققین کا مسلک یہ ہے کہ بوقتِ رفع حاجت قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ کرنا بہرصورت ناجائز ہے خواہ آڑ ہو یا نہ ہو۔ امام کی دلیل حدیثِ زیرِ بحث ہے جس میں قبلہ کی طرف مطلقاً استدبار و استقبال سے منع فرمایا گیا ہے۔

نیز عقل بھی یہ چاہتی ہے کہ قبلہ کی طرف استقبال و استدبار مطلقاً منع نہ ہو۔ کیونکہ ممانعت کی علت احترامِ کعبہ ہے اور یہ علت کھلا میدان ہو یا عمارت دونوں جگہ پائی جاتی ہے۔ پھر عمارت میں استدبار و استقبال کے جواز کا قول حائل کی وجہ سے کیا گیا ہے تو یہ حائل تو کھلے میدان میں بھی موجود ہے کیونکہ وہاں بھی دریا و پہاڑ وغیرہ کعبہ کے لیے آڑ بنے ہوتے ہیں۔ لہٰذا کھلے میدان میں بھی جواز کا قول کرنا چاہیئے۔ فافہم

شرّقوا و غرّبوا اس حدیث میں ہدایت کی گئی ہے کہ جب قضائے حاجت کے لیے بیٹھو تو منہ یا پیٹھ کعبہ کی طرف نہ کرو بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو تو یہ خطاب اہلِ مدینہ کو ہے کیونکہ ان کا قبلہ جنوب کی طرف واقع ہے۔ لہٰذا جن ملکوں میں جہتِ قبلہ مشرق و مغرب کی طرف ہو۔ جیسے پاک و ہند میں مغرب کی طرف قبلہ ہے تو ان کو جنوب یا شمال کی طرف منہ یا پیٹھ کر کے بیٹھنا چاہیئے ا۔ مکان بناتے وقت لوگ عام طور پر اس مسئلہ کا خیال نہیں رکھتے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ پاخانہ یا پیشاب خانہ ایسے بنائیں کہ جب اس میں قضاء حاجت کے لیے بیٹھا جائے تو قبلہ کی طرف مُنہ یا پیٹھ نہ کی جائے ۲۔ نیز ویسے بھی قبلہ کی طرف پاؤں کر کے سونا منع ہے۔

نوٹ:۔ اس مسئلہ کی مزید تفصیل اور علماء کی آراء معلوم کرنے کے لیے عینی و فتح الباری اور نیل الاوطار دیکھنی چاہیئے۔

فوائد و مسائل

۱۔ امام مسلم نے فضائل ابن عباس میں اور نسائی نے مناقب میں اس حدیث کا ذکر کیا ۲۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضور اقدس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے لیے پانی کا لوٹا رکھ دیا۔ یہ آپ کی فطانت و ذکاوت کی دلیل ہے اور بیت الخلاء کے قریب اس لیے رکھا تاکہ حضور علیہ السلام کو بعد فراغت پانی طلب نہ کرنا پڑے بلکہ نکلتے ہی بلا کسی تکلف کے آپ کو پانی مل جائے۔ حضرت ابن عباس کی اس فطانت و ذکاوت کو دیکھ کر حضور علیہ السلام نے آپ کو مذکورہ بالا دعا دی ۳۔ حضرت ابن عباس نے جو پانی رکھا وہ استنجا کے لیے تھا۔ جس سے ثابت ہوا کہ پانی سے استنجا کرنا جائز ہے۔ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ پہلے ڈھیلے سے استنجا کر لیا جائے۔ اس کے بعد پانی سے دھویا جائے۔ یہی افضل ہے لیکن صرف پانی سے دھونے کو بھی علماء نے افضل کہا ہے۔ کیونکہ اس میں زیادہ پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔

بَابٌ لَا يَسْتَقْبِلُ الْقِبْلَةَ

باب، پیشاب، پاخانہ کرتے وقت

بِغَائِطٍ اَوْ بَوْلٍ اِلَّا عِنْدَ الْبِنَاءِ جِدَارٍ اَوْ نَحْوِهٖ

قبلہ کی طرف منہ نہ کرے مگر جب کسی عمارت کی آڑ میں ہو جیسے دیوار وغیرہ

۴۴۔ عَنْ اَبِيْ اَيُّوْبَ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتٰى اَحَدُكُمُ الْغَائِطَ فَلَا يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلَا يُوَلِّهَا ظَهْرَهٗ بَلْ شَرِّقُوْا اَوْ غَرِّبُوْا

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب کوئی تم میں سے پاخانہ کو آئے تو قبلہ کی طرف منہ اور پیٹھ نہ کرے بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرے (بخاری)

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا نام خالد بن زید انصاری ہے۔ نجبار صحابہ سے ہیں۔ مدینہ میں حضور اکرم کے اوّلین میزبان ہیں۔ ہجرت کے موقع پر حضور علیہ السلام کی اونٹنی مدینہ میں انہیں کے مکان میں ٹھہری تھی۔ بدر اور عقبۂ الثانیہ میں شریک ہوئے۔ نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے ساتھ بھی تمام محاربات میں شریک رہے۔ جب کہ حضرت معاویہ قسطنطنیہ میں جہاد کر رہے تھے تو آپ ان کے ساتھ شریک جہاد ہونے کے لیے گئے مگر بیمار پڑ گئے۔ جب مرض بڑھ گیا تو آپ نے اصحاب کو وصیت کی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میرے جنازے کو اٹھا لینا اور جب تم دشمن کے سامنے صف بستہ ہو جاؤ تو مجھے اپنے قدموں میں دفن کرنا چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ آپ کی قبر قسطنطنیہ کے قلعہ کی چار دیواری کے قریب ہے جو آج تک مشہور ہے۔ علامہ عینی لکھتے ہیں کہ لوگ آپ کی قبر کی تعظیم کرتے ہیں اور آپ کے وسیلے سے بارش طلب کرتے ہیں تو بارش ہو جاتی ہے (عینی ج ۱ ص ۲۳) آپ سے ۱۵۰ احادیث مروی ہیں جن میں سے بخاری و مسلم نے سات پر اتفاق کیا ہے اور ایک حدیث امام بخاری نے آپ سے منفرداً ذکر کی ہے۔ گویا بخاری میں آپ سے کل آٹھ حدیثیں مروی ہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)

بَاب مَنْ تَبَرَّزَ عَلٰی لَبِنَتَیْنِ

باب دو کچی اینٹوں پر بیٹھ کر پاخانہ کرنا

اسلام چونکہ ایک کامل و مکمل اور ابدی دین ہے اس لیے وہ اپنے ماننے والوں کی ہر موقع پر رہنمائی کرتا ہے۔ کسی اور مذہب میں یہ کاملیت آپ کو نہیں ملے گی کہ وہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہدایات دے۔ یہ شرف تو صرف اسلام کو حاصل ہے کہ وہ قوم مسلم کی ہر دینی و دنیوی معاملہ میں رہنمائی کرتا ہے۔ زمانہ رسالت کے مشرکین یہ دیکھ کر حیران ہوا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ تمہارے رسول تم کو پیشاب و پاخانہ کرنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ صحابہ جواب دیتے کہ ہاں ہمارے رسول نے ہمیں قبلہ کی طرف منہ کرکے پیشاب، پاخانہ کرنے، داہنے ہاتھ سے استنجا کرنے سے منع فرمایا ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہارے لیے باپ کی طرح ہوں اور تم کو تعلیم دیتا ہوں۔ یعنی جیسے ماں باپ شفقت و محبت کے ساتھ بچوں کی تربیت کرتے ہیں اور ان کی بہتری و بھلائی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اس سے بھی کہیں زیادہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اُمت کی فلاح و بہبود مطلوب ہے۔ پیغمبر اپنی اُمّت کا رُوحانی باپ ہوتا ہے اور پھر باپ بھی ایسا جس کا سینہ وہبی علم و عرفان کا گنجینہ ہوتا ہے۔ وہ اُمّت کا معلّم حکیم اور مزکّی ہوتا ہے۔ اس لیے ایک ادنیٰ بات سے لے کر اعلیٰ تک سب کے متعلق وہ اپنی اُمّت کو ہدایت دیتا ہے۔ یہ بیت الخلاء کے آداب و احکامات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں ۲۔ تبرّز کے اصلی معنیٰ براز کی طرف نکلنے کے ہیں۔ براز کھلے میدان کو کہتے ہیں۔ پھر عام طور پر تبرز کے معنیٰ رفع حاجت کے ہوگئے۔
۳۔ لَبِنَتَیْنِ تثنیہ ہے لَبِنَۃٌ، اینٹ کو کہتے ہیں جو مٹی سے بنائی جائے اور آگ میں اس کو پکایا نہ جائے۔ پکی ہوئی اینٹ کو آجُر کہتے ہیں ۴۔ مطلب عنوان یہ ہے کہ آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اگر ممکن ہو تو بوقت قضاء حاجت اپنے دونوں پاؤں کو زمین سے اونچا رکھے تاکہ نجاست سے ملوّث ہونے کا خطرہ نہ رہے۔ جیسے دو اینٹوں پر قضاء حاجت کی جائے ۵۔ اس باب میں امام نے جو حدیث ذکر کی ہے اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ حدیث اس حدیث کی مخصص ہے جس میں مطلقاً قبلہ کی طرف مُنہ کرنے اور پیٹھ کرنے کی ممانعت آئی ہے کیونکہ حضرت ابن عمر کا بیان ہے کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دو اینٹوں پر بیت المقدس کی طرف مُنہ کیے ہوئے قضاء حاجت کرتے دیکھا جس سے واضح ہوا کہ اگر کوئی حائل ہو تو پھر کعبہ کی طرف استقبال میں حرج نہیں۔ حدیث ابن عمر یہ ہے:۔

۱۴۵۔ عَنْ عَمِّہٖ وَاسِعِ بْنِ حَبَّانَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ اِنَّ نَاسًا یَّقُوْلُوْنَ اِذَا قَعَدْتَّ عَلٰی حَاجَتِکَ فَلَا تَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَۃَ وَلَا بَیْتَ الْمَقْدِسِ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰہِ ابْنُ عُمَرَ لَقَدِ ارْتَقَیْتُ یَوْمًا عَلٰی ظَھْرِ بَیْتٍ لَّنَا فَرَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی لَبِنَتَیْنِ

محمد بن یحییٰ اپنے چچا واسع بن حبان سے اور وہ حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ واسع بن حبان کہتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جب تم حاجت کے لیے بیٹھو تو قبلہ کی طرف مُنہ نہ کرو اور نہ بیت المقدس کی طرف۔ عبد اللہ بن عمر نے کہا میں ایک دن اپنے گھر کی چھت پر چڑھا تو (اچانک میری نظر پڑ گئی) میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ

مُسْتَقْبِلًا بَيْتَ الْمَقْدِسِ لِحَاجَتِهِ وَ قَالَ لَعَلَّكَ مِنَ الَّذِيْنَ يُصَلُّوْنَ عَلٰى أَوْرَاكِهِمْ فَقُلْتُ لَا أَدْرِيْ وَاللّٰهِ قَالَ مَالِكٌ يَعْنِيْ الَّذِيْ يُصَلِّيْ وَلَا يَرْتَفِعُ مِنَ الْأَرْضِ يَسْجُدُ وَهُوَ لَاصِقٌ بِالْأَرْضِ (بخاری)

علیہ وسلم دو کچی اینٹوں پر بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے حاجت کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابن عمر نے واسع سے کہا کہ شاید تو ان لوگوں میں سے ہے جو سرین کے بل نماز پڑھتے ہیں۔ میں نے کہا خدا کی قسم میں نہیں جانتا۔ امام مالک نے کہا ابن عمر نے اس شخص سے وہ مراد لیا جو نماز میں زمین سے اُونچا نہ رہے اور سجدہ میں زمین سے چمٹ جائے۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے کتاب الطہارۃ میں مکرر اور خمس میں بھی ذکر کیا ہے۔ ترمذی، نسائی، ابن ماجہ و ابوداؤد و امام مسلم نے بھی اس حدیث کو کتاب الطہارۃ میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ السلام کی اس حالتِ خاص کو قصداً، عمداً دیکھا تھا۔ ہوا یہ کہ جب وہ مکان کی چھت پر چڑھے تو اچانک ان کی نظر حضور اکرم پر پڑ گئی اور اس کو بیان اس لیے کیا کہ حضور کے اقوال و افعال شریعت ہیں ۳۔ حضرت واسع حضرت عبداللہ بن عمر کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے اپنے استاد حضرت عبداللہ بن عمر کے سامنے یہ ذکر کیا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں یعنی حضرت ابو ایوب انصاری و ابوہریرہ و معقل الاسدی وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو مکان میں بھی قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنے سے منع کرتے ہیں۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنا مسلک بیان کیا کہ مکان میں کعبہ کی طرف منہ کرنا جائز ہے کیونکہ میں نے خود حضور اکرم کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ ۴۔ اس کے بعد آپ نے واسع سے فرمایا کہ شاید تو بھی ان لوگوں میں سے ہے جو سرین کے بل نماز پڑھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے اس جملہ کا مسئلہ قضاءِ حاجت سے کوئی ربط دکھائی نہیں دیتا۔ شارحین کرام نے ربط و تعلق قائم کرنے کے لیے متعدد توجیہیں کی ہیں۔

بعض نے کہا مقصد حضرت ابن عمر کا اس جملہ سے یہ ہے کہ جیسے وہ لوگ جو سجدہ میں اپنے پیٹ کو رانوں کے ساتھ چمٹا لیتے ہیں تو جیسے یہ لوگ سجدہ کے مسئلہ سے ناواقف ہیں اسی طرح تم بھی مسئلہ قضاءِ حاجت سے ناواقف ہو کیونکہ اگر واقف ہوتے تو یہ جان لیتے کہ قضاء حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنے کی ممانعت میدان میں ہے مکان میں نہیں لیکن ظاہر ہے یہ توجیہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اول تو روایت میں مذکور نہیں ہے کہ یہ مسئلہ حضرت واسع نے پوچھا تھا تاآنکہ وہ ان کو جاہل قرار دیتے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو سجدہ کی سُنّت سے ناواقف ہو، وہ قضاءِ حاجت کے طریقہ سے بھی ناواقف ہو — بعض نے یہ توجیہہ کی اور یہی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابن عمر کے اس جُملہ کا مسئلہ قضاء حاجت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دراصل حضرت ابن عمر نے واسع کو نماز پڑھتے دیکھا اور حضرت واسع نے سجدہ میں کوئی غلطی کی ہوگی۔ اس لیے آپ کو ان کو سجدہ کرنے کا طریقہ بتا دیا کہ مرد کے لیے سجدہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سجدہ میں پیٹ کو رانوں سے چمٹائے نہیں۔ سات اعضاء پر سجدہ کرے اور کہنیاں زمین پر نہ بچھائے جیسا کہ احادیث میں مذکور ہے۔ چنانچہ مسلم کی حدیث اس توجیہہ کی تائید کرتی ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت واسع کہتے ہیں۔ میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا اور حضرت ابن عمر بیٹھے تھے۔ جب میں

میں نماز پڑھ چکا تو ان کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا: بعض لوگ کہتے ہیں؟ پھر پوری حدیث کو آخیر تک بیان کیا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ابن عمر نے حضرت واسع کو سجدہ میں کوئی غلطی کرتے دیکھا تھا۔ اس بناء پر سجدہ کا مسئلہ قضائے حاجت مسئلہ کے ساتھ بیان کر دیا۔

بوقتِ قضاءِ حاجت کعبہ معظمہ کی طرف منہ اور پیٹھ کرنے کے متعلق تفصیلی گفتگو

واضح ہو کہ اس مسئلہ میں متعدد قول ہیں۔ اوّل، عروہ بن زبیر و ربیعۃ الرائی و داود الرائی کا قول یہ ہے کہ قضاء حاجت کے وقت کعبہ شریف کی طرف استقبال و استدبار مطلقاً جائز ہے۔ یہ لوگ حدیث ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جس میں ممانعت آئی ہے) کو منسوخ قرار دیتے ہیں اور حدیث جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کا ناسخ۔ دوم۔ امام مالک و شافعی و احمد و اسحٰق و عبداللہ بن عمر وغیرہ صحابہ کرام کا مسلک یہ ہے کہ اگر قضاء حاجت کھلے میدان میں کی جائے جہاں کوئی آڑ نہ ہو تو پھر تو کعبہ شریف کی طرف منہ یا پیٹھ کرنا جائز نہیں ہے اور اگر مکان میں قضائے حاجت کی جائے یا کوئی آڑ ہو تو پھر تو کعبہ کی طرف منہ یا پیٹھ کرنے میں حرج نہیں ہے۔ یہ حضرات احادیث مندرجہ ذیل سے استدلال کرتے ہیں۔ اوّل، حدیث ابن عمر (جو زیر بحث ہے) کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دو اینٹوں پر بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے قضاءِ حاجت کرتے ہوئے دیکھا لیکن امام مالک و شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کا اس حدیث سے مذکورہ بالا استدلال کرنا متعدد وجوہ سے درست نہیں ہے۔

اوّلاً۔ جس سوال کے جواب میں حضرت عبداللہ بن عمر نے یہ جواب دیا وہ یہ تھا کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قضاء حاجت کے وقت قبلہ اور بیت المقدس کی طرف منہ نہ کیا جائے۔ اس کے جواب میں حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا۔ میں نے حضور علیہ السلام کو بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے قضاء حاجت کرتے دیکھا ہے۔ اس سوال و جواب پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس میں مسئلہ استقبالِ قبلہ کو بیان کرنا مقصود ہی نہیں ہے بلکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما تو اس شخص کے مسلک کی تردید کر رہے ہیں جو استقبال بیت المقدس کو استقبالِ کعبہ کی طرح مکروہ سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے استقبال و استدبارِ کعبہ کا ذکر تک نہیں کیا بلکہ استقبالِ بیت المقدس کا ذکر فرمایا۔ رہا یہ سوال کہ مدینہ شریف میں جب بیت المقدس کی طرف منہ ہو گا تو کعبہ شریف کی طرف پیٹھ ہو جائے گی تو اس کے لیے پہلے سمتِ بیت المقدس کی تحقیق کرنی پڑے گی اور یہ بات علماءِ علمِ جغرافیہ ہی سے طے کر سکتے ہیں۔ بہرحال اتنی بات واضح ہے کہ حضرت ابن عمر جس بات کی تردید کر رہے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ استقبالِ بیت المقدس کو استقبال کعبہ کی طرح سمجھا جائے۔ رہا کعبہ کی طرف استقبال و استدبار کا مسئلہ تو اس حدیث میں اس کا بیان نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ فضل اللہ تورپشتی نے شرح المصابیح میں لکھا ہے کہ حدیث ابن عمر میں جناب ابن عمر نے استدبارِ کعبہ کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ وانما انکر علی من قال بالنھی من استقبال بیت المقدس فافہم

ثانیاً۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی اچانک نظر پڑ گئی تھی اور یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی حضور علیہ السلام کی حالتِ خاص کو قصداً عمداً دیکھے۔ ایسی صورت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ قضاءِ حاجت کے وقت حضور اکرم واقعی کعبہ کی طرف

بیٹھ گئے تھے ، یہ بھی تو ممکن ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم[1] اس طرح بیٹھے ہوں کہ صرف آپ کا چہرۂ اقدس بیت المقدس کی طرف ہو۔ چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جس سمت کی طرف بیٹھ کر پیشاب و پاخانہ کرتا ہے۔ چہرہ کسی اور سمت کی طرف موڑ لیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ حضور واقعی کعبہ کی طرف ہوکر قضاء حاجت نہ فرما رہے ہوں۔

ثالثاً۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اچانک نظر پڑ جانے پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ فیصلہ فرما لینا کہ حضور اکرم واقعی کعبہ کی طرف ہوکر قضاء حاجت فرما رہے تھے۔ یہ ان کا ظن وفہم ہی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کے پاس اس مسئلہ کے متعلق کوئی حدیث مرفوع نہیں تھی اگر ہوتی تو وہ ضرور پیش کر دیتے خصوصاً معارضہ کی صورت میں تو جب حدیث ابن عمر خود مشتبہ ہے تو اس سے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم واقعی کعبہ کی طرف ہوکر ہی قضاء حاجت فرما رہے تھے یا نہیں تو اس سے جواز کا استدلال کرنا کیونکر درست قرار پا سکتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ ممانعتِ استقبال و استدبار کے متعلق حضور کی مرفوع حدیث موجود ہے جو ایک قانونِ کلی کی حیثیت رکھتی ہے فافہم۔

حدیث حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت جابر ابن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کعبہ کی طرف استقبال و استدبار سے منع فرمایا لیکن میں نے دیکھا کہ حضور علیہ السلام نے اپنی وفات کے ایک سال قبل کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے پیشاب فرمایا (ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم نے فرمایا یہ حدیث شرطِ مسلم پر صحیح ہے)۔ اس سے وہ لوگ جو مطلقاً استقبال و استدبار کے جواز کے قائل ہیں استدلال کرتے ہیں لیکن اس سے بھی مطلقاً استدبار و استقبال کے جواز پر دلیل لینا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں بھی وہی احتمالات موجود ہیں جو حدیثِ ابن عمر میں ہم نے بیان کئے ہیں — اور ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ اگر مان لیا جائے کہ واقعی حضور علیہ السلام نے کعبہ کے رُخ ہوکر پیشاب فرمایا تو یہ حضور اکرم کے خصائص سے ہوگا کیونکہ حضور علیہ السلام کعبہ سے قطعاً و حتماً افضل ہیں لہٰذا آپ کے لیے استقبال جائز ہوگا اور اگر فضیلت کو خصوصیت کی علت نہ بنایا جائے تو بھی بعض احکام میں حضور اقدس کا مختلف ہونا امر محقق ہے۔ حضور علیہ السلام نے جناب علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کو فرمایا۔ میرے اور تمہارے سوا کسی کو مسجد میں بحالتِ جنابت رہنا جائز نہیں ہے (اس حدیث[2]

---

[1] واضح ہو کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ بوقتِ قضاء حاجت کعبہ کی طرف منہ نہ کرو۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ شرمگاہ کعبہ کی طرف نہ ہو۔ اگر صورت یہ ہو کہ شرمگاہ تو کعبہ کی طرف نہیں ہے اور کسی نے صرف اپنا منہ کعبہ کی طرف کر لیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ۱۲ منہ

[2] رہی یہ بات کہ حضور اکرم نے صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو کیوں مخصوص فرمایا حالانکہ وہ نبی نہیں ہیں تو سیرۃ محمدیہ میں ہے کہ جناب موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے مصر میں مسجد بنائی تو اعلان کیا کہ میرے اور ہارون کے سوا کسی کو مسجد میں بحالتِ جنابت رہنا جائز نہیں ہے۔ جس سے واضح ہوا کہ مسجد میں بحالتِ جنابت رہنے کا جواز خصائصِ نبوت سے ہے لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم چونکہ بمنزلہ ہارون کے ہیں اور حضور نے فرمایا۔ انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ۔ اس لیے حضور نے حضرت علی کے لیے یہ رخصت دیدی کہ وہ بحالت جنابت

(اگلے صفحہ پر)

کو امام بخاری نے حسن کہا۔ حالانکہ عام قانون یہی ہے کہ بحالتِ جنابت مسجد میں رہنا جائز نہیں ہے لیکن حضور اقدس علیہ السلام نے اس عام قانون سے اپنی ذات کو اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو خاص کر لیا۔ یہی حال استقبالِ قبلہ کا بھی ہو سکتا ہے اور خصوصیت کا قول اس لیے کرنا پڑ رہا ہے کہ حضور کی عام عادت اور جس بات کو حضور علیہ السلام نے ایک قانونِ کلی قرار دیا ہے وہ یہی ہے کہ بوقت قضاء حاجت کعبہ کی طرف منہ یا پیٹھ نہ کی جائے۔ فافہم

اس کے علاوہ عقل بھی یہ چاہتی ہے کہ حضور علیہ السلام کے لیے بوقتِ قضاء حاجت کعبہ شریف کو استقبال و استدبار جائز ہو کیونکہ صحیح احادیث و روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور کے فضلاتِ مبارک عام انسانوں کی طرح نہیں تھے۔ اور کعبہ شریف کو استقبال و استدبار کی علت احترامِ کعبہ ہی ہے اور حضور کے استقبال و استدبار سے احترامِ کعبہ میں کوئی خلل نہیں آتا۔ چنانچہ جناب سیدہ عائشہ صدیقہ طیبہ و طاہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بحضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم عرض کی آپ جس جگہ قضاء حاجت فرماتے ہیں وہاں میں کچھ نہیں پاتی۔ اس پر حضورِ اقدس نے فرمایا۔

اما تعلم ان الارض تبتلع عذرات الانبیاء	کیا تم نہیں جانتیں کہ انبیاء کرام کے عذرات کو زمین نگل جاتی ہے۔

یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِن اجساد الانبیا نابتۃ علی اِجسادِ الملائکۃِ　　(کنز العمال)	انبیاءِ کرام کے جسم اجسادِ ملائکہ پر پیدا فرمائے گئے ہیں۔

خصائصِ کبریٰ میں علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ نے جو حدیث نقل کی ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی حضور! وہاں میں مشک و عنبر کی خوشبو باقی ہوں۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہمارے اجساد ارواح اہل جنت پر پیدا فرمائے گئے ہیں الخ۔ بتائیے جس ہستیٔ مقدس کی یہ شان ہو وہ اگر بوقتِ قضاءِ حاجت کعبہ کو استقبال و استدبار فرمائے تو احترامِ کعبہ میں کیا فرق پڑ سکتا ہے۔

حدیثِ عراک اس سلسلہ میں مجوزین کی طرف سے یہ حدیث بھی پیش کی جاتی ہے کہ جس کی سند یہ ہے۔ (حدثنا وکیع عن حماد بن سلمہ عن خالد الحذاء عن خالد بن ابی الصلت عن عراک بن مالک عن عائشۃ قالت) حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام کے سامنے ان لوگوں کا ذکر کیا گیا جو کعبہ شریف کی طرف شرمگاہ کرنے کو معیوب سمجھتے ہیں تو اس پر آپ نے فرمایا۔ میرے پاخانہ کی بیٹھک قبلے کی طرف کر دو (رواہ ابن ماجہ) اس حدیث کے وصل و ارسال سے متعلق محدثین نے کلام کیا ہے۔

۱۔ ابن ابی حاتم نے اس حدیث کو مرسل قرار دیا ہے کیونکہ امام احمد ابن حنبل نے فرمایا ہے کہ عراک کا حضرت عائشہ سے سماع

مسجد میں رہ سکیں لیکن اس کے ساتھ یہ تصریح بھی فرما دی۔ الا انہ لا نبی بعدی، کہ میں خاتم النبیین ہوں۔ میرے بعد کسی کو نبوت نہیں مل سکتی تاکہ کوئی دجال یہ نہ کہہ سکے کہ حضرت علی جب بمنزلہ ہارون علیہ السلام کے ہوئے تو نبی ہو گئے (فافہم)

ثابت نہیں ہے۔ بعض علماء نے جواب میں کہا کہ امام مسلم نے عراک کا سماع حضرت عائشہ صدیقہ سے ثابت کیا ہے اور ان سے ایک حدیث روایت کی ہے۔ جس میں عراک حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جناب احمد بن حنبل کا ارشاد مُسلم سے زیادہ لائقِ اتباع ہے لہذا یہ حدیث اگرچہ امام مسلم کے نزدیک صحیح ہے لیکن عند احمد معلول ہے۔

اس طرح امام نووی نے کہا اس کی اسناد حسن ہے مگر اسناد کے حسن ہونے سے حدیث کا حسن ہونا لازم نہیں آتا۔ اور امام ذہبی نے میزان میں لکھا کہ خالد بن ابی الصلت مُنکر ہے۔ ظاہر ہے کہ امام ذہبی معرفت، رجال اور تنقیدِ حدیث میں کہیں افضل و اعلیٰ ہیں۔ پھر اس حدیث کا موقوف ہونا بدیہی بات ہے۔ یہی حدیث عراک نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے سامنے پیش کی تھی لیکن حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس پر عمل نہیں کیا۔ (رواہ البیہقی و دار القطنی) اور عمل نہ کرنے کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ یہ حدیث ان کے نزدیک مرفوع نہ تھی۔ علاوہ ازیں یہ حدیث اس باب میں بالکل اجنبی معلوم ہوتی ہے اور حضور کی قولی مرفوع حدیثوں سے اس کا کوئی ربط قائم نہیں ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی قابلِ غور ہے کہ حدیثِ عراک حدیثِ ابو ایوب سے (جس میں ممانعت وارد ہوئی ہے) یا مقدم ہے یا مؤخر۔ اگر مقدم ہے تو حدیث ابو ایوب انصاری (جو مرفوع متصل قولی حدیث ہے) سے منسوخ قرار پائے گی اور اگر مؤخر ہے تو یہ بات بہت ہی البعد ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم استقبال و استدبار سے مطلقاً صریح طور پر منع فرمانے کے بعد چند لوگوں کے متعجب ہونے پر اس نہی کو واپس لے لیں۔ یہ بات بھی حدیثِ عراک کے موقوف ہونے کی دلیل ہے اور اس سے یہ وضاحت ملتی ہے۔ اِسْتَقْبِلُوْا بِمَقْعَدَتِیْ الْقِبْلَۃَ کا امر امرِ نبوی نہیں ہے بلکہ امرِ عائشہ ہوگا۔ فافہم

خلاصہ کلام یہ کہ جو حضرات اس امر کے قائل ہیں کہ اگر مکان میں رفع حاجت کی جائے یا کوئی آڑ ہو تو پھر کعبہ کی طرف منہ یا پیٹھ کرنا جائز ہے وہ جسقدر حدیثیں پیش کرتے ہیں وہ سب کی سب متعدد احتمالات کی حامل ہیں اور ان سے یقینی طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضور علیہ السلام نے واقعی کعبہ کو استقبال و استدبار فرمایا۔ پھر ان میں سے بعض کے اسناد میں محدثین نے یہ کلام کیا ہے کہ منکر و مُرسل قرار دیا ہے۔ ان سب باتوں سے صرفِ نظر کر لیجئے تو یہ بات تو بالکل بدیہی ہے یہ سب کی سب حدیثیں موقوف ہیں۔ حتیٰ کہ حدیث ابن عمر بھی حضور علیہ السلام کا قول نہیں ہے۔ لہذا اس نوع کی احادیث سے کسی مسئلہ کی حلت و حُرمت ثابت نہیں ہوتی۔ لہذا ضروری ہے کہ ہم اس باب میں مرفوع متصل صحیح احادیث سے مسئلہ کا فیصلہ کریں جو اس باب میں نصِ صریح ہیں۔ چنانچہ اس باب کی قولی احادیث سے بلا کھینچ تان کے آفتابِ نیم روز کی طرح یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بوقتِ قضائے حاجت کعبہ کی طرف مُنہ یا پیٹھ کرنا بہر صورت ممنوع ہے۔ وہ احادیث یہ ہیں۔

۱۔ حدیث عبداللہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس کا مضمون یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی کعبہ کی طرف منہ کر کے پیشاب نہ کرے (عینی جلد ۱ ص ۷۵) اس حدیث کو ابن حبان نے صحیح کہا۔

۲۔ حدیث معقل بن ابی معقل جس کے الفاظ یہ ہیں :۔

نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ اَنْ یَّسْتَقْبِلَ الْقِبْلَتَیْنِ بِبَوْلٍ اَوْ غَائِطٍ (ابن ماجہ، ابوداؤد)	حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ بیت المقدس اور کعبہ کی طرف منہ کر کے پیشاب یا پاخانہ کیا جائے۔

۳- حدیث سلمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جس کے لفظ یہ ہیں :-

نَهَانَا اَن نستقبل القبلة بِغَائِطٍ او بول (مسلم، بخاری، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منع فرمایا کہ ہم پیشاب یا پاخانہ کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ کریں۔

۴- حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس کے الفاظ یہ ہیں :-

فَاِذَا اَتَى اَحَدُكُمُ الْغَائِطَ فَلَا يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلَا يَسْتَدْبِرْهَا (مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی)

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی بیت الخلاء جائے تو قبلہ کو منہ بھی نہ کرے اور پیٹھ بھی نہ کرے۔

۵- حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث جس میں قضاء حاجت کے وقت مطلقاً قبلہ کی طرف استقبال و استدبار کی ممانعت وارد ہوئی ہیں۔

یہ ہیں وہ صاف وصریح واضح حدیثیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قضاء حاجت کے وقت کعبہ کی طرف منہ پیٹھ کرنا خواہ آڑ ہو یا نہ ہو، بہرصورت ممنوع ہے۔ یہ مسلک سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا ہے اور یہاں تک دلائل کا تعلق ہے۔ مسلکِ امام اعظم بہت ہی قوی ومستحکم ہے۔ چنانچہ قاضی ابوبکر بن عربی علیہ الرحمۃ نے شرح ترمذی میں یہ لکھا کہ اقرب واقوی اس باب میں مذہب حنفیہ ہی ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

بَابُ خُرُوجِ النِّسَآءِ اِلَى الْبَرَازِ

باب مستورات کا قضاء حاجت کے لیے نکلنے کے بیان میں

۱۴۶- عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ اَزْوَاجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُنَّ يَخْرُجْنَ بِاللَّيْلِ اِذَا تَبَرَّزْنَ اِلَى الْمَنَاصِعِ وَهِيَ صَعِيدٌ اَفْيَحُ وَكَانَ عُمَرُ يَقُولُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُ فَخَرَجَتْ سَوْدَةُ بِنْتُ زَمْعَةَ زَوْجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً مِّنَ اللَّيَالِي عِشَآءً وَّ كَانَتِ امْرَاَةً طَوِيْلَةً فَنَادَاهَا عُمَرُ اَلَا قَدْ عَرَفْنَاكِ يَا سَوْدَةُ حِرْصًا عَلٰٓى اَنْ يُّنْزَلَ الْحِجَابُ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ الْحِجَابَ (بخاری شریف)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ازواجِ مطہرات رات کو پاخانہ کے لیے مناصع کی طرف نکلتی تھیں اور مناصع ایک وسیع (کھلا) میدان تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کرتے تھے کہ حضور اپنی ازواج کو پردہ میں بٹھائیے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا حکم نہیں دیتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت ام المومنین سودہ بنت زمعہ عشاء کے وقت قضاء حاجت کے لیے نکلیں اور وہ لمبے قد کی عورت تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (ان کو دیکھ کر) آواز دی۔ اے سودہ ہم نے تمہیں پہچان لیا۔ کیونکہ عمر کو اس بات کی حرص تھی کہ پردہ کا حکم آئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے پردہ کا حکم نازل فرمادیا۔

فوائد ومسائل اس حدیث کو امام مسلم نے استیذان میں ذکر فرمایا ۲- مناصع وہ مقامات ہیں جو مدینہ منورہ کے

کنارے بقیع کی طرف ہیں۔ یہاں مستورات قضاءِ حاجت کے لیے جایا کرتی تھیں۔ صعید افیح کے لفظ سے مناصع کی تفسیر کی گئی یعنی وہ جگہ جو کھلی ہو وسیع ہو۔ افیح کے معنیٰ کشادہ جگہ کے ہیں۔

احجب نساءك حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گزارش یہ تھی کہ حضور اکرم ازواجِ مطہرات کو بالکل گھر سے نکلنے کی ممانعت فرمادیں۔ یعنی حضرت عمر کا منشا یہ تھا کہ ازواجِ مطہرات چادر اوڑھ کر بھی باہر نہ نکلیں۔ لیکن وحی نے ان کی اس رائے سے موافقت نہیں کی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بوقتِ ضرورت پردہ کے ساتھ باہر نکلنے کی اجازت کو برقرار رکھا۔ جیسا کہ اس باب کی اگلی حدیث سے واضح ہو رہا ہے اور بخاری کتاب التفسیر میں اس کی وضاحت و تشریح ہے کہ جناب سودہ رضی اللہ عنہا حکمِ حجاب کے نزول کے بعد نکلی تھیں اور جناب فاروقِ اعظم کی خواہش یہ ہوئی کہ چادر اوڑھنے کے بعد بھی جسم کا طول و عرض معلوم دیتا ہے اس کے چھپانے کا بھی حکم دیا جائے مگر ان کی اس رائے سے وحی الٰہی نے موافقت نہیں فرمائی۔ فافہم۔

ہاں آیتِ حجاب کا نزول جناب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی رائے کے موافق ہوا اور حجاب کا حکم بھی ان گیارہ امور میں سے ہے جن میں وحی الٰہی نے جناب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے کی تائید و توثیق کی۔

علامہ قسطلانی نے لکھا ہے کہ حجاب کا مطلب یہ ہے کہ مستورات چادر سے اپنے تمام جسم کو چھپائیں اور راستہ دیکھنے کے لیے آنکھیں کھلی رکھیں

۱۴۷- عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَدْ أُذِنَ لَكُنَّ أَنْ تَخْرُجْنَ فِي حَاجَتِكُنَّ قَالَ هِشَامٌ يَعْنِي الْبَرَازَ (بخاری)

جناب عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تمہیں حاجت کے لیے گھر سے باہر جانا جائز ہے۔ (مگر چادر اوڑھ کر)

کتاب التفسیر میں اس کا واقعہ یوں آیا ہے کہ حجاب کا حکم نازل ہوجانے کے بعد جناب سودہ رضی اللہ تعالیٰ رات کے وقت (چادر اوڑھ کر) قضاءِ حاجت کے لیے نکلیں۔ چونکہ یہ فربہ عورت تھیں۔ اس لیے حضرت عمر نے ان کو پہچان لیا اور کہا تم ہم سے چھپی ہوئی نہیں ہو۔ حضرت سودہ نے حضور علیہ السلام سے شکایت کی۔ حضرت عمر ایسا کہتے تھے۔ حضور علیہ السلام اس وقت رات کا کھانا تناول فرما رہے تھے۔ آپ پر وحی آئی اور فرمایا کہ تمہیں بوقتِ ضرورت (چادر اوڑھ کر) نکلنے کی اجازت دی گئی ہے۔

بَابُ التَّبَرُّزِ فِي الْبُيُوتِ

باب گھروں میں قضاءِ حاجت کے بیان میں

۱۴۸-۱۴۹- امام نے یہ بیان دو باتوں کے بیان کرنے کے لیے قائم کیا ہے۔

اول یہ کہ مستورات کو قضاءِ حاجت کے لیے گھروں سے باہر جانا اس وقت تک کے لیے تھا جب تک گھروں میں پاخانے نہیں بنے تھے لیکن جب گھروں میں پاخانے بنا دیئے گئے تو اب گھروں سے باہر جانے کی ضرورت نہیں

رہی۔ دوم ۔ یہ کہ گزشتہ احادیث میں یہ آیا ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارکہ میں مستورات جنگل میں قضائے حاجت کے لیے جایا کرتی تھی۔ اس سے کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ قضاء حاجت کے لیے جنگل میں جانا ہی ضروری ہے اور گھروں میں پاخانے بنانا درست نہیں ہے۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے عنوانِ مذکورہ قائم کر کے یہ بتایا کہ صرف مستورات کے لیے گھروں میں ضروری پاخانے بنائیں۔ اس لیے کہ جب وہ باہر نکلتی ہیں تو ان مواقع پر عموماً اوباش لوگ ان کے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔

اس عنوان کے ماتحت امام نے دو حدیثیں ذکر کی ہیں۔

پہلی حدیث کا مضمون یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ میں کسی ضرورت کے لیے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مکان کی چھت پر چڑھا۔ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کعبہ کو پیٹھ کیے اور شام کی طرف منہ کیے قضاء حاجت فرما رہے تھے۔ دوسری حدیث کا مضمون یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ حضور علیہ السلام دو اینٹوں پر بیت المقدس کی طرف منہ کیے ہوئے قضاء حاجت فرما رہے تھے۔ یہ احادیث مع تفہیم کے پہلے گزر چکی ہیں۔ اس لیے ہم نے ان کا متن نہیں لکھا۔

بَابُ الْاِسْتِنْجَاءِ بِالْمَاءِ

باب پانی سے استنجا کرنے کے بیان میں

اس باب کے قائم کرنے سے امام کا مقصد ان لوگوں کی تردید ہے جو یہ کہتے ہیں کہ پانی سے استنجا کرنا مکروہ ہے اور یہ کہ پانی سے استنجا کرنا حضور علیہ السلام سے ثابت نہیں ہے۔

۱۵۰۔ يَقُولُ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا خَرَجَ لِحَاجَتِهٖ اَجِئُ اَنَا وَغُلَامٌ وَّمَعَنَا اِدَاوَةٌ مِّنْ مَّاءٍ يَعْنِىْ يَسْتَنْجِىْ بِهٖ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب قضاءِ حاجت کے لیے تشریف لے جاتے تو میں اور ایک لڑکا پانی کا کوزہ لے کر آتے یعنی حضور علیہ السلام اس سے استنجاء فرماتے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے صلوٰۃ اور طہارۃ میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم، نسائی۔ ابو داؤد نے بھی طہارۃ میں ذکر فرمایا ہے۔

غلام اس کی جمع اغلمہ، غلمہ و غلمان ہے۔ غلام کی تعریف میں متعدد قول ہیں۔ دودھ چھٹنے سے سات برس کی عمر تک غلام ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جس کی مونچھیں ظاہر ہو جائیں۔ اس کو غلام کہیں گے۔ علامہ زمخشری کہتے ہیں غلام وہ لڑکا ہے۔ جس کی ڈاڑھی نہ نکلی ہو۔ ان تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ جس کی ڈاڑھی آجائے اس کو غلام نہیں کہیں گے مگر مجازاً جیسے سیدنا حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نے اپنے ایک رجز میں فرمایا۔ انا الغلام الہاشمی المکی۔ اِدَاوَۃ۔ اس چھوٹے برتن کو کہتے ہیں جو چمڑے سے بنایا جائے۔

۲۔ اصیلی نے یہاں یہ اعتراض کیا ہے کہ امام بخاری کا اس حدیث سے یہ استدلال کرنا کہ پانی سے استنجا جائز ہے

صحیح نہیں کیونکہ یستنجی بہ۔ حضرت انس کا قول نہیں ہے بلکہ ابوالولید کا ہے جو شعبہ سے روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی حدیث کو سلیمان بن حرب نے شعبہ سے روایت کیا ہے۔

پانی سے استنجا کرنے کے مسائل اور اس کی تفصیلی بحث

مگر اس میں یستنجی بہ کا لفظ نہیں ہے۔ جس سے یہ استدلال پیدا ہوتا ہے کہ یہ پانی استنجاء کے لیے نہیں بلکہ وضوء کے لیے لایا گیا ہو۔ جواب یہ ہے کہ متعدد روایتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ جملہ حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ ہی کا ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے بطریق ابن بشار عن غندر عن شعبہ جو روایت کی ہے۔ اس میں یستنجی بالماء ہے اسی طرح روایت اسماعیلی من طریق عمرو بن مرزوق عن شعبہ اس کے لفظ یہ ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا۔

مَعَنَا اِدَاوَةٌ فِیْهَا مَاءٌ یَسْتَنْجِیْ مِنْهَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ | ہمارے ساتھ پانی کا برتن تھا جس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے استنجاء فرمایا۔

اسی طرح بخاری نے روح بن قاسم سے انہوں نے عطاء بن ابی میمونہ سے جو روایت کی ہے اس میں اور مسلم نے طریق خالد الحذاء عن عطاء عن انس میں اور صحیح ابی عوانہ میں بھی یہی لفظ ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے۔ یستنجی بہ حضرت انس ہی کا قول ہے۔ ابوالولید بن ہشام کا نہیں ہے۔ ۲۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی سے استنجا فرمایا۔ مثلاً

۱۔ صحیح ابن خزیمہ میں ابراہیم بن جریر سے ہے کہ حضور غیضہ میں قضاء حاجت کے لیے تشریف لائے اور جریر ایک ڈول پانی لائے اور آپ نے پانی سے استنجاء فرمایا۔ ۲۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قضاء حاجت کے لیے گئے تو میں نے آپ کے لیے پانی کا برتن رکھ دیا (بخاری شریف) ۳۔ مسلم نے پانی سے استنجا کرنے کو امور فطرۃ میں شمار کیا ہے ۴۔ صحیح ابن حبان میں ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ حضور علیہ السلام بیت الخلاء سے نکلے ہوں اور پانی نہ لیا ہو ۵۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا اپنے خاوندوں سے کہو کہ وہ پاخانہ و پیشاب کے بعد پانی استعمال کریں کیونکہ حضور ایسا کرتے تھے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا۔ ۶۔ صحیح ابن حبان میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے پانی سے استنجا فرمایا ۷۔ ابن حبیب نے شرح موطاء ابان بن عیاش سے روایت ذکر کی کہ حضور اقدس علیہ السلام نے فرمایا۔ پانی سے استنجا کیا کرو۔ اس میں زیادہ پاکیزگی ہے۔ یہ تمام مباحث عینی ج ۱ ص ۷۱۸ نیل اوطار و ارشاد الساری میں ہیں۔

ان احادیث سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے جو پانی سے استنجاء کو مکروہ قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ پانی سے استنجا کرنا حضور علیہ السلام سے ثابت نہیں ہے۔

توضیح ۱۔ جمہور سلف وخلف کا مسلک یہ ہے کہ پانی اور ڈھیلوں دونوں سے استنجاء کرنا افضل ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ڈھیلا ملے تاکہ نجاست کم ہو جائے اس کے بعد پانی سے دھوئے۔

۲۔ اور اگر ایک پر اکتفا کرنا چاہے تو پانی سے استنجا کرنا افضل ہے۔ کیونکہ ڈھیلے سے صرف عین نجاست زائل ہوتی ہے

مگر اثر زائل نہیں ہوتا اور پانی سے عین نجاست اور اس کا اثر دونوں زائل ہو جاتے ہیں اور اس میں زیادہ پاکیزگی بھی ہے مگر مستحب یہ ہے کہ ڈھیلا لینے کے بعد پانی سے استنجا کرے کیونکہ ڈھیلا لینا بہر صورت سنت ہے۔

۳۔ رہی یہ بات کہ صرف ڈھیلے سے بھی استنجا کرنا کافی ہے یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ و شافعی فرماتے ہیں کہ صرف ڈھیلوں سے استنجا کر لینا کافی ہے کیونکہ پانی سے استنجا کرنا واجب نہیں ہے لیکن ڈھیلوں سے استنجا کرنا اس صورت میں کافی ہوگا اور اس سے نماز بھی درست ہوگی۔ جب کہ نجاست سے مخرج کے آس پاس کی جگہ ایک درہم سے زیادہ آلودہ نہ ہو اور اگر درہم سے زیادہ سن ہو جائے تو پھر دھونا فرض ہے اگرچہ ڈھیلا لینا اس صورت میں بھی سنت ہے حضرت سعید بن ابی وقاص، ابن زبیر اور ابن مسیب اور عطاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی یہی مسلک ہے کہ پانی سے استنجا کرنا واجب نہیں ہے اور صرف ڈھیلوں سے پاک کر لینا کافی ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا کہ جب تم میں سے کوئی پاخانے کے لیے جائے اور تین پتھروں سے استنجا کرے وہ کافی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صرف ڈھیلے سے استنجا کرنا کافی ہے اور پانی سے کرنا واجب نہیں ہے۔

۴۔ علامہ طحاوی نے پانی سے استنجا کرنے کا استدلال اس آیت سے کیا ہے۔ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ۔ یہ آیت جب نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے گروہ انصار! اللہ تعالیٰ نے طہارۃ کے بارے میں تمہاری تعریف کی ہے تو بتاؤ تمہاری طہارت کیا ہے۔ عرض کی حضور! ہم نماز کے لیے وضو کرتے ہیں اور جنابت سے غسل کرتے ہیں اور پانی سے استنجا کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ تو وہی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے اسی فعل کو پسند فرمایا ہے) لہٰذا اس کا التزام کرو۔ (ابن ماجہ)

حسن بصری و ابن ابی لیلیٰ و حسن بن صالح اور ابوعلی جبائی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم یہ کہتے ہیں۔ نماز کے لیے صرف ڈھیلا لینا کافی نہیں اور پانی سے استنجا کرنا واجب ہے اور ان کی دلیل یہ آیت ہے۔ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا الخ لیکن ظاہر ہے کہ اس آیت سے استدلال صحیح نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق وضو سے ہے استنجا سے نہیں ہے۔ اسی طرح یہ لوگ احادیث ذیل سے بھی استدلال کرتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے:۔

۱۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی سے استنجا فرمایا۔

۲۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عورتوں سے کہا کہ اپنے شوہروں کو پانی سے استنجا کرنے کی تاکید کرو۔

۳۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ پاخانہ کے بعد پانی لیتے ہوئے دیکھا۔

۴۔ اہل قبا سے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تم اس کو لازم کر لو اور اہل قبا پانی سے استنجا کرتے تھے۔

لیکن ان احادیث سے پانی سے استنجا کرنے کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ پانی پر اکتفا کرنا بہتر ہے ——— رہا یہ کہ اہل قبا کو حضور علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ پانی سے استنجا کرنے کو لازم کر لو۔ اس سے بھی وجوب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اہل قبا کی تخصیص سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بہت لوگ پانی سے استنجا نہیں کرتے تھے۔ تو اگر پانی سے دھونا واجب ہوتا تو تمام صحابہ ایسا کرتے اور اگر پانی سے استنجا کرنے کا وجوب شارع علیہ السلام کو منظور ہوتا، تو آپ

تمام لوگوں کو اس کا حکم دیتے۔ صرف اہلِ قبا کو مخصوص نہ فرماتے اور اہلِ قبا کو مخصوص فرمانے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کے اس فعل کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا تو حضور علیہ السلام نے ان کو اس فعل پر قائم رہنے کی تلقین فرمادی۔

مسائل حدیث | حدیث زیر بحث سے مسائل ذیل معلوم ہوئے۔ ۱۔ بزرگوں اور اہلِ فضل کی خدمت کرنا اور اس سے برکت حاصل کرنا اور ان کی حاجت پورا کرنے کی تلاش میں رہنا۔ خصوصاً امورِ طہارت میں جائز ہے۔ ۲۔ بزرگوں کا اپنے متبعین سے جو آزاد ہو خدمت لینا جائز ہے ۳۔ قضاءِ حاجت کے لیے پوشیدہ مقام پر جانا ۴۔ اسبابِ وضو میں کسی سے مدد لینا جائز ہے ۵۔ پانی سے استنجاء کرنا جائز ہے۔

بَابُ مَنْ حُمِلَ مَعَهُ الْمَاءُ لِطُهُوْرِهِ

باب طہارت کے لیے پانی کا ساتھ لے جانا

وَقَالَ اَبُوالدَّرْدَاءِ لَيْسَ فِيْكُمْ صَاحِبُ النَّعْلَيْنِ وَالطُّهُوْرِ وَالْوِسَادِ

اور ابودرداء نے (عراق والوں سے) کہا کیا تم میں وہ شخص نہیں ہے جو (حضور علیہ السلام کی) نعلین وضو کا پانی اور تکیہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

۱۔ اس تعلیق کو امام نے مناقب میں موصولاً ذکر کیا ہے۔ علقمہ بن قیس کہتے ہیں کہ شام کی مسجد میں میری ملاقات حضرت ابودرداء سے ہوئی۔ میں نے کہا میری خواہش ہے کہ آپ میرے سوالات کا جواب دیں۔ انھوں نے پوچھا کہ تم کون ہو۔ میں نے کہا اہلِ کوفہ سے ہوں۔ اس پر حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ کیا تم میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نعلین بردار نہیں ہے۔ (یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ تم میں موجود نہیں ہیں؟) جن کو حضور علیہ السلام کی نعلین برداری، وضو کا پانی اور تکیہ اُٹھانے کا شرف حاصل تھا۔

۲۔ امام بخاری نے اس تعلیق کو حدیثِ انس کے ساتھ اپنے قائم کردہ تائید و توثیق کے لیے ذکر کیا ہے کہ حضور علیہ السلام اپنے اصحاب سے اس نوع کی خدمت لیا کرتے تھے۔

۱۵۱۔ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسًا يَقُوْلُ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا خَرَجَ لِحَاجَتِهٖ تَبِعْتُهٗ اَنَا وَغُلَامٌ مِّنَّا مَعَنَا اِدَاوَةٌ مِّنْ مَّاءٍ (بخاری)

عطاء ابن میمونہ کہتے ہیں میں نے انس سے سُنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب حاجت کے لیے (جنگل) کو تشریف لے جاتے تو میں اور ایک لڑکا دونوں مل کر ایک ڈول پانی لے کر آپ کے پیچھے جاتے۔

اس حدیث کی باب سے مناسبت بالکل ظاہر ہے یعنی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ استنجاء کے لیے اپنے ساتھ پانی لے جانا جائز ہے اور اگر کوئی خادم لے جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

بَابُ حَمْلِ الْعَنَزَةِ مَعَ الْمَاءِ فِي الْاِسْتِنْجَاءِ

باب استنجاء کے لیے پانی کے ساتھ نیزہ لے جانے کے بیان میں

اس باب میں امام بخاری نے مذکورہ بالا حدیث ہی ذکر کی ہے۔ البتہ اس میں عنزہ کا لفظ زیادہ ہے۔ حدیث زیر باب کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب قضاء حاجت کے لیے تشریف لے جاتے تو میں اور ایک لڑکا۔

۱۵۲- يَقُولُ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْخُلُ الْخَلَاءَ فَاَحْمِلُ اَنَا وَغُلَامٌ اِدَاوَةً مِّنْ مَّاءٍ وَّعَنَزَةً يَسْتَنْجِي بِالْمَاءِ

پانی کا برتن اور نیزہ لے جاتے اور حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پانی سے استنجا فرماتے۔

فوائد و مسائل اس حدیث میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پانی کے ساتھ نیزہ بھی لے جاتے تھے تو اس کی متعدد وجہیں ہوسکتی ہیں۔ یہ کہ آپ کی ضرورت ہو تو نیزہ کو زمین میں گاڑ کر اس پر کپڑا ڈال دیں تاکہ پردہ ہو جائے یا زمین اگر سخت ہو تو اس کو کھود لیں تاکہ نرم ہو جائے اور پیشاب کی چھینٹیں نہ اُڑیں۔ یا یہ کہ نیزہ کو بازو کی طرف گاڑ دیا جائے تاکہ راہ گزر یہ سمجھ لے کہ یہاں کوئی قضاء حاجت کر رہا ہے۔ یا یہ موذی جانوروں سے حفاظت کے لیے اس کا ساتھ رکھا گیا کیونکہ حضور علیہ السلام آبادی سے دُور ویران جگہ میں قضاء حاجت کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ استنجے کے بعد آپ وضوء کر کے نماز پڑھتے ہوں، اور برچھی کو زمین میں گاڑ دیتے ہوں تاکہ سترہ کا کام دے۔ چنانچہ سترہ کے باب میں امام نے اسی مسئلہ کے بیان کرنے کے لیے حدیث زیر بحث کو ذکر کیا ہے ۲۔ عنزہ، اس لکڑی کو کہتے ہیں جس میں شام لگی ہو۔

بَابُ النَّهْيِ عَنِ الْاِسْتِنْجَاءِ بِالْيَمِيْنِ

باب داہنے ہاتھ سے استنجا کرنے کی ممانعت میں

۱۵۳- قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا شَرِبَ اَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَفَّسْ فِي الْاِنَاءِ وَاِذَا اَتَى الْخَلَاءَ فَلَا يَمَسَّ ذَكَرَهُ بِيَمِيْنِهِ وَلَا يَتَمَسَّحْ بِيَمِيْنِهِ (بخاری)

ابو قتادہ انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی چیز پیئے تو برتن میں سانس نہ لے اور جب کوئی پاخانہ میں آئے تو اپنی شرمگاہ کو سیدھا ہاتھ نہ لگائے اور نہ سیدھے ہاتھ سے استنجا کرے۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے مکرر طہارۃ میں اور کتاب الاشربہ میں ذکر کیا۔ ابو داؤد، نسائی و ابن ماجہ و ترمذی نے کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا۔

حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔ جب کوئی پینے کی چیز پی جائے تو برتن میں سانس نہ لیا جائے۔ حضور اکرم کے اس ارشاد کے فوائد بالکل ظاہر ہیں۔ اسی طرح داہنے ہاتھ سے مس ذکر نہ کیا جائے اور نہ داہنے ہاتھ سے استنجا کیا جائے۔ یہ نہی تنزیہی ہے۔ اسی پر جمہور کا اتفاق ہے۔ فقہاء کرام نے اسی حدیث سے یہ مسئلہ نکالا کہ داہنے ہاتھ سے استنجاء کرنا یا اس کو چھونا یا ڈھیلے کو داہنے ہاتھ سے گزارنا مکروہ تنزیہی ہے کیونکہ داہنا ہاتھ عزت و بزرگی رکھتا ہے۔

بَابُ لَا يُمْسِكُ ذَكَرَهٗ بِيَمِيْنِهٖ إِذَا بَالَ

باب پیشاب کرتے وقت شرمگاہ کو داہنے ہاتھ سے تھامنا

۱۵۴- عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا بَالَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَأْخُذَنَّ ذَكَرَهٗ بِيَمِيْنِهٖ وَلَا يَسْتَنْجِيْ بِيَمِيْنِهٖ وَلَا يَتَنَفَّسْ فِي الْإِنَاءِ (بخاری)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی پیشاب کرے تو اپنی شرمگاہ کو سیدھے ہاتھ سے نہ تھامے اور سیدھے ہاتھ سے استنجا نہ کرے اور نہ (برتن) میں سانس لے۔

فوائد و مسائل سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترجمہ باب پہلی حدیث سے بھی معلوم ہو گیا تھا۔ پھر تکرار سے فائدہ۔ جواب یہ ہے کہ امام کی عادت یہ ہے کہ وہ اس حدیث کو جس سے متعدد مسائل نکلتے ہوں متعدد بابوں میں لاتے ہیں حتیٰ کہ حدیث کے کسی ایک ٹکڑے سے بھی کوئی نئی بات پیدا ہوتی ہو تو عنوان قائم کر دیتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ اس میں اسناد و الفاظ متن کا فرق ہے۔ لہٰذا تکرار بے فائدہ نہ ہوئی۔ علامہ قسطلانی نے فرمایا۔ پہلے باب میں امام نے داہنے ہاتھ سے استنجا کرنے کی ممانعت ثابت کی تھی اور اب اس باب میں داہنے ہاتھ سے شرمگاہ کو چھونے کی ممانعت بیان کی ہے۔

بَابُ الْإِسْتِنْجَاءِ بِالْحِجَارَةِ

باب ڈھیلوں سے استنجا کرنے کے بیان میں

اس باب کو قائم کر کے امام نے ان لوگوں کے خیال کی تردید کی ہے جو پانی سے استنجا کرنے کو ضروری کہتے ہیں۔

۱۵۵- عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ اتَّبَعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَخَرَجَ لِحَاجَتِهٖ وَكَانَ لَا يَلْتَفِتُ فَدَنَوْتُ مِنْهُ فَقَالَ ابْغِنِيْ أَحْجَارًا أَسْتَنْفِضْ بِهَا أَوْ نَحْوَهٗ وَلَا تَأْتِنِيْ بِعَظْمٍ وَّلَا رَوْثٍ فَأَتَيْتُهٗ بِأَحْجَارٍ بِطَرَفِ ثِيَابِيْ فَوَضَعْتُهَا إِلٰى جَنْبِهٖ وَأَعْرَضْتُ عَنْهُ فَلَمَّا قَضٰى أَتْبَعَهٗ بِهِنَّ (بخاری شریف)

حضرت ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلا۔ آپ قضاء حاجت کے لیے نکلے تھے۔ اور (چلتے میں) پیچھے نہیں دیکھتے تھے۔ میں آپ کے قریب ہوا۔ آپ نے فرمایا۔ میرے لیے کچھ پتھر (ڈھیلے) ڈھونڈ کر لاؤ۔ تاکہ میں اس سے استنجا کروں، یا ایسا ہی آپ نے کوئی اور جملہ کہا اور فرمایا ہڈی مینگنی نہ لانا۔ میں اپنے دامن میں کئی پتھر لے آیا اور آپ کے پاس رکھ دیے اور ایک طرف ہٹ گیا۔ آپ جب قضاء حاجت سے فارغ ہوتے تو آپ نے ان سے پونچھا (استنجا کیا)

فوائد و مسائل ۱- اس باب کے قائم کرنے سے امام کا مقصد ان لوگوں کے خیال کی تردید کرنا تھا۔ جو پانی سے استنجا کرنے کو ضروری قرار دیتے تھے۔ چنانچہ حدیث زیر عنوان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ڈھیلوں سے استنجا کرنا جائز ہے اور پانی سے استنجا کرنا ضروری و لازمی نہیں ہے البتہ ڈھیلے سے طہارت اس وقت ہو گی جبکہ

نجاست سے مخرج کے آس پاس کی جگہ ایک درہم سے زیادہ آلودہ نہ ہو۔

۲۔اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوا کہ کسی بزرگ یا امام کا اپنے ساتھی یا ماتحت یا دوست یا نیازمند سے خدمت لینا جائز ہے۔ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے لیے سامانِ استنجاء مہیا کر دینا جائز ہے۔

۳۔گوبر ہڈی سے استنجاء کرنا مکروہ ہے کیونکہ ہڈی جنوں کی خوراک ہے۔اللہ تعالیٰ اس پر ان کے لیے گوشت پیدا فرما دیتا ہے اور گوبر جنوں کے چارپاؤں کی خوراک ہے۔پتھر سے استنجاء کرنا متعین نہیں ہے۔ہر وہ چیز جو پاک ہو، جامد ہو اور نجاست زائل کر سکے وہ استنجاء کرنے کے کام آسکتی ہے۔جیسے پتھر، کنکر، مٹی کا ڈھیلا کپڑا وغیرہ ان سے بلا کراہت استنجاء کرنا جائز ہے۔اسی طرح دیوار سے بھی استنجاء سکھایا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ غیر کی ملک نہ ہو۔اگر دوسرے کی ہے اور اس سے استنجاء سکھایا تو اگرچہ طہارت ہو جائے گی مگر ایسا کرنا مکروہ ہے۔البتہ جو مکان کرایہ پر لے رکھا ہے اس کی دیوار سے استنجاء سکھانا جائز ہے۔پرائی دیوار سے ڈھیلے توڑ کر استنجاء کر لیا یا کاغذ سے کیا تو طہارت تو ہو جائے گی مگر یہ فعل علی الترتیب ناجائز اور ممنوع ہوگا۔سونا، چاندی، ہڈی، گوبر، پکی اینٹ، ٹھیکری اور شیشہ، کوئلے اور جانور کے چارے وغیرہ سے استنجاء کرنا بھی مکروہ ہے۔اگر کسی نے ان اشیاء سے استنجاء کر لیا تو ہو جائے گا (عام کتب فقہیہ حنفیہ)

۴۔حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔استنجاء کے لیے پتھر تلاش کر لاؤ۔پتھر کے لفظ سے بعض حنابلہ و ظاہریہ نے یہ استدلال کیا کہ استنجاء صرف پتھر ہی سے ہو سکتا ہے لیکن ان کا یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ حضور علیہ السلام نے ابوہریرہ کو یہ حکم دیا کہ میرے لیے پتھر لاؤ۔استنفض بھا تاکہ میں اس سے صفائی حاصل کروں۔استنفض کے لفظ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ گمان کر سکتے تھے کہ جو چیز بھی نجاست کے اثر کو زائل کر دے وہ استنجاء کے کام آسکتی ہے۔خواہ وہ پتھر ہو، یا کچھ اور تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ہڈی و گوبر کی نفی کر دی تو ہڈی و گوبر کی نفی سے یہ واضح کہ ان کے سوا سے استنجاء جائز ہے۔پس اگر استنجاء صرف پتھر کے ساتھ خاص مانا جائے تو ہڈی و گوبر کو نہی کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔رہی یہ بات کہ حضور علیہ السلام نے پتھر کی تخصیص کیوں فرمائی؟ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ عامۃ الوجود ہے خصوصاً عرب کی سرزمین میں۔

گوبر و ہڈی سے استنجا کرنے کا بیان

رہی یہ بات کہ اگر کسی نے گوبر یا ہڈی سے استنجاء کر لیا تو طہارت ہو جائے گی یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے اور طول طویل بحثیں ہیں۔مثلاً اگر گوبر و ہڈی سے استنجاء کی ممانعت کی علت یہ ہو کہ یہ جنوں کی خوراک ہے جیسا کہ بخاری کتاب المبعث کی حدیث میں وارد ہوا ہے تو اس سے تمام مطعومات (کھانے کی چیزوں) سے استنجاء کرنے کی ممانعت نکلے گی اور اگر گوبر سے ممانعت کی علت ہو کہ یہ خود نجس ہے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آئے گا کہ حضور علیہ السلام نے گوبر سے یہ کہہ کر استنجاء نہیں فرمایا کہ یہ نجس ہے تو اس سے نجس اشیاء سے استنجاء کی ممانعت ثابت ہوگی اور ہڈی سے ممانعت کی وجہ یہ ہو کہ وہ چکنی ہوتی ہے اور اس سے نجاست کا ازالہ تام نہیں ہوتا۔تو اس سے چکنی چیزوں سے استنجاء کی ممانعت ثابت ہوگی جیسے آئینہ شیشہ وغیرہ تو جب ممانعت کی علت میں علماء کا اختلاف ہوا، تو اس امر میں بھی اختلاف ہو گیا کہ آیا ان اشیاء سے استنجاء

کرنے کی صورت میں طہارت ہوگی یا نہیں۔
امام شافعی وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ گوبر و ہڈی سے استنجا کرنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے کر لیا تو طہارت نہ ہوگی، یہ حضرات ان احادیث سے استدلال کرتے ہیں کہ جن میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ گوبر و ہڈی سے استنجا مت کرو، چنانچہ اس مضمون متعدد حدیثیں، مسلم، دارقطنی، نسائی، حاکم نے روایت کی ہیں اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ فرماتے ہیں کہ گوبر و ہڈی سے استنجا کرنے کی ممانعت کی علت یہ ہے کہ وہ جنوں کی خوراک ہیں۔ کیونکہ جنوں نے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی خوراک کے متعلق سوال کیا تو حضور نے فرمایا کہ ہڈی پر تمہارے لیے اور گوبر پر تمہارے چارپاؤں کے لیے اللہ تعالیٰ خوراک پیدا فرما دے گا اس پر جنوں نے عرض کی۔

اِنَّ بَنِیْ آدَمَ یُنَجِّسُوْنَہٗ عَلَیْنَا فَعِنْدَ ذَالِکَ قَالَ لَا تَسْتَنْجُوا بِرَوْثِ دَابَّۃٍ وَلَا بِعَظْمٍ اِنَّہٗ زَادُ اِخْوَانِکُمْ مِنَ الْجِنِّ (طحاوی)

حضور! بنی آدم ہڈی اور گوبر سے استنجا کر کے اس کو ناپاک کر دیتے ہیں۔ اس پر حضور نے حکم دیا کہ تم لوگ ہڈی لید و گوبر سے استنجا نہ کیا کرو کیونکہ یہ دونوں چیزیں تمہارے بھائی جنات کی خوراک ہیں۔

اسی مضمون کی حدیث بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد و نسائی، دارقطنی، حاکم نے روایت کی ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ گوبر و ہڈی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے استنجا کرنے کی ممانعت اس لیے فرمائی کہ یہ جنوں کی خوراک ہے۔ لہٰذا ان اشیاء سے استنجا کرنے کی کراہت ثابت ہوتی ہے۔ نہ یہ کہ ان اشیاء سے ڈھیلوں کی طرح طہارت بھی نہیں ہوتی۔ رہی وہ حدیثیں جن میں حضور علیہ السلام نے ہڈی و گوبر سے استنجا کی ممانعت فرمائی ہے۔ ہمیں وہ تسلیم ہیں مگر ممانعت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اگر کسی نے ہڈی و گوبر سے استنجا کر لیا تو نجاست کا ازالہ بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ استنجا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز ایسی ہونی چاہیئے کہ نجاست کو زائل کر سکے۔ سوکھا ہوا گوبر، یا سوکھا ہوا اونٹ کا مینگنا یا ہڈی ان میں یہ صلاحیت ہے کہ ان سے نجاست صاف ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے ان سے استنجا کر لیا تو طہارت تو ہو جائے گی۔ اگرچہ اس کا یہ فعل مکروہ ہوگا۔
لہٰذا ممانعت کی حدیثوں سے یہ استدلال کرنا (جیسا کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ نے کہا ہے) کہ ہڈی و گوبر سے نجاست کا ازالہ ہی نہیں ہوگا۔ لہٰذا طہارت نہ ہوگی، صحیح نہیں بلکہ عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ ممانعت اور چیز ہے اور نجاست کا زائل ہو جانا اور بات ہے دیکھیے کاغذ سے استنجا کرنا ممنوع ہے اور اس کی علت کاغذ کا احترام ہے کہ اس پر لکھا جاتا ہے لہٰذا اس کو استنجا کے لیے استعمال نہ کیا جائے لیکن اگر کسی نے بالفرض کاغذ سے استنجا کر لیا اور نجاست کو اس سے پونچھ لیا تو اس کے متعلق یہ تو کہا جائے کہ اس نے برا کیا لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ کاغذ سے نجاست کو پونچھنے سے نجاست زائل نہیں ہوئی لہٰذا طہارت نہ ہوئی۔ فافہم

بَابٌ لَا یُسْتَنْجٰی بِرَوْثٍ

باب گوبر سے استنجا نہ کیا جائے

۵۶: يَقُولُ أَتَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْغَائِطَ فَأَمَرَنِي أَنْ آتِيَهُ بِثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ فَوَجَدْتُ حَجَرَيْنِ وَالْتَمَسْتُ الثَّالِثَ فَلَمْ أَجِدْ فَأَخَذْتُ رَوْثَةً فَأَتَيْتُهُ بِهَا فَأَخَذَ الْحَجَرَيْنِ وَأَلْقَى الرَّوْثَةَ وَقَالَ هٰذَا رِكْسٌ
(بخاری)

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قضاء حاجت کے لیے جنگل میں گئے مجھے تین پتھر لانے کا حکم دیا۔ میں نے دو پتھر تو تلاش کر لیے۔ تیسرا ڈھونڈا نہ ملا تو میں نے گوبر کا ٹکڑا اٹھا لیا اور آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے دونوں پتھروں کو تو لے لیا اور گوبر پھینک دیا اور فرمایا یہ پلید ہے۔

فوائد و مسائل
۱۔ یہ حدیث افرادِ بخاری سے ہے۔ امام مسلم علیہ الرحمۃ نے اس حدیث کو نہیں لیا۔ نسائی و ابن ماجہ نے کتاب الطہارت میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ ۲۔ حدیثِ ہذا مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے۔
۱۔ گوبر سے استنجا نہ کیا جائے۔ چنانچہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے گوبر کے متعلق فرمایا کہ یہ رِکس ہے یعنی نجس ہے۔ رکس کے معنی نجس کے لینا اولیٰ ہے کیونکہ روایت ابن ماجہ و ابن خزیمہ میں رکس کی جگہ رجس کا لفظ آیا ہے۔ ۳۔ اس حدیث سے یہ واضح ہوا کہ استنجا کے لیے تین ڈھیلوں کا ہونا ضروری نہیں ہے یعنی ڈھیلوں کی کوئی تعدادِ معین سنّت نہیں بلکہ جتنے سے صفائی ہو جائے کافی ہے تو اگر ایک سے صفائی ہو گئی سنّت ادا ہو گئی اور اگر تین ڈھیلے لیے اور صفائی نہ ہوئی، سنّت ادا نہ ہوئی۔ البتہ یہ مستحب ہے کہ ڈھیلے طاق ہوں اور کم سے کم تین ہوں تو اگر ایک یا دو سے صفائی ہو گئی تو تین کی گنتی پوری کر لینا مستحب ہے۔ اسی طرح اگر چار سے صفائی ہو گئی تو پانچواں اور لے لینا کہ طاق ہو جائیں مستحب ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا یہی مسلک ہے اور اس کی دلیل اسی حدیث میں موجود ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو تین ڈھیلے لانے کا حکم دیا۔ ان کو دو ملے۔ تیسرے کی جگہ گوبر لے آئے۔ آپ نے گوبر کا استعمال نہ کیا اور دو عدد ڈھیلوں سے استنجا فرمایا۔ جس سے واضح ہوا کہ دو ڈھیلوں پر اکتفا کرنا بھی جائز ہے کیونکہ اگر تین عدد ڈھیلے سے استنجا کرنا ضروری ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ضرور تیسرا ڈھیلا تلاش کرنے کا حکم صادر فرماتے مگر آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ دو ہی سے استنجا فرما لیا۔

سوالات
علامہ طحاوی نے اس موقع پر یہ اعتراض کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرا ڈھیلا منگانے کا حکم اس لیے نہ دیا کہ جس جگہ آپ قضاء حاجت کے لیے بیٹھے ہوں گے وہاں موجود ہو گا مگر ایسا کہنا متعدد وجوہ سے باطل ہے کیونکہ اگر وہاں ڈھیلے پہلے ہی سے موجود ہوتے تو حضور علیہ السلام حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ڈھیلے لانے کا حکم ہی کیوں دیتے؟ اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام ایسی جگہ قضاء حاجت کے لیے تشریف لے گئے تھے جہاں پہلے سے ڈھیلے موجود نہ تھے اور اگر یہ کہا جائے کہ اس جگہ تین عدد موجود نہ تھے۔ ایک موجود تھا تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ اگر ایک اس جگہ پہلے ہی سے موجود تھا تو پھر آپ کو تین کا عدد پورا کرنے کے لیے دو عدد ڈھیلے لانے کا حکم دینا چاہیے تھا لیکن آپ نے دو کی بجائے تین کا حکم دیا جو اس امر کی دلیل ہے کہ

اس جگہ پہلے سے بھی ڈھیلہ موجود نہ تھا۔ قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں امام طحاوی کے استدلال کی تردید میں لکھا ہے۔ مسند احمد کی حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ دو ڈھیلے اور ایک گوبر کا ٹکڑا لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں پہنچے تو آپ نے گوبر پھینک دیا اور فرمایا کہ اس کی جگہ ایک، اور پتھر لے آؤ۔ اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں۔ لہٰذا اس سے ثابت ہوا۔ استنجاء کے لیے تین عدد ڈھیلوں کا لینا واجب ہے۔ اگر تین عدد ڈھیلے لینا واجب نہ ہوتا تو حضور سید عالم تیسرا ڈھیلا منگانے کا حکم نہ فرماتے۔ اس کا جواب علامہ عینی نے یہ دیا ہے کہ اس حدیث میں ابی اسحٰق علقمہ سے روایت کرتے ہیں اور امام طحاوی کے نزدیک اسحٰق کا علقمہ سے سماع ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ حدیث منقطع ہے اور منقطع حدیث محدثین کے ہاں قابل عمل نہیں ہے۔ اسی طرح ابو شیبہ واسطی ضعیف ہیں۔ لہٰذا ان کی متابعت بھی معتبر نہیں (نیل الاوطار جلد ۱ صفحہ ۹۶ عینی جلد ۱ صفحہ ۷۴۳)۔ پس ثابت ہوا کہ استنجاء کے لیے تین عدد ڈھیلوں کا ہونا واجب نہیں اور بلا تعین تعداد ڈھیلے سے استنجاء کرنا سنت ہے اور ان کا طاق ہونا مستحب ہے۔

واضح ہو کہ اس باب کی متعدد حدیثوں کا مضمون یہ ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین ڈھیلوں سے استنجا کیا جائے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے حکم دیا کہ ہم تین ڈھیلوں سے کم پر اکتفاء کریں۔ (احمد، ابن ماجہ، ابوداؤد و ترمذی)۔ ان احادیث سے علماء کا ایک طبقہ استدلال کرتا ہے کہ استنجاء کے لیے تین ڈھیلوں کا ہونا واجب ہے اور تین عدد سے کم سے استنجاء جائز نہیں ہے لیکن امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ یہ فرماتے ہیں کہ مقصود استنجا سے صرف یہ ہے کہ نجاست زائل ہو جائے اور وہ جس قدر ڈھیلوں سے ہو جائے درست ہے۔ خواہ تین سے کم ہوں یا زیادہ جفت ہوں یا طاق اور وہ حدیثیں جن میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تین عدد ڈھیلوں سے استنجاء کیا کرو تو ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تین کا عدد ڈھیلوں کے لیے متعین ہے اور تین سے کم سے نجاست کا ازالہ ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ اس پر اجماع ہے کہ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ تین عدد ڈھیلوں سے صفائی نہیں ہوئی ہے تو اس کو اسی قدر مزید ڈھیلے لینا واجب ہے۔ جن سے صفائی ہو جائے خواہ وہ تین سے کتنے ہی ہو جائیں۔ اسی طرح اگر ایک پتھر کے متعدد طرف ہیں۔ مثلاً تین اطراف ہیں تو ان تینوں اطراف سے استنجاء کیا تو جائز ہے۔ جس سے واضح ہوا کہ ڈھیلوں کی کوئی تعداد معین سنت نہیں ہے۔ چنانچہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس مسلک کی تائید و توثیق حدیث ذیل سے بھی ہوتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوتِرْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ اَحْسَنَ وَمَنْ لَا فَلَا حَرَجَ
(احمد۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

جو شخص ڈھیلوں سے استنجاء کرے تو ڈھیلے وتر (طاق) لے جس نے ایسا کیا اچھا کیا جس نے ایسا نہ کیا تو کوئی حرج نہیں۔

اس مضمون کی متعدد حدیثیں ہیں۔ جن سے واضح ہوا کہ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے طاق ڈھیلے لینے کا حکم بطور استحباب کے دیا ہے۔ بطور فرضیت کے نہیں۔ اگر بطور فرضیت کے طاق ڈھیلے کا حکم فرمایا ہوتا تو پھر وَمَنْ لَا فَلَا حَرَجَ (کہ جس نے طاق ڈھیلے نہیں لیے تو بھی کوئی حرج نہیں) نہ فرماتے۔ نیز اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ

جب حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) دو ڈھیلے اور ایک گوبر کا ٹکڑا لے کر آئے تو آپ نے گوبر کو پھینک دیا اور دونوں ڈھیلوں سے استنجا فرمالیا۔ حضور علیہ السلام کے اس فعل سے بھی واضح ہوا کہ ڈھیلوں میں تین عدد متعین نہیں ہے بلکہ جتنوں سے نجاست زائل ہوجائے۔ اتنے ہی ڈھیلے لینا ضروری ہیں۔ خواہ دو ہوں یا تین۔ البتہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ طاق ڈھیلے لینا مستحب ہے۔

نیل الاوطار میں قاضی شوکانی نے امام اعظم علیہ الرحمۃ کی رائے پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ وہ احادیث جن میں حضور علیہ السلام نے تین عدد ڈھیلے لینے کا حکم کیا ہے قولی ہیں اور حدیث عبداللہ بن مسعود جس میں یہ ہے کہ آپ نے دو عدد ڈھیلوں سے استنجا فرمایا فعلی ہے اور جب قولی اور فعلی حدیثوں میں تعارض ہو تو قولی حدیث کو ترجیح دی جاتی ہے۔ (نیل الاوطار ج ۱ ص ۹۶)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ امام اعظم علیہ الرحمۃ کی اصل دلیل فعلی نہیں بلکہ قولی ہی ہے یعنی وہ حدیث ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاق ڈھیلے لیا کرو۔ جس نے طاق ڈھیلا لیا اچھا کیا اور جس نے نہیں لیا تو اس پر کوئی حرج نہیں۔ رہی زیر بحث فعلی حدیث تو یہ امام نے بطور تائید کے پیش کی ہے نہ کہ بطور اصل دلیل کے۔ اس کے علاوہ یہ کلیہ قاعدہ نہیں ہے کہ فعلی اور قولی میں تعارض ہو تو ضرور ہر جگہ پر قولی کو ترجیح دی جائے گی۔ جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔

بَابُ الْوُضُوْءِ مَرَّةً مَرَّةً

باب وضوء میں ایک ایک بار اعضاء کو دھونا

۱۵۷۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ تَوَضَّأَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّةً مَرَّةً

حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعضاءِ وضوء کو ایک ایک بار دھویا۔

بَابُ الْوُضُوْءِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ

باب وضوء میں دو دو بار اعضاء کو دھونا

۱۵۸۔ اَلنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ

عبداللہ بن زید کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعضاءِ وضوء کو دو دو بار دھویا۔

بَابُ الْوُضُوْءِ ثَلٰثًا ثَلٰثًا

باب وضوء میں اعضاء وضو کو تین تین بار دھونا

۱۵۹۔ اَنَّهُ رَاَى عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ دَعَا بِاِنَاءٍ فَاَفْرَغَ عَلٰى كَفَّيْهِ ثَلٰثَ مِرَارٍ فَغَسَلَهُمَا ثُمَّ اَدْخَلَ يَمِيْنَهُ فِي الْاِنَاءِ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلٰثًا وَّيَدَيْهِ اِلَى الْمِرْفَقَيْنِ ثَلٰثَ مِرَارٍ

(حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے غلام حمران نے خبر دی) کہ انھوں نے دیکھا کہ حضرت عثمان نے پانی کا برتن منگایا۔ (پہلے) اپنے دونوں پہونچوں پر تین بار ڈالا اور ان کو دھویا پھر اپنا داہنا ہاتھ برتن میں ڈالا۔ پھر کلی کی اور ناک سنکی پھر اپنا منہ تین بار دھویا اور دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت تین بار

ثُمَّ مَسَحَ بِرَاسِهٖ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ ثَلٰثَ مِرَارٍ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِيْ هٰذَا ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيْهِمَا نَفْسَهٗ غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ

دھوئے پھر سر پر مسح کیا (ایک بار) پھر دونوں پاؤں ٹخنوں تک تین بار دھوئے۔ پھر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی میرے اس وضوء کی طرح وضوء کرے اور دو رکعتیں (تحیۃ الوضوء) پڑھے اور اس عرصہ میں دنیا کا خیال اپنے دل میں نہ لائے تو اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

قَالَ ابْنُ شِهَابٍ وَّلٰكِنْ عُرْوَةَ يُحَدِّثُ عَنْ حُمْرَانَ فَلَمَّا تَوَضَّأَ عُثْمَانُ قَالَ لَاُحَدِّثَنَّكُمْ حَدِيْثًا لَوْلَا اٰيَةٌ مَّا حَدَّثْتُكُمُوْهُ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَتَوَضَّأُ رَجُلٌ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَهٗ وَ يُصَلِّي الصَّلٰوةَ اِلَّا غُفِرَ لَهٗ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الصَّلٰوةِ حَتّٰى يُصَلِّيَهَا ثُمَّ قَالَ عُرْوَةُ الْاٰيَةَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا

ابن شہاب نے کہا لیکن عروہ حمران سے اس حدیث کی یوں روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وضو کر چکے تو کہنے لگے میں تم کو ایک حدیث سناتا ہوں۔ اگر قرآن حکیم کی ایک آیت نہ ہوتی تو میں تم کو یہ حدیث نہ سناتا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا جو شخص اچھی طرح وضو کرے اور اس کے بعد نماز پڑھے تو جتنے گناہ اس نماز سے دوسری نماز کے پڑھنے تک ہوں گے، وہ بخش دیئے جائیں گے (بخاری)

توضیح حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس آیت کی طرف اشارہ کیا وہ سورۃ بقر کے دوسرے پارہ کی آیت ہے جو علماء یہود کے حق میں نازل ہوئی تھی۔ یہ لوگ حضور علیہ السلام سے متعلق توریت میں جو بشارتیں تھیں ان کو چھپاتے تھے اور رجم اور دوسرے احکام پر بھی پردہ ڈالتے تھے۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور فرمایا گیا اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا الخ جو لوگ اللہ کی اُتاری ہوئی نشانیوں اور ہدایت کی باتوں کو چھپاتے ہیں۔ ان پر اللہ لعنت فرماتا ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت کی طرف اشارہ کر کے یہ بتایا کہ دین سے متعلق امور کی تبلیغ و اشاعت ضروری ہے اور اس کا کتمان حرام ہے۔ اس لیے میں حدیثِ نبوی کو بیان کرنا اپنا فرض جانتا ہوں اس کے بعد آپ نے حدیث بیان کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جس نے اچھی وضوء کیا یعنی آداب و سنن کی رعایت کے ساتھ وضوء کیا۔ پھر نماز پڑھی تو اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ واضح ہو کہ حدیث کے اس جملے اِلَّا غُفِرَ لَهٗ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الصَّلٰوةِ حَتّٰى يُصَلِّيَهَا کا عام شراح حدیث نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ جتنے گناہ اس نماز سے دوسری نماز کے پڑھنے تک ہوں گے بخش دیے جائیں گے لیکن علامہ عینی نے حَتّٰى يُصَلِّيَهَا کا ترجمہ حتّٰى يَفْرُغَ مِنْهَا کیا ہے۔

فوائد و مسائل امام نے تین عنوان قائم کئے ہیں اور اس کے ضمن میں عنوان کے مناسب حدیثیں لکھی ہیں۔ تینوں سے بڑی کے مسائل و احکام بیان کیے جاتے ہیں۔ حدیث اول کو ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ و نسائی نے روایت

کیا ہے۔ مسلم نے نہیں۔ اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وضوء میں اعضاء وضوء کو ایک ایک بار دھونا فرض ہے یعنی اگر ایک بار بھی نہ دھویا تو وضوء ہوگا ہی نہیں۔ ان سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے جو وضوء میں ہر عضو کو تین تین بار دھونا فرض قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وضوء میں داڑھی کو خلال کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ ایک بار چہرہ دھونے کے بعد ہاتھوں میں اتنا پانی نہیں رہتا جس سے خلال کیا جا سکے۔ حدیث دوم افراد بخاری سے ہے۔ ابو داؤد و ترمذی نے اسی مضمون کی حدیث حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔ لیکن ترمذی نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے اور حدیث سوم کو بخاری نے مکرر کتاب الطہارت میں اور کتاب الصوم میں ذکر کیا ہے اور مسلم، ابوداؤد و نسائی نے بھی اس حدیث کو کتاب الطہارت میں ذکر کیا ہے۔

مسائل احادیث واضح ہو کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ وضوء میں اعضاء وضوء کو حضور نے تین تین بار دھویا اور کبھی دو دو بار اور کبھی ایک ایک بار۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے بعض اعضاء وضوء کو تین تین بار دھویا۔ بعض کو دو دو بار اور بعض کو صرف ایک ایک بار دھویا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام اعضاء وضوء کو صرف ایک ایک بار دھونا فرض ہے اور اس سے زائد یعنی تین تین بار دھونا سُنّت ہے۔

۱۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وضوء کے لیے پانی منگایا۔ اس سے ثابت ہے کہ وضوء کے پانی لانے کے لیے دوسرے سے مدد لینا جائز ہے ۳۔ پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ جس سے ثابت ہوا کہ برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہاتھوں کو تین بار دھو لینا مستحب ہے ۴۔ پھر آپ نے اپنا داہنا ہاتھ برتن میں ڈالا۔ اس سے ثابت ہوا کہ داہنے ہاتھ سے چلو لینا چاہیے ۵۔ پھر آپ نے کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا۔ اگرچہ اس حدیث میں تین بار کلی کرنے کا ذکر نہیں لیکن روایت شعیب جو آگے آرہی ہے۔ اس میں تین بار کی تصریح ہے۔ اسی طرح حدیث ابو داؤد میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار کلی کی اور تین بار ناک میں پانی ڈالا۔

فَاَخَذَ لِكُلِّ وَاحِدٍ مَاءً جَدِيْدًا (ابوداؤد) | اور ہر بار نیا پانی کا چلو لیا

وضو میں کلی کرنا اور ناک میں پانی لینا سُنّت ہے۔ تین چلو پانی سے تین کلیاں کرنا چاہیے۔ اس طرح کہ ہر بار منہ کے ہر پُرزے پر پانی بہہ جائے اور اگر روزہ دار نہ ہو تو غرغرہ کرے، کلی پہلے کرے اور اس کے بعد ناک میں تین چلو سے تین بار پانی ڈالے اس طرح کہ جہاں تک نرم گوشت ہے اور جہاں پانی پہنچ کر لگتا ہے ہر بار اس پر پانی بہہ جائے۔ یہ دونوں کام سیدھے ہاتھ سے کیے جائیں اور ناک بائیں ہاتھ سے صاف کی جائے۔

اختلاف اگر کسی نے بھول کر کلی نہیں کی یا ناک میں پانی نہیں لیا تو اس کا وضو ہو جائے گا یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام حسن عطاء، زہری، قتادہ ربیعہ یحیٰے انصاری و مالک و اوزاعی اور امام شافعی فرماتے ہیں دوبارہ وضو کی ضرورت نہیں اور عطاء و زہری (فی اول قولیہ) و ابن ابی لیلے و حماد و اسحاق یہ فرماتے ہیں کہ جس نے کلی نہیں کی وہ دوبارہ وضوء کرے (وبہ قال ابو عبید و ابو ثور)۔ امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ وضو میں کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا سنّت ہے فرض نہیں تو اگر کسی نے کلی نہ کی اور ناک میں پانی نہ لیا تو اس کا وضو ہو جائے گا۔

۶۔ پھر آپ نے منہ کو تین بار دھویا۔ منہ دھونا فرض ہے اور اس کی فرضیت قرآن کریم سے ثابت ہے۔ پانی کے تین وصف ہوتے ہیں۔ رنگ، بو، مزا چلو میں پانی لینے سے اس کی رنگت اور ناک میں پانی لینے سے اس کی بو اور کلی کرنے سے اس کا مزا معلوم ہو جاتا ہے۔ اس لیے منہ دھونے سے پہلے کلی کرنے اور ناک میں پانی لینے کی ہدایت دی گئی۔

۷۔ اس کے بعد آپ نے دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت تین بار دھویا۔ ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھونا بھی فرض ہے اور قرآنِ حکیم سے ثابت ہے۔

۸۔ پھر آپ نے سر کا مسح کیا۔ یہ بھی فرض ہے۔ مقدار مسح میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں واجب مسح میں صرف اتنا ہے کہ اس پر اسمِ مسح کا اطلاق آجائے۔ پس اگر کسی نے ایک بال یا تین بال کا مسح کر لیا ہوگا۔ امام مالک و احمد کا مسلک یہ ہے کہ سارے سر کا مسح کرنا ضروری ہے۔ جب تک سارے سر کا مسح نہ ہوگا وضو درست نہ ہوگا۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ یہ فرماتے ہیں کہ چوتھائی سر کا مسح کرنا فرض ہے کیونکہ قرآن کریم میں یہ فرمایا گیا کہ سر کا مسح کرو لیکن قرآن میں مقدارِ مسح نہیں بتائی۔ حضور علیہ السلام چونکہ قرآنی اصولوں کے شارح ہیں۔ آپ نے اپنے عمل سے یہ بتایا کہ چوتھائی سر کا مسح کیا جائے جیسا کہ حدیثِ مشہورہ میں وارد ہوا ہے۔ رہی یہ بات کہ سر کا مسح ایک بار کیا جائے یا تین بار؟ امام شافعی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ جیسے اور اعضاء وضوء کو تین تین بار دھونا مستحب ہے۔ اسی طرح تین بار مسح کرنا بھی مستحب ہونا چاہیے۔ حضرت امام شافعی مسلم کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے تین تین بار وضوء کیا۔ وہ فرماتے ہیں تین تین بار وضو کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وضوء کے تمام اعضاء کو تین تین بار دھویا اور سر پر بھی تین بار مسح کیا۔ لیکن ان کا یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ خط کشیدہ جملوں کا مطلب یہ ہے کہ وضوء میں جو اعضاء دھوئے جاتے ہیں ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین تین بار دھویا۔ چنانچہ صحاح کی کسی حدیث میں بھی مسح کا عدد مذکور نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مسح کا مبنیٰ تخفیف ہے تو اگر مسح میں بھی عدد کا اعتبار کیا جائے تو تخفیف باقی نہ رہے گی۔ لہٰذا مسح کو دیگر اعضاء وضو پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ جو اعضا دھوئے جاتے ہیں ان کو تین بار دھونے کی ہدایت تو اس بنا پر ہے کہ اعضاءِ وضو خوب اچھی طرح دھل جائیں بر خلاف مسح کے حضرت امام مالک و احمد و امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ مسح ایک بار ہی کیا جائے۔ کیونکہ وہ احادیث جن میں وضو کا بیان ہے ان کا مضمون یہی ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے تین بار ہاتھ دھوئے، تین بار کلی کی تین بار منہ دھویا اور سر کا مسح کیا۔ لیکن مسح کے ساتھ عدد کا ذکر نہیں ہوتا جو اس امر کی دلیل ہے کہ مسح ایک بار کرنا ہی مسنون ہے۔

۹۔ پھر دونوں پاؤں ٹخنے سمیت تین بار دھوتے۔ وضو میں پاؤں کا دھونا بھی فرض ہے اور قرآنِ حکیم سے ثابت ہے۔

۱۰۔ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ جب وضوء کر چکے تو آپ نے کہا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص وضو کرے میرے وضوء کی طرح اور دو رکعت نفل پڑھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وضوء کے بعد دو رکعت نفل (تحیۃ الوضوء) پڑھنا مسنون ہے اور اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں۔ اوقاتِ مکروہہ کے علاوہ ہر وقت پڑھے جا سکتے ہیں۔ لا یحدث فیھما کا مطلب یہ ہے کہ یہ دو رکعتیں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھی جائیں اور دل دنیاوی خیالات سے خالی ہو۔ البتہ جو وسوسے بے اختیار آجائیں وہ معاف ہیں۔ غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ۔ یعنی جو اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت تحیۃ الوضوء کے پڑھے گا۔ اس کے

اگلے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ اگرچہ الفاظ حدیث سے تمام گناہوں کی مغفرت ثابت ہوتی ہے خواہ وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ لیکن علمائنے دیگر دلائل شرعیہ کے پیش نظر یہ تخصیص کی ہے کہ صغیرہ معاف ہوجائیں گے کبیرہ نہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک دوسری حدیث میں حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ اس بشارت پر مغرور نہ ہوجانا۔ یعنی یہ خیال کرکے کہ گناہ تو معاف ہو ہی جائیں گے۔ گناہ کرنے پر جرأت نہ کرنا۔ کیونکہ گناہ اس نماز سے معاف ہوتے ہیں جو بارگاہِ خداوندی میں شرف قبول پائے۔ اب نامعلوم جو نماز پڑھی گئی ہے وہ مقبول ہے یا نہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ کسی عمل پر بشارت کو سن کر گناہ پر دلیر ہوجانا خود ایک مستقل گناہ ہے۔

بَابُ الْاِسْتِنْثَارِ فِی الْوُضُوْءِ

باب وضوء میں ناک سنکنے کے بیان میں

۱۶۰۔ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ مَنْ تَوَضَّاَ فَلْیَسْتَنْثِرْ وَ مَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْیُوْتِرْ (بخاری شریف)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو وضوء کرے وہ ناک سنکے اور جو استنجا کے لیے ڈھیلے لے تو طاق لے۔

فوائد اس حدیث کو ابن ماجہ و نسائی نے کتاب الطہارت میں ذکر کیا۔ من توضا میں من موصولہ متضمن معنیٰ شرط ہے اور فلیستنثر جواب شرط ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ جو کوئی وضو کرے اور ناک میں پانی لے تو ناک سنکے۔ بخاری باب بدء الخلق کی حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی تم میں سے سو کر اٹھے اور وضو کرے تو تین بار ناک سنکے کیونکہ شیطان رات کو ناک پر شب باشی کرتا ہے۔ ناک سنکنے میں حکمت یہ ہے کہ خوب اچھی طرح صاف ہوجائے تاکہ حروف اچھی طرح ادا ہوسکیں۔ من استجمر، استجمار۔ پاخانہ و پیشاب کے بعد پتھر سے صاف کرنے کو کہتے ہیں۔ معنیٰ یہ ہیں کہ استنجے کے لیے ڈھیلے طاق لیے جائیں۔

مسائل حدیث ۱۔ وضوء میں کلی کرنا اور ناک میں پانی لینا سنت ہے اور ناک سنکنا مستحب ہے اسی پر اجماع ہے۔
۲۔ امام احمد و اسحاق و ابو عبیدہ و ابو ثور و ابن المنذر نے حدیث زیر بحث کے ظاہری الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے وضو میں ناک میں پانی لینے کو واجب قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں فَلْیَسْتَنْثِرْ امر کا صیغہ ہے جو وجوب کو چاہتا ہے لیکن جمہور علماء و امام ابو حنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ یہاں امر ندب کے لیے ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک اعرابی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضوء کرنے کا طریقہ ان لفظوں سے بتایا۔ تَوَضَّاْ كَمَا اَمَرَكَ اللّٰهُ (ترمذی و حاکم) تو اس طرح وضوء کر جس طرح قرآن حکیم میں وضوء کا بیان آیا ہے۔ امام فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں وضوء کے متعلق ناک میں پانی لینے اور کلی کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ صرف ہاتھ، پاؤں، منہ دھونے اور سر کا مسح کرنے کا ذکر ہے۔ لہٰذا کلی کرنا، ناک میں پانی لینے اور سنکنے کی فرضیت ثابت نہیں ہوئی۔ لہٰذا حدیث میں ناک میں پانی لینے کو مستحب قرار دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح استنجاء کے لیے طاق ڈھیلے لینے کی ہدایت بھی ندبی ہے۔

بَابُ الْاِسْتِجْمَارِ وِتْرًا

باب استنجار میں طاق ڈھیلے کے بیان میں

۱۶۱- عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا تَوَضَّاءَ اَحَدکُمْ فَلْیَجْعَلْ فِیْ اَنْفِهٖ مَاءً ثُمَّ لِیَنْتَثِرْ وَمَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْیُوْتِرْ وَ اِذَا اسْتَیْقَظَ اَحَدُکُمْ مِّنْ نَّوْمِهٖ فَلْیَغْسِلْ یَدَہٗ قَبْلَ اَنْ یُّدْخِلَهَا فِیْ وُضُوْءِہٖ فَاِنَّ اَحَدَکُمْ لَا یَدْرِیْ اَیْنَ بَاتَتْ یَدُہٗ

حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب کوئی تم میں سے وضو کرے تو اپنی ناک میں پانی ڈالے اور پھر سنکے اور جو کوئی استنجار کے لیے ڈھیلے لے تو طاق لے اور تم میں سے جو کوئی سو کر اٹھے تو پہلے ہاتھ وضو کے پانی میں ڈالنے سے دھوئے کہ معلوم نہیں اس کا ہاتھ کو کہاں رہا ہے۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمۃ نے طہارت میں بھی ذکر کیا ہے اور ابن ماجہ، مسلم، دارقطنی، امام طحاوی و ابوداؤد نے بھی اسی مضمون کی حدیث کو روایت کیا ہے اور اس میں دو بار اور تین بار دھونے کے لفظ بھی آئے ہیں۔ ۲۔ یہ حدیث تین حکموں پر مشتمل ہے۔ وضو کرتے وقت ناک میں پانی لینا اور سنکنا۔ استنجا کے لیے طاق ڈھیلے لینا اور سو کر اٹھنے کے بعد برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے دھو لینا۔ بعض روایتوں میں دو بار اور بعض میں تین بار دھونے کا ذکر ہے۔ امام نے حدیث کے ایک ٹکڑے یعنی استنجار میں طاق ڈھیلے لیے جائیں کا عنوان قائم کیا۔
۳۔ ہاتھوں کو دھونے کی علت یہ بتائی گئی کہ ممکن ہے رات کو سوتے میں ہاتھ شرمگاہ تک پہنچ گیا ہو اور وہاں کا پسینہ ہاتھ کو لگا ہو۔ جس سے واضح ہوا کہ یہ حکم استحباب کے لیے ہے وجوب کے لیے نہیں ہے کیونکہ جو حکم متضمن شک ہو وجوب کا فائدہ نہیں دیتا۔

اس حکم کی علت یہ ہے کہ اہل حجاز عموماً ڈھیلے سے استنجار کرتے تھے۔ اب سونے کے بعد ہو سکتا ہے کہ پسینہ آئے اور ہاتھ شرمگاہ کی نجاست سے ملوث ہو جائے اس لیے دھونے کا حکم دیا گیا ہے مگر چونکہ یہ بات یقینی نہیں ہے بلکہ محض امکانی ہے۔ اس لیے دھونے کا حکم بھی استحبابی قرار دیا جائیگا۔ یعنی سو کر اٹھنے پر برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہاتھ کو دھو لینا مستحب ہے۔ چنانچہ عام اہل علم کا یہی مسلک ہے۔ حدیث میں اگرچہ رات کے سونے کا ذکر ہے۔ مگر ہاتھ دھونے کی جو علت بیان فرمائی گئی ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب اور جس وقت بھی یہ شک ہو کہ ہاتھ نجس ہو گیا ہے اس کا دھو لینا مستحب ہے۔ خواہ رات کو سو کر اٹھنے پر شک ہو یا دن میں ہو یا بیداری میں شک ہو جائے۔ یہاں یہ بات یاد رکھئے کہ محض شک کی صورت میں اگر بغیر دھوئے ہاتھ برتن میں ڈال دئے تو پانی ناپاک نہ ہوگا لیکن بلا دھلا ہاتھ برتن میں ڈالنے سے پانی مستعمل ہو جاتا ہے اور وضو کے قابل نہیں رہتا۔
۴۔ روایت مسلم میں آیا ہے کہ فی الاناء تو یا تو اس سے چھوٹا برتن مراد ہے جیسے گلاس اور لوٹا تو ایسی صورت میں ہاتھ نہ ڈالے بلکہ پانی انڈیل کر ہاتھ دھوئے۔ لیکن اگر پانی بڑے برتن میں ہے اور چھوٹا برتن بھی موجود ہے تو پھر بھی ہاتھ نہ ڈالے

بلکہ چھوٹے برتن سے نکال کر ہاتھ دھوئے۔ لیکن اگر پانی بڑے برتن میں ہے اور کوئی چھوٹا برتن بھی نہیں کہ اس میں پانی انڈیل کر ہاتھ دھوئے تو اسے چاہیئے کہ بائیں ہاتھ کی انگلیاں ملا کر صرف وہ انگلیاں پانی میں ڈالے کہ ہتھیلی کا کوئی حصہ پانی میں نہ پڑے اور انگلیوں سے پانی نکال کر داہنا ہاتھ گٹے تک دھوئے (تین بار ایسا ہی کرے۔ پھر داہنے ہاتھ کو جہاں تک دھویا ہے بلا تکلف پانی میں ڈال سکتا ہے اور اس سے پانی نکال کر بایاں ہاتھ دھوئے اور اگر چھوٹے برتن میں پانی ہے یا پانی بڑے برتن میں ہے مگر وہاں چھوٹا برتن بھی موجود ہے اور اس صورت میں اس نے بے دھویا ہاتھ پانی میں ڈال دیا بلکہ صرف انگلی کا پورا یا ناخن ڈال دیا تو وہ سارا پانی ماءِ مستعمل ہو گیا یعنی یہ پانی وضوء کے قابل نہ رہا۔ اس مسئلہ سے لوگ بہت بے پرواہی برتتے ہیں۔ خیال کرنا چاہیئے۔

واضح ہو یہ تمام احکام اس صورت میں ہیں جب کہ ہاتھ میں کوئی نجاست نہ لگی ہو۔ اگر ہاتھ پر نجاست لگی ہو تو چاہے برتن چھوٹا ہو یا بڑا کسی طرح بھی ہاتھ ڈالے گا پانی نجس و ناپاک ہو جائے گا۔ یہ مسئلہ کہ برتن بڑا ہو تو بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو ملا کر پانی نکال لے اور سیدھے ہاتھ کو دھوئے، یہ بھی اسی صورت میں ہے جب کہ ہاتھ پر نجاست نہ لگی ہو۔ صرف وضو کرنے کی غرض سے پانی میں ہاتھ ڈالنا مقصود ہو۔ فافہم۔

یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

۱۔ ماءِ قلیل میں اگرچہ قلتین ہی ہو اور نجاست کا اثر بھی پانی میں نمودار نہ ہو تو پانی پھر بھی ناپاک ہو جائے گا۔
۲۔ نجس کپڑے یا کسی بھی نجس چیز کو تین مرتبہ دھونا مستحب ہے کیونکہ جب شک کی صورت میں ہاتھ کو تین مرتبہ دھونے کی ہدایت دی گئی ہے تو جس چیز کا ناپاک ہونا یقینی ہے اس کا تین مرتبہ دھونا بطریق اولیٰ مستحب ہونا چاہیئے ۳۔ پیشاب و پاخانہ پھرنے کے بعد مٹی یا پتھر وغیرہ سے استنجا کیا گیا پانی سے دھویا نہیں تو وہ جگہ نجس ہی رہے گی، تو اگر موضع کو تری پہنچی اور وہ تری کپڑے یا شلوار وغیرہ کو لگ گئی تو کپڑا ناپاک ہو جائے گا۔ ہاں ڈھیلے سے استنجا کرنے کے بعد نماز پڑھی جا سکتی ہے یعنی نماز کے حق میں اتنی نجاست معاف ہے۔

بَابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ

باب وضوء میں پاؤں دھونا (ضروری ہے)

وَلَا يَمْسَحُ عَلَى الْقَدَمَيْنِ | مسح نہ کرے

۱۔ اس عنوان کے قائم کرنے سے امام بخاری کا مقصود یہ بتانا ہے کہ وضوء میں پاؤں دھونا فرض ہے اور پاؤں پر مسح کرنے سے وضوء نہ ہوگا۔

۱۶۲۔ اس عنوان کے ماتحت امام نے وہی حدیث ذکر کی ہے جو باب من رفع صوته بالعلم میں مع تفہیم کے گزر چکی ہے۔ اس لیے ہم نے یہاں نہیں لکھی۔ اس حدیث کا مضمون یہ تھا کہ بعض لوگ وضو کر رہے تھے اور پاؤں پر مسح کر رہے تھے یا پاؤں اچھی طرح نہیں دھو رہے تھے۔ یہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ دوزخ کی آگ سے ایڑیوں کی خرابی ہوگی۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ وضوء میں پاؤں کا دھونا ضروری ہے۔

بَابُ الْمَضْمَضَہِ فِی الْوُضُوْءِ
باب وضوء میں کلی کرنے کے بیان میں

۱۶۳ - اَنَّہُ رَأَی عُثْمَانَ دَعَا بِوَضُوْءٍ فَاَفْرَغَ عَلٰی یَدَیْہِ مِنْ اِنَائِہٖ فَغَسَلَھُمَا ثَلٰثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ اَدْخَلَ یَمِیْنَہٗ فِی الْوَضُوْءِ ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْھَہٗ ثَلٰثًا وَّ یَدَیْہِ اِلَی الْمِرْفَقَیْنِ ثَلٰثًا ثُمَّ مَسَحَ بِرَاْسِہٖ ثُمَّ غَسَلَ کُلَّ رِجْلٍ ثَلٰثًا ثُمَّ قَالَ رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَتَوَضَّأُ نَحْوَ وُضُوْئِیْ ھٰذَا وَقَالَ مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِیْ ھٰذَا ثُمَّ صَلّٰی رَکْعَتَیْنِ لَا یُحَدِّثُ فِیْھِمَا نَفْسَہٗ غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ

عمران جو حضرت عثمانؓ کے غلام تھے انہوں نے دیکھا کہ حضرت عثمانؓ نے وضوء کے لیے پانی منگایا اور اپنے دونوں ہاتھوں پر برتن میں سے پانی ڈالا۔ پس ہاتھوں کو تین بار دھویا۔ پھر اپنا داہنا ہاتھ پانی میں ڈالا اس کے بعد (پانی لے کر) کلی کی، ناک میں پانی چڑھایا اور ناک سنکی پھر تین بار منہ دھویا اور تین بار کہنیوں سمیت ہاتھ دھوئے اور سر کا مسح کیا پھر دونوں پاؤں کو تین بار دھویا۔ پھر کہا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جیسے میں نے وضو کیا اور حضور نے فرمایا تھا۔ جو کوئی میرے اس وضوء کی طرح وضوء کرے پھر دو رکعت (تحیۃ المسجد) خلوصِ قلب کے ساتھ پڑھے۔ اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

فوائد و مسائل یہ حدیث مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے۔ وضوء میں ترتیب، اعضاءِ وضوء کو تین بار دھونا، کلی کرنا اور ناک میں پانی لینا سنت ہے۔ ترتیب کا مطلب یہ ہے کہ وضوء کرنے والا پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو گٹے تک دھوئے پھر منہ دھوئے پھر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھوئے۔ پھر سر کا مسح کرے۔ اس کے بعد دونوں پاؤں ٹخنے سمیت دھوئے۔ پھر تحیۃ المسجد پڑھے یہ دو رکعت نفل ہیں جو وضوء کرنے کے بعد مسجد میں پڑھے جاتے ہیں۔ حدیثِ زیرِ بحث میں یہ بتایا گیا اس نفل کے پڑھنے سے آدمی کے اگلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

تحیۃ المسجد کے مسائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں آئے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لے۔ تحیۃ المسجد پڑھنا سنت ہے۔ علماء نے فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ چار رکعت پڑھے جو شخص ایسے وقت میں مسجد آیا۔ جس میں نفل پڑھنا مکروہ ہے مثلاً بعد طلوعِ فجر یا بعد نمازِ عصر تو وہ تحیۃ المسجد نہ پڑھے بلکہ تسبیح و تہلیل، درودِ شریف میں مشغول ہو جائے حقِ مسجد ادا ہو جائے گا۔

بَابُ غَسْلِ الْاَعْقَابِ
باب ایڑیوں کے دھونے کے بیان میں

وَکَانَ ابْنُ سِیْرِیْنَ یَغْسِلُ مَوْضِعَ الْخَاتَمِ

اور حضرت ابن سیرین جب وضو کرتے تو انگوٹھی

اِذَا تَوَضَّاءَ (بخاری) | کی جگہ بھی دھوتے۔

امام اعظم ابوحنیفہ و امام شافعی کا قول ہے کہ اگر انگوٹھی تنگ ہو تو اس کو ہلانا وضو میں سنت ہے، جیسے ہاتھ دھوتے وقت انگلیوں کا خلال کرنا سنت ہے اور اگر انگوٹھی ڈھیلی ہے تو ہلانے کی ضرورت نہیں۔ خوب یاد رکھئے کہ انگوٹھی کے تنگ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسی تنگ ہو کہ بغیر ہلائے بھی اس کے نیچے پانی بہہ جائے تو اب ایسی تنگ انگوٹھی کو وضو میں ہلانا سنت ہے۔ لیکن بغیر ہلائے پانی پہنچتا ہی نہیں ہے تو ایسی صورت میں ہلانا فرض ہے تاکہ پانی جلد پر بہہ جائے۔ وضو میں یہ ضروری ہے کہ اعضاء وضو اس طرح دھوئے جائیں کہ ایک بال برابر بھی خشکی نہ رہے۔ لہٰذا اگر انگوٹھی یا عورتوں کے پاؤں میں چھلے وغیرہ ایسے تنگ ہیں کہ ہلانے سے ان کے نیچے پانی بہہ جائیگا تو ہلانا فرض ہے اور اگر ہلانے سے بھی پانی نہ بہے تو اُن کو اتار کر پانی بہانا فرض ہے۔ بعض لوگ کسی بیماری کی وجہ سے انگوٹھوں میں بہت کس کر تاگا باندھ لیتے ہیں کہ پانی کا بہانا درکنار تاگے کے نیچے بھی پانی نہیں بہتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تاگے کو علیحدہ کرکے اس جگہ پانی بہایا جائے۔

۱۶۴۔ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا هُرَيْرَةَ وَكَانَ يَمُرُّبِنَا وَالنَّاسُ يَتَوَضَّئُوْنَ مِنَ الْمِطْهَرَةِ فَقَالَ اَسْبِغُوا الْوُضُوْءَ فَاِنَّ اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَيْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ

محمد بن زیاد کہتے ہیں میں نے ابوہریرہ سے یہ سُنا جب کہ وہ ہمارے پاس سے گزرے اور لوگ برتن سے وُضو کر رہے تھے۔ تو وہ کہتے کہ لوگو! وضو کو پورا کرو کیونکہ ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایڑیوں کے لیے خرابی ہو۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام مُسلم و نسائی نے کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا ہے۔ اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وضو میں پاؤں کا ٹخنوں سمیت اس طرح دھونا فرض ہے کہ ذرا بھی خشک نہ رہے۔ چنانچہ مسلم کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جس نے وضو کیا، مگر ایڑیوں پر پانی نہیں بہایا۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ ویل للاعقاب ابوداؤد و دارقطنی و احمد کی حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص بحضور نبوی وضو کرکے آئے مگر پاؤں ان کا ناخن کے برابر دھلنے سے رہ گیا۔ حضور نے فرمایا۔ اِرْجِعْ فَاَحْسِنْ وُضُوْءَكَ جاؤ اور اچھی طرح دوبارہ وضو کرکے آؤ۔ (نیل الاوطار جلد ا صفحہ ۱۱)

پاؤں پر مسح کرنے سے وضو دُرست نہ ہو گا؟ واضح ہو جمہور صحابہ کرام و آئمہ دین سب کا اس پر اجماع ہے کہ وضو میں پاؤں کا دھونا فرض ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ صحابہ کرام کا اس باب میں کوئی اختلاف نہیں البتہ حضرت علی و انس و ابن عباس کے متعلق یہ روایت ملتی ہے کہ انہوں نے پاؤں پر مسح کیا۔ لیکن ان حضرات کا اس سے رجوع بھی ثابت ہے۔ امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ وضو کے معاملہ میں پاؤں پر مسح کرنے کے متعلق جس قدر بھی آثار ملتے ہیں وہ سب کے سب منسوخ ہیں کیونکہ حضور کی قولی و فعلی احادیث اور صحابہ کرام کے عمل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پاؤں کا دھونا فرض ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پاؤں کے ذرا بھی سُوکھے رہ جانے پر جہنم کی وعید سنائی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے قدمین کے

متعلق جو روایت منقول ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز پڑھی پھر صحنِ مسجد میں تشریف لائے پانی لایا گیا۔
فَمَسَحَ بِوَجْهِهٖ وَيَدَيْهِ وَبِرَاْسِهٖ وَرِجْلَيْهِ | تو آپ نے منہ ہاتھوں سر اور پاؤں کا مسح کیا
اس کے بعد فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی کرتے دیکھا ہے۔ وَهٰذَا وُضُوْءُ مَنْ لَّمْ يُحْدِثْ
اور یہ وضوء اس کا ہے جو باوضوء ہو (طحاوی)

ظاہر ہے کہ اس روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وضوء میں پاؤں کا مسح کرنا کافی ہے، کیونکہ اس میں منہ اور ہاتھ کے مسح کرنے کا بھی ذکر ہے حالانکہ منہ اور ہاتھ کے مسح کا قول کسی نے نہیں کیا نیز حضرت علی کا یہ فرمانا کہ "یہ وضوء اس کا ہے جو باوضوء ہو"۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ وضوء جو حضرت علی نے کیا نماز کا وضوء نہ تھا بلکہ گرد و غبار دُور کرنے یا ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے آپ نے اپنے منہ ہاتھ پاؤں اور سر پر پانی مل لیا تھا۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ وضوء نماز کا وضوء تھا، تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مَسَحَ رِجْلَيْهِ میں مسح کا لفظ (غسل) دھونے کے معنیٰ میں ہے کیونکہ اس روایت میں مسح بِوَجْهِهٖ میں مسح کا لفظ غَسَلَ دھونے کے معنیٰ میں آیا ہے۔ ایسے ہی مسح رجلیہ میں بھی مسح کا لفظ (غسل) دھونے کے معنیٰ میں لینا ضروری ہے فافہم۔

بَابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ فِي النَّعْلَيْنِ

باب چپل پہنے ہو تو پاؤں کو دھوئے

وَلَا يَمْسَحُ عَلَى النَّعْلَيْنِ | چپلوں پر مسح نہ کرے

فوائد و مسائل اس عنوان سے امام کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اگر کوئی چپل پہنے تو اس کو وضوء کرتے وقت پاؤں کو دھونا چاہیے۔ موزوں کی طرح چپلوں پر مسح کرنے کے وضوء نہ ہوگا۔ واضح ہو کہ وضوء میں پاؤں کا دھونا فرض ہے لیکن شریعت نے آسانی کے لیے موزوں پر مسح کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ یعنی جو شخص موزہ پہنے ہو وہ اگر وضوء میں بجائے پاؤں دھونے کے مسح کرے تو وضو درست ہو جائے گا۔ مسح کے جواز میں کثرت سے حدیثیں آئی ہیں جو قریب قریب تواتر کے ہیں۔ اسی لیے امام کرخی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ جو مسح کو جائز نہ جانے اس کے کافر ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ امام شیخ الاسلام نے فرمایا کہ مسح خف کو جائز نہ ماننے گمراہ ہے۔ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اہلسنت کی علامت دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا۔
تفضيل الشيخين وحُبُّ الختنين ومَسْحُ الخفين۔ سیدنا صدیقِ اکبر و فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو تمام صحابہ سے افضل جاننا، سیدنا عثمانِ غنی و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے محبت رکھنا اور موزوں پر مسح کرنا۔ امام نے ان تین باتوں کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ آپ کوفہ میں تشریف فرما تھے اور رافضیوں کی وہاں کثرت تھی، تو وہی علامات ارشاد فرمائیں جو ان کا رد ہیں۔ اس کے یہ معنیٰ نہ سمجھے جائیں کہ صرف ان تین باتوں کا پایا جانا سُنّی ہونے کے لیے کافی ہے کیونکہ علامت شئی میں پائی جاتی ہے۔ شئی لازم علامت نہیں ہوتی۔ فافہم۔

موزوں پر مسح کرنا جائز ہے حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ تقریباً ستّر افراد نے قولاً و عملاً موزوں پر مسح کرنے کی حدیث کو روایت کیا ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ موزوں پر مسح کے جواز میں

مجھے کچھ تردد نہیں کیونکہ اس کے جواز پر مجھے چالیس صحابہ کرام سے حدیثیں پہنچی ہیں۔ ابن المنذر ابن المبارک سے روایت کرتے ہیں کہ موزوں پر مسح کے جائز ہونے میں صحابہ کرام میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی وفعلی حدیثیں اس باب میں کثرت سے آئی ہیں۔ چند احادیث کے تراجم یہاں لکھے جاتے ہیں۔ ۱۔ حضرت مغیرہ کہتے ہیں کہ حضور نے موزوں پر مسح فرمایا۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ آپ پاؤں دھونا بھول گئے؟ حضور نے جواب دیا نہیں تو بھولا ہے۔ مجھے میرے رب نے موزوں پر مسح کا حکم دیا ہے (احمد و ابو داؤد) ۲۔ سیدنا صدیق اکبر سے روایت ہے کہ حضور نے مسافر کو تین دن تین راتیں اور مقیم کو ایک دن ایک رات موزوں پر مسح کرنے کی اجازت دی جب کہ موزے طہارت کے ساتھ پہنے ہوں (دارقطنی) ۳۔ صفوان بن عسال کہتے ہیں۔ جب ہم مسافر ہوتے تو حضور ہمیں حکم فرماتے کہ ہم تین دن تین رات موزے نہ اُتاریں مگر بوجہ جنابت کے۔ لیکن پاخانہ و پیشاب اور سونے کے بعد نہیں (ترمذی اور نسائی) ۴۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں۔ میں نے حضور کو موزوں کی پشت پر مسح کرتے دیکھا (ابو داؤد و ترمذی) غرضیکہ یہ بات اپنی جگہ ثابت ہے کہ وضو میں پاؤں دھونے کی بجائے چمڑے کے موزوں پر مسح کیا جائے تو جائز بلا کراہت ہے بشرطیکہ موزہ پر مسح کرنے کی جو شرائط ہیں اس کا خیال رکھا جائے۔

موزوں پر مسح کرنے کے متعلق ضروری مسائل

موزوں پر مسح کرنے کے لیے چند شرائط ہیں ۱۔ موزے چمڑے کے ہوں یا کسی ایسی دبیز چیز کے بنے ہوئے ہوں کہ جن میں سے پانی نہ چھنے جیسے کرمچ و پلاسٹک وغیرہ ۲۔ یہ موزے ایسے ہوں کہ ٹخنے چھپ جائیں۔ اس سے زیادہ ہونے کی ضرورت نہیں اور اگر انگل کم ہو کہ ٹخنے کا کچھ حصہ کھلا رہے تو بھی مسح درست ہے مگر اس میں یہ شرط ہے کہ ایڑھی کھلی نہ رہے۔ ۳۔ موزہ پاؤں سے چمٹا ہو کہ اس کو پہن کر آسانی سے بخوبی چل پھر سکیں ۴۔ وضو کر کے موزہ پہنا ہو یعنی پہننے کے بعد اور حدث (وضو ٹوٹنے سے پہلے ایک ایسا وقت ہو کہ اس وقت میں وہ شخص باوضو ہو خواہ پورا وضو کر کے پہنے یا صرف پاؤں دھو کر موزہ پہن لے بعد میں وضو پورا کرے۔ مسح میں دو فرض ہیں۔ اوّل یہ کہ ہر موزہ کا مسح ہاتھ کی چھوٹی تین انگلیوں کے برابر ہو (۱) دوم مسح موزے کی پیٹھ پر کیا جائے تو اگر موزہ کے تلے یا کروٹ یا ٹخنے یا پنڈلی یا ایڑی پر مسح کیا تو مسح درست نہ ہوگا ۲۔ موزہ پر مسح کی مدت مقیم کے لیے ایک دن ایک رات ہے اور مسافر کے لیے تین دن اور تین رات ہے۔ مسح کی مدت پہلی بار جو حدث ہوگا اس وقت سے شروع ہوگی مثلاً موزہ پہننے کے بعد پہلی مرتبہ حدث ہوا (یعنی وضو جاتا رہا) اس وقت سے مدت کا شمار ہوگا۔ فرض کیجیے صبح کے وقت موزہ پہنا اور ظہر کے وقت پہلی بار حدث ہوا تو مقیم دوسرے دن کی ظہر تک مسح کرے گا اور مسافر چوتھے دن کی ظہر تک مسح کرے گا ۳۔ جس پر غسل فرض ہو وہ موزوں پر مسح نہیں کر سکتا ۴۔ جن چیزوں سے وضو ٹوٹتا ہے ان سے مسح بھی جاتا رہتا ہے ۵۔ مدت پوری ہو جانے سے مسح جاتا رہتا ہے۔ اس صورت میں صرف پاؤں دھو لینا کافی ہے پھر سے پورا وضو کرنے کی حاجت نہیں بہتر یہ ہے کہ پورا وضو کرے ۶۔ موزہ اُتار دینے سے مسح ٹوٹ جاتا ہے۔ اگرچہ ایک ہی اُتارا ہو۔ یونہی اگر ایک پاؤں آدھے سے زیادہ موزہ سے باہر ہو جائے مسح جاتا رہا ۷۔ خوب یاد رکھیے کہ سوتی یا اونی موزوں پر مسح جائز نہیں ہے۔ ان کو اُتار کر پاؤں دھونا فرض ہے۔ ۸۔ مندرجہ ذیل قسم کے موزوں پر مسح کر سکتے ہیں۔

اوّل:۔ پورا موزہ ہی چمڑہ کا ہو۔ جو ٹخنوں کو ڈھانپ لے یا صرف تلہ چمڑے کا ہو اور باقی حصہ کسی اور دبیز چیز کا بنا

ہو اس پر بھی مسح جائز ہے۔

منعل - پر بھی مسح جائز ہے یعنی سوتی یا اونی جراب کا تلہ چمڑہ کا بنا لیا جائے اور اس کو ساتھ ملا کر سی دیا جائے حدیث میں جو جرابوں پر مسح کا ذکر ہے اس سے ایسا ہی موزہ مراد ہے۔

مجلد - پر بھی مسح جائز ہے یعنی اونی یا سوتی جراب پر چمڑہ کا پائتابہ چڑھا لیا جائے مگر اس میں یہ شرط ہے کہ یہ پائتابہ جرابوں کے ساتھ سی لیا جائے۔ اگر سیا نہیں گیا تو مسح جائز نہ ہوگا۔

وضاحت موزہ چمڑہ کا ہو یا کسی ایسی چیز کا بنا ہوا ہونا چاہیے، جس میں سے پانی نہ چھنے جیسے پلاسٹک، کرمچ وغیرہ، انگریزی بوٹ جو ٹخنے کو ڈھانپ لے اس پر بھی مسح جائز ہے یعنی اگر کسی نے بوٹ پہنے ہوں اور وضوء کرتے وقت ان پر مسح کر لیا وضوء درست ہو گیا لیکن نماز کے لیے یہ ضروری ہے کہ موزہ یا بوٹ ایسے نرم چمڑے کا بنا ہوا ہو کہ سجدہ کرنے میں پاؤں کی انگلیاں مڑ سکیں اور انگلیوں کے پیٹ زمین سے چمٹ سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سجدہ میں پاؤں کی ایک انگلی کے پیٹ کا زمین سے چمٹ جانا فرض ہے۔ اگر دونوں پاؤں سجدہ میں اٹھے رہے بلکہ صرف انگلی کی نوک زمین سے لگی جب بھی نماز نہیں ہوئی۔ اس مسئلہ سے بہت لوگ غافل ہیں۔ یہ چند ضروری مسائل یہاں لکھے گئے ہیں۔ مفصل احکام مسائل کے لیے بہارِ شریعت حصہ دوم کا مطالعہ کیجیے۔

چپلوں پر مسح کی بحث امام بخاری نے مذکورہ بالا عنوان قائم کر کے یہ بتایا ہے کہ چپلوں پر مسح کرنے سے وضوء نہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ چمڑے کے موزوں پر مسح جائز ہے لیکن چپلوں پر مسح جائز نہیں ہے لیکن صحابہ میں سے بعض افراد کے متعلق ایسی حدیثیں مل جاتی ہیں کہ انھوں نے چپلوں پر مسح کیا۔ مثلاً اوس بن اوس کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو دیکھا کہ انھوں نے چپلوں پر مسح کیا۔ میں نے کہا یہ آپ کیا کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ میں نے حضور علیہ السلام کو بھی (نعلین) پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے یا ابوظبیان کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کو دیکھا کہ انھوں نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا پھر وضوء کے لیے پانی منگایا۔ وَمَسَحَ عَلَى النَّعْلَيْنِ اور چپلوں پر مسح کیا اور مسجد میں جا کر نعلین اتار کر نماز پڑھی (طحاوی باب المسح علی الخفین)۔ اس نوع کے آثار سے بعض لوگوں کے یہ استدلال درست نہیں کیونکہ اس سلسلہ کی احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن نعلین پر حضور نے مسح فرمایا۔ ان کے نیچے چمڑے کے موزے بھی ہوں اور آپ کا ارادہ بھی موزوں پر ہی مسح کا ہو۔ کیونکہ اگر آپ چپل نہ پہنے ہوتے تو بھی موزوں پر ہی مسح فرماتے تو آپ کا ارادہ تو موزوں پر ہی مسح کا تھا۔ مگر آپ نے موزہ اور نعلین دونوں پر مسح فرمایا تو طہارت حاصل ہو گئی اور نعلین پر مسح فرمانا امرِ زائد ہوا چنانچہ اس کی وضاحت کہ حضور نے جن چپلوں پر مسح فرمایا ان کے نیچے موزے بھی پہنے ہوئے تھے حدیثِ ابوموسیٰ سے ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ مسح عَلىٰ جَوْرَبَيْهِ وَنَعْلَيْهِ۔ حضور نے جورب اور نعلین پر مسح فرمایا تو حدیث ابوموسیٰ سے نعلین پر مسح کرنے کی کیفیت معلوم ہو گئی کہ حضور نے نعلین کے ساتھ ساتھ جورب پر بھی مسح فرمایا تو مقصود دراصل (جورب) موزوں ہی پر مسح کرنا تھا نہ کہ چپلوں اور جوتیوں پر۔ لہٰذا چپل پر مسح کرنے سے وضوء کی صحت ثابت نہ ہوئی۔

اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ جو حدیث ابنِ عمر سے نکلتا ہے کہ حضرت ابنِ عمر جب وضوء کرتے اور جوتے آپ کے پاؤں

ہیں ہوتے تو آپ ظاہر قدمین پر مسح کر لیتے اور یہ فرماتے کہ حضور اکرم بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ حدیث ابن عمر سے حضور کے نعلین پر مسح کرنے کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ کبھی حضور نعلین پر مسح کرتے ہوئے ظاہر قدمین پر بھی مسح فرما لیتے تھے یعنی ظاہر قدمین پر مسح فرمانا تو علی سبیل الفرضیت تھا اور نعلین پر مسح کرنا، امر زائد تھا۔ (پھر یہ پاؤں پر مسح کرنے کا جواز منسوخ ہوگیا) غرضیکہ جن احادیث و آثار میں نعلین پر مسح کرنے کا بیان ہے۔ ان میں یہ دونوں احتمال پائے جاتے ہیں۔

اوّل یہ کہ نعلین پر مسح کرنے کی کیفیت یہ تھی کہ آپ موزے بھی پہنے ہوئے تھے۔ آپ نے نعلین اور موزہ دونوں پر مسح فرمایا جیسا کہ حدیث مغیرہ وحدیث ابوموسیٰ سے ثابت ہوتا ہے۔ جس کے لفظ یہ ہیں مَسَحَ عَلٰی جَوْرَبَیْہِ وَنَعْلَیْہِ اور جرابوں پر مسح کو امام اعظم علیہ الرحمۃ بھی جائز سمجھتے ہیں جب کہ وہ مجلد یا منعل ہوں یا ایسی دبیز چیز کی بنی ہوئی ہوں کہ ان میں پانی نہ چھنے۔ دوم یہ کہ حدیث ابن عمر سے یہ احتمال نکلتا ہے کہ حضور بھی نعلین پر مسح کرتے ہوئے ظاہر قدمین پر بھی مسح فرمایا کرتے تھے تو گویا پاؤں پر مسح بطور فرض وضوء کے تھا اور نعلین پر مسح ضمنی طور پر امر زائد تھا۔ پھر پاؤں پر مسح کرنا منسوخ ہوگیا۔ غرضیکہ وہ احادیث و آثار جن میں نعلین (چپل) پر مسح کا ذکر ہے۔ مذکورہ بالا دونوں معنوں میں سے کسی بھی معنیٰ پر محمول کر لیجیے۔ اس سے چپلوں پر مسح کرنے کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ عقل بھی چاہتی ہے کہ چپلوں پر مسح کرنا جائز نہ ہو کیونکہ یہ بات سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ اگر چمڑہ کا موزہ اتنا پھٹ جائے کہ پاؤں کا اکثر حصہ[1] ظاہر ہو جائے تو ایسے موزوں پر مسح جائز نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے چپل میں پاؤں کا اکثر حصہ ظاہر رہتا ہے لہٰذا چپل پر مسح جائز نہیں ہونا چاہیے (فافہم)

نیز اس سلسلہ میں اہلِ علم کے لیے مندرجہ ذیل امور بھی قابلِ غور و فکر ہیں۔ اوّل حدیث مَسَحَ عَلٰی جَوْرَبَیْہِ وَنَعْلَیْہِ محدثین نے اس میں کلام کیا ہے۔ امام بیہقی نے فرمایا یہ حدیث منکر ہے۔ سفیان ثوری عبدالرحمٰن بن مہدی احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین اور علی المدینی و مسلم بن حجاج نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام ابوداؤد نے فرمایا کہ عبدالرحمٰن بن مہدی اس حدیث کو روایت نہیں کرتے کیونکہ حضرت مغیرہ سے جو معروف و مشہور حدیث مروی ہے اس کا مضمون تو یہ ہے کہ حضور نے موزوں پر مسح کیا۔ اسی طرح یہ حدیث حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے مگر یہ روایت بھی متصل نہیں ہے۔ اگرچہ اس حدیث کو ابن ماجہ نے بھی حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے لیکن ابوداؤد کہتے ہیں کہ اس کی سند بھی متصل نہیں ہے۔ کیونکہ ابوموسیٰ سے ضحاک ابن عبدالرحمٰن نے روایت کیا ہے اور امام بیہقی نے فرمایا کہ ضحاک کا سماع ابوموسیٰ سے ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح یحییٰ بن معین و امام بیہقی نے فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف ہے قوی نہیں ہے کیونکہ اس کی اسناد میں عیسیٰ بن سنان بھی ہیں جو ضعیف ہیں لائق حجت نہیں ہیں (نیل الاوطار ج ۱ ص ۱۷۹)

دوم۔ اسی طرح وہ حدیث جس میں یہ آیا ہے کہ حضور نے نعلین پر مسح کیا۔ یہ سب حدیثیں فعلی ہیں۔ مثلاً اوس بن اوس کہتے ہیں۔ میں نے اپنے والد کو نعلین پر مسح کرتے دیکھا تو ان سے میں نے کہا کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے حضور کو نعلین پر مسح کرتے دیکھا ہے (طحاوی، ابوداؤد) لیکن کوئی روایت ایسی نہیں ملتی جس میں یہ ہو کہ حضور نے فرمایا کہ نعلین پر مسح کرو یا تمہیں نعلین پر مسح کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اسی طرح اس باب کی تمام حدیثیں

---

[1] بلکہ پیر کی تین انگلیوں کی مقدار اگر موزے سے کھل جائے ہو تو مسح جائز نہیں۔ کذا فی عامۃ الکتب الفقۃ ۱۲ (رضوی)

خبر احاد ہیں۔ لیکن اس کے برعکس چمڑے کے موزوں پر مسح کرنے کے جواز کی حدیثیں قولی بھی ہیں اور فعلی بھی بلکہ حدیث مغیرہ بن شعبہ تو حدیث مشہور ہے۔

سوم - حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے متعلق نعلین پر مسح کرنے کی جو حدیث ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ آپ نے نعلین پر مسح کیا۔ پھر مسجد میں گئے اور نعلین اُتار کر نماز پڑھی۔ ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَخَلَعَ نَعْلَيْهِ ثُمَّ صَلّٰى (طحاوی) غور طلب بات یہ ہے کہ اگر حضرت علی نے نعلین پر مسح فرمایا تھا تو پھر نماز پڑھتے وقت اس کو اُتارا کیوں؟ اور اس بات پر توسب کا اتفاق ہے کہ موزہ پر مسح کے بعد اگر اس کو اُتار دیا جائے تو مسح ٹوٹ جاتا ہے۔

ان امور کے پیش نظر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نعلین پر مسح کے متعلق جس قدر آثار ملتے ہیں۔ اول تو ان کی یہ پوزیشن نہیں ہے کہ ان کو حدیث مشہورہ کے مقابل لایا جائے، دوسرے یہ کہ "نعلین اُتار کر نماز پڑھی" کے جملہ سے اس توجیہ کو تقویت پہنچتی ہے کہ ضرور نعلین کے اندر چمڑہ کا موزہ پہنا ہوا تھا اور اس زمانہ کی چپل بھی ایسی ہوتی تھی کہ اس میں پاؤں کا اوپر کا حصہ بالکل ظاہر رہتا تھا۔ پس مسح علی نعلیہ کا مفہوم یہ ہوا کہ چپل پہنے پہنے موزہ پر مسح کر لیتے تھے کیونکہ چپل پہننے کی صورت میں بھی مسح کرنے کی جگہ ظاہر رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بوقت نماز چپل اُتار دیتے تھے ورنہ اگر چپل پر مسح کیا ہوتا تو اس کو اُتارتے نہیں کیونکہ اُتارنے سے مسح ٹوٹ جاتا ہے۔

۱۶۵- عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ جُرَيْجٍ اَنَّهٗ قَالَ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ رَاَيْتُكَ تَصْنَعُ اَرْبَعًا لَمْ اَرَ اَحَدًا مِّنْ اَصْحَابِكَ يَصْنَعُهَا قَالَ وَمَا هِيَ يَا ابْنَ جُرَيْجٍ قَالَ رَاَيْتُكَ لَا تَمَسُّ مِنَ الْاَرْكَانِ اِلَّا الْيَمَانِيَيْنِ وَرَاَيْتُكَ تَلْبَسُ النِّعَالَ السِّبْتِيَّةَ وَرَاَيْتُكَ تَصْبُغُ بِالصُّفْرَةِ وَرَاَيْتُكَ اِذَا كُنْتَ بِمَكَّةَ اَهَلَّ النَّاسُ اِذَا رَاَوُا الْهِلَالَ وَلَمْ تُهِلَّ اَنْتَ حَتّٰى كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ اَمَّا الْاَرْكَانُ فَاِنِّيْ لَمْ اَرَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمَسُّ اِلَّا الْيَمَانِيَيْنِ وَاَمَّا النِّعَالُ السِّبْتِيَّةُ فَاِنِّيْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبَسُ النِّعَالَ الَّتِيْ لَيْسَ فِيْهَا شَعَرٌ وَيَتَوَضَّاُ فِيْهَا فَاَنَا اُحِبُّ اَنْ اَلْبَسَهَا وَاَمَّا الصُّفْرَةُ فَاِنِّيْ

حضرت عبید اللہ بن جریج نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے کہا آپ چار کام ایسے کرتے جس کو میں نے تمہارے ساتھیوں کو کرتے نہیں دیکھا۔ عبد اللہ بن عمر نے جواب دیا ابن جریج وہ چار باتیں کونسی ہیں۔ جریج نے جواب دیا وہ ہیں ۱۔ تم طواف میں سوائے رکن یمانی اور حجر اسود کے کسی اور کونے کو ہاتھ نہیں لگاتے ۲۔ تم نری کے جوتے پہنتے ہو اور زرد خضاب کرتے ہو ۳۔ تم (حج کے دنوں) میں کہ میں ہوتے ہو تو لوگ (ذوالحجہ کا چاند) دیکھتے ہی احرام باندھ لیتے ہیں اور تم آٹھویں تاریخ تک نہیں باندھتے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر نے جواب دیا۔ کعبہ کے کونوں کے متعلق جو تم کہتے ہو تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا کہ آپ نے حجر اسود اور رکن یمانی کے سوا کعبہ کے کسی کونے کو طواف میں ہاتھ لگایا ہو۔ نری کی جوتیوں کے متعلق یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی میں نے پہنتے دیکھا ہے

فَاِنِّیْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَصْبِغُ بِھَا فَاِنِّیْ اُحِبُّ اَنْ اَصْبِغَ بِھَا وَاَمَّا الْاِھْلَالُ فَاِنِّیْ لَمْ اَرَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُھِلُّ حَتّٰی تَنْبَعِثَ بِہٖ رَاحِلَتُہٗ

(بخاری)

اور آپ ان کو پہنے پہنے وضو فرماتے تو میں بھی ان کا پہننا پسند کرتا ہوں ۔ رہا زرد خضاب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی زرد خضاب فرماتے تھے تو میں بھی زرد رنگ پسند کرتا ہوں ۔ احرام کا حال یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ کو اس وقت تک احرام باندھے نہیں دیکھا جب تک آپ کی اُونٹنی آپ کو لے کر نہ اُٹھتی (یعنی یہ آٹھویں تاریخ ہوتی تھی ۔ اسی دن حاجی منیٰ کو روانہ ہوتے تھے)

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے کتاب اللباس میں بھی ذکر کیا ہے ۔ ابوداؤد نے حج میں ترمذی نے شمائل میں ۔ نسائی نے طہارۃ میں ۔ ابن ماجہ نے لباس میں اور نسائی و مسلم نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے ۲۔ امام بخاری نے عنوان قائم کیا تھا کہ وضو میں پاؤں کا دھونا فرض ہے اور چپلوں پر مسح کرنے سے وضو نہ ہوگا ۔ حدیث زیرِ بحث میں عنوان سے متعلق صرف "یتوضأ فیھا" ہے کہ حضور علیہ السلام نے چپل پہنے پہنے وضو فرمایا یعنی پاؤں کو دھویا چپلوں پر مسح نہیں کیا ۔ کیونکہ اگر آپ نے چپلوں پر مسح کیا ہوتا تو حضرت عبداللہ بن عمر یتوضأ کی جگہ یمسح کا لفظ بولتے جس سے واضح ہوا کہ اگر کوئی شخص چپل پہنے تو وضو میں اس کو پاؤں کا دھونا ضروری ہے مسح کرنے سے وضو درست نہ ہوگا ۳۔ حضرت عبداللہ بن عمر کعبہ کا طواف کرتے وقت صرف رکن یمانی و سنگِ اسود کو بوسہ دیتے تھے (الا الیمانیین کا یہی مطلب ہے) ان سے پوچھا گیا ۔ آپ باقی دو رکنوں کو کیوں نہیں بوسہ دیتے ، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے حضور کو بھی صرف رکن یمانی و حجرِ اسود کو ہی بوسہ دیتے دیکھا ہے ۔ اس لیے میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں ۔ اس مسئلہ کو سمجھنے نقشہ ذیل کو دیکھئے ۔

طوافِ کعبہ میں حجرِ اسود کو چُومنا

واضح ہو کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے طوافِ کعبہ کے وقت حجرِ اسود کو بوسہ دیا ہے ۔ آپ نے فرمایا ۔ قیامت کے دن یہ پتھر اُٹھایا جائیگا ۔ جس شخص نے اس کو دیکھا اور اس کو چُوما ، اس کے لیے گواہی دے گا ۔ حجرِ اسود پر دونوں ہتھیلیاں اور ان کے بیچ میں منہ رکھ کر بوسہ دینا چاہیئے کہ آواز پیدا نہ ہو ۔ حجرِ اسود کے چُومنے میں کسی کو ایذا نہ دے ۔ بھیڑ کی وجہ سے نہ چُوم سکے تو ہاتھ کو چھُو کر اسے چُوم لیا جائے ۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو لکڑی سے چھُو کر اسے چُوم لو ۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو ہاتھوں کو اس کی طرف اُٹھا کر اور ان کا اندرونی رُخ حجرِ اسود کی طرف کر کے ہاتھوں کو چُوم لیا جائے ۔ اسی طرح رُکنِ یمانی کو دونوں ہاتھ یا داہنے ہاتھ سے تبرّکاً چھُوا جائے اور اگر چاہے تو اس کو بھی بوسہ دے لیکن یہاں لکڑی سے چھُونا یا اشارہ کرکے ہاتھ چُومنا نہیں ہے اور رکن شامی یا رکنِ عراقی کو چھُونے یا بوسہ دینے کی ضرورت نہیں ہے ۔
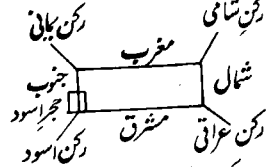
۴۔ زرد خضاب کرنا سنّت ہے ۔ اور کالے خضاب میں علماء کا اختلاف ہے ۔ علماء رامپور اس کے مجوز ہیں لیکن

علمار بریلی اس کو حرام وناجائز قرار دیتے ہیں۔ اعلیحضرت بریلوی قدس سرہ العزیز نے کالے خضاب کے ناجائز ہونے پر ایک رسالہ بھی لکھا ہے جس کا نام حک العیب ہے۔

۴۔ یوم الترویہ یعنی ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ کو جو احرام باندھ نہیں ہوتا غسل کرکے احرام باندھتا ہے۔ طواف کعبہ اور دو رکعت سنت احرام پڑھ کر حج کی نیت کی جاتی ہے اور لبیک کہتے ہیں اور بعد طلوع آفتاب منیٰ کو روانہ ہوجاتے ہیں اور حدیث ہذا میں اسی کا بیان ہے۔

بَابُ التَّيَمُّنِ فِي الْوُضُوْءِ وَالْغُسْلِ

باب وضور وغسل کے وقت ابتدار سیدھی طرف کرنا

۱۶۶۔ ۱۔ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهُنَّ فِي غُسْلِ ابْنَتِهٖ اِبْدَأْنَ بِمَيَامِنِهَا وَمَوَاضِعِ الْوُضُوْءِ مِنْهَا

ام عطیہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی (حضرت زینب) کو غسل دینے لگے تو آپ نے غسل دینے والی عورتوں سے فرمایا داہنی طرف سے اور وضور کے مقاموں سے ان کا غسل شروع کریں۔

۱۶۷۔ ۲۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ فِي تَنَعُّلِهٖ وَتَرَجُّلِهٖ وَطُهُوْرِهٖ فِي شَانِهٖ كُلِّهٖ

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر کام میں داہنی طرف سے شروع کرنا پسند تھا، جوتا پہننے اور کنگھی کرنے اور طہارۃ کرنے میں بھی۔

فوائد و مسائل حدیث ۱ کو امام نے کتاب الجنائز میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم، نسائی، ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔ میت کو نہلاتے وقت وضو کرانا مستحب ہے مگر کلی اور ناک میں پانی نہیں ڈالا جائے گا۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ وضور سنتِ غسل سے ہے، تمام علمار کا اس پر اتفاق ہے کہ وضو وغسل داہنی طرف سے شروع کیا جائے۔ بِمَيَامِنِهَا یہ ترجمہ باب ہے کیونکہ اس سے یہ یہ واضح ہوتا ہے کہ جب غسل میں داہنی طرف سے شروع کرنے کا حکم ہوا ہے تو وضور میں بھی ایسا ہی ہوگا۔

حدیث ۲ کو امام نے کتاب الصلوٰۃ اور اطعمہ اور کتاب اللباس بھی ذکر کیا ہے اور نسائی و ابن ماجہ اور مسلم نے طہارۃ میں۔ ابوداؤد نے لباس میں، ترمذی نے آخر صلوٰۃ میں اور شمائل میں ذکر کیا ہے۔

التیمن کے معنیٰ ہر کام میں داہنی طرف سے شروع کرنے کے ہیں۔ حضور علیہ السلام جوتا پہننے، کنگھی کرنے، وضور فرمانے حتیٰ کہ تمام کاموں میں داہنی طرف سے ابتدار کرنے کو پسند فرماتے تھے۔ "فِي شَانِهٖ كُلِّهٖ" یہ عام مخصوص ہے کیونکہ بعض افعال میں بائیں طرف سے شروع کرنے کا حکم دیا ہے۔ جیسے پاخانہ جاتے وقت پہلے بایاں قدم رکھا جائے۔ امام شیخ محی الدین نے فرمایا کہ اس حدیث سے یہ اصول معلوم ہوا کہ وہ ہر کام جو عزت و بزرگی رکھتا ہے۔ اسے سیدھی طرف سے شروع کرنا مستحب ہے جیسے مسجد میں داخل ہونا، مصافحہ کرنا۔ کپڑے پہننا، وضور وغسل کرنا وغیرہ اور جس کام میں یہ بات نہیں جیسے مسجد سے باہر آنا۔ استنجا کرنا وغیرہ اس میں سیدھی طرف سے شروع کرنا نہیں ہے۔

بَابُ اِلْتِمَاسِ الْوُضُوْءِ اِذَا حَانَتِ الصَّلٰوۃُ

باب جب صبح کی نماز کا وقت آئے تو پانی تلاش کرنا

قَالَتْ عَائِشَۃُ حَضَرَتِ الصُّبْحُ فَالْتُمِسَ الْمَاءُ فَلَمْ یُوْجَدْ فَنَزَلَ التَّیَمُّمُ

حضرت عائشہ نے فرمایا۔ نماز صبح کا وقت ہوا تو پانی ڈھونڈا نہ ملا آخر تیمم کی آیت اُتری

عنوان اول میں التیمن لاجل الوضوء کا ذکر ہے اور اس میں وضوء کے لیے پانی تلاش کرنے کا بیان ہے۔ فالتمس سے ترجمہ باب نکلتا ہے۔

۱۶۸۔ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّہٗ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَانَ صَلٰوۃُ الْعَصْرِ فَالْتَمَسَ النَّاسُ الْوُضُوْءَ فَلَمْ یَجِدُوْا فَاُتِیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِوَضُوْءٍ فَوَضَعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ ذٰلِكَ الْاِنَاءِ یَدَہٗ وَاَمَرَ النَّاسَ اَنْ یَتَوَضَّؤُا مِنْہُ قَالَ فَرَاَیْتُ الْمَاءَ یَنْبَعُ مِنْ تَحْتِ اَصَابِعِہٖ حَتّٰی تَوَضَّؤُا مِنْ عِنْدِ اٰخِرِھِمْ

حضرت انس بن مالک، کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ لوگوں نے پانی تلاش کیا مگر نہ ملا تو حضور علیہ السلام کے پاس تھوڑا سا پانی لایا گیا، آپ نے اپنا دست مبارک اس برتن میں رکھ دیا اور لوگوں سے فرمایا اس سے وضوء کرو (حضرت انس کہتے ہیں) میں نے دیکھا پانی آپ کی انگلیوں سے پھوٹ رہا ہے۔ یہاں تک کہ سب نے وضوء کیا۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام بخاری نے علامات النبوۃ میں بھی ذکر کیا ہے مسلم نے فضائل میں، نسائی نے طہارۃ میں اور ترمذی نے مناقب میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ حضور کی مقدس انگلیوں سے پانی جاری ہونے کا معجزہ متعدد بار وقوع میں آیا۔ اس مقدس پانی سے سیراب ہونے والوں کی تعداد کسی واقعہ میں چودہ سو، کسی میں ڈیڑھ ہزار کسی میں ۱۵ سو آئی ہے۔ حضور کا یہ معجزہ جناب موسیٰ کلیم علیہ السلام کے معجزہ سے کہیں بڑھ کر ہے کیونکہ پتھر سے تو پانی نکلا ہی کرتا ہے مگر گوشت پوست کی انگلیوں سے پانی کے فواروں کا جاری ہو جانا بہت عجیب و غریب ہے۔ اس معجزہ پر تفصیلی بحث کے لیے ہماری کتاب جامع الصفات کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا ۳۔ علماء نے فرمایا سب پانیوں سے افضل "ماء زمزم" ہے۔ شب معراج اسی پانی سے حضور اقدس کے قلب اقدس کو غسل دیا گیا۔ بعض نے آب کوثر کو افضل قرار دیا۔ لیکن حق یہ ہے کہ سب پانیوں سے افضل و برزدہ پانی ہے جو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک انگلیوں سے بہا، کیونکہ یہ پانی حضور کا جز ہے، حضور نے بھی اس کو طہور مبارک فرمایا۔ (بخاری) سہ

پنجۂ مہر عرب ہے جس سے دریا بہہ گئے
چشمۂ خورشید میں تو نام کو بھی نم نہیں

حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ وضوء کے لیے پانی کی تلاش اس وقت واجب ہے۔ جب کہ نماز کا وقت آجائے ۲۔ نماز اپنے وقت پر واجب ہوتی ہے ۳۔ نماز کا وقت آنے سے پیشتر وضوء کے لیے پانی تلاش کر لینا مستحب ہے ۴۔ اس حدیث سے ان ملاحدہ کا رد ہو گیا جو معجزات کے منکر ہیں۔ حضور کی انگلیوں سے پانی کا نکلنا

حضور کا معجزہ ہے جس کو ثقہ افراد کی جماعت کثیر نے نقل کیا۔ ۴۔ حضور کی انگلیوں سے بہا ہوا پانی متبرک و معظم تھا۔ مگر اس سے صحابہ نے وضو کیا جس سے زمزم کے پانی سے وضوء و غسل کا جواز ثابت ہوا۔ نیز زمزم کے پانی سے وضوء و غسل کے جائز ہونے کے متعلق صریح حدیث بھی مل جاتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ فَدَعَا بِسَجْلٍ مِّنْ مَاءِ زَمْزَمَ فَشَرِبَ مِنْهُ وَتَوَضَّأَ (مسند احمد بن حنبل) نیل الاوطار ج ۱ صـ۱۸) حضور علیہ السلام نے ایک ڈول زمزم کے پانی کا منگایا۔ آپ نے اس سے کچھ پانی نوش فرمایا اور وضو بھی کیا۔

بَابُ الْمَاءِ الَّذِیْ یُغْسَلُ بِهٖ شَعَرُ الْاِنْسَانِ

باب جس پانی سے آدمی کے بال دھوئے جائیں اور حضرت

وَکَانَ عَطَاءٌ لَّا یَرٰی بِهٖ بَاْسًا اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْهَا الْخُیُوْطُ وَالْحِبَالُ وَسُؤْرِ الْکِلَابِ وَمَمَرِّهَا فِی الْمَسْجِدِ (بخاری)

عطاء کا قول ہے کہ آدمی کے بال کی ڈوریاں یا رسّیاں بنانے، کتے کے جھوٹے اور ان کے مسجد میں آنے جانے میں حرج نہیں۔

فوائد و مسائل بعض شارحین نے لکھا ہے کہ امام بخاری نے اس عنوان کو قائم کر کے ان لوگوں کے اس خیال کی تردید کی ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ آدمی کے بال جب اس کے جسم سے جدا ہو جائیں تو وہ نجس ہیں اور پانی میں گر جائیں تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت عطار کے قول سے استدلال کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اگر آدمی کے بال نجس ہوتے تو اس سے ڈوری و رسی بنانا جائز نہ ہوتا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ آدمی کے بالوں کو جب کہ وہ جسم سے جدا ہو جائیں نجس قرار دیتے ہیں لیکن علامہ عینی نے لکھا ہے کہ امام شافعی نے اپنے اس قول سے رجوع فرمالیا تھا (عینی ج ۲ صـ۳۷) بہرحال احادیث سے صاف صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کے بال پاک ہیں البتہ حضرت عطار کا کہنا ہے کہ آدمی کے بال کی رسی وغیرہ بنانا جائز ہے یہ درست نہیں کیونکہ آدمی مکرم و محترم ہستی ہے۔ اللہ عز و جل نے لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ فرمایا۔ لہٰذا آدمی کے کسی جز سے بعینہٖ نفع اٹھانا جائز نہیں ہے لہٰذا بال کا پاک ہونا حق ہے۔ مگر بنی آدم کے اجزاء کو کام میں لانا، اس کے بالوں کا تیل نکالنا یا ہڈی وغیرہ کی کوئی چیز بنانا بوجہ کرامت و بزرگی انسان کے ناجائز ہے۔ احناف کا یہی مسلک ہے۔ خود امام بخاری نے حضرت عطار کے مذکورہ بالا قول سے صرف آدمی کے بالوں کے پاک ہونے کا استدلال کیا ہے لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ امام بخاری کے نزدیک بنی آدم کے اجزاء کا استعمال جائز ہے۔ فافہم۔

قَالَ الزُّهْرِیُّ اِذَا وَلَغَ الْکَلْبُ فِیْ اِنَاءٍ لَیْسَ لَهٗ وَضُوْءٌ غَیْرُهٗ یَتَوَضَّأُ بِهٖ (بخاری)
قَالَ سُفْیَانُ هٰذَا الْفِقْهُ بِعَیْنِهٖ لِقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَیَمَّمُوْا هٰذَا مَاءٌ وَفِی النَّفْسِ مِنْهُ شَیْءٌ یَتَوَضَّأُ بِهٖ

اور زہری نے کہا ہے کہ جب کتا برتن میں منہ ڈال دے اور اس کے سوا پانی نہ ہو تو اسی پانی سے وضو کرے۔ اور سفیان نے کہا قرآن سے بھی یہی نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب تم پانی نہ پاؤ اور کتے کا جھوٹا آخر پانی ہے لیکن اس کے متعلق تردد یہ ہے کہ ممکن ہے کتے کا

وَيَتَيَمَّمُ | جو جھوٹا نجس ہو اس لیے وضو اور تیمم دونوں کرے۔

خوب یاد رکھیے کہ زہری اور سفیان کے ان مذکورہ بالا اقوال کے نقل کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امام بخاری کتے کے جوٹھے کو پاک قرار دیتے ہیں کیونکہ انھوں نے عنوان میں کوئی لفظ ایسا نہیں لکھا جس سے کتے کے جوٹھے کی طہارت ثابت ہو بلکہ اس باب کے ماتحت انھوں نے جو حدیثیں درج کی ہیں ان سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ کتے کا جوٹھا اغلظ النجاسات سے ہے نیز اثر زہری کی نظیر وہ مسئلہ ہے کہ جب نماز پڑھنے والا پاک کپڑا نہ پائے اور صرف ناپاک کپڑا اس کے پاس ہو تو کیا اس کو ننگے نماز پڑھنا چاہیے؟ ظاہر ہے اس مسئلہ سے ناپاک کپڑے کی طہارۃ ثابت نہیں ہوتی۔ یہی حال قول زہری کا ہے۔ اسی طرح حضرت سفیان کے اثر کی نظیر نبیذ تمر ہے کہ اس کے متعلق وضو و تیمم کا حکم ہے بلکہ حضرت سفیان کے لفظ "فی النفس" الخ اس امر کی دلیل ہیں کہ ان کے نزدیک بھی کتے کا جوٹھا پاک نہیں ہے۔

۱۶۹۔ عَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَ قَالَ قُلْتُ لِعُبَيْدَةَ عِنْدَنَا مِنْ شَعَرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصَبْنَاهُ مِنْ قِبَلِ اَنَسٍ اَوْ مِنْ قِبَلِ اَهْلِ اَنَسٍ فَقَالَ لَاَنْ تَكُوْنَ عِنْدِىْ شَعْرَةٌ مِّنْهُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا

حضرت ابن سیرین کا بیان ہے انھوں نے عبیدہ سے کہا میرے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال ہیں جو ہمیں حضرت انس یا ان کے گھر والوں کی وساطت سے ملے ہیں۔ عبیدہ نے کہا اگر ان میں سے ایک بال بھی میرے پاس ہو تو مجھے وہ دنیا اور جو دنیا میں ہے سب سے زیادہ محبوب ہے۔

۱۷۰۔ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا حَلَقَ رَاْسَهٗ كَانَ اَبُوْ طَلْحَةَ اَوَّلَ مَنْ اَخَذَ مِنْ شَعْرِهٖ

حضرت انس سے روایت ہے کہ حضور نے جب اپنے سر کے بال اُتروائے تو حضرت ابوطلحہ نے سب سے پہلے حضور کے بال حاصل کیے۔

فوائد و مسائل | حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے ا۔ امام بخاری نے ان دونوں حدیثوں سے انسان کے بالوں کے پاک ہونے کا استدلال فرمایا اور جب بال پاک ہیں تو پھر وہ پانی بھی پاک ہے جس میں بال گر جائیں۔ واضح ہو کہ حضور سید عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کا پاک ہونا قطعی و حتمی بات ہے بلکہ حضور کے تمام فضلاتِ مبارکہ طیب و طاہر ہیں۔ صحابہ کرام حضور کے آثارِ شریفہ، حضور کے موئے مبارک اور حضور کے پہنے ہوئے کپڑوں کو معظم و متبرک سمجھتے تھے اور ان سے برکت حاصل کرتے تھے۔ حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حضور کا جبہ مبارک تھا۔ جس کے غسالہ کو وہ بیماروں کو پلاتی تھیں اور شفا ہوتی تھی (مسلم شریف) حضرت خالد بن ولید اپنی ٹوپی میں حضور کے بال مبارک کو بطور تبرک رکھتے تھے خود ہی فرماتے کہ ہر معرکہ میں فتح و نصرت مجھے انھیں مقدس بالوں کی برکت سے حاصل ہوئی ہے۔

حضرت علامہ بدرالدین عینی شارح بخاری نے ان لوگوں کی نہایت سخت انداز میں تردید کی جو حضور کے موئے مبارک اور فضلاتِ طیبہ کے عدم طہارۃ کا قول کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ حضور علیہ السلام کو اپنے

قیاس کرنے والے اور آپ کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ کرنیوالے جاہل وغبی ہیں۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے حضور کے ذات مبارکہ کے طیب وطاہر ہونے کے ثبوت میں احادیث ذیل ذکر کی ہیں۔ بزار، طبرانی، حاکم و بیہقی و ابونعیم نے روایت کیا کہ ابن زبیر نے حضور کے پچھنے لگنے سے جو خون نکلا تھا، پیا تھا۔ حضرت ام ایمن نے حضور کا بول مبارک پیا تھا۔ (دارقطنی، طبرانی وحاکم) حضرت سلمیٰ ام رافع نے حضور کے غسل کا پانی پیا۔ حضور نے فرمایا۔ اللہ نے تیرے بدن پر آتش دوزخ حرام کردی (عینی ج ۱ ص ۷۷۰)

صحابہ کرام کا حضور کے آثار شریفہ سے برکت حاصل کرنا

بخاری شریف میں ہے کہ جب حضور علیہ السلام وضو فرماتے، تو حضور کے آب وضو پر صحابہ کرام والہانہ دوڑتے۔ قریب ہے کہ آپس میں کٹ مریں۔ حضور جب لعاب دہن ڈالتے یا کھنکھارتے صحابہ اسے دونوں میں سے اپنے بدنوں اور چہروں پر ملتے ۲۔ حضور نے ایک پیالہ پانی میں اپنے ہاتھ اور چہرہ مبارک کو دھویا، اس میں کلی کی، حضرت ابوموسیٰ و بلال کو فرمایا اس کو پی لو اور اپنے چہرے پر ڈال لو ۳۔ صائب ابن یزید کہتے ہیں۔ میں بیمار تھا میری خالہ مجھے بحضور نبوی لے کر آئیں۔ میرے مرض کا ذکر کیا۔ حضور نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا، برکت کی دعا دی۔ پھر آپ نے وضو کیا میں نے آپ کے وضو کا پانی پیا۔ مجھے اس سے اسی وقت شفا ہوگئی اور میں نے حضور کی اقتدار میں نماز پڑھی۔ نیل الاوطار میں علامہ شوکانی نے اس مضمون کی حدیث ذکر کرکے یہ لکھا ہے کہ

وقد استدل الجمہور بصبہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لوضوئہ علی جابر وتقریرہ الصحابۃ علی التبرک بوضوئہ

جمہور نے اس سے حضور علیہ السلام کے وضور کے پانی ڈالنے سے استدلال کیا ہے اور صحابہ اسے تبرک جانتے تھے (نیل الاوطار جلد ۱ ص ۱۹)

حضرت ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حضور کے موئے مبارک تھے جنہیں وہ عطر میں ڈالے رکھتی تھیں (مسند احمد ابن حنبل) حضرت ام سلیم نے حضور کے پسینہ مبارک کو ایک شیشی میں محفوظ کرلیا تھا اور وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد خوشبو میں اس کو ملا دیا جائے (بخاری) صحابہ کرام نے حضور کے ناخن کے ٹکڑے بطور تبرک محفوظ کر رکھے تھے (مسند احمد بن حنبل) حضرت ام سلمہ نے چاندی کی جلجل میں حضور کے موئے مبارک رکھ چھوڑے تھے۔ جب کوئی بیمار ہوتا تو اس کا غسالہ مریض کو دیا جاتا اور وہ شفا پاتا (بخاری) یہ تمام حدیثیں نیل الاوطار میں شوکانی نے بھی ذکر کی ہیں۔ جن سے آفتاب نیمروز کی طرح واضح ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آثار شریفہ، نشان قدم، موئے مبارک اور تمام ان اشیاء کا جن کو آپ سے نسبت ہوتی ہے ادب واحترام کرنا واجب ہے اور ان کو حفاظت سے رکھنا، ان سے برکت چاہنا، انھیں متبرک سمجھنا، ان سے شفا حاصل کرنا جائز ہے اور سنت صحابہ کرام ہے۔ شفاء میں علامہ قاضی نے لکھا کہ حضرت عبداللہ ابن عمر مسجد نبوی میں حضور کے منبر مبارک کے اس مقام پر جہاں حضور جلوہ فرما ہوتے تھے ہاتھ لگاتے اور پھر اس کو بوسہ دیتے تھے۔ علامہ خفاجی علیہ الرحمۃ نے نسیم الریاض میں اس کے تحت لکھا ہے کہ:۔

ہذا یدل علی جواز التبرک بالانبیاء

کہ صحابہ کرام و حضرت عبداللہ بن عمر کے اس فعل سے

وَالصَّالِحِيْنَ وَ اٰثَارِهِمْ وَ مَا يَتَعَلَّقُ بِهِمْ | انبیاء کرام و اولیاءِ عظام کے آثارِ شریفہ سے اور ان اشیاء سے جن کو ان سے نسبت ہوگئی ہے برکت حاصل کرنے کا جواز نکلتا ہے۔

اور بڑی حیرت کی بات ہے کہ اس حدیث زیرِ بحث کی تشریح کرتے ہوئے مشہور غیر مقلد مولوی وحید الزمان نے لکھا کہ اس باب کی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے موئے مبارک ہمیشہ صحابہ کرام لیتے رہے ہیں حضور نے دو بار سارے سر کے بال اُتروائے اور سارے بال تقسیم فرمائے اور یہ بھی ثابت ہے کہ انبیاء کرام کے جسموں کو زمین نہیں کھاتی تو بال بھی آپ کے زمین نہیں کھا سکتی۔ لہٰذا اس زمانہ میں جن بالوں کے متعلق ہمیں بطور تواتر یا شہرت یہ معلوم ہو کہ وہ حضور کے ہیں ان کی تکذیب نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ہم پر ایسے بالوں کی عزت و حرمت لازم ہے، اگرچہ اس میں شبہ بھی ہو پھر بھی ان کی تکریم و تعظیم ضروری ہے کیونکہ اگر وہ بال واقع میں آپ کا ہے تو اس کی تعظیم کرنے سے ہم گنہگار نہ ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہماری نیت کو جانتا ہے کہ ہم نے اس کا ادب اس وجہ سے کیا ہے کہ اس کے متعلق یہ کہا گیا ہے یہ حضور کے موئے مبارک ہیں اور تعجب ہے ان لوگوں پر جو اتباعِ سُنّت کا دعویٰ کرتے ہیں اور پھر خواہ مخواہ اس قسم کے آثارِ شریفہ (یعنی نشانِ قدم و موئے مبارک وغیرہ) کی تکذیب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غلو اور تعصب سے بچائے۔ باوجود علم کے بعض لوگوں نے ایسے کلمات منہ سے نکالے ہیں کہ ان کی نوبت کفر تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ غافل ہیں اور نہیں جانتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے فضلات یہاں تک کہ آپ کا بول و براز بھی اور آپ کے جسم مبارک کی ہر چیز طیب و طاہر، مقدس و محترم ہے اور اس پر تمام علمائے حدیث کا اتفاق ہے اور حق بھی یہی ہے کہ حضور کے بالِ مبارک کیا آپ کی جوتی کی خاک بھی مومن کے لیے تو دنیا و ما فیہا سے افضل و برتر ہے۔ اللہ تعالیٰ ادب کی توفیق عطا فرمائے ؎

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ   نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(تسہیل القاری ج ۱ ص ۴۸۲)

بَابٌ إِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِي الْإِنَاءِ

باب کتے کا برتن سے پانی پینے کا بیان

۱۷۱۔ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِىْ اِنَاءِ اَحَدِكُمْ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعًا (بخاری)

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب کتا برتن سے پی لے تو اس برتن کو سات مرتبہ دھو ڈالو۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابو داؤد نے کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا ہے۔ بعض شارحین مثلاً ابن بطال نے کہا کہ اس حدیث سے امام بخاری کا مقصود یہ بتانا ہے کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے۔

تقریرِ مسئلہ یہ ہے کہ کتا جس برتن سے پانی پی لے اس کو سات مرتبہ دھونے کا حکم دیا حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ سؤر کتے سے زیادہ نجس ہے۔ اسی طرح آدمی کا پاخانہ و پیشاب بھی نجس ہے اور ہر قسم کی نجاست کو زائل کرنے کے لیے ایک بار حد درجہ تین بار دھونا کافی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سات بار دھونے کا حکم اس وجہ سے نہیں ہے کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے بلکہ کسی

اور مصلحت کی بنا پر ہو۔ یعنی بعض کتے زہریلے ہوتے ہیں تو احتمال ہے کہ برتن میں اس کے زہر کا اثر رہ جائے اس لیے مبالغۃً سات بار دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن ابن بطال کا ایسا کہنا متعدد وجوہ سے باطل ہے۔

اوّل اس لیے کہ کسی چیز کی طہارۃ کا جو حکم دیا جاتا ہے اس کی وجہ یا حدث ہوتا ہے یا نجاست اور یہاں حدث ہو نہیں سکتا اس لیے نجاست متعین ہے یعنی دھونے کا حکم اس وجہ سے دیا گیا کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے۔

دوم اس لیے کہ سات بار دھونے کے حکم سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ نجس نہیں ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ تین بار رفع نجاست کے لیے ہو اور چار بار رفع زہر کے لیے ہو۔ سوم مسلم کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں :۔

طھور اناء احدکم اذا ولغ الکلب ان یغسلہ سبع مرات (مسلم و احمد بن حنبل) | اس برتن کے پاک کرنے کا طریقہ جس میں کتا منہ ڈال دے یہ ہے کہ اس کو سات بار دھویا جائے۔

اس حدیث میں طھور کا لفظ اس امر کی وضاحت کر رہا ہے کہ دھونے کی علت زہر نہیں ہے بلکہ نجاست ہے چنانچہ اس کی تائید مزید" اثر ابن عباس سے ہوتی ہے"۔ جس کو محمد بن نصر المروزی نے باسناد صحیح روایت کیا ہے کہ کتے کے منہ ڈالے برتن کو دھونے کی علت نجاست ہے اور کتا نجس ہے اور صحابہ سے اس کے خلاف پر ہمیں کچھ نہیں ملتا۔ جس سے ثابت ہوا کہ کتا نجس ہے اور اس کا جوٹھا بھی نجس ہے۔

رہا ابن بطال کا یہ فرمانا کہ ان چار حدیثوں سے امام بخاری کی غرض کتے کے جوٹھے کی طہارۃ ثابت کرتی ہے۔ اس میں بھی نظر ہے کیونکہ ہوسکتا ہے امام بخاری کا مقصود صرف لوگوں کے مذاہب کا بیان کرنا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے "سؤر الکلاب طاہر" کے الفاظ کے ساتھ عنوان قائم نہیں کیا۔ فافہم

سات بار دھونے کی بحث

واضح رہے کہ اس باب میں متعدد حدیثیں آئی ہیں ا۔ حدیث ابوہریرہ میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب کتا برتن میں منہ ڈال دے تو

فلیرقہ ثم لیغسلہ سبع مرات (مسلم و نسائی) | اس پانی کو پھینک دو اور برتن کو سات بار دھو ڈالو

۲۔ حدیث حضرت عبد اللہ بن مغفل میں سات بار دھونے کے بعد وعفروہ الثامنہ بالتراب کے لفظ بھی آئے ہیں یعنی آٹھویں بار مٹی سے مانجا جائے۔

اس مضمون کی احادیث سے حضرت ابن عباس وعروہ بن الزبیر و محمد بن سیرین وطاؤس وعمرو بن دینار اوزاعی و امام مالک وشافعی و احمد بن حنبل والوثور و ابو عبید داؤد رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ استدلال کرتے ہیں کہ جس برتن میں کتا منہ ڈالدے اس کو سات بار دھونا واجب ہے۔

احناف وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ لعاب کلب اور دیگر نجاسات میں کچھ فرق نہیں ہے۔ جب پاخانہ وپیشاب کے سات بار دھونا واجب نہیں ہے تو کتے کے جوٹھے کے لیے سات بار کے وجوب کا حکم کیسے کیا جا سکتا ہے۔ نجاست غلیظہ کے لیے جب تین بار دھونا کافی ہے تو جو نجاستیں اس سے کم درجہ کی ہیں وہ تو بطریق اولیٰ تین بار دھونے سے پاک ہو جانی چاہئیں۔ نیز اس سلسلہ میں حنفیہ صرف قیاس وعقل سے کام لے کر یہ رائے قائم نہیں کر رہے ہے بلکہ مرفوع حدیثیں

بھی ان کے مسلک کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ جناب ابوہریرہ جن سے سات بار دھونا مروی ہے انہیں سے تین بار دھونا بھی (مرفوعاً و موقوفاً) مروی ہے اور جمع بین الحدیثین کا یہی طریقہ نظر آتا ہے کہ سات بار دھونے کے حکم کو مبالغۃً قرار دیا جائے اور تین بار دھونے سے طہارت کا حصول مانا جائے۔ چنانچہ دارقطنی نے اسنادِ صحیح کے ساتھ روایت کیا کہ روایت کیا کہ جناب ابوہریرہ نے فرمایا کہ جب کتّا برتن میں منہ ڈال دے تو۔

فاهرقه ثم اغسله ثلاث مرات | اس کو پھینک دو اور برتن کو تین بار دھولو۔

اور ابن عدی نے کامل میں جو روایت نقل کی اس کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت ابوہریرہ نے کہا:

قَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا وَلَغَ الْكَلْبُ فِي إِنَاءِ احدكم فليهرقه وليغسله ثلاث مرات | کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کتّا برتن میں منہ ڈال دے تو اس چیز کو پھینک دو اور برتن کو تین بار دھو ڈالو (عینی ج ۱ ص ۷۸۴)

اس مرفوع حدیث سے یہ واضح ہوگیا کہ سات بار دھونا مستحب ہے کیونکہ اگر سات بار دھونا واجب ہوتا تو پھر تین بار دھونے کو کافی نہ قرار دیا جاتا۔ امام طحاوی نے فرمایا کہ جناب ابوہریرہ کے متعلق یہ ثابت ہے کہ آپ نے تین بار دھونے کا فتویٰ دیا۔ ظاہر ہے کہ سات بار دھونے والی حدیث کے راوی بھی حضرت ابوہریرہ ہیں۔ جب تین بار دھونے کا حکم دے رہے ہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سات بار دھونے کا حکم منسوخ ہے جبھی تو جناب ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تین بار دھونے کا فتویٰ دیا۔

بہر حال یہ مسئلہ حنفیہ و ائمہ ثلاثہ میں مختلف فیہ ہے۔ حنفیہ تین بار دھونے کو کافی قرار دیتے ہیں اور سات بار دھونے کو مستحب اور مالک و شافعی و احمد بن حنبل سات بار دھونے کو واجب قرار دیتے ہیں۔ ہر فریق کی رائے سے متعلق تفصیلی بحث کے لیے طحاوی، نیل الاوطار جلد ۱ ص ۳۵ و عینی جلد اوّل ص ۷۸۴ دیکھنی چاہئے۔ یہاں ہم نے بقدر ضرورت کلام کیا ہے۔

مسائلِ حدیث

جمہور علماء نے حدیثِ زیر بحث سے کتے کے نجس ہونے کا استدلال کیا ہے کیونکہ جب اس کا لعابِ دہن نجس ہے جو منہ میں پیدا ہوتا ہے تو اس کا باقی بدن بطریقِ اولیٰ نجس قرار پائے گا۔ اسی طرح دھونے کی علت بھی نجاست ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس چیز میں کتا منہ ڈال دے اس کے پھینکنے کا حکم دیا گیا۔ البتہ امام مالک کی طرف یہ بات منسوب ہے کہ ان کے نزدیک کتا پاک ہے اور ان کے اس قول کی دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ کتے کے ذریعے جو شکار کیا جاتا ہے وہ حلال ہے شکار کرنے سے جانور پر کتے کا لعابِ دہن ضرور لگتا ہے اور ایسے شکار کے متعلق دھونے کا حکم نہیں دیا گیا لیکن یہ بات بہت بودی ہے کیونکہ کتے کے پکڑے ہوئے شکار کی اباحت سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو شکار نجس ہو جائے اس کو پاک کر کے استعمال کرنا ضروری نہیں ہے۔ دھونے کا حکم خصوصی طور پر نہ دینے کی وجہ یہی ہے کہ ہر نجس چیز کو پاک کر کے استعمال کرنے کا حکم پہلے ہی سے شریعت میں معروف و مشہور ہے۔ فافہم

۱۷۲ - عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَجُلًا رَاٰى كَلْبًا يَاكُلُ | حضرت ابوہریرہ سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک آدمی نے ایک کتے کو دیکھا جو پیاس کی وجہ سے

الثَّرٰی مِنَ الْعَطَشِ فَاَخَذَ الرَّجُلُ خُفَّہٗ فَجَعَلَ یَغْرِفُ لَہٗ بِہٖ حَتّٰی اَرْوَاہُ فَشَکَرَ اللّٰہُ لَہٗ فَاَدْخَلَہُ الْجَنَّۃَ (بخاری)

گیلی مٹی چاٹ رہا تھا۔ تو اس شخص نے اپنا موزہ اُتارا اور پانی بھر بھر کر اس کو پلایا یہاں تک کہ وہ سیر ہو گیا اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ فعل پسند آیا اور اس کو جنت میں داخل فرمایا۔

فوائد و مسائل امام بخاری نے اس حدیث کو شرب مظالم ادب ذکر بنی اسرائیل میں بھی ذکر کیا ہے مسلم نے حیوان میں اور ابوداؤد نے کتاب الجہاد میں ذکر فرمایا ۲۔ ثریٰ اس مٹی کو کہتے ہیں جس میں تری ہو۔ شکر منعم کی تعظیم وثنا کو کہتے ہیں۔ فاثنی اللہ کے معنیٰ اجر و جزا کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اس شخص کا یہ فعل پسند آگیا اور اس کی جزا میں اس کو جنت میں داخل کر دیا۔ اس حدیث میں مخلوقِ خدا پر رحم و رافت کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے اور یہ کہ اللہ عزوجل فاعلِ مختار ہے وہ چاہے تو خلوص کے ساتھ ایک معمولی سی نیکی کرنے والے کو نوازے اس کے دربار میں عمل کے وزن و مقدار کو نہیں دیکھا جاتا۔ اسی لیے خلوصِ نیت کے ساتھ کیا ہوا ایک معمولی سا عمل خیر کثیر کا باعث ہو جاتا ہے۔ حضور سرورِ عالم وسلم نے اسی نکتہ کو یوں بیان فرمایا کہ "تمہارا مسلمان بھائی کو دیکھ کر مسکرا دینا بھی عبادت ہے"۔ اور قرآن نے اعلان کیا:۔

وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ

اللہ تعالیٰ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ واسع بھی ہے اور علیم بھی

جس کا حاصل یہی ہے کہ جسقدر خلوص اور جتنے گہرے جذبے کے ساتھ نیک کام کیا جائیگا اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اجر زیادہ ہوگا۔ قطع نظر اس بات کے کہ وہ کام فی نفسہٖ مقدار میں بڑا ہے یا چھوٹا ۲۔ اس حدیث سے کتے کے لعاب کی طہارت کا قول کیا گیا ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ اس شخص نے موزہ سے کتے کو پانی پلایا اور ضرور اس کا لعاب موزہ کو لگا ہوگا لیکن ظاہر ہے کہ موزہ پر لعاب لگنے سے کتے کے پاک ہونے کا استدلال کرنا بہت ہی عجیب و غریب ہے۔ ثانیاً حدیث میں یہ تصریح نہیں ہے کہ اس شخص نے موزہ سے کتے کو پانی پلایا۔ ہوسکتا ہے کہ موزے کے ذریعے پانی لے کر کسی دوسری جگہ ڈال دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے بعد میں موزہ کو دھو لیا ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ وہ شخص جس کا حال اس حدیث میں بیان ہوا یہ کس وقت کا واقعہ ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ یہ حضور کے زمانہ بعثت کا واقعہ نہیں ہے چنانچہ خود جناب ابوہریرہ سے روایت ہے کہ اَنَّہٗ کَانَ فِیْ شَرْعِ مَنْ قَبْلَنَا (عینی ج ا ص۴۸۷) لہٰذا کتے کی طہارت پر اس سے دلیل لینا درست نہیں ۳۔ اس حدیث سے علماء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ انسان پر اپنے مملوکہ و مقبوضہ جانوروں کا نفقہ واجب ہے۔

۱۷۳۔ قَالَ کَانَتِ الْکِلَابُ تُقْبِلُ وَ تُدْبِرُ فِی الْمَسْجِدِ فِیْ زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمْ یَکُوْنُوْا

حمزہ بن عبداللہ نے اپنے والد عبداللہ بن عمر سے روایت کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد میں کتے آتے جاتے تھے۔ پھر وہاں کسی جگہ

يَرُشُّوْنَ شَيْئًا مِنْ ذَالِكَ | پر پانی نہیں چھڑکتے تھے۔

فوائد اس تعلیق کو ابوداؤد نے بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں یہ ہے کہ ابن عمرؓ نے فرمایا میں مسجد نبوی میں رات گزارتا تھا تو (دروازہ نہ ہونے کی وجہ سے) کتے مسجد میں آتے جاتے تھے اور پیشاب کرتے۔ اس تعلیق سے بھی کتے اور اس کے لعاب کی طہارت کا قول کیا جاتا ہے۔ مگر یہ بھی درست نہیں کیونکہ محض کتے کے آنے جانے سے اس کی طہارت ثابت نہیں ہوتی۔ رہی یہ بات کہ کتے پیشاب کر دیتے تھے اور صحابہ کرام زمین نہیں دھوتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اول تو مقام نجاست متعین نہ ہوتا تھا دوسرے یہ کہ زمین سُوکھ جانے سے پاک ہو جاتی ہے اس لیے پانی نہیں بہاتے تھے۔ احناف نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ جب زمین کو نجاست پہنچے اور سورج یا ہوا سے سُوکھ جائے اور اثرِ نجاست زائل ہو جائے تو اس زمین پر نماز پڑھی جا سکتی ہے یعنی نماز کے حق میں وہ زمین پاک قرار دی جائے گی۔

۱۷۴ - عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ الْمُعَلَّمَ فَقَتَلَ فَكُلْ وَإِذَا أَكَلَ فَلَا تَأْكُلْ فَإِنَّمَا أَمْسَكَ عَلَى نَفْسِهِ قُلْتُ أُرْسِلُ كَلْبِي فَأَجِدُ مَعَهُ كَلْبًا آخَرَ قَالَ فَلَا تَأْكُلْ فَإِنَّمَا سَمَّيْتَ عَلَى كَلْبِكَ وَلَمْ تُسَمِّ عَلَى كَلْبٍ آخَرَ (بخاری)

عدی بن عدی حاتم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (کتے کے شکار) کے متعلق سوال کیا۔ حضور نے فرمایا جب تو اپنا سدھایا ہوا کتا چھوڑے اور وہ شکار مارے تو کھالے اور اگر کتا اس جانور سے کھالے تو اس شکار کو مت کھا کیونکہ کتے نے یہ جانور اپنے لیے پکڑا (تیرے لیے نہیں) میں نے عرض کی کبھی میں اپنا کتا چھوڑتا ہوں اس کے ساتھ دوسرا کتا بھی پاتا ہوں۔ فرمایا اس شکار کو نہ کھا کیونکہ تو نے اپنے شکاری کتے پر بسم اللہ پڑھی ہے دوسرے پر تو نہیں پڑھی۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے بیوع، صید ذبائح میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم، ابوداؤد و ابن ماجہ نے کتاب الصید میں ذکر کیا۔ اس حدیث سے بھی کتے اور اس کے لعاب کی طہارت کا قول کیا گیا اور انھوں نے کہا حضور نے شکاری کتے کے ذریعے کیے ہوئے شکار کو کھانے کا حکم دیا اور یہ قید نہیں لگائی کہ جانور کے جس حصہ پر کتے نے زخم لگایا ہے اس کو دھو کر کھایا جائے اس سے کتے کے لعاب کا پاک ہونا ثابت ہوا۔

لیکن ظاہر ہے کہ محض مبہمات سے تمسک کرنا اور احادیثِ صریحہ کو نظر انداز کر کے مذکورہ بالا رائے قائم کرنا نہایت ہی ضعیف دلیل ہے۔ کیونکہ حدیث زیرِ بحث میں دراصل کتے کے مارے ہوئے شکار کی ناپاکی کو بیان کرنا مقصود ہی نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ جب بسم اللہ پڑھ کر کتے کو چھوڑا گیا اور اس نے شکار کیا تو کتے کا جانور کو قتل کرنا ہی اس کو ذبح کرنے کے مترادف ہے لہٰذا اس کو کھایا جائے۔

اور اگر اس دلیل کو مان لیا جائے کہ چونکہ حضور نے اس شکار کو دھو کر کھانے کی ہدایت نہیں دی اس لیے کتے کے لعابِ دہن کی طہارت ثابت ہو گئی۔ تو پھر یہ بھی کہنا پڑے گا کہ حضور نے چونکہ جانور کے جو زخم آیا ہے اور اس سے خون بہا اس کے دھونے اور جانور کے پیٹ میں جو نجاست ہے اس کو صاف کرنے کا حکم بھی نہیں دیا ہے اس لیے جانور کی

او جھڑی کی آلائش وغیرہ اور زخم کا دمِ مسفوح بھی پاک ہے؟

دراصل یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ شکاری کتے کے مارے ہوئے جانور کے دھونے کا ذکر حضور نے اس لیے نہیں فرمایا کہ اس کو دھونے اور صاف کرنے کی ہدایت پہلے ہی سے شارع کی جانب سے مقرر و متعین ہے اور یہاں مسئلہ صرف شکاری کتے کے کیے ہوئے شکار کا بتانا مقصود تھا۔ اس لیے صرف یہ بتانے پر اکتفا فرمایا کہ شکاری کتے نے جو شکار کیا ہے وہ حلال ہے۔

شکاری کُتّے کے شکار کے مسائل و احکام

حدیث زیر بحث مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے۔

۱۔ کلبِ معلّم اس کتے کو کہتے ہیں جو شکار کے لیے سدھا لیا جاتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ عام درندوں کی طرح شکار پھاڑ نہیں کھاتا بلکہ اپنے مالک کے لیے پکڑ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے عام درندوں کا پھاڑا ہوا جانور حرام ہے اور سدھائے ہوئے کتے کا شکار حلال ہے ۲۔ پھر چونکہ اس میں کتے کو مطلق رکھا گیا ہے۔ اس لیے کسی بھی قسم و نسل کا کتا ہو، چاہے وہ اسود ہی کیوں نہ ہو۔ جب اس کو سدھا لیا جائے تو اس کا شکار حلال ہے۔ (لیکن امام مالک کے نزدیک کلبِ اسود کا شکار حلال نہیں ہے) ۳۔ حدیث زیر بحث سے واضح ہوتا ہے کہ کتے کے ذریعہ شکار کرنے کے لیے چار شرطوں کا ہونا ضروری ہے۔ اوّل، کتا سدھایا ہوا ہو۔ دوم ارسال یعنی کتے نے خود بخود شکار نہ کیا ہو بلکہ مالک کا اشارہ پاکر اس نے جانور کو پکڑا ہو۔ سوم، یہ کہ بوقتِ ارسال بسم اللہ پڑھ لی ہو۔ چہارم یہ کہ کتے نے شکار کو مالک کے لیے پکڑا ہو اور اس میں سے خود نہ کھایا ہو۔ اگر خود اس نے شکار سے کھا لیا تو شکار حرام ہوگا۔ چنانچہ حدیث کے یہ لفظ اذا اکل فلا تاکل سے یہ بات بالکل صراحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے ۴۔ اگر بھول کر بسم اللہ نہیں پڑھی تو شکار حلال ہے اور قصداً نہیں پڑھی تو حرام ہے ۵۔ اگر سدھائے ہوئے کتے کو چھوڑا اور دوسرا کتا بھی شکار کرنے میں بھی شامل ہوگیا تو شکار حرام ہوگا کیونکہ شکاری نے بسم اللہ اپنے کتے پر پڑھی تھی نہ کہ دوسرے کتے پر ۶۔ یہ ہدایات قرآن پاک کی آیت سے ماخوذ ہیں۔

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّا اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ

اور جو شکاری جانور تم نے سدھا لیے انہیں شکار پر دوڑانے جو علم تمہیں خدا نے دیا اس میں سے انہیں سکھانے تو کھاؤ اس میں سے جو وہ مار کر تمہارے لیے رہنے دے اور اس پر اللہ کا نام لو۔

یہ آیت ابن حاتم اور حضرت زید بن مہلہل کے حق میں نازل ہوئی جن کا نام حضور نے زید الخیر رکھا تھا۔ ان دونوں صاحبوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ہم لوگ کتے اور باز کے ذریعہ شکار کرتے ہیں۔ کیا ہمارے لیے حلال ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

الف۔ جو شکاری جانور خواہ وہ درندوں میں سے ہوں جیسے کتا اور چیتا یا شکاری پرندوں سے ہوں جیسے باز، شاہین، شکرہ وغیرہ۔ جب ان کو اس طرح سدھا لیا جائے کہ جو شکار کریں اس میں سے نہ کھائیں اور جب شکاری ان کو چھوڑے تب شکار پر جائیں اور جب واپس بلائے واپس آجائیں۔ ایسے شکاری جانور کو معلّم کہتے ہیں۔ آیت سے جو مستفاد ہوتا

ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص نے کتا یا شکرہ وغیرہ کوئی شکاری جانور شکار پر چھوڑا تو اس کا شکار چند شرطوں سے حلال ہے۔
ا۔ شکاری جانور مسلمان کا ہو اور سدھایا ہوا ہو ۲۔ اس نے شکار کو زخم لگا کر مارا ہو ۳۔ شکاری جانور بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر چھوڑا گیا ہو ۴۔ شکار اگر زندہ ملے تو اس کو بسم اللہ کہہ کر ذبح کر لیا جائے ۵۔ اگر زندہ نہ ملے تو اس کے بغیر ہی حلال ہے کیونکہ بوقت ارسال بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ لیا گیا ہے۔

ب۔ اور مندرجہ ذیل صورتوں میں شکار حرام ہوگا۔ ا۔ اگر شکاری جانور (معلم) سدھایا ہوا نہ ہو ۲۔ یا اس نے شکار کے زخم نہ کیا ہو ۳۔ یا شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر نہ پڑھا ہو ۴۔ یا شکار زندہ ملا ہو اور اس کو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح نہ کیا گیا ہو ۵۔ یا معلّم کے ساتھ غیر معلّم شکار میں شریک ہو گیا ہو ۶۔ یا ایسا شکاری جانور شکار میں شریک ہو گیا ہو جس کو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر نہ چھوڑا گیا ہو ۷۔ یا وہ شکاری جانور کسی مجوسی کافر کا ہو۔ ان سب صورتوں میں شکار حرام ہے۔

ج۔ نیز یہی احکام تیر کے ساتھ شکار کے ہیں یعنی اگر بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر تیر شکار پر چھوڑا اور تیر سے شکار مجروح ہو کر گر پڑا اور مر گیا تو حلال ہے اور اگر مجروح ہو کر بھی زندہ رہا تو پھر اس کو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر دوبارہ ذبح کیا جائیگا اور اگر بوقت ارسال تیر پر بسم اللہ نہیں پڑھی یا تیر نے شکار کو زخم نہیں پہنچایا یا زندہ پانے کے بعد دوبارہ اس کو ذبح نہ کیا تو ان صورتوں میں تیر کا شکار بھی حرام ہوگا نیز بندوق کو تیر پر قیاس نہ کیا جائے بندوق کا شکار بغیر ذبح کے کسی حالت میں حلال نہیں۔

بَابُ مَنْ لَمْ يَرَ الْوُضُوْءَ اِلَّا

باب ان لوگوں کے مسلک کے بیان جو یہ کہتے ہیں کہ وضوء

مِنَ الْمَخْرَجَيْنِ الْقُبُلِ وَالدُّبُرِ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى اَوْجَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ (بخاری)

اسی حدث سے لازم آتا ہے جو دونوں راہوں (آگے اور پیچھے) سے نکلے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یا کوئی تم میں سے پاخانہ سے آئے

فوائد و مسائل

قُبُل آگے کے مقام کو کہتے ہیں اور دُبُر پیچھے کے مقام کو، ان دونوں کو مخرجین سے موسوم کرتے ہیں۔ غائط اس جگہ یا مکان کو کہتے ہیں جو پاخانہ و پیشاب کرنے کے لیے مقرر کر دی جاتی ہے دُبُر پاخانہ کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ احلیل (آلہ تناسل)۔ پیشاب گاہ کے سوراخ کو کہتے ہیں۔ یعنی سوراخ ذکر اور قُبُل و دُبُر کو سبیلین سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ آئندہ بحث میں چونکہ یہ الفاظ استعمال ہوں گے اس لیے ان لفظوں کے معنیٰ کو قارئین خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

وضوء توڑنے والی چیزوں کا بیان

واضح کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ کا مسلک یہ ہے کہ جب کوئی چیز سبیلین قُبُل و دُبُر سے نکلے تو وضوء توڑ دے گی اور اگر سبیلین سے نہ نکلے تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ مثلاً پیشاب آیا، پاخانہ آیا یا کوئی اور چیز قُبُل و دُبُر سے نکلی تو وضو ٹوٹ جائیگا اور اگر اس کے علاوہ جسم کے کسی حصہ سے کوئی چیز نکلے مثلاً خون بہے یا پچھنے لگانے سے خون نکلے یا قے آئے تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ وہ فرماتے ہیں آیت اَوْجَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ کا حاصل یہ ہے کہ صرف قُبُل و دُبُر کی راہوں سے نکلنے والی چیز وضوء کو توڑ دے گی۔ احناف نے کہا یہ تو ہمیں تسلیم ہے کہ قُبُل و دبر کی راہوں سے نکلنے والی چیز ناقضِ وضوء ہے مگر ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ صرف قُبُل و دُبُر

سے نکلنے والی چیز ہی ناقضِ وضوء قرار پائے گی۔ کیونکہ آیت میں حصر نہیں ہے اور آیت زیر بحث پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ طہارت کو زائل کرنے والی اصل چیز نجاست کا نکلنا ہے اور سبیلین وغیر سبیلین کی اس میں کوئی تاثیر نہیں ہے اصل موثر صرف خروجِ نجاست ہے لہٰذا نجاست جس جگہ سے بھی خارج ہوگی وضوء کو توڑ دے گی خواہ وہ قبل و دُبر سے خارج ہو یا جسم کے کسی اور حصہ سے فافہم اور حق یہ ہے کہ اس باب میں احناف کی رائے بہت قوی ہے پس احناف کے نزدیک:۔

۱۔ پاخانہ، پیشاب، ودی، مذی، کیڑا پتھر اور منی بلا شہوت مرد یا عورت کے آگے یا پیچھے کے مقام سے نکلے گی تو وضوء ٹوٹ جائے گا۔ اسی طرح بدن کے کسی حصہ سے خون، پیپ یا زرد پانی نکل کر بہا اور اس کے بہنے میں ایسی جگہ پہنچنے کی صلاحیت تھی۔ جس کا وضوء یا غسل میں دھونا فرض ہے وضوء کو توڑ دے گا اور اگر خون بدن کے کسی حصہ سے صرف چمکا یا اُبھرا اور بہا نہیں جیسے سوئی کی نوک یا چاقو کا کنارہ لگ جانے سے خون اُبھر یا چمک جاتا ہے یا خلال یا مسواک کرنے یا انگلی سے دانت مانجھنے یا دانت سے کوئی چیز کاٹنے پر خون کا اثر محسوس ہوتا ہے یا انگلی، ناک میں ڈالنے سے اس پر خون کی سُرخی آگئی۔ ان سب صورتوں میں خون بہنے کے قابل نہ ہو تو وضوء نہیں ٹوٹے گا۔ اسی طرح اگر خون بہا مگر ایسی جگہ بہہ کر نہیں آیا جس کا وضوء یا غسل میں دھونا فرض ہو۔ مثلاً آنکھ میں دانا تھا وہ ٹوٹ کر آنکھ کے اندر ہی پھیل گیا باہر نہیں نکلا یا کان کے اندر دانا تھا اور اس کا پانی سوراخ سے باہر نہ نکلا یا زخم میں گڑھا پڑ گیا۔ اس میں رطوبت چمکی، اُبھری، ظاہر ہوئی مگر زخم کے اندر ہی اندر رہی تو ان سب صورتوں میں وضو نہیں ٹوٹے گا غرضیکہ امام اعظم علیہ الرحمۃ کے نزدیک خروجِ نجاست ناقضِ وضوء ہے خواہ وہ جسم کے کسی بھی حصہ سے نکل کر بہے (یعنی بہہ کر ایسی جگہ پر پہنچ جائے جس کا وضو اور غسل میں دھونا فرض ہے) چنانچہ امام خطابی نے معالم السنین میں فرمایا کہ اکثر فقہاء کا یہی مسلک ہے کہ خون کا غیر سبیلین سے بہنا ناقضِ وضوء ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا کہ اصحابِ رسول اور تابعین کرام کے نزدیک قے اور نکسیر ناقضِ وضوء ہے اور امام احمد، سفیان ثوری اور ابن المبارک و اسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کا بھی مسلک ہے! اس سے واضح ہو گیا کہ احناف کا مسلک، وہی ہے جو اکثر اصحابِ رسول کریم کا مسلک ہے۔

اولامستم النساء امام شافعی کے نزدیک عورت کو چھونے سے بھی وضوء ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ لمس کے معنیٰ چھونے کے ہیں۔ اسی طرح ذکر کو بلا حائل چھونے سے بھی وضوء ٹوٹ جائے گا۔ وہ کہتے ہیں ذکر کو چھونا بھی عورت کے چھونے کے مثل ہے۔ پس نیند سے وضوء اس لیے ٹوٹ جاتا ہے کہ ہوا نکلنے کا سبب بنتی ہے اور عورت کو چھونے اور ذکر کو چھونے میں مذی نکلنے کا احتمال ہے تو امام شافعی نے لمس کو از روئے نص اور مسِ ذکر کو از روئے حدیث اس کے ساتھ ملحق کرکے ناقضِ وضوء قرار دیا۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ سبیلین سے نکلنے والی چیز ناقضِ وضوء ہے۔ فافہم

حنفیہ یہ کہتے ہیں۔ **اولامستم** لمس کے معنیٰ عورت کو ہاتھ سے چھونے کے نہیں ہیں بلکہ یہ جماع سے کنایہ ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس، علی ابن ابی طالب، ابو موسیٰ اشعری، عبیدۃ السلمانی و عبیدۃ الضبی، عطاء و طاؤس و حسن بصری و شعبی و ثوری، اوزاعی اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہم سب کے نزدیک اس آیت میں لمس سے مراد جماع ہے چنانچہ امام بخاری نے بھی اس کو اختیار کیا اور کتاب التفسیر میں اس کی تصریح بھی کی۔ یعنی آیت کا تعلق وضوء سے نہیں بلکہ جنابت سے ہے۔ یعنی جو شخص جنبی ہو گیا۔ اگر پانی پر قدرت نہ پائے تو تیمم کرے۔ لہٰذا محض عورت کو چھونے یا ذکر کو مس کرنے سے وضوء کے ٹوٹ

جانے کا آیۃ زیر بحث سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

وَقَالَ عَطَاءٌ فِيمَنْ يَخْرُجُ مِنْ دُبُرِهِ الدُّودُ أَوْ مِنْ ذَكَرِهِ نَحْوُ الْقَمْلَةِ يُعِيدُ الْوُضُوءَ

اور عطاء نے کہا جس کی قبل یا دبر سے کوئی کیڑا وغیرہ مثل جوں کے نکلے وہ وضوء دوبارہ کرے

یعنی اگر قبل و دُبر سے کیڑا یا جانور وغیرہ نکلے تو یہ ناقضِ وضوء ہے۔ حضرت امام شافعی، امام احمد اسحٰق ابی ثور، سفیان ثوری، اوزاعی اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی مسلک ہے اور حضرت قتادہ و امام مالک یہ فرماتے ہیں کہ خلافِ معمول کوئی چیز اگر قبل و دُبر سے نکلے تو وہ ناقضِ وضو نہیں ہے لہٰذا کیڑے کے نکلنے سے وضوء نہیں ٹوٹے گا لیکن دارقطنی میں جو مرفوع حدیث حضرت ابن عمر سے ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وضوء نہیں ٹوٹتا مگر اس چیز سے جو قبل و دُبر سے نکلے۔ دارقطنی نے کہا اس کی اسناد میں عبداللہ بن محمد ضعیف ہے۔ بہر حال مسئلہ مختلف فیہ ہے اور حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ کا مسلک یہی ہے کہ قبل و دُبر سے جو چیز بھی خارج ہوگی وہ ناقضِ وضو قرار پائے گی۔

وَقَالَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ إِذَا ضَحِكَ فِي الصَّلٰوةِ أَعَادَ الصَّلٰوةَ وَلَمْ يُعِدِ الْوُضُوْءَ

حضرت جابر نے فرمایا اگر کوئی نماز میں ہنسے تو وہ نماز دوبارہ پڑھے مگر وضوء دوبارہ نہ پڑھے

نماز میں قہقے سے وُضوء ٹوٹ جاتا ہے

واضح ہو کہ اس میں غالباً سب کا اتفاق ہے کہ اگر نماز میں قہقہہ لگایا گیا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور دوبارہ پڑھنی پڑے گی۔ لیکن نماز میں قہقہہ[۱] لگانے سے وضوء بھی ٹوٹے گا یا نہیں، اس میں آئمہ کا اختلاف ہے۔

امام مالک و شافعی ولیث کے نزدیک قہقہہ سے وضوء نہیں ٹوٹتا اور امام نخعی و حسن و ثوری و اوزاعی و امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ فرماتے ہیں کہ نماز میں قہقہہ مارنے سے وضوء بھی جاتا رہتا ہے۔ یہ حضرات گیارہ حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جن میں سے چار مرسل ہیں اور سات مسند ہیں۔ دارقطنی نے ابی الملیح سے انھوں نے اپنے باپ سے روایت کیا کہ ہم حضور علیہ السلام کی اقتدار میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص جن کو کم نظر آتا تھا، آئے اور کنویں میں گر گئے۔ جس سے بعض نمازیوں کو زور سے ہنسی آگئی جسے قہقہہ کہا جاتا ہے۔ نماز کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

مَنْ ضَحِكَ مِنْكُمْ فَلْيُعِدِ الْوُضُوْءَ وَالصَّلٰوةَ (دارقطنی)

جو نماز میں ہنستا ہے وہ وضو بھی دوبارہ کرے اور نماز بھی دوبارہ پڑھے۔

اور روایت ابن عمر کے الفاظ یہ ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

مَنْ ضَحِكَ فِي الصَّلٰوةِ قَهْقَهَةً فَلْيُعِدِ الصَّلٰوةَ وَالْوُضُوْءَ (ابن عدی فی الکامل)

جو نماز میں قہقہہ مار کر ہنسا وہ نماز دوبارہ پڑھے اور وضوء بھی دوبارہ کرے

اس حدیث سے ہنسنے کی کیفیت بھی معلوم ہوگئی کہ ہنسنے سے مراد قہقہہ مار کر ہنسنا ہے لہٰذا قہقہہ کا ناقضِ وضوء ہونا بھی

---

[۱] واضح ہو کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ خارج نماز قہقہہ لگانے سے وضوء نہیں ٹوٹتا۔ فافہم

ثابت ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس باب کی حدیثوں ضعیف بھی ہیں تو جواب یہ ہے کہ کثرۃ طرق متون و رواۃ سے ان میں ایسی قوت پیدا ہوگئی ہے کہ ان کے مقابل قیاس جلی کو چھوڑنا ضروری ہے۔ رہا یہ سوال کہ صحابہ کرام کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار میں اور نماز میں ہنسنا بڑی عجیب سی بات ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ اول تو تمام صحابہ کا ہنسنا ثابت نہیں۔ ممکن ہے یہ ہنسنے والے وہ لوگ ہوں جو نئے نئے اسلام لائے تھے اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ ہنسی بے اختیار آجاتی ہے اور اس میں شرعاً کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ بہرحال متعدد حدیثوں سے ثابت ہے کہ نماز میں قہقہہ لگانے سے وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے اور بھی فاسد ہوجاتی ہے۔ واضح ہو کہ تبسم میں آواز نہیں ہوتی جس کو مسکرانا کہتے ہیں اور ضحک وہ ہنسنا ہے جس میں آواز ہوتی ہے مگر دوسرا نہیں سنتا۔ ضحک سے وضو نہیں ٹوٹتا البتہ نماز فاسد ہوجاتی ہے اور قہقہہ یہ ہے کہ ایسی آواز سے ہنسا جائے کہ خود بھی سُنے اور ساتھی کو بھی سنائی دے۔ قہقہہ سے نماز بھی فاسد ہوجاتی ہے اور وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر چونکہ قہقہہ کا ناقضِ وضو ہونا خلافِ قیاس ہے اور جو بات خلافِ قیاس ہو وہ اپنے مورد پر بند رہتی ہے اس لیے سیّدنا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ وہ نماز جس میں رکوع وسجدہ ہوتا ہے اس میں اگر قہقہہ لگایا گیا تو نماز فاسد ہوگی اور وضو بھی جاتا رہے گا۔ پس اگر نمازِ جنازہ یا سجدہ تلاوت یا خارج نماز میں قہقہہ لگایا تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اسی طرح نابالغ نے اپنی نماز میں قہقہہ لگایا تو وضو نہیں ٹوٹے گا مگر نماز فاسد ہوجائے گی۔ صاحبِ ہدایہ نے اس کو علیٰ ماقیل کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ وجہ یہ بتائی ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق امام اعظم سے کوئی روایت نہیں ملتی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ بالغ کا قہقہہ یعنی اتنی آواز سے ہنسی کہ آس پاس والے سُنیں۔ اگر جاگتے میں رکوع وسجدہ والی نماز میں ہو تو وضو ٹوٹ جائیگا نماز فاسد ہوجائے گی (۲) اگر نماز کے اندر سوتے میں یا جنازہ یا سجدہ تلاوت میں قہقہہ ہو تو وضو نہیں جائے گا مگر وہ نماز یا سجدہ فاسد ہوگا (۳) اور اگر اتنی آواز سے ہنسا کہ خود اس نے سُنا۔ پاس والوں نے نہ سُنا تو وضو نہیں جائے گا نماز جاتی رہے گی (۴) اگر نماز میں مسکرایا کہ دانت نکلے مگر آواز بالکل پیدا نہیں ہوئی تو اس سے نہ نماز جائیگی نہ وضو۔

وَقَالَ الْحَسَنُ اِنْ اَخَذَ مِنْ شَعْرِهٖ اَوْ اَظْفَارِهٖ اَوْ خَلَعَ خُفَّيْهِ فَلَا وُضُوْءَ عَلَيْهِ

اور حسن بصری نے کہا جو شخص اپنے سر کے بال منڈائے یا ناخن کترائے یا اپنے موزے اُتار ڈالے تو اس پر دوبارہ وضو لازم نہیں ہے۔

فوائد ومسائل ۱۔ یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے۔ اہلِ حجاز وعراق ابی العالیہ وحکم وحماد ومجاہد یہ فرماتے ہیں کہ وضو کرنے کے بعد اگر بال اُتروا دیئے یا ناخن ترشوائے تو دوبارہ وضو کرنا واجب ہے۔ ۲۔ امام شافعی ونخعی وعطا کا قول ہے کہ صرف دوبارہ مسح کرے اور ہاتھ دھولے ۳۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ دوبارہ وضو ومسح کی ضرورت نہیں پہلا وضو ہی درست ہے۔ امام کی رائے تعلیق زیر بحث کے موافق ہے۔

اَوْخَلَعَ خُفَّيْهِ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی نے وضو کر کے موزے پہن لیے۔ پھر موزے اُتار دیئے تو اس صورت میں دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے صرف پاؤں کو دھو ڈالے۔ ۱۔ تعلیق اول کو سعید ابن منصور وابن منذر نے حضرت حسن بصری سے باسنادِ صحیح موصولاً روایت کیا ہے اور تعلیق دوم کو ابن ابی شیبہ نے باسنادِ صحیح روایت کیا ہے۔

وَقَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ لَا وُضُوْءَ

حضرت ابوہریرہ نے فرمایا وضو لازم نہیں ہوتا

اِلَّا مِنْ حَدَثٍ | مگر حدث سے۔

فوائد و مسائل اس تعلیق کو اسمٰعیل قاضی نے احکام میں بسند صحیح مجاہد سے موقوفاً روایت کیا ہے اور ابو عبیدہ نے کتاب الطہور میں الفاظ ذیل سے روایت کیا ہے۔

لَا وُضُوْءَ اِلَّا مِنْ حَدَثٍ او صوتٍ اَوْ رِیْحٍ (عینی ج ۱ ص ۹۴) | وضو لازم نہیں ہوتا مگر حدث سے یا ہوا نکلنے کی آواز سے یا بُو سے

ظاہر ہے کہ حدث کا لفظ عام ہے۔ سونا، بے ہوشی، جنون یہ بھی حدث ہے اور قبل و دُبر سے کسی چیز کا نکلنا بھی حدث ہے اور جسم کے کسی حصہ سے بھی نجاست کا بہنا بھی حدث ہے۔ فافہم

وَّ یُذْکَرُ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ فِیْ غَزْوَۃِ ذَاتِ الرِّقَاعِ فَرُمِیَ رَجُلٌ بِسَہْمٍ فَنَزَفَہُ الدَّمُ فَرَکَعَ وَسَجَدَ وَمَضٰی فِیْ صَلٰوتِہٖ | اور جابر ابن عبداللہ سے روایت ہے کہ حضور ذات الرقاع کی لڑائی میں تھے۔ وہاں ایک شخص کو (عین نماز میں) تیر لگا۔ اس میں سے خون بہا لیکن انہوں نے رکوع وسجدہ کیا اور نماز پڑھتے رہے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو ابن اسحاق نے مغازی میں درج کیا جس کا قصہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام ایک گھاٹی میں مقیم ہوئے فرمایا آج رات کون ہمارا پہرہ دے گا تو ایک شخص مہاجر اور ایک انصاری نے یہ خدمت اپنے ذمے لی۔ بیہقی کی روایت میں یہ تصریح بھی ہے کہ انصاری کا نام عبادہ بن صامت ہے اور مہاجر کا نام حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہے۔ غرضیکہ ان دونوں حضرات نے باری مقرر کرلی۔ ایک صاحب سوگئے دوسرے پہرہ دینے لگے اور نماز پڑھنی شروع کردی۔ اتنے میں ایک کافر نے موقع تاک کر تیر مارا اور انہوں نے تیر کو جسم سے نکال دیا اور بدستور نماز میں مصروف رہے۔ اسنے دوسری بار تیر مارا۔ پھر تیسری بار تیر مارا اور یہ تیر کو جسم سے نکال کر نماز میں بدستور مصروف رہے۔ جب نماز پوری کرلی تو اپنے ساتھی کو جگایا۔ انہوں نے زخم سے خون بہتا دیکھا تو کہا تم نے مجھے پہلے تیر پر کیوں نہ جگایا۔ انصاری نے جواب دیا۔ بات یہ تھی کہ میں قرآن پاک کی ایک سورۃ پڑھنے میں محو تھا۔ اس لیے اس کو موقوف کرنا اچھا نہ لگا۔

۱۔ اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں، حاکم نے مستدرک میں، ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں، امام احمد نے مسند میں، دارقطنی نے سنن میں بیان کیا ۲۔ شارحین نے فرمایا کہ اس حدیث سے امام بخاری نے یہ بتایا ہے کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس کے بعد اثر حسن بصری کو ذکر کیا ہے کہ مسلمان اپنے زخموں میں نماز پڑھتے تھے لیکن یہ استدلال تام نہیں ہے۔ اوّل تو یہ معلوم نہیں کہ انصاری کے اس فعل کی اطلاع حضور علیہ السلام کو ہوئی یا نہیں۔ اگر ہوئی تو پھر آپ نے اس کو جائز رکھا یا ناجائز؟ ثانیاً بہتے خون کا ناپاک و نجس ہونا قطعی اجماعی مسئلہ ہے۔ جب ان کے تیر لگا اور خون نکلا تو کپڑے اور جسم خون میں ملوث ہوئے تو امام شافعی کے نزدیک اگر تھوڑا خون بھی بدن یا کپڑے کو لگ جائے تو نماز نہیں ہوتی اور اگر یہ کہا جائے کہ زخم سے خون اس طرح نکلا ہوگا کہ بدن محفوظ رہا ہو؟ لیکن اگر ایسا ہوا ہو تو یہ بڑی عجیب بات ہوگی۔ جب کہ ان کے جسم کا خون سے محفوظ رہنا بعید از عقل ہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زخم سے خون بہنے کے باوجود نماز میں مشغول رہنا ایک جذباتی فعل ہے۔ اس سے حکم فقہی اخذ نہیں کیا جا سکتا اور ان کا اپنے ساتھی کو کنت فی سورۃ اقرءھا فلم احب اقطعہا کے الفاظ سے جواب دینا اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ وہ مشاہدہ حق میں غرق تھے۔ انہیں قرآن کریم کی قرأت میں لطف آ رہا تھا۔ یہ ایسے ہے جیسے قرّاء صحابہ میں سے ایک صحابی جب شہید ہوئے اور خون نکلا تو وہ اپنے چہرہ پر ملنے لگے اور فرماتے تھے۔ (فُزْتُ وربّ الکعبہ (بخاری) لیکن ان کے اس عاشقانہ انداز کو کسی امر کی دلیل نہیں بنایا گیا اور نہ اس پر کوئی تنقید کی گئی۔ رہا حضرت حسن بصری کا یہ فرمانا کہ "مسلمان زخموں کی حالت میں بھی نماز پڑھا کرتے تھے" اس کو بھی اس امر کی دلیل بنانا کہ جسم سے خون نکلنے سے وضو نہیں جاتا درست نہیں ہے۔ جس کا بیان ابھی آتا ہے۔

وَقَالَ الْحَسَنُ مَا زَالَ الْمُسْلِمُوْنَ يُصَلُّوْنَ فِيْ جِرَاحَاتِهِمْ

اور حسن بصری نے کہا۔ مسلمان ہمیشہ اپنے زخموں میں نماز پڑھتے تھے۔

فوائد و مسائل حضرت حسن بصری کے اس اثر سے بھی امام شافعی نے استدلال فرمایا کہ "خروج دم من غیر السبیلین" ناقض وضو نہیں ہے۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔ اثر بصری سے یہ استدلال کرنا صحیح نہیں کیونکہ "زخموں میں نماز پڑھتے تھے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زخم تھا مگر اس سے خون بہتا نہیں تھا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں ہشیم سے انھوں نے یونس سے، انھوں نے حسن بصری سے روایت کیا کہ حسن بصری کے نزدیک جب خون نکل کر بہے "تو ناقض وضو ہے (اسنادہ صحیح) اور احناف کا یہی مسلک ہے کہ محض خون کے ظہور سے وضو نہیں ٹوٹتا بلکہ جب خون نکل کر بہے تو وہ وضو توڑ دیتا ہے۔

وَقَالَ طَاوٗسٌ وَّمُحَمَّدٌ وَّ عَلِيٌّ وَّعَطَاءٌ وَّاَهْلُ الْحِجَازِ لَيْسَ فِي الدَّمِ وُضُوْءٌ وَعَصَرَ ابْنُ عُمَرَ بَثْرَةً فَخَرَجَ مِنْهَا الدَّمُ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ وَبَزَقَ ابْنُ اَبِيْ اَوْفٰى دَمًا فَمَضٰى فِيْ صَلٰوتِهٖ

طاؤس اور امام محمد باقر اور عطاء اور اہل حجاز نے کہا خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا اور عبداللہ بن عمر نے ایک پھنسی کو دبایا اس میں سے خون نکلا۔ پھر وضو نہیں کیا اور ابن ابی اوفیٰ صحابی نے خون تھوکا مگر نماز میں بدستور مشغول رہے۔

فوائد و مسائل حضرت طاؤس و محمد و ابن عمر و ابن ابی اوفیٰ کے ان اقوال سے بھی یہ استدلال کیا گیا کہ غیر سبیلین سے اگر خون نکلے تو ناقض وضو نہیں ہے لیکن یہ اقوال بھی حنفیہ کے مسلک کے خلاف نہیں ہیں۔ کیونکہ

۱۔ حضرت طاؤس و محمد کے اثر کا مطلب یہ ہے کہ محض خون کے ظاہر ہونے سے وضو نہیں جاتا اور حنفیہ بھی یہی کہتے ہیں کہ خون کے ظہور سے نہیں بلکہ سیلان سے وضو ٹوٹتا ہے اور اس میں بہنے کا ذکر نہیں ہے۔

۲۔ حضرت ابن عمر نے پھنسی کو دبایا۔ خون نکلا مگر انہوں نے وضو نہیں کیا؛ اس میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ وہ خون بہہ کر کسی جگہ پہنچ گیا تھا۔ جس کا وضو و غسل میں دھونا فرض ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خون صرف ظاہر ہوا ہو بہا نہ ہو۔ غرضیکہ یہ استدلال بھی تمام نہیں ہے۔

۳۔ اور حضرت ابن ابی اوفیٰ نے خون تھوکا مگر اس کے باوجود نماز میں مشغول رہے۔ اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ تھوک پر

خون غالب تھا؟ ہوسکتا ہے کہ تھوک غالب ہوا ور حنفیہ کے نزدیک بھی اگر کوئی تھوکے اور خون ظاہر ہو تو وضوء اس سے نہیں ٹوٹے گا جب کہ خون تھوک پر غالب ہو۔

وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ وَالْحَسَنُ فِيْمَنِ احْتَجَمَ لَيْسَ عَلَيْهِ إِلَّا غَسْلُ مَحَاجِمِهِ

اور ابن عمر و حسن بصری نے کہا جو کوئی پچھنے لگائے تو اس پر سوائے پچھنے کی جگہ کے دھونے کے اور کچھ نہیں ہے

فوائد و مسائل

۱- حضرت ابن عمر کے اثر کو ابن شیبہ نے اپنے مصنف میں روایت کیا جس کا مضمون یہ ہے کہ جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جب پچھنے لگواتے تو پچھنے کی جگہ کو دھوتے اور حسن بصری کے اثر کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حسن بصری سے کسی نے پوچھا کہ پچھنے لگوانے والے پر کیا لازم ہے آپ نے فرمایا- پچھنے کے مقامات کو دھو ڈالے- اس سے امام شافعی نے یہ استدلال فرمایا کہ غیر سبیلین سے اگر خون نکلے تو وہ ناقض نہیں ہے- لیکن حنفیہ یہ کہتے ہیں یہ دونوں اثر بھی ہمارے مسلک کے خلاف نہیں ہیں کیونکہ اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ پچھنے کی جگہ سے خون نکل کر بہا بھی تھا اور جب تک خون ظاہر ہو کر بہے وضوء نہیں ٹوٹتا- گویا حضرت ابن عمر و حسن بصری کے اس فتویٰ کا یہ ہے کہ کسی نے پچھنے لگوائے اور خون ظاہر ہوا اور بہا نہیں بلکہ محاجم (پچھنے لگنے کی جگہ) تک محدود رہا تو یہ ناقض وضوء نہیں ہے چنانچہ اس باب میں متعدد مرفوع حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا-

من اصابہ قئ او رعاف اوقلس او مذی فلینصرف فلیتوضا

(دارقطنی، ابن ماجہ)

جس کو قے آجائے یا نکسیر آئے یا منہ بھر کر قے آئے یا مذی نکلے تو وہ نماز کو چھوڑے، وضوء دوبارہ کرے پھر آکر بنا کرے

۲- امام بیہقی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا- سات باتوں سے وضوء لازم ہوتا ہے پیشاب کا آنا، منہ بھر کر قے آنا، کروٹ پر سونا، نماز میں قہقہہ لگانا اور خون کا بہنا۔

۳- حضرت سلمان کہتے ہیں میری ناک سے خون بہا تو حضور علیہ السلام نے دوبارہ وضو کرنے کا حکم دیا- اس مضمون کی ایک نہیں متعدد حدیثیں ہیں- اسی طرح آثار صحابہ و تابعین بھی بہت ہیں جن میں صاف صاف اس امر کا بیان ہے کہ خون نکل کر بہے تو ناقض وضوء ہے- چنانچہ عشرہ مبشرہ حضرت ابن مسعود و ابن عمر و زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری، ابوالدرداء، ثوبان، زہری، علقمہ، اسود، عامر، شعبی، عروہ بن زبیر، نخعی، قتادہ، حکم بن عیینہ، حماد ثوری، حسن بن صالح بن حی، عبداللہ بن حبیس، اوزاعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ و امام اعظم ابوحنیفہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) ایسے جلیل القدر صحابہ و تابعین کا یہی مسلک ہے کہ سبیلین کے علاوہ بھی اگر جسم کے کسی حصے سے خون نکل کر بہے تو وہ ناقض وضوء ہے- اب اگر کہا جائے اس باب کی مرفوع حدیثوں میں بھی علماء نے کلام کیا ہے تو احتیاط پھر بھی مسلک حنفیہ کے اختیار کرنے ہی میں ہے (واللہ اعلم)

کن چیزوں سے وضوء ٹوٹتا ہے اور کن سے نہیں، ائمہ کا اختلاف اور انکے دلائل کا تفصیلی بیان

واضح ہو کہ جو چیزیں بالا... علماء حدث ہیں یعنی...

کے نکلنے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے وہ یہ ہیں :۔ پاخانہ، پیشاب، منی، دُبر سے ہوا کا نکلنا، حیض و نفاس، مذی کا نکلنا، جنون، بیہوشی، نشہ اور ذیل کی چیزیں باختلافِ علماء حدث ہیں (۱) قبل و دُبر سے خلافِ معمول کسی چیز کا نکلنا جیسے خون، کیڑا، پتھر کنکر وغیرہ (۲) قبل و دبر کے علاوہ جسم کے کسی حصہ سے خون یا پیپ کا نکلنا (۳) قے کرنا (۴) غش آنا (۵) قبل و دُبر کو چھونا (۶) سونا (۷) استحاضہ یا بواسیر کا خون نکلنا (۸) عورت کا چھونا (۹) آگ کی پکی ہوئی چیز کھانا (۱۰) اونٹ کا گوشت کھانا۔ یہ دس امور وہ ہیں جن کے حدث ہونے یا نہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے جس کی تفصیل یہ ہے :۔

مُنہ بھر قے ناقضِ وضوء ہے

سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسلک یہ ہے کہ قے ناقضِ وضوء ہے۔ یعنی وہ قے جو منہ بھر کر ہو یعنی جس کو آدمی بے تکلیف روک نہ سکے خواہ پانی کی ہو یا صفرا کی، وضوء توڑ دے گی۔ اسی طرح بہتے خون کی قے بھی ناقضِ وضوء ہے اور یہ قے نجس ہے۔ قے میں یہ بھی شرط ہے کہ ایک ہی مجلس میں آئے تو اگر تھوڑی تھوڑی قے چند بار آئی کہ اس کا مجموعہ مُنہ بھر ہے۔ تو اگر ایک ہی متلی سے ہے تو وضو توڑ دے گی اور اگر متلی جاتی رہی اور اس کا کوئی اثر نہ رہا۔ پھر نئے سرے سے متلی شروع ہوئی اور قے آئی۔ دونوں مرتبہ کی علیحدہ علیحدہ منہ بھر نہیں ہے مگر دونوں جمع کی جائیں تو منہ بھر ہیں تو ناقضِ وضوء نہیں۔ صرف بلغم کی قے خواہ منہ بھر ہو ناقضِ وضو نہیں ہے۔ امام کی دلیل متعدد ایسی حدیثیں ہیں جن میں حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جس کو قے آجائے نکسیر چھوٹے تو وہ دوبارہ وضوء کرے (۲) حضرت امام شافعی، امام باقر و صادق رضی اللہ تعالےٰ عنہم یہ کہتے ہیں کہ قے ناقضِ وضوء نہیں ہے۔ امام شافعی کی دلیل حدیثِ ثوبان ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے قے فرمائی۔ پھر وضوء کے لیے پانی مانگا اور وضوء فرمایا۔ میں نے عرض کی۔ حضور کیا قے سے وضوء فرض ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر فرض ہوتا تو قرآنِ کریم میں اس کا ذکر ہوتا (دارقطنی) لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث لائقِ معارضہ نہیں ہے دارقطنی نے فرمایا کہ اس کی اسناد میں عتبہ بن سکن ہے اور وہ متروک الحدیث ہے۔

بیہوشی بھی ناقضِ وضوء ہے

بے ہوشی، جنون اور غشی اور اتنا نشہ کہ چلنے میں پاؤں لڑکھڑا جائیں ناقضِ وضوء ہے علامہ نووی نے فرمایا اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ عقل کے جانے رہنے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے۔ جیسے جنون، بیہوشی، نشہ خواہ شراب کا ہو یا کسی اور چیز کا اور علت اس مسئلہ میں زوالِ قوتِ ماسکہ ہے جو حدث کا سبب بنتی ہے۔

مسِ ذکر و قبل ناقضِ وضوء نہیں

امام شافعی و مالک و احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کا مسلک یہ ہے کہ بلا حائل شرمگاہ کو چھُونے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے یہ حضرات متعدد حدیثوں سے دلیل لیتے ہیں جن کے الفاظ یہ ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا :۔

مَنْ مَسَّ فَرْجَهٗ فَلْيَتَوَضَّأْ | جو شرمگاہ کو چھوئے وضوء کرے

یا، بسرہ بنت صفوان سے روایت ہے وہ کہتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

يَأْمُرُ بِالْوُضُوْءِ مِنْ مَسِّ الْفَرْجِ | شرمگاہ کو چھُونے پر وضوء کرنے کا حکم فرماتے تھے۔

(ترمذی، نسائی، ابوداؤد)

لیکن حضرت امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے اس باب کی احادیث پر مفصل بحث کرتے ہوئے یہ جواب دیا ہے کہ ان احادیث کے راویوں میں کوئی ضعیف ہے اور کوئی منکر، کوئی مدلس ہے اور کوئی منقطع۔ لہٰذا ان سے استدلال درست نہیں ہے۔
اس کے علاوہ قیاس جلی صحابہ کرام وتابعین عظام کا تعامل اور دوسرے آثار جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، امام شافعی کے مسلک کی تردید کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس ایسے جلیل القدر فقہاء صحابہ مس فرج کو ناقض وضو نہیں قرار دیتے اور تفقہ جودت ذہن واصابت رائے اور قرب نبوی کے لحاظ سے ان حضرات کو جو ممتاز مقام ومرتبہ حاصل ہے وہ ان کو نہیں ہے جو مس فرج کو ناقض وضوء قرار دیتے ہیں۔ حضرت ربیعہ نے جب بسرہ کی حدیث سنی کہ مس ذکر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو آپ نے فرمایا کیا اگر کوئی شخص خون حیض کو ہاتھ لگادے تو اس کا وضوء ٹوٹ جائیگا؛ یعنی خون حیض کو ہاتھ لگادینا مس ذکر سے کہیں بھاری ہے۔ لیکن خون حیض میں اگر ہاتھ ملوث ہوجائے تو وضوء نہیں جاتا۔ پھر مس ذکر سے کیسے جائیگا۔
غرضیکہ حضرت علی، ابن مسعود، عمار، حسن بصری، ربیعہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ مس فرج ناقض وضوء نہیں، امام اعظم بھی متعدد آثار سے استدلال فرماتے ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں (۱) قیس ابن طلق کے والد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:۔

أَفِي مس الذكر وُضُوْءٌ؟ فَقَالَ لَا	حضور شرمگاہ کے چھونے پر وضوء ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں

(۲) انہیں سے دوسری حدیث ہے۔

قَالَ يَا نَبِيَّ اللهِ مَا تَرَىٰ فِي مس الرجل ذَكَرَهُ بَعْدَ مَا تَوَضَّاءَ فَقَالَ هَلْ هُوَ إِلَّا بُضْعَةٌ مِنْكَ (طحاوی باب الوضوء بمس الفرج)	حضور اگر وضوء کرنے کے بعد آدمی اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ حضور نے فرمایا۔ وہ بھی تمہارے جسم کا ایک ٹکڑا ہی ہے۔

امام طحاوی نے فرمایا۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ مستقیم الاسناد ہے اور اس میں کچھ اضطراب نہیں ہے۔ غرضیکہ اس مضمون کی متعدد حدیثیں ہیں جو مسلک احناف کی دلیل ہیں۔ تفصیل کے لیے طحاوی، نیل الاوطار کا مطالعہ مفید رہے گا۔

نیند ناقض وضوء ہے

علامہ نووی نے فرمایا۔ نیند کے ناقض وضوء ہونے یا نہ ہونے میں آٹھ مذہب ہیں۔
مذہب اول:۔ ابوموسیٰ اشعری، سعید ابن مسیب، ابومجلز اور حمید اعرج کے نزدیک نیند مطلقاً ناقض وضوء نہیں ہے۔ ان کی دلیل حدیث انس ہے (۱) وہ فرماتے ہیں کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کے انتظار میں مسجد میں بیٹھے رہتے۔ حَتّٰى تَخْفِقُ رُؤُسُهُمْ ثُمَّ يصلون وَلَا يتوضّؤن۔ یہاں تک ان کو نیند کی وجہ سے جھونکے آتے۔ پھر وہ بغیر وضوء کیے نماز پڑھ لیتے۔ اس حدیث کو امام شافعی نے کتاب الام میں روایت کیا اور مسلم اور ترمذی نے بھی اور امام ابوداؤد نے روایت شعبہ عن قتادہ میں علی عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم کے لفظ زیادہ کیے اور ترمذی نے طریق شعبہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

۲۔ لقد رأيتُ أصحابَ رسول الله صلى الله عليه وَسَلَّمَ يُوقَظُوْنَ للصلوٰة حتّٰى إِنِّي	میں نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ نماز کے لیے بیدار کیے جاتے یہاں تک کہ میں ان میں سے

لا یسمع لاحد ھم غطیطاً ثم یقومون و یصلون و لا یتوضؤن

بعض کے خراٹے سُنتا۔ پھر وہ کھڑے ہوتے اور نماز پڑھتے اور وضوء نہ کرتے۔

ابن مبارک نے فرمایا۔ ہمارے نزدیک اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ وہ صحابہ بیٹھے بیٹھے سوجاتے تھے۔ امام بیہقی نے فرمایا کہ امام شافعی اور عبدالرحمٰن بن مہدی نے بھی اس حدیث کا یہی مطلب لیا ہے کہ صحابہ کا مسجد میں نماز کے انتظار میں سونا بحالتِ قعود تھا۔ چنانچہ وہ روایت جس میں جھونکے کھانے کا ذکر ہے اس کی تائید کرتی ہے کیونکہ جھونکا بحالتِ قعود ہی متصور ہو سکتا ہے۔ لیکن اس تاویل کی تردید یحییٰ بن قطان کی روایت سے ہو جاتی ہے۔ قتادہ حضرت انس سے روایت کرتے ہیں کہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے انتظار میں رہتے۔

۳۔ فیضعون جنوبھم فمنھم من ینام ثم یقوم الی الصلوٰۃ

پھر بعض ان میں سے کروٹ کے بل سوجاتے اور نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔

ابن دقیق العید نے کہا۔ یہ سونا محمول ہے نومِ خفیف پر۔ یعنی وہ پوری طرح نہیں سوتے تھے لیکن اس تاویل کی تردید روایت ترمذی سے ہو جاتی ہے جس میں غطیط کا لفظ موجود ہے یعنی ان سے خراٹے بھرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جس سے اس امر کی تردید ہوتی ہے کہ ان کا سونا نومِ خفیف تھا۔ ہاں ترمذی نے بندار سے اور امام احمد نے طریق یحییٰ القطان سے جو روایت کی ہے اس میں کروٹ کے بل سونے کے الفاظ نہیں ہے۔ لیکن بیہقی بزار اور خلال کی روایت میں خط کشیدہ لفظ موجود ہیں۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یہ تمام روایتیں حضور علیہ السلام کا قول نہیں۔ بلکہ حضرت انس کا مشاہدہ ہے۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ حضور علیہ السلام نے ان صحابہ کی (جو سو گئے خواہ بحالتِ جلوس سوئے ہوں یا کروٹ کے بل اور پھر بغیر وضوء کئے نماز کے لیے کھڑے ہو گئے) نماز کو جائز قرار دیا یا ناجائز۔ (وفیہ نظر)

مذہب دوم۔ حضرت حسن بصری، مزنی، ابوعبید قاسم بن سلام، اسحاق بن راہویہ، ابن منذر اور حضرت ابن عباس و ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مذہب یہ ہے کہ نیند مطلقاً ناقضِ وضوء ہے خواہ خفیف ہی کیوں نہ ہو۔ ان حضرات کی دلیل حدیث صفوان و علی و معاویہ ہے:۔

۱۔ صفوان ابن عسال کہتے ہیں:۔

کان رسول اللہ یامرنا اذا کنا سفراً ان لا ننزع خفافنا ثلاثۃ ایام ولیالیھن الا من جنابۃ لکن من غائط و بول و نوم (احمد، نسائی، ترمذی صححہ)

کہ حضور علیہ السلام ہمیں بحالتِ سفر تین دن رات موزے نہ اُتارنے کا حکم دیتے تھے مگر جنابت سے (یعنی جنبی ہو جانے پر اُتارنے کا حکم تھا) لیکن پاخانہ و پیشاب اور نیند سے موزہ اُتارنے کا حکم نہ دیتے تھے۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس حدیث میں نیند کو بھی ناقضِ وضوء قرار دیا گیا ہے۔ جیسے پاخانہ و پیشاب کا آنا ناقضِ وضوء ہے لہذا نیند خواہ کسی حالت میں ہو کم ہو یا زیادہ ناقضِ وضوء ہے۔

۲۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

اَلعَينُ وِكَاءُ السَّهِ فَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

آنکھ، یہ پچھلے حصہ کی بندش ہے جب آدمی سو جائے تو دوبارہ وضوء کرے

۳۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

اَلعَينُ وِكَاءُ السَّهِ فَإِذَا نَامَتِ الْعَيْنَانِ اسْتَطْلَقَ الْوِكَاءُ (احمد و دارقطنی)

کہ آنکھ دُبر کی بندش ہے۔ جب آنکھیں سو جاتی ہیں تو بندش کھل جاتی ہے (ڈھیلی ہو جاتی ہے)

اگرچہ حدیث ۲، ۳ میں کلام کیا گیا ہے اور اس کو ضعیف تک قرار دیا گیا ہے مگر حدیث ۱ ان دونوں حدیثوں کے مفہوم کی تائید و توثیق کرتی ہے اور حدیث ۱ کی صحت پر سب کا اتفاق ہے۔ حدیث ۱ کو ابن ماجہ، ابن حبان، دارقطنی اور بیہقی نے روایت کیا۔ امام ترمذی نے امام بخاری سے نقل کیا کہ یہ حدیث حسن ہے۔ اس کی اسناد میں عاصم بن ابی النجود ہیں جن کی ایک جماعت نے متابعت کی اور چالیس سے زیادہ افراد نے عاصم سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ غرضیکہ ان تینوں مرفوع حدیثوں سے نیند کا ناقضِ وضوء ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مذہب سوم۔ امام زہری، ربیعہ اوزاعی اور امام مالک و امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ نومِ کثیر ہر صورت ناقضِ وضوء ہے۔ لیکن قلیل ہر صورت میں ناقضِ وضوء نہیں ہے۔ ان حضرات کی دلیل حدیثِ انس ہے جو اوپر ذکر کی جا چکی ہے۔ جس کو یہ حضرات نومِ خفیف پر محمول کرتے ہیں اور ایک یہ حدیث ہے جس کو امام بیہقی نے روایت کیا۔

مَنِ اسْتَحَقَّ النَّوْمَ فَعَلَيْهِ الْوُضُوْءُ

جو اتنا سوئے کہ لوگ اس کو سویا ہوا کہیں وہ دوبارہ وضوء کرے۔

مذہب چہارم۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ رکوع و سجود میں سو جائے تو وضوء جاتا رہے گا، ورنہ نہیں۔ صاحب بدر التمام و صاحب سبل السلام نے اس مذہب کو یوں ذکر کیا ہے۔ سونا ناقضِ وضوء ہے مگر رکوع و سجود کی حالت میں سونا ناقضِ وضوء نہیں ہے اور ان کی دلیل حدیث اذا نام العبد فی صلاتہ ہے۔

مذہب پنجم۔ یہ کہ نیند ناقضِ وضوء نہیں ہے، مگر سجدہ کی حالت میں سونے سے وضوء جاتا رہے گا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ایک روایت یہ بھی ہے۔

مذہب ششم۔ نماز میں کسی صورت سونے سے وضوء نہیں جاتا اور خارج صلوٰۃ ہر صورت و شکل پر سونا ناقضِ وضوء ہے۔ یہ زید ابن علی کا قول ہے اور یہ حدیث اذا نام العبد فی صلاتہ سے استدلال کرتے ہیں۔

مذہب ہفتم۔ اگر زمین پر اس طرح بیٹھ کر سوئے کہ سرین زمین پر جم جائیں تو یہ ناقضِ وضوء نہیں ہے۔ خواہ نوم قلیل ہو یا کثیر، نماز میں ہو یا خارج نماز۔ اس کے علاوہ سب شکلوں میں نیند ناقضِ وضوء ہے۔ علامہ نووی کہتے ہیں یہ امام شافعی کا مسلک ہے۔

مذہب ہشتم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ و داؤد یہ فرماتے ہیں کہ رکوع و سجدہ، قیام اور قعود کی شکل میں سونے سے وضوء نہیں ٹوٹتا اور کروٹ سے یا چت سو جانے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے یعنی امام کے نزدیک نیند ناقضِ وضوء ہے (۱) ایسا سویا کہ سرین زمین پر خوب نہ جمے، یا (۲) ایسی ہیئت پر سویا جو غافل ہو کر سونے کو مانع

نہ ہو۔ مثلاً اکڑوں بیٹھ کر سویا یا پیٹھ یا کروٹ پر لیٹ کر یا کہنی پر تکیہ لگا کر یا بیٹھ کر سویا مگر ایک کروٹ کو جھکا کہ ایک یا دونوں سرین اُٹھے ہوئے ہوں یا ننگی پیٹھ پر سوار ہے کہ جانور نشیب میں اُتر رہا ہے یا دوزانو بیٹھا اور پیٹ رانوں پر رکھا کہ دونوں سرین جمے نہ رہیں یا چارزانو ہو کر سویا اور سرزانو یا پنڈلیوں پر ہے یا جس طرح عورتیں سجدہ کرتی ہیں۔ اسی شکل پر سوگیا۔ ان سب صورتوں میں سونے سے وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر نماز میں ان صورتوں میں سے کسی صورت پر قصداً سویا تو نماز بھی گئی اور وضو بھی دوبارہ کرکے نماز پڑھے اور اگر بلاقصد سویا تو وضو جاتا رہا نماز نہیں گئی۔ دوبارہ وضو کرکے جس رکن (سجدہ یا رکوع وغیرہ) میں سویا تھا، وہاں سے نماز ادا کرے۔ بہتر یہی ہے کہ از سرِ نو نماز کی نیت باندھ کر پوری نماز پڑھے (۳) دونوں سرین زمین پر یا تخت پر ہیں اور دونوں پاؤں ایک طرف پھیلے ہوئے یا دونوں سرین پر بیٹھا ہے اور گھٹنے کھڑے ہیں اور ہاتھ پنڈلیوں پر محیط ہوں خواہ زمین پر ہوں۔ دوزانو سیدھا بیٹھا ہو، یا چارزانو پالتی مارتے یا زمین پر سوار ہو یا ننگی پیٹھ پر سوار ہے مگر جانور چڑھائی چڑھ رہا ہے یا راستہ ہموار ہے یا کھڑے کھڑے یا رکوع کی حالت میں یا مردوں کے سجدہ مسنونہ کی شکل پر سویا، ان سب شکلوں پر سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ نماز میں اگر یہ صورتیں پیش آئیں تو نہ وضو جائے گا اور نہ نماز۔ ہاں اگر پورا رکن سوتے ہی میں ادا کیا تو اس کا اعادہ واجب ہے اور اگر جاگتے میں شروع کیا، پھر سوگیا، تو اگر جاگتے میں بقدر کفایت رکن (یعنی سجدہ، رکوع وغیرہ) ادا کرچکا ہے تو وہی کافی ہے ورنہ پورا کرے۔ (۴) اونگھنے یا بیٹھے بیٹھے جھونکے لینے سے وضو نہیں جاتا۔ نماز وغیرہ کے انتظار میں بعض مرتبہ نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو اگر غلبہ ایسا ہے کہ پہلی آواز میں بیدار نہیں ہوتا تو اس پر وضو لازم ہے اور اس معاملے میں اپنے خیال کا اعتبار نہیں۔ اگر معتبر شخص یہ کہے کہ تو غافل تھا، تجھے پکارا جواب نہ دیا یا مجلس کی باتیں جو اس کی غفلت میں ہوئیں پوچھی جائیں اور بتا نہ سکے تو ایسے شخص پر وضو دوبارہ کرنا لازم ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے مسلک کی احادیث یہ ہیں (۱) حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایک رات میں اپنی خالہ میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس سو رہا تھا۔ رات کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے اور نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ میں آپ کی بائیں طرف کھڑا ہوگیا۔ حضور نے مجھے اپنے داہنے طرف کھڑا کیا۔

فَجَعَلْتُ اِذَا اَغْفَيْتُ يَاْخُذُ بِشَحْمَةِ اُذُنِيْ (مسلم و بخاری)

جب میں اُونگھتا تو آپ میرے کان کی لو پکڑ کر (جگاتے)

یہ حدیث بھی امام اعظم ابوحنیفہ کے مسلک کی دلیل ہے کہ نماز کی حالت میں اونگھنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ (۲) امام بیہقی علیہ الرحمۃ نے یزید بن قلیط سے انہوں نے جناب ابوہریرہ سے روایت کیا، آپ نے فرمایا۔

لَيْسَ عَلَى الْمُحْتَبِيْ النَّائِمِ وَلَا عَلَى الْقَائِمِ النَّائِمِ وَضُوْءٌ حَتّٰى يَضْطَجِعَ فَاِذَا اضْطَجَعَ تَوَضَّاَ

جو شخص دونوں پاؤں کھڑا کرکے سرین پر سو جائے یا کھڑے کھڑے سو جائے اس کا وضو نہیں ٹوٹتا یہاں تک کہ کروٹ سے سو جائے اور جب کروٹ سے لیٹ کر سوئے گا (تو وضو ٹوٹ جائیگا) وضو کرے۔

حافظ ابن حجر نے فرمایا۔ اس کی اسناد جید اور حدیث موقوف ہے۔ یہ حدیث بھی امام کی دلیل ہے۔ اس سے واضح ہوا

ہے کہ کھڑے کھڑے سوئے اور سرین پر بیٹھ جائے اور گھٹنے کھڑے ہوں۔ اس حالت پر سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، ہاں کروٹ سے سونا ناقضِ وضو ہے۔ (۳) صفوان بن عسال کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام ہمیں حکم دیا کرتے تھے :۔

وَلٰکن مِن غائطٍ و بول و نوم (ترمذی وصححہ) | کہ ہم موزے پاخانہ یا پیشاب، و نیند کے بعد نہ اُتاریں۔

اس حدیث صحیح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جیسے پیشاب پاخانہ کا آنا ناقضِ وضو ہے۔ اسی طرح نیند بھی ناقضِ وضو ہے۔ رہا مذہبِ دوم والوں کا یہ کہنا کہ اس حدیث میں نیند کو مطلقاً ناقضِ وضو قرار دیا گیا ہے لہٰذا بحالتِ قیام و قعود و رکوع سو جانا بھی ناقضِ وضو ہونا چاہئے تو جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں قیام و قعود کا ذکر نہیں ہے صرف نیند کے ناقضِ وضو ہونے کا بیان ہے۔ رہا "بحالت قیام و قعود، رکوع و سجود میں سونا ناقضِ وضو نہیں ہے"۔ یا "صرف اونگھنا ناقضِ وضو نہیں ہے"۔ یہ بات دوسرے آثار سے ثابت ہے لہٰذا اگر اس حدیث میں عموم مانا جائے تو دوسری حدیث سے تخصیص کی جائے گی (۴) یزید ابن عبدالرحمٰن قتادہ سے وہ ابی العالیہ وہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا۔

لَيْسَ عَلٰى مَنْ نَامَ سَاجِدًا وُضُوْءٌ حَتّٰى يَضْطَجِعَ فَاِنَّهٗ اِذَا اضْطَجَعَ اسْتَرْخَتْ مَفَاصِلُهٗ (احمد، ترمذی، دارقطنی، ابوداؤد) | جو بحالتِ سجدہ سو جائے اس پر وضو نہیں یہاں تک کہ کروٹ سے سوئے، کیونکہ کروٹ سے سونے سے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔

(۵) لَا وُضُوْءَ عَلٰى مَن نَامَ قَائِمًا (دارقطنی) | جو کھڑے کھڑے سو جائے اس پر وضو نہیں ہے۔

(۶) لا يجب الوضوء عَلٰى مَنْ نَامَ جَالِسًا اوقَائِمًا اوسَاجِدًا حَتّٰى يَضَعَ جَنْبَه (بیہقی) | جو کھڑے کھڑے، بیٹھے بیٹھے یا سجدہ کی حالت میں سو جائے اس پر وضو واجب نہیں یہاں تک کہ کروٹ سے سو جائے۔

یزید سے مراد یزید دالانی ہیں۔ امام احمد و نسائی نے کہا۔ یزید دالانی میں کوئی برائی نہیں۔ امام ذہبی نے مغنی میں کہا یہ مشہور ہیں اور ان کی حدیث حسن ہے۔ ابوحاتم نے فرمایا یزید ثقہ ہے مگر دوسرے لوگوں نے سخت جرح کی ہے اور ضعیف قرار دیا ہے (واللہ اعلم) تفصیل کے لیے نیل الاوطار جلد ا ص ۹۳، ۹۴ دیکھیے۔ بحالتِ سجدہ سونے میں وضو نہیں ٹوٹتا۔ مگر اس سجدہ سے مراد سجدہ مسنونہ ہے جو نماز میں کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سجدہ میں کچھ استمساک باقی رہتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ نیند ناقضِ وضو نہیں ہے مگر نیند کو ناقضِ وضو اس لیے قرار دیا گیا کہ سونے سے آدمی بے خبر ہو جاتا ہے اور اعضا ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور عادۃً استرخاء اعضاء کے سبب ہوا کے نکل جانے پر ظن غالب ہوتا ہے اور جو بات عادۃً ثابت ہو وہ مثل متیقن کے ہوتی ہے تو اب کوئی شخص ایسا ہو جو نیند کی حالت میں بھی کامل طور پر غافل نہیں ہوتا اور اس کو گرد و پیش کے حالات کی خبر رہتی ہے اس کی نیند ناقضِ وضو نہ ہوگی۔ مگر یہ بات عام لوگوں میں عادۃً نہیں پائی جاتی۔ اس لیے نیند کو ناقضِ وضو ہی قرار دینا پڑے گا۔ امام نووی علیہ الرحمۃ نے شرح مسلم میں مذکورہ بالا آٹھ مذاہب کا ذکر کرنے کے بعد لکھا

ہے کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ زوالِ عقل، جنون، بیہوشی اور نشہ ناقضِ وضوء ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص سے یہ بھی ہے کہ آپ کا کروٹ سے سونا ناقضِ وضوء نہیں جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہوا حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کروٹ سے سوئے پھر بغیر وضوء کئے آپ نے نماز پڑھی (انتہی) - جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضور علیہ السلام کی نیند آپ پر غفلت و بے خبری کو طاری نہیں کرتی تھی - یہی وجہ تھی جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے استفسار پر حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں اور دل جاگتا ہے۔

استحاضہ و بواسیر کا خون ناقضِ وضوء ہے

بعض مالکیہ کا قول ہے کہ سبیلین سے خلافِ عادت جو چیز خارج ہو وہ ناقض نہیں ہے۔ مثلاً کنکر، پتھر، ریت، کیڑا وغیرہ کا نکلنا کیونکہ سبیلین سے جو چیز بھی خارج ہو خواہ معتاد ہو یا غیر معتاد بہر صورت ناقضِ وضوء ہے۔ لہٰذا بواسیر کا خون اور استحاضہ کا خون ناقضِ وضوء قرار پائے گا۔ استحاضہ اس خون کو کہتے ہیں جو عورت کی شرمگاہ سے کسی مرض کی وجہ سے آتا ہے۔ اب اگر استحاضہ اس حد تک پہنچ گیا کہ اس کو اتنی مہلت نہیں ملتی کہ وضوء سے فرض نماز ادا کر سکے تو نماز کا پورا ایک وقت شروع سے آخر تک اسی حالت میں گزر جانے پر اس کو معذور قرار دیا جائیگا۔ اب وہ ایک وضوء سے اس وقت میں جتنی نمازیں (فرض واجب قضاء و نفل) چاہے پڑھے اس خاص صورت میں خون آنے سے اس کا وضوء نہیں جائیگا۔ یہی حکم ہر شخص کا ہے جس کو کوئی ایسی بیماری ہے کہ ایک وقت پورا ایسا گزر گیا کہ وضوء کے ساتھ نماز فرض ادا نہ کر سکا وہ معذور ہے۔ جیسے قطرہ کا مرض ہو یا دست آنا یا ہوا خارج ہونا، یا دکھتی آنکھ سے پانی گرنا یا پھوڑے یا ناسور سے ہر وقت رطوبت بہنا یا کان سے ہر وقت رطوبت نکلنا کہ یہ سب بیماریاں وضوء توڑنے والی ہیں۔ ان میں جب پورا وقت ایسا گزر گیا کہ ہر چند کوشش کی مگر وضوء کے ساتھ نماز نہ پڑھ سکا تو عذر ثابت ہوا۔ ایسے لوگ ہر نماز کے لیے وضوء کریں اور اس ایک وضوء سے جب تک اس نماز کا وقت موجود ہے اس میں جتنی نمازیں چاہیں پڑھ سکتے ہیں۔ یہ تمام مسائل متعدد حدیثوں سے اخذ کئے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبیش نے عرض کی کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے استحاضہ کی بیماری ہے اور خون بند نہیں ہوا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

فامرھا ان تدع الصلوٰۃ ایام اقرائھا ثم تغتسل و توضاء لکل صلوٰۃ و تصلی و ان قطر الدم علی الحصیر (بخاری و مسلم و طحاوی)

کہ وہ صرف حیض کے دنوں میں نماز نہ پڑھیں۔ جب حیض کے دن پورے ہو جائیں تو غسل کر لیں اس کے بعد ہر نماز کے لیے تازہ وضوء کریں اور نماز پڑھیں۔ اگرچہ یہ خون چٹائی پر ہی کیوں نہ ٹپک جائے۔

یہ اور اس مضمون کی متعدد حدیثیں واضح کرتی ہیں کہ سبیلین سے جو چیز بھی خارج ہو خواہ وہ معتاد ہو یا غیر معتاد بہر حال ناقضِ وضوء ہے۔ اس حدیث میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جس کو استحاضہ کی بیماری ہو، تو ایسی عورت کو چاہیئے کہ صرف ایام حیض میں نماز نہ پڑھے، جب حیض کی مدت پوری ہو جائے تو غسل کرلے اور اس کے بعد ہر نماز کے لیے وضوء کرے اور نماز پڑھے جس کی تشریح اوپر گزر چکی ہے۔

عورت کو چھونا ناقضِ وضو نہیں ہے

اس مسئلہ میں بھی علماء و آئمہ کا اختلاف ہے۔ علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں لکھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود و ابن عمر و زہری و شافعی اور ان کے اصحاب اور زید ابن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ فرماتے ہیں کہ عورت کو چھونا ناقضِ وضو ہے خواہ شہوت کے ساتھ عورت کو ہاتھ لگایا یا بغیر شہوت کے، خواہ عورت اجنبی ہو یا اجنبی نہ ہو۔ ان حضرات کی دلیل آیت اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً الخ ہے یہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں لمس سے مراد چھونا ہے۔ چنانچہ:

۱۔ حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود نے لمس کے معنیٰ ہاتھ سے چھونے کے کیے۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرمایا کرتے تھے، جو اپنی عورت کا بوسہ لے یا چھوئے اس پر وضو ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا۔ بوسہ لمس میں داخل ہے اور لمس سے وضو لازم ہے۔ (بیہقی) ۲۔ حاکم نے فرمایا۔ لمس کے معنے چھونے کے ہیں، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ کوئی دن ایسا نہ ہوتا کہ حضور علیہ السلام ہمارے پاس تشریف لائیں اور بوسہ نہ لیں اور لمس نہ کریں۔ بیہقی نے حدیث ابو ہریرہ سے استدلال کیا کہ ہاتھوں کا زنا لمس ہے اور ماعز کے واقعہ میں حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ شاید تم نے بوسہ لیا ہو گا یا لمس کیا ہو گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ لمس چھونے (ہاتھ لگانے) کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔

احناف کا مسلک

حضرت علی و ابن عباس، عطاء، طاؤس، حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ عورت کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا اور حق یہ ہے کہ احناف کے دلائل اس مسئلہ میں بہت قوی ہیں۔

(۱) حنفیہ کہتے ہیں کہ آیت سے لمس سے مراد ہاتھ سے چھونا نہیں بلکہ جماع ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن حمید نے باسنادِ صحیح روایت کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک لمس سے مراد جماع ہے اور تفسیر کے باب میں سیدنا ابن عباس کا قول راجح ہے اور دیگر صحابہ حضرت عمر و ابن مسعود و ابن عمر کے قول کا درجہ نہیں ہے جو جناب ابن عباس کے قول کا ہے۔ اس کے علاوہ احادیثِ مرفوعہ بھی اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ عورت کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ (۲) رہا حدیثِ عائشہ و ابو ہریرہ وقصہ ماعز رضی اللہ تعالےٰ عنہم سے استدلال تو ان احادیث سے صرف اتنی بات واضح ہوتی ہے کہ لمس کے معنیٰ ہاتھ سے چھونے یا بوسہ لینے کے بھی آتے ہیں، اور ہمیں اس سے انکار نہیں ہے۔ مَابِهِ النِّزَاع تو یہ بات ہے کہ آیت میں لمس کے معنیٰ چھونے کے ہیں یا جماع کے تو حضرت ابن عباس نے اس کے معنیٰ جماع کے کیے اور ان کی تفسیر کا دیگر صحابہ کی تفسیر سے ارجح و اقوی ہونا ظاہر ہے۔

امام شافعی حدیثِ ذیل سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ جس کا مضمون یہ ہے کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور عرض کی کہ اس شخص کے متعلق کیا حکم ہے جس نے ایک عورت سے سب کچھ کیا مگر جماع نہیں کیا تو اللہ تعالےٰ نے آیت واقمو الصلوٰۃ طرفی النہار الخ نازل فرمائی اور حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ توضاء ثم صل وضو کر اور پھر نماز پڑھ (احمد و دارقطنی)۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت کو ہاتھ لگانا یا بوسہ لینا وغیرہ ناقضِ وضو ہے۔ حنفیہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث منقطع ہے۔ عبدالملک بن عمر عبدالرحمٰن بن ابی لیلےٰ سے وہ حضرت معاذ سے روایت کرتے ہیں لیکن عبدالرحمٰن کا حضرت معاذ سے سماع ثابت نہیں۔ اس حدیث کو عبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے مگر مرسلاً

کمافی النسائی اور صحیحین (بخاری ومسلم) نے اس حدیث کو روایت کیا ہے مگر اس میں یہ لفظ نہیں ہیں کہ حضور علیہ السلام نے اس کو وضوء کرنے کا حکم دیا۔ علامہ شوکانی نے یہ لکھا کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ عورت کو چھونا ناقض وضوء ہے کیونکہ اس حدیث میں یہ تصریح نہیں ہے کہ حضور علیہ السلام کے حکم دینے سے پہلے وہ شخص باوضو تھا اور یہ کہ وہ لمس سے پہلے باوضو تھا۔ اس لیے حضور علیہ السلام نے اس کو وضو جاتے رہنے کی اطلاع دی (نیل الاوطار ج ۱ ص ۱۹۵) زیلعی علیہ الرحمۃ نے فرمایا یہ حدیث قابل حجت نہیں ہے۔ اول تو یہ ضعیف اور منقطع ہے۔ دوسرے ہوسکتا ہے کہ وضوء کا حکم دینا گناہ کی معافی کے لیے ہو، نہ اس لیے کہ لمس امراۃ حدث ہے اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں یہ ہے کہ ایک شخص حاضر ہوا۔ عرض کی کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے لیے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو بخش دے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اچھی طرح وضوء کر پھر دو رکعت پڑھ، پھر اللہ سے دعا کر۔ نیز علامہ زیلعی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آیت میں لمس سے مراد چھونا "لیتے تھے اس کو ابن عبدالبر نے ضعیف قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے۔ دراصل یہ قول حضرت عمر کا نہیں ہے بلکہ حضرت ابن عمر کا ہے۔ حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ" جن مرفوع حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ ان میں سے دو ایک یہ ہیں۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُقَبِّلُ بَعْضَ اَزْوَاجِہٖ ثُمَّ یُصَلِّی وَلَا یَتَوَضَّاءُ (ابوداؤد ونسائی)

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعض ازواج مطہرات کا بوسہ لینے کے بعد بغیر وضوء فرمائے نماز ادا فرماتے تھے۔

اس حدیث کو ابوداؤد نے مرسلاً روایت کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ اس کے راویوں میں ابراہیم تیمی ہیں جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن حضرت ابراہیم کا جناب عائشہ صدیقہ سے سماع ثابت نہیں۔ امام ترمذی نے فرمایا کہ اس حدیث کو امام ترمذی نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن علامہ ابن عبدالبر اور ایک جماعت محدثین نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ راقم یہ کہتا ہے کہ اگر یہ حدیث مرسل یا ضعیف ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کے علاوہ متعدد صحیح حدیثیں ہیں جو اس کے اصل مضمون کی تائید و توثیق کرتی ہیں۔

۱۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام نماز میں مصروف ہوتے اور میں آپ کے سامنے سورہی ہوتی۔ آپ جب سجدہ فرماتے تو میرا پاؤں دبا دیتے۔ میں سمیٹ لیتی پھر جب آپ کھڑے ہوجاتے تو میں پاؤں پھیلا دیتی (بخاری ومسلم) اس حدیث صحیح سے ثابت ہوتا ہے کہ مس امرأۃ ناقض وضوء نہیں ہے۔

آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا

علماء کا ایک طائفہ اس امر کا قائل ہے کہ آگ سے پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ حضرات متعدد ایسی حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ جن کا مضمون یہ ہے کہ:۔

(۱) ابراہیم بن عبداللہ بن قارظ کہتے ہیں۔ میں نے حضرت ابوہریرہ کو مسجد میں وضوء کرتے دیکھا تو ابوہریرہ نے کہا کہ میں نے پنیر کے ٹکڑے کھائے اس لیے وضوء کررہا ہوں اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

تَوَضَّئُوْا مِمَّا غَيَّرَتِ النَّارُ (احمد، مسلم، نسائی) | وضو کرو، آگ کی پکی ہوئی چیزوں کے (کھانے سے)

تقریباً اسی مضمون کی دس پندرہ حدیثیں ہیں جو ابن ماجہ، نسائی، ابوداؤد، احمد بن حنبل وطحاوی میں مختلف صحابہ کرام حضرت انس، حضرت ابوہریرہ، زید ابن ثابت، ابوسلمہ ابوطلحہ، ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہیں (دیکھو طحاوی کتاب الطہارۃ، نیل الاوطار ج ۱ ص ۱۹۵) اس مضمون کی احادیث سے بعض حضرات یہ استدلال کرتے ہیں کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کھا لینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن احناف کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ وہ تمام حدیثیں جن میں آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے کو ناقضِ وضو قرار دیا گیا ہے منسوخ ہیں جیسا کہ اس باب کی دوسری حدیثوں سے واضح ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حکم یہی تھا کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ چنانچہ خلفاء اربعہ، ابوبکر، عمر، عثمان وعلی، عبداللہ بن مسعود، ابودردار، ابن عباس، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، جابر ابن سمرہ، زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری، ابی ابن کعب، ابوطلحہ، عامر بن ربیعہ، ابوامامہ، مغیرہ بن شعبہ، جابر بن عبداللہ، عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایسے جلیل القدر صحابہ کرام، تابعین عظام، امام مالک وامام ابوحنیفہ و امام شافعی وعبداللہ بن مبارک، امام احمد واسحاق بن راہویہ، یحییٰ بن یحییٰ، ابوثور، ابوخثیمہ، سفیان ثوری، اہلِ حجاز، اہلِ کوفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا قول یہ ہے کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کا کھانا ناقضِ وضو نہیں ہے۔ یہ حضرات تقریباً انتیس حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جن کو بخاری ومسلم ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، احمد، ابوداؤد وامام طحاوی نے ابن عباس، ابورافع میمونہ ام المومنین، انس بن مالک، ام سلمہ، حضرت جابر ایسے صحابہ کرام سے روایت کیا جن کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے بکری کا گوشت تناول فرمایا اور بغیر وضو کئے نماز پڑھی اور آثارِ صحابہ وتابعین بھی بہت ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا اور عقل بھی یہ چاہتی ہے کیونکہ اس میں تو سب کا اتفاق ہے کہ آگ پر پکانے سے پہلے کسی چیز کا بھی کھانا ناقضِ وضو نہیں ہے۔ ٹھنڈے پانی سے وضو جائز ہے اور اسی طرح گرم پانی سے بھی جائز ہے۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ جن پاک چیزوں کو آگ پر پکانے سے پہلے کھانا ناقضِ وضو نہیں ہے۔ ان کا آگ پر پکانے کے بعد بھی ناقضِ وضو نہیں ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ پانی سے وضو جائز ہے اور جب پانی گرم کر لیا جائے تو آگ اس پانی کے حکم میں کوئی تغیر پیدا نہیں کرتی۔ (تفصیل کے لیے نیل الاوطار (جلد اول وطحاوی) کا مطالعہ مفید رہے گا۔

اُونٹ کا گوشت کھانا ناقضِ وُضو نہیں ہے

علامہ شوکانی نے لکھا ہے کہ امام احمد ابن حنبل، اسحاق بن راہویہ، یحییٰ بن یحییٰ، ابوبکر ابن المنذر اور ابن خزیمہ وغیرہ علماء کا قول یہ ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ متعدد حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ حضرت جابر ابن سمرہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضور علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا ہم بکری کا گوشت کھا کر وضو کریں۔ آپ نے فرمایا۔ اگر جی چاہے تو وضو کر لو ورنہ نہیں۔ اس شخص نے پھر سوال کیا:

اَنَتَوَضَّاُ مِنْ لُحُوْمِ الْاِبِلِ قَالَ نَعَمْ (احمد، مسلم) | حضور اونٹ کا گوشت کھانے پر وضو کریں۔ فرمایا۔ ہاں

اور خلفاءِ اربعہ جناب صدیقِ اکبر وفاروقِ اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، ابن مسعود، ابی ابن کعب، ابن عباس،

ابو درداء، ابوطلحہ، عامر بن ربیعہ، ابو امامہ، جمہور تابعین اور امام مالک و شافعی و امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ کسی بھی حلال جانور کا پکا ہوا گوشت کھانا ناقضِ وضوء نہیں ہے خواہ وہ بکری کا گوشت ہو یا اونٹ کا۔ یہ حضرات حدیثِ جابر سے استدلال کرتے ہیں:۔

اِنَّ آخِرَ الْاَمْرَیْنِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَرْكُ الْوُضُوْءِ مِمَّا غَیَّرَتِ النَّارُ (طحاوی)

کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخر حکم آگ سے پکی ہوئی چیز کھانے پر وضوء نہ کرنا تھا۔

اور اس میں بکری اور اونٹ دونوں کے گوشت شامل ہیں۔ تو جب بکری کا گوشت کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا تو اونٹ کا گوشت کھانے سے بھی نہیں ٹوٹے گا کیونکہ بلحاظِ طہارتِ گوشت دونوں مساوی ہیں لہٰذا ان کے احکام میں بھی مساوات ہوگی (فیض نظر)

۱۷۵- عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَزَالُ الْعَبْدُ فِیْ صَلٰوةٍ مَّا كَانَ فِی الْمَسْجِدِ یَنْتَظِرُ الصَّلٰوةَ مَا لَمْ یُحْدِثْ فَقَالَ رَجُلٌ اَعْجَمِیٌّ مَّا الْحَدَثُ یَا اَبَا هُرَیْرَةَ قَالَ الصَّوْتُ یَعْنِی الضَّرْطَةَ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ ہمیشہ نماز میں رہتا ہے (یعنی نماز کا ثواب اس کو ملتا رہتا ہے) جب تک مسجد میں نماز کا انتظار کرتا رہے اور اس کو حدث نہ ہو۔ اس پر ایک غیر عربی شخص نے سوال کیا۔ ابوہریرہ حدث کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا۔ ہوا نکلنے کی آواز آنا۔

مسائلِ حدیث

حدیثِ ہذا مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے (۱) نماز کے انتظار میں رہنا کار ثواب ہے۔ کیونکہ انتظارِ عبادت بھی عبادت ہے (۲) لِمَنْ لَا یحدث کے لفظ سے یہ معلوم ہوا کہ یہ ثواب اس وقت تک ملتا ہے جب تک آدمی باوضوء رہے اور یہ کہ نماز کا انتظار مسجد میں کرے (۳) حضرت ابوہریرہ سے کسی نے سوال کیا کہ حدث سے کیا مراد ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہوا کا نکلنا یعنی ہوا کے نکلنے سے وضو جاتا رہتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جناب ابوہریرہ نے صرف (ہوا نکلنے کو) کیوں حدث قرار دیا۔ حالانکہ اس کے علاوہ بھی متعدد باتوں کے پائے جانے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے۔ جیسے پاخانہ پیشاب کا آنا یا جسم کے کسی بھی حصے سے نجاست کا نکلنا وغیرہ تو جواب یہ ہے کہ یہاں حضرت ابوہریرہ کا مقصود یہ بتانا نہیں ہے کہ حدث صرف ہوا کا نکلنا ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ جو شخص مسجد میں باوضوء دوسری نماز کے انتظار میں بیٹھا ہے اس کا وضوء جاتے رہنے کی یہی شکل ہو سکتی ہے کہ ہوا خارج ہو جائے۔ کیونکہ عموماً مسجد میں بیٹھے ہوئے شخص کا وضوء ہوا خارج ہونے سے ہی جاتا ہے اور پاخانہ و پیشاب و دیگر اسباب جو وضوء کو توڑ دیتے ہیں۔ ان کا ظہور عموماً مسجد میں نہیں ہوتا۔ اس لیے حضرت ابوہریرہ نے وضوء کو توڑنے والے اسباب میں سے صرف ایک خاص سبب ہوا کے خارج ہونے کا ذکر کر دیا (۴) اس حدیث کے بعد امام بخاری نے وہی حدیث ذکر کی ہے جو (باب لا یتوضأ من الشك حتّٰی یستیقن) میں گزر چکی ہے۔ ہم اس پر مکمل بحث گزشتہ اوراق میں کر چکے ہیں۔ اس لیے ہم نے یہاں نہیں لکھا۔ اس حدیث کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص نماز پڑھ رہا ہو وہ اس وقت تک نماز نہ توڑے جب تک

کہ ہوا نکلنے کی آواز آئے یا بدبو آئے۔ مطلب یہ ہے کہ محض ہوا نکلنے کا وہم یا شک ہونا وضو کو نہیں توڑتا (تفصیل صر پر)

۱۷۶- محض شک سے وضو نہیں ٹوٹتا

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَنْصَرِفُ حَتّٰى يَسْمَعَ صَوْتًا اَوْ يَجِدَ رِيْحًا

عباد ابن تمیم اپنے چچا عبداللہ سے راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نماز نہ چھوڑے یہاں تک ہوا نکلنے کی آواز سنے یا بدبو پائے۔
(بخاری)

فوائد ومسائل اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب الطہارۃ میں اور مسلم، ابوداؤد ونسائی اور ابن ماجہ نے بھی کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا ہے (۲) مطلب حدیث یہ ہے کہ نمازی کو اگر نماز میں یہ شک ہو کہ ہوا نکلی ہے یا نہیں، تو نماز پڑھے جائیں یعنی محض شک وشبہ کی وجہ سے یہ نہ سمجھے کہ وضو ٹوٹ گیا ہے کیونکہ یقینی بات شک سے زائل نہیں ہوتی۔ طہارت (وضو کا ہونا) یقینی ہے اور حدث یعنی ہوا نکلنے کا شبہ یا شک عارضی ہے۔ ہاں اگر آواز سنائی دے بو آئے تو پھر یقین کیا جائے گا کہ ہوا نکلی ہے اور اب وضو ٹوٹا ہے۔

۱۷۷- مذی ناقضِ وضو ہے

حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم فرماتے ہیں کہ میرے مذی بہت نکلتی تھی۔ میں نے حضور علیہ السلام سے اس کے متعلق خود پوچھنے میں شرم کی اور حضرت مقداد بن اسود سے کہا کہ وہ اس کے متعلق حضور علیہ السلام سے سوال کریں، ان کے سوال کرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

فِيْهِ الْوُضُوْءُ (بخاری)

مذی کے نکلنے سے وضو ہے

فوائد ومسائل یہ حدیث کتاب العلم میں صر پر مع تفہیم وترجمانی کے گزر چکی ہے۔ مذی اس رطوبت کو کہتے ہیں جو بوقت بوس وکنار شرمگاہ سے نکلتی ہے۔ بعض اوقات شہوانی خیالات کے آنے پر بھی یہ رطوبت خارج ہو جاتی ہے۔ یہ لیسدار چمکیلا سا مادہ ہوتا ہے۔ جس میں منی کی سی بُو اور گاڑھا پن نہیں ہوتا۔ مذی کے نکلنے سے آلہ کا انتشار بھی ختم نہیں ہوتا اور ہر شخص کو خود اندازہ ہو جاتا ہے کہ مذی نکلی ہے یا منی۔ یہ تشریح میں نے اس لیے کی ہے کہ بعض لوگ مذی کے نکلنے سے پریشان ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ غسل واجب ہو گیا ہے۔ حالانکہ غسل اس وقت واجب ہوتا ہے جب کہ منی شہوت کے ساتھ نکلے اور مذی کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر مذی خارج ہو تو شرمگاہ کو دھو کر وضو کیا جائے۔ مذی بھی منی کی طرح ناپاک ہے۔

۱۷۸- (۱) اَنَّ زَيْدَ بْنَ خَالِدٍ اَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ سَاَلَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قُلْتُ اَرَاَيْتَ اِذَا جَامَعَ وَلَمْ يُمْنِ قَالَ عُثْمَانُ يَتَوَضَّاُ كَمَا يَتَوَضَّاُ لِلصَّلٰوةِ وَيَغْسِلُ ذَكَرَهٗ قَالَ عُثْمَانُ سَمِعْتُهٗ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلْتُ عَنْ ذٰلِكَ عَلِيًّا

حضرت زید ابن خالد مدنی صحابی نے جناب عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا مجھے بتائیے اگر کوئی شخص جماع کرے اور انزال نہ ہو (تو اس پر غسل ہے یا نہیں) حضرت عثمان نے فرمایا۔ وہ نماز کے وضو کی طرح وضو کرے اور شرمگاہ دھو ڈالے۔ حضرت عثمان نے فرمایا میں نے حضور سے بھی سنا اور میں نے اسی مسئلہ کے متعلق

وَّالزُّبَيْرَ وَطَلْحَةَ وَاُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ فَاَمَرُوْهُ بِذٰلِكَ

حضرت علی وزبیر وطلحہ وابی بن کعب سے بھی پوچھا تو انھوں نے مذکورہ بالا جواب دیا۔

۱۷۹ - (۲) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْسَلَ رَجُلًا مِّنَ الْاَنْصَارِ فَجَاءَ وَرَاْسُهٗ يَقْطُرُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَلَّنَا اَعْجَلْنَاكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُعْجِلْتَ اَوْ قُحِطْتَ فَعَلَيْكَ الْوُضُوْءُ (بخاری)

حضرت ابوسعید خدری نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری کو بلا بھیجا۔ وہ اسی حالت میں حاضر ہوئے کہ ان کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا (یعنی نہا کر آئے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید ہم نے تمہیں مشکل میں ڈال دیا۔ انھوں نے جواب دیا۔ ہاں۔ تب آپ نے فرمایا۔ جب تم جلدی میں پڑجاؤ یا تمہاری منی رُک جائے (انزال نہ ہو) تو تم پر وضو ہے۔

فوائد و مسائل

(۱) حدیث ۱ کو امام نے مکرر اسی باب میں ذکر کیا ہے اور مسلم نے کتاب الطہارۃ میں درج کیا اور حدیث ۲ کو مسلم و ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے (۲) حدیث ۱ کا مطلب تو واضح ہے اور حدیث ۲ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ انصاری جن کو حضور علیہ السلام نے طلب فرمایا اور وہ اسی حالت میں حاضر ہوئے کہ سر سے پانی ٹپک رہا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ کر جان لیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ مشغول تھے اور میرے بلانے پر جلدی میں پڑ گئے اور بیوی سے علیحدہ ہو کر غسل کر کے حاضر ہوئے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر صحبت کی جائے اور انزال نہ ہو تو ایسی صورت میں غسل فرض نہیں ہوتا صرف وضو کافی ہے۔ باب سے ان دونوں حدیثوں کا تعلق یہی ہو سکتا ہے کہ ان میں وضو کا ذکر ہے۔ یہ تو ہے ان دونوں حدیثوں کا نفسِ مضمون۔ اب اس مسئلہ کی پوری وضاحت کی جاتی ہے۔

دخول کے بعد انزال نہ ہو تو غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں

واضح ہو کہ جب آدمی جماع کرے اور دخول ہو جائے۔ مگر انزال نہ ہو (یعنی منی نہ نکلے) تو غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں۔ تو اس مسئلہ میں صحابہ کرام میں بھی اختلاف رہا ہے۔ اس لیے علماء کرام کے بھی دو گروہ ہو گئے۔ محلی نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان غنی و علی ابن طالب، ابوسعید خدری، ابی بن کعب، عطاء ابن رباح، ابوسلمہ ابن عبدالرحمٰن، ہشام بن عروہ اعمش، بعض اصحاب ظاہر کا قول یہ ہے کہ اس صورت میں غسل واجب نہیں ہوتا۔ صرف وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں صرف شرمگاہ کو دھو لیا جائے اور وضو کیا جائے (عینی ج ۱ ص ۸۰۴) جو علماء غسل کے واجب ہونے کا قول نہیں کرتے ان کی دلیل یہ دونوں زیر بحث حدیثیں بھی ہیں اور اس کے علاوہ اور بھی متعدد حدیثیں اور اقوالِ صحابہ ہیں جنہیں امام طحاوی نے طحاوی میں درج کیا ہے۔ مثلاً حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

(۱) اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ وَالْغُسْلُ عَلٰى مَنْ اَنْزَلَ

پانی پانی سے ہے یعنی غسل اس وقت واجب ہوتا ہے جب کہ منی نکلے

(۲) لَيْسَ فِي الْاِكْسَالِ اِلَّا الطُّهُوْرُ (طحاوی)

اور فرمایا کہ منی نہ نکلنے کی صورت میں صرف وضو ہے۔

(۲) اور حضرات خلفاءِ اربعہ وجمہور صحابہ وتابعین وفقہاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ اگر دخول کیا اور انزال نہ ہوا تو غسل واجب ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے فرمایا کہ تمام صحابہ کرام کا اس امر پر اجماع ہے کہ مجرد دخول سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔ اگر چہ انزال نہ ہو (نیل الاوطار ج ۱ صفحہ ۲۲۰) ابن حزم نے کہا۔ جناب ام المومنین عائشہ صدیقہ، صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، ابن عباس، ابن مسعود، مہاجرین صحابہ، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، احمد بن حنبل، امام نخعی وثوری رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی یہی مسلک ہے (عینی ج ۱ صفحہ ۸۰۵)

نیز علامہ ابن عربی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ مجرد دخول سے غسل پر اجماع ہوگیا (نووی شرح مسلم) اور وہ حدیثیں جن میں صرف وضو کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ منسوخ ہیں۔ چنانچہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ابتداء میں یہی فتویٰ تھا کہ صرف دخول سے غسل واجب نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے بعد اس حکم کو منسوخ کر دیا اور غسل کو واجب قرار دیا گیا۔ اصل الفاظ یہ ہیں:۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَخَّصَ بِهَا فِي اَوَّلِ الْاِسْلَامِ ثُمَّ اَمَرَنَا بِالْاِغْتِسَالِ (احمد، ابوداؤد، ترمذی)

حضور علیہ السلام نے ابتداءِ اسلام میں اس امر کی رخصت دی تھی کہ جو شخص جماع کرے اور انزال نہ ہو وہ صرف وضو کرلے (لیکن اس کے بعد یہ حکم منسوخ فرمادیا) اور غسل کرنے کا حکم دیا۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب آدمی جماع کرے

فَقَدْ وَجَبَ عَلَيْهِ الْغُسْلُ وَاِنْ لَمْ يُنْزِلْ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ واحمد بن حنبل)

تو اس پر غسل واجب ہے اگرچہ انزال نہ ہو اور فرمایا۔

اِذَا جَاوَزَ الْخِتَانُ الْخِتَانَ فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ (طحاوی)

جب شرمگاہ سے شرمگاہ مل جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔

امام طحاوی نے اس مسئلہ کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور اس باب میں متعدد حدیثیں ذکر کی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ وضوء کے حکم والی حدیثیں منسوخ ہیں اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنی بیوی سے صحبت کرے اور دخول ہو جائے (یعنی حشفہ داخل ہو جائے) تو خواہ منی نکلے یا نہ نکلے بہرصورت غسل واجب ہے۔

بَابُ الرَّجُلِ يُوَضِّئُ صَاحِبَهُ

باب کسی شخص کا اپنے ساتھی کو وضو کرانا

اس باب میں امام بخاری نے دو حدیثیں لکھی ہیں۔ ۱۸۰۔ حدیث اول کا مضمون یہ ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ جب حضور علیہ السلام عرفات سے واپس ہوئے تو آپ گھاٹی کی طرف مڑ گئے۔ وہاں آپ حاجت سے فارغ ہوئے تو میں پانی لے کر حاضر ہوا۔ دوسری حدیث کا مضمون یہ ہے کہ حضرت

۱۸۱۔ وَاَنَّ الْمُغِيْرَةَ جَعَلَ يَصُبُّ الْمَاءَ عَلَيْهِ وَهُوَ يَتَوَضَّاُ فَغَسَلَ وَجْهَهُ

مغیرہ آپ پر پانی ڈالنے لگے اور آپ وضو فرما رہے تھے۔ آپ نے چہرہ مبارک اور ہاتھ دھوئے

وَيَا بَيْدِ وَمَسَحَ بِرَاسِهِ وَمَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ

سر مبارک کا مسح فرمایا اور موزوں پر مسح کیا۔ (بخاری)

ان دونوں حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے ساتھی یا بزرگ کو وضو کرا دے تو اس میں حرج نہیں اور یہ فعل بلاکراہت جائز و مباح ہے بلکہ سُنّت ہے اور یہ بھی کہ چمڑے کے موزے پہنے ہوں تو ان پر مسح جائز ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو گزشتہ اوراق میں ہو چکی ہے۔

بَابُ قِرَاءَةِ الْقُرْاٰنِ بَعْدَ الْحَدَثِ وَغَيْرِهٖ

باب قرآن پاک کا بے وضو پڑھنا جائز ہے؟

وَقَالَ مَنْصُوْرٌ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ لَا بَاْسَ بِالْقِرَاءَةِ فِي الْحَمَّامِ وَبِكَتْبِ الرِّسَالَةِ عَلٰى غَيْرِ وُضُوْءٍ وَّقَالَ حَمَّادٌ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ اِنْ كَانَ عَلَيْهِ اِزَارٌ فَسَلِّمْ وَاِلَّا فَلَا تُسَلِّمْ

منصور نے ابراہیم نخعی سے نقل کیا کہ حمام کے اندر قرآن پڑھنے میں حرج نہیں اور خط وغیرہ بے وضو لکھ سکتا ہے اور حماد بن سلیمان نے ابراہیم نخعی سے نقل کیا ہے کہ جو لوگ نہا رہے ہوں۔ اگر وہ تہبند باندھے ہوں ان کو سلام کرو، ورنہ نہیں۔

فوائد و مسائل عنوان کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بے وضو ہو اس کو قرأت قرآن جائز ہے اور ظاہر ہے کہ جب اس کو قرآن کریم کا پڑھنا جائز ہے تو تسبیح و تہلیل اور سلام کا جواب دینا بطریق اولیٰ جائز ہوگا۔

جنبی اور بے وضو کو قرآن کی تلاوت، درود شریف پڑھنا جائز ہے یا نہیں

(۱) جو شخص بے وضو ہے اسے قرآن پڑھنا، ذکر و اذکار، درود شریف، تسبیح و تہلیل، ورد، وظائف میں مشغول رہنا، سلام کا جواب دینا اور چھینک کے جواب میں الحمد للہ کہنا، یا یرحمک اللہ سے جواب دینا یا اذان کا جواب دینا جائز ہے۔ البتہ یہ بہتر ہے کہ ذکر و تسبیح و درود شریف وغیرہ باوضو ہو کر پڑھے۔
۲۔ جو شخص بے وضو ہے۔ اس کو قرآنِ مجید یا اس کی کسی آیت کا چھونا حرام ہے ہاں بغیر چھوئے، زبانی یا دیکھ کر پڑھے تو حرج نہیں (۳) جس کو نہانے کی حاجت ہو (جنبی) اس کو مسجد میں جانا، طواف کرنا، قرآنِ مجید چھونا، اگرچہ اس کا سادہ حاشیہ یا جلد یا چولی چھوئے یا دیکھ کر یا زبانی پڑھنا یا کسی آیت کا لکھنا یا آیت کا تعویذ لکھنا یا ایسا تعویذ چھونا یا ایسی انگوٹھی چھونا یا پہننا ناجائز ہے جس پر حروفِ مقطعات ہوں یا ایسا تعویذ یا تختی پہننا جس پر آیات قرآنی لکھی ہوں حرام ہے (۴) جنبی کو اذان کا جواب دینا جائز ہے۔ یونہی سلام کا جواب دینا اور تسبیح و تہلیل اور درود شریف پڑھنا بھی جائز ہے مگر بہتر یہ ہے کہ وضو یا کُلّی کر کے پڑھیں اور صرف قرآن مجید کو دیکھنا اگرچہ حروف پر نظر پڑے اور الفاظ سمجھ میں آئیں اور (زبان سے نہیں بلکہ) خیال سے پڑھے جائیں حرج نہیں۔ جنبی اور بے وضو کو فقہ و تفسیر و حدیث کی کتابوں کا چھونا مکروہ ہے مگر جہاں کاغذ پر قرآنِ کریم کی آیت لکھی ہو اس پر ہاتھ رکھنا حرام ہے۔ قرآن کا ترجمہ فارسی یا اُردو یا کسی اور زبان میں ہو اس کو بھی چھونے اور پڑھنے میں قرآنِ مجید ہی کا سا حکم ہے۔ جنبی کو قرآنِ کریم کی کتابت کرنا حرام ہے۔ یونہی بے وضو کو بھی قرآنِ کریم

کی کتابت جائز نہیں ہے۔

(ب) حضرت ابراہیم نخعی علیہ الرحمۃ کا قول ہے کہ حمام میں قرآن پڑھنا جائز ہے۔ اس اثر کو سعید ابن منصور نے موصولاً روایت کیا ہے لیکن امام قسطلانی نے لکھا ہے کہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک پاخانہ میں قرآن پڑھنا ناجائز ہے کیونکہ وہ نجاست کی جگہ ہے اور حمام میں بھی قرآن پڑھنا مکروہ ہے کہ وہ جگہ مار مستعمل اور دوسری کثافتوں کا مخزن ہے، نیز ابوداؤد و ترمذی و ابن ماجہ و نسائی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور علیہ السلام جب بیت الخلار تشریف لے جاتے تو اپنی انگوٹھی اُتار دیا کرتے تھے اور صحیح احادیث میں وارد ہوا کہ حضور علیہ السلام کی انگوٹھی کا نقش محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھا۔ تو جب اس انگوٹھی کو جس پر اللہ کا نام تھا حضور علیہ السلام نے پاخانہ میں لے جانا گوارا نہ فرمایا تو نجاست کی جگہ پر ذکرِ الٰہی اور قرأتِ قرآنِ پاک کیونکر روا قرار پائے گی۔ ہاں اگر حمام بالکل پاک و صاف ہو اور آدمی ننگا بھی نہ ہو تو پھر قرأتِ قرآنِ پاک میں حرج نہیں ہے لیکن نجس مقامات پر زبان سے اللہ کا ذکر مکروہ ہے۔ ہاں ذکرِ قلبی ہر جگہ جائز ہے۔ (یعنی دل سے ذکرِ الٰہی کرنا)۔ علامہ نووی نے لکھا ہے کہ پاخانہ و پیشاب کے وقت زبان سے ذکرِ الٰہی کرنا مکروہ ہے۔ علماء نے فرمایا کہ ایسی حالت میں تسبیح و تہلیل و تکبیر اور سلام کا جواب اذان کا جواب چھینکنے والے کا الحمد للہ کہنا مکروہ ہے۔ یونہی جماع کی حالت میں بھی ذکرِ الٰہی مکروہ ہے۔ حتیٰ کہ پاخانہ و پیشاب کرنے کی حالت میں سلام کا جواب دینا مکروہ ہے۔ امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے متعدد ایسی حدیثیں ذکر کیں ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام قضاءِ حاجت فرما رہے تھے۔ کسی نے سلام کیا آپ نے اس کا جواب نہ دیا فراغت کے بعد وضو یا تیمم کرکے سلام کا جواب دیا۔

وَيَكْتُبُ الرِّسَالَةَ اور بے وضو خط لکھنا بھی جائز ہے۔ خط یا رسالہ میں بسم اللہ یا کبھی قرآنِ کریم کی کوئی آیت لکھنے کی ضرورت پڑجاتی ہے تو امام نخعی سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا جائز ہے لیکن جنبی اور حائضہ کو خط لکھتے وقت بسم اللہ یا کسی اور آیتِ قرآن کی کتابت جائز نہیں ہے۔

وَقَالَ حَمَّادٌ اور جناب حماد بن ابی سلیمان، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کے استاذ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص تہبند باندھ کر نہا رہا ہے تو اس کو سلام کر سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ اس تعلیق کو امام ثوری نے موصولاً ذکر کیا اور ابن ماجہ و ابوداؤد میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کی ممانعت فرمائی کہ دو شخص ستر کھولے ہوئے گفتگو کریں۔ تو جب اس حالت میں عام گفتگو کی ممانعت ہے تو ایسے شخص کو سلام کرنا جو ننگا ہو کیسے روا قرار پائیگا۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور قرآنِ مجید میں سلام علیکم کے الفاظ ہیں۔

امام بخاری نے اس کے بعد ایک حدیث لکھی ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بیان ہے کہ ایک رات میں نے اپنی خالہ ام المومنین میمونہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں گزاری۔ میں بچھونے کے عرض میں لیٹ گیا اور حضور علیہ السلام مع اپنی زوجہ مطہرہ کے بستر میں آرام فرما ہوئے پھر آپ سو گئے۔ آدھی رات یا اس کے کچھ پہلے یا اس کے کچھ بعد آپ بیدار ہوئے۔ اپنی آنکھیں ملتے ہوئے، پھر آپ نے سورہ آل عمران کی اخیر کی دس آیتیں

(ان فی خلق السموٰت) سے اخیر تک تلاوت فرمائیں۔ پھر ایک مشک سے جو لٹک رہی تھی آپ نے اچھی طرح وضو فرمایا۔ پھر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ میں نے حضور کی طرح وضو کیا اور آپ کے بائیں پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ پھر آپ نے اپنا داہنا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور میرا داہنا کان پکڑا اور مجھے داہنے پہلو کر لیا۔ پھر آپ نے بارہ رکعتیں پڑھیں (دو دو رکعت کر کے) پھر وتر پڑھے، پھر لیٹ رہے۔ یہاں تک کہ موذن آیا۔ اس وقت آپ کھڑے ہوئے اور دو رکعت سنتِ فجر ہلکی پڑھیں پھر آپ مسجد میں آئے اور نماز فجر پڑھائی (بخاری)

فوائد ومسائل

۱۸۲۔ (۱) اس حدیث کا ہم نے عربی متن اس لیے نہیں لکھا کہ آئندہ ابواب میں اس حدیث پر مکرر بحث کرنی ہے (۲) امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الصلوٰۃ میں وتر کی تفسیر میں ذکر کیا۔ امام ترمذی نے شمائل میں، امام مسلم نے صلوٰۃ میں، ابن ماجہ نے طہارت میں ذکر کیا۔ اس حدیث میں یہ آیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے بیدار ہو کر بغیر وضو کیسے قرآن پاک کی آیات پڑھیں۔ اسی سے ترجمہ باب نکلتا ہے۔ مگر اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند تو بالاتفاق ناقضِ وضو نہیں ہے۔ اس لیے عنوان سے حدیث کے مذکورہ بالا جملہ کا کوئی تعلق پیدا نہیں ہوتا۔ بعض علماء نے اس کا یہ جواب دیا کہ ممکن ہے کہ حضور علیہ السلام جب بیدار ہوئے ہوں۔ اس وقت آپ کا وضو جاتا رہا ہو۔ یعنی نیند سے نہیں بلکہ کسی اور حدث سے اور قرینہ اس پر یہ ہے کہ آپ نے نماز پڑھنے کے لیے وضو فرمایا۔ مگر یہ توجیہ کچھ یونہی سی ہے۔ کیونکہ اول تو اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ حضور علیہ السلام کو حدث ہوا۔ ثانیاً وضو فرمانا بھی حدث کی دلیل نہیں بن سکتا۔ کیونکہ وضو پر وضو بھی تو کیا جاتا ہے (۳) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے لیے موذن کا امام کو جگانا اور اقامتِ الصلوٰۃ کی اطلاع دینا مستحب ہے۔

بَابُ مَنْ لَّمْ يَتَوَضَّأْ اِلَّا مِنَ الْغَشْيِ الْمُثْقِلِ

باب سخت غشی ہو تو وضو جائے گا۔ (ورنہ نہیں)

فوائد ومسائل

۱۸۳۔ اس باب میں امام بخاری نے وہی حدیث ذکر کی ہے جو کتاب العلم کے باب میں "اجاب الفتیا باشارۃ الید والراس" میں مکمل تفہیم و ترجمانی کے ساتھ گزر چکی ہے (دیکھو حدیث ۸۵)۔ اس حدیث میں حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا تھا کہ میں سورج گہن کی نماز کے لیے کھڑی ہوئی۔ گرمی کی وجہ سے مجھے غش آگیا تو میں اپنے سر پر پانی ڈالنے لگی۔ حدیث کے ان جملوں سے ترجمہ باب نکلتا ہے کہ حضرت اسماء کو غش آگیا مگر انھوں نے دوبارہ وضو نہیں کیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ ایسی غشی جس میں ہوش و حواس باقی رہیں ناقضِ وضو نہیں ہے۔ حضرت اسماء پر خفیف سی غشی طاری ہوئی تھی جبھی تو انہوں نے اس حالت میں پانی ڈالنے کا احساس رہا۔ اس حدیث پر تفصیلی گفتگو چونکہ کتاب العلم صہ پر ہو چکی ہے۔ اس لیے ہم نے متن حدیث نہیں لکھا۔

فائدہ - اغماء کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے اور غشی کا دل سے، احناف کے نزدیک اغماء و غشی ناقضِ وضو ہے۔

بَابُ مَسْحِ الرَّأْسِ كُلِّهٖ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ

باب سارے سر پر مسح کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے سروں پر مسح کرو

وَقَالَ ابْنُ الْمُسَيَّبِ الْمَرْاَةُ بِمَنْزِلَةِ الرَّجُلِ تَمْسَحُ عَلٰى رَاْسِهَا وَسُئِلَ مَالِكٌ اَيُجْزِئُ اَنْ يَّمْسَحَ بَعْضَ رَاْسِهٖ فَاحْتَجَّ بِحَدِيْثِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ (بخاری)

حضرت سعید ابن مسیب نے فرمایا۔ عورت بھی مرد کی طرح سر کا مسح کرے اور امام مالک سے پوچھا گیا کہ کیا بعض سر کا مسح جائز ہے تو انھوں نے عبد اللہ بن زید کی حدیث سے دلیل لی۔

وضو میں سر کے مسح کی بحث

واضح ہو کہ وضو میں سارے سر کا مسح کرنا سنت ہے اور اس پر تمام ائمہ کرام کا اتفاق بھی ہے۔ البتہ مقدار مسح میں اختلاف ہے۔ (۱) امام مالک اکثر عترت مزنی وجبائی اور امام احمد (فی روایۃ) وابن علیہ کا مسلک یہ ہے کہ سارے سر کا مسح کرنا واجب ہے (۲) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بعض سر کے مسح کو واجب قرار دیتے ہیں مگر کوئی حد معین نہیں فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک انگلی سے مسح کر لینا بھی کافی ہے (۳) حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چوتھائی سر کا مسح کرنا فرض ہے (۴) اور امام مالک علیہ الرحمۃ یہ فرماتے ہیں کہ قرآن نے وامسحوا برؤسکم فرمایا اور اس میں کوئی مقدار نہیں فرمائی کہ آدھے سر کا مسح کر دیا۔ چوتھائی سر کا تو اگر بعض مراد ہوتا تو اللہ عزوجل اس کو بیان فرما دیتا۔ جیسے ہاتھ اور پاؤں کے متعلق تصریح فرما دی کہ ہاتھ کہنیوں سمیت اور پاؤں ٹخنوں سمیت دھوئے جائیں۔ حضرت امام مالک علیہ الرحمۃ متعدد ایسی حدیثوں سے بھی دلیل لاتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے:۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَسَحَ رَاْسَهٗ بِيَدَيْهِ فَاَقْبَلَ بِهِمَا وَاَدْبَرَ (رواہ الجماعۃ)

کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کا مسح فرمایا۔ اس طرح کہ دونوں ہاتھوں کو آگے سے گدی کی طرف لے گئے پھر واپس لے آئے۔

احناف اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ آیت میں برؤسکم آیا ہے اور با یہاں تبعیض کے لیے ہے۔ ثانیاً آیت مقدار مسح میں مجمل ہے۔ حدیث نے اس اجمال کو بیان کر دیا کہ مقدار فرض چوتھائی سر کا مسح ہے۔ جیسا کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چوتھائی سر کا مسح فرمایا اور وہ حدیثیں جن میں یہ مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے سارے سر کا مسح کیا تو اس میں بیان وجوب نہیں بلکہ بیان فضیلت ہے کہ سارے سر کا مسح کرنا مستحب ہے اور ہم بھی پورے سر کے مسح کو مسنون مانتے ہیں۔ پس سارے سر کے مسح کی فرضیت ثابت نہیں ہوئی۔ واضح ہو کہ مسح کے باب میں جس قدر حدیثیں آئی ہیں ان میں جو کیفیت مسح وارد ہوئی ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) ایک حدیث تو وہی ہے جس کو بخاری نے عنوان زیر بحث میں ذکر کیا یعنی حدیث عبد اللہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ:۔

۱۸۴- ثُمَّ مَسَحَ بِيَدَيْهِ فَاَقْبَلَ بِهِمَا وَاَدْبَرَ بِمُقَدَّمِ رَاْسِهٖ حَتّٰى ذَهَبَ بِهِمَا اِلٰى قَفَاهُ ثُمَّ رَدَّهُمَا اِلَى الْمَكَانِ الَّذِيْ بَدَاَ مِنْهُ (بخاری)

کا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام نے وضو فرمایا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر پر مسح کیا اور دونوں ہاتھوں کو گدی تک لے گئے پھر جہاں سے شروع کیا تھا (یعنی پیشانی سے) وہیں تک واپس لے گئے۔

امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الطہارۃ میں پانچ مرتبہ ذکر کیا ہے اور ابو داؤد وابن ماجہ ومسلم وترمذی نے بھی

کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا۔ ظاہر ہے اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو میں سارے سر کا مسح فرمایا (۲) اور ایسی بھی متعدد حدیثیں ہیں جن کا مضمون یہ ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ قِطْرِيَّةٌ فَأَدْخَلَ يَدَهُ تَحْتَ الْعِمَامَةِ فَمَسَحَ مُقَدَّمَ رَأْسِهِ وَلَمْ يَنْقُضِ الْعِمَامَةَ (ابوداؤد)

اور سر مبارک پر دھاری دار عمامہ تھا۔ آپ نے اپنے ہاتھ کو عمامہ میں داخل کیا اور سر کے اگلے حصہ کا مسح فرمایا اور عمامہ نہ اُتارا۔

(۳) حضرت مغیرہ بن شعبہ کا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام سباطہ قوم پر آئے۔ آپ نے پیشاب کیا پھر وضو کیا۔

وَمَسَحَ يَمْسَحُ بِمُقَدَّمِهِ رَأْسِهِ إِذَا تَوَضَّأَ (مسلم و ابن ماجہ)

اور وضو میں چوتھائی سر کا مسح کیا اور موزوں پر مسح کیا۔

نیز بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے:۔

(۴) أَنَّهُ كَانَ يَمْسَحُ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ إِذَا تَوَضَّأَ (طحاوی ۳۷)

کہ حضرت سالم کے والد جب وضو کرتے تو مقدم راس کا مسح فرماتے۔

(۵) امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے اس مضمون کی مختلف حدیثیں لکھی ہیں کہ:۔

فَمَسَحَ عَلَى عِمَامَتِهِ وَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ

کہ حضور علیہ السلام نے وضو فرمایا تو آپ نے عمامہ اور پیشانی پر مسح فرمایا۔

ہم نے تقریباً اس باب کی تمام حدیثوں سے چند ذکر کر دیں (نمبر دیدیے ہیں) جو تمام حدیثوں کی کیفیات کی جامع ہیں ان پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے سر کا مسح کیا اور یہ بھی کہ آپ نے صرف پیشانی کے مسح پر اکتفا فرمایا۔ جس سے یہ بات تو بالکل واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ پورے سر کا مسح کرنا واجب نہیں ہے۔ اگر پورے سر کا مسح کرنا واجب ہوتا تو حضور علیہ السلام پیشانی کے مسح پر اکتفا نہ فرماتے۔ ہاں یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ پورے سر کا مسح کرنا مستحب ہے جس کے احناف بھی قائل ہیں۔ لیکن پورے سر کے مسح کرنے کا وجوب اس سے ثابت نہیں ہوتا چنانچہ وضو کے دیگر اعضاء منہ اور ہاتھ اور پاؤں کے متعلق بھی حضور سے ایسے ہی مروی ہے کہ آپ نے کبھی ایک ایک بار کبھی دو دو بار اور کبھی تین بار اعضاءِ وضو کو دھویا۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تین بار دھونا فرض ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اعضاء وضو کو ایک ایک بار دھونا فرض ہے اور تین تین بار دھونا مستحب ہے تو اسی طرح مسح کے باب میں پیشانی (چوتھائی سر) کا مسح فرض قرار پائیگا اور سارے سر کا مستحب اور اگر عقل و قیاس کی رو سے غور کیا جائے تو بھی چوتھائی سر کے مسح کی فرضیت ہی ثابت ہوتی ہے۔ دیکھئے وضو میں ہاتھ منہ اور پاؤں کے دھونے کا حکم ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جس عضو کا وضو میں دھونا فرض ہے اس کا تمام دھونا فرض ہے۔ اور وضو میں سر کے مسح کا حکم ہے تو اب ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے کہ جس عضو کے مسح کرنے کا حکم ہے اس کی کیا کیفیت

ہے۔ آیا کل کا مسح کیا جائے یا بعض کا؟ تو موزوں پر مسح کے متعلق اس امر میں سب کا اتفاق ہے کہ سارے پاؤں کے مسح کی ضرورت نہیں تو جب مسح الخفین میں کل کا مسح ضروری نہیں بلکہ ظاہر قدم کا مسح ضروری ہے تو اسی پر سر کے مسح کو بھی قیاس کرنا چاہیئے۔ لہٰذا وضو میں چوتھائی سر کا مسح فرض قرار پائے گا۔

توضیح حدیثِ اول میں سیدنا امام مالک کی دلیل ہے۔ وہ وضو میں سارے سر کے مسح کو واجب قرار دیتے ہیں۔ احناف کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ وہ حدیثیں جن میں سارے سر کے مسح کرنے کا ذکر ہے یہ بطور استحباب ہے اور ان میں وجوب میں کوئی دلالت نہیں ہے۔ جیسا کہ اوپر تفصیل سے بیان ہوا۔ حدیث دوم، سوم، چہارم احناف کی دلیل ہیں جن میں پیشانی کے مسح کرنے کا ذکر ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ وہ حدیثیں جن میں پیشانی پر مسح کرنے کا ذکر ہیں اس امر کی دلیل ہیں کہ وضو میں سر کے مسح کے متعلق مقدار مفروض پیشانی کا مسح (چوتھائی سر کا مسح) ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشانی سے زائد جو مسح فرمایا ہے وہ بیانِ فضیلت کے لیے ہے۔

فائدہ:۔ یہاں یہ بات یاد رکھئے کہ حدیثِ اوّل میں فَاَقْبَلَ بِهِمَا وَاَدْبَرَ کے لفظ آئے ہیں تو یہ اقبال و ادبار دو حرکتیں ہیں دو مسح نہیں ہیں۔ یہ اقبال و ادبار تو صرف اس لیے ہے کہ پورے سر کا مسح ہو جائے۔ چنانچہ اسی باب میں امام بخاری نے عبداللہ بن زید سے جو دوسری روایت درج کی ہے اس میں یہ لفظ بھی ہیں۔ فَاَقْبَلَ بِهِمَا وَاَدْبَرَ مَرَّةً وَاحِدَةً جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس روایت میں (مسح مرتین) کے الفاظ آئے ہیں اس میں تکرار فی المسح سے اقبال و ادبار مراد ہے نہ کہ تکرار مسح فافہم

حدیثِ پنجم میں بھی احناف کی دلیل ہے۔ اس میں بھی یہ تصریح ہے کہ حضور علیہ السلام نے ناصیہ یعنی چوتھائی سر کا مسح فرمایا۔ بعض علمائے نے کہا کہ اس میں تو عمامہ پر مسح کا ذکر ہے تو اب نئی کیفیت یہ پیدا ہو گئی کہ اگر عمامہ باندھا ہو تو اس کو اتارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں پیشانی پر مسح کر لیا جائے اور عمامہ پر بھی ہاتھ پھیر لیا جائے تاکہ پورے سر کا مسح ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ بات یہی قرار پائی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سارے سر کا مسح فرمایا۔ ہاں نئی کیفیت یہ پیدا ہوئی کہ سر پر عمامہ ہو تو پیشانی پر مسح کر لیا جائے اور باقی مسح پگڑی پر کر لیا جائے۔ جس کا نتیجہ بہر صورت یہی نکلا کہ آپ نے پورے سر کا مسح فرمایا۔ تو احناف اس موقع پر بھی وہی جواب دیں گے کہ حضور علیہ السلام کا فقط پیشانی کے مسح پر اکتفا فرمانا بھی تو ثابت ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مقدار مفروضہ پیشانی ہے اور اس سے زائد کا مسح بطور استحباب کے ہے ___ غرضیکہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک وضو میں چوتھائی سر کا مسح کرنا فرض ہے اور سارے سر کا مسح کرنا سُنّت ہے۔

سر کے مسح کرنے کا طریقہ، کان کا بھی مسح کیا جائے

(۱) پورے سر کا ایک بار مسح کرنا اور کانوں کا مسح کرنا سُنّت ہے۔ مسح کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انگوٹھے اور کلمے کی انگلی کے سوا ایک ہاتھ کی باقی تین انگلیوں کا سرا اور دوسرے ہاتھ کی تینوں انگلیوں کے سرے سے ملائے اور پیشانی کے بال یا کھال پر رکھ کر گدی تک اس طرح لے جائے کہ ہتھیلیاں سر سے جُدا رہیں۔ وہاں سے ہتھیلیوں سے مسح کرتا ہوا واپس لائے اور کلمہ کی انگلی کے پیٹ سے کان کے اندرونی حصّہ کا مسح کرے۔ یہ طریقہ صحیح طور پر اس وقت سمجھ میں آتا ہے۔ جب کہ کسی عالمِ دین سے

علی طور پر اس کو سیکھ لیا جائے۔ کان کے ظاہر و باطن کے مسح سے متعلق چند حدیثیں یہ ہیں (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا۔

فَمَسَحَ بِرَاسِهِ وَاُذُنَيْهِ (طحاوی)	تو آپ نے سر اور کانوں کا مسح فرمایا۔

(۲) مقدام ابن معدی کرب کہتے ہیں کہ میں نے حضور علیہ السلام کو وضو کرتے دیکھا۔ تو جب آپ نے مسح کرنا چاہا

وَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى مُقَدَّمِ رَاْسِهِ ثُمَّ مَرَّ بِهِمَا حَتّٰى بَلَغَ الْقَفَا ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتّٰى بَلَغَ الْمَكَانَ الَّذِىْ بَدَاَ وَمَسَحَ بِاُذُنَيْهِ ظَاهِرَهُمَا وَبَاطِنَهُمَا مَرَّةً وَّاحِدَةً	تو آپ نے اپنی دونوں مقدم ہتھیلیاں مقدم راس پر رکھیں۔ پھر انہیں گدی تک لے گئے۔ پھر وہیں تک لائے جہاں سے شروع کیا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک دفعہ کانوں کے ظاہر اور باطن کا مسح فرمایا۔ (طحاوی)

(۳) ایک شخص حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں آیا تو آپ نے اس کو وضو کرنے کا طریقہ بتایا:۔

فَاَدْخَلَ اِصْبَعَيْهِ السَّبَابَتَيْنِ اُذُنَيْهِ فَمَسَحَ بِاِبْهَامَيْهِ ظَاهِرَ اُذُنَيْهِ وَبِالسَّبَابَتَيْنِ بَاطِنَ اُذُنَيْهِ (طحاوی شریف ص۲۹)	(اور بوقتِ مسح) اپنی دونوں انگشتِ شہادت کانوں کے سوراخوں میں داخل کیں اور انگوٹھوں سے کانوں کے اوپر کا مسح فرمایا اور انگشتِ شہادت سے کانوں کے اندر کا مسح کیا۔

اسی مضمون کی حدیثیں ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد ابن حنبل میں بھی ہیں۔ ان حدیثوں سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) سر کا مسح ایک دفعہ کرنا ہی مسنون ہے (۲) سر اور کانوں کا مسح ایک ہی پانی سے کیا جائے، کانوں کے مسح کے لیے دوبارہ ہاتھوں کو تر کرنے کی ضرورت نہیں ہے (۳) کانوں کے ظاہر اور باطن کا مسح کرنا سنت ہے (۴) کان کے اندر کا مسح انگشتِ شہادت سے کیا جائے اور کان کے ظاہر کا مسح انگوٹھوں سے کیا جائے (۵) یہ بھی ثابت ہوا کہ کان سر کا حصہ قرار دیے جائیں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ الاذنان من الراس اور جمہور علماء کا یہی مسلک ہے۔ جلیل القدر صحابہ کرام مثلاً سیدنا ابن عباس و ابن عمر و ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے فرمایا کان سر میں داخل ہیں اور سر کے مسح کے ساتھ کانوں کا بھی مسح کیا جائے۔ (طحاوی شریف)

بَابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ اِلَى الْكَعْبَيْنِ

باب وضوء میں دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت دھونا

اس باب میں امام نے جو حدیث لکھی ہے اس میں وضو کرنے کا طریقہ بیان ہوا ہے۔ اس حدیث میں یہ لفظ ہیں۔

۱۸۵۔ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ اِلَى الْكَعْبَيْنِ	کہ پھر انھوں نے اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت دھوئے

عنوان سے متعلق حدیث کے صرف یہی جملے ہیں جو ہم نے لکھ دیئے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وضو میں پاؤں کا ٹخنوں سمیت دھونا ضروری ہے۔

بَابُ اِسْتِعْمَالِ فَضْلِ وَضُوْءِ النَّاسِ (بخاری)

باب وضوء سے جو پانی بچ گیا اس کو کام میں لانے کے بیان میں

فضلِ وضو کا اگر یہ مطلب ہو کہ وہ پانی جو وضو کرنے کے بعد برتن میں بچ رہے تو ظاہر ہے کہ اس پانی کے طاہر و مطہر ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے اور اگر فضلِ وضوء کا یہ مطلب ہو کہ وہ پانی جو وضو کرنے والے کے اعضاء سے جُدا ہو جس کو فقہاء کرام ماءِ مستعمل کہتے ہیں۔ اس کے طاہر و نجس ہونے میں اختلاف ہے۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے تین قول منقول ہیں۔ اول روایتِ ابو یوسف میں نجس مخفف ہے (۲) روایتِ حسن بن زیاد میں نجس مغلظ (۳) روایت زفر و محمد بن حسن میں طاہر غیر طہور اسی کو محققین ماوراء النہر نے اختیار کیا محیط میں اشہر اور مفید میں صحیح قرار دیا گیا اور علامہ اسبیجانی نے کہا کہ روایت سوم پر فتویٰ بھی ہے۔ علامہ قاضی خاں نے فرمایا تغلیظ کے قول کی امام کی طرف نسبت ثابت نہیں اور امام نخعی حسن بصری زہری ثوری و امام مالک علیہم الرحمۃ کا قول یہ ہے کہ ماءِ مستعمل طاہر و طہور ہے اور امام شافعی علیہ الرحمۃ کے نزدیک طاہر ہے طہور نہیں۔ علامہ عینی نے لکھا ہے کہ اگر ماءِ مستعمل کو ناجائز قرار دیا جائے تو پھر تو مطلقاً اس کا استعمال جائز نہ ہو گا اور اگر طاہر و مطہر قرار دیا جائے تو ہر چیز میں اس کا استعمال جائز قرار پائیگا اور اگر فقط طاہریت کا قول کیا جائے تو پینے، آٹا گوندھنے، نجاست کے زائل کرنے کے لیے اس کا استعمال درست قرار پائے گا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

وَالفتوىٰ على انه طاهر غير طهور كما ذهب اليه محمد بن الحسن (عینی ج۱ ص۷۲)	اور حنفیہ کا فتویٰ ہے کہ ماءِ مستعمل طاہر ہے مطہر نہیں ہے جیسا کہ امام محمد بن حسن نے اختیار کیا۔

توضیح ماءِ مستعمل کے متعلق سیدنا امام اعظم علیہ الرحمۃ کی رائے میں بظاہر تضاد معلوم دیتا ہے۔ مگر حقیقت میں تضاد نہیں ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ احادیث میں وارد ہوا ہے کہ وضو سے گناہ دُھلتے ہیں۔ آنکھ کان، ناک، سر، ہاتھ، پاؤں سب کے گناہ دُھل جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وضوء کے بعد

من كل ذنب كهيئة ولدته امه (طبرانی)	سب گناہوں سے ایسا خالص ہو جاتا ہے جیسا کہ اپنی ماں سے پیدا ہوتے وقت تھا۔

اکثر علماء نے فرمایا کہ یہاں گناہوں سے صغائر مراد ہیں مگر تحقیق یہ ہے کہ کبائر بھی دُھلتے ہیں اگرچہ زائل نہ ہوں۔ یہ سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ اکابر اولیاء کرام قدست اسرارہم کا، مشاہدہ ہے اور گناہ متعدد قسم کے ہوتے ہیں۔ سیدنا امام اعظم علیہ الرحمہ اہلِ مشاہدہ سے تھے۔ جب لوگوں کے آب وضو کو دیکھتے تو بعینہٖ ان گناہوں کو پہچان لیتے جو دُھل کر پانی میں گرتے اسی وجہ سے ماءِ مستعمل کے متعلق آپ کے تین قول ہو گئے چنانچہ:۔

سیدنا امام اعظم امام اہل کشف و مشاہدہ ہیں

امام عارف باللہ سیدی عبدالوہاب شعرانی قدس سرہ الربانی جو اکابر اولیاء شافعیہ سے ہیں۔ میزان الشریعۃ الکبریٰ میں فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے سردار حضرت علی خواص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو (کہ وہ بھی شافعی ہیں) سنا کہ امام اعظم ابو حنیفہ کے مدارک باریک ہیں۔ ان پر

اکابر اولیاء۔ اہلِ مشاہدہ ہی مطلع ہو سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ جب حوضِ وضوء کا پانی دیکھتے تو لوگوں کے وضوء کرنے میں گناہِ کبیرہ، صغیرہ اور مکروہ جو کچھ دھل کر اس میں گرا سب پہچان لیتے۔ اسی لیے امام اعظم نے ماءِ مستعمل کے تین حکم رکھے۔ نجاست غلیظہ ہے۔ یہ اس صورت میں جب کہ استعمال کرنے والوں نے کوئی گناہِ کبیرہ کیا ہو۔ دوم نجاستِ خفیفہ ہے۔ یہ اس صورت میں جب کہ گناہِ صغیرہ کے مرتکب کا دھوون ہو۔ سوم۔ پاک ہے مگر پاک نہیں کرتا۔ یہ اس صورت میں کہ فعلِ مکروہ کے مرتکب کا دھوون ہو۔ ان کے مقلد سمجھے کہ یہ تینوں حکم ہر حال میں ہیں۔ حالانکہ وہ مختلف احوال پر ہیں۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ اللہ راضی ہوا امام ابوحنیفہ سے اور ان کے مقلدوں پر رحم فرمائے کہ انھوں نے نجاست کی دو قسمیں کیں غلیظ اور خفیفہ اس لیے کہ گناہ دو ہی قسم کے ہیں کبیرہ اور صغیرہ ——— اور میں نے اپنے سردار علی خواص کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آدمی کو کشف حاصل ہو تو لوگوں کے وضوء و غسل کے پانی کو نہایت گھنونا اور بدبودار پائے تو کبھی اس کا دل نہ ہو کہ اس سے طہارت کرے ——— امام شعرانی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ اس پر میں نے عرض کی کہ امام ابوحنیفہ و ابو یوسف کشف والے تھے کہ ماءِ مستعمل کو نجس مانتے ہیں۔ سیدی علی خواص نے فرمایا۔ ہاں یہ دونوں اعظم اہلِ کشف سے تھے۔ جب لوگوں کا آبِ وضو دیکھتے تو فوراً پہچان لیتے کہ یہ دھوون گناہِ کبیرہ کا ہے۔ یہ صغیرہ کا اور یہ مکروہ کے مرتکب کا ہے اور یہ خلافِ اولیٰ کا اور ایسے پہچانتے جیسے کوئی اجسام کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ہم کو روایت پہنچی کہ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ جامع مسجد کوفہ کے حوض پر تشریف لے گئے۔ ایک جوان وضوء کر رہا تھا۔ اس کا پانی جو ٹپکا تو امام نے اس پر نظر فرمائی اور کہا۔ اے میرے بیٹے ماں باپ کو ایذا دینے سے توبہ کر۔ اس نے فوراً توبہ کی۔ ایک اور شخص کا غسالہ دیکھ کر فرمایا۔ اے بھائی زنا سے توبہ کر۔ ایک اور شخص کا دھوون دیکھ کر فرمایا۔ شراب پینے اور مزامیر سننے سے توبہ کر۔ یہ دونوں تائب ہوئے (میزان الشریعۃ الکبریٰ ترجمہ من وعن ہے)

ماءِ مستعمل کی جامع مانع تعریف، نجاست حکمی و حقیقی کا فرق، ماءِ مستعمل کی صورتیں

واضح ہو کہ نجاست دو قسم پر ہے۔ نجاستِ حقیقی، جیسے پاخانہ و پیشاب، شراب وغیرہ۔ فقہاء اس کو نجاستِ حقیقی کہتے ہیں اور جس چیز کو یہ نجاست لگ جائے گی تو اس کے متعلق یوں کہیں گے کہ اس چیز کو نجاستِ حقیقی لگی ہے۔ ——— نجاستِ حکمی کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود حقیقتاً نجاست نہیں ہے۔ مگر شرع نے اس کو نجاست کا حکم دیا ہے جیسے بے وضوء شخص یا جنبی اس کے بدن پر کوئی نجاستِ حقیقی نہیں ہے مگر نجاستِ حکمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے وضوء کو قرآنِ مجید کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے اور جنبی کو مسجد میں آنا، قرآن پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اب جس پانی سے یہ نجاستِ حکمیہ زائل کی جائے گی اس پانی کو نجاستِ حکمیہ منتقل ہو جائے گی اور وہ پانی مستعمل ہو جائے گا۔

فائدہ:۔ (۱) جس پانی سے قربتِ مطلوبہ شرعاً کی اقامت کی جاتی ہے وہ انسان کے گناہ دھوتا ہے۔ گناہوں کی نجاستِ حکمیہ اس کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ پانی مستعمل ہو جاتا ہے (۲) حج میں جو کنکریاں ایک بار کسی بھی جمرہ پر استعمال ہو چکیں انہیں دوبارہ استعمال کرنا مکروہ ہے۔ اگر ضرورت ہو تو ان کو تین بار دھو کر استعمال کرے بلکہ مطلقاً دھو کر ہی کام میں لانا مستحب ہے کہ شاید کوئی نجاستِ حقیقیہ یا حکمیہ سے ملوث ہو (۳) ماءِ مستعمل وہ قلیل پانی ہے جس نے یا تو تطہیر نجاستِ حکمیہ سے کسی واجب کو

ساقط کیا یعنی انسان کے کسی ایسے پارۂ جسم کو مس کیا جس کی تطہیر وضوء یا غسل سے بالفعل لازم تھی یا ظاہر بدن پر اس کا استعمال خود کارِ ثواب تھا اور استعمال کرنے والے نے اپنے بدن پر اسی امرِ ثواب کی نیت سے استعمال کیا اور یوں اسقاطِ واجب تطہیر یا اقامتِ قربت کر کے عضو سے جدا ہوا۔ اگرچہ ہنوز کسی جگہ مستقر نہ ہوا بلکہ روانی میں ہے اور بعض نے زوالِ حرکت و حصولِ استقرار کی قید لگائی۔ یہ حد جامع مانع ہے اور فتاویٰ رضویہ مؤلفہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے سوا کہیں نہیں ملے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ عام قارئینِ کرام اس تعریف کو بخوبی نہیں سمجھ سکے ہوں گے۔ اس لیے ہم مثالوں سے سمجھاتے ہیں۔ جو صاحب ان مسائل کی پوری بحث اور دلائل معلوم کرنا چاہیں وہ فتاویٰ رضویہ ج ۱ ص ۲۳ کا بغور مطالعہ کریں۔

ان صورتوں میں پانی مستعمل قرار پائیگا

(۱) محدث (بے وضوء یا جنبی آدمی) نے تمام یا بعض اعضاء وضوء دھوئے اگرچہ وضوء کی نیت نہ کی۔ محض ٹھنڈ حاصل کرنے یا میل وغیرہ جدا کرنے کے لیے کسی عضوء کو دھویا تو یہ پانی جو اعضاء پر سے بہہ گیا۔ ماءِ مستعمل ہوگیا (یاد رکھئے پانی اعضاء سے مل کر جدا ہو جانے کے بعد ہی مستعمل قرار پاجائیگا) (۲) جنبی نے خود غسل کیا اور نہ ارادہ ہی کیا مگر کسی نے مثلاً اس کی پیٹھ پر پانی ڈالا۔ اب جو پانی اس کی پیٹھ پر سے بہا ہے ماءِ مستعمل ہوگیا (یعنی استعمال کیا ہوا پانی) (۳) باوضوء آدمی نے بہ نیتِ ثواب دوبارہ وضوء کیا۔ (۴) حائض و نفساء عورت نے نمازِ پنجگانہ کے وقت یا چاشت و اشراق و تہجد کے وقت محض یادِ الٰہی کے لیے وضوء کیا کہ عبادت کی عادت باقی رہے (۵) باوضوء نے کھانا کھانے کو یا کھانا کھانے کے بعد بہ نیتِ ادائے سنت ہاتھ دھوئے یا کلّی کی (۶) سمجھ دار نابالغ بچہ نے دستور بقصدِ وضوء کیا (۷) پاک آدمی نے ادائے سنت کو۔ جمعہ یا عیدین یا عرفے یا احرام یا اور اوقاتِ مسنونہ کا غسل کیا یا میت کو نہلانے کا غسل یا وضوء کیا (۸) وضوء فرض یا نفل میں جو پانی کلی یا ناک میں پہنچانے میں صرف ہوا (۹) کچھ اعضاء دھو لیے تھے خشک ہوگئے۔ سنتِ موالات کی نیت سے انہیں دوبارہ دھو لیا (۱۰) باوضوء شخص نے وضوء علی الوضوء کی نیت سے دوسرے کو کہا مجھے وضوء کرا دے۔ اس پر دوسرے شخص نے بہ نیتِ ثواب اس کے اعضاء دھو دیئے۔ ان سب صورتوں میں جو پانی اعضاء سے مس کر کے جدا ہوا (بہا) ماءِ مستعمل ہے (۱۱) جنب یا بے وضوء کا اگر وہ عضو جس کی ابھی طہارت نہ کی (دھویا نہیں) اس عضوء کا ذرا سا حصہ بھی ماءِ قلیل میں ڈوب جانے سے پانی مستعمل ہو جائیگا۔ یعنی لوٹے میں پانی ہو تو جیسے اس میں سارا ہاتھ پڑنے سے پانی مستعمل ہو جائے گا۔ اسی طرح ناخن یا کوئی حصہ عضوء کے پڑنے سے بھی پانی مستعمل ہو جائے گا (۱۲) برتن میں پانی ہے اس میں بے وضوء یا جنب کا پاؤں پڑ گیا (۱۳) یا کنویں یا حوضِ صغیر میں محض ٹھنڈ حاصل کرنے کے لیے غوطہ لگایا یا صرف ہاتھ پاؤں ڈالا یا ایک پورا ہی بلا دھلا ڈال دیا، پانی مستعمل ہوگیا۔ اسی طرح غسل کرنے کی نیت سے جنب نے کنویں میں غوطہ لگایا پانی مستعمل ہوگیا۔

ان صورتوں میں پانی مستعمل نہیں ہوتا

(۱) وضوء کرنے کے بعد پانی لوٹے میں بچ گیا۔ وہ ماءِ مستعمل نہیں ہے بلکہ وہ پانی ہے جو استعمال سے بچ رہا ہے اس سے وضوء کر سکتے ہیں کھانے پینے میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ (۲) جو شخص باوضوء نہیں ہے اور پانی مٹکے وغیرہ میں ہے جس کو جھکا کر نہیں نکال سکتا تو کٹورے وغیرہ سے لے کر ہاتھ دھوئے یا کسی باوضوء شخص یا نابالغ بچہ سے نکلوائے اور اگر یہ بھی مہیا نہ ہو تو چلّو سے لے کر ہاتھ دھوئے۔

یا کسی باوضوء شخص یا نابالغ بچہ سے نکلواتے اور اگر یہ بھی مہیا نہ ہو تو چُلّو سے لے کر ہاتھ دھوئے۔ پانی اس ضرورت کے سبب مستعمل نہ ہوگا، بے ضرورت ہو تو مستعمل ہو جاتا ہے (۳) آبِ کثیر یعنی دہ دردہ پانی یا جاری پانی جیسے نہر، سمندر، دریا میں بے وضو وضو کرے یا جنب غسل کرے یا کوئی نجاست ہی دھوئی جائے تو یہ پانی نجس نہ ہوگا اور نہ مستعمل ہوگا (۴) باوضوء آدمی نے بلا نیتِ وضوء اعضا ٹھنڈے کرنے یا میل دُور کرنے کے لیے وضوء کیا (۵) یا باوضوء آدمی نے بلا نیتِ ثواب دوبارہ وضوء کیا (۶) معلوم تھا کہ عضوء تین بار دھو چکا اور ہنوز پانی خشک نہ ہوا تھا۔ بلا وجہ چوتھی بار اور پانی اعضاء پر ڈالا۔ (۷) جیسے حاجتِ غسل نہیں ہے، اُس پر غسل فرض نہ تھا۔ اس نے اعضاء وضوء کے سوا مثلاً پیٹھ پر یا ران پر۔ یا سینہ یا پیٹ کو دھویا (۸) باوضوء آدمی نے کھانا کھانے یا کھانے کے بعد یا ویسے ہی ہاتھ منہ صاف کرنے کو ہاتھ دھوئے کُلی کی اور ادائے سنت کی نیت نہ کی تو ان سب صورتوں میں وہ پانی جو اعضا سے بہہ کر جُدا ہوا ماءِ مستعمل نہ ہوگا (۹) باوضوء آدمی نے کوئی پاک کپڑا دھویا (۱۰) باوضوء آدمی نے کسی جانور یا نابالغ بچے کو نہلایا اور بچے یا جانور کے بدن پر نجاست نہ تھی (پاک تھے)۔ اگرچہ وہ جانور غیر ماکول اللحم ہو جیسے بلّی چوہا اگرچہ بہ نیتِ ثواب نہلایا پانی مستعمل نہ ہوگا (۱۱) عورت ابھی حیض و نفاس میں ہے۔ خون بند نہیں ہوا۔ اس حالت میں اس کا ہاتھ یا کوئی عضوء پانی میں پڑ جائے وہ پانی مستعمل نہ ہوگا کہ ابھی اس پر غسل واجب نہیں ہے۔ (والمسئلۃ فی الخانیۃ والخلاصۃ والبحر)۔ (۱۲) عورت ابھی حیض و نفاس میں ہے، خون بند نہیں ہوا، بے نیتِ قربت (عبادت و ثواب) غسل کیا پانی مستعمل نہ ہوگا (۱۳) ناسمجھ بچے نے وضو کیا، جس طرح دو تین سال کے بچے ماں باپ کو دیکھ کر بطور نقل و حکایتِ افعال وضوء و نماز کرنے لگتے ہیں پانی مستعمل نہ ہوگا۔ (۱۴) باوضوء شخص کا گرمی کے سبب عبادت یا مطالعہ کتاب میں دل نہیں جمتا۔ اس نیت سے ٹھنڈک پہنچے کو نہایا یا ہاتھ دھوئے پانی مستعمل نہ ہوگا (۱۵) بے وضوء نابالغ کا ہاتھ پانی میں ڈوب جانے سے پانی مستعمل نہ ہوگا۔ اس سے وضوء روا ہے ہاں اگر شک ہو کہ بچہ کا ہاتھ ناپاک تھا تو بہتر یہ ہے کہ اس پانی سے وضو نہ کیا جائے لیکن اگر کر لیا وضوء ہو گیا کیونکہ محض شک سے کوئی چیز ناپاک نہیں ہوتی جب تک کہ یقین نہ ہو۔ (۱۶) بے وضو یا جُنب نے کنویں یا حوضِ صغیر میں ڈول یا گلاس وغیرہ نکالنے کے لیے غوطہ مارا، پانی مستعمل نہ ہوگا کیونکہ یہ غوطہ مارنا ضرورت کے لیے ہے اور بضرورت ہاتھ ڈالنے اور غوطہ مارنے سے پانی مستعمل نہیں ہوتا۔

توضیح ضروری ۱۔ جس عضوء کا جہاں تک پانی ڈالنا بضرورت ہے اتنا معاف ہے یعنی بہ ضرورت اتنا ہاتھ پانی میں ڈالنے سے پانی مستعمل نہ ہوگا۔ مثلاً پانی بڑے مٹکے میں ہے اور کوئی برتن ایسا نہیں ہے جس سے پانی نکال کر استعمال کیا جائے تو چُلّو لینے کے لیے جُنب یا بے وضو نے ہاتھ ڈالا پانی مستعمل نہ ہوگا۔ لیکن اگر اسی صورت میں ہاتھ مثلاً کہنی یا نصف کلائی تک ڈال کر چُلّو لیا تو پانی مستعمل ہو جائے گا کیونکہ چُلّو بھر پانی لینے کے لیے ہاتھ کو نصف کلائی یا کہنی تک ڈبونے کی ضرورت نہ تھی۔ (۲) مٹکے میں کٹورا یا گلاس گر گیا اس کو نکالنے کے لیے جُنب یا بے وضو نے جتنے ہاتھ ڈالنے کی ضرورت تھی ڈالا اور کٹورا نکال لیا اگرچہ بازو تک یا بغل تک ہاتھ ڈالنا پڑا پانی مستعمل نہ ہوگا کیونکہ یہاں ضرورت ہے۔ (۳) عورت کے جھوٹے پانی سے اسی طرح عورت کے غسل یا وضوء کرنے کے بعد جو پانی برتن یا لوٹے میں باقی رہ گیا مرد کو وضوء و غسل کرنا جائز ہے۔ یونہی مرد کے بچے ہوئے پانی سے عورت کو جائز ہے۔ (۴) کنویں میں غسل یا وضوء کا پانی خواہ کتنا ہی ڈال دیا

ما نے بشرطیکہ اس وضوء و غسل کے پانی میں نجاست نہ ہو تو کنواں پاک رہے گا اور سب کا پانی مستعمل بھی نہ ہوگا۔ ہاں اگر مستعمل پانی کی مقدار زائد ہو جائے تو پھر کنویں کا پانی مستعمل ہو جائے گا۔ مثلاً کنویں کا کل پانی فرض کیجئے ایک سو ڈول ہے۔ اب اس میں سے ایک سو ایک ڈول پانی مستعمل ڈال دیا اب کنویں کا پانی بھی مستعمل ہو جائے گا ورنہ نہیں۔

مائے مستعمل کا حکم تحقیق یہ ہے کہ ہمارے سب ائمہ کے نزدیک، مائے مستعمل پاک ہے اور حدث سے پاک کرنے والا نہیں ہے۔ یعنی خود تو پاک ہے مگر نجاستِ حکمیہ کو زائل نہیں کرتا۔ اس لیے مائے مستعمل سے وضو و غسل نہیں ہو سکتا۔ ہاں نجاستِ حقیقیہ اس سے دھو سکتے ہیں (۲) مائے مستعمل کو مسجد میں ڈالنا یا چھڑکنا حرام ہے (۳) مائے مستعمل سے کپڑے دھو سکتے ہیں۔ کسی چیز پر نجاست لگ جائے تو اس سے اس کو زائل کر سکتے ہیں۔ کپڑا اور وہ چیز پاک ہو جائے گی لیکن مائے مستعمل کو پینا اور اس سے آٹا گوندھنا مکروہ ہے (۴) مستعمل پانی سے محض بدن ٹھنڈا کرنے یا بدن سے میل کچیل زائل کرنے کے لیے نہا دھو سکتے ہیں (۵) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو بلکہ غسلِ جنابت کا پانی ہمارے حق میں طیب وطاہر ہے حضور علیہ السلام کے آثارِ شریفہ مثل جبہ اقدس ونعلِ مبارک کا غسالہ شفاء و برکت ہے قابلِ وضوء و معطی طہارت ہے۔ مگر اس مقدس پانی سے اگر وضوء کرے تو پاؤں پر نہ ڈالے، پاؤں کسی دوسرے پاک پانی سے دھولے۔ ادب کا تقاضا یہی ہے (۶) مائے مستعمل کو قابلِ غسل و وضوء بنانے کے دو طریقے ہیں۔ اوّل یہ کہ مستعمل پانی کی مقدار سے زائد اس میں طاہر و مطہر پانی ملا دیا جائے مثلاً ایک سیر پانی مستعمل ہے تو اس میں دو سیر پانی غیر مستعمل ملا دینے سے سب کا سب طاہر و مطہر ہو جائیگا۔ وضو و غسل اب اس پانی سے کر سکتے ہیں۔ دوم یہ کہ جس برتن میں مستعمل پانی ہے اس میں غیر مستعمل پانی ڈالیے یہاں تک کہ برتن اُبل پڑے اور پانی برتن سے اُبل کر بہنے لگے۔ اب سب پانی طاہر و مطہر ہو جائے گا۔

وَاَمَرَ جَرِيرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ اَنْ يَّتَوَضَّؤُوْا بِفَضْلِ سِوَاكِهٖ (بخاری شریف)

اور حضرت جریر ابن عبد اللہ نے اپنے اہل سے کہا کہ مسواک کے بچے ہوئے پانی سے وضو کریں۔

اس اثر کو دار قطنی اور ابن شیبہ نے قیس ابن ابی حازم سے انھوں نے حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔ جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت جریر اپنی مسواک کا سر پانی میں ڈبو دیتے پھر اپنے گھر والوں سے کہتے اس پانی سے جو بچ رہا ہے وضوء کر لو۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ابو طالب نے امام احمد حنبل سے حضرت جریر کے مذکورہ بالا جملوں کا مطلب پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت جریر اپنی مسواک برتن میں ڈال دیتے پھر اسی پانی سے وضوء فرما لیتے۔

مسواک استعمال کرنے سے پہلے نرم کرنے کے لیے پانی میں ڈال دیتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ پانی جس میں مسواک بھگوئی گئی ہے مائے مستعمل نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی پاک چیز پانی میں ڈال دی جائے تو وہ پانی کو مستعمل نہیں کرتی۔ پھر یہ بھی سنت ہے کہ مسواک کرنے سے پہلے اور کرنے کے بعد اس کو تین بار دھویا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ پانی جس سے مسواک کو دھویا گیا مائے مستعمل نہیں ہے کیونکہ مائے مستعمل ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس کا استعمال بدنِ انسانی پر ہو (فافہم) اسلیے اس اثر کا باب سے تعلق سمجھ نہیں آتا۔

توضیح اس عنوان اور اس کے ماتحت اثر و احادیث کو ذکر کرتے امام بخاری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مائے مستعمل طاہر و مطہر ہے لیکن اس عنوان کے ماتحت انھوں نے جس قدر حدیثیں ذکر کی ہیں وہ خاص حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات

اقدس سے متعلق ہیں کہ آپ کے اعضاء مبارک سے جو پانی ٹپکتا تھا صحابہ کرام اس کو تبرک سمجھتے تھے اور امر واقعہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے فضلات مبارک بھی طیب وطاہر ہیں تو آپ کے جسم پاک کے غسالہ کے طیب وطاہر ہونے میں کس کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ اس لیے ان احادیث سے عام لوگوں کے استعمال کیے ہوئے پانی کو طاہر و مطہر قرار دینا کیوں کر صحیح قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۲) نیز ہمارے ائمہ احناف بھی ماءِ مستعمل کو نجس قرار نہیں دیتے البتہ وہ احادیث جن میں ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل کرنے اور فضل طہور امراۃ سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ ماءِ مستعمل سے پرہیز کرنا شارع علیہ السلام کو مطلوب ہے فافہم

۱۸۶- يَقُولُ خَرَجَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْهَاجِرَةِ فَأُتِيَ بِوَضُوْءٍ فَتَوَضَّأَ فَجَعَلَ النَّاسُ يَأْخُذُوْنَ مِنْ فَضْلِ وَضُوْئِهٖ فَيَتَمَسَّحُوْنَ بِهٖ فَصَلَّى النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ رَكْعَتَيْنِ وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ وَبَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةٌ

حضرت ابوجحیفہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کو ہم پر برآمد ہوئے وضو کا پانی آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے وضو کیا۔ پھر لوگ آپ کے وضو کا بچا ہوا پانی لینے لگے۔ پھر آپ نے ظہر کی دو رکعتیں پڑھیں اور عصر کی دو رکعتیں (اس لیے کہ آپ مسافر تھے) اور آپ کے سامنے ایک برچھی گڑی تھی۔

(۲) وَقَالَ أَبُوْ مُوْسٰى دَعَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَدَحٍ فِيْهِ مَاءٌ فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهٗ فِيْهِ وَمَجَّ فِيْهِ ثُمَّ قَالَ لَهُمَا اشْرَبَا مِنْهُ وَأَفْرِغَا عَلٰى وُجُوْهِكُمَا

اور ابوموسیٰ اشعری نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیالہ پانی منگوایا اور اپنے منہ اور ہاتھ اس میں دھوئے اور اسی میں کلی کی۔ پھر بلال اور ابوموسیٰ سے کہا اس میں سے دونوں پی لو اور اپنے منہ اور سینہ پر ڈالو۔

۱۸۷- (۳) قَالَ أَخْبَرَنِيْ مَحْمُوْدُ بْنُ الرَّبِيْعِ قَالَ وَهُوَ الَّذِيْ مَجَّ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ وَجْهِهٖ وَهُوَ غُلَامٌ مِّنْ بِئْرِهِمْ وَقَالَ عُرْوَةُ عَنِ الْمِسْوَرِ وَغَيْرِهٖ يُصَدِّقُ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا صَاحِبَهٗ وَإِذَا تَوَضَّأَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَادُوْا يَقْتَتِلُوْنَ عَلٰى وَضُوْئِهٖ

محمود بن ربیع نے بیان کیا اور یہ محمود وہی ہیں جن کے منہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلی کر دی تھی جب وہ بچے تھے ان کے کنوئیں کے پانی سے اور عروہ نے مسور بن مخرمہ وغیرہ (مروان) سے روایت کی ہر ایک اپنے ساتھی کو سچا بتاتا تھا کہ عروہ بن مسعود نے مکہ کے مشرکوں سے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب وضو کرتے ہیں تو آپ کے وضو کے غسالہ کیلیے لوگ لڑنے پر مستعد ہو جاتے ہیں۔

۱۸۸- (۴) بَابٌ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ يُوْنُسَ قَالَ حَدَّثَنَا حَاتِمُ ابْنُ إِسْمٰعِيْلَ عَنِ الْجَعْدِ قَالَ سَمِعْتُ السَّائِبَ بْنَ يَزِيْدَ يَقُوْلُ ذَهَبَتْ بِيْ خَالَتِيْ إِلَى النَّبِيِّ

باب، ہم نے عبدالرحمٰن بن یونس نے بیان کیا۔ کہا ہم سے حاتم بن اسمٰعیل نے انھوں نے جعد بن عبدالرحمٰن سے انھوں نے کہا میں نے سائب بن یزید سے سنا وہ کہتے تھے میری خالہ مجھ کو نبی کریم صلی اللہ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ ابْنَ أُخْتِي وَجِعٌ فَمَسَحَ رَأْسِي وَدَعَا لِي بِالْبَرَكَةِ ثُمَّ تَوَضَّأَ فَشَرِبْتُ مِنْ وَضُوئِهِ ثُمَّ قُمْتُ خَلْفَ ظَهْرِهِ فَنَظَرْتُ إِلَى خَاتَمِ النُّبُوَّةِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ مِثْلَ زِرِّ الْحَجَلَةِ

علیہ وسلم کے پاس لے گئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ یہ میرا بھانجا بیمار ہے (پاؤں کے درد سے) آپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لیے برکت کی دعا کی پھر آپ نے وضو کیا تو میں نے آپ کے وضو سے بچا ہوا پانی پی لیا۔ پھر آپ کی پیٹھ کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ میں نے مہر نبوت کو دیکھا آپ کے دونوں مونڈھوں کے بیچ میں ایسی تھی جیسے چھپر کھٹ کی گھنڈی۔

فوائد و مسائل

اس عنوان کے ماتحت امام بخاری نے یہ چند حدیثیں ذکر کی ہیں۔ ہم نمبروار ہر حدیث کے فوائد و مسائل بیان کرتے ہیں۔ حدیث اوّل کو امام بخاری نے صلوٰۃ و باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اور امام مسلم نے صلوٰۃ میں ذکر کیا۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے اس حدیث کے ماتحت لکھا کہ :

فِيهِ جَوَازُ التَّبَرُّكِ بِآثَارِ الصَّالِحِينَ
(عینی ج ۲ ص ۸۲۴)

کہ اس حدیث سے بزرگانِ دین کے آثار کو تبرک بنانے کا جواز نکلتا ہے۔

یہ واقعہ سفر کا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفر میں ظہر و عصر کی نمازیں قصر پڑھیں۔ جس سے واضح ہوا کہ بحالتِ سفر چار رکعتی فرض دو پڑھے جائیں اور یہ بھی کہ جب صحرا وغیرہ میں نماز پڑھی جائے تو کوئی چیز ایسی سامنے رکھی جائے یا گاڑی جائے جو سترہ کا کام دے سکے۔ حضور علیہ السلام کے سامنے نیزہ کھڑا ہوا تھا ۲۔ ھجر کے لغوی معنے ترک کرنے اور چھوڑنے کے ہیں۔ ھاجرہ وقت نصف النہار کو کہتے ہیں کیونکہ عرب اس وقت گرمی کی وجہ سے راستہ ہی چلنا ترک کر دیتے تھے اور گھروں میں بیٹھ رہتے تھے۔ لہٰذا نصف النہار کے وقت کو ھاجرہ کہنے لگے۔

حدیث دوم، کے ماتحت علامہ کرمانی نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا لعابِ مبارک مشک و عنبر سے زیادہ خوشبودار تھا۔ (عینی)۔(۲) یہ دو خوش نصیب حضرات، ابو موسیٰ و حضرت بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) تھے جنھیں حضور علیہ السلام نے اپنی کلی کا پانی عطا فرمایا اور فرمایا اس کو پی لو اور اپنے چہرہ پر ڈال لو۔ معلوم ہوا کہ بزرگانِ دین کے استعمال کئے ہوئے پانی کو متبرک سمجھنا اور برکت کے لیے اپنے بدن پر ڈالنا جائز ہے۔

حدیث سوم، کو امام بخاری نے کتاب العلم باب متی یصح سماع الصغیر میں ذکر کیا ہے۔ حضرت محمود ابن ربیع کو بھی یہ سعادت حاصل ہوئی کہ حضور علیہ السلام نے ان کے چہرہ پر کلی فرمادی۔ اس وقت ان کی عمر ۵ سال تھی۔

حدیث چہارم، صلح حدیبیہ سے متعلق ہے۔ یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔ حدیبیہ کے موقع پر حضرت عروہ بن مسعود ثقفی کفار مکہ کی طرف سے تفتیش حال کے لئے آئے تھے وہاں انھوں نے صحابہ کرام کی حضور علیہ السلام سے والہانہ محبت و عقیدت کو دیکھا۔ انھوں نے نظارہ کیا کہ جب حضور ناک سنکتے تو صحابہ بڑھ کر آپ کے فضلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور اپنے چہروں پر مل لیتے۔ جب حضور علیہ السلام وضو فرماتے تو صحابہ کرام وضو کے غسالہ کو حاصل کرنے کے لیے سخت

کوشش کرتے تھے۔ حضرت عروہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے اس فعل کو کادوا یقتتلون علی وضوئہ کے الفاظ سے تعبیر کیا۔

حدیث پنجم، کو امام نے طب، دعوات، صفۃ النبی میں ذکر کیا۔ مسلم نے صفۃ النبی میں، ترمذی نے مناقب میں اور نسائی نے طب میں ذکر کیا۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے حدیث ہذا کے تحت ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

وَهُوَ يَقُوْلُ بِطَهَارَةِ بَوْلِهٖ وَسَائِرِ فُضُلَاتِهٖ (عینی ج ۱ صفحہ ۸۲۸)

حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ حضور علیہ السلام کے بول مبارک اور تمام فضلات کو پاک قرار دیتے ہیں۔

ان احادیث سے بلا کسی کھینچ تان کے امورِ ذیل پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلاتِ مبارک اور جسم پاک کا دھوون طیّب و طاہر، باعثِ برکت موجب رحمت ہے۔ صحابہ کرام بھی اس سے برکت حاصل کرتے اور اس کو متبرک جانتے تھے اور اس سے نفع کی اُمید رکھتے تھے۔ ثابت ہوا کہ بزرگانِ دین کے آثار کو تبرک بنانا، متبرک سمجھنا اور نفع کی اُمید رکھنا بدعت و شرک نہیں ہے بلکہ جائز ہے اور سنّت صحابہ ہے بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ تقریری ہے۔

مُہرِ نبوّت یہ حضور سید عالم علیہ السلام کے دونوں کندھوں کے درمیان گوشت کا اُبھار سا تھا جس کے اردگرد سیاہ بال تھے۔ صحابہ کرام نے اس کو مختلف الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ مسلم میں بیضۂ حمامہ کے لفظ آئے۔ یعنی وہ گوشت کا اُبھار کبوتر کے انڈے کی طرح تھا۔ ترمذی میں کالتفاحۃ کا لفظ آیا ہے (یعنی سیب کی طرح تھا) خاتم نبوۃ میں محمد رسول اللہ کے لفظ دکھائی دیتے تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاتم نبوۃ دیکھ کر ہی حضور علیہ السلام پر ایمان لائے تھے ——— عیسائی راہبوں اور دینِ عیسوی کے عالموں نے انہیں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تین نشانیاں بتائی تھیں۔ اوّل یہ کہ خود صدقہ نہ کھائیں۔ دوم یہ کہ ہدیہ خود بھی تناول فرمائیں گے۔ سوم یہ کہ ان کے کندھوں کے درمیان مُہر نبوت ہوگی۔ حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ پہلی دو علامتیں تو میں نے حضور میں پائی تھیں مگر تیسری علامت مُہرِ نبوت کے دیکھنے کا میں مشتاق تھا اور اسی کے مشاہدہ کے لیے ایک دن میں حضور کی پس پشت کھڑا ہو گیا کہ کسی طرح مجھے خاتم نبوّت نظر آئے۔ میں اسی کشمکش و پنج میں تھا کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری حالت دیکھ کر چادر مبارک کو پشت سے علیحدہ کر دیا۔ جونہی مجھے مہر نبوت نظر آئی میں نے اُسے چُوم لیا۔ (حجۃ اللہ علی العالمین۔ (ابن سعد، بیہقی وابونعیم)

عیسائی راہبوں کا اپنے معتقدین کو نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) کی علامت سے خاتم نبوت کو شمار کرنا اس امر کا اشارہ کرتا ہے کہ شاید کتب سماویہ میں حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی علامات کا جو ذکر تھا ان میں مہر نبوت کا بھی ذکر ہو، (واللہ اعلم) بخاری کی زیرِ تفہیم حدیث میں مثل زِرِ الحجلۃ کے لفظ آئے ہیں۔ حجلہ دراصل گنبد نما عمارت کو کہتے ہیں اور چھپر کھٹ کو بھی حجلہ کہتے ہیں۔ لکڑی کے تخت کے چاروں طرف بانس باندھ کر اس کو کپڑے سے آراستہ کرتے ہیں اور اس میں پھُندنے لٹکا دیتے ہیں۔ مطلب صرف یہ ہے وہ گوشت کا اُبھار چھپر کھٹ کے پھُندنے کی طرح تھا۔

بَابُ مَنْ مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ غُرْفَةٍ وَّاحِدَةٍ

باب ایک ہی چلّو سے کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا

اس باب کے قائم کرنے سے امام بخاری کا مقصود یہ بتانا ہے کہ کلی اور ناک میں پانی لینا ایک ہی چلو پانی سے سنت ہے اور امام نے حدیث عبداللہ بن زید سے استدلال کیا ہے جو یہ ہے کہ انھوں نے پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو دھویا۔

۱۸۹- وَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفَّةٍ وَّاحِدَةٍ فَفَعَلَ ذٰلِكَ ثَلٰثاً (بخاری)

پھر کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا ایک ہی چلو پانی سے تین بار ایسا کیا۔

پھر انھوں نے ہاتھ کہنیوں تک دھوئے (دو دو بار) اور سر کا مسح کیا اور ٹخنوں تک پاؤں دھوئے اور پھر کہا میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس طرح وضو کرتے دیکھا ہے۔

یہ حدیث امام بخاری نے پانچ مرتبہ ذکر کی ہے اور جتنے جملے عربی عبارت کے ہم نے یہاں لکھے ہیں یہ ترجمہ باب ہے۔ احناف کا مسلک یہ ہے کہ ناک میں پانی ڈالنے اور کلی کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ پانی کا چلو لینا سنت ہے۔ البتہ ایک ہی چلو سے کلی کی جائے اور ناک میں پانی ڈال لیا جائے تو جائز ہے۔ یہ حدیث احناف کے مسلک کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اس میں ایک ہی چلو سے ناک میں پانی ڈالنے اور کلی کرنے کا جو ذکر ہے وہ بیان جواز کے لیے ہے اور احناف اس کے منکر نہیں ہے۔ البتہ ان کے نزدیک ناک میں پانی ڈالنے کے لیے علیحدہ پانی کا چلو لینا اور کلی کے لیے علیحدہ پانی لینا سنت ہے جیسا کہ حدیث داؤد میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے ہر دو کے لیے علیحدہ علیحدہ پانی کا چلو لیا ــــ شیخ ابن الہمام علیہ الرحمۃ نے مِن کفۃ واحدۃ کی ایک اور ہی توجیہ کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ راوی کا مقصود اس جملے سے فصل و وصل نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ مضمضہ و استنشاق کے لیے ایک کف استعمال ہو کفین نہیں یعنی وضو کے لیے دیگر اعضا کے دھونے کے لیے دونوں ہاتھ استعمال ہوتے ہیں تو راوی حدیث مذکورہ بالا سے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کلی کرنے اور ناک میں پانی کے لیے ایک ہاتھ استعمال کیا جائے دو نہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیلی گفتگو باب الوضوء مرۃ مرۃ (باب وضو میں ایک ایک بار دھونا) میں ہو چکی ہے۔ قارئین یہ مقام دوبارہ دیکھ لیں۔

بَابُ مَسْحِ الرَّاسِ مَرَّةً

باب سر کا مسح ایک بار کرنا

اس عنوان کے ماتحت بھی امام بخاری نے حدیث عبداللہ بن زید ہی کو ذکر کیا ہے جس میں یہ لفظ آئے ہیں۔

۱۹۰، ۱۹۱- فَمَسَحَ بِرَاسِهٖ (بخاری)

پھر انہوں نے سر پر مسح کیا۔

سر کا مسح ایک بار کیا جائے یا تین بار

یہ حدیث باب غسل الرجلین الی الکعبین (یعنی پاؤں ٹخنوں سمیت دھوئے جائیں) حدیث ۱۸۵ گزر چکی ہے

حدیث کے مذکورہ بالا جملہ سے واضح ہوتا ہے کہ سر کا مسح ایک بار کرنا سنت ہے۔ چنانچہ وھیب کی روایت میں مَسَحَ بِرَاسِهٖ مَرَّةً کے لفظ موجود ہیں (بخاری)۔ واضح ہو کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سر کا مسح تین بار کرنا مسنون ہے وہ حدیث علی و عثمان غنی (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) سے استدلال کرتے ہیں۔ جس میں یہ مذکور ہے کہ ان دونوں حضرات نے تین بار سر کا مسح کیا لیکن ان دونوں حدیثوں میں کلام ہے اور مجاہد، حسن بصری، امام ابوحنیفہ و موید باللہ و ابونصر جو اصحاب شافعی

سے ہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے نزدیک ایک بار مسح کرنا سنت ہے۔ ان حضرات کے دلائل یہ ہیں۔
(۱) بخاری و مسلم میں حضرت عثمان و عبداللہ بن زید کی حدیث میں مسح کا عدد مذکور نہیں ہے۔ حالانکہ باقی اعضا کے متعلق تین تین بار کا ذکر ہے (۲) حدیث علی و ابن ابی اوفی و ابن عباس و سلمہ بن اکوع و ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہم سب میں ایک بار ہی مسح کرنے کی تصریح ہے۔ حدیث علی کے متعلق امام ترمذی نے فرمایا حسن صحیح ہے (۳) امام بیہقی نے فرمایا کہ حضرت عثمان سے جو تین بار مسح کرنا مروی ہے غریب ہے اور حفاظ ثقات کے خلاف ہے اس لیے حجت نہیں (۴) امام ابو داؤد نے فرمایا کہ حضرت عثمان سے اس بارے میں جو صحیح حدیثیں ہیں وہ اس پر دال ہیں کہ سر کا مسح ایک بار ہی ہے (نیل الاوطار) ابن خزیمہ نے حدیث عبداللہ بن عمرو ابن العاص کو صحیح کہا۔ اس میں یہ آیا ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو سے فارغ ہو کر مسح فرمایا اور روایت سعید بن منصور میں یہ تصریح ہے کہ آپ نے ایک بار سر کا مسح کیا تھا۔

من زاد علی ھذا فقد اساء وظلم (عینی ج۱ ص۳۴) | جس نے اس پر زیادتی کی اس نے برا کیا اور ظلم کیا

اس حدیث سے بھی تین بار مسح کرنے کی مسنونیت کی نفی ہوتی ہے اور اس سلسلہ کی حدیثوں کے الفاظ یہ ہیں:
(۱) حدیث عبداللہ بن زید: ثم مسح راسه بيديه (بخاری) (۲) حدیث حضرت عثمان غنی: ثم مسح براسه (بخاری) (۳) حدیث عبداللہ بن زید۔ فمسح راسه فاقبل بهما وادبر مرة واحدة (بخاری) (۴) حدیث وہیب۔ مسح راسه مرةً (بخاری) (۵) حدیث علی ومسح براسه مرةً (ترمذی وصححہ) (۶) حدیث علی مسح براسه واحدة (ابوداؤد) (۷) حدیث عائشہ۔ مسحت راسها مسحة واحدة (نسائی) (۸) حدیث حضرت انس۔ مسح براسه مرة (طبرانی) (۹) حدیث سلمہ بن اکوع۔ ومسح براسه مرةً (۱۰) حدیث ربیع۔ مسح راسه ما اقبل منه وما ادبر وصدغيه واذنيه مرةً واحدةً (ترمذی و قال حسن صحیح) (۱۱) حدیث حسین بن علی مسح براسه مرة واحده رضی اللہ تعالیٰ عنہم

توضیح | یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ کے نزدیک تین بار مسح کرنا اور ہر بار نئے پانی سے ہاتھ کو تر کرکے مسح کرنا سنت ہے۔ اب اس سلسلہ کی جس قدر حدیثیں ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ وہ کس پایہ کی ہیں۔ ان میں جو لفظ ملتے ہیں وہ صرف یہ ہیں:

مَسَحَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ | حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تین بار مسح کیا

میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ تکرار مسح کی حدیثوں میں تین بار مسح کا ذکر تو ہے مگر اس کی تصریح کسی روایت میں بھی نہیں ہے کہ "تین بار مسح" ہر بار نئے پانی سے ہاتھ تر کرکے کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک بھی تین بار مسح کرنا جائز تو ہے۔ بشرطیکہ ایک دفعہ ہاتھ تر کرکے کیا جائے۔ ہر بار ہاتھ کو نئے پانی سے تر نہ کیا جائے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ نے تصریح کی والذی یروی من التثلیث محمول علیه بماءٍ واحدٍ (ہدایہ اولین ص۳۲) غرضیکہ تثلیث مسح کی حدیثوں کا مطلب مسحات متعددہ نہیں ہے بلکہ اس سے مقصود استیعاب راس ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک بھی مسنون ہے۔ فافہم۔

بَابُ وُضُوْءِ الرَّجُلِ مَعَ اِمْرَاَتِہٖ وَفَضْلِ وُضُوْءِ

باب مرد کا اپنی بیوی کے ساتھ مل کر وضوء کرنا اور عورت کے وضوء سے جو پانی بچ جائے

الْمَرْاَةِ وَ تَوَضَّاَ عُمَرُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ بِالْحَمِیْمِ وَ مِنْ بَیْتِ نَصْرَانِیَّۃٍ

اس کا استعمال کرنا
اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گرم پانی سے وضوء کیا اور ایک نصرانی عورت کے گھر سے پانی لے کر استعمال کیا۔

فوائد و مسائل عنوانِ ہذا کا مقصود یہ ہے کہ عورت و مرد مل کر اگر کسی برتن سے وضوء کریں تو جائز ہے۔ اسی طرح گرم پانی سے وضوء کرنا بھی جائز ہے، نیز کافر کے گھر کا پانی جب کہ اس کے ناپاک ہونے پر دلیل نہ ہو استعمال کیا جاسکتا ہے اور قرآن میں جو "انما المشرکون نجس" آیا ہے اس سے نجاست اعتقادی مراد ہے۔

کفار کے کنوئیں اور برتن کے پانی کا حکم علامہ عینی نے فرمایا کہ اس اثر سے کفار کے کنوؤں اور برتنوں کے پانی کے استعمال کا جواز نکلتا ہے لیکن ان کے برتنوں، کپڑوں خواہ اہلِ کتاب یہودی و نصاریٰ ہی کیوں نہ ہو استعمال کرنا مکروہ ہے (عینی ج) اسی لیے فقہاء احناف نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ اور ہنود کے برتن اگر کسی مسلمان نے خرید لیے تو ان کو دھونے سے پہلے استعمال کرنا مکروہ ہے (ذخیرہ)

گرم پانی سے وضوء و غسل کرنے کے مسائل (۱) اتنے گرم پانی یا اتنے سرد پانی سے وضوء و غسل مکروہ ہے جو بدن پر اچھی طرح نہ ڈالا جاسکے اور تکمیل سنت نہ کرنے دے اور اگر ایسا پانی گرم یا سرد ہے کہ فرض پورا کرنے سے روکے تو پھر ظاہر ہے کہ وضوء و غسل ہوگا ہی نہیں (۲) اوپلوں سے گرم کیے ہوئے پانی سے وضوء و غسل سے احتمالِ برص ہے، اس مسئلہ میں اختلافات بکثرت ہیں مگر قول اصح و ارجح یہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اعلیحضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب منتہی الآمال میں ثابت کیا ہے (۴) اپنی بیوی کے بچے ہوئے پانی سے وضوء و غسل کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ ہاں غیر محرم عورت کے بچے ہوئے پانی سے وضوء و غسل کرنے کو ہمارے فقہائے نے مکروہ لکھا ہے کیونکہ اس میں فسادِ نیت کا خطرہ ہے۔

۱۹۲۔ اَنَّہٗ قَالَ کَانَ الرِّجَالُ وَالنِّسَآءُ یَتَوَضَّأُوْنَ فِیْ زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَمِیْعًا (بخاری)

حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ مرد اور عورتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک برتن سے وضوء کیا کرتے تھے (یعنی پردہ کا حکم آنے سے پہلے)

فوائد و مسائل حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) صحابی جب کسی فعل کو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی طرف نسبت کرے تو اس کو رفع کا حکم دیا جائے گا۔ جمہور علماء کا یہی مسلک ہے (۲) عورت اور مرد مل کر اگر ایک ہی برتن سے وضوء کریں تو جائز ہے (۳) عورت وضوء کر چکی اب برتن میں جو پانی باقی ہے اس سے وضوء کرنا جائز ہے (۴) بعض شارحین نے حدیث زیرِ بحث کا مطلب یہ لیا ہے کہ پانی تو ایک ہی برتن میں ہوتا تھا اور پہلے عورتیں وضوء کر کے فارغ ہو جاتی تھیں۔ پھر مرد آتے اور وضوء کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ یکدم اکٹھے عورتیں و مرد ایک

ہی برتن سے وضو نہیں کرتے تھے یا اگر کرتے بھی تھے تو یہ واقعہ پردہ کے حکم کے نزول سے پہلے کا ہوگا۔

بَابُ صَبِّ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَضُوْءَهٗ عَلَى الْمُغْمٰى عَلَيْهِ

باب حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے وضوء کا بچا ہوا پانی ایک بیہوش آدمی پر ڈالا

۱۹۳ - يَقُوْلُ جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُنِيْ وَاَنَا مَرِيْضٌ لَا اَعْقِلُ فَتَوَضَّأَ وَصَبَّ عَلَيَّ مِنْ وُضُوْئِهٖ فَعَقَلْتُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لِمَنِ الْمِيْرَاثُ اِنَّمَا يَرِثُنِيْ كَلَالَةٌ فَنَزَلَتْ اٰيَةُ الْفَرَائِضِ

حضرت جابر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری بیمار پرسی کے لیے تشریف لائے میں ایسا بیمار تھا کہ بالکل بیہوش تھا۔ آپ نے وضوء کیا اور اپنے وضوء کے بچے ہوئے پانی کو مجھ پر ڈال دیا۔ مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے عرض میرا وارث کون ہوگا میں توکلالہ ہوں تب آیتِ فرائض نازل ہوئی۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے طب و فرائض میں ذکر کیا۔ مسلم نے فرائض میں۔ نسائی نے طب، طہارۃ اور تفسیر میں (۲) علامہ ابن بطال نے کہا۔ اس حدیث سے ماءِ مستعمل کے پاک ہونے کا ثبوت ملتا ہے لیکن ظاہر ہے یہ بات اس حدیث سے قطعی طور پر ثابت نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ حضور علیہ السلام نے جو پانی برتن میں وضوء کرنے کے بعد باقی رہ گیا تھا وہ حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) پر ڈالا ہو اور اس کا پاک ہونا مسلم ہے اور اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ حضور علیہ السلام کے جسمِ پاک کا دھوون ہی تھا تو اس کے طیب و طاہر ہونے میں کس کو کلام ہے (۳) علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا صالحین کے جھوٹے پانی سے برکت کی اُمید رکھنا جائز ہے۔ (وَفِيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى اِنَّ بَرَكَةَ يَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَزُوْلُ كُلَّ عِلَّةٍ) اس میں اس امر پر بھی دلیل ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس کی برکت سے ہر بیماری دُور ہو جاتی ہے (عینی ج ۱ ص ۸۳۹) (۴) مسلمان اور خصوصاً غریب مسلمان کی عیادت کرنا مسنون ہے اور باعثِ ثواب ہے (۵) بڑے چھوٹوں کی عیادت کو جائیں۔

کلالہ کے معنیٰ فرائض جمع ہے فریضہ کی اور یہاں اس سے مراد ورثہ کے وہ حصے ہیں جو قرآنِ مجید میں مقرر فرمائے گئے ہیں۔ کلالہ اس کو کہتے ہیں جو اپنے بعد نہ باپ کو چھوڑے نہ اولاد کو۔ آیت یہ ہے۔ يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِى الْكَلَالَةِ الخ اس آیت کا شانِ نزول حدیث زیرِ بحث ہی ہے، جب حضور علیہ السلام نے حضرت جابر پر اپنا آبِ وضو ڈالا تو وہ صحت یاب ہو گئے۔ دیکھا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما ہیں۔ عرض کی سرکار میں اپنے مال کا کیا انتظام کروں۔ اس پر یہ آیۂ مبارکہ نازل ہوئی۔ (بخاری و ابوداؤد) ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور اکرم نے حضرت جابر سے فرمایا۔ میرے علم میں تمہاری موت اس بیماری سے نہیں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کا آبِ وضو تبرک ہے اور اس کو حصولِ شفا کے لیے استعمال کرنا سنّت ہے۔ مریضوں کی عیادت بھی سنّت ہے۔

بَابُ الْغُسْلِ وَالْوُضُوْءِ فِي الْمِخْضَبِ وَالْقَدَحِ وَالْخَشَبِ وَالْحِجَارَةِ

باب لگن پیالے اور لکڑی اور پتھر کے برتن سے غسل اور وضو کرنا (جائز ہے)

مخضب - اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کپڑے دھوئے جائیں یعنی مرکن - قدح کی جمع اقداح ہے جس میں پیا جائے یعنی پیالہ - خشب لکڑی کو کہتے ہیں - حجارۃ سے مراد تمام جواہر ارض جیسے لوہا، پیتل، تانبا، پتھر اور تمام وہ اشیاء جن کے برتن وغیرہ بنتے ہیں۔

۱۹۴- عَنْ اَنَسٍ قَالَ حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ فَقَامَ مَنْ كَانَ قَرِيْبَ الدَّارِ اِلٰى اَهْلِهٖ وَبَقِيَ قَوْمٌ فَاُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِخْضَبٍ مِّنْ حِجَارَةٍ فِيْهِ مَآءٌ فَصَغُرَ الْمِخْضَبُ اَنْ يَّبْسُطَ فِيْهِ كَفَّهٗ فَتَوَضَّاَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ قُلْنَا كَمْ كُنْتُمْ قَالَ ثَمَانِيْنَ وَزِيَادَةً

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ (عصر کی) نماز کا وقت آگیا تو جس کا گھر قریب تھا وہ تو اپنے گھر (وضو کرنے) کو گیا اور کچھ لوگ رہ گئے - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پتھر کی ایک لگن لائی گئی جس میں پانی تھا، وہ اتنی چھوٹی تھی کہ حضور علیہ السلام اپنی ہتھیلی اس میں پھیلا نہ سکے لیکن باوجود اس کے سب لوگوں نے اسی سے وضو کیا - حضرت انس رضی اللہ عنہ سے تو پوچھا کہ اس وقت وضو کرنے والے کتنے تھے فرمایا اسی سے کچھ زیادہ (بخاری)

فوائد و مسائل (۱) اس حدیث کو امام نے علامات نبوۃ میں بھی ذکر کیا - امام مسلم نے یوں روایت کیا کہ حضور علیہ السلام مقام زوراء میں تھے - وضو کے لیے پانی کی ضرورت ہوئی تو حضور علیہ السلام کی خدمت میں ایک پیالہ لایا گیا جس میں پانی تھا - حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس میں رکھ دیا تو آپ کی انگلیوں سے پانی نکلنے لگا اور اسی پانی سے تمام صحابہ کرام نے وضو کیا (۲) یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) انگلیوں سے پانی نکلنا حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم و جلیل معجزہ ہے (۲) برتن خواہ لکڑی کا ہو یا کسی اور دھات تانبا، پیتل، پتھر وغیرہ کا استعمال کرنا بلا کراہت جائز ہے - البتہ سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال حرام و ناجائز ہے۔

۱۹۵- عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعَا بِقَدَحٍ فِيْهِ مَآءٌ فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهٗ فِيْهِ وَمَجَّ فِيْهِ (بخاری شریف)

حضرت ابی موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کا ایک پیالہ منگایا - اس میں ہاتھ دھوئے، منہ دھویا اور کلی کی۔

فوائد و مسائل (۱) یہ حدیث باب استعمال فضل وضوء الناس میں حدیث ۱۸۶ میں مع تفہیم کے گزر چکی ہے - حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پانی کو متبرک کرنے کے لیے کبھی اس میں کلی فرما دیا کرتے تھے اور کبھی ہاتھ اور چہرہ مبارک دھو دیا کرتے تھے - یہ پانی صحابہ کرام بطور تبرک حاصل کرتے - بیماروں کو پلایا جاتا تو صحت یاب ہو جایا کرتے تھے - (۲) اس حدیث ۱۹۶ کے بعد امام نے ایک حدیث لکھی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہم نے (مَاءً فِيْ

تَوْرٍ مِّنْ صُفْرٍ) پیتل کی لگن میں پانی پیش کیا۔ آپ نے اس سے وضو فرمایا۔

واضح ہو کہ امام بخاری نے اس مضمون کی جسقدر حدیثیں لکھی ہیں۔ ان سے مقصود یہ بتانا ہے کہ تانبے پیتل وغیرہ جواہر ارض کے برتن سے وضو کرنا، اس میں کھانا پینا سب بلاکراہت جائز ہے۔ ایسے برتنوں سے وضو کرنے میں کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ ہاں بغیر قلعی کے برتن میں کھانا پینا مکروہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بے قلعی کا برتن جسمانی ضرر کا باعث ہے اور مٹی کا برتن تانبے پیتل کے برتن سے افضل ہے۔ علماء نے وضو کے آداب و مستحبات سے یہ بھی شمار کیا ہے کہ مٹی کے برتن سے وضو کیا جائے۔ اسی طرح مٹی کے برتن میں کھانا کھانا تواضع کے قریب تر ہے۔ (رد المحتار)

۱۹۷- اَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا ثَقُلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاشْتَدَّ بِهٖ وَجَعُهٗ اسْتَاْذَنَ اَزْوَاجَهٗ فِيْ اَنْ يُّمَرَّضَ فِيْ بَيْتِيْ فَاَذِنَّ لَهٗ فَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ رَجُلَيْنِ تَخُطُّ رِجْلَاهُ فِي الْاَرْضِ بَيْنَ عَبَّاسٍ وَّ رَجُلٍ اٰخَرَ قَالَ عُبَيْدُ اللّٰهِ فَاَخْبَرْتُ عَبْدَ اللّٰهِ ابْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ اَتَدْرِيْ مَنِ الرَّجُلُ الْاٰخَرُ قُلْتُ لَا قَالَ هُوَ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ وَّ كَانَتْ عَائِشَةُ تُحَدِّثُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَعْدَ مَا دَخَلَ بَيْتَهٗ وَاشْتَدَّ وَجَعُهٗ هَرِيْقُوْا عَلَيَّ مِنْ سَبْعِ قِرَبٍ لَّمْ تُحْلَلْ اَوْكِيَتُهُنَّ لَعَلِّيْ اَعْهَدُ اِلَى النَّاسِ وَاُجْلِسَ فِيْ مِخْضَبٍ لِّحَفْصَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ طَفِقْنَا نَصُبُّ عَلَيْهِ تِلْكَ حَتّٰى طَفِقَ يُشِيْرُ اِلَيْنَا اَنْ قَدْ فَعَلْتُنَّ ثُمَّ خَرَجَ اِلَى النَّاسِ (بخاری)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری سخت ہو گئی تو آپ نے اپنی ازواج سے میرے گھر میں تیمار داری ہونے کی اجازت لی۔ سب نے اجازت دیدی۔ آپ دو آدمیوں (عباس و علی) کے سہارے تشریف لائے۔ آپ کے دونوں پاؤں سے زمین پر لکیر کھنچتی جا رہی تھی۔ وہ دو آدمی عباس تھے اور ایک اور۔ عبید اللہ نے کہا میں نے یہ حدیث عبد اللہ بن عباس سے بیان کی۔ انھوں نے کہا تو جانتا ہے کہ وہ دوسرے شخص کون تھے۔ میں نے کہا نہیں فرمایا وہ علی ابن ابی طالب تھے اور حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے حجرہ میں آگئے اور آپ کی بیماری زیادہ ہو گئی تو آپ نے فرمایا مجھ پر ایسی سات مشکیں بہاؤ جن کے منہ نہ کھولے گئے ہوں تاکہ میں لوگوں کو وصیت کر سکوں۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ام المومنین حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک لگن میں جو (جو تانبے کی تھی) بٹھایا گیا اور ہم نے آپ پر مشکیں بہانا شروع کیں۔ یہاں تک آپ نے اشارہ سے فرمایا۔ تم اپنا کام پورا کر چکیں۔ پھر آپ لوگوں پر برآمد ہوئے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام مسلم نے صلوۃ میں، نسائی نے عشرۃ النساء و وفات میں، ترمذی نے جنائز میں اور امام بخاری نے اس حدیث کو تقریباً سات جگہ ذکر کیا ہے۔ یہاں ہم نے پوری حدیث لکھ دی ہے۔ آئندہ جس عنوان کے ماتحت یہ حدیث آئے گی ہم پوری حدیث نہیں لکھیں گے بلکہ عنوان کے مناسب الفاظ نقل کریں گے۔ یہ

حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

(۱) شوہر کو اپنی تمام بیویوں کے درمیان عدل کرنا واجب ہے۔ حضور علیہ السلام نے اپنی ازواج مطہرات کے لیے باری مقرر فرمادی تھی لیکن اس مرض میں حضور اکرم کا فطری رجحان یہ تھا کہ جناب عائشہ صدیقہ کے ہاں یہ ایام گزاریں۔ اس لیے آپ نے اپنی باقی ازواج سے اجازت مانگی اور انھوں نے جونہی اجازت دیدی تب حضور علیہ السلام حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مکان میں آگئے (۲) خاندان کے فردِ اعلیٰ یا حاکم کو بوقتِ وفات ضروری امور کی وصیت کرنا اور ان کی طرف خصوصی توجہ دلانا مستحب ہے (۳) پیتل، تانبے وغیرہ کے برتن میں بیٹھ کر نہانا جائز ہے (۴) مریض پر بہ نیتِ دوا و شفا پانی بہانا جائز ہے۔ اس سے بزرگوں کے ٹوٹکوں کے جواز کا ثبوت بھی ملتا ہے، بشرطیکہ وہ خلافِ شریعت نہ ہوں (۵) سات مشک پانی ڈالنے کے حکم کی اصلی حکمت تو اللہ کا رسول ہی جانتا ہے۔ ویسے شارحین نے لکھا ہے کہ سات کا عدد متبرک ہے اور اللہ تعالیٰ نے بہت سی اشیاء سات پیدا کی ہیں اور سات کا عدد وتر بھی ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وتر پسند ہے (۶) حضور علیہ السلام نے ایسی سات مشکیں ڈالنے کا حکم فرمایا ہے۔ جن کے منہ نہ کھولے گئے ہوں۔ اس کی حکمت یہ ہوگی کہ پانی بالکل صاف و پاک ہو اور دست و برد سے محفوظ ہو (۷) اس حدیث سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی فضیلت پر روشنی پڑتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاں قیام فرمانا محبوب جانا (۸) یہ سات عدد مشک ڈالنے سے حضور شفایاب ہوگئے۔ علامہ عینی علیہ الرحمہ نے لکھا کہ حضور علیہ السلام کو معلوم تھا کہ اس طریقہ سے میں شفایاب ہو جاؤں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ عینی ج ۱ ص ۸۴۴) (۹) طبرانی کی حدیث میں یہ تصریح ہے کہ حضور علیہ السلام نے سات عدد کنوؤں کا پانی طلب فرمایا تھا۔ اس نوع کی شرطیں بزرگوں کے عملیات و تعویذات میں بھی ہوتی ہیں جو غالباً اسی حدیث سے ماخوذ ہیں فافہم

بَابُ الْوُضُوْءِ مِنَ التَّوْرِ

باب تور سے وضوء کرنے کے بیان میں

واقعہ معراج کے متعلق جو حدیث حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اس میں یہ لفظ ہیں۔ فاتی بطست من ذھب۔ اس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ تور کے معنیٰ لوٹے کے ہیں کیونکہ طشت کے ساتھ لوٹے کی طرز کا ایک برتن ہوتا ہے۔ اس باب کے ماتحت امام نے حدیث عبداللہ بن زید ذکر کی ہے۔ جس میں وضوء کا طریقہ بیان ہوا ہے۔ حدیث گزشتہ اوراق میں مع تفہیم کے گزر چکی ہے اس میں یہ ہے۔ فدعا بتور کہ انھوں نے پانی کا ایک لوٹا منگوایا۔ یہی ترجمہ باب ہے اور اس سے تانبا پیتل وغیرہ کے لوٹے سے وضو کرنے کا جواز نکلتا ہے (۲) امام نے اس باب میں حدیث انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ذکر کی ہے جس میں یہ لفظ ہیں:۔

۱۹۸ -

۱۹۹ - دَعَا بِاِنَاءٍ مِنْ مَاءٍ فَاُتِیَ بِقَدَحٍ رَحْرَاحٍ (بخاری شریف)

حضور علیہ السلام نے پانی کا ایک برتن منگوایا تو ایک ایسے پیالہ میں آپ کی خدمت میں پانی پیش کیا گیا جس کا منہ چوڑا تھا اور اس میں تھوڑا سا پانی بھی تھا۔

اس کے بعد مضمون حدیث یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک اس پیالہ میں رکھ دیا۔ حضرت

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی انگلیوں سے پانی جوش مارتے ہوئے دیکھا۔ اس ایک پیالہ سے وضو کرنے والے صحابہ ستر یا اسّی کے قریب تھے۔ اس مضمون کی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ اس سے بھی پیالہ سے وضو کرنیکا جواز نکلتا ہے۔

بَابُ الْوُضُوْءِ بِالْمُدِّ

باب ایک مد پانی سے وضو کرنیکا بیان

مُد: امام شافعی علیہ الرحمۃ واہل حجاز کے نزدیک ایک رطل اور تہائی رطل کا ہوتا ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مُد دو رطل کا ہے۔ امام اعظم حدیثِ ذیل سے استدلال کرتے ہیں۔

۲۰۰- کان رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَتَوَضَّاءُ بمد رطلین وَ یَغْتَسِلُ بالصاع ثمانیۃ ارطال (دارقطنی وابن عدی)

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مد پانی سے وضو فرمایا۔ ایک مد دو رطل کا تھا اور ایک صاع پانی سے غسل فرمایا جو آٹھ رطل کا ہوتا ہے۔

مد اور صاع کا وزن صاع کا ایک پیمانہ ہے۔ چار مد کا، اور مد جس کو مَن بھی کہتے ہیں۔ احناف کے نزدیک دو رطل ہے اور رطل شرعی (غیر منقسم ہندوستان میں جو چاندی کا روپیہ رائج تھا) چھتیس روپے بھر ہے کہ رطل بیس استار کا ہوتا ہے اور استار ساڑھے ۴ مثقال کا۔ ایک مثقال ساڑھے ۴ ماشہ کا اور چاندی کا سابقہ مروجہ روپیہ سوا گیارہ ماشہ یعنی ڈھائی مثقال ہے تو رطل شرعی کہ نوّے مثقال ہوا۔ ڈھائی پر تقسیم سے چھتیس آئے تو صاع کہ ہمارے نزدیک آٹھ رطل ہے۔ دو سو اٹھاسی روپے بھر ہوا۔ لہٰذا اسی تولہ کے سیر کے حساب سے صاع کا وزن ۳ ۱/۲ سیر ۸ تولہ ہوا اور مد دو رطل کا ہے۔ ایک رطل چھتیس روپے بھر ہوا۔ اس حساب سے مد کا وزن ۸۰ تولہ سیر کے مطابق تین پاؤ ۲ چھٹانک دو تولہ ہوا۔

یَقُوْلُ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَغْسِلُ اَوْ کَانَ یَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ اِلٰی خَمْسَۃِ اَمْدَادٍ وَیَتَوَضَّاءُ بِالْمُدِّ (بخاری شریف)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک صاع سے لے کر پانچ مُد پانی کی (مقدار) تک غسل فرماتے اور ایک مُد پانی سے وضو کرتے۔

فوائد و مسائل یہاں چند اُمور قابلِ غور و فکر ہیں ۱۔ اوّل، حدیث مذکورہ میں مُد و صاع سے پانی کا اندازہ بتایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پیمانے اناج کے لیے ہوتے ہیں۔ پانی مکیل نہیں کہ اس کے لیے کوئی مُد یا صاع علیحدہ مقرر ہو۔ فقہاءِ احناف نے تصریح کی۔ پانی قیمی ہے مکیل و موزوں نہیں۔ لہٰذا صاع اور مُد سے پانی کا جو اندازہ بتایا گیا ہے۔ اس سے یہ مفہوم نہیں لیا جائے گا کہ صاع یا مُد میں جسقدر اناج آجائے اس کے وزن کے برابر پانی ہو بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ صاع یا مُد بھر پانی سے وضو اور غسل فرمایا۔ ظاہر ہے کہ پانی اناج سے بھاری ہوتا ہے۔ ایک صاع یا مُد میں جس قدر اناج کے دانے سمائیں گے ان کا وزن یقیناً ایک صاع یا مُد میں جو پانی

آئے گا، سے کم ہی ہوگا۔ اسی لیے شارحین کرام علامہ عینی و علامہ قسطلانی علیہما الرحمۃ نے باب الغسل من الصاع کی تفسیر ان لفظوں سے کی "ای بالماء قدر ملئ الصاع"۔ فافہم

دوم، یہ صاع کس اناج کا تھا؛ ظاہر ہے کہ اناج ہلکے بھاری ہوتے ہیں۔ جس پیمانے میں تین سیر جَو آئیں گے، گیہوں تین سیر سے زائد آئیں گے اور ماش اور بھی زائد، اسی طرح دو قسم کے گیہوں اگرچہ ایک ہی پیمانے میں لیے جائیں وزن میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ امام صدر الشریعہ نے شرح وقایہ میں صاع سے گیہوں کا صاع مراد لیا ہے اور علامہ شامی نے ردالمحتار میں جَو کا صاع احوط قرار دیا اور یہ ہونا بھی چاہیے۔ اس لیے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں جَو ہی عام طور پر پائے جاتے تھے۔ گیہوں کی کثرت زمانہ امیر معاویہ میں ہوئی۔ صحیح ابن خزیمہ میں عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہے کہ۔

"لم تکن الصدقۃ علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا التمر والزبیب والشعیر ولم تکن الحنطۃ"

بخاری شریف میں جناب ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے۔ کان طعام یومئذ الشعیر۔ قطع نظر اس کے یہ تو ظاہر ہے کہ مد و صاع کا اطلاق مُد و صاع جَو کو بھی شامل تو اس پر عمل ضرور اتباع حدیث کی حد میں داخل۔

سوم، اس باب میں جو حدیثیں آئی ہیں وہ یہ ہیں:۔ (۱) حدیث انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ہے کہ حضور علیہ السلام ایک مُد سے وضو فرماتے اور ایک صاع سے لے کر پانچ مُد تک غسل فرماتے (بخاری) ۲۔ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میں ہے۔ ایک مُد پانی سے وضو اور ایک صاع سے غسل فرماتے (مسلم و ترمذی، طحاوی وغیرہ) ۳۔ حدیث عبداللہ بن زید میں ہے۔ توضأ بثلث المد۔ حضور علیہ السلام نے ایک تہائی مُد سے وضو فرمایا (حاکم) ۴۔ حدیث ام عمارہ میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمانا چاہا تو ایک برتن لایا گیا جس میں دو تہائی مُد کے برابر پانی تھا (قدر ثلثی المد) (ابوداؤد و نسائی)۔ اور وضو میں حضور علیہ السلام کی عادت کریمہ یہ تھی کہ ہر عضو کو تین تین بار دھوتے اور کبھی دو بار بھی اعضاء دھوتے اور کبھی ایک ہی بار دھونے پر اکتفا فرمایا تو غالباً جب ایک بار اعضاء کریمہ دھوئے تو تہائی مُد پانی اور دو دو بار میں دو دو تہائی مُد اور تین تین بار پورا مُد پانی خرچ ہوتا ہوگا۔ ۵۔ اور ابوداؤد، نسائی و طحاوی و مسلم و بخاری میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت یوں ہے۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ بمكوك ويغتسل بخمسة مكاكي

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مکوک پانی سے وضو اور پانچ مکوک پانی سے غسل فرماتے۔

قاموس صحاح وغیرہ کتب لغت میں بتایا گیا کہ مکوک تین کیلہ کا ہوتا ہے اور کیلہ نصف صاع کا تو مکوک ڈیڑھ صاع کا ہوا۔ اس حساب سے وضو کے لیے چھ مُد پانی ہوا ـــــ لیکن امام طحاوی نے فرمایا کہ احتمال ہے کہ حدیث ہذا میں مکوک سے مراد مُد ہے کیونکہ مُد کو مکوک سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ نہایہ ابن اثیر جزری میں ہے کہ مکوک سے مراد مد ہے اور کہا گیا کہ مکوک سے مراد صاع ہے لیکن مُد مراد لینا اشبہ ہے کیونکہ دوسری حدیث میں مکوک کی تفسیر مُد سے مروی ہے۔ لہٰذا راجح یہ ہے کہ حدیث

مذکورہ میں مکوک سے مُد مراد لیا جائے۔ غرضیکہ وضوء کے پانی کے متعلق جو آثار وارد ہوئے ہیں ان میں پانی کی کم سے کم مقدار تہائی مُد اور زیادہ سے زیادہ مقدار ایک مُد ہے۔ —— اور ایک مد کی تصریح تو متعدد احادیث مرفوعہ میں موجود ہے مثلاً حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

یجزی مِنَ الوُضُوْءِ مد (طبرانی، احمد، حاکم، بیہقی)	کہ وُضو کے لیے ایک مُد پانی کافی ہے

غُسل کے متعلق

اب غسل کے متعلق روایات و آثار پر غور کیجئے۔ جناب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ:۔

(۱) انھا تَغْتَسِلُ ھی وَالنَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ یَسَعُ ثَلٰثَۃَ اِمْدَادٍ اَوْ قَرِیْبًا مِنْ ذٰلِکَ (مسلم شریف)	وہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے غسل فرمالیتے جس میں تین مُد یا اس کے قریب پانی کی گنجائش ہوتی۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ صدیقہ دونوں کا غسل اسی تین مُد پانی سے ہوجاتا تو ایک غسل کو گویا ڈیڑھ مُد ہی پانی رہا۔ ظاہر ہے کہ ڈیڑھ مُد پانی سے غسل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے علماء نے اس کی متعدد توجیہیں کیں —— علامہ قاضی عیاض نے فرمایا کہ اس حدیث میں ہر ایک کے جُداگانہ غسل کا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام اسی ایک برتن سے جس میں تین مُد پانی آتا تھا، غسل فرمالیتے اور اسی طرح حضرت عائشہ بھی فرمالیتیں یعنی برتن تو ایک ہوتا تھا مگر پانی کی مقدار ہر غسل کے لیے تین تین مُد ہوتی تھی لیکن اس توجیہہ پر یہ معقول اعتراض پڑتا ہے کہ بخاری و مسلم کی دوسری روایتوں میں یہ لفظ بھی موجود ہیں کہ مِنْ اِنَاءٍ بَیْنِی وبینہ واحد فیبادرنی حتیٰ اقول دع لِی۔ اور نسائی کے یہ لفظ ہیں کہ مِنْ اناءٍ واحد یبادرنی وابادرہ حتیٰ یقول دع لی و انا اقول دع لی کہ جب حضور علیہ السلام اور میں ایک ہی برتن سے نہاتے تو میں کہتی میرے لیے پانی چھوڑ دیجئے اور حضور اقدس فرماتے میرے لیے چھوڑ دینا۔ حدیث میں یہ تصریح مذکورہ بالا توجیہ کو بالکل ثابت کر دیتی ہے اور اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صرف تین مُد پانی ہی سے حضور علیہ السلام اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا غسل فرمالیتے تھے۔

بعض شراح حدیث نے فرمایا کہ یہاں مُد سے مراد صاع ہے۔ لیکن مُد بمعنی صاع آنا محتاج دلیل ہے اور کتب لغت صراح، قاموس، تاج العروس، مختار، نہایہ، مختصر السیوطی، مختار، صحاح، مصباح المنیر، لغات حدیث وطلبۃ الطلبہ۔ حتیٰ کہ مجمع البحار میں بھی اس کی تصریح نہیں ملتی کہ مُد کا اطلاق صاع پر بھی آتا ہے۔

علامہ نووی نے فرمایا کہ حدیث میں زیادہ کا انکار نہیں ہے۔ حضور اکرم و ام المومنین معاً تین مد پانی سے نہائے ہوں اور جب پانی ختم ہوچکا تو اور لے لیا ہو۔ لیکن اس توجیہہ پر ذکر مقدار فرمانا کہ برتن میں تین مُد پانی آتا تھا، عبث و بیکار ہوا جاتا ہے (واللہ اعلم)

فائدہ۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ شوہر اور بیوی دونوں ایک برتن سے ایک ساتھ غسلِ جنابت کریں اگرچہ باہم ستر نہ ہو اور اس وقت غسل سے متعلق بات کریں۔ مثلاً یہ کہیں کہ میرے لیے پانی رہنے دو یا صابن اٹھا دو یا

یا تولیہ کپڑا دو وغیرہ وغیرہ تو جائز ہے۔

(۲) موطا امام مالک۔ وصحیح مسلم وابوداؤد میں ام المومنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَغْتَسِلُ مِنْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ ھُوَ الْفَرَقُ مِنَ الْجَنَابَۃِ	کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک فرق برتن سے غسلِ جنابت فرماتے۔

فرق میں اختلاف ہے۔ مسلم شریف میں ہے کہ حضرت عفیٰن نے فرمایا۔ الفرق ثلثۃ آصع۔ فرق صرف تین صاع کا ہوتا ہے۔ امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے بھی اسی کو اختیار کیا۔ علامہ نووی نے فرمایا کہ جمہور کے نزدیک فرق تین صاع کا ہے۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ فرق دو صاع کا ہے۔ علامہ نجم الدین نسفی نے طلبۃ الطلبہ میں، نہایہ ابن اثیر وصحاح الجوہری اور ابوداؤد نے امام احمد بن حنبل سے نقل کیا کہ فرق سولہ(۱۶) رطل کا ہوتا مگر درحقیقت یہ اختلاف نہیں ہے کیونکہ دو صاع عراقی سولہ(۱۶) رطل کا ہوتا ہے۔ اور تین صاع حجازی بھی سولہ رطل کا ہوتا ہے۔ بہرحال غسل کے لیے پانی کی زیادہ سے زیادہ مقدار جو نص صریح ہے وہ حدیثِ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی میں ہے۔ جس میں پانچ مد پانی تک سے غسل فرمانے کا ذکر ہے اور غسل کے باب میں ارشادِ قولی ایک صاع ہے۔

فائدہ امام اجل طحاوی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ غسل کے لیے جو صاع بھر پانی مقرر ہے اس میں وہ وضوء مراد نہیں ہے جو غسل کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یعنی صاع بھر پانی صرف غسل کے لیے ہے اور وہ جو اکثر احادیث میں ایک صاع اور حدیث حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پانچ مد آیا ہے اس میں یہ تطبیق دی ہے کہ ایک مد پانی وضوء کا ایک صاع غسل کا۔ یوں غسل کے لیے کل پانچ مد ہوئے۔ طحاوی، غرضیکہ یہ وہ امور تنقیحیہ ہیں جو شارحینِ حدیث نے وضوء وغسل کی حدیثوں سے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔

کیا وضوء وغسل کے لیے پانی کی مقدار متعین ہے؟

ان تمام حدیثوں پر غور وفکر کے بعد جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ وضوء غسل کے لیے پانی کی مقدار معین نہیں ہے اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ مقدار معین نہ ہو، کیونکہ ایک لمبا چوڑا دوسرا دبلا پتلا، ایک کے تمام اعضاء پر بال، دوسرے کا بدن صاف، ایک گھنی ڈاڑھی والا، دوسرا بے ریش، ایک کے سر پر گھنے بال، دوسرے کا سر منڈھا ہوا دعلیٰ ہذا القیاس سب کے لیے ایک مقدار مقرر کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود حضور علیہ السلام نے وضوء وغسل میں جس مقدار میں پانی استعمال فرمایا اس میں بھی اختلاف ہے اور اس کا پایا جانا بدیہی ہے اور اس کی وجہ حالات کا تفاوت ہے اور حدیث میں جو صاع اور مد کا ذکر آیا اس سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ ایک مد پانی سے وضوء اور ایک صاع پانی سے غسل ہو سکتا ہے (یعنی ادنیٰ قدر سنت مد وصاع سے ادا ہو سکتی ہے) چنانچہ آئمہ دین وعلماء معتمدین مثل امام زکریا نووی امام محمود بدر عینی، امام محمد بن امیر الحاج وملا علی قاری نے نووی شرح مسلم، عینی شرح بخاری، شرح منیہ وشرح مشکوٰۃ میں اجماع امت میں نقل فرمایا کہ ان مقادیر پر قصر نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ پانی بلا وجہ محض زیادہ خرچ نہ ہو اور نہ ادائے سنت میں تقصیر ہے۔

یعنی اتنا پانی جس سے وضو و غسل کے فرائض و واجبات و سنن ادا ہو جائیں استعمال کیا جائے خواہ وہ مد و صاع سے زائد ہی کیوں نہ ہو جائے۔

بَابُ الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ

باب موزوں پر مسح کرنے کے بیان میں

اس باب میں امام بخاری نے چند حدیثیں لکھی ہیں جو یہ ہیں :۔

اوّل :۔ حضرت سعد ابن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

۲۰۱۔ اِنَّهُ مَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ (بخاری)	حضور علیہ السلام نے موزوں پر مسح کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے موزوں پر مسح کے متعلق پوچھا، آپ نے کہا ۔ فَقَالَ نَعَمْ ۔ ہاں! حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پر مسح کیا ہے۔ اور حضرت سعد جب تم سے کوئی حدیث بیان کریں تو پھر اس کے متعلق کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے (بخاری)

۲۰۲۔ **دوم** : حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام حاجت کے لیے نکلے مغیرہ ایک ڈول پانی لے کر آپ کے پیچھے چلے۔ جب آپ حاجت سے فارغ ہوئے تو مغیرہ نے آپ پر پانی ڈالا۔

فَتَوَضَّاءَ وَمَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ (بخاری)	حضور علیہ السلام نے وضو کیا اور موزوں پر مسح فرمایا۔

۲۰۳۔ **سوم** : حضرت عمرو بن اُمیہ ضمری نے اپنے والد سے سُنا کہ انھوں نے حضور علیہ السلام کو دیکھا کہ

يَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ (بخاری)	کہ آپ نے موزوں پر مسح فرمایا۔

۲۰۴۔ **چہارم** : انھیں سے روایت ہے، کہتے ہیں۔

رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْسَحُ عَلَى عِمَامَتِهِ وَخُفَّيْهِ (بخاری)	کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عمامہ پر اور موزوں پر مسح کرتے ہوئے دیکھا۔

فوائد و مسائل مسح علی الخفین کی مکمل بحث اور ضروری مسائل گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکے ہیں۔ اب نمبروار مذکورہ حدیثوں کے فوائد بیان کیے جاتے ہیں۔

(۱) حدیث اوّل افراد بخاری سے ہے۔ امام نے صرف ایک دفعہ ہی ذکر کی ہے۔ اس حدیث سے مسح علی الخفین کا جائز ہونا آفتاب نیمروز کی طرح واضح ہوتا ہے۔ عامہ فقہاء و عامہ صحابہ کرام جواز کے حق میں ہیں۔ البتہ شیعہ حضرات اس کے سخت مخالف ہیں۔ علامہ عینی نے لکھا کہ حضرت ابن عباس کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے کہ وہ مسح علی الخفین کو ناجائز کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ شیعہ حضرات کا قول ہے۔ ابن عباس کا نہیں۔ حضرت عمر بن عبدالبر نے فرمایا کہ تمام بدری صحابہ اور اہل حدیبیہ، مہاجرین و انصار تمام صحابہ کرام تابعین اور فقہائے مسلمین مسح علی الخف کے قائل ہیں اور اس سلسلہ میں صحابہ کرام سے ۵۳ حدیثیں مروی ہیں۔ امام طحاوی نے ان حدیثوں کو شرح معانی الآثار میں جمع فرمایا ہے (۲) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابی جلیل القدر و قدیم الصحبۃ پر بھی بعض اوقات کوئی اہم مسئلہ شرعی مخفی رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب عبداللہ بن عمر

نے حضرت سعد سے مسح علی الخفین کی حدیث سُن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ یہ مسئلہ ٹھیک ہے؟
حدیث دوم کو امام نے طہارۃ، مغازی اور لباس میں ذکر کیا اور مسلم وابو داؤد نے طہارۃ وصلوٰۃ میں اور ابن ماجہ ونسائی نے طہارۃ میں ذکر کیا۔ یہ حدیث مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے (۱) مسح علی الخفین بلاشبہ جائز ہے (۲) وضوء میں دوسرے سے مدد لینا جائز ہے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت مغیرہ سے مدد لی۔ وہ پانی ڈال رہے تھے اور حضور علیہ السلام وضوء فرما رہے تھے۔ البتہ وضوء میں کسی طرح کی مدد نہ لینا مستحب ہے اور کسی دوسرے سے اعضاءِ وضوء کو دھلانا مکروہ ہے۔ امام نووی نے فرمایا کہ وضوء کے لیے کسی سے پانی منگوایا جائے اس میں کوئی کراہت نہیں۔ اور پانی ڈلوانے کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ مکروہ ہے اور ایک یہ کہ جائز ہے لیکن پانی ڈلوانا تو حضور علیہ السلام سے ثابت ہے۔ یہ مکروہ نہیں ہوسکتا البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ کسی قسم کی مدد نہ لی جائے۔ (۳) حدیث زیرِ بحث کا واقعہ جنگِ تبوک کا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی تردید ہوجاتی ہے جو مسح علی الخفین کو آیتِ وضوء سے منسوخ قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ سورہ مائدہ جس میں وضوء کا بیان ہے وہ غزوہ مریسیع میں نازل ہوئی اور غزوہ تبوک اس کے بعد واقع ہوا (۴) خبرِ واحد یقین کا فائدہ دیتی ہے۔ جب کہ قرائن موجود ہوں (۵) اور یہ کہ خبرِ واحد احکام میں مقبول ہے (۶) ہمیشہ باوضوء رہنا مستحب ہے (۷) قضاءِ حاجت کے لیے پوشیدہ مقام تلاش کرنا چاہیئے۔

عمامہ پر مسح کی بحث

حدیثِ چہارم سے مسح علی الخفین کا جواز ثابت ہوا اور اس میں عمامہ پر مسح کا بھی ذکر ہے۔ خود صحابہ کرام میں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا۔ حضرت صدیق اکبر، فاروق اعظم وانس رضی اللہ تعالیٰ عنہم جواز کے حق میں ہیں۔ اوزاعی، احمد بن حنبل، ابو ثور، داؤد بن علی وسعد بن مالک وابو دردا وعمر بن عبدالعزیز، حسن، قتادہ، مکحول رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی جواز کے قائل ہیں۔ امام شافعی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ عمامہ پر مسح کی حدیث صحیح ہوجائے تو میں بھی اس کا قائل ہوں۔ پھر مجوزین کے درمیان ایک اختلاف یہ پیدا ہوا کہ عمامہ پر مسح کے لیے کوئی شرط ہے یا نہیں؟ ابو ثور کے نزدیک عمامہ پر مسح اس صورت میں جائز ہے، جب کہ باوضوء باندھا ہو۔ بعض کے نزدیک مطلقاً عمامہ پر مسح جائز ہے اور ابو ثور نے عمامہ پر مسح کے لیے وہی میعاد بھی مقرر کی جو مسح علی الخفین کے لیے ہے۔ نیل الاوطار ج۱ ص۱۶۴ حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ عمامہ پر مسح اس صورت میں جائز ہے جب کہ ناصیہ (ماتھے) کا مسح بھی ساتھ کیا جائے۔ امام سفیان ثوری، مالک ابن انس، ابن المبارک، شافعی اور حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک عمامہ پر مسح جائز نہیں۔ یہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں سر کا مسح فرض قرار دیا گیا ہے اور عمامہ پر مسح کی حدیثوں کی تاویل صحیح ہوسکتی ہے تو یقینی امر کو احتمال کے لیے ترک نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی وہ حدیثیں جن میں عمامہ پر مسح کا ذکر ہے ان کا مطلب ہے کہ حضور علیہ السلام نے مسح کے وقت عمامہ مبارک اتارا نہیں، بلکہ ناصیہ چوتھائی سر کا مسح فرمایا اور عمامہ پر بھی ہاتھ پھیر لیا۔ جیسا کہ حدیث مسلم میں آیا۔

تَوَضَّاءَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهٖ وَعَلَى الْعِمَامَةِ وَالْخُفَّيْنِ (مسلم)

کہ حضور علیہ السلام نے پیشانی پر مسح کرنے کے بعد عمامہ پر مسح کیا۔

سیدنا امام اعظم علیہ الرحمہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ صرف عمامہ پر مسح کرنا کافی نہیں، البتہ حدیثِ مسلم میں جو صورت مسح کرنے کی مذکور ہے ایسے کیا جائے تو درست ہے (واللہ تعالیٰ اعلم) (۲) یہاں پر یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ امام بخاری نے جو حدیث ذکر کی ہے اس میں عمامہ پر مسح کا بھی ذکر ہے مگر انھوں نے عمامہ پر مسح کا عنوان قائم نہیں کیا۔ جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ عمامہ پر مسح کے مسئلہ میں ضعف ہے ——— کیونکہ امام کا اندازِ فکر یہ ہے کہ جب روایت قوی ہو اور اس میں کوئی لفظ ایسا ہو جس میں فکر کو تردد ہو تو اس کا نہ عنوان باندھتے ہیں اور نہ اس سے استنباط کرتے ہیں۔ یہاں بھی یہی معاملہ ہوتا ہے (واللہ تعالیٰ اعلم)

بَابُ اِذَا اَدْخَلَ رِجْلَيْهِ وَهُمَا طَاهِرَتَانِ

باب موزوں کو باوضو پہننے کے بیان میں

۲۰۵ - قَالَ كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ فَاَهْوَيْتُ لِاَنْزِعَ خُفَّيْهِ فَقَالَ دَعْهُمَا فَاِنِّيْ اَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا (بخاری)

حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک سفر (غزوۂ تبوک) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ (آپ وضو کرنے لگے) میں جھکا تاکہ آپ کے موزے اُتار دوں اس پر آپ نے فرمایا موزے میں نے باوضو پہنے ہیں پھر آپ نے موزوں پر مسح کیا۔

فوائد و مسائل یہ واقعہ غزوہ تبوک کا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرما رہے تھے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چاہا کہ قدم اقدس سے موزے اُتار دیں تاکہ حضور علیہ السلام پاؤں دھولیں اس پر آپ نے فرمایا۔ موزے اُتارنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں نے ان کو باوضو پہنا ہے۔ ایسی صورت میں مسح کافی ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مسح علی الخفین جائز ہے جب کہ موزے وضو کر کے پہنے ہوں۔ اس سلسلہ میں ایک اختلاف یہ ہے کہ امام شافعی، مالک، احمد و اسحاق کے نزدیک بوقت لبس طہارۃ کاملہ کا ہونا ضروری ہے۔ اس مسئلہ کو آپ مثال سے سمجھ لیجیے۔ (۱) اگر کسی شخص نے پورا وضو کر کے موزے پہن لیے۔ (دیکھیے بوقت لبس موزہ طہارۃ کاملہ موجود ہے) اس کے بعد اس کو حدث ہوا وضو جاتا رہا۔ اس نے اب وضو پورا کیا۔ (دیکھیے اس صورت میں بوقت لبس طہارۃ کاملہ نہ تھی)۔ مگر بوقت حدث طہارۃ کاملہ موجود ہے۔ لیکن امام شافعی کے نزدیک اس صورت میں موزوں مسح جائز نہ ہوگا کیونکہ پہننے کے وقت طہارۃ کاملہ نہیں تھی۔ (۳) اگر کسی نے سارا وضو ترتیب کے ساتھ کیا اور ایک پاؤں دھو کر ایک موزہ پہن لیا۔ پھر دوسرا پاؤں دھو کر دوسرا موزہ پہن لیا۔ اس صورت میں بھی جب اس کا وضو جائیگا اور وہ شخص وضو کرے گا۔ امام اعظم کے نزدیک اس کو مسح علی الخفین جائز ہوگا۔ کیونکہ بوقتِ حدث طہارۃ کاملہ پائی گئی۔ لیکن امام شافعی کے نزدیک جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ بوقت لبس طہارۃ کاملہ نہ تھی اور یہ ظاہر ہے کہ حدیث زیر بحث پر اگر غور کیا جائے تو اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ بوقتِ لبسِ طہارۃ کاملہ کا ہونا شرط نہیں ہے۔ (تفصیل کے لیے عینی ج ۱ ص ۷۵۷ دیکھیے)

بَابُ مَنْ لَّمْ يَتَوَضَّأْ مِنْ لَحْمِ الشَّاةِ وَالسَّوِيْقِ

باب بکری کا گوشت اور ستو کھانے کے بعد وضو نہ کرنے کے بیان میں

(۱) وَاَكَلَ اَبُوْبَكْرٍ وَّعُمَرُ وَعُثْمَانُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ لَحْمًا فَلَمْ يَتَوَضَّئُوْا

اور حضرت ابوبکر صدیق و عمر فاروق و عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بکری کا پکا ہوا گوشت کھایا اور وضو نہیں کیا

۲۰۶ - (۲) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكَلَ كَتِفَ شَاةٍ ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کا شانہ تناول فرمایا (اور نماز پڑھی) لیکن وضو نہ کیا۔

۲۰۷ - (۳) اَنَّهُ رَاَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْتَزُّ مِنْ كَتِفِ شَاةٍ فَدُعِيَ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاَلْقَى السِّكِّيْنَ فَصَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ (بخاری)

عمرو بن امیہ کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکری کے شانہ کا گوشت کاٹ کر کھا رہے تھے۔ اتنے میں نماز کا وقت ہوگیا اور بلائے گئے۔ آپ نے چھری رکھدی پھر نماز پڑھائی اور وضو نہ کیا۔

فوائد و مسائل (۱) اس عنوان کے ماتحت امام بخاری نے جو حدیثیں ذکر کی ہیں ان سے مقصود یہ بتانا ہے کہ آگ پر پکی ہوئی چیزوں کے کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس مسئلہ کے متعلق ہم گزشتہ اوراق میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اوائل اسلام میں یہ حکم تھا کہ آگ کی چھوئی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ چنانچہ حضرت جابر ابن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔

كَانَ آخِرُ الْاَمْرَيْنِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ تَرْكُ الْوُضُوْءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ (طحاوی، ابوداؤد، نسائی، ابن حبان)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حکم یہی تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیزوں کے کھانے کے بعد وضو نہ کیا جائے۔

حدیث نمبر ۳ کو امام بخاری نے صلوٰۃ، جہاد، اطعمہ و طہارت میں بھی ذکر کیا ہے اور نسائی نے ولیمہ میں اور ابن ماجہ نے طہارۃ میں۔ حدیث نمبر ۳ مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا (۲) گوشت چھری سے کاٹ کر کھانا جائز ہے۔ ممانعت میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے (۳) امام مسجد کو نماز کے لیے بلانا جائز ہے حضور علیہ السلام کو بلانے والے جناب بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔

بَابُ مَنْ مَضْمَضَ مِنَ السَّوِيْقِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ

باب ستو کھانے کے بعد کلی کر کے نماز پڑھنا اور وضو نہ کرنے کے بیان میں

۲۰۹ - اَخْبَرَهُ اَنَّهُ خَرَجَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ خَيْبَرَ حَتّٰى اِذَا كَانُوْا بِالصَّهْبَاءِ وَهِيَ اَدْنٰى خَيْبَرَ فَصَلّٰى

سوید بن نعمان نے خبر دی کہ جس سال خیبر فتح ہوا۔ وہ فتح ہوا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ جب مقام صہباء پر آئے وہاں آپ نے نماز عصر ادا کی۔

العَصْرَ ثُمَّ دَعَا بِالْأَزْوَادِ فَلَمْ يُؤْتَ إِلَّا بِالسَّوِيْقِ فَأَمَرَ بِهِ فَثُرِّيَ فَأَكَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَكَلْنَا ثُمَّ قَامَ إِلَى الْمَغْرِبِ فَمَضْمَضَ وَمَضْمَضْنَا ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ　(بخاری)

پھر کھانے کا توشہ دان منگایا تو اس میں صرف ستو نکلے آپ کے حکم سے وہ بھگوئے گئے۔ پھر آپ نے اور سب حاضرین نے کھائے۔ اس کے بعد نماز مغرب کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپ نے کلی کی اور ہم نے بھی کلی کی اور آپ نے نماز پڑھائی۔ (وضوء نہ کیا)

فوائد و مسائل اس عنوان کے ماتحت امام نے ایک اور حدیث بھی ذکر کی ہے جس کا مضمون یہ ہے (۲) کہ حضور علیہ السلام نے بکری کا شانہ تناول فرمایا اور وضوء نہ کیا۔ یہ دونوں حدیثیں اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے (۱) آگ سے پکی ہوئی چیز کا کھانا ناقضِ وضوء نہیں ہے اور یہ کہ کھانے پینے کے بعد جب نماز کے لیے کھڑے ہوں تو کلی کر لینا مستحب ہے تاکہ چکنائی وغیرہ سے منہ صاف ہو جائے۔ ویسے بھی کھانے کے بعد منہ کو صاف کرنا صحت کے لیے مفید ہے۔ کھانے پینے کے بعد ہاتھ منہ کو صاف کر لینے کو وضوء طعام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

فائدہ حدیثِ اوّل کو امام نے سات جگہ ذکر کیا ہے۔ طہارۃ، مغازی، جہاد، اطعمہ وغیرہ میں اور نسائی و ابن ماجہ نے طہارۃ و ولیمہ میں اور حدیثِ دوم کو مسلم نے طہارۃ میں ذکر فرمایا (۲) صہبا وہی جگہ ہے جہاں سورج کے پلٹنے کا معجزہ ظہور میں آیا۔ صہبا مدینہ و خیبر کے درمیان ایک منزل ہے۔ امام طحاوی قدس سرہ العزیز نے مشکل الآثار میں اپنے شیخ سے نقل کیا کہ انہوں نے امتِ محمدیہ کو وصیت کی ہے کہ وہ اس معجزہ باہرہ کو جو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر ظہور پذیر ہوا خوب اچھی طرح یاد رکھیں۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

وقد حكى علي بن عبد الرحمن بن المغيرة عن احمد بن صالح انه كان يقول لا ينبغي لمن كان سبيله العلم التخلف عن حفظ حديث اسماء الذي روى لنا عنه لانه من اجل علامات النبوة　(مشکل الآثار ج ۲ ص۱۱)

۳۔ البتہ احناف کے نزدیک بھی مسِ ذکر و امراہ اور اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضوء کر لینا مستحب ہے۔ امام شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز بھی اس کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ طبرانی میں ہے کہ وہ جو بحالت جنابت سو جائے اور مر جائے تو

ان الملائكة لا تحضر جنازته　|　ملائکہ اس کے جنازے میں نہیں آتے

اور وضوء سے یہ مضرت چلی جاتی ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے فقہاءِ احناف نے تصریح کی کہ اجنبی عورت پر اگر نظر پڑ جائے تو وضوء مستحب ہے تو مسِ ذکر و امراہ تو اس سے بھی زیادہ افحش ہیں۔ لہٰذا اس کے لیے استحبابِ وضوء کا قول بہت مناسب ہے۔

(۴) اور وہ جو حدیث میں آیا کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد وضوء کیا جائے تو یہ امر بھی استحبابی ہے اور اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ملائکہ کھانے پینے سے پاک ہیں تو کھانے کے بعد وضوء کی ہدایت اس لیے دی گئی تاکہ طبائع ملائکہ سے بُعد نہ رہے۔

بَابٌ هَلْ يُمَضْمِضُ مِنَ اللَّبَنِ

باب کیا دودھ پینے کے بعد کلی کی جائے

۲۱۰ - عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَرِبَ لَبَنًا فَمَضْمَضَ وَقَالَ اِنَّ لَهٗ دَسَمًا۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ نوش فرمایا پھر کلی کی اور فرمایا دودھ میں چکنائی ہوتی ہے

اس حدیث کو امام مسلم، ابوداؤد و نسائی نے کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا۔ اس حدیث سے چکنائی دار چیز کھانے کے بعد کلی کر لینے کا استحباب ثابت ہوتا ہے نیز حضرت انس سے باسناد حسن ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے دودھ نوش فرمایا اور کلی نہ کی اور وضو بھی نہ کیا۔ اس سے ان لوگوں کی رائے کی تردید ہو جاتی ہے جو کھانے پینے کے بعد کلی کو واجب قرار دیتے ہیں۔ (عینی ج ۱ ص ۶۶۲)

بَابُ الْوُضُوْءِ مِنَ النَّوْمِ

باب نیند سے وضو کے بیان میں

وَمَنْ لَّمْ يَرَ مِنَ النَّعْسَةِ وَالنَّعْسَتَيْنِ اَوِالْخَفْقَةِ وُضُوْءًا (بخاری)

اور جو لوگ ایک دوبار اونگھنے یا ایک آدھ جھونکا لینے سے وضو لازم نہیں سمجھتے اس کی دلیل کے بیان میں

۲۱۱ - عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا نَعَسَ اَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّىْ فَلْيَرْقُدْ حَتّٰى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ فَاِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا صَلّٰى وَهُوَ نَاعِسٌ لَّا يَدْرِىْ لَعَلَّهٗ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبُّ نَفْسَهٗ (بخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے میں اونگھے تو وہ سو رہے۔ یہاں تک کہ نیند کا غلبہ اس پر سے جاتا رہے کیونکہ اونگھتے میں اگر کوئی نماز پڑھے تو ممکن ہے کہ وہ اپنے لیے بخشش مانگے اور زبان پر برائی کے کلمے جاری ہو جائیں۔

۲۱۲ - ۲ - عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا نَعَسَ فِى الصَّلٰوةِ فَلْيَنَمْ حَتّٰى يَعْلَمَ مَا يَقْرَاُ (بخاری)

حضرت انس سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی نماز میں اونگھے تو چاہیے کہ سو جائے یہاں تک کہ جو پڑھے وہ سمجھنے لگے۔

فوائد و مسائل (۱) حدیث اوّل کو امام ابوداؤد و مسلم نے کتاب الصلوٰۃ میں ذکر کیا ۲۔ نعاس یعنی اونگھ نیند کی ایک ایسی قسم ہے جس میں آدمی ایسا ہوشیار رہتا ہے کہ پاس کے لوگ جو باتیں کریں وہ اکثر پر مطلع رہتا ہے اور ایسی ہوشیاری نہ رہے تو پھر وہ نیند ہے۔ نیند ناقض وضو ہے اور اونگھ ناقض وضو نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو گزشتہ اوراق میں ہو چکی ہے۔ اس حدیث سے مسائل ذیل معلوم ہوئے (۱) یہ جو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو نماز میں اونگھے تو اسے چاہیے کہ سو جائے۔ پھر نیند پوری کرنے کے بعد نماز پڑھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وقت میں گنجائش ہو تو ایسا کرے تاکہ نماز

خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھی جائے۔ اونگھ کی حالت میں حضورِ قلب نہیں ہوگا۔ بعض علماء نے اس کراہت کو رات کے نوافل کے ساتھ خاص کیا ہے لیکن حدیث میں صلوٰۃ کا لفظ عام ہے تمام نمازوں کو شامل ہے۔(۲) اسی سے اس امر کی وضاحت بھی ہو گئی کہ اونگھ ناقضِ وضو نہیں ہے ورنہ حضور علیہ السلام نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم فرماتے اور حدیث دوم کو نسائی نے طہارۃ میں ذکر کیا ہے۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ اونگھ ناقضِ وضو نہیں ہے۔

بَابُ الْوُضُوْءِ مِنْ غَيْرِ حَدَثٍ

باب بغیر حدث کے وضو کرنا

۲۱۳- عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ عِنْدَ كُلِّ صَلٰوةٍ قُلْتُ كَيْفَ كُنْتُمْ تَصْنَعُوْنَ قَالَ يُجْزِئُ اَحَدَنَا الْوُضُوْءُ مَالَمْ يُحْدِثْ (بخاری)

حضرت انس فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لیے وضو فرمایا کرتے تھے۔ عمرو بن عامر نے انس سے پوچھا تم لوگ کرتے تھے؟ یعنی تم بھی ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے حضرت انس نے جواب دیا ہم کو تو ایک ہی وضو کافی ہوتا جب تک کہ حدث نہ ہو۔

فوائد و مسائل اس کے بعد امام نے وہی حدیث ۲۰۹ ذکر کی ہے جو باب من مضمض من السويق میں گزر چکی ہے یعنی خیبر سے واپسی پر مقام صہبا پر حضور علیہ السلام نے قیام کیا اور ستو تناول فرمائے۔ پھر مغرب کی نماز کا وقت آیا۔

۲۱۴- ۲- ثُمَّ صَلّٰى لَنَا الْمَغْرِبَ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ

تو آپ نے صرف کلی کی وضو نہیں کیا اور نماز پڑھائی۔

حدیثِ اول کو ترمذی و نسائی و ابن ماجہ نے طہارۃ میں ذکر کیا۔(۲) اس عنوان کے قیام سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنا واجب نہیں ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے دو حدیثیں اس عنوان کے ماتحت لکھیں۔ پہلی حدیث سے یہ نکلتا ہے کہ حضور علیہ السلام ہر نماز کے لیے تازہ وضو فرمایا کرتے تھے۔ جس سے ہر نماز کے لیے تازہ وضو کر لینا مستحب قرار پایا۔ اور دوسری حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وضو سے دو نمازیں پڑھیں یعنی دوسری نماز کے لیے تازہ وضو نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ تازہ وضو کر کے نماز پڑھنا واجب نہیں ہے۔

امام احمد علیہ الرحمہ نے باسناد حسن جناب ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میری اُمت پر شاق نہ ہوتا تو میں ان کو ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنے اور ہر وضو کے لیے مسواک کرنے کا حکم کرتا اس مضمون کی احادیث سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ وضو ہونے کے باوجود تازہ وضو کر کے نماز پڑھنا موجب خیر و برکت اور باعث رحمت ہے۔ لیکن یہ بات واجب نہیں ہے۔

بَابٌ مِنَ الْكَبَائِرِ اَنْ لَا يَسْتَتِرَ مِنْ بَوْلِهٖ

باب پیشاب سے نہ بچنا کبیرہ گناہ ہے

۲۱۵ - عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِحَائِطٍ مِنْ حِيطَانِ الْمَدِينَةِ أَوْ مَكَّةَ فَسَمِعَ صَوْتَ إِنْسَانَيْنِ يُعَذَّبَانِ فِي قُبُورِهِمَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَذَّبَانِ فَقَالَ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ ثُمَّ قَالَ بَلَى أَحَدُهُمَا لَا يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ وَكَانَ الْآخَرُ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ ثُمَّ دَعَا بِجَرِيدَةٍ فَكَسَرَهَا كِسْرَتَيْنِ فَوَضَعَ عَلَى كُلِّ قَبْرٍ مِنْهُمَا كِسْرَةً فَقِيلَ لَهُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ لِمَ فَعَلْتَ هٰذَا قَالَ لَعَلَّهُ أَنْ يُخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ تَيْبَسَا (بخاری)

حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ یا مکہ کے کسی باغ پر گزرے وہاں دو آدمیوں کی آواز سنی جنہیں قبر میں عذاب ہو رہا تھا۔ اس وقت آپ نے فرمایا ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے کسی بڑے گناہ میں نہیں پھر فرمایا البتہ بڑا گناہ ہے ان میں ایک تو اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغل خوری کرتا تھا۔ پھر آپ نے کھجور کی ایک ہری ٹہنی منگوائی۔ اس کے دو ٹکڑے کئے اور دونوں قبروں پر ایک ایک ٹکڑا ڈال دیا۔ صحابہ کرام نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا۔ اس لیے کہ جب تک یہ ٹہنیاں سبز رہیں گی ان کے عذاب میں تخفیف ہو۔

فوائد و مسائل

۱۔ حدیث ہذا کو امام بخاری نے طہارۃ و جنائز میں بھی ذکر کیا۔ مسلم، ابن ماجہ، ابوداؤد و ترمذی نے طہارۃ میں اور نسائی نے طہارۃ، جنائز و تفسیر میں درج کیا (۲) مقصود عنوان یہ بتانا تھا کہ پیشاب سے اپنے جسم اور کپڑوں کو محفوظ نہ رکھنا گناہ کبیرہ ہے۔ حدیث ہذا میں پیشاب سے نہ بچنے والے پر عذاب کا بیان ہوا جس سے اس گناہ کا اشد و اکبر ہونا ثابت ہوا۔

گناہ کبیرہ

(۱) حدیث بخاری عن ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں سات گناہ لیے گئے۔ اور حدیث حاکم میں نو اور کسی میں اس سے بھی زیادہ۔ جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس گنتی سے حصر مقصود نہیں ہے۔ اسی لیے بعض علماء نے فرمایا۔ ہر وہ گناہ جس کے ارتکاب پر شارع علیہ السلام نے وعید سنائی یا لعنت فرمائی یا عذاب و غضب کا بیان آیا وہ کبیرہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے کہا گناہ کبیرہ سات ہیں؟ آپ نے کہا سات سو تک ہیں مطلب یہ ہے کہ جیسے ایک چھوٹی سی نیکی اگر خلوص و تلبیت کے ساتھ کی جائے تو اس کا اجر بڑھ جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک ذرا سا گناہ اللہ عزوجل سے جس قدر بے خوفی اور جرأت کے ساتھ کیا جائیگا۔ اسی قدر اس کی سنگینیت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔ کبیرہ امر نسبی ہے ایک گناہ دوسرے گناہ کی نسبت کم درجہ کا ہوتا ہے تو اسی نسبت سے صغیرہ و کبیرہ کی تقسیم ہوگی۔ (عینی ج ۱ ص ۸۷۵) (۲) حائط کی جمع حیطان ہے کھجور کے باغ کو کہتے ہیں۔ جو چار دیواری میں ہو۔ دارقطنی کی روایت میں یہ تصریح ہے کہ یہ باغ جس میں حضور علیہ السلام کا گزر ہوا۔ ام البشر انصاریہ کا تھا ۳۔ روایت اعمش میں مر بقبرین کے لفظ ہیں۔ اور روایت ابن ماجہ میں بقبرین جدیدین کے لفظ آئے ہیں۔ یعنی وہ قبریں نئی تھیں۔ اس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ مقبور مسلمان تھے۔ ۴۔ لا یستتر بعض روایت میں لَا يَسْتَبْرِئُ اور لَا يَسْتَنْزِهُ بھی آیا۔ یہ تمام قریب المعنی ہیں اور ابو نعیم کی روایت میں لا یتوقی (نہیں بچتا تھا) آیا ہے۔

فَسَمِعَ صَوْتَ اِنْسَانَيْنِ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کی آواز سنی جنہیں قبر میں عذاب ہو رہا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عالمِ برزخ میں جو کیفیات ہیں ان پر آدمی مطلع ہو سکتا ہے اور یہ کہ آیت وما انت بمسمع مَن فِي الْقُبُورِ کے یہ بات منافی نہیں ہے کیونکہ آیت میں خود بخود سننے کی نفی ہے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ سنانا چاہے یا کسی کو ایسے حواس ہی عطا فرما دے جو احوالِ برزخ کا مشاہدہ کریں تو یہ ممکن ہے اور آیت کے منافی نہیں ہے بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو اس کا وقوع ہو گیا اور حضور علیہ السلام نے عالمِ برزخ کے احوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

۵۔ نمیمہ کے معنی کسی بات کو دوسرے تک نقصان دینے کے لیے پہنچانے کے ہیں اور یہ فعل نہایت مکروہ ہے اور اشد کبائر سے ہے کیونکہ چغلی کی وجہ سے دو مسلمانوں میں ناچاقی پیدا ہوتی ہے۔ بعض روایات میں آیا کہ شیطان دو مسلمانوں میں ناچاقی سے بہت خوش ہوتا ہے ۶۔ یعذبان۔ عذابِ قبر حق ہے اور اس کے ثبوت میں جلیل القدر صحابہ سے احادیث وارد ہوئی ہیں مایعذبان فی کبیر کے ایک معنی شارحین نے یہ کیے کہ وہ ایک ایسے کام سے نہیں بچتے تھے جس سے بچنا ان کے لیے کوئی مشکل نہ تھا (شرح السنہ)

فی کبیر: علامہ نووی نے فرمایا۔ پیشاب سے پرہیز کرنا فی نفسہ گناہ نہیں ہے۔ یہ کبیرہ اس لیے بن جاتا ہے کہ یہ فسادِ صلوٰۃ کا سبب بن جائیگا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ پاک رہنا ہر حال میں شارع علیہ السلام کو مطلوب ہے اور نجاست سے ملوث رہنا مکروہ ہے تو پیشاب سے پرہیز نہ کرنا اگرچہ صغیرہ ہے لیکن صغیرہ پر جب اصرار کیا جائے تو وہ کبیرہ ہو جاتا ہے (۲) اگرچہ حدیث میں عذابِ قبر کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیشاب کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی نجاسات سے بچنا عذابِ قبر کا سبب بن سکتا ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ ملائکہ کو ہر قسم کی نجاست سے ایذا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس گھر میں کتا یا جاندار کی تصویر ہو وہاں ملائکہ رحمت کا نزول نہیں ہوتا۔ پھر نجاست خواہ حسی ہو جیسے پیشاب یا حکمی جیسے چغل خوری ان سے بھی ملائکہ کو ایذا ہوتی ہے۔

اور حدیث میں پیشاب کو خاص کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ پاخانہ گوبر اور دوسری نجاستیں ایسی ہیں جن سے عام طور پر لوگ پرہیز کرتے ہیں خواہ جاہل ہوں یا عالم۔ اس کے برعکس پیشاب ایک ایسی نجاست ہے کہ لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے آپ مسٹران کرام کو دیکھ لیجئے کہ ان کی پتلونوں میں چھینٹے کیوں پیشاب ہوتا ہے۔ عرب بھی پیشاب سے پرہیز کرنے کا خیال خاص نہیں رکھا کرتے تھے جیسا کہ شارحین نے قصہ بول اعرابی فی المسجد کے ضمن میں تصریح کی ہے۔ لیکن جب اسلام آیا تو حضور علیہ السلام نے ان کی ایسی تربیت فرمائی کہ پھر انہی عربوں کا یہ حال ہو گیا کہ خود قرآن مجید میں ان کی طہارت و پاکیزگی کو سراہا گیا۔

۳۔ حدیث میں آیا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال ہوگا تو مناسب ہوا کہ قبر میں طہارت کے متعلق بھی سوال ہو کیونکہ برزخ حشر پر مقدم ہے اور طہارت نماز پر مقدم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیشاب سے نہ بچنے کے سبب قبر میں عذاب ہوا۔

۴۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں تو یہ آیا ہے کہ ان من شئ الا یسبح بحمدہ کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے اور حضور علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ جب تک یہ کھجور کی شاخیں تر رہیں گی تسبیح کریں گی۔ جواب یہ ہے کہ آیت میں من شئ سے مراد شئ حی ہے اور ہر چیز کی حیات اس کے حسبِ حال ہوتی ہے تو ٹہنیوں کی زندگی اسی وقت

تک ہے جب تک وہ سبز رہیں۔ لیکن جواب کچھ یونہی سا ہے کیونکہ آیت کا عموم و اطلاق تو یہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز خواہ وہ خشک ہو یا تر وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور محققین کرام نے بھی آیت کو اس کے عموم پر رکھا ہے۔ صحیح جواب یہ ہے کہ آیت و حدیث میں تضاد ہے ہی نہیں۔ کیونکہ حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ بتایا ہے کہ کھجور کی ان شاخوں کا بحالت تر و تازگی تسبیح سے عذاب قبر میں تخفیف ہوگی۔ باقی رہی یہ بات کہ خشک ہو جانے کے بعد بھی یہ تسبیح کرتی ہیں؟ تو حدیث میں اس کی نفی نہیں ہے اور جب قرآن مجید میں یہ بات ہے تو حدیث میں اس کی نفی کیسے ہو سکتی ہے۔

کیا ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہر چیز اللہ عزوجل کی تسبیح کرتی ہے خواہ وہ خشک ہو یا تر۔ اب یہ جو بعض آثار میں وارد ہوا کہ:

۱۔ کپڑا جب تک سفید رہے اللہ کی تسبیح کرتا ہے اور جب میلا ہو جائے تو نہیں کرتا ۲۔ پانی جب تک جاری رہے تسبیح کرتا ہے اور جب میلا ہو جائے تو نہیں کرتا ۳۔ پتھر جب تک اپنی جگہ پہ ہے تسبیح کرتا ہے اور جب پہاڑ سے کاٹ دیا جائے تو نہیں کرتا۔ "تو نہیں کرتا" کا مطلب صرف یہ ہے کہ تسبیح تو ہر چیز ہر حال میں کرتی ہے مگر حال میں جب تغیر ہوتا ہے تو اس کی تسبیح میں بھی تغیر ہو جاتا ہے۔ دیکھئے انسان کو خوشی کی حالت میں بھی بھوک لگتی ہے اور غم کی حالت میں بھی لیکن خوشی کی حالت میں جو بھوک لگتی ہے وہ اس بھوک سے مختلف ہوتی ہے جو اس کو غم کی حالت میں لگتی ہے۔

چنانچہ خود قرآن مجید نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ کہ ہر چیز کی تسبیح اس کے حال کے مطابق ہوتی ہے۔ درخت جب تک تر و تازہ ہے تسبیح کرتا ہے مگر جب سوکھ جاتا ہے تو بھی تسبیح کرتا ہے مگر یہ تسبیح اس نوع کی نہیں ہوتی جیسی کہ وہ بحالت تر و تازگی تسبیح کرتا تھا۔ کپڑا جل جانے کے بعد بھی تسبیح کرتا ہے مگر جلنے سے پہلے اس کی تسبیح اور نوع کی تھی اور راکھ ہو جانے کے بعد اور نوع کی ہے۔ آدمی زندگی میں تسبیح کرتا ہے اور مرنے کے بعد جب عناصر سے مل جاتا ہے جب بھی تسبیح کرتا ہے مگر پہلی تسبیح، تسبیح حیات ہے اور دوسری تسبیح، تسبیح عناصر ہے۔ غرضیکہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ لکڑی سوکھنے کے بعد تسبیح نہیں کرتی تو نفی اس تسبیح کی جاتی ہے جو وہ بحالت تر و تازگی کرتی تھی مطلقاً تسبیح کی نفی نہیں کی جاتی۔

قبر پر پھول ڈالنا جائز ہے

لعلہ ان یخفف: کھجور کی تر شاخیں قبروں پر ڈالنے کی حکمت حضور علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمائی کہ سبزے کی تسبیح سے ان کے عذاب میں تخفیف کی امید ہے۔ اس سے قبروں پر سبزہ ڈالنے کے جواز کا ثبوت ہوا اور جو لوگ سبزہ ڈالنے کو بدعت کہتے ہیں ان کے خیال کی تردید ہوگئی۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو تو معلوم ہو گیا تھا کہ ان قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے۔ اس لیے آپ نے سبز شاخیں ڈال دیں لیکن اور دوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا تو اس کا جواب علامہ ابن حجر علیہ الرحمۃ نے یہ دیا کہ کسی مقبور کے متعلق ہمیں یہ معلوم نہ ہونا کہ قبر میں اس کا کیا حال ہے؟ اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ ہم وہ کام نہ کریں جو تخفیف عذاب کا سبب ہے۔ جیسے رحم کا معلوم نہ ہونا اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ ہم مقبور کے لیے رحمت کی دعا بھی نہ کریں؟ (فتح الباری وعینی ج ۱ ص ۸۷۹) نیز بخاری کتاب الجنائز میں ہے کہ حضرت بریدہ بن الحصیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بوقت وصال یہ وصیت فرمائی کہ میری قبر پر سبز شاخیں لگائی جائیں تو جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم سے یہ امر منقول ہے تو اس کے جائز ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سبزہ کی تسبیح تخفیفِ عذاب کا سبب بنتی ہے اور قبر پر سبزہ ڈالنے میں فائدہ ہی کی اُمید ہے نقصان کی نہیں ۔ اگر فی الواقع صاحبِ قبر کو عذاب نہیں ہو رہا تو بھی سبزہ کی تسبیح و تہلیل اس کے لیے باعثِ برکت و موجبِ مزید رحمت ہی ہوگی ۔

قبر کے پاس تلاوتِ قرآن پاک جائز ہے

۹ ۔ علامہ خطابی نے فرمایا ۔ جب سبز شاخوں کی تسبیح سے میت کے عذاب میں تخفیف کی اُمید کی جاسکتی ہے تو قبر پر قرآنِ مجید کی تلاوت تو بطریقِ اولیٰ مستحب ہونی چاہیئے ۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :۔

فِیْہِ دَلِیْلٌ عَلٰی استحباب تِلاوَۃِ القرآنِ العزیز علی القبور لانہ اِذَا کان یرجی عن المیت التخفیف بتسبیح الشجر فتلاوۃ القرآن العظیم اعظم رجاء و برکۃ (عینی ج ۱ ص ۸۷۰)

اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ قبر پر قرآنِ مجید کی تلاوت مستحب ہے کیونکہ جب تر شاخوں کی تسبیح سے تخفیفِ عذاب کی اُمید ہے تو قرآنِ عزیز کی تلاوت سے تو بہت ہی برکت کی امید ہے ۔

(۱۰) علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے لکھا کہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ و احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا مسلک یہ ہے کہ میت کو قرآنِ عزیز پڑھنے کا ثواب پہنچتا ہے اور اس باب میں احادیث بھی وارد ہوئی ہیں ۔ مثلاً ابو بکر النجار نے کتاب السنن میں علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔

مَنْ مَرَّ بَیْنَ الْمَقَابِرِ فقراء قُلْ ھُوَاللّٰہ اَحَد احد عشر مرۃ ثُمَّ وھب اجرھا للاموات اعطی اللہ تعالیٰ بعدد اموات

جو کوئی قبرستان پر گزرے اور گیارہ بار قل ھو اللہ احد پڑھ کر اس کا ثواب اموات کو بخش دے اللہ تعالیٰ مردوں کے برابر ثواب عطا فرماتے ۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔

مَنْ دَخَلَ المقابر فقرء سورۃ یٰسین یخفف اللہ عَنْھُمْ یَوْمَئِذٍ (عن انس برفعہ)

جو قبرستان میں جائے اور سورۂ یٰسین پڑھ کر میت کو پہنچا دے اللہ تعالیٰ عذاب میں تخفیف فرمائے

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ۔

مَنْ زَارَ قَبْرَ وَالِدَیْہِ اَوْ اَحَدِھِمَا فَقَرَءَ عِنْدَہٗ اَوْعِنْدَھُمَا یٰسین غُفِرَلَہٗ

جو شخص اپنے والدین کی قبر کی زیارت کرے یا فقط ماں یا فقط باپ کی قبر پر جائے اور وہاں سورہ یٰسین پڑھے تو اللہ

اُن کی بخشش فرمائے۔

اور تمام علماء اسلام نے اجماع کیا کہ دُعا سے میت کو فائدہ پہنچتا ہے اور یہ بات قرآنِ مجید سے ثابت ہے اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ

جو ان کے بعد آئے وہ یہ دُعا کرتے ہیں کہ اے رب ہمارے ہماری مغفرت فرما اور ان کی بھی مغفرت فرما جو ہم سے پہلے ایمان لائے (اور وفات پا چکے)

اور بہت سی آیات واحادیث سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ دُعا کرنے سے میّت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ خود حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دُعا فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاَهْلِ بَقِيْعِ الْغَرْقَدِ

الٰہی بقیع غرقد کے رہنے والوں کی مغفرت فرمادے۔

اسی طرح نمازِ جنازہ میں حضور علیہ السلام نے یہ تعلیم دی کہ میّت کے لیے اللّٰھم اغفر لحینا ومیتنا کے الفاظ کے ساتھ دُعا مانگی جائے۔ اسی طرح ہر نیک عمل کا ثواب میت کو پہنچایا جا سکتا ہے۔ جس کے متعلق چند حدیثیں یہ ہیں۔ ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ میں اپنے والد کے ساتھ ان کے مرنے کے بعد کیا نیکی کر سکتا ہوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ یہ نیکی کر سکتے ہو۔

اَن تصلّی لهما مع صلاتك وان تصوموا لهما مع صيامك وان تصدق عنهما صدقتك

کہ ان کے ایصالِ ثواب کی نیت سے اپنی نماز کے ساتھ اور نماز پڑھ لو اور روزہ کے ساتھ روزہ رکھ لو اور صدقہ کے ساتھ ان کے نام پر بھی صدقہ دے دو۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ اگر ہم اپنے وفات شدہ افراد کے ثواب پہنچانے کی نیت سے صدقہ دیں یا حج کریں تو ان کو پہنچے گا؟ حضور علیہ السلام نے جواب دیا۔

نعم ويفرحون كما يفرحون احدكم بالطبق اذا اُهدِىَ اليه

(کتاب القاضی الامام ابوالحسین)

ہاں ثواب پہنچے گا اور تمہارے صدقہ سے میت ایسے خوش ہوں گی جیسے تم کو کوئی ایک طشت کھانا وغیرہ ہدیہ میں دے۔

اسی طرح حضرت سعد نے عرض کی میں اپنی والدہ کے ایصالِ ثواب کے لیے غلام آزاد کروں؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا نعم ہاں اور بخاری ومسلم میں ہے کہ ایک صاحب نے عرض کی۔ حضور میری والدہ کا انتقال ہوگیا ہے تو میں صدقہ کروں تو ان کو نفع ہوگا؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ نعم ہاں! حضرت ابوجعفر بن محمد بن علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ حضرات حسنین کریمین رضی اللہ تعالےٰ عنہم، حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی ذاتِ پاک کو ایصالِ ثواب کے لیے غلام آزاد فرمایا کرتے (عینی ج ۱ ص ۸۷۶)

فائدہ:۔ (۱) اسی مضمون کی حدیثِ جابر کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے انھیں کھجور کی شاخ کے دو

ٹکڑے کر کے قبروں پر ڈالنے کا حکم دیا اور اس میں عذاب کے سبب کا ذکر نہیں ہے اور کلمہ ترجی بھی نہیں ہے اور حدیث ابو ہریرہ میں یہ ہے کہ حضور علیہ السلام ایک قبر پر سے گزرے اور کھجور کی دو شاخیں منگوائیں ایک قبر کے سرہانے گاڑ دی اور دوسری پائنتی پر گاڑ دی ۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی واقعہ کی حکایت نہیں بلکہ ہر ایک مستقل واقعہ ہے (واللہ اعلم)

(۱۲) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چغلخوری ایک نہایت ہی مذموم فعل ہے اور گناہِ کبیرہ ہے اور ایسا گناہ ہے کہ اس کے سبب آدمی عذابِ قبر میں مبتلا ہو سکتا ہے اور یہی حال اپنے جسم اور کپڑوں کو پیشاب سے نہ بچانے کا ہے ۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے حواس کی کیفیت

(۱۳) حدیثِ زیرِ بحث میں یہ تصریح ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کے اندر کی کیفیت کو دیکھ لیا اور وہاں جو آواز پیدا ہو رہی تھی اس کو سن لیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے قوائے بدنیہ عام انسانوں کے قویٰ سے بالکل الگ حیثیت کے ہوتے ہیں ۔ اسی لیے وہ وہ کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں جو عام انسان دیکھ اور سن نہیں سکتے ۔ ابو البقاء نے "تعریفات" میں نبوت پر بحث کرتے ہوئے بو علی سینا کے حوالہ سے کیا خوب لکھا ہے کہ :-

فنحن نری الاشیا وبواسطۃ الحس والنبی یری الاشیاء بواسطۃِ القوی الباطنۃ ونحن نری ثم نعلم والنبی یعلم ثم یری

ہم لوگ (عام انسان) اشیاء کو حواس کے ذریعے دیکھتے ہیں اور نبی قوائے باطنہ کے ذریعہ دیکھتا ہے ہم لوگ ایک چیز دیکھتے ہیں پھر جانتے ہیں اور نبی پہلے جانتا ہے اور پھر دیکھتا ہے ۔

حضرت مولانا روم علیہ الرحمۃ نے اس حقیقت کا یوں اظہار فرمایا ہے ۔

فلسفی کو منکرِ حنانہ است ‏ ‏ از حواسِ انبیاء بیگانہ است

نطقِ خاک و نطقِ آب و نطقِ گل ‏ ‏ ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لیے ہماری تالیف "جامع الصفات" کا مطالعہ کیجیے جو مکتبہ رضوان لاہور سے قیمتاً مل سکتی ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي غَسْلِ الْبَوْلِ

باب پیشاب کو دھونے کے بیان میں

وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِصَاحِبِ الْقَبْرِ كَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ وَلَمْ يَذْكُرْ سِوَى بَوْلِ النَّاسِ

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (سابقہ حدیث) میں یہ بھی فرمایا کہ وہ قبر والا جسے عذاب ہو رہا تھا ، پیشاب سے پرہیز نہیں کرتا تھا تو آپ نے آدمی ہی کے پیشاب کا ذکر کیا

یعنی حدیثِ سابقہ میں مِنْ بولہ کے لفظ آئے ہیں ۔ یعنی جس کو قبر میں عذاب ہو رہا تھا اس کے متعلق حضور علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ وہ اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا معلوم ہوا کہ مراد اس سے خاص آدمی کا پیشاب ہے لیکن

یہ بالکل ظاہر ہے کہ بولہ کے جملہ سے یہ استدلال کرنا کہ آدمی کے علاوہ جانوروں اور شیر خوار بچوں کا پیشاب پاک ہے کسی طرح بھی درست نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے من بولہ تو صرف اس لیے فرمایا کہ اس شخص کا قبر میں عذاب پانے کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ اپنے پیشاب سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔

۲۱۶- عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَبَرَّزَ لِحَاجَتِهٖ اَتَيْتُهٗ بِمَاءٍ فَيَغْسِلُ بِهٖ

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب حاجت کے لیے جاتے تو میں پانی لے کر آتا آپ اس سے استنجاء فرماتے۔ (بخاری)

فوائد و مسائل یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) قضاء حاجت کے لیے دُور پوشیدہ مقام پر جانا۔ چھوٹے بچوں سے خدمت لینا اور پانی سے استنجاء کے متعلق تفصیلی گفتگو گزشتہ اوراق میں ہو چکی ہے۔

۲۱۷- اس کے بعد امام بخاری نے باب کا لفظ لکھ کر اس کے ماتحت وہی حدیث ۲۱۵ لکھی ہے۔ جس میں عذاب قبر کا بیان ہے۔ یہ حدیث مع تفہیم و ترجمانی کے پیش کی جا چکی ہے۔ اس لیے ہم نے یہاں نہیں لکھی۔

۲۱۸- (۱) بَابُ تَرْكِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالنَّاسِ الْاَعْرَابِيَّ حَتّٰى فَرَغَ مِنْ بَوْلِهٖ فِي الْمَسْجِدِ

باب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے اس گنوار کو جس نے مسجد میں پیشاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ چھوڑے رکھا۔ یہاں تک کہ وہ فارغ ہو گیا۔

۲۱۹- ۲۲۰- (۲) بَابُ صَبِّ الْمَاءِ عَلَى الْبَوْلِ فِي الْمَسْجِدِ

باب مسجد میں پیشاب پر پانی ڈالنے کے بیان میں۔

(۳) بَابُ يُهْرِيْقُ الْمَاءَ عَلَى الْبَوْلِ (بخاری)

باب پیشاب پر پانی بہانے کے بیان میں۔

فوائد و مسائل امام بخاری نے یہ تین عنوان قائم کیے ہیں۔ بخاری کے بعض نسخوں میں عنوان اوّل و دوم تو ہے۔ مگر عنوان سوم نہیں ہے۔ ان تینوں عنوانوں کے ماتحت امام نے تین حدیثیں لکھی ہیں، مگر چونکہ تینوں کا مضمون ایک ہے اس لیے ہم بوجہ اختصار صرف ایک حدیث لکھیں گے (۲) گزشتہ باب میں پیشاب کرنے کے بعد پانی سے استنجاء کرنے کا بیان تھا۔ اب اس باب میں پیشاب کو زمین سے پانی کے ساتھ دھونے کا بیان ہے۔

اَنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ قَامَ اَعْرَابِيٌّ فَبَالَ فِي الْمَسْجِدِ فَتَنَاوَلَهُ النَّاسُ فَقَالَ لَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعُوْهُ وَهَرِيْقُوْا عَلٰى بَوْلِهٖ سَجْلًا مِّنْ مَّاءٍ اَوْ ذَنُوْبًا مِّنْ مَّاءٍ فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ ایک گنوار کھڑا ہوا اور مسجد میں پیشاب کرنے لگا۔ لوگوں نے اس کو پکڑنا چاہا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رہنے دو اور جہاں اس نے پیشاب کیا ہے ایک ڈول پانی بہا دو۔ تم لوگوں پر نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو۔ سختی کے لیے نہیں۔ (بخاری شریف)

فوائد و مسائل حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) آدمی کا پیشاب نجس ہے (۲) مسجد کو نجس چیزوں سے پاک و صاف رکھنا ضروری ہے (۳) اگر کسی بے سمجھ آدمی سے کوئی خلافِ شرع کام صادر ہو جائے تو اسے نرمی کے ساتھ سمجھا دینا چاہیئے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے صحابہ کو روک دیا کہ وہ اسے کچھ نہ کہیں چنانچہ مسلم کی روایت میں ہے کہ جب وہ اعرابی پیشاب کر چکے تو حضور علیہ السلام نے ان کو بلایا اور فرمایا مسجدیں پیشاب و پاخانہ کے لیے نہیں ہیں بلکہ اللہ کے ذکر، نماز اور قرأت قرآن کے لیے ہیں (۴) اس حدیث سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ زمین کی طہارت صرف پانی سے ہو سکتی ہے۔ سوکھنے یا ہوا سے خشک ہونے سے نہیں ہو سکتی کہتے ہیں امام شافعی و امام مالک کا یہی مسلک ہے لیکن ظاہر ہے یہ استدلال درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس حدیث کے کسی طرق میں بھی حصر و تخصیص نہیں ہے یعنی اس امر کی قید نہیں ہے کہ زمین صرف پانی بہانے سے ہی پاک ہوگی۔ کسی دوسرے طریقہ سے نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں مصنف عبدالرزاق و ابن ابی شیبہ میں یہ حدیث موجود ہے۔

خفاف الارض طہورھا اذا جفت الارض فقد زکت

زمین کا سوکھ جانا اس کی طہارت ہے جب زمین سوکھ جائے تو پاک ہو جاتی ہے۔

اسی لیے سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا مسلک یہ ہے کہ زمین دھوپ کی گرمی یا ہوا سے سوکھ جائے اور نجاست کا اثر یعنی رنگ و بو جاتا رہے پاک ہو گئی، اس پر نماز پڑھنا درست ہے۔ غرض کہ حدیث زیر بحث میں تو صرف اس امر کا بیان ہے کہ اگر زمین نجاست سے ملوث ہو جائے اور اس پر پانی بہا دیا جائے اور نجاست کا اثر زائل ہو جائے تو زمین پاک ہو جائے گی۔ رہا یہ امر کہ زمین سوکھنے سے بھی پاک ہوتی ہے یا نہیں؛ تو حدیث زیر بحث میں نہ اس کی نفی ہے اور نہ اثبات (۲) ایک استدلال اس حدیث سے یہ کیا گیا کہ وہ پانی جس سے نجاست دھوئی گئی وہ پاک ہے کیونکہ وہ پانی جو زمین پر بہایا گیا ہے زمین میں جذب ہوگا لیکن یہ استدلال بھی درست نہیں ہے کیونکہ حدیث میں ہریقوا علی بولہ کے لفظ موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب پانی بہایا جائے گا تو نجاست اس کے ساتھ بہہ جائے گی اور ہریقوا کا مطلب یہ ہے کہ اس طریقہ سے پانی ڈالا جائے کہ نجاست کو ساتھ لے کر بہہ جائے۔ لہٰذا وہ پانی جو نجاست لے کر بہا ہے کیسے پاک ہو سکتا ہے (۵) اس حدیث سے یہ استدلال بھی کیا گیا کہ کپڑوں کو دھوتے وقت نچوڑنا ضروری نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ زمین کو کپڑے پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ کپڑے کو تو نچوڑا جا سکتا ہے اور زمین کو نچوڑنا ممکن ہی نہیں ہے۔

بَابُ بَوْلِ الصِّبْيَانِ

باب بچوں کے پیشاب کے حکم کے بیان میں

۲۲۲- (۱) عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنَّهَا قَالَتْ اُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِصَبِيٍّ فَبَالَ عَلٰى ثَوْبِهٖ فَدَعَا بِمَآءٍ فَاَتْبَعَهٗ اِيَّاهُ (بخاری)

(۱) حضرت عائشہ ام المؤمنین سے روایت ہے کہ ایک بچہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں لایا گیا تو اس نے آپ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا آپ نے پانی منگایا اور کپڑے پر جہاں جہاں پیشاب تھا اس پر ڈال دیا۔

۲۲۳ - (۲) عَنْ اُمِّ قَیْسٍ بِنْتِ مِحْصَنٍ اَنَّهَا اَتَتْ بِابْنٍ لَهَا صَغِيْرٍ لَّمْ يَاْكُلِ الطَّعَامَ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَجْلَسَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجْرِهٖ فَبَالَ عَلٰى ثَوْبِهٖ فَدَعَا بِمَآءٍ فَنَضَحَهٗ وَلَمْ يَغْسِلْهُ

(۲) ام قیس بنت محصین اپنے لڑکے کو جو ابھی روٹی وغیرہ نہ کھاتا تھا (شیر خوار تھا) بحضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آئیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنی گود میں بٹھایا۔ اس نے پیشاب کر دیا تو آپ نے پانی منگایا اور اس کو بہادیا (دھویا نہیں)
(بخاری)

فوائد و مسائل

۱۔ حدیث اول کو امام نسائی نے طہارۃ میں ذکر کیا ہے اور حدیث دوم کو امام مسلم نے طب و طہارۃ میں اور ترمذی ، ابن ماجہ و نسائی نے طہارۃ میں ذکر کیا (۲) صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین اپنے شیر خوار بچوں کو بحضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم لاتے تھے ، تاکہ حضور علیہ السلام بچہ کے لیے دُعا فرمائیں اور تحنیک کریں اور حضور کی شفقت و محبت کا یہ عالم تھا کہ بچہ کو گود میں لیتے تھے اور دستِ رحمت پھیر دیتے تھے ۔ علامہ عینی نے لکھا کہ جس کے لیے حضور علیہ السلام دُعا فرما دیں :۔

يسعد في الدنيا والآخرة (عینی ج ۱ ص ۸۹۴)

وہ دین و دنیا میں سعید ہو جاتا ہے ۔

کیا شیر خوار بچہ کا پیشاب پاک ہے

ان دونوں حدیثوں سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا کہ شیر خوار لڑکے کا پیشاب پاک ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ان حدیثوں میں شیر خوار لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکنے اور شیر خوار لڑکی کے پیشاب کو دھونے کا بیان آیا۔ اس تفریق سے یہ واضح ہوا کہ شیر خوار لڑکے کا پیشاب پاک ہے اور شیر خوار لڑکی کا پیشاب نجس ہے لیکن ایسا کہنا باطل محض ہے اور اس کے باطل ہونے پر یہی بات کافی ہے کہ اگر شیر خوار لڑکے کا پیشاب پاک ہوتا تو پھر اس پر پانی بہانے کا حکم کیوں دیا جاتا۔ اسی سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ جن حدیثوں میں فرشه عليه ۔ فصبه على البول اور فنضحه کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے دراصل غسل دھونا ہی مراد ہے اور لغت میں نہ سہی مگر کلامِ شارع میں صب رش اور نضح پانی بہانے کے معنی میں آیا ہے۔ نیز حنابلہ و شوافع کی طرف جو نسبت کی جاتی ہے کہ وہ شیر خوار بچے کے پیشاب کو پاک قرار دیتے ہیں یہ نسبت صحیح نہیں ہے ۔ خود امام نووی علیہ الرحمۃ نے اس کی تردید فرمادی اور اس کو نقلِ باطل قرار دیا اور فرمایا :۔

الخلاف فى كيفية تطهير الذى بال عليه الصبى ولا خلاف فى نجاسته
(عینی ج ۱ ص ۸۸۹)

کہ حنفیہ اور شافعیہ کے درمیان اختلاف اس امر میں ہے کہ اگر شیر خوار لڑکا پیشاب کر دے تو اس چیز کو کیسے پاک کیا جائے اور شیر خوار لڑکے کے پیشاب کے نجس ہونے میں اختلاف نہیں ہے (نووی شرح مسلم)

اس سے واضح ہو گیا کہ امام شافعی و امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کے متعلق جو یہ مشہور ہو گیا کہ وہ شیر خوار لڑکے لڑکے کے پیشاب کو پاک قرار دیتے ہیں تو اس شہرت کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ دونوں حضرات شیر خوار لڑکے کے پیشاب پر صرف پانی

چھڑک دینے سے طہارت کا حکم کر دیتے ہیں ۔ اس سے لوگوں نے یہ سمجھا کہ ان حضرات کے نزدیک لڑکے کا پیشاب پاک ہوگا جبھی تو صرف پانی چھڑک دینے کے حکم پر اکتفا کیا ۔ بہرحال یہ بات بالکل یقینی ہے کہ یہ حضرات بھی شیر خوار بچے کے پیشاب کو نجس ہی قرار دیتے ہیں البتہ تطہیر میں اختلاف ہے ۔ امام شافعی یہ فرماتے ہیں کہ صرف پانی چھڑکنے سے طہارت ہو جائے گی اور احناف کا مسلک یہ ہے کہ دھونے سے پاک ہوگا ۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ احادیث جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں ان میں فرشہ، فاتبعہ، فنضعہ کے لفظ آئے ہیں ۔ اس سے مراد معمولی طور پہ دھونا ہے اور بعض احادیث ہیں تو بول غلام و جاریہ میں بظاہر تفریق کی طرف اشارہ یا دلالت بھی موجود ہے ۔ ملاحظہ کیجئے ۱۔ حدیث حضرت علی کرم اللہ وجہہ تعالیٰ کے لفظ یہ ہیں :۔

۱۔ انہ قال فی الرضیع یغسل بول الجاریۃ و ینضح بول الغلام (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

شیر خوار لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے اور لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکا جائے ۔

(۲) حدیث ابی السمح رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ ہے ۔

یغسل من بول الجاریۃ و یرش من بول الغلام (ابوداؤد)

شیر خوار لڑکی کا پیشاب دھویا جائے اور لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکا جائے ۔

(۳) حدیث حضرت ابن عباس میں ہے کہ حضور علیہ السلام کے کپڑوں یا جسم پر شیر خوار بچہ کا پیشاب

بول صبی و هو صغیر فصب علیہ من الماء بقدر البول (دارقطنی)

لگ گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر پانی بہایا (جس قدر جگہ پیشاب کی تھی اس پر)

(۴) حدیث حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ :۔

یصب علی بول الغلام و یغسل بول الجاریۃ (طبرانی)

شیر خوار لڑکے کے پیشاب پر پانی بہایا جائے اور لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے ۔

ان احادیث کے پیش نظر امام شافعی علیہ الرحمۃ نے یہ رائے قائم کی کہ شیر خوار بچہ کا پیشاب اگر کپڑے وغیرہ کو لگ جائے تو اتنی جگہ جہاں پیشاب لگا ہے پانی چھڑک دیا جائے پاک ہو جائے گا ۔ پانی چھڑکنے کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ پر اتنا پانی ڈال دے جو ٹپکے نہیں بلکہ کپڑے میں ہی جذب ہو جائے اور شیر خوار لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے اور دھونے کا مطلب یہی ہے کہ پانی کپڑے سے ٹپک پڑے ۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ شیر خوار لڑکی اور لڑکا جب روٹی کھانے لگ جائے تو اس کا پیشاب دھونے ہی سے کپڑا وغیرہ پاک ہوگا ۔ صرف پانی چھڑکنے سے طہارت نہ ہوگی ۔ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک چھوٹے اور بڑے سب کے پیشاب کا ایک ہی حکم ہے یعنی دھونے ہی سے کپڑا وغیرہ پاک ہوگا اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کیونکہ جب لڑکا اور لڑکی شیر خوار نہ ہوں تو ان کے پیشاب میں کوئی تفریق نہیں ہے لہٰذا زمانۂ شیر خوارگی میں بھی تفریق نہیں ہونی چاہیئے ۔ اور احادیث میں جو رش و نضح کے لفظ آئے ہیں تو کلام شارع علیہ السلام میں یہ لفظ غسل خفیف کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوئے ہیں ۔ لہٰذا یہاں بھی دھونے کے معنیٰ ہی مراد لیے جائیں گے ۔ چنانچہ اس امر کے دلائل کہ رش و نضح غسل کے معنیٰ میں آیا ہے یہ ہیں ۔

(۱) شرمگاہ کو مذی لگ جائے تو اس کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

فلینضح فرجہ، ولیتوضأ (ابوداؤد) | چاہیئے کہ وہ اپنی شرمگاہ پر پانی چھڑک لے اور پھر وضو کرے۔

۲۔ دوسری حدیث میں فرمایا۔

یغسل ذکرہ ویتوضاء | چاہیئے کہ شرمگاہ کو دھولے پھر وضو کرے۔

یہ دونوں حدیثیں ایک ہی سوال کے جواب میں ہیں۔ قصہ بھی ایک ہی ہے اور راوی بھی دونوں کے حضرت علی و مقداد ابن اسود ہیں۔ ان میں سے ایک میں نضح کا لفظ آیا ہے اور دوسری میں غسل کا۔ معلوم ہوا کہ نضح (چھڑکنے) سے مراد دھونا ہی ہے۔ اسی طرح حدیث سہل بن حنیف میں ہے کہ انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ کپڑے کو مذی لگ جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا۔

(۳) یکفیك ان تاخذ کفا من مآء فتنضح به ثوبك حیث یریٰ انه اصابه (ترمذی) | ایک کف پانی کا لے کر وہاں چھڑک دے جہاں جہاں تجھے کپڑے پر مذی لگی ہوئی نظر آئے۔

دیکھو یہاں بھی نضح سے مراد دھونا ہے صرف چھڑکنا نہیں ہے۔ نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضور علیہ السلام کے وضوء کی کیفیت، ان لفظوں میں بیان فرمائی ہے۔

(۴) اخذ غرفةً من مآء فرش علی رجله الیمنیٰ حتیٰ غسلها | حضور علیہ السلام نے ایک چلّو پانی کا لیا اور اپنے سیدھے پاؤں پر چھڑکا یہاں تک کہ دھو دیا۔

دیکھئے یہاں بھی رش بمعنی غسل کے ہے اسی طرح نضح و رش غسل کے معنیٰ میں ان دو حدیثوں میں بھی وارد ہوا۔ جو یہ ہیں۔ حضور علیہ السلام نے حضرت اسمار رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا۔ ثم تنضحہ ثم تصلی فیه ثم رشیه وصلی فیه (بخاری مسلم ترمذی)

ان سے ثابت ہوا کہ کلام شارع میں رش و نضح دھونے کے معنیٰ میں آیا۔ پس بول غلام کے بارے میں جو احادیث مروی ہیں۔ ان میں بھی رش و نضح دھونے کے معنیٰ میں لینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ سیدنا امام شافعی علیہ الرحمۃ کے مسلک پر ایک سوال یہ وارد ہوتا ہے کہ جب ان کے نزدیک بھی شیر خوار لڑکے کا پیشاب نجس ہے تو صرف اس پر پانی چھڑک دینے سے فائدہ؟ خصوصاً ایسی صورت میں جب ان کے نزدیک صرف اتنا پانی چھڑکنا چاہیئے جو کپڑے کی اتنی جگہ پر پڑ کر جذب ہو جائے جتنی جگہ کو پیشاب نے گھیرا ہے (۲) یہاں اہل علم کے لیے یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ خون حیض کے متعلق بھی حدیث میں لتنضحه کے لفظ آئے ہیں (بخاری کتاب الحیض) اور اس پر سب کا اجماع ہے کہ خونِ حیض ناپاک ہے لہذا شیر خوار بچہ کا پیشاب کے لفظ نضح سے اس کی طہارت کا قول کرنے والوں کو یہ چاہیئے کہ وہ خونِ حیض کی طہارت کا بھی قول کریں فافہم۔

بَابُ الْبَوْلِ قَائِمًا وَقَاعِدًا

باب کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر پیشاب کرنے کے بیان میں

۲۳۴ - عَنْ حُذَیْفَۃَ قَالَ اَتَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ | حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِمًا ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ (بخاری)

کوڑا جمع ہونے کی جگہ پر تشریف لائے اور کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ پھر پانی منگایا۔ آپ نے وضوء فرمایا۔

فوائد ومسائل

۱۔ امام بخاری نے متعدد بار اس حدیث کو کتاب الطہارۃ میں لکھا ہے۔ ترمذی، مسلم، ابن ماجہ، نسائی نے بھی کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا ہے۔ یہ اور اس مضمون کی دو ایک حدیثیں اور بھی بخاری میں ہیں جن میں حضور علیہ السلام کا کھڑے ہو کر پیشاب فرمانے کا ذکر ہے۔ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔

۱۔ حضرت سعید ابن مسیب، عروہ، محمد بن سیرین، زید ابن اصم، عبیدہ السلمانی، امام نخعی، حاکم، شعبی و امام احمد کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کو مباح قرار دیتے ہیں۔ حضرت علی و انس و ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی کھڑے ہو کر پیشاب کرنا مروی ہے ۲۔ امام مالک علیہ الرحمۃ کی رائے یہ ہے کہ اگر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں چھینٹیں نہ لگیں تو حرج نہیں ورنہ مکروہ ہے۔

۳۔ ابن المنذر نے کہا بیٹھ کر پیشاب کرنا اچھا ہے اور کھڑے ہو کر مباح ہے، حضور علیہ السلام سے دونوں طرح ثابت ہے۔

(۴) عامہ علماء حنفیہ بلا عذر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کو مکروہ تنزیہہ قرار دیتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ (عینی ج ا ص۸۹۴)

کھڑے ہو کر پیشاب کرنا جائز نہیں ہے؟

اس کی چند حدیثیں یہ ہیں:۔

(۱) حضرت عائشہ صدیقہ ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جو تم سے یہ بیان کرے کہ حضور علیہ السلام نے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا۔ اس کی تصدیق مت کرو۔ ما کان یبول الا قاعدًا (رواہ الخمسہ) (۲) حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یبول الرجل قائمًا۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے سے منع فرمایا۔ (ابن ماجہ) لیکن اس حدیث کی اسناد میں عدی بن الفضل ہے جو متروک ہے۔ (۳) حدیث بریدہ جس کو بزار نے بسند صحیح روایت کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ تین باتیں جفاء سے ہیں۔ ان یبول الرجل قائمًا (یہ کہ آدمی کھڑے ہو کر پیشاب کرے)۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو غیر محفوظ قرار دیا گیا ہے مگر بزار نے بسند صحیح روایت کیا ہے۔ (عینی ج ا ص۸۹۶) ۴۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا تو فرمایا۔

یا عمر لا تبل قائمًا قال فما بلت قائمًا بعدُ (بیہقی)

اے عمر کھڑے ہو کر پیشاب مت کرو۔ تو پھر میں نے اس کے بعد کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا۔

لیکن امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ ابن جریج، عبد الکریم بن امیہ سے روایت کرتے ہیں اور یہ ضعیف ہیں۔ عبد الکریم نے اس حدیث کا رفع کیا ہے۔ مگر ایوب نے ان میں کلام کیا اور اس کو ضعیف قرار دیا ہے ۵۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ:۔

مَا بَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

کہ نزولِ قرآن کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

لہ حدیث ۱ و ۵ دوسری حدیثوں کے متعارض نہیں ہیں کیونکہ حضرت عائشہ اپنا مشاہدہ بیان فرما رہی ہیں اور ان کا مشاہدہ ظاہر ہے کہ گھر ہی سے متعلق ہو

قائما منذ انزل علیه القرآن | کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا۔

حدیث ہذا کو ابو عوانہ نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے روایت کیا اور دارقطنی وغیرہ نے اس کو صحیح کہا۔ (۶) ابن ماجہ نے بعض مشائخ سے نقل کیا کہ عربوں کی عادت کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی تھی اور نسائی و ابن ماجہ کی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر پیشاب کیا تو ہم نے کہا۔

فقلنا انظروا الیه یبول کما تبول المرأة | دیکھو حضور تو ایسے پیشاب کر رہے ہیں جیسے عورتیں کرتی ہیں (یعنی بیٹھ کر)

حافظ ابن حجر علیہ الرحمۃ نے فرمایا اس حدیث کو عبدالرحمٰن بن حسنہ نے روایت کیا اور یہ صحیح ہے دارقطنی نے اس کو صحیح کہا۔ (نیل الاوطار ج ۱ ص ۸۸) (۷) اور حضرت ابو موسیٰ سے منقول ہے انھوں نے ایک شخص کو کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا تو فرمایا:۔

ویحك افلا قاعدا | برائی ہو بیٹھ کر کیوں نہیں کرتا

علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے ان تمام توضیحات کے بعد فرمایا کہ کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر دونوں طرح پیشاب کرنا جائز ہے اور اکثر علماء نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔ **لوجود احادیث النهی واکثرها غیر ثابت فافهم** ۔ غرض کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی ممانعت کی حدیث صحیح ہو جائے تو پھر تو یہ فعل مکروہ تحریمہ ہوگا اور اس کا قول نہیں بلکہ امام نسائی علیہ الرحمۃ نے تو باب الرخصۃ فی البول فی الصحراء قائما کا عنوان قائم ہے اور علامہ سندھی نے دونوں حدیثوں میں یہ تطبیق دی ہے۔ (۲) حدیث حذیفہ محمول ہے خارج بیت پر اور حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جس میں یہ آیا کہ حضور علیہ السلام بیٹھ کر پیشاب فرماتے تھے یہ محمول ہے بیت پر فافہم۔ (۳) ہاں بعض علماء نے حدیث مستدرک کو سامنے رکھ کر یہ فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا کھڑے ہو کر پیشاب فرمانا کسی عذر کی وجہ سے تھا۔ جیسا کہ حدیث مستدرک للحاکم میں آیا **کان لوجع فی مابضه** یعنی گھٹنوں کے اندرونی حصہ میں حضور کو تکلیف تھی۔ اس لیے بحالت قیام پیشاب فرمایا۔ یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن بیان احتمالات کا فائدہ دے سکتی ہے۔ (۴) البتہ بعض صلحاء امت نے اس معاملہ میں سختی بھی کی ہے تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ہمارے زمانہ میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا نصاریٰ کا شعار ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر اس معاملہ میں سختی کی جائے تو پھر بھی مکروہ تنزیہیہ سے زیادہ کا حکم نہیں دیا جا سکتا (واللہ تعالیٰ اعلم)

بَابُ الْبَوْلِ عِنْدَ صَاحِبِهِ وَالتَّسَتُّرِ بِالْحَائِطِ

باب اپنے ساتھی کے نزدیک پیشاب کرنا اور دیوار کی آڑ کرنا

۲۲۵ - عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ رَأَيْتُنِي أَنَا وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَتَمَاشٰى فَأَتٰى سُبَاطَةَ قَوْمٍ خَلْفَ حَائِطٍ فَقَامَ | حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ میں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چہل قدمی کر رہے تھے تو آپ قوم کی کوڑا ڈالنے کی جگہ پہنچے اور دیوار کے پیچھے ایسے کھڑے ہوئے جیسے تم

سکتا ہے اور گھر سے باہر کا حال انہیں معلوم نہیں ہے۔ منہ

كَمَا يَقُوْمُ اَحَدُكُمْ فَبَالَ فَانْتَبَذْتُ مِنْهُ فَاَشَارَ اِلَيَّ فَجِئْتُهُ فَقُمْتُ عِنْدَ عَقِبِهٖ حَتّٰى فَرَغَ (بخاری)

میں سے کوئی کھڑا ہوتا ہے پھر آپ نے پیشاب کیا اور میں الگ ہوگیا۔ آپ نے اشارہ سے مجھے بلایا تو میں آپ کی ایڑی کے قریب کھڑا ہوگیا یہاں تک آپ فارغ ہوئے۔

فوائد و مسائل (۱) حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کبار صحابہ کرام سے ہیں۔ مسلم میں ہے کہ انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک ہونے والے واقعات بتا دیے تھے۔ حضرت حذیفہ کے والد بھی صحابی تھے جو جنگ اُحد میں شہید ہوئے اور حضرت حذیفہ نے جناب علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی ابتداء خلافت ۳۶ھ میں وفات پائی۔ آپ سے بخاری میں بائیس ۲۲ حدیثیں مروی ہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) (۲) یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے:۔

(۱) اگر ساتھی نزدیک ہی بایں طور کھڑا ہو کہ شرمگاہ اس کی نظروں سے پوشیدہ رہے تو ایسی حالت میں پیشاب کرنا جائز ہے حضور علیہ السلام نے اپنی حفاظت کے لیے یا کسی اور وجہ سے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے نزدیک کھڑا کر لیا ہو۔ اور وہ حضور علیہ السلام کی ایڑیوں کے قریب کھڑے ہو گئے تھے یا یہ کہ آپ نے ان کو اس لیے کھڑا کیا ہو کہ ایک طرف تو دیوار کا پردہ ہو جائے اور دوسری طرف حذیفہ حائل ہو جائیں جیسا کہ طبرانی کی حدیث میں یا حذیفہ استرنی کے لفظ آئے ہیں۔

(۲) اس سے بعض نے یہ استدلال کیا کہ پیشاب کرتے ہوئے باتیں کرنا جائز ہے مگر یہ استدلال باطل ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے حضرت حذیفہ کو اشارہ سے بلایا تھا اور حدیث میں اشارہ کا لفظ بھی موجود ہے۔ البتہ مسلم میں (اُدنہ) کا لفظ آیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ روایت بالمعنی ہے۔ چنانچہ ابو داؤد کی حدیث میں ہے کہ دو آدمی ایسا نہ کریں جب کہ وہ اپنی شرمگاہوں کو کھولے ہوئے قضاء حاجت کر رہے ہوں۔

يَتَحَدَّثَانِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَمْقُتُ عَلٰى ذٰلِكَ (ابوداؤد) | اور باتیں کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں ہے

اس حدیث میں مذکورہ بالا صورت میں بات کرنے سے منع فرمایا گیا۔ ہاں اگر ضرورت شرعی ہو تو بات کرنے میں حرج نہیں ـــــ علامہ قاضی عیاض علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ یہی تھی کہ قضاء حاجت آبادی سے دُور جا کر فرماتے لیکن یہاں آبادی کے قریب قضاء حاجت فرمانا اس وجہ سے ہوگا کہ آپ امور مسلمین میں مشغول رہے تو حاجت ہوگئی اور آبادی سے دُور جانے میں دشواری محسوس ہوئی۔ اس لیے قریب ہی رفع حاجت فرمائی۔

بَابُ الْبَوْلِ عِنْدَ سُبَاطَةِ قَوْمٍ

باب سباطہ قوم کے نزدیک پیشاب کرنے کے بیان میں

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اندازِ فکر یہ ہے کہ حدیث کے ایک ایک ٹکڑے کا عنوان باندھ دیتے ہیں۔ اس عنوان کے ماتحت بھی امام نے مذکورہ بالا مضمون کی حدیث ذکر کی ہے جس میں یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے سباطہ قوم پر پیشاب فرمایا۔ سُباطہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں بستی والے بستی کا کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں۔ ویسے سباطہ کے اصل معنی اس جگہ کے ہیں جہاں مٹی کا ڈھیر لگا ہوا ہو اور وہ ٹیلے کی صورت ہو جائے۔

۲۲۶- عَنْ اَبِيْ وَائِلٍ قَالَ كَانَ اَبُوْ مُوْسٰى | حضرت ابو وائل سے روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ

الْاَشْعَرِیُّ یُشَدِّدُ فِی الْبَوْلِ وَیَقُوْلُ اِنَّ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ کَانَ اِذَا اَصَابَ ثَوْبَ اَحَدِھِمْ قَرَضَہٗ فَقَالَ حُذَیْفَۃُ لَیْتَہٗ اَمْسَكَ اَتٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سُبَاطَۃَ قَوْمٍ فَبَالَ قَآئِمًا (بخاری)

اشعری پیشاب کرنے والے کے ساتھ سختی کرتے (منع کرتے) اور فرماتے (بنی اسرائیل کی شریعت میں یہ مسئلہ تھا کہ کپڑے کو پیشاب لگ جائے تو اس کو کتر ڈالتے) حذیفہ نے کہا کاش ابو موسیٰ اس سختی سے باز رہتے۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ سباطۂ قوم پر آئے اور کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔

اصل واقعہ یہ تھا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ چھینٹوں سے بچنے کے لیے قارورہ میں پیشاب کیا کرتے تھے، کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں عموماً چھینٹیں آتی ہیں۔ اس لیے وہ لوگوں کو خصوصی طور پر تنبیہ فرمایا کرتے کہ کھڑے ہو کر پیشاب مت کرو اور ظاہر ہے کہ اگر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں کپڑوں اور جسم پر چھینٹیں لگیں تو یہ صورت ممنوع قرار پائے گی اور اس کی علت قیام نہیں بلکہ تلویث ثوب و بدن ہوگی۔ فافہم۔ اسی سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ ایسی ہیئت سے قضائے حاجت کرنا کہ کپڑے یا بدن ملوّث ہوں ممنوع ہے۔

بَابُ غَسْلِ الدَّمِ

باب خون (حیض) دھونے کے بیان میں

۲۲۷۔ عَنْ اَسْمَآءَ قَالَتْ جَآءَتِ امْرَاَۃٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ اَرَءَیْتَ اِحْدَانَا تَحِیْضُ فِی الثَّوْبِ کَیْفَ تَصْنَعُ قَالَ تَحُتُّہٗ ثُمَّ تَقْرُصُہٗ بِالْمَآءِ وَ تَنْضَحُہٗ بِالْمَآءِ وَتُصَلِّیْ فِیْہِ (بخاری)

حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت بحضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حاضر ہوئی۔ اس نے عرض کی ہم میں سے اگر کسی عورت کو کپڑے میں حیض آجائے تو کیا کریں؟ آپ نے فرمایا۔ پہلے اس کو کھرچ ڈال پھر پانی ڈال کر رگڑے اور پانی سے دھو ڈالے۔

فوائد و مسائل ۱۔ امام نے اس حدیث کو صلوٰۃ اور بیوع میں ذکر کیا۔ مسلم، ترمذی، نسائی و ابن ماجہ نے طہارۃ میں ذکر کیا (۲) حضرت اسماء سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی والدہ ماجدہ ہیں۔ آپ کو ذات النطاقین بھی کہتے ہیں۔ مہاجرات میں سے ہیں۔ علم تعبیر کی ماہر تھیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابن سیرین نے علم تعبیر حضرت ابن مسیب سے اور انھوں نے جناب اسماء سے حاصل کیا تھا۔ ۷۳ھ میں سو برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ بخاری میں حضرت اسماء سے سولہ حدیثیں مروی ہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)
(۳) مطلب حدیث یہ ہے کہ اگر کپڑے کو خونِ حیض لگ جائے تو اس کو اچھی طرح رگڑ کر دھو لیا جائے پاک ہو جائے گا۔ دیکھیے۔ تنضحہ کا لفظ یہاں دھونے کے معنیٰ میں ہے۔ نیز اس سلسلہ کی دوسری حدیثوں کے الفاظ یہ ہیں۔

(۱) اغسلیہ بالماء والسدر — (۱) بیری کے پتوں سے دھو ڈال
(۲) واطرحی فیہ ملحًا ثم اغسلی — (۲) پہلے کپڑے پر نمک ڈال دے پھر پانی سے دھو ڈال۔

(۳) ثم تقرص الدم من ثوبها عند طهرها و تغسله

(۳) کپڑے سے خون کو کھرچ پھر دھو ڈال

(۴) جس جگہ کپڑے پر خون حیض لگا ہے اس کو دھو ڈال

(۴) فاغسلی موضع حیضك ثم صلی فیه قالت یا رسول الله اری لم یخرج اثره قال یکفیك الماءَ ولا یضرك اثره (مسند احمد، ابن ماجہ)

(۴) جس جگہ کپڑے پر خون حیض لگا ہے اس کو دھو ڈال عرض کی یا رسول اللہ اگرچہ خون کا دھبہ نہ جائے فرمایا۔ تیرے لیے پانی سے دھونا کافی ہے، دھبہ نقصان نہیں دیگا۔

۱۔ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ کپڑے کو خونِ حیض لگ جائے تو بیری کے پتوں یا نمک یا صابن لگا کر دھولیا جائے تاکہ خوب اچھی طرح دُھل جائے خوب دھونے کے باوجود بھی اگر دھبہ باقی رہ جائے تو معاف ہے (۲) یہ کہ خون ناپاک ہے (۳) ناپاک چیز کو دھونے کے لیے کوئی عدد مقرر نہیں۔ فقہاء کرام نے جو عدد مقرر کیا ہے کہ تین مرتبہ دھویا جائے۔ اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ تین دفعہ دھونے سے یقین ہو جاتا ہے کہ نجاست زائل ہوگئی ورنہ اگر واقعی ایک دفعہ دھونے سے نجاست دُور ہو جائے تو طہارت حاصل ہو جائے گی۔ غرضیکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نجاست زائل ہونے کا جب ظن غالب ہو جائے تو نجس چیز پاک ہو جائے گی، خواہ یہ ظن ایک دفعہ دھونے سے حاصل ہو یا دو یا تین دفعہ دھونے سے۔ البتہ جو شخص وسوسہ کے مرض میں مبتلا ہو اسے تین بار سے زائد نہ دھونا چاہئے کہ وسوسہ کا مریض ہزار بار بھی دھوئے تو بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی۔

کیا عرق گلاب وکیوڑہ سے ناپاک کپڑا وغیرہ دھونے سے پاک ہو جائے گا؟

۱۔ علامہ خطابی و بیہقی نے اس حدیث سے یہ استدلال فرمایا کہ نجاست کا ازالہ صرف پانی ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور دوسری رقیق وسیال چیزوں مثلاً عرقِ گلاب، کیوڑہ وغیرہ سے دھونے سے طہارت نہ ہوگی لیکن یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ حدیث میں پانی کی قید تو محض اس لیے ہے کہ عموماً پانی موجود ہوتا ہے یعنی حدیث میں پانی کو ازالۂ نجاست کے لیے شرط قرار نہیں دیا گیا ہے۔ اس لیے احناف کا مسلک یہ ہے کہ ہر وہ پاک رقیق بہنے والی چیز جس سے نجاست دُور ہو جائے۔ مثلاً عرقِ کیوڑہ یا سرکہ اگر اس سے نجس چیز کو دھویا گیا تو پاک ہو جائے گی۔ لیکن بلا ضرورت گلاب و سرکہ وغیرہ سے اشیاء کو پاک کرنا ناجائز ہے کہ فضول خرچی ہے اور دودھ گھی تیل ایسی چکنی سیال چیزوں سے دھونے سے طہارت نہیں ہوگی۔ کیونکہ بوجہ چکناہٹ یہ چیزیں نجاست کو دُور نہیں کرتیں۔

ایک درہم سے کم نجاست کا حکم

واضح ہو کہ نجاست دو قسم پر ہے۔ غلیظہ جیسے پاخانہ، پیشاب، بہتا خون، پیپ، منہ بھر قے، حیض و نفاس و استحاضہ کا خون، منی، ودی اس کا حکم یہ ہے کہ اگر کپڑے یا بدن میں ایک درہم سے زیادہ لگ جائے تو اس کا پاک کرنا فرض ہے۔ بے پاک کیے نماز پڑھی نہ ہوگی اور قصداً پڑھی گناہ بھی ہوا اور اگر بنیت توہین پڑھی تو کفر ہوا اور اگر درہم کے برابر ہے تو پاک کرنا واجب ہے۔ بے پاک کیے نماز پڑھی، ہوگئی مگر خلاف سنت ہوئی اور اس کا دوبارہ پڑھ لینا بہتر ہے لیکن اگر دوبارہ نہ لوٹائی تو گنہگار نہ ہوگا۔

(۲) احناف کی دلیل اس مسئلہ میں حضرت علی و ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے۔ ان حضرات نے ایک درہم

نجاست معین کی اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالٰی عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنے انگوٹھے کے ناخن کے برابر مقدار معین کی (کما فی المحیط) اور حضرت عمر کے انگوٹھے کا ناخن عرض کف کے برابر تھا۔ صاحب محیط نے فرمایا۔ درہم کبیر عرض کف کے برابر ہے البتہ امام سرخسی نے یہ کہا کہ درہم رائج الوقت مراد لیا جائے۔ فافہم

۲۲۸۔ عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ جَاءَتْ فَاطِمَۃُ بِنْتُ اَبِیْ حُبَیْشٍ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ امْرَاَۃٌ اُسْتَحَاضُ فَلَا اَطْھُرُ اَفَاَدَعُ الصَّلٰوۃَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا اِنَّمَا ذٰلِکِ عِرْقٌ وَّلَیْسَ بِحَیْضٍ فَاِذَآ اَقْبَلَتْ حَیْضَتُکِ فَدَعِی الصَّلٰوۃَ وَاِذَآ اَدْبَرَتْ فَاغْسِلِیْ عَنْکِ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّیْ قَالَ وَقَالَ اَبِیْ ثُمَّ تَوَضَّاءِیْ لِکُلِّ صَلٰوۃٍ حَتّٰی یَجِیْءَ ذٰلِکَ الْوَقْتُ۔ (بخاری)

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ فاطمہ بنت ابی حبیش بحضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آئیں اور عرض کی یا رسول اللہ! مجھے استحاضہ کی بیماری ہے پاک نہیں رہتی کیا نماز چھوڑ دوں؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ نماز چھوڑنے کی ضرورت نہیں، یہ ایک رگ کا خون ہے حیض نہیں ہے۔ جب حسب معمول حیض کے دن آئیں تو نماز نہ پڑھو اور جب حیض کی مدت پوری ہو جائے تو بدن یا کپڑے پر خون لگا ہو تو اس کو دھو ڈالو اور وضوء کر کے نماز پڑھو میرے باپ عروہ نے کہا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا پھر ہر نماز کے لیے وضوء کرتی رہ یہاں تک کہ پھر حیض کے دن آئیں

فوائد و مسائل اس حدیث کو مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی نے کتاب الصلوٰۃ میں درج کیا۔ حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) مستورات کا اپنے مخصوص مسائل کا دریافت کرنا جائز ہے (۲) غیر محرم سے بضرورت شرعیہ گفتگو جائز ہے (۳) حائضہ عورت کو نماز پڑھنا خواہ نفل ہوں یا فرض حرام ہے۔ اسی طرح حائضہ کو طواف کعبہ، نماز جنازہ سجدۂ شکر بھی جائز نہیں (۴) خون نجس ہے (۵) جب حیض کا خون بند ہو جائے تو مجرد انقطاع سے نماز واجب ہو جاتی ہے۔

(۶) استحاضہ ایک بیماری ہے جس کی وجہ سے عورت کو خون آتا ہے اور کبھی یہ مرض شدت اختیار کر جائے تو پھر ہر وقت آتا رہتا ہے۔ اسی مسئلہ کو حضرت فاطمہ نے حضور علیہ السلام سے دریافت فرمایا کہ خون جاری رہتا ہے اور میں پاک نہیں رہتی، نماز کے متعلق کیا حکم ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جتنے دن حیض آنے کی عادت ہے اس مدت میں تو نماز نہ پڑھی جائے۔ پھر جب حیض کی مدت ختم ہو جائے تو غسل کر (جیسا کہ دوسری روایت میں تصریح ہے) اور ہر نماز کے وقت کے لیے تازہ وضوء کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔ گویا مسئلہ یہ ہوا کہ فرض کیجئے کسی عورت کو استحاضہ کی بیماری لاحق ہے اور اس کو ہر ماہ دس دن یکم سے لے کر ۱۰ تاریخ تک حیض آنے کی عادت ہے تو یہ دس دن تو حیض کے ہوں گے۔ ان دنوں میں نماز نہ پڑھے۔ گیارھویں دن غسل کرے اور اس کے بعد سے ہر نماز کے وقت تازہ وضوء کرے اور نماز پڑھتی رہے اور کپڑا وغیرہ رکھ لیا جائے تاکہ خون اس میں رہے۔ جب تک نماز کا وقت باقی رہے گا وضو باقی رہے گا۔ خواہ خون جاری رہے۔ اس کے بعد جب دوسری نماز کا وقت آئے پھر تازہ وضوء کر کے نماز ادا کرے اسی طرح نماز پڑھتی رہے۔

بَابُ غَسْلِ الْمَنِیِّ وَفَرْکِہٖ وَ

(۱) باب منی کا دھونا (۲) اور اس کا کھرچنا (۳) اور عورت کی

غَسْلِ مَا یُصِیْبُ مِنَ الْمَرْأَۃِ | شرمگاہ سے (کپڑے یا بدن) جو رطوبت لگ جائے اسکا دھونا

امام نے اس عنوان کو تین امور میں کیا ہے۔ منی کا دھونا، منی کا کھرچنا، رطوبت فرج کا دھونا۔ مگر اس عنوان کے ماتحت سے حدیث درج کی ہے۔ اس میں صرف منی کے دھونے کا بیان ہے۔ شارحین نے اس اعتراض کے متعدد جواب دیے ہیں اور گرما گرم بحثیں کی ہیں مگر سب کے سب عذر بارد ہیں۔ دیکھو عینی، قسطلانی، فتح الباری۔

۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲ عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ کُنْتُ اَغْسِلُ الْجَنَابَۃَ مِنْ ثَوْبِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَیَخْرُجُ اِلَی الصَّلٰوۃِ وَاِنَّ بُقَعَ الْمَآءِ فِیْ ثَوْبِہٖ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی کو دھو دیتی تھی اور حضور علیہ السلام وہ کپڑا اپنے نماز کے لیے جاتے درآنحالیکہ پانی کے دھبّے آپ کے کپڑے پر ہوتے۔

فوائد و مسائل (۱) امام نے اس حدیث کو اسی باب میں متعدد بار ذکر کیا ہے۔ مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے (۲) تسمیۃ الشی باسم سببہ کے ماتحت یہاں جنابۃ کے لفظ سے منی مراد ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دوسروں کی منی نجس ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ حضور علیہ السلام کے کپڑوں سے منی دھوتی تھیں۔ حضور علیہ السلام اسی کپڑے کو پہن کر نماز کے لیے تشریف لے جاتے اور دھونے کا اثر اس پر باقی ہوتا تھا یعنی کپڑا گیلا ہی ہوتا تھا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ امام بخاری کے نزدیک بھی منی نجس ہے۔ واضح ہو کہ اگر کپڑے کو منی لگ جائے اور ابھی گیلی ہو تو دھونے سے ہی کپڑا پاک ہوگا اور اگر غلیظ ہو اور سوکھ جائے اور اس کو خوب اچھی طرح رگڑا جائے کہ اس کے اجزا کپڑے سے جھڑ جائیں تو اس کپڑے کے ساتھ بغیر دھوئے بھی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ کی چند حدیثیں یہ ہیں:۔

منی کا حکم اور پاک کرنیکا طریقہ

(۱) ربما فرکتہ من ثوب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم باصابعی

جناب عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں میں کبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی کو انگلیوں سے کھرچتی تھی۔ (ترمذی)

(۲) وَ انی لاحکہ من ثوب رسول اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وَسَلَّمَ یابسا بظفری (ترمذی)

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی کو اپنے ناخنوں سے کھرچتی تھی۔

(۳) انھا کانت تحت المنی مِن ثوب رسول اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وَ ھو یصلی (بیہقی، دارقطنی)

حضرت عائشہ صدیقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں سے منی کو کھرچ دیتی تھیں اور حضور اسی کپڑے میں نماز ادا فرماتے۔

(۴) کنت افرک المنی من ثوب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا کان یابسا وَ اغسلہ اذا

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی کو کھرچتی تھی جب کہ وہ سوکھی ہوتی اور اگر تر ہوتی

کان رطبا ۔ (بزار و ابو عوانہ) | تو دھوتی تھی۔

ان احادیث سے واضح ہوا کہ منی سوکھ جائے اور اس کو کھرچ دیا جائے تو اس کپڑے میں نماز جائز ہے اور اگر منی تر ہو تو پھر دھونا ضروری ہے۔ کیونکہ کھرچنے سے وہ زائل نہیں ہوگی۔

بَابُ اَبْوَالِ الْاِبِلِ وَالدَّوَآبِّ

باب اونٹوں، بکریوں اور چوپاؤں کے پیشاب

وَالغَنَمِ وَمَرَابِضِهَا

وَصَلّٰی اَبُوْ مُوْسٰی فِیْ دَارِ الْبَرِیْدِ وَالسِّرْقِیْنِ وَالْبَرِّیَّۃُ اِلٰی جَنْبِہٖ فَقَالَ ھٰھُنَا وَثَمَّ سَوَاءٌ

اور وہاں نماز پڑھنے کے بیان میں

اور ابو موسیٰ نے دار البرید میں نماز پڑھی جہاں لید اور گوبر پڑا تھا حالانکہ جنگل ان کے پہلو میں تھا اور کہا کہ اس مقام میں اور صاف مقام میں کوئی فرق نہیں۔

فوائد و مسائل اس اثر کو شیخ بخاری ابو نعیم نے کتاب الصلوٰۃ میں وصل کیا۔ صلّی کا مطلب یہ لیا گیا کہ حضرت ابو موسیٰ نے اس جگہ نماز پڑھی جہاں لید اور گوبر پڑا ہوا تھا کیونکہ ان کے نزدیک حلال جانوروں کا پیشاب و پاخانہ پاک ہے۔ لیکن اس مفہوم کو لینے میں نظر ہے کیونکہ عموماً جب نماز پڑھتے ہیں تو مصلّی یا چٹائی یا کپڑا بچھا کر پڑھتے ہیں تو حضرت ابو موسیٰ نے بھی چٹائی بچھا کر ہی نماز پڑھی ہوگی اور ناپاک زمین پر موٹا کپڑا یا چٹائی بچھا کر نماز پڑھنا بالاتفاق جائز ہے اور اگر یہ مان ہی لیا جائے کہ ان کے نزدیک حلال جانور کا لید اور گوبر پاک تھا۔ اس لیے انھوں نے چٹائی وغیرہ بچھائے بغیر نماز پڑھ لی تو یہ صرف ان کا ایک فعل ہے اور حضرت ابن عمر و دیگر صحابہ کرام اس کے خلاف ہیں۔

۲۳۳۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُصَلِّیْ قَبْلَ اَنْ یُّبْنَی الْمَسْجِدُ فِیْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر سے قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکریوں کے باڑہ میں نماز پڑھتے تھے۔

فوائد و مسائل اس حدیث سے امام نخعی، اوزاعی، زہری، امام مالک، احمد و محمد و زفر و ابن خزیمہ و ابن حبان نے یہ استدلال کیا کہ جن جانوروں کا کھانا حلال ہے ان کا پیشاب و گوبر بھی پاک ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھی اور باڑہ عموماً لید، گوبر، پیشاب سے صاف نہیں ہوتا لیکن امام شافعی، ابو حنیفہ بجماعت سلف و جمہور علماء (کما فی الفتح) کا مسلک یہ ہے کہ حلال جانوروں کا پیشاب اور گوبر بھی نجس ہے البتہ نجاست خفیفہ ہے۔ رہی یہ بات کہ حضور علیہ السلام نے بکریوں کے باڑہ میں نماز پڑھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے چٹائی بچھا کر پڑھی ہو چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔

کان یصلی علی الخمرۃ | حضور علیہ السلام اوڑھنی پر نماز پڑھتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ ان کے گھر میں حضور علیہ السلام نے

علی حصیر فی دارھم (بخاری و مسلم) | چٹائی پر نماز پڑھی

اس کے علاوہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عام ہدایت یہ تھی کہ گھروں میں نماز پڑھنے کے لیے صاف ستھری جگہ مقرر کی جائے۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو گھر میں نماز پڑھنے کے لیے جگہ بنانے کا حکم دیا اور فرمایا:۔

وان تنظف وتطیب (ابوداؤد و احمد) | کہ اس جگہ کو پاک و صاف رکھا جائے۔

نیز بیہقی کی حدیث میں ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ان لم تجدوا الا مرابض الغنم و اعطان الابل فصلوا فی مرابض الغنم ولا تصلوا فی اعطان الابل

اگر سوائے بکریوں کے باڑہ اور اونٹوں کے باڑہ کے نماز کے لیے کوئی اور جگہ نہ ملے تو بکریوں کے باڑہ میں نماز پڑھو، اونٹوں کے باڑہ میں نہیں۔ (ابن حبان وقال الترمذی حسن صحیح)

ان روایات کے پیش نظر اس امر کو تقویت پہنچتی ہے کہ حضور علیہ السلام نے بکریوں کے باڑہ میں جو نماز پڑھی وہ چٹائی بچھا کر ادا فرمائی ہوگی۔

وضاحت اس سلسلہ میں امور ذیل بھی قابل ذکر ہیں ۱- جن احادیث میں بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنے کا ذکر آیا ہے تو ان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شارع علیہ السلام کو یہ امر مطلوب ہے کہ لوگ یہاں نماز پڑھا کریں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں یہ لفظ ہیں اذا لم تجد واجب تم نماز کے سبب بکریوں کے باڑے کے سوا اور کوئی جگہ نہ پاؤ تو پھر وہاں نماز پڑھو۔ اس سے مطلوبیت کی نفی ہو گئی۔ ثانیاً حضور علیہ السلام کا یہ امر ابتدائی بھی نہیں ہے کہ مستقل طور پر آپ نے از خود یہ مسئلہ بیان فرمایا ہو بلکہ طحاوی میں تو یہ تصریح ہے کہ حضور سے کسی نے سوال کیا کہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ سکتا ہوں۔ حضور اکرم نے فرمایا۔ ہاں! معلوم ہوا کہ یہ امر ابتدائی نہیں ہے بلکہ سائل کے جواب میں ہے۔ ثالثاً، بکریوں کے باڑہ میں نماز پڑھنے کی اجازت دینا اور اونٹوں کے رہنے کی جگہ میں نماز پڑھنے سے ممانعت فرمانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عرب کا محبوب ترین مال بکریاں تھیں اور وہ ان کے قیام و طعام کا انتظام گھروں ہی میں کرتے تھے جہاں بکریاں رہتی تھیں وہیں بیٹھتے، اٹھتے، کھاتے پیتے تھے تو وہ ضرور ایک حصہ زمین کو نماز پڑھنے اور اپنے بیٹھنے کے لیے صاف ستھرا رکھتے ہوں گے چنانچہ حدیث موطا امام مالک کے یہ لفظ احسن مرابض الغنم واطب مراجها وصل فی ناحیہ اس خیال کی تائید و توثیق کرتے ہیں جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ بکریوں کے باڑے کے ایک کونہ میں نماز پڑھتے تھے جو صاف ستھرا رکھا جاتا تھا چنانچہ عینی میں مسند البزار کی حدیث کے لفظ بھی اس کی تائید کرتے ہیں احسنوا الیہا وامیطوا عنہا الاذی۔ پس ثابت ہوا کہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنے سے یہ استدلال کرنا کہ حلال جانوروں کا پیشاب اور لید و گوبر پاک ہے صحیح نہیں ہے۔ فافہم

۲۳۴- عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَدِمَ اُنَاسٌ مِّنْ عُكْلٍ اَوْ عُرَيْنَةَ فَاجْتَوَوُا الْمَدِيْنَةَ فَاَمَرَ

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ کچھ لوگ قبیلہ عکل و عرینہ کے مسلمان ہو کر مدینہ میں آئے

ھُمُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِلِقَاحٍ وَّاَنْ یَّشْرَبُوْا مِنْ اَبْوَالِھَا وَاَلْبَانِھَا فَانْطَلَقُوْا فَلَمَّا صَحُّوْا قَتَلُوْا رَاعِیَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاسْتَاقُوا النَّعَمَ فَجَآءَ الْخَبَرُ فِیْ اَوَّلِ النَّھَارِ فَبَعَثَ فِیْ اٰثَارِھِمْ فَلَمَّا ارْتَفَعَ النَّھَارُ جِیْءَ بِھِمْ فَاَمَرَ فَقُطِعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ وَاُلْقُوْا فِی الْحَرَّۃِ یَسْتَسْقُوْنَ فَلَا یُسْقَوْنَ قَالَ اَبُوْ قِلَابَۃَ فَھٰؤُلَآءِ سَرَقُوْا فَقَتَلُوْا وَکَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ وَحَارَبُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (بخاری)

کی آب و ہوا انہیں موافق نہ آئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ اونٹوں کا پیشاب اور دودھ پیتے رہیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ وہ تندرست ہو گئے اور انھوں نے حضور علیہ السلام کے گلہ کے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹنیاں بھگا کر لے گئے۔ صبح کو یہ خبر حضور علیہ السلام کو پہنچی۔ آپ نے ان کے تعاقب کا حکم دیا دن چڑھے وہ پکڑے گئے اور آپ نے حکم دیا تو ان کے ہاتھ کاٹے گئے آنکھیں پھوڑی گئیں اور پتھریلی زمین پر دھوپ میں ڈال دیئے گئے۔ وہ پیاس کی وجہ سے پانی مانگتے تھے لیکن کوئی پانی نہیں دیتا تھا۔ ابو قلابہ نے کہا یہ سزا انھیں اس لیے دی گئی کہ انھوں نے چوری کی قتل ناحق کیا۔ مرتد ہوئے اور اللہ و رسول سے لڑے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام بخاری نے آٹھ جگہ ذکر کیا۔ جہاد، دیات، حدود، تفسیر، مغازی، محاربین اور مسلم نے حدود میں، ابو داؤد نے طہارۃ میں، نسائی نے محاربہ میں (۲) طبرانی کی حدیث میں ہے کہ یہ قبیلۂ عکل کے آٹھ اور عرینہ کے چار آدمی تھے۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کرز بن جابر الفہری کی قیادت میں دس گھوڑ سواروں کو ان کے تعاقب میں بھیجا تھا۔ انھوں نے مقام ذی ہمد رجو کہ قباء کے قریب مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے، حضور علیہ السلام کے غلام حضرت یسار کو مع ان کے ساتھیوں کے بیدردی سے شہید کیا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے تھے۔ زبان میں کانٹے چبھو دیئے تھے اور اونٹنیاں لے کر فرار ہو گئے تھے۔ مسلم شریف میں یہ تشریح ہے کہ ان لوگوں کے رنگ زرد ہو گئے تھے اور پیٹ پھول گئے تھے اس لیے حضور علیہ السلام نے ان کو اونٹوں کے پیشاب اور دودھ پینے کی ہدایت دی انھوں نے ایسا ہی کیا اور صحت یاب ہونے پر مرتد ہو گئے اور اونٹوں کے محافظوں کو قتل کر دیا اور اونٹ لے کر بھاگ گئے۔ پھر جب یہ لوگ پکڑ کر لائے گئے تو حضور سید عالم نے سزا دینے میں وہی سختی اختیار فرمائی جس کے وہ مرتکب ہوتے تھے۔ ترمذی شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے ان کی آنکھیں پھوڑنے کا حکم اسلیے دیا۔

انھم سملوا اعین الرعاۃ | کہ انھوں نے اونٹ کے محافظوں کی آنکھیں پھوڑی تھیں۔

(۲) اس حدیث سے حضرت مالک، علیہ الرحمۃ نے یہ استدلال فرمایا کہ حلال جانوروں کا پیشاب پاک ہے۔ امام محمد علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ حلال جانور کا پیشاب بطور دوا، پینا حلال ہے لیکن امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کا مسلک یہ ہے کہ جانور خواہ حلال ہو یا حرام سب کا پیشاب نجس ہے اور بطور دوا بھی اس کا پینا اور استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور وہ جو حضور علیہ السلام نے قبیلہ عرینین کے آدمیوں کو اونٹ کا پیشاب پینے کی ہدایت دی تھی وہ منسوخ ہے کیونکہ آپ نے فرمایا ہے۔

استنزھوا عن البول فان عامۃ عذاب | پیشاب سے بچو، عذاب قبر کا سبب عام طور پر پیشاب سے

الغبر منه | نہ بچنا بھی ہے۔

حرام اشیاء میں شفاء نہیں ہے

علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ان کو اونٹوں کے پیشاب پینے کی ہدایت وحی کی بناء پر دی تھی۔ حضور علیہ السلام کو بذریعہ وحی یہ بتا دیا گیا کہ یہ مرتد ہو کر مریں گے اور ان کے مرض کی دوا اونٹوں کا پیشاب ہے۔ پس اگر کسی کو قطعی حتمی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں مریض کی شفا اسی میں ہے کہ حرام چیز کھائے یا پیئے تو الا ما اضطررتم الیہ کے ماتحت اس کو حرام چیز کا استعمال جائز ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ بڑے سے بڑا حکیم اور ڈاکٹر یہ قطعی فیصلہ نہیں دے سکتا کہ فلاں دوا سے فلاں مریض ضرور اچھا ہو جائے گا اس لیے بطور دوا بھی حرام چیزوں کا کھانا ناجائز ہی قرار پائے گا۔ (عینی ج ۱ ص ۲۰)

اس سلسلہ کی چند حدیثیں یہ ہیں:-

(۱) لا شفاء فی المحرم (حاشیہ نور الانوار ص ۲۶) | حرام چیزوں میں شفا نہیں ہے

(۲) بحضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کسی نے عرض کی حضور! شراب بطور دوا استعمال کر لی جائے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس نے دوبارہ پوچھا۔ فرمایا نہیں! تیسری بار اس نے عرض کی حضور شراب میں شفاء ہے؟ فرمایا:-

فقال لا ولکنها داء (عینی ج ۱ ص ۹۲۰) | نہیں اس میں شفا نہیں ہے۔ اس میں بیماری ہے۔

(۳) حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

ان اللہ لم یجعل شفاء کم فی حرام (ابن حبان) | اللہ تعالیٰ نے حرام چیزوں میں تمہارے لیے شفا نہیں رکھی

ان احادیث سے یہ نہ سمجھا جائے کہ حرام چیزوں میں بدن کو نفع پہنچانے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ شراب کے متعلق تو خود قرآن مجید نے تصریح کی ہے کہ اس میں لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ فیھما اثم کبیر و منافع للناس اور منافع کو بھی قرآن نے مطلق رکھا ہے۔ اس میں کسی خاص نفع کی قید نہیں[1] لگائی۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شارع علیہ السلام نے اس چیز کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں لوگوں کے لیے کوئی نفع ہی باقی نہ رہے بلکہ منافع للناس فرما کر تو قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ باوجود اس کے کہ کسی چیز میں نفع ہو مگر وہ بھی حرام کی جا سکتی ہے جیسے شراب ہی کو لیجئے کہ اس میں نفع بھی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کو حرام قرار دیا گیا۔ مگر اس کے ساتھ قرآن مجید نے یہ

---

[1] بعض علماء نے یہ تاویل کی ہے کہ آیت میں منافع سے منافع تجارت مراد ہے۔ لیکن اس تاویل کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اول تو قرآن مجید نے منافع کو مطلق رکھا ہے۔ خواہ وہ منافع تجارت ہوں یا منافع بدن۔ ثانیاً کھانے پینے کی چیزیں مطلوب بنفسہ ہوتی ہیں تو اگر ہم منافع تجارت، مراد لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ایک مطلوب بنفسہ چیز کو کسی دوسری چیز کے حصول کا ذریعہ اور آلہ کار قرار دیدیں تو اس صورت میں وہ چیز مطلوب بنفسہ نہ رہے گی بلکہ آلہ و ذریعہ ہو جائے گا جیسے کہ نقود (روپیہ، پیسہ) کی ذات مطلوب نہیں ہوتی کہ یہ دوسری چیز کے حصول و ذریعہ بنتے ہیں۔ فافہم

تصریح بھی کی کہ شراب کا نقصان اس کے منافع سے زیادہ ہے۔ واثمهما اکبر من نفعهما۔ جس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ صراحۃً تو یہ جو چیز حرام ہے یہ ضروری نہیں کہ اس میں نفع نہ ہو اور بطور اشارہ یہ کہ جو چیز حرام کی جاتی ہے اس کا نقصان اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں حضور سید عالم طبیب اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا احادیث پر غور کیجئے۔ فرماتے۔ "اللہ نے حرام چیزوں میں تمہارے لیے شفا نہیں رکھی"۔ دیکھو حضور علیہ السلام نے شفا کی نفی فرمائی۔ یہ نہیں فرمایا کہ حرام چیز میں نفع ہوتا ہی نہیں تو ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی وہی بات ظاہر ہوئی۔ جس کا اشارہ آیت میں موجود ہے کہ حرام چیز کے استعمال سے نفع ہو سکتا ہے مگر اس کے نقصانات اس کے نفع سے زیادہ ہوتے ہیں اور جس دوا میں نفع کم ہو اور نقصان زیادہ اس کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہ دوا شفاء ہے۔

توضیح واضح ہو کہ حدیث عرنیین مباحث اربعہ پر مشتمل ہے اور اب ہم ہر ایک کا مختصر بیان کرتے ہیں۔

اوّل، وہ جانور جن کا گوشت کھانا حلال ہے۔ ان کا پیشاب پاک ہے یا نہیں؟ تو امام مالک اس حدیث سے استدلال فرماتے ہوئے بول ما یوکل لحمہ کو پاک قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر ناپاک ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ عرنیہ کے لوگوں کو اونٹوں کے پیشاب کو پینا مباح قرار نہ دیتے۔ اب یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ حضور علیہ السلام قبیلہ عرنیین کے افراد کو اونٹوں کے پیشاب پینے کی جو اجازت دی ہے کیا اس کی بنیاد اس امر پر تھی کہ حلال جانوروں کا پیشاب پاک ہے یا یہ اجازت محض تداوی کے لیے تھی۔ اگر پہلی بات ثابت ہو جائے تو پھر تو امام مالک کا یہ استدلال صحیح ہو جاتا ہے کہ حلال جانوروں کا پیشاب پاک ہے اور اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ اجازت محض دوا کے طور پر پینے کے لیے تھی تو اس صورت حضرت امام مالک کا استدلال صحیح قرار نہیں پائے گا۔ کیونکہ یہ جائز ہے کہ ایک شی فی نفسہ حرام ہو۔ مگر شارع علیہ السلام کسی ضرورت کی بنا پر اس کو حلال قرار دے دیں، جیسا کہ اضطراری حالت میں شراب و خنزیر کے استعمال کی اجازت خود قرآن پاک میں موجود ہے اور یہ بات خود اس سلسلہ کی احادیث سے ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام نے انہیں اونٹوں کا پیشاب پینے کی اجازت بطور دوا کے دی تھی، جس کا اظہار حدیث کے یہ الفاظ ماجتووا المدینہ کر رہے ہیں۔ نیز بخاری باب ابوال الاتن میں ہے کہ کان المسلمون یتداوون بہا کہ مسلمان اونٹوں کے پیشاب سے دوا کرتے تھے۔ بعض روایات میں آیا کہ انہیں استسقاء کی بیماری ہو گئی تھی۔ ابن سینا نے لکھا ہے کہ استسقاء کی بیماری کے لیے اونٹوں کا پیشاب مفید ہے۔ بہر حال یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضور علیہ السلام نے انھیں اونٹوں کا پیشاب پینے کی اجازت بطور دوا کے دی تھی۔ لہٰذا اس اجازت سے حلال جانوروں کے طہارت ثابت نہیں ہو سکتی۔ پھر یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر اس حدیث سے طہارۃ ابوال کا استنباط کیا جائے تو پھر مسئلہ التداوی بالحرم کا استنباط نہیں ہو سکے گا اور اگر اس کو تداوی پر محمول کیا جائے۔ تو پھر مسئلہ طہارۃ ابوال کا استنباط درست نہ ہوگا۔ فافہم۔

دوم، حرام اشیاء کو بطور دوا پینا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس پر ہم ابھی بحث کر چکے ہیں ثانیاً، اس معاملہ میں جب نصوص صریحہ صحیحہ موجود ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ حرام چیز میں مسلمانوں کے لیے شفا نہیں ہے تو اس نص کے ہوتے ہوئے تاویلات کے ذریعہ جواز نکالنا میں تو درست نہیں سمجھتا۔ (واللہ اعلم)

سوم: یہ کہ مثلہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو نسائی شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام اپنے ہر خطبہ میں مثلہ کرنے سے منع فرماتے تھے اور حضرت ابن سیرین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ واقعہ عرنیین احکامِ حدود نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ حدیث سے مثلہ کرنے کا جواز ثابت نہ ہوگا۔

بَابُ مَا يَقَعُ مِنَ النَّجَاسَاتِ فِي السَّمْنِ وَالْمَاءِ

باب گھی یا پانی میں نجاست گر جائے تو اس کا کیا حکم ہے

(۱) وَقَالَ الزُّهْرِيُّ لَا بَأْسَ بِالْمَاءِ مَا لَمْ يُغَيِّرْهُ طَعْمٌ أَوْ رِيحٌ أَوْ لَوْنٌ

(۱) زہری نے کہا پانی کا جب تک رنگ یا بُو یا مزا نہ بدلے وہ پاک ہے

(۲) وَقَالَ حَمَّادٌ لَا بَأْسَ بِرِيشِ الْمَيْتَةِ

(۲) اور حماد بن ابی سلیمان نے کہا مردار کے بال اور پر پاک ہیں۔

(۳) وَقَالَ الزُّهْرِيُّ فِي عِظَامِ الْمَوْتَى نَحْوَ الْفِيلِ وَغَيْرِهِ أَدْرَكْتُ نَاسًا مِنْ سَلَفِ الْعُلَمَاءِ يَمْتَشِطُونَ بِهَا وَيَدَّهِنُونَ فِيهَا لَا يَرَوْنَ بِهِ بَأْسًا

(۳) اور زہری نے کہا مُردار کی ہڈیوں اور بارے میں نے کئی عالموں کو دیکھا وہ ان سے کنگھی کرتے اور ان میں تیل رکھتے تھے۔ اور اسمیں کوئی حرج نہ جانتے۔

(۴) وَقَالَ ابْنُ سِيرِينَ وَإِبْرَاهِيمُ لَا بَأْسَ بِتِجَارَةِ الْعَاجِ (بخاری)

اور محمد بن سیرین وابراہیم نخعی نے کہا، ہاتھی دانت کی تجارت درست ہے۔

فوائد ومسائل ہم نے نمبر لگا دیئے ہیں۔ اب ہر مسئلہ پر نمبر وار بحث کی جاتی ہے۔

(۱) امام زہری علیہ الرحمۃ کا مسلک یہ ہے کہ پانی خواہ قلیل ہو یا کثیر نجاست کے گرنے سے ناپاک نہ ہوگا۔ جب تک کہ اس کا رنگ، بو یا مزے میں تبدیلی پیدا نہ ہو۔ اس پر ابو عبیدہ نے کتاب الطہور میں اعتراض کیا کہ زہری کے مذہب کے مطابق تو یہ لازم آتا ہے کہ اگر کوئی ایک پیالہ پانی میں پیشاب کر دے اور پانی کا رنگ و بو و مزا نہ بدلے تو وہ پانی پاک رہنا چاہیئے۔ علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں اس اعتراض کو نقل کیا مگر جواب نہیں دیا۔ بہرحال کچھ لوگ اس طرف گئے ہیں کہ پانی خواہ قلیل ہو یا کثیر جب تک نجاست اس کا کوئی وصف رنگ یا بُو یا مزا نہ بدل دے۔ اس وقت تک وہ پانی پاک نہ ہوگا۔ یہ لوگ احادیث ذیل سے استدلال کرتے ہیں۔

اوّل۔ حضور سید عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا گیا کہ بضاعۃ کنویں سے وضو کر سکتے ہیں۔ بضاعۃ ایسا کنواں تھا کہ جس میں مدینہ کے لوگ کوڑا کرکٹ حتیٰ کہ مردار جانور کتے، بلی، حیض کے کپڑے ڈال دیا کرتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

إِنَّ الْمَاءَ طَهُورٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ (ترمذی) | کہ پانی پاک ہے اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ دیکھو اس کنویں میں ہر قسم کی نجاست ڈالی جاتی تھی مگر اس کے باوجود حضور علیہ السلام نے اس کے پانی کو پاک قرار دیا۔

کیا پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی؟

احناف اس استدلال کے متعدد الزامی وتحقیقی جواب دیتے ہیں جو یہ ہیں۔ اولاً: حدیث ہذا میں پانی کی مقدار کا بیان نہیں ہے اور نہ رنگ و بو ومزے کی تبدیلی کا بیان ہے بلکہ مطلقاً یہ بتایا گیا ہے کہ پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی تو نفسِ حدیث کے مضمون سے یہ لازم آتا ہے کہ ایک لوٹے پانی میں حیض کا کپڑا پڑ جائے تو وہ ناپاک نہ ہو۔ اسی طرح کنویں میں کیسی ہی نجاست گر جائے اور اس کے اوصاف رنگ و بو ومزے میں سے کوئی وصف بھی بدل جائے تو بھی کنواں ناپاک نہ ہوگا کیونکہ حدیث میں وصف بدلنے کی قید بھی تو نہیں ہے۔ یہ بات زہری کا مسلک رکھنے والوں کے خلاف ہے۔ ثانیاً: یہ بات مشاہدہ میں آچکی ہے کہ کنویں میں اگر ایک مرغی پھٹ، پھول جائے تو پانی میں بو پیدا ہو جاتی ہے اور بیرِ بضاعہ میں تو کتے تک ڈال دیئے جاتے تھے، مگر لوگ اس کے باوجود اس کا پانی استعمال کرتے تھے۔ عقل بھی یہ چاہتی ہے کہ وہ لوگ ایسے وحشی نہیں تھے کہ پانی میں باوجود بدبو پیدا ہو جانے کے استعمال کرتے ہوں؛ جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ بیرِ بضاعہ کنویں کی شکل میں تھا مگر دراصل وہ کنواں نہ تھا بلکہ جاری پانی کی نہر تھی جس میں اسقدر پانی تھا اور اس کی روانی ایسی تھی کہ اسقدر غلیظ اشیاء ڈال دینے کے باوجود پانی میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوتا تھا اور گندگی وغیرہ بہہ جاتی تھی۔ جیسے جاری نہر یا دریا میں گندگی ٹھہرتی نہیں بلکہ بہہ جاتی ہے۔ چنانچہ آج بھی مکہ معظمہ کے کنویں نہر زرقا پر جو بظاہر کنویں معلوم ہوتے ہیں مگر درحقیقت آبِ رواں کی نہریں ہیں اور انجنیئرنگ کا کمال یہ ہے کہ نہر زبیدہ منیٰ وعرفات تک کو سیراب کرتی ہے اور سعودی حکومت نے اسی نہر سے آج کل جگہ جگہ راستے میں نلکے لگا دیئے ہیں۔ یہی حال بیرِ بضاعہ کا تھا کہ وہ دراصل بہتے پانی کی نہر تھی۔ چنانچہ واقدی نے یہ تصریح کی۔

ان بیر بضاعۃ کانت طریقا للماء الی البساتین فکان الماء لا یستقر فیھا (طحاوی)

بضاعہ کنواں دراصل پانی کی نہر تھی جو باغوں میں رواں ہوتی تھی اور اس کا پانی نہیں ٹھہرتا تھا۔

گویا اس نہر کے ایک مقام پر کنویں کی شکل بنا دی گئی تھی تاکہ لوگ آسانی سے پانی بھر سکیں اور چونکہ یہ جاری نہر تھی اسلیے اس میں گندگی وغیرہ بھی ڈال دی جاتی تھی جو ٹھہرتی نہ تھی۔ حضور علیہ السلام سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔ اَنَّ الْمَآءَ طَھُوْرٌ کہ اس بیرِ بضاعہ کا پانی پاک ہے اس کو کوئی نجاست ناپاک نہیں کر سکتی کیونکہ یہ جاری پانی ہے۔ غرضیکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو خاص اس بیرِ بضاعہ کے لیے تھا جو ایک نہر جاری تھی مگر بعض علماء نے ارشاد نبوی کے مرفع ومحل کو بنظرِ غور نظر نہ رکھا تو پھر انھوں نے وہی نتیجہ نکالا جو امام زہری کا مسلک ہے۔ اسی طرح اس حدیث سے بھی استدلال کیا گیا ہے کہ حضور علیہ السلام سے پوچھا گیا جو تالاب جنگلوں میں ہوتا ہے اور جس سے درندے و دیگر جانور پانی پیتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

اذا کان الماء قلتین لم یحمل الخبث (ترمذی)

کہ پانی قلتین ہو تو نجاست کو نہیں اٹھاتا

تو کنویں کا پانی کیونکر نجس ہو سکے گا جب کہ اس میں سینکڑوں مشک پانی موجود ہے۔ اس استدلال کے بھی متعدد جواب دیے گئے ہیں۔ اوّلاً، یہ حدیث زہری کے مسلک کے بھی خلاف ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو قلہ پانی کسی حالت میں بھی ناپاک نہیں ہوتا خواہ اس کے وصف میں بھی تبدیلی آجائے کیونکہ رنگ و بو ومزے کی تبدیلی کی قید اس میں بھی نہیں ہے۔ ثانیاً

لم یحمل الخبث" کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ دو قلہ پانی نجاست کو برداشت نہیں کرتا یعنی نجس ہو جاتا ہے۔ ثالثاً لفظ قلہ خود مجمل ہے۔ اس کے معنی مٹکے کے بھی آتے ہیں۔ پانچ مشکیزہ پانی کے بھی، انسان کی قد و قامت کے بھی اور پہاڑ کی چوٹی کے بھی۔ لہٰذا ایسا معنی متعین کرنے چاہئیں جو اس باب کی دوسری احادیث کی تصریحات کے مطابق ہوں اور اس کی مقدار ایسی ہو سکتی ہے کہ دہ دہ در دہ ہوں جیسا کہ فقہاء احناف نے مقرر کیا ہے، یا پھر یہ کہا جائے کہ قلہ سے مراد آب رواں ہے جیسے نہروں کا پانی جاری ہوتا ہے۔ یہ جاری پانی یا ماءِ کثیر دہ در دہ نجاست پڑنے سے ناپاک نہ ہوگا۔ یہاں ہم نے مختصر سی بحث کی ہے۔ جو صاحب تفصیلی بحث دیکھنا چاہیں وہ فتح الباری، عینی، قسطلانی، نیل الاوطار و طحاوی شریف کا مطالعہ کریں۔ غرضکہ سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ آبِ قلیل وہ حوض و تالاب جو دہ در دہ نہ ہو، نجاست گرنے سے ناپاک ہو جائے گا۔ اسی سلسلہ کی چند احادیث یہ ہیں:۔

۱۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے

انہ نھیٰ ان یبال فی الماء الراکد ثم یتوضاء فیہ (مسلم، نسائی، ابن ماجہ، طحاوی) | ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے، پھر اس سے وضوء کرنے سے منع فرمایا۔

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کوئی شخص ٹھہرے ہوئے پانی میں غسلِ جنابت نہ کرے ان سے پوچھا گیا پھر پانی کیسے استعمال کرے؟ حضرت ابوہریرہ نے کہا۔

یتناولہ تناولا (طحاوی) | علیحدہ (کسی برتن وغیرہ) میں پانی لے کر استعمال کرے

ان دو حدیثوں سے معلوم ہوا کہ ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل کرنے اور پیشاب کرنے سے اس لیے منع فرمایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو پانی ناپاک ہو جائے گا تو اگر آبِ قلیل نجاست کے گرنے سے ناپاک نہ ہوتا تو حضور علیہ السلام اس سے وضو کرنے سے منع نہ فرماتے۔ (۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں۔

ان غلاما وقع فی بئر زمزم فنزحت (دار قطنی و طحاوی) | کہ صحابہ کے زمانے میں زمزم کے کنویں میں ایک لڑکا گر گیا تو اس کا پانی نکالا گیا۔

(۴) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ زمزم کے کنویں میں ایک حبشی گر کر مر گیا (فمات) تو آپ نے ایک آدمی کو کنویں میں اُتارا جس نے لاش نکالی اس کے بعد فرمایا۔

اِنزحوا ما فیھا من الماءٖ (بیہقی) | کہ کنویں میں جس قدر پانی ہے سب نکال دو۔

نیز طحاوی میں یہ تصریح بھی ہے کہ جب زمزم کا پانی نکالنے لگے تو اس کا پانی ختم نہ ہوتا تھا۔ جب دیکھا تو معلوم ہوا

(۵) فَاذا عَینٌ تجری من قِبَلِ الحَجَرِ الاَسْوَدِ فقال الزبیرُ حَسْبُکُم (طحاوی) | کہ اس کنویں میں پانی کا چشمہ ہے جو سنگِ اسود کی طرف سے آرہا ہے حضرت ابن الزبیر نے فرمایا کافی ہے۔

ان احادیث سے مسائلِ ذیل معلوم ہوتے۔ اگر آدمی کنویں میں گر کر مر جائے تو کنواں نجس ہو جائے گا اور کل پانی نکالنے سے پاک ہوگا۔ کل پانی نکالنے کے بعد کنویں کی طہارت بھی ہو جائے گی اور کنویں کی دیواریں اور دیگر لوازمات ڈول، رسی وغیرہ

بھی پاک ہو جائے گی اور اگر کنواں ایسا ہو کہ اس کا پانی نہ ٹوٹ سکے تو پھر اندازہ سے پانی نکال لیا جائے گا۔ یعنی پہلی بار ناپا معلوم ہوا کہ کنوئیں کا کل پانی دس ہاتھ ہے۔ پھر تیزی کے ساتھ سو ڈول نکال لیے اور ناپا تو معلوم ہوا کہ اب نو ہاتھ پانی رہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سو ڈول نکالنے سے ایک ہاتھ پانی کم ہوتا ہے تو دس ہاتھ والے کنوئیں کے لیے ایک ہزار ڈول ہوتے۔ یعنی ایک ہزار ڈول نکالنے سے کل پانی نکل جائے گا۔ نیز امام شعبی نے فرمایا کہ چڑیا بلی وغیرہ اگر کنوئیں میں گر کر مرجائیں تو چالیس ڈول پانی نکالا جائے۔ حضرت حماد ابن سلیمان تابعی نے فرمایا۔ مرغی گر کر مرجائے تو چالیس سے پچاس ڈول تک نکالے جائیں۔ حضرت میسرہ نے روایت کی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ الکریم نے فرمایا۔ جب چوہا اور اس کی مثل کوئی اور جانور گر جائے تو کنوئیں کا پانی نکالو۔ یہاں تک کہ پانی تم پر غالب آجائے (طحاوی شریف)۔ یہ اور اس مضمون کے اور بھی آثار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کنوئیں یا ماءِ قلیل میں نجاست گر جائے تو وہ ناپاک ہو جائے گا۔ اور جب پانی حسبِ مقدار نکالا جائے گا تب پاک ہوگا۔

مُردار جانور کے بال و پَر

(۲) حضرت حماد بن ابی سلیمان علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ مُردار جانور کے پَر ہیں کوئی حرج نہیں یعنی مُردار جانور خواہ حلال ہو یا حرام اس کے بال و پَر پاک ہیں ان کو استعمال کرنا جائز ہے۔ پانی میں گر جائیں تو پانی ناپاک نہ ہوگا۔ مردار جانور کے بالوں اور پروں کو دھو کر استعمال کرنا بہتر ہے۔ سیدنا امام اعظم علیہ الرحمۃ کا بھی یہی مسلک ہے

مُردار کی ہڈی کا حکم

(۳) امام زہری نے فرمایا کہ مُردار کی ہڈی میں کوئی حرج نہیں۔ یعنی مُردار کی ہڈی جب کہ اس پر گوشت اور چکنائی باقی نہ رہے پاک ہے۔ جیسے ہاتھی دانت وغیرہ کی کنگھی اور تیل دانی بنائی جاتی ہیں ان سب کا استعمال جائز ہے (۴) حضرت ابن سیرین نے فرمایا ہاتھی دانت کی تجارت بھی جائز ہے۔

واضح ہو

کہ مُردار جانور خواہ وہ حلال ہو یا حرام (سوائے خنزیر کے اس کی ہڈی، بال، پَر، اون جب کہ گوشت اور چربی سے صاف ہوں پاک ہیں اور ان کا استعمال کرنا جائز ہے کیونکہ قرآن پاک میں مُردار کا کھانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما سے روایت ہے۔

انما حرم من المیتۃِ ما یوکل عنہا | مُردار کی وہ چیز حرام کی گئی ہے جو کھائی جاتی ہے

اسی طرح مُردار کی کھال بھی استعمال کی جا سکتی ہے جب کہ اس کو دھولیا گیا ہو۔ جس کو رنگنا کہتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں چند حدیثیں یہ ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں نے حضور علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے سُنا۔

ایما اھاب دُبغ فقد طھر (مسلم واحمد وابن جہ وترمذی) | جو کھال بھی رنگ لی جائے وہ پاک ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

امران ینتفع بجلودِ المیتۃِ اذا دبغت (بخاری ومسلم) | دباغت کے بعد مُردار کی کھال سے نفع اٹھانے کی اجازت دی۔

سُئل رَسُولُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ جلودِ المیتۃِ فقالَ ذکاتُھا (نسائی) | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مُردار کی کھال کے متعلق پوچھا گیا نے فرمایا اس کی دباغت (رنگنا) اس کی طہارت ہے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بکری مر گئی۔ حضور علیہ السلام کو اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ تم نے اس کی کھال کیوں نہ اُتار لی۔ کہا گیا مردار کی کھال؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مردار کا گوشت کھانا حرام قرار دیا ہے۔

وانتم لا تطعمونہ ان تدبغوا و تنتفعوا (رواہ باسناد صحیح) نیل الاوطار ج ۱ ص۔۔۔

اور تم تو اس کا گوشت نہیں کھاتے۔ اس کو رنگتے ہو اور نفع اُٹھاتے ہو۔

مُردار کی کھال وغیرہ کے احکام

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ مُردار کی کھال کو پکا لیا جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔ مردار سے مراد غیر مذبوح ہے یعنی جس کو بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر ذبح نہ کیا گیا ہو۔ جو جانور خود مر گیا یا گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا یا کسی جانور نے اس کو مار دیا مُردار ہے۔ اس کی کھال کو رنگنے سے پہلے بیچنا، استعمال کرنا حرام ہے اور دباغت کے بعد جائز ہے۔ مُردار کا پٹھا، بال، ہڈی، چونچ، کھُر، ناخن ان سب کو بیچ بھی سکتے ہیں اور کام میں بھی لا سکتے ہیں اور اس کی بنی ہوئی اشیاء استعمال کر سکتے ہیں۔ خنزیر کے تمام اجزاء ناپاک و نجس ہیں۔ خنزیر کے بال اور کسی جزء کی بیع باطل ہے اور اس کی کھال و بال کسی صورت بھی استعمال کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ خنزیر کے متعلق قرآن پاک میں فرمایا۔ فانہ رجس خنزیر کے تمام اجزاء نجس ہیں۔

۲۳۵، ۲۳۶۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ مَيْمُونَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْ فَارَةٍ سَقَطَتْ فِيْ سَمْنٍ فَقَالَ اَلْقُوْهَا وَمَا حَوْلَهَا وَكُلُوْا سَمْنَكُمْ (بخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ چوہا گھی میں گر پڑے تو کیا کریں۔ فرمایا اس کو پھینک دو اور آس پاس کے گھی کو بھی پھینک دو اور باقی گھی کھاؤ۔

فوائد و مسائل

امام نے اس حدیث کو کتاب الذبائح میں بھی ذکر کیا ہے۔ ابوداؤد و ترمذی نے اطعمہ میں، نسائی نے ذبائح میں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جمی ہوئی چیز جیسے شہد یا گھی وغیرہ میں اگر چوہا یا اس کی مثل

ناپاک گھی کو پاک کرنے کا طریقہ

کوئی جانور گر جائے تو اس کو نکال کر پھینک دیں اور آس پاس سے تھوڑا تھوڑا گھی جہاں تک اس کی نجاست سرایت کرنے کا ظن ہو پھینک دیں باقی کا پاک ہے استعمال کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمے ہونے کی وجہ سے نجاست سارے گھی میں سرایت نہیں کرے گی بلکہ صرف اس حصہ میں سرایت کرے گی جو اس سے ملا ہوا ہوگا۔ اسی لیے آس پاس کے گھی کو نکال پھینکنے کا حکم دیا گیا اور اگر گھی جما ہوا نہیں ہے تو پھر سارا گھی ناپاک ہو جائے گا اور اس کے پاک کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جس برتن میں ناپاک گھی ہے اسی میں پاک گھی ڈالتے رہیں۔ یہاں تک کہ برتن کے کناروں تک اُبل کر بہنے لگے۔ جو گھی بہے گا وہ ناپاک ہے اور جو برتن کے اندر رہ گیا وہ پاک ہو جائے گا۔

(۲) جو گھی یا تیل ناپاک ہو جائے اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔ البتہ جلانے یا اسی نوع کے دوسرے کاموں میں استعمال کر

سکتے ہیں۔ چنانچہ بیہقی میں ہے کہ:۔

اِنْ کَانَ السَّمْنُ مَائِعًا اِنْتَفِعُوْا بِہٖ وَلَا تَاْکُلُوْا

اگر وہ پتلا ہو تو اس کو استعمال کر لو کھاؤ نہیں۔
(کتاب الاطعمہ، فتح الباری ج ۹ صفحہ ۵۳۰)

روزِ قیامت مجاہدِ فی سبیل اللہ کے زخموں کی کیفیت

۲۳۷۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ کُلُّ کَلْمٍ یُکْلَمُہُ الْمُسْلِمُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یَکُوْنُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ کَھَیْئَتِھَا اِذَا طُعِنَتْ تَفَجَّرَ وَمَا اللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ وَالْعَرْفُ عَرْفُ الْمِسْکِ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ راہِ خدا میں مسلمان کو جو زخم لگتا ہے۔ قیامت کے دن اسی حالت میں آجائے گا جیسے کہ لگا تھا
(بخاری شریف)

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمۃ نے کتاب الجہاد میں بھی ذکر کیا۔ مسلم نے بھی جہاد میں۔ ابن عساکر کی روایت کے لفظ یہ ہیں کہ اللہ عزوجل کو خون کا وہ قطرہ بہت محبوب ہے جو راہِ خدا میں گرے اور چشمِ مسلم کا وہ آنسو بھی جو اندھیری رات میں بہے کیونکہ اللہ عزوجل مجدہٗ سے خوفِ خشیت کے وقت تنہائی میں جو اشکباری ہوگی وہ خلوص وللہیت ہی پر مشتمل ہوگی اور اسلام میں ہر کام کی مقبولیت خلوص پر موقوف ہے۔ یہ حدیث امور ذیل پر ہے (۱) راہِ خدا میں کھائے ہوئے زخم آخرت کا بہترین سرمایہ ہیں (۲) بروزِ حشر یہ زخم ہرے ہو جائیں گے تاکہ شہید کے فضل کا اظہار ہو اور ظالم کے ظلم کا (۳) زخموں کے خون میں مشک وعنبر کی سی خوشبو ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ شہید فقہی کو نہ غسل دیا جاتا ہے اور نہ اس کے بدن کا خون دھویا جاتا ہے (۴) سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث کا باب سے کیا تعلق ہے۔ شارحین کرام نے عنوان سے مناسبت کے متعلق گرما گرم بحثیں کی ہیں۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے ہر مناسبت کو صحیح قرار دیا ہے۔ اہلِ علم عینی ج صفحہ ۹۳ کا مطالعہ کریں۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے یہ مناسبت بیان فرمائی ہے کہ اس حدیث سے مشک کا پاک ہونا ثابت ہوتا ہے تو اگر مشک گھی وغیرہ میں گر جائے تو گھی وغیرہ ناپاک نہ ہوگا (فیہ نظر)

بَابُ الْبَوْلِ فِی الْمَاءِ الدَّائِمِ

باب ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کے بیان میں

۲۳۸۔ اَنَّہٗ سَمِعَ اَبَا ھُرَیْرَۃَ اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ وَبِاِسْنَادِہٖ قَالَ لَا یَبُوْلَنَّ اَحَدُکُمْ فِی الْمَاءِ الدَّائِمِ الَّذِیْ لَا یَجْرِیْ ثُمَّ یَغْتَسِلُ فِیْہِ
(بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہم دنیا میں پچھلے ہیں۔ آخرت میں پہلے ہوں گے (اور اسی اسناد سے) کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کوئی شخص ٹھہرے ہوئے پانی میں جو جاری نہ ہو پیشاب نہ کرے اور نہ اس میں غسل کرے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام مسلم نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد، ترمذی طبرانی وطحاوی نے بھی ذکر کیا ہے۔ ترمذی کی حدیث میں ثم یتوضاء منه اور باقی دوسری روایتوں میں ثم یغتسل منه اور طحاوی کی روایت میں ثم یتوضاء منه اور لیشرب منه کے لفظ بھی آئے ہیں۔ یعنی حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے، پھر اس سے غسل کرے یا پیئے۔ مطلب یہ کہ پیشاب کرنے سے وہ پانی ناپاک ہوجائے گا۔ پھر اس سے وضو و غسل کرنا کیونکر روا ہوگا۔ یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کیا جائے۔ اسی طرح جاری پانی میں بھی پیشاب کرنا مکروہ ہے (۲) ناپاک پانی سے وضو و غسل کرنا حرام ہے (۳) جو پانی کہ وہ دردہ نہ ہو نجاست پڑنے سے ناپاک ہوجائے گا (۴) حدیث کے خط کشیدہ جملہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُمت سب سے اخیر میں دفن ہوگی اور سب سے پہلے اٹھائی جائے گی۔ کیونکہ زمین برتن کی طرح ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز برتن میں سب سے اخیر رکھی جائے وہ پہلے اٹھائی جاتی ہے۔

بَابٌ اِذَا اُلْقِیَ عَلٰی ظَهْرِ الْمُصَلِّیْ قَذَرٌ اَوْ جِیْفَةٌ لَمْ تَفْسُدْ عَلَیْهِ صَلَاتُهٗ وَکَانَ ابْنُ عُمَرَ اِذَا رَاٰی فِیْ ثَوْبِهٖ دَمًا وَهُوَ یُصَلِّیْ وَضَعَهٗ وَمَضٰی فِیْ صَلَاتِهٖ وَقَالَ ابْنُ مُسَیَّبٍ وَالشَّعْبِیُّ اِذَا صَلّٰی وَفِیْ ثَوْبِهٖ دَمٌ اَوْ جَنَابَةٌ اَوْ لِغَیْرِ الْقِبْلَةِ اَوْ تَیَمَّمَ فَصَلّٰی ثُمَّ اَدْرَكَ الْمَاءَ فِیْ وَقْتِهٖ لَا یُعِیْدُ (بخاری)

باب (۱) جب نمازی کی پیٹھ پر نجاست یا مُردار ڈال دیا جائے تو نماز میں فساد نہ آئے گا (۲) اور حضرت عبداللہ بن عمر جب نماز کے اندر اپنے کپڑے پر خون دیکھتے تو اس کپڑے کو اُتار دیتے اور نماز پڑھے جاتے (۳) ابن المسیب اور عامر شعبی نے کہا کوئی شخص نماز پڑھ لے اس کے کپڑے میں خون لگا ہو، یا منی لگی ہو، یا قبلے کے سوا اور کسی طرف نماز پڑھی ہو، یا تیمم سے پڑھی ہو پھر وقت کے اندر پانی پالے تب بھی نماز نہ لوٹائے۔

فوائد و مسائل ہم نے نمبر دیدیے ہیں، ہر مسئلہ نمبر وار بیان کیا جاتا ہے۔
مسئلہ اول، امام بخاری کا مسلک یہ ہے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے پاک ہونا ضروری ہے۔ پھر اگر دورانِ نماز نجاست لگ جائے تو نماز نہیں ٹوٹتی لیکن احناف کے نزدیک دوران نماز بدن یا کپڑا ناپاک ہوجائے تو نماز دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔

مسئلہ دوم، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا فعل جو روایت ہوا، یہ صریحاً امام بخاری کے مسلک کے خلاف ہے کیونکہ اس میں تو یہ تصریح ہے کہ دورانِ نماز اگر ان کو معلوم ہوجاتا کہ کپڑے پر نجاست ہے تو وہ کپڑے کو اُتار دیتے تھے۔ جس سے ثابت ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمر دورانِ نماز اگر کپڑا ناپاک ہوجائے تو وہ نماز جائز نہیں سمجھتے تھے۔

مسئلہ سوم، نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ کپڑے پر منی یا خون لگا ہوا تھا تو اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ خون اور منی درہم سے کم تھی یا برابر اور اس اثر میں اس کا بھی ذکر نہیں لہٰذا یہ بھی امام بخاری کے مسلک کی دلیل نہیں بن سکتی۔ بہرحال حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر درہم سے کم تھی تو نماز درست ہوگئی اور اگر قدر درہم تھی تو نماز دوبارہ پڑھنا واجب ہے البتہ تیمم کے مسئلہ

میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے یعنی اگر پانی پر قدرت نہ تھی تو پھر تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ پھر وقت کے اندر اندر ہی پانی پر قدرت ہو گئی تو اب نماز دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے اور قبلہ کے مسئلہ میں بھی امام اعظم ابوحنیفہ وامام مالک و احمد بن حنبل علیہم الرحمۃ کا اتفاق ہے۔ اگر کسی نے کسی سمت کو قبلہ جان کر (تحری کے بعد) نماز پڑھ لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سمت قبلہ وہ نہیں تھی جس طرف نماز پڑھی ہے تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک دوبارہ نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں اور اگر بغیر تحری کے بلا سوچے سمجھے نماز پڑھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سمت قبلہ اور طرف تھا تو امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک نماز کا دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔

۲۳۹۔ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُصَلِّیْ عِنْدَ الْبَیْتِ وَاَبُوْجَھْلٍ وَّ اَصْحَابٌ لَّہٗ جُلُوْسٌ اِذْ قَالَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ اَیُّکُمْ یَجِیْٓئُ بِسَلَا جَزُوْرِ بَنِیْ فُلَانٍ فَیَضَعُہٗ عَلٰی ظَھْرِ مُحَمَّدٍ اِذَا سَجَدَ فَانْبَعَثَ اَشْقَی الْقَوْمِ فَجَآءَ بِہٖ فَنَظَرَ حَتّٰی اِذَا سَجَدَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَضَعَہٗ عَلٰی ظَھْرِہٖ بَیْنَ کَتِفَیْہِ وَاَنَا اَنْظُرُ لَآ اُغْنِیْ شَیْئًا لَوْ کَانَتْ لِیْ مَنَعَۃٌ قَالَ فَجَعَلُوْا یَضْحَکُوْنَ وَیُحِیْلُ بَعْضُھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّرَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَاجِدٌ لَا یَرْفَعُ رَاْسَہٗ حَتّٰی جَآءَتْہُ فَاطِمَۃُ فَطَرَحَتْہُ عَنْ ظَھْرِہٖ فَرَفَعَ رَاْسَہٗ ثُمَّ قَالَ اَللّٰھُمَّ عَلَیْکَ بِقُرَیْشٍ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ فَشَقَّ ذٰلِکَ عَلَیْھِمْ اِذْ دَعَا عَلَیْھِمْ قَالَ وَکَانُوْا یَرَوْنَ اَنَّ الدَّعْوَۃَ فِیْ ذٰلِکَ الْبَلَدِ مُسْتَجَابَۃٌ ثُمَّ سَمّٰی اَللّٰھُمَّ عَلَیْکَ بِاَبِیْ جَھْلٍ وَّعَلَیْکَ بِعُتْبَۃَ ابْنِ اَبِیْ رَبِیْعَۃَ وَشَیْبَۃَ بْنِ رَبِیْعَۃَ وَالْوَلِیْدِ بْنِ عُتْبَۃَ وَاُمَیَّۃَ بْنِ خَلَفٍ وَّعُقْبَۃَ بْنِ اَبِیْ مُعَیْطٍ وَعَدَّ السَّابِعَ فَلَمْ نَحْفَظْہُ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَقَدْ رَاَیْتُ الَّذِیْنَ عَدَّ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے پاس نماز ادا کر رہے تھے۔ ابوجہل اور اس کے ساتھی بھی وہاں بیٹھے تھے پھر آپس میں کہنے لگے تم میں سے کون ہے جو فلاں لوگوں نے جو اونٹنی کاٹی ہے اس کا بچہ دان لائے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت مبارک پر رکھ دے یہ سن کر ان میں سے سب سے بڑا شقی (عقبہ بن ابی معیط) اس کو اٹھا لایا تو اس نے اونٹ کا سلا آپ کی پشت مبارک پر رکھ دیا۔ عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کاش! میرا بھی زور ہوتا (تو ان کو بتلاتا) یہ لوگ ہنسنے لگے۔ ایک پر ایک گرے جاتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں تھے۔ سر مبارک بوجھ کی وجہ سے نہ اٹھاتے تھے یہاں تک کہ حضرت فاطمۃ الزہرا آئیں اور آپ کی پشت مبارک سے اس کو اتار کر پھینک دیا۔ تب آپ نے سر اٹھایا اور دعا کی یا اللہ قریش سے سمجھ لے۔ تین بار یہ فرمایا۔ جب آپ نے ان کے لیے بد دعا کی تو ان پر یہ گراں گزری کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مکہ میں دعا مستجاب ہوتی ہے۔ پھر آپ نے نام لے لے کر بد دعا فرمائیں (ذیل کے نام لیے) ابوجہل، عتبہ بن ابی ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، ساتویں کا نام لیا جو ہمیں یاد نہ رہا۔ ابن مسعود کہتے ہیں۔ مجھے اس ذات مقدس

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَرْعٰى فِى الْقَلِيْبِ قَلِيْبِ بَدْرٍ (بخاری)

کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ جن لوگوں کا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لیا تھا میں نے دیکھا کہ وہ بدر کی لڑائی میں مارے گئے اور قلیبِ بدر میں ان کی لاشیں ڈالی گئیں۔

فوائد و مسائل (۱) امام بخاری نے اس حدیث کو جزیہ، مغازی، صلوٰۃ، جہاد میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے مغازی میں اور نسائی نے سیر و طہارۃ میں ذکر کیا (۲) یہ واقعہ قبل ہجرت کا ہے۔

اس حدیث سے امام بخاری علیہ الرحمۃ نے یہ استدلال فرمایا کہ باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت مبارک پر کفار نے اونٹنی کی سلا رکھ دی تھی مگر حضور علیہ السلام بدستور سجدہ میں رہے۔ معلوم ہوا کہ دورانِ نماز اگر بدن یا کپڑے کو نجاست لگ جائے تو نماز فاسد نہیں ہوتی لیکن ظاہر ہے کہ سجدہ میں حضور اس لیے بدستور مصروف رہے کہ بوجھ کی وجہ سے سر مبارک نہ اٹھا سکتے تھے۔ ثانیاً، حدیث میں حضور علیہ السلام کا بدستور نماز میں مشغول رہنے کی تصریح نہیں ہے۔ صرف اتنا ہے کہ سلا کے رکھ دینے کے بعد حضور سجدہ ہی میں رہے تا آنکہ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا نے آکر اس کو ہٹایا اور جب تک ان امور کی وضاحت نہ ہو یہ استدلال صحیح نہیں قرار پا سکتا۔ اس کے علاوہ حدیثِ ہذا میں ان امور کی بھی تصریح نہیں ہے کہ وہ نفل تھی یا فرض۔ پھر حضور علیہ السلام نے اس نماز کو دوبارہ پڑھا یا نہیں۔ پھر جو دعا حضور نے فرمائی وہ سلام پھیر کر فرمائی یا سر اٹھاتے ہی فرمائی۔ ظاہر ہے کہ یہ دعا ایسے کلمات پر مشتمل ہے جو نماز کو فاسد کر دیتی ہے تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ جب کفار نے سلا رکھ دیا تو آپ کو نماز کے فاسد ہونے کا رنج ہوا اس لیے آپ نے ان کے لیے بددعا فرمائی ——— فتح الباری میں علامہ ابن حجر علیہ الرحمۃ نے یہ تصریح بھی کی ہے۔ یہ واقعہ آیتِ ثیابک فطہر کے نزول سے قبل کا ہے چنانچہ اصل الفاظ یہ ہیں :-

اخرج ابن المنذر فی سبب نزولها من طریق زید ابن مرثد قال القی علی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم سلا جزور فنزلت (وثیابك فطهر فتح الباری ج ۸ ص ۵۱۴)

اس حدیث سے بات بالکل واضح ہوئی کہ حضور علیہ السلام کا یہ فعل ثیابک فطہر کے نزول سے قبل کا ہے۔ لہٰذا اس واقعہ سے یہ استدلال کرنا کہ دورانِ نماز کپڑے وغیرہ کو نجاست لگ جائے تو نماز فاسد نہ ہوگی، کسی طرح بھی درست نہیں ہے (واللہ اعلم)

بَابُ الْبُزَاقِ وَالْمُخَاطِ وَنَحْوِهٖ فِى الثَّوْبِ

باب تھوک اور رینٹ وغیرہ کپڑے کے لگ جانے کے بیان میں

عروہ ابن مسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم نے نقل کیا کہ حضور علیہ السلام صلح حدیبیہ کے زمانہ میں نکلے۔ پھر پوری حدیث بیان کی :-

وَمَا تَنَخَّمَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نُخَامَةً اِلَّا وَقَعَتْ فِىْ كَفِّ رَجُلٍ

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھوکتے تو لوگ آپ کے لعابِ مبارک کو اپنے ہاتھوں پر لیتے اور منہ

مِنْهُمْ فَذَلِكَ بِهَا وَجْهَهُ وَجِلْدَهُ
اور بدن پر ملتے۔ (بخاری)

۲۴۰۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ بَزَقَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي ثَوْبِهِ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (نماز) میں اپنے رومال میں تھوکا۔

مقصودِ عنوان یہ ہے کہ تھوک اور رینٹ پاک ہے اگر کپڑے کو لگ جائے نماز فاسد نہ ہوگی۔ اسی طرح پانی میں گر جائے تو پانی ناپاک نہ ہوگا۔ صلح حدیبیہ کا پورا واقعہ آیندہ حدیث میں آئے گا۔ اس حدیث سے یہ ہدایت بھی ملتی ہے کہ نماز میں اگر تھوک یا ناک آجائے تو رومال وغیرہ میں ڈال دے۔ مسجد میں نہ تھوکے کیونکہ مسجد میں تھوکنے سے حضور نے منع فرمایا۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوا کہ آدمی کا لعابِ دہن اور ناک کے فضلات اور آنسو پاک ہیں۔ لیکن حدیث ہذا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تھوک چونکہ پاک ہے۔ اس لیے کپڑے یا پانی میں تھوک دیا کرو۔ بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ اگر کپڑے یا پانی میں تھوک گر جائے تو وہ ناپاک نہ ہوگا۔ اس سے یہ مسئلہ بھی نکلے گا کہ اگر بالفرض کسی کے پاس صرف ایسا پانی ہے جس میں لعابِ دہن پڑا ہوا ہے تو اس پانی کے ہوتے ہوئے تیمم جائز نہ ہوگا۔

بَابُ لَا يَجُوزُ الْوُضُوءُ بِالنَّبِيذِ

باب نبیذ تمر اور نشہ والی شراب سے وضوء جائز

وَلَا بِالْمُسْكِرِ وَكَرِهَهُ الْحَسَنُ وَاَبُو الْعَالِيَةِ وَقَالَ عَطَاءٌ التَّيَمُّمُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنَ الْوُضُوءِ بِالنَّبِيذِ وَاللَّبَنِ (بخاری)

نہیں اور حسن وابو العالیہ نے نبیذ تمر سے وضوء کو مکروہ قرار دیا اور عطاء نے کہا دودھ یا نبیذ تمر سے وضوء کے بجائے تیمم میرے نزدیک اچھا ہے۔

کیا نبیذِ تمر سے وضو جائز ہے

پانی میں چند کھجوریں بھگو دی جائیں کہ اس میں کھجوروں کی مٹھاس سی آجائے اور نشہ پیدا نہ ہو، اس کو نبیذِ تمر کہتے ہیں۔ عرب کے پانی عموماً کھاری ہوا کرتے ہیں اس لیے لوگ چند سوکھی کھجوریں پانی میں بھگو دیتے جس سے پانی میں ذرا مٹھاس سی پیدا ہو جاتی تھی تو نبیذِ تمر جس میں قطعاً نشہ نہ ہو اور رقت و سیلان بھی باقی رہے۔ اگر کسی کے پاس صرف یہی پانی ہو تو اس صورت میں اس کو نبیذِ تمر سے وضو کرنا چاہیے یا تیمم؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

(۱) امام بخاری کے نزدیک نبیذ تمر سے وضوء جائز نہیں لیکن امام نے اپنی تائید میں جو حضرت حسن بصری وابو العالیہ کا قول نقل کیا ہے۔ یہ ان کو مفید نہیں ہے کیونکہ حضرت حسن بصری سے جو روایت ہے اس میں لاباس کے لفظ ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت حسن بصری کے نزدیک نبیذِ تمر سے وضو جائز ہے۔ مگر مکروہ تنزیہہ ہے۔ اسی طرح حضرت عطاء ابن رباح کا قول بھی ان کے موافق نہیں کیونکہ حضرت عطاء یہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک تیمم کر لینا زیادہ اچھا ہے گویا وہ بھی عدم جواز کے قائل نہیں ہیں۔ فافہم۔

۲۔ امام شافعی و مالک و امام احمد علیہم الرحمۃ کے نزدیک کسی حال میں نبیذِ تمر سے وضو جائز نہیں۔

۲۔ سیدنا امام اعظم علیہ الرحمۃ سے تین قول منسوب ہیں ــــ اوّل، نبیذِ تمر سے وُضو کرے تیمّم نہ کرے، امام زفر کا بھی یہی مسلک ہے۔ دوم، تیمم کرے اور نبیذِ تمر سے وضو نہ کرے۔ اس کو نوح بن مریم و حسن بن زیاد نے روایت کیا۔ قاضی خان نے فرمایا یہی صحیح ہے۔ اکثر علماء امام ابو یوسف کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام طحاوی نے بھی اسی کو اختیار کیا سوم، یہ کہ تیمّم بھی کرے اور نبیذِ تمر سے وضو بھی کرے۔ امام محمد علیہ الرحمۃ کا یہی مسلک ہے (احکام القرآن لابی بکر الرازی) صاحب محیط نے فرمایا۔ نبیذ تمر کا مطلب یہ ہے کہ پانی میں چند کھجوریں ڈال دی جائیں۔ یہاں تک کہ پانی میں مٹھاس سی پیدا ہو جائے لیکن وہ گاڑھا نہ ہو اور نشہ بھی نہ پیدا ہو۔ اگر نشہ پیدا ہو جائے تو اس کا پینا بھی حرام ہے وضو کیونکر جائز ہوگا۔

وضاحت:۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبیذ تمر جس سے حضور علیہ السلام نے وضو کیا:۔

تمرات القیتها فی الماءِ لان عادة العرب انها تطرح التمر فی الماءِ لیحلو (عینی ج ۱ ص ۹۴۸)

وہ چند کھجوریں تھیں جو پانی میں ڈال دی تھیں کیونکہ عرب کی عادت یہ تھی کہ وہ پانی میں کھجوریں ڈال دیتے تا کہ پانی میٹھا ہو جائے۔

اور لیلۃ الجن کی حدیث میں آیا کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا، تمہارے ڈول میں کیا ہے انھوں نے عرض کی نبیذ ہے۔ حضور نے فرمایا۔

تَمْرَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ مَاءٌ طَهُوْرٌ فَتَوَضَّاءُ بِهَا وَ صَلَّى الْفَجْرَ (ترمذی، ابوداؤد)

کھجوریں ہیں طیب اور پانی پاک ہے پھر آپ نے اس سے وضو فرمایا اور فجر کی نماز پڑھی۔

امام ترمذی علیہ الرحمۃ نے کہا اس حدیث کے راویوں میں ابو زید ہے جو مجہول ہے۔ اس بناء پر علماء سلف نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے لکھا کہ ابن العربی نے فرمایا کہ ابو زید مولیٰ عمر بن حریث روی عنہ راشد بن کیسان اور ابو روق اور یہ بات ابو زید کو حدِ جہالت سے نکال دیتی ہے۔ ہاں ابو زید کا اصل نام معلوم نہیں تو جائز ہے کہ امام ترمذی نے جو فرمایا کہ وہ مجہول ہے۔ اس سے مراد مجہول الاسم ہو کیونکہ اسی حدیث کو چودہ افراد نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے جیسا کہ ابو زید نے روایت کیا ہے۔ علامہ عینی نے ان چودہ افراد کے نام بھی گنائے ہیں، دیکھو عینی ج ۱ ص ۹۴۹) ــــ بہرحال اس حدیث کے پیش نظر سیدنا امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ نبیذِ تمر سے وضو جائز ہے، جبکہ وہ رقیق ہو اور اگر شہد کی طرح گاڑھا ہو جائے تو وُضو جائز نہیں ہوگا اور اگر اس میں نشہ پیدا ہو جائے تو پھر وضو کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر تو اس کا پینا بھی حرام ہے۔

(۲) اور دودھ سے وُضو بالاتفاق جائز نہیں ہے ــــ اسی طرح جس پانی میں کوئی پاک چیز مل گئی کہ بول چال میں (عرف میں) اس کو پانی نہ کہیں جیسے شربت، شوربا، چائے، عرق گلاب، کیوڑہ وغیرہ اس سے وضو و غسل جائز نہیں ہے ــــ لسی سے بھی وُضو جائز نہیں یعنی جب تک یہ کہا جائے کہ یہ تو پانی ہے، جس میں کچھ دودھ مل گیا ہے تو وضو جائز ہے اور جب دیکھنے والا اسے دُودھ یا دہی کی لسی کہے تو اس سے وضو و غسل جائز نہ ہوگا۔

۲۴۱ عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ

وَسَلَّمَ قَالَ كُلُّ شَرَابٍ اَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ　(بخاری)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر پینے کی وہ چیز جو نشہ لائے حرام ہے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب الاشربہ میں اور مسلم نے بھی اشربہ میں ذکر کیا۔ ترمذی و نسائی نے اشربہ و ولیمہ میں اور ابن ماجہ نے اشربہ میں ذکر کیا۔ کُلُّ شراب کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہر وہ پینے کی چیز جس میں نشہ ہو حرام ہے کیونکہ کلمہ "کُل" جب نکرہ کی طرف مضاف ہو تو عموم افراد کا فائدہ دیتا ہے اور جب معرفہ کی طرف ہو تو عموم الاجزاء کا فائدہ دیتا ہے۔ واضح ہو کہ خمر جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے جس کو ہم اردو زبان میں شراب کہتے ہیں اس کا پینا بہر صورت حرام ہے خواہ نشہ ہو یا نہ ہو۔ تھوڑا پیا جائے یا زیادہ لیکن جو پینے کی چیز خمر نہیں ہے جیسے پوست، افیون، چرس، بھنگ اور اسی نوع کی اور چیزیں، ان کا اس مقدار میں پینا اور کھانا حرام ہے جب کہ نشہ لائیں اور اگر اتنی قلیل مقدار میں استعمال کی گئیں کہ نشہ نہ ہو تو پھر حرج نہیں جیسے ادویہ میں استعمال کی جاتی ہیں۔

بَابُ غَسْلِ الْمَرْأَةِ اَبَاهَا الدَّمَ عَنْ وَّجْهِهٖ

باب عورت کا اپنے والد کے چہرہ سے خون کا دھونا

وَقَالَ اَبُو الْعَالِيَةِ اَمْسَحُوْا عَلٰى رِجْلِىْ فَاِنَّهَا مَرِيْضَةٌ　(بخاری)

اور ابو العالیہ نے کہا (جب ان کے پاؤں میں تکلیف تھی) میرے پاؤں پر مسح کر دو اس میں تکلیف ہے۔

عنوان سے مقصود یہ بتانا ہے کہ نجاست کے دُور کرنے میں کسی دوسرے سے مدد لینا جائز ہے، جیسا کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے احد کی لڑائی میں جو زخم آیا تو جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا نے اپنے ہاتھوں سے حضور علیہ السلام کے چہرہ مبارک سے خون صاف کیا اور یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ عورت کے چھونے سے وضو نہیں جاتا۔ اسی طرح بضرورت اگر اعضاء وضو کے دھونے میں دوسرے سے مدد لی جائے تو جائز ہے۔ جیسا کہ ابو العالیہ نے اپنے پاؤں پر مسح کرایا، کیونکہ اس میں تکلیف تھی اور مسح اس لیے کیا کہ پانی نقصان دیتا تھا۔ اس اثر کو عبد الرزاق نے معمر سے انھوں نے عاصم بن سلیمان سے انھوں نے کہا کہ ہم ابو العالیہ کی عیادت کو گیا کہ وہ بیمار تھے۔ لوگوں نے ان کو وضو کرایا۔ جب ایک پاؤں باقی رہ گیا تو کہا۔ اس پر مسح کر دو۔ ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ اس پاؤں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

۲۴۲ - بِاَیِّ شَیْءٍ دُوِیَ جُرْحُ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا بَقِیَ اَحَدٌ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ كَانَ عَلِیٌّ يَجِیْءُ بِتُرْسِهٖ فِیْهِ مَاءٌ وَّفَاطِمَةُ تَغْسِلُ عَنْ وَّجْهِهِ الدَّمَ فَاُخِذَ حَصِيْرٌ فَاُحْرِقَ فَحُشِیَ بِهٖ جُرْحُهٗ　(بخاری)

سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو زخم اُحد کی لڑائی میں لگا تھا اس کو کیا دوا لگائی تھی انھوں نے کہا اب اس واقعہ کا جاننے والا مجھ سے زیادہ کوئی اور باقی نہیں رہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم اپنی ڈھال میں پانی لاتے تھے اور جناب فاطمہ حضور کے چہرہ مبارک سے خون دھو رہی تھیں تو ایک بوریا جلایا اور آپ کے زخم میں بھر دیا گیا۔

فوائد و مسائل (۱) اس حدیث کو امام نے مغازی اور نکاح میں بھی ذکر کیا۔ مسلم نے مغازی میں۔ ترمذی و ابن ماجہ نے طب میں ذکر فرمایا (۲) یہ واقعہ کتاب المغازی میں تفصیل کے ساتھ آئے گا۔ حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدنی انصاری صحابی جلیل القدر ہیں۔ ان کا اصل نام حزن تھا۔ حضور علیہ السلام نے سہل نام تجویز فرمایا۔ سو برس کی عمر ہوئی۔ ۹۱ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ سے کل ایک سو اٹھاسی حدیثیں مروی ہیں۔ بخاری میں آپ سے اکتالیس حدیثیں مروی ہیں۔ مدینہ میں انتقال کرنے والے صحابہ میں سب سے آخری آپ ہی ہیں (۳) یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) پرانے بوریے کی راکھ زخم کے لیے مفید ہے اور خون فوراً بند کر دیتی ہے یہ ایک پرانا طریقِ علاج ہے جو بہت ہی مفید ہے (۲) دوا۔ وعلاج کرنے کا جواز ثابت ہوا۔ یہ کہ دوا کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے (۴) محارم سے خدمت لینا جائز ہے

بَابُ السِّوَاكِ

باب مسواک کرنے کے بیان میں

۱۔ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ بِتُّ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَنَّ

حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گزاری۔ آپ نے (سو کر) اٹھ کر مسواک فرمائی۔

۲۴۳ (۲) عَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدْتُهٗ يَسْتَنُّ بِسِوَاكٍ بِيَدِهٖ يَقُوْلُ اُعْ اُعْ وَالسِّوَاكُ فِیْ فِيْهِ كَاَنَّهٗ يَتَهَوَّعُ (بخاری)

ابو بردہ اپنے والد سے راوی وہ کہتے ہیں میں نے دیکھا حضور علیہ السلام مسواک کر رہے تھے جو آپ کے ہاتھ میں تھی۔ آپ اُع اُع کی آواز نکال رہے تھے اور مسواک آپ کے منہ میں تھی۔ گویا آپ قے کر رہے تھے۔

۲۴۴۔ (۳) عَنْ اَبِیْ حُذَيْفَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ يَشُوْصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ

حضرت حذیفہ کا بیان ہے کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سو کر اٹھتے تو اپنے منہ کو مسواک سے رگڑتے (صاف کرتے)۔

فوائد و مسائل حدیثوں پر نمبر لگا دیے ہیں۔ نمبروار ان کے احکام و مسائل بیان کیے جاتے ہیں ۱۔ یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جو آئندہ بیان ہوگی ۲۔ حدیث دوم کو امام مسلم و نسائی و ابوداؤد نے کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا ہے۔ استنان کے معنیٰ مسواک کرنے کے ہیں۔ یتھوع کے معنیٰ قے کرنے کے ہیں لیکن بتکلف مطلب یہ ہے کہ مسواک اس طرح فرما رہے تھے کہ قے کی سی آواز نکل رہی تھی جیسے حلق میں انگلی یا برش سے صفائی کرتے ہیں تاکہ منہ اور گلے کی آلائش خارج ہو جائے ۳۔ حدیث سوم کو امام نے صلوٰۃ اللیل میں بھی ذکر کیا ہے اور ابوداؤد و مسلم و ابن ماجہ نے طہارۃ میں اور نسائی نے طہارۃ و صلوٰۃ میں ذکر کیا ہے۔ یشوص کے معنیٰ دھونے، صاف کرنے کے ہیں۔ ابن دقیق العید نے فرمایا کہ اس حدیث سے سو کر اٹھنے کے بعد مسواک کرنے کا استحباب ثابت ہوتا ہے

نیند میں معدہ کے انجرات صعود کرتے ہیں اس لیے سوکر اٹھنے کے بعد مسواک کی ہدایت دی گئی تاکہ مسواک کے ذریعے منہ ان آلائشوں سے پاک وصاف ہوجائے ـــــ علامہ عینی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ یہ حدیثیں اس امر پر دال ہیں کہ مسواک کرنا سنت موکدہ ہے۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مواظبت فرمائی۔ حتیٰ کہ اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ عین وفات شریف کے وقت بھی حضور علیہ السلام نے مسواک استعمال فرمائی ہے (بخاری)

مسواک کے فضائل

۱۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میری امت پر شاق ہوگا تو میں ان کو ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنے کا امر فرماتا (طبرانی) ۲۔ حضرت عائشہ صدیقہ کا بیان ہے کہ حضور اکرم جب باہر سے تشریف لاتے تو پہلا کام آپ کا مسواک کرنا ہوتا۔ (مسلم شریف) ۳۔ مسواک کا التزام رکھو یہ سبب ہے منہ کی صفائی اور اللہ عزوجل کی رضا کا ۴۔ دو رکعتیں جو مسواک کرکے پڑھی جائیں افضل ہیں بے مسواک کی ستر رکعتوں سے (ابونعیم) ۵۔ دس چیزیں فطرت سے ہیں یعنی ان کا حکم ہر شریعت میں تھا۔ مونچھیں کترنا، ڈاڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن تراشنا، انگلیوں کی گھائیاں دھونا، بغل کے بال دور کرنا، موئے زیر ناف مونڈنا، استنجا کرنا، کلی کرنا ـــــ یہ اور اس سلسلہ کی دیگر احادیث سے مسائل ذیل پر روشنی پڑتی ہے۔

مسواک کرنے کے مسائل

۱۔ کم سے کم تین مرتبہ داہنے، بائیں، اوپر نیچے دانتوں میں مسواک کرے اور ہر مرتبہ مسواک کو دھوئے، مسواک نہ بہت نرم ہو نہ بہت سخت، پیلو یا زیتون یا نیم وغیرہ کی کڑوی لکڑی کی ہو چھنگلیا کے برابر موٹی اور زیادہ سے زیادہ ایک بالشت لمبی ہو اور اتنی چھوٹی بھی نہ ہو کہ مسواک کرنا دشوار ہو جائے۔ مسواک داہنے ہاتھ سے کرے اور اس طرح ہاتھ میں لے کہ چھنگلیا مسواک کے نیچے اور بیچ کی تین انگلیاں اوپر اور انگوٹھا سرے پر نیچے ہو اور مٹھی نہ باندھے۔ دانتوں کی چوڑائی میں مسواک کرے لمبائی میں نہیں، چت لیٹ کر مسواک نہ کرے، پہلے داہنی جانب کے دانت مانجھے پھر بائیں جانب کے اوپر کے پھر داہنی جانب کے نیچے کے۔ پھر بائیں جانب کے نیچے کے۔ جب مسواک کرنا ہو تو اسے دھولے یونہی فارغ ہونے کے بعد دھو ڈالے اور زمین پر پڑی نہ چھوڑ دے بلکہ کھڑی رکھے اور ریشہ کی جانب اوپر ہو۔ مسواک جب قابل استعمال نہ رہے تو اسے دفن کر دیا جائے یا کسی پاک جگہ رکھ دی جائے گندگی میں نہ ڈالی جائے ـــــ احناف کے نزدیک مسواک سنت وضو ہے سنت نماز نہیں ہے۔

بَابُ دَفْعِ السِّوَاكِ اِلَى الْاَكْبَرِ

باب جو عمر میں بڑا ہو پہلے اس کو مسواک دینے کے بیان میں

۲۴۵ - اِبْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرَانِيْ اَتَسَوَّكُ بِسِوَاكٍ فَجَآءَنِيْ رَجُلَانِ اَحَدُهُمَا اَكْبَرُ مِنَ الْاٰخَرِ فَنَاوَلْتُ السِّوَاكَ الْاَصْغَرَ مِنْهُمَا فَقِيْلَ لِيْ كَبِّرْ فَدَفَعْتُهُ اِلَى الْاَكْبَرِ مِنْهُمَا قَالَ اَبُوْعَبْدِ اللّٰهِ

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ مسواک کر رہا ہوں۔ اتنے میں دو شخص میرے پاس آئے۔ ایک عمر میں دوسرے سے بڑا تھا۔ میں نے پہلے اس کو مسواک دی جو عمر میں چھوٹا

اَخْتَصَرَهُ نُعَيْمٌ عَنِ ابْنِ مُبَارَكٍ عَنْ اُسَامَةَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ (بخاری)

تھا۔ تب مجھ سے کہا گیا کہ پہلے بڑے کو دو۔ میں نے بڑے کو دیدی۔

فوائد ومسائل اس حدیث کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ بڑوں کا حق مقدم ہے لیکن جب کوئی چیز بانٹی جائے تو چھوٹوں سے ابتدار کی جائے اور یہ طریقہ ہر بات میں سلام، تحیۃ، کھانے و پینے میں اختیار کیا جائے کہ یہی سنت ہے۔ حضرت مہلب علیہ الرحمہ نے فرمایا۔ بڑی عمر والے کو ہر بات میں مقدم رکھنا اولیٰ ہے لیکن جب ترتیب کے ساتھ بیٹھیں تو پھر ابتدار داہنی طرف والے سے کی جائے۔ ۲۔ دوسرے کی مسواک استعمال کرنا جائز ہے البتہ مناسب یہ ہے کہ دھوکر استعمال کرے ۳۔ اس حدیث سے مسواک کی فضیلت نکلتی ہے کہ اس کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی ہوئی۔ حضور علیہ السلام نے مسواک کے متعلق جو خواب دیکھا وہ وحی ہی تو تھا! (۴) عنوان کا مقصود مسواک کی فضیلت کا اثبات ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ یہ تھی کہ اگر کوئی ایسی چیز آپ کے پاس ہوتی جو عند اللہ معمول ہے تو حضار مجلس میں سے کم سن سے اس کی تقسیم فرماتے اور اگر وہ چیز ایسی ہوتی جو عند اللہ فضیلت والی ہے تو اس کی تقسیم بڑی عمر والے سے شروع فرمایا کرتے۔ مسواک چونکہ ایک فضیلت والی چیز تھی اسی لیے خواب میں آپ کو بڑی عمر والے کو دینے کی ہدایت دی گئی۔

بَابُ فَضْلِ مَنْ بَاتَ عَلَى الْوُضُوْءِ

باب باوضو سونے کی فضیلت کے بیان میں

۲۴۶۔ عَنِ الْبَرَاءِ ابْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَيْتَ مَضْجَعَكَ فَتَوَضَّاْ وُضُوْءَكَ لِلصَّلٰوةِ ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلٰى شِقِّكَ الْاَيْمَنِ ثُمَّ قُلِ اللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ اِلَيْكَ وَ فَوَّضْتُ اَمْرِيْ اِلَيْكَ وَاَلْجَاْتُ ظَهْرِيْ اِلَيْكَ رَغْبَةً وَّرَهْبَةً اِلَيْكَ لَا مَلْجَا وَلَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ اَللّٰهُمَّ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ اَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ فَاِنْ مُتَّ مِنْ لَيْلَتِكَ فَاَنْتَ عَلَى الْفِطْرَةِ وَاجْعَلْهُنَّ اٰخِرَ مَا تَتَكَلَّمُ بِهٖ قَالَ فَرَدَّدْتُهَا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا بَلَغْتُ اَللّٰهُمَّ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ قُلْتُ

براء بن عازب سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا جب تو اپنے سونے کی جگہ پر آجائے تو نماز کا سا وضو کرے پھر داہنے کروٹ پر لیٹ کر یوں دعا کر۔ یا اللہ! تیرے ثواب کے شوق میں اور تیرے عذاب کے ڈر سے میں نے اپنے تئیں تیرے سپرد کر دیا اور اپنا کام تجھ کو سونپ دیا اور اپنی پیٹھ تجھ پر ٹیک دی (یعنی تجھ پر بھروسہ کیا) تجھ سے بھاگ کر کہیں پناہ اور کہیں ٹھکانا نہیں۔ مگر تیرے ہی پاس، یا اللہ میں تیری کتاب (قرآن پاک) پر ایمان لایا جس کو تو نے اتارا اور تیرے نبی پر جس کو تو نے بھیجا۔ اب اگر تو اسی رات مرجائے تو اسلام پر رہے گا اور (ایسا کر) کہ یہ دعا تیرا آخری کلام ہو۔ براء نے کہا۔ میں نے

وَرَسُوْلِكَ قَالَ لَا وَنَبِيِّكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ (بخاری)

اس دعا کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے (یاد کرنے کے لیے) دہرایا۔ جب اس جگہ پہنچا "آمنت بکتابک الذی انزلت" اس کے بعد میں نے یوں کہہ دیا "ورسولک" آپ نے فرمایا نہیں، (بلکہ) یوں کہہ ونبیک الذی ارسلت۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے دعوات میں بھی ذکر کیا ہے۔ مسلم نے دعا میں ابوداؤد نے ادب میں ترمذی نے دعوات میں اور نسائی نے فی الیوم ولیلۃ میں ——— باوضو سونے کی دیگر احادیث میں بھی فضیلت آئی ہے۔ ۲۔ سوتے وقت وضو کر لینا مستحب ہے اور اسی طرح دعا کرنا ۳۔ داہنی کروٹ سونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھا۔ کیونکہ آپ ہر کام میں سیدھی طرف کو پسند فرماتے تھے۔ نیز دہنی کروٹ سونے سے زیادہ غفلت نہیں ہوتی اور تہجد کے لیے آنکھ کھل جاتی ہے ۴۔ اگر پہلے سے کسی کو وضو ہو تو سونے کے لیے دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہی وضو کافی ہے اور باوضو سونے کی حکمت یہ ہے کہ ممکن ہے اسی رات موت آجائے تو وضوء کی برکت سے شیطان سے محفوظ رہے گا۔ ۵۔ سوتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا اور کوئی دنیاوی بات نہ کرنا مستحب ہے۔ اسی طرح مذکورہ بالا دعا پڑھنا بھی تو اگر اسی نیند میں موت آگئی تو اس کے اعمال کا اختتام وضوء پر اور دعا پر جو افضل الاعمال ہے، ہوگا ۶۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے کتاب الوضوء کے اخیر میں یہ حدیث درج کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جیسے آدمی وضو بیداری کے اخیر میں کرتا ہے۔ اسی طرح یہ حدیث کتاب الوضوء کا خاتمہ ہے۔

خاتمہ اس حدیثِ مقدس پر کِتَابُ الْوُضُوْءِ ختم ہوئی۔ پارہ دوم انشاء اللہ العزیز کِتَابُ الْغُسْل سے شروع ہوگا ——— کتاب الوضوء میں کل مرفوع حدیثیں ۱۵۴ ہیں۔ ان میں سے موصول ۱۱۶ اور بصیغہ متابعت و تعلیق ۸۸ حدیثیں ہیں اور مکرر ان میں ۷۳ حدیثیں گویا بلا تکرار کل ۸۱ حدیثیں ہیں جن میں ۳ معلق ہیں اور باقی موصول۔ کتاب الوضوء میں صحابہ و تابعین کے آثارِ موقوف ۴۸ ہیں۔ ان میں تین موصول ہیں باقی معلق ہیں۔

——— وَاللّٰہُ الموفق والمعین ———

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ تَعَالٰى اَعْلَمُ

سید محمود احمد رضوی غفرلہ
دار العلوم حزب الاحناف لاہور
۱۹ ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ بمطابق ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۹ء

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ
دینِ مصطفیٰ
عَلَيْهِ التَّحِيَّةُ وَالثَّنَاءُ
عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق
معاشرت سے متعلق قرآن وحدیث اور
فقہ حنفی کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کا
قابل مطالعہ مجموعہ
حسب فرمائش
جناب محترم الحاج امیر بخش صاحب
مخدوم کارپوریشن میکلوڈ روڈ لاہور
تالیف
علامہ سید محمود احمد رضوی
ناظم شعبہ تبلیغ دار العلوم حزب الاحناف
گنج بخش روڈ
لاہور

روشنی
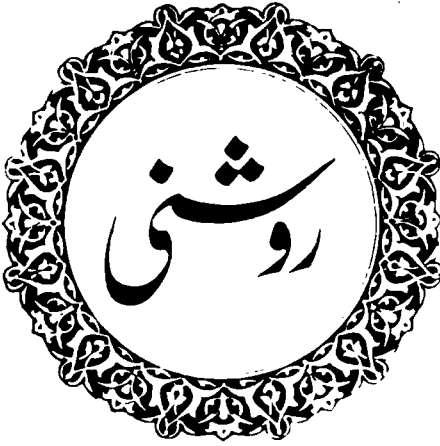
حضور ہادیِ عالم نورِ مجسم حبیبِ کبریا

سرورِ انبیا حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا

کے

ارشادات کا ایمان افروز مجموعہ
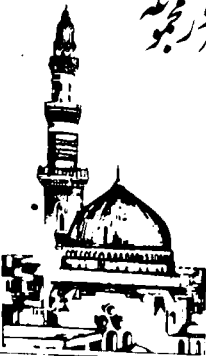
علامہ سید محمود احمد رضوی

شعبہ تبلیغ دار العلوم حزب الاحناف لاہور
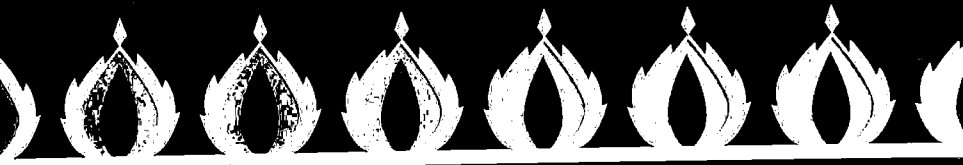
دینِ مصطفیٰ
علیہ التحیۃ والثناء
باہتمام
صاحبزادہ سید مصطفیٰ اشرف رضوی